ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ. حضرت سید احمد شہیدؒ کا جہاد حریت، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں علماء کا حصہ، ریشمی خطوط کی تحریک اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور دوسرے اکابر کی جدوجہد آزادیٔ ہند کے نہایت مستند حالات

نقشِ حیات

خود نوشت سوانح

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ

(۲ حصے کامل)

دار الاشاعت

اردو بازار کراچی ۱ — فون ۲۶۳۱۸۶۱

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ط

نقشِ حیات

خود نوشت سوانح

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

جلد اوّل و دوم

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خود نوشت مکمل سوانح حیات اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ، حضرت سید احمد شہیدؒ کا جہاد حریت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علما کا حصہ ریشمی خطوط کی تحریک اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور دوسرے اکابر کی جدوجہد آزادی ہند کے نہایت مستند حالات ایک واقف کار کے قلم سے

ناشر
دارالاشاعت اردو بازار، کراچی ۱
فون ۲۱۳۷۶۸

اشاعت اوّل

ناشر دارالاشاعت کراچی ۱

باھتمام خلیل اشرف عثمانی

طباعت

ملنے کے پتے

دارالاشاعت مولوی مسافرخانہ کراچی ۱

ادارۃ المعارف دارالعلوم کورنگی کراچی ۱۴

ادارۂ اسلامیات۔ ۱۹۰ انارکلی لاہور

مکتبہ دارالعلوم۔ دارالعلوم کورنگی کراچی ۱۴

۴۸۶

فہرست مضامین نقش حیات جلد اول

فہرست مضامین جلد دوم صفحہ ۴۰۳ تا صفحہ ۴۰۷ پر ملاحظہ فرمائیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تعارف اور وجہ تالیف

از

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند و ممبر ہند پارلیمنٹ دام ظلہ العالی

---

(۱) جس قدسی صفات بزرگ کے رشحاتِ قلم آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں اس کی شہرت و عظمت کی سطح میرے تعارفی الفاظ سے بہت بلند ہے۔

کون نہیں جانتا کہ وہ بزرگِ باخدا۔ عالم باعمل جس کو مولانا حسین احمد مدنی کہا جاتا ہے اور علماءِ ہند کا بہت بڑا طبقہ اُس سے یہاں تک ارادت و عقیدت رکھتا ہے کہ وہ شیخ الاسلام" کا صحیح خطاب ہی اُن کے جذبات احترام کی کسی قدر تسکین کر سکتا ہے — وہ علم و عمل اور شریعت و طریقت کا وہ مجمع البحرین ہے کہ اگر ایک طرف اتباعِ سنت، اخلاق نبوت، سیرتِ صحابہ اور اسوۂ مشائخ کا سرچشمہ ہے تو دوسری جانب وہ ایسا بحرِ بے پایاں ہے جس سے جذباتِ حریت، ترقی ملت، حبِّ وطن ہمدردی خلقِ خدا، غمخواری نوع انسانیت۔ اور اُن کے لئے ایثار اور بے پناہ قربانی کے چشمے ابلتے رہتے ہیں۔ اُس کا قلب حامل شریعت ہے اور عمل تفسیرِ شریعت۔

دینی اور ملی جذبات نے جس طرح خوف و خشیہ الٰہی کی کھٹک اس مقدس ہستی کے دل میں پیدا کی اُسی طرح خدمتِ خلق کے پاک احساسات اس کے قلب حق آگاہ پر کچھ کم اثر انداز نہیں ہوئے اور آخر درد و کرب کی یہی ملی جلی کیفیت سعی پیہم کی صورت میں نمودار ہوئی جس نے اس کو چین و آرام۔ راحت و سکون سے قطعاً ناآشنا بنا دیا۔ اور آج جب کہ ستر سال سے تجاوز کر کے جسمانی طاقت ضعفِ پیری کے حوالہ ہو چکی ہے اُس

کی پاک زندگی شباب جدّوجہد سے ہم آغوش اور سعی پیہم کی حامل ہے۔

(۲) عہدِ شباب کی بات ہے۔ وہ سید المرسلین۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے حرمِ اطہر میں درس و تدریس کے ذریعہ قال اللہ وقال الرسول کی خدمت انجام دیا کرتا تھا۔ اور مشرق وسطیٰ۔ افریقہ، چین اور جزائر شرق الہند کے تشنگانِ علوم اور رہ نوردانِ سلوک و طریقت اُس کے ظاہری و باطنی کمالات و ملکات سے فیضیاب ہُوا کرتے تھے مگر اُس کی نگاہ حقیقتِ آگاہ نے جب یہ دیکھا کہ حیاتِ ملّی کس طرح مظلومیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے اور انسانیت کس طرح درد و کرب میں مبتلا ہے۔ تب وہ خدمتِ ملّی کے تنہا اس گوشہ پر قانع نہ رہ سکا۔ اس نے نہ صرف دنیاء اسلام۔ بلکہ عالم انسانیت پر گہری نظر ڈالی۔ وہ نظر جو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے جوارِ رحمت کے طفیل میں۔ رحمت و شفقت، محبت و رافت اور ہمدردی و غمخواری کے جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جس کی وسعت، فرقہ واریت کی تنگنائیوں سے آزاد۔ اور تحزّب اور گروہ بندی کے گرد و غبار سے پاک تھی۔ اُس نے دیکھا کہ مغرب کے فولادی پنجے۔ مشرق کے گوشت و پوست کو کھُرچتے ہوئے ہڈیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ مشرق اس اذیت سے تڑپ رہا ہے۔ وہ درد بھری آواز سے انسانیت کے نام پر اپیل کر رہا ہے۔ لیکن سفید فام یورپین وحشیوں کے دل رحم اور مہربانی کے مفہوم سے قطعًا نا آشنا ہو چکے ہیں۔

یورپ کے نقشہ میں انگریز کی تصویر سب سے زیادہ بھیانک تھی۔ وہ ظلم و ستم کے لشکرِ بے پناہ کا علم بردار تھا جس کی دراز دستیاں جبرالٹر سے لے کر سنگاپور تک اور آئرلینڈ سے لے کر بینکاک و ہانگ تک ہر ایک آزاد قوم کی عزت و عظمت پامال کر چکی تھیں۔ وہ اپنے وطنِ عزیز کی تباہ حالی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ دولت آل عثمان (ترکی) پر یورشِ یورپ کی خونیں تاریخ اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ افریقہ اور ایشیا کی مظلوم قوموں کی چہار طرف آہ و بکا۔ گریہ و زاری کی دردناک صداؤں نے اُس کو بے چین و مضطرب بنا دیا تھا چنانچہ وہ عزم بالجزم کا فولادی پیکر۔ استقلال و استقامت کا کوہِ گراں بن کر اُٹھا۔ سب سے پہلے وطنِ عزیز کی آزادی اور برطانوی اقتدار کی پامالی کو اُس نے اپنا لائحہ عمل بنایا کہ یہی طریقِ کار مظلوم قوموں کی گلو خاصی، وطن کی آزادی اور دنیاء اسلام کی رفعت اور ترقی کا کفیل ہو سکتا تھا۔

یہی وہ فراست مومن تھی جس نے چالیس سالہ جنگِ آزادی کا ہیرو بنا کر اس بلند شخصیت کو سیاست کے اس انقلابی مقام پر لا کھڑا کیا جس کو ظاہر بین نگاہیں حیرت و تعجب سے دیکھتی تھیں اور سطحی اندازِ بیان سے اس مقدس ہستی کے اس بے لوث جوش و خروش اور سرگرمی عمل کو محض پولیٹیکل حیثیت دیتی نظر آتی تھیں اور اُس کے اخلاص و صداقت اعلاءِ حق اور جہادِ حریت کے مقدس جذبات کی وہ قدر نہ کر سکتی تھیں جس کی وہ مستحق تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ بیسویں صدی میں انگریز۔ انگریزیت اور نہ صرف انگریزی سامراج بلکہ ہر ایک سامراج کی سب سے بڑی دشمن حسین احمد مدنی کی شخصیت ہے تو یہ دعویٰ ایسا ہی صحیح ہوگا جیسا کہ آج انگریزی اقتدار کا زوال آفتاب نیم روز کی طرح ایک حقیقت بن کر سامنے آچکا ہے۔

غرض یہی وہ پاک جذبات و حسیات تھے جن کی عملی شکل و صورت نے اس بوریا نشین مقدس درویش اور جانشین رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قید و بند کے مصائب کے سامنے سینہ سپر کر دیا اور درس و تدریس اور ارشاد و سلوک کے مبارک سلسلوں کے ساتھ مسندِ یوسفی کی رونق و آرائش کے لئے بھی اسی کو چن لیا۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

(۳) وجہِ تالیف

۱۹۴۴ء میں جب آپ نینی جیل میں قید و بند کی زندگی بسر کر رہے تھے تو بعض مخلص خدامؑ اور بے تکلف احباب نے آپ سے سوانح حیات قلمبند کرنے کی درخواست کی۔ تاکہ اس طرح اکابر امت مرحومہ کے اُس اُسوۂ حسنہ کا بھی اتباع ہو جائے جس کو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام الحدیث احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مقدس اساطین امت نے اپنے اخلاف کے لئے یادگار چھوڑا ہے۔

اوّل اوّل آپ نے انکار کیا لیکن آخر کار جب عرض و گزارش نے اصرارِ پیہم کی شکل اختیار کر لی تب مجبور ہو کر قلم اُٹھایا اور اپنی زندگی سے متعلق چند صفحات لکھ دیئے مگر جنبشِ قلم جب اس موڑ پر پہنچی جہاں سے وہ اپنے مقدس اُستاذ شیخ الطریقت حضرت مولانا محمود حسن، قدس اللہ سرہ العزیز کا

ؑ اس سلسلہ میں مولانا ابو الحسن صاحب حیدری کا اسمِ گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

رفیق بن کر میدانِ سیاست میں گامزن ہوا۔ تو اُس کے سامنے سب سے اہم اور سب سے زیادہ وقیع یہ مسئلہ آیا کہ آخر شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز اور اُن کے رفقاء کار نے یورپین اقوام خصوصاً انگریزی اقتدار کی مخالفت میں سیاست کی پُر شور اور ہنگامہ آرا زندگی کیوں اختیار کی۔

یوں تو یہ سوال سیاسی زعماء اور پولیٹیکل لیڈروں کے نقطہ نظر سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن وہ گوشہ نشین۔ خدا پرست۔ صوفی و عالم جو رضاء الٰہی میں غرق پبلک کی ہنگامی زندگی سے الگ تھلگ رہتے ہوں۔ جن کی تقدیس کا شہرہ خواہ تمام دنیا میں کیوں نہ ہو لیکن خود اُن کی اپنی جدوجہد کا دائرہ خانقاہوں اور مدرسوں سے وابستہ اور جن کی تلقین و تبلیغ حق کا طریق کار خاموش علم و عمل اور پُر سکون کردار سے متعلق رہا ہو۔ ایسی قدسی صفات بزرگوں کا راحت و آرام اور راحت و آرام سے بڑھ کر درس و تدریس۔ تعلیم و تربیت۔ تزکیۂ نفس تالیف و تصنیف۔ تفسیر و افتاء وغیرہ کے مقدس مشاغل سے دست کش ہو کر یک بیک سیاست کے میدان میں کود پڑنا اور حکومت تسلّطہ کے بالمقابل صف آرا ہو جانا معمولی بات نہیں بلکہ بہت ہی اہم سوال ہے۔

جس شخص کا قلب احترام شریعت سے زیادہ لبریز اور جو شخص اپنے افعال کے محاسبہ کا زیادہ عادی اور خداوندی بازپرس اور پاداش عمل کے اصول پر جس کو جس قدر زیادہ یقین و اعتماد ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ اس سوال کی اہمیت محسوس کرے گا۔

چنانچہ حضرت مصنف مدظلہ العالی کے سامنے یہ سوال سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ آیا۔ یہ پوری جلد جو آپ کے سامنے ہے، اس کا بیشتر حصہ اسی سوال کا مدلّل و مفصّل جواب ہے۔

دوسری جلد میں قطب العالم۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی سیاسی تحریک کے وہ گوشے جو اب تک پردۂ خفا میں تھے اور رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ بھی اُن کو بے نقاب نہیں کر سکی تھی، اُن کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

تحریک کے رجالِ کار، حکومت موقتہ کے قیام، افغانستان و حجاز کے انقلابات، ناکامی تحریک کے وجوہات پھر اسارتِ مالٹا وغیرہ کے حالات و کوائف قلمبند کرنے کے بعد اپنے حالات قلمبند فرمائے ہیں۔

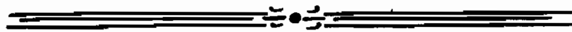
اس طرح یہ کتاب صرف حضرت مصنف مدظلہ العالی کی سوانح حیات ہی نہیں رہی بلکہ ہندوستان

میں انگریزوں کی آمد سے لے کر اُن کے اقتدار کے خاتمہ تک تمام نمایاں واقعات کا مجموعہ برطانوی حکومت کی تباہ کُن ڈپلومیسیوں اور سیاسی مکر و فریب کا انسائیکلوپیڈیا یا حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک حریت اور اس عرصہ کے سیاسی رجحانات اور انقلابی تحریکات کا وہ مستند اور جامع تذکرہ ہے جس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو ماضی سے سبق لے کر مستقبل کی فکر کرنا چاہتا ہے اور ہند یونین میں ملت اسلامیہ کی عزت و عظمت کا آرزومند ہے۔

محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ
۱۵ ذیقعدہ ۱۳۷۲ھ۔ ۲۷ جولائی ۱۹۵۳ء
دہلی

قطعۂ تاریخِ طباعت

سوانح خود نوشت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ



عقیدت کا خضرِ طریقِ نجات! شریعت کا سرمایۂ کائنات!
طریقت کا مجموعۂ حال و قال! حقیقت کا آئینہ دارِ صفات!
یہ گنجینۂ رازِ حبِ وطن!!!!! چھپا جب بصد حسن و شان ثبات
مصنف ہیں جس کے بفضلِ خدا! حسین احمدِ پاک دل پاک ذات
جو انور سوئے سالِ تاریخِ طبع! تصور ہوا مائلِ التفات!

پکارا یہ ہاتف۔ بجا خود نوشت
۱۳۷۲ھ
ہے اک شیخ کا نقشِ عزمِ حیات
۱۹۵۳ء

کفش بردارِ شیخ
انور صابری

دھلی

(۲)
از مولانا مقبول الرحمٰن (خیال) سیوہاروی
نقشِ حیات امام العصر
۱۳۷۲ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

الحمد للّٰہ۔ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم۔

اما بعد:۔ عرصۂ دراز سے احباب مجھ سے میری سوانحعمری کی مختلف باتیں دریافت فرماتے رہتے تھے۔ حسب وقت وسوال میں جواب دیتا رہتا تھا۔ بعض احباب نے مختلف اخباروں اور رسائل میں اُن کو شائع بھی کر دیا۔ مگر افراط وتفریط اور زیادتی کمی سے وہ مضامین خالی نہیں رہے اور بعض چیزیں غلط بھی شائع ہوئیں جن کے تذکرے پر اصرار کیا گیا کہ صحیح واقعات قلمبند کر دیئے جائیں۔ کثرت مشاغل اس کی فرصت ہی نہ دیتے تھے کہ مختصر سے مختصر طریقہ پر بھی تحریر کروں۔ بالآخر ۱۹۴۲ئ میں نظربندی کی نوبت آئی اور جبکہ میں نینی جیل الہ آباد میں تھا تو اس کی پرزور تحریک ہوئی اور کہا گیا کہ اس وقت تو تجھ کو بہت سی مصروفیتوں سے نجات حاصل ہے اس کو غنیمت جان کر اس مہم کو پورا کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں علاوہ تاریخی واقعات کے تذکرہ کے آنے والے لوگوں کے لئے ہدایت اور مشعلیت راہ بھی ہے۔ اور نعمائے الٰہیہ کے تحدیث کی بھی عمدہ صورت ہے۔ میں نے اس پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ واقع میں جس قدر انعام اور فضل خداوندی میرے اوپر مثل بارش موجب حیاتِ روحانی وجسمانی ہوا ہے، نہ میں اس کا مستحق تھا اور نہ اتنے افضال وانعام کی عام مثالیں پائی جاتی ہیں۔ جس انتہائی تنزل میں انقلاباتِ زمانہ نے ہمارے خاندان کو پہنچایا تھا اس کے بعد اسطرح ابھارنا وہ انتہائی کرم خداوندی ہے جس کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ خاندانی

روایات منقبیں کہ ہر زمانہ میں کم از کم ایک یا دو صحیح مجذوب اور بکثرت اہلِ سلوک موجود رہتے تھے۔ مگر ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اہلِ عرفان و سلوک سے خاندان خالی ہوگیا اور سب پکّے دنیادار ہوگئے۔ علم و معرفت کی جگہ جہالت اور نفس پروری نے لے لی تھی۔ پھر ۵۷ء کے واقعات نے رہی سہی حالت بھی بالکل برباد کر دی۔ اندوختہ خزانے اور اموال سب لُٹ گئے۔ جائیدادیں تقریباً سب کی سب نکل گئیں اور انتہائی افلاس نے چاروں طرف سے احاطہ کر کے بالکل بے دست و پا کر دیا۔ خاندان کے مُربّی حضرات دارالفنا کو راہی ہوگئے اور ابھرنے کے سامان بالکل نیست و نابود ہوگئے۔ عالمگیر، پے در پے قحطوں نے جو کہ انگریزی چیرہ دستیوں اور اُن کی نحوستوں سے انیسویں صدی عیسوی کے اخیر میں ظہور پذیر ہوئے تمام ہندوستان بالخصوص یوپی اور اودھ کے مشرقی اضلاع میں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ خاندانوں کے خاندان بے نام و نشان ہوگئے تھے۔ بقول سر ولیم ڈگبی ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۰ء تک ہندوستان میں اٹھارہ قحط واقع ہوئے اور تقریباً تین کروڑ آدمی ہلاک ہوگئے۔ ایسے زمانہ میں ایسے گرے ہوئے خاندانوں اور پھر ایسے گرے ہوئے خاندان کے یتیم بچّوں کو باعزّت زندہ رکھنا اور اُن کو ان غیر متناہی عظیم الشان نعمتوں سے ڈھک لینا کیا وہ بےنظیر انعام الوہیّت نہیں ہے کہ جس کے شکریہ سے کبھی بھی عہدہ برائی نہیں ہوسکتی۔ ؎

اگر بر روید از ہر موزبانم ⁂ ادائے شکر لطفش کے توانم

بہرحال حسب ارشاد قرآنی وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ضروری معلوم ہوا کہ بطور تحدیث نعمت خداوندی اللہ تعالےٰ کے اس فضل و کرم کا جو کہ مجھ پر اور میرے والدین اور خاندان پر سایہ گستر رہا ہے اور اب بھی سایہ افگن ہے تذکرہ کروں اور اس کے شکریہ کے گیت گا کر قلب اور دماغ ناظرین کو معطر کروں۔ ؎

من آں خاکم کہ ابر نو بہاری کند از لطف بر من قطرہ باری

چونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ ہائے سابقہ میں اسلاف کرام نے اپنی اپنی سوانحعمریاں خود لکھی ہیں جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے اور زمانہ حال میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں اس کی بکثرت مثالیں پائی جاتی ہیں اور چونکہ اپنی بیتی اور سرگذشت ۔۔ انسان جس قدر واقف ہوتا ہے دوسرا

نہیں ہو سکتا اس لئے کوئی وجہ معتمد علیہ اس سے باز رہنے اور اس تذکرہ کو ترک کرنے کی معلوم نہیں ہوتی خصوصاً اس بناء پر کہ اُمید ہے کہ شاید لوگوں کو صحیح حالات معلوم ہونے کی بناء پر کچھ نفع پہنچے یا کم از کم وہ ان بدظنیوں اور بدگوئیوں سے پرہیز کریں جو کہ دشمنانِ دین و مذہب نے اپنی خود غرضیوں کے ماتحت یوربین پروپیگنڈوں سے پھیلائی ہیں اگرچہ ان بدگوئیوں اور سوءِ ظنوں سے میرے لئے کفارۂ سیئات اور دوسروں کے حسنات حاصل کرنے کا فائدہ بھی متصور بلکہ یقینی ہے۔ بہر حال ان مقاصدِ حسنہ کے تحت میں ان سطور کو پیش کرتا ہوا افضال خداوندی سے دست بدعا ہوں کہ وہ مجھ کو مَا لَا يُرْضِيهِ سے محفوظ رکھے اور اپنی مرضیات کی ہر قول و عمل میں توفیق عطا فرمائے۔

وما ذلك على الله بعزيز وما توفيقي الا بالله عليه توكلت واليه انيب رب اوزعني ان اشكر نعمتك التي انعمت على وعلى والدي وان اعمل صالحا ترضاه واصلح لي في ذريتي اني تبت اليك واني من المسلمين۔

سنہ و تاریخ ولادت

سنہ ۱۲۹۶ھ ماہ شوال کی انیسویں تاریخ کی شب میں گیارہ بجے دوشنبہ کے دن گزر جانے کے بعد یعنی شب سہ شنبہ میں بمقام بانگر مئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوا: تاریخی نام چراغ محمد ہے والد صاحب مرحوم نے اپنی بیاض میں صرف یہی تحریر فرمایا ہے: تاریخ و سنہ عیسوی نہیں لکھا ہے، حساب سے ۱۸۷۹ء ہوتا ہے۔

اُس زمانہ میں والد صاحب مرحوم قصبہ بانگر مئو میں اُردو مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور کئی سال سے معہ متعلقین وہاں ہی مقیم تھے۔ ۱۲۹۳ھ میں اس سے پہلے میرے منجھلے بھائی مولانا سید احمد صاحب مرحوم بھی وہاں ہی پیدا ہوئے تھے۔ جس زمانہ میں میری پیدائش ہوئی اُس زمانہ میں موسمی تپ و لرزہ کا بہت زور تھا اموات زیادہ ہوتی تھیں۔ والدہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ عموماً بچے اور اُن کی مائیں جو کہ اس زمانہ میں زچہ ہوئی تھیں، ضائع ہو گئے۔ تمام قصبہ میں صرف میں اور ایک دوسری عورت معہ بچے کے سالم بچی تھی۔

ابتدائی پرورش بانگر مئو ہی میں ہوئی میں بہت ہی چھوٹا تھا جبکہ والد مرحوم بانگر مئو چھوڑ کر وطن آبائی قصبہ ٹانڈہ میں قیام گزیں ہوئے چونکہ اس پردیسی اقامت کیوجہ سے زمینداری کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا اسلئے انہوں نے کوشش کی کہ تبدیلی ٹانڈہ کو ہو جائے حکام بالا نے اسوجہ سے اسمیں لیت و لعل کی کہ ٹانڈہ

کے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ عنلہ ماہوار ہے اور تم کو یہاں منہ ماہوار ملتے ہیں یہ مقدار تم کو وہاں دیجا سکتی مگر ضروریات وقت نے مجبور کیا کہ اس قلت تنخواہ پر بھی تبدیلی کرالی جائے۔ بالآخر وہ وہاں سے تبدیل ہو کر ٹانڈہ چلے آئے۔ مجھ کو وہاں سے آنا بالکل یاد نہیں۔ غالباً تین برس کی عمر ہوگی اسکے بعد بارہ برس کی عمر تک ٹانڈہ ہی میں رہنا اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنا نصیب ہوا۔

سلسلہ نسب

سلسلہ نسب حسب ذیل ہے۔

حسین احمد[1] بن سید حبیب اللہ[2] بن سید کبیر علی[3] بن سید جہانگیر[4] بخش بن شاہ نور اشرف[5] بن شاہ مدن[6] بن شاہ محمد ماہ[7] شاہی بن شاہ خیر اللہ[8] بن شاہ صفت اللہ[9] بن شاہ محب اللہ[10] بن شاہ محمود[11] بن شاہ لاد حسن[12] بن شاہ قلندر[13] بن شاہ منور[14] بن شاہ راجو[15] بن شاہ عبد الواحد[16] بن شاہ محمد زاہد[17] بن شاہ نور الحق[18] رحمہم اللہ تعالےٰ

شاہ نور الحق رحمۃ اللہ وہ مورث اعلیٰ ہیں جو کہ اس سرزمین "الہداد پور قصبہ ٹانڈہ" میں پہلے پہل تشریف لاکر اقامت گزیں ہوئے۔ اس زمانہ میں قوم رجبھر کا ٹانڈہ کے گرد و نواح میں تمام دیہات وغیرہ پر قبضہ اور تصرف تھا۔ اور وہ مسلمانوں کو ستاتے رہتے تھے۔ حضرت شاہ نور الحق صاحب مرحوم نے پہنچ کر ان کو دعوتِ اسلام دی مگر وہ لوگ اور راجہ مقابلہ پر آئے آپ نے بزور کرامت اُن کو زک دی۔ اُن کا راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا آپ نے وہیں اقامت فرمائی اور اس موضع کا نام الہداد پور رکھا جس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے قلعہ کے آثار اب تک موجود ہیں۔ شمالی دیوار اور مشرقی برجوں کے باقی ماندہ پتھر وغیرہ باقی ہیں اسی قلعہ میں آپ کے اور آپ کی تمام اولاد کے مزار اب تک بنتے چلے آتے ہیں۔

آج ہمارے خاندان میں کوئی ایسا کاغذ یا تحریر موجود نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ موصوف کہاں سے آئے تھے اور سلسلہ نسب فوقانی کیا ہے اور کس زمانے میں آئے تھے مگر شجرۂ طریقت میں جو کہ محفوظ ہے دکھلایا گیا ہے کہ آپ شاہ داؤد چشتی کے اور وہ شاہ قطب الدین چشتی کے اور وہ شاہ نجم الدین چشتی کے اور وہ شاہ رومی چشتی کے اور وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہم اللہ تعالےٰ کے خلیفہ ہیں۔

یہ شجرۂ طریقت بہت پرانے کاغذات میں پایا تھا اس کا تصنیف کرنے والا والد ماجد مرحوم کے پڑدادا شاہ نور اشرف قدس اللہ سرہ العزیز کا کوئی مرید یا بیٹا ہے۔ الفاظ حسب ذیل ہیں۔

خداوندا کریما کارسازا — کہ ہستی بندہ پرور بے نیازا
بحق راز شاہ نور اشرف — کہ در روشن دلی از نور اشرف
بحق راز حضرت پیر مدن — کہ دلق فقر از دگشتہ مزین
بحق آں محمدؐ ماہ شاہی — کہ در بہرج فقیری بود ماہی
بحق شاہ خیر اللہ نیکو — نبودش ہیچ مطلوبے بجز تو
خدایا ہم بحق آں شہ دیں — پناہ معرفت توحید آئیں
کہ صفت اللہ نام نامیش بود — مسمے در رج اسم سامیش بود
خدایا ہم بعزّ و رفعت شاہ — محبّ اللہ سماء فقر را ماہ
کہ چوں نام خود آں راسخ محبّت — ہمیں بود از رسوخ دل محبّت
خدایا ہم بحق شاہ محمودؔ — چہ گویم وصف او چیز ایں کہ محمودؔ
خدایا ہم بحق شاہ لدّہن — کز و گشتہ چراغ فقر روشن
شریعت را از و شد خانہ آباد — طریقت را از و معمور بنیاد
خدایا ہم بحق شہ قلندر — کہ چوں دلق فقیری کردہ در بر
عمل بر فقر فخری داشتہ او — فقیری فخر خود انگاشتہ او
بکار فقر عمر خود بسر برد — بجز راہ طریقت کام نسپرد
خدایا از برائے شہ منوّر — کہ جانش بود از نور سنت منوّر
شدہ روشن ز ذات آں یگانہ — چراغ معرفت خانہ بخانہ
خدایا ہم بحق شاہ راجو — کہ در فقر و فنا برد از ہمہ گو
خدایا ہم بآں شاہِ ستودہ — کہ عبد الواحد اورا نام بودہ
چو در عبدیت واحد سر آمد — ازاں ایں نام نامیش بر آمد
خدایا ہم بحق شاہ زاہد — محمد زاہدی کو بود زاہد،
ازاں وقتیکہ از تمیز دم زد — براہ زاہد بس ثابت قدم زد
بزہد اندر چناں او محو خود ساخت — کہ یکدم با خودی خود نہ پرداخت
بحق شاہ نور الحق لاریب — کہ نور حق نمایاں داشت از غیب
ازاں وقتیکہ حق تمیز دادش — نبودہ غیر ذات حق مرادش

خدارا از برائے شاہ داؤد[۱] کہ اہل چشت را پیر ہدی بود
چناں بود او براہ شرع و دیں چست کہ جز تبعیت امرت نمی جست
بحق شہ قطب[۲] الدین چشتی کہ اندر آتش عشقش برشتی ،
الٰہی بہر نجم[۳] الدین چشتی ، کہ ذاتش پاک از آلائش سرشتی
الٰہی بہر شہ[۴] رومی چشتی ، کہ آمد فرد در ظاہر سرشتی

---

[۱] شاہ داؤد چشتی یہ شاہ داؤد سرمست خلیفہ اور داماد شاہ قطب بینا دل قلندر سر انداز کے ہیں اور سلسلہ چشتیہ اور قلندریہ و قادریہ و سہروردیہ میں مجاز ہیں۔ سرہرپور کے رہنے والے ہیں۔ اُن کے دو خلیفے ہیں شاہ نور الحق سرہرپوری اور دوسرے شاہ نور الحق ٹانڈوی ہمارے جد امجد اور شاہ داؤد سرمست رحمۃ اللہ علیہم کی سنہ پیدائش اور سنہ وفات معلوم نہ ہو سکی وَاللہُ اَعْلَمُ۔ مراۃ الاسرار میں ہے یا زبہ نقل متواتر شنیدہ شد کہ شاہ نور در اوائل سال لیسے ریاضات شاقہ کشیدہ بود پیوستہ در خدمت شاہ داؤد مشغول می بود بعد ازاں بحسب بشریت از وے در خدمت معتاد قصورے واقع شد۔ شاہ داؤد فرمود کہ تو در خدمت من تساہل می ورزی پس من برائے خدمت خود شیخ نور دیگر پیدا می کنم۔ ایں سخن گفتہ از قصبہ سرہرپور برخاست و در قصبہ ٹانڈہ رسید حضرت شیخ نور ثانی قدس سرہٗ دراں حال بقصبۂ ٹانڈہ در کسب قصاری اشتغال داشت شاہ داؤد بر سر وقت او رسید و جوہر استعداد از راہِ فراست باطن معائنہ نمودہ فرمود کہ بابا تا کے چوب را بر سر چوب بزنی کار دیگر بہ ازیں در پیش گیر در ساعت بر دل وے جائے گرفت۔ موجب اشارتش در ہر چہ بود بیکبار ازاں کار بر آمدہ بدنبال شاہ داؤد افتاد و طریق خدمت و ریاضت و مجاہدات پیش گرفت و بحسن تربیتش بمرتبہ تکمیل و ارشاد رسید تا آنکہ بشرف خلافت شاہ داؤد بہرہ مند گردید مرقد متبرکا و نیز بقصبہ ٹانڈہ زیارت گاہ خلق است رحمۃ اللہ علیہ و حضرت شیخ میرک قدس سرہٗ کہ در قصبہ انبالہ آسودہ است خلیفہ شاہ نور بود واللہ اعلم۔

[۲] شاہ قطب الدین چشتی۔ یہ شاہ قطب الدین بینا دل قلندر فاروقی سر انداز ہیں۔ پیدائشی نابینا تھے مگر آنکھ والوں سے زیادہ دل کی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ اسی لئے انکا لقب بینا دل مشہور رہا۔ اثناء ذکر میں آپکا جسم سر سے علیحدہ ہو جاتا تھا اسی لئے انکا لقب سر انداز بھی مشہور ہوا۔ بمقام سرہرپور ۲۹ شعبان ۷۸۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴ شعبان ۹۳۷ھ میں وفات پائی۔ مزار جونپور محلہ علن پور میں ہے۔ ایک سو اوپچاس برس عمر پائی۔ واللہ اعلم۔

بحق خواجہ قطب الدین کاکی　　کہ از قطبیتش خلقے است خاکی
بآن خواجہ معین الدین چشتی　　کہ واتش دین و دنیا راست پشتی
بحق خواجہ عثمان ہارون　　کہ باشد واقف اسرار بےچون
بحق قدوہ پیران اعظم　　شریف زندنی خواجہ معظم،
بحق قطب دیں مودود چشتی،　　کہ سازی پیرو او را بہشتی
بحق خواجہ یوسف ناصر الدین　　کہ ہست از عارفان اہل تمکین
خداوندا بحضرت بو محمد　　دل او مقتبس از نور احمد
بحق خواجہ بو احمد خدا یا　　بحال زار ما رحمے بفرما،

سے۳ شاہ نجم الدین چشتی۔ وہ شاہ نجم الدین نظام الدین بن مجد الدین مبارک حسینی غزنوی ثم الدہلوی ہیں ۷۳۶ھ ہجری میں دہلی میں پیدا ہوئے اور حضرت نظام الدین محمد بدایوانی سے بیعت ہوئے اور مدت دراز تک اُن کی خدمت میں رہے۔ مگر اُن کو کشف اور شہود کے دروازے نہیں کھلے تو حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے امر فرمایا کہ روم میں جاؤ تو پھر آپ روم گئے اور حضرت خضر رومی حسینی قلندر رومی سے ملے اور اُن کی خدمت میں رہ کر طریقہ قلندریہ میں مجاز ہوئے پھر ہندوستان میں آئے اور مندو میں سکونت اختیار فرمائی۔ ان کے خلفاء میں سے شیخ حسین سرہرپوری اور شیخ قطب الدین جونپوری وغیرہ ہیں اُن کی وفات ۸۳۷ھ ماہ ذی الحجہ میں واقع ہوئی۔ دوسو برس عمر پائی۔ انہوں نے بہت عرصہ تک عرب اور عجم میں اقامت فرمائی اور آخری حصہ عمر میں ۲۵ سال متاہل ہو کر مانڈو میں گزاری اور وہیں وفات پائی۔ سے۴ شاہ رومی وہ شاہ خضر حسینی قلندر رومی ہیں ان سے شاہ نجم الدین بن نظام الدین بن مجد الدین مبارک حسینی غزنوی دہلوی نے طریقہ حاصل کیا تھا۔ شاہ خضر رومی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۵۰۰ھ میں واقع ہوئی اور وفات ۷۵۰ھ میں واقع ہوئی۔ دوسو پچاس برس عمر پائی۔ یہ سلسلہ اشاعت دین ہندوستان میں بزمانہ سلطان التمش داخل ہوئے۔ سلسلہ قلندریہ کی اجازت ان کو سیّد عبد العزیز مکی سے حاصل ہوئی اور پھر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت سلسلہ چشتیہ بطور مبادلہ حاصل کی اور سلسلہ قلندریہ چشتیہ کو رائج کیا آپ کا مزار شہر خاندیس یا دن براریں شہر سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ واللہ اعلم۔

بحق خواجہ بو اسحاق شامی — کہ دارد عالمے را در غلامی
بحق خواجہ دیں خواجۂ ممشاد — علو دینوری از خویش آزاد
ہبیرہ بصری آں پیر پیراں — کہ باشد دستگیر دستگیراں
بحق آں کہ فخر عارفاں است — حذیفہ مرعشی قطب جہاں است
بحق خواجۂ ابراہیم ادہم — شہنشاہ دو عالم شاہ اعظم
پئے خواجہ فضیل اکرم الخلق ، — شہنشاہ کریماں اعظم الخلق
بعبدالواحد اے واحد حقیقی — کہ یکتا بود در واحد طریقی ،
بحق اسوہ اہل کمالاں ! — امام زندوۂ ارباب حالاں
حسن بصری کہ مخدوم جہاں است — رئیس خواجگاں انس وجان است
بحق آں شہ ملک ولایت — معظم نیر برج ہدایت !
علی مرتضیٰ دروازۂ علم ! — در دریائے خلق و معدن علم
بحق کارفرما شاہ لولاک — کہ از تحت الثریٰ تا عالم پاک
برایش از عدم آمد بہستی — کہ بروے کس ندارد پیش دستی
طراز اوّل کہ کلک حق رقم زد — شفیع امتاں یعنی محمدؐ ،
بحق آل و اصحاب کبارش — بحق را از جملہ دوستانش
مرادہ پنج چیز از درگہ خویش — یکے علم و ادب زاہد زحد بیش
دویم رزقے کہ میدارم تمنا — عطا فرما مرا در دار دنیا !
سویم زیں وقت خود تا آخریں دم — بمانم در جہاں خوشنود و خرم ،
چہارم دہ فروغ علم مارا ! — کہ چوں خورشید باشد آشکارا
بہ پنجم چوں کہ در گورم رسانند — دوا ہم کردہ از من باز مانند
سپس با من نکیر و منکر آیند — زمن از دین من پرسش نمایند

محمدؐ مصطفےٰ یادم دہ آں دم !
دگر زہرہ و حسنین معظم

یہ شجرہ شاہ نور الحق صاحب تک شجرہ طریقت بھی ہے اور نسب نامہ بھی ہے مگر اُن کے بعد کا نسب نامہ شجرۂ طریقت سے جُدا ہوتا ہے۔ نسب نامہ اور دیگر احوال کی تفصیل حضرت

شاہ ولایت احمد صاحب لاہرپوری کی مساعی جمیلہ سے حسب ذیل حاصل ہوئی ہے جس کے ہم نہایت شکر گذار ہیں۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء۔

عہد سلطان مبارک شاہ جونپوری (یہ دوسرا بادشاہ جونپور کا تھا) ۸۰۲ھ لغایت ۸۰۴ھ اس کے مختصر عہد میں اکثر سادات مستقر خلافت جونپور میں تشریف لا کر بحصول علو فہ و جاگیر علی قدر مراتب بادشاہ مرحوم سے مواضعات مفصلہ ذیل میں مسکن گزین ہوئے۔

موزتان سادات ٹانڈہ ضلع فیض آباد و سادات مسوی و سادات کچھوکر و سادات ملوپور پرگنہ کاوی پور ضلع سلطان پور و سادات وردے پور و سادات کمال پور تکنی و سادات منڈیاہو پرگنہ خاص و سادات دیوگاؤں پرگنہ خاص (ذکر سادات ٹانڈہ) سادات آں بسیار نجیب اند و اکثر در قبائل ایشاں صاحب جاہ و جلال بودہ اند و در سیادت ایشاں ہیچ شکے نیست۔ اور سادات بوی و خرسوان بھی نہایت صحیح النسب تھے۔ وصلت و مصاہرت ان کی سادات ٹانڈہ سے تھی۔ سادات ٹانڈہ وغیرہ حضرت سیّد احمد توختہ، تمثال رسول (علیہ السّلام) کے اولاد میں ہیں۔ اس طرح۔ سیّد شاہ[۱] زبید بن سیّد شاہ[۲] احمد زاہد بن سیّد شاہ حمزہ[۳] بن سیّد شاہ ابوبکر[۴] ابن سیّد شاہ[۵] عمر بن سیّد شاہ محمد بن حضرت مخدوم سیّد شاہ[۷] احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السّلام) بن[۸] سیّد علی بن سیّد[۹] حسین بن سیّد محمد[۱۰] مدنی المعروف بہ سیّد ناصر ترمذی بن[۱۱] سیّد حسین بن سیّد موسیٰ[۱۲] حمصہ بن[۱۳] سیّد علی بن[۱۴] سیّد حسین اصغر بن حضرت امام[۱۵] علی زین العابدین علی جدہ و علیہ السّلام۔ سیّد محمد مدنی عرف سیّد ناصر ترمذ تشریف لائے اور ان کی اولاد سے حضرت مخدوم سیّد احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) لاہور تشریف لائے اور ۶۰۲ھ میں وصال ہوا۔ لاہور میں مزار ہے۔ اُن کی اولاد میں سے سیّد شاہ زبید بن سیّد شاہ احمد زاہد مورث سادات ٹانڈہ وغیرہ کے ہیں۔ اُن اولاد میں سے ایک بزرگ سیّد شاہ عبدالوہاب قدس سرہٗ کا مزار بمقام شاہ ہورہ متصل جونپور ہے) ان کی ایک کرامت یہ تھی کہ ان کے مکان کے سامنے سے جس کسی کافر کا جنازہ نکلتا تھا تو پھر چل نہ سکتا تھا۔ یہ بزرگ چشتی تھے۔ حضرت سیّد احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) کے کوئی اُوپر کے اجداد سے حضرت سلطان الطائفہ جنید بغدادیؒ قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے ان کو حضرت نے دعا دی تھی کہ تمہاری نسل میں بکثرت اولیاء اللہ ہوں گے اور ہمیشہ ایک قطب ہوا کرے گا (نوٹ) توختہ ترکی لفظ ہے اس کے معنے[۱] بہت دیر تک کھڑا رہنا

ہے۔ آپ کے پیر و مرشد نے آپ کو اندر حجرہ میں بُلایا اور بہ ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے۔ آپ جب حجرہ میں جانے لگے تو حجرہ اندر سے بند پایا۔ آپ اس کی دہلیز پر کھڑے ہو گئے اور رات بھر کھڑے رہے۔ علی الصباح جب شیخ نے حجرہ کھولا تو آپ کو کھڑا دیکھ کر نوختہ کا لقب عنایت فرمایا اور تمثال رسول کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے ہم عصر کسی بزرگ نے واقعہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اس زمانہ میں حضور کی اولاد میں کوئی حضور کی شبیہ موجود ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سیّد احمد نوختہ کی زیارت کرو وہ میرا شبیہ ہے اس کو دیکھا تو گویا مجھ کو دیکھا اسی لئے آپ تمثال رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملقب ہوئے۔

حضرت مخدوم سیّد نور الحق چشتی ٹانڈوی قدس اللہ سرہٗ العزیز حضرت سیّد احمد نوختہ تمثال رسول صلی اللہ علیہ وسلم (قدس اللہ سرہٗ) کی اولاد سے تھے اور وہ سیّد محمد مدنی، المعروف بہ سیّد ناصر ترمذی کی اولاد سے تھے اور وہ حضرت سیّد حسین اصغر بن حضرت امام علی زین العابدین ابن شہید کربلا حضرت امام حسین علی جدہ و علیہم السّلام کی اولاد سے تھے متفق علیہ نسابین ہے (عمدۃ الطالب، بنبع الانساب کنز الانساب، ائمۃ الہدیٰ، تاریخ آئینہ اودھ)

شاہ ولایت احمد صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں بڑی محنت اور تحقیق سے جو حالات شجرۂ نسبی حضرت شیخ الاسلام دریافت ہوئے وہ پیش کئے جاتے ہیں۔ افسوس کہ سیّد شاہ زید بن سیّد شاہ احمد زاہد کے نیچے کا سلسلہ نہ دریافت ہو سکا۔ اور ریز و میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ سلسلہ طریقت میں حضرت مخدوم سیّد شاہ نور الحق چشتی ٹانڈوی قدس اللہ سرہٗ العزیز اور حضرت شاہ نور الحق بن شاہ نصیر الحق قلندر قدس اللہ سرہٗ العزیز دونوں نور حضرت شاہ داؤد چشتی قلندر قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مرید و خلیفہ تھے۔ دوسرے بزرگ ۹۶۳ھ میں فوت ہوئے مزار سرہر پور میں ہے۔ مگر شاہ داؤد کا سنہ وفات نہیں ملا۔ مگر اُن کے پیر و خسر حضرت شاہ قطب الدین بنیا دل قلندر کا سنہ وصال ۹۲۹ھ (اخبار الاخیار) اذکار الابرار ص ۹۲ و ۹۳ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کے جد اعلیٰ میرے حضرات مرشد ان کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کے سلسلہ چشتیہ میں منسلک تھے اور بڑے صاحب کمال بزرگ تھے۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں جبکہ صفی پور اور بانگر مئو میں ہیڈ ماسٹر تھا اور لوگوں سے تذکرہ آتا تھا کہ میں سادات سے ہوں اور میرا خاندان پیرزادوں کا خاندان ہے تو لوگ تصدیق نہیں کرتے تھے کیونکہ اودھ کے شہروں میں ٹانڈہ کے کپڑوں کے بننے والوں (نوربافوں) کی بستی مشہور تھا اور یہاں کے کپڑے واقع میں بہت امتیازی شان رکھتے تھے۔ ٹانڈہ کی آبادی کا بڑا حصہ اسی برادری کا ہے اس لئے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ یہ بھی اسی قوم میں سے ہوں گے۔ مگر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ایک روز بھرے مجمع میں فرمایا "مدرسٹ[1] تو سیّد اور پیر زادے ہیں اُن کے مورث اعلیٰ شاہ نورالحق رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں رات میرے پاس وہ آئے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ میرے بیٹے حبیب اللہ کا خیال رکھو۔ بھئی یہ تو بڑے پیر زادے ہیں"۔ اس کے بعد سے ان کی نظر التفات مجھ پر بہت زیادہ ہوگئی اور لوگوں کے خیالات میرے نسب کے متعلق بدل گئے اور یہ مقالہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور ہوگیا۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے اوائل عمر میں خواب دیکھا تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک بڑے تالاب کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی چرخا کات رہی ہیں اور میں اپنے آپ کو بچّہ پاتا ہوں اور تالاب کے دوسرے کنارے پہ ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میں تالاب میں تیرتا ہوا اُن کی طرف اس طرح جا رہا ہوں جیسے بچّہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے۔ میں خواب ہی میں ان کو ماں سمجھ رہا ہوں اور وہاں پہنچ گیا ہوں۔ ہجرت کرنے کے بعد انھوں نے مدینہ منورہ میں اس کو ذکر کیا اور فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا مطلب تھا۔ میں نے عرض کیا کہ تعبیر تو ظاہر ہے آپ سمندر کے دوسرے کنارے پر تھے ہجرت کر کے مدینہ منورہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچ گئے۔ نسبی سلسلہ میں وہ ماں ہیں ہی۔

نیز ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھ کو نسب نامہ کی تلاش تھی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار جہاد کو جا رہے ہیں اور میں اُن کے پاس کھڑا ہوا ہوں تو مجھ کو فرمایا کہ تو میری اولاد میں سے ہے۔ بہر حال یہ امور اگرچہ قطعی حیثیت سے

---

[1] حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز والد صاحب مرحوم کو "مدرسٹ" فرمایا کرتے تھے (مصنّف)

تعیین نسب پر روشنی نہیں ڈالتے۔ مگر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالتے ہیں۔

ہماری قدیمی رشتہ داریاں ان اطراف میں محفوظ و مشہور سادات خاندانوں میں یا شیوخ کے ان خاندانوں میں چلی آتی ہیں جو کہ نسبی حیثیت سے بہت اوپر کی چوٹی کے شمار کیے جاتے ہیں۔ رشتہ ایسے خاندانوں میں کبھی نہیں کیا جاتا تھا جن کے سلسلہ نسب میں نجیب الطرفین ہونے میں کبھی کوئی داغ لگا ہو۔ حسب عادت قدیمۂ ہند خاندانوں کی پشتہا پشت کی تحقیقات کی جاتی تھی۔ اگر سلسلہ نسب میں کسی پشت میں کسی عورت یا مرد میں کوئی کمی نسبی معلوم ہو جاتی تھی تو رشتہ نہیں کیا جاتا تھا (حالانکہ یہ بالکل غلط طریقہ ہے) سلسلہ نسب آباء اور ذکور سے ہوتا ہے۔ اناث کو اس میں دخل نہیں۔

حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ حضرت شہر بانو رحمۃ اللہ علیہا شاہان فارس کی اولاد میں سے تھے جو اسیر ہو کر آئی تھیں سادات حسینہ سب انہیں کی اولاد ہیں۔ اسی طرح اور آئمہ سادات میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ شیوخ صدیقیہ اور فاروقیہ وغیرہ میں بھی یہ بات ملتی ہے۔ خود حضرت اسماعیل علیہ السّلام جن سے تمام سلاسل عربیہ کا انتساب ہے حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے ہیں جن کے متعلق مشہور یہی ہے کہ وہ باندی تھیں۔ شرفاء اور سادات حجاز جن کو اپنے نسب پر بڑا غرور اور گھمنڈ ہمیشہ رہا ہے اور شاہان ترک اُن کا بے حد احترام کرتے رہے ہیں ان میں بہت سے نفوس باندیوں کے بطن سے ہیں۔ یہ چیز ہندوستانی شرفاء کی غلط ہے اور غالباً ہندوؤں کے پڑوس سے پیدا ہوئی ہے، ہندوستان میں جو مسلمان باہر سے آئے ہیں عموماً باہر سے عورتیں اپنے ساتھ نہیں لائے۔ یہاں ہی نکاح یا ملک یمین کے ذریعہ سے سلسلہ تناسل جاری کیا۔ پھر بعد میں ایسے تقیدات کہاں تک صحیح کیے جاسکتے ہیں۔

قدیمی زمانہ سے ہماری ان سادات یا شیوخ میں بھی رشتہ داری چلی آتی ہے جو کہ شیعہ مذہب رکھتے ہیں اور یہ مرض اودھ کی شیعی حکومت کی وجہ سے تمام یوپی اور بالخصوص اودھ میں بہت زیادہ پھیلا اور اگر اس زمانہ میں چند اکابر اولیاء اللہ خاندان میں نہ ہوتے تو غالباً ہمارا خاندان بھی اس لعنت سے محفوظ نہ رہ سکتا تاہم آخر میں بغیر اس کے چارہ نہ ہو سکا کہ نانا حسن علی شاہ صاحب مرحوم نے (جو کہ اپنے زمانہ میں تمام خاندانی جائداد کے متولی اور منصرف تھے) ایک امام باڑہ بنایا اور چھ محرم کی شب کو مہندی نکالنا اور بڑے تزک اور احتشام سے تمام شہر میں روشنی اور باجوں کے ساتھ گشت کرانا جاری کر دیا۔ جس کا بقیہ اب تک چلا جا رہا ہے۔

خاندان کے ہر گھرانے میں تعزیہ رکھنا جاری ہوا جو کہ ہمارے بچپن تک چلتا رہا۔ الحمد للہ کہ آہستہ آہستہ یہ مصیبت تمام خاندان سے اُٹھ گئی۔ مگر مہندی کی لعنت اب تک مرتفع نہ ہوئی نیز شیعوں سے رشتہ داری بھی تقریباً بند ہو گئی اگرچہ قدرے قلیل اب بھی باقی ہے۔

نسبی تفاخر اور غرور یقیناً نہایت قبیح مرض ہے جس کے ازالہ کے لئے اسلام نے انتہائی جدوجہد کی ہے بارگاہِ خداوندی میں عملی جدوجہد کی ہی پوچھ ہے۔ نسب بغیر عمل صالح اور بغیر اخلاق کاملہ اور عقائد صادقہ کوئی وقعت نہیں رکھتا اسلام کے نصب العین میں حضرت بلالؓ اور حضرت سلمان اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہم کو جو بلندی اور رفعت حاصل ہوئی ابولہب اور ابوجہل اُمیّہ اور ولید کے انساب عالیہ نے اس کا کروڑواں حصّہ بھی حاصل نہ ہونے دیا۔ ان سرداران قریش کے غرور نے ان کو دوزخ کا کندہ بنا کر چھوڑا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ باوجود بعد نسبی اپنے اخلاص اور سچی قربانیوں کی بناء پر خلیفہ اوّل اور صدیق اکبر بن کر حضرت خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ مگر حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو باوجود قرب نسبی یہ شرافت حاصل نہ ہوئی۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء افسوس کہ مسلمانان ہند میں ابتک یہ چھوٹا غرور اور غلط گھمنڈ چلا جاتا ہے جس کو اذہان و قلوب سے بالکل ہی چلا جانا چاہیئے تھا۔ حضرت قطب العارفین سیّد احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ صراط مستقیم میں فرماتے ہیں۔

> از جملہ بقایائے رسوم جاہلیت کہ دریں اُمّت مرحومہ کمال انتشار وغایت شہرت یافتہ و ارباب خاندان عالی مثل سادات و پیرزادہا دراں گرفتار اند افتخار بمکارم آباؤ مناقب اجداد است و اعتماد بر شفاعت ایشاں حتیٰ کہ بسبب ہمیں افتخار و اعتماد تواضع و انکسار راکہ شعار اہل اسلام است و تقویٰ و صلاح راکہ افضل مناقب اہل ایمان است نسیاً منسیاً ساختہ و بجائے آں تکبر و تبختر و جرائت بر اظہار بدعات و ارتکاب منکرات حاصل نمودہ کلام اللہ و کلام رسول راپس پشت خود انداختہ اند گویا کہ آیتہ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمٰن ورضی لہ قولا ہا لا تجری نفس عن نفس شیئا الاٰیتہ فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم الاٰیۃ یا یھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی وجعلنکم شعوبا

وتبا ئل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم الآیۃ تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم الآیۃ وحدیث ان اللہ قد اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء انما ھو مومن تقی او فاجر شقی الناس کلھم بنو آدم وآدم من تراب الحدیث
وامثال آنرا بگوش ہوش خود گاہے نشنیدہ ذبجرد اوہام وظنون خود بہ مسلمات ومشہورات باطلہ ورا امثال خود تمسک نمودہ در ورطۂ ہلاکت جان خود را انداختہ سبحان اللہ زہے سفاہت وچہے حماقت کہ اسباب نجات راکہ بالیقین وبالقطع موجب نجات وباعث رفع درجات اند ترک کردہ باسباب وہمیہ وظیفہ متمسک شدند۔ حال سفاہت مآئی ایں جہال بداں می ماند کہ شخصے اموال خطیرہ خود را کہ در قبضۂ خود میداشت وانتفاع بآں قطعی ویقینی می انگاشت در تحصیل حیل اکسیریہ واعمال دست غیب کہ حصول آں محض موہوم است برباد دہد۔ القصہ اگر ایں علائق نسبیہ باکابر از امور نافعہ معاد است پس پر ظاہر است کہ غفلت ازاں وعدم اعتنا بآں ہیچ درجہ خلال در نفع آں نمی کند۔ چہ علائق نسبیہ از جنس افعال اختیاریہ نیست تا بسبب غفلت وعدم اعتنا برہم شود پس وقتیکہ شخصے غافل را از علائق نسبیہ خود در معاد نفعے حاصل خواہد شد البتہ اورا بسبب حصول آں نعمت غیر مترقبہ سرور وابتہاج دو بالا بدست خواہد آمد مثل حصول فرحت بسبب بدست آمدن مالے از میراث آبائی خود باوجودیکہ ایں وارث ازاں غافل بود۔ واگر ایں امر در معاد کارآمدنی نیست وایں شخص تمام عمر خود را در امید حصول منفعتے ازاں امر گزرانیدہ باشد پس البتہ ندامتے وخجالتے بسبب جہل مرکب خواہد کشید وبانواع آلام نفسانیہ وتعذیبات روحانیہ گرفتار خواہد گردید۔
پس عدم اعتنا بایں علائق نسبیہ وعدم اعتماد برامثال ایں امور وہمیہ بہر تقدیر احسن واصوب است والسلام۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ سادات میں سے ہیں۔ بہت بڑے پیرزادہ ہیں، اور نیز رائے بریلی کے چوٹی کے مشہور ومعروف خاندان سے وابستہ ہیں۔ اُن کے اسلاف ایسں بہت بڑے بڑے اولیاء اللہ گزرے ہیں۔ مگر مذکورہ بالا الفاظ میں کس مؤثر پیرایہ میں اس نسبی افتخار کی شناعت بیان فرماتے ہیں۔ سخت ضرورت ہے کہ اس خیال خام کو دماغ سے نکال دیا جائے اور اپنے اعمال واخلاق وعقائد کو درست کیا جائے: تاکہ کمالات اور

قربِ خداوندی کی وہ بے بہا نعمتیں حاصل ہوں جن سے نہ صرف نجات حاصل ہوسکے بلکہ تمام خاندان کے لئے دینی اور دنیوی عزّت اور افتخار کی شرافت ملے اور پروردگار عالم اپنی رضا اور خوشنودی سے نوازے۔ نسبوں پر فخر کرنیوالے نہ صرف عملی میدان میں کسل مند اور لنگڑے ہوتے ہیں بلکہ اُن کے اخلاق اور عقائد بھی بگڑ جاتے ہیں۔ جہالت اور بے کمالی کا بھوت دنیا پرستی اور نفس پروری کا شیطان اُن پر سوار ہو جاتا ہے بیہودہ اور غلط اوہام کے اس قدر متوالے ہو جاتے ہیں کہ تمام مسلمانوں حتیٰ کہ اہل علم و تقوی کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں ناشائستہ کلمات اور رنجیدہ افعال و معاملات سے دوسروں کا سامنا کرتے ہیں۔ جو لوگ نسبی حیثیت کچھ کم یا گرے ہوئے ہوتے ہیں خواہ کتنے ہی متقی یا عالم اور پرہیزگار ہوں اُن کی توہین و تذلیل میں انتہائی دلیری عمل میں لاتے رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ امر اسلامی تعلیمات اور اسلاف کرام کے طریقوں کے بالکل خلاف ہے۔ احادیث میں مسلمان کو دوسرے مسلمان کی تحقیر کرنے سے سختی سے روکا گیا ہے اور اس کی عظمت اور ہمدردی کا ترو رداً حکم وارد ہوا ہے۔ اہل تصوّف تو اس بارہ میں بہت پیش پیش ہیں۔ حضرت سیّد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ صراطِ مستقیم میں فرماتے ہیں۔

حالات و مقامات و فضائل کہ مندرج ایں رسالہ است ہر کہ متصف بآں شود یا صرف بدریافت علمی آں بہرہ مند شود او را لازم است کہ در تعظیم و تکریم عاطلین و غافلین ایں امور کوتاہی نکند حسب حال ہر یک حق تعظیم ادا نماید چہ ہر مسلم از گفتن نام پاک حق جل شانہٗ مقصر نیست پس او لاً تعظیمش بجہت تعظیم ایں نام پاک مے باید ایں نام پاک اسم جلیل القدر است کہ بمقابلہ آں ہیچ چیز نمی سنجد و ادراک بکنہ کمال آں نمی رسد، و اجر و ثوابش را پایان نیست۔ و ثانیاً حال آغاز و انجام خود را ملاحظہ کردہ از رذیلہ تکبر متبری شدہ حفظ جناح نماید چہ ہر کس در بدو خلقت لا یعقل محض و ناکارہ بحت بود و انجام خود ہیچ کس را معلوم نیست کہ چہ خواہد شد۔ و ثالثاً بلحاظ عموم رحمت و قدرت حضرت حق جل شانہٗ از رحمت و قدرت او ہیچ بعید نیست کہ در یک لمحہ انسان را برتبہ قطب الاقطاب رساند اگر مومن باشد یا کافر را در یک لمحہ فائز بہ نعمت

ایمان فرماید وہمان وقت او را بہ نعمت قطبیت بنوازد۔ رحمت و انعام او موقوف بر محنت و استعداد نیست بلکہ محنت و استعداد ہم از انعام عام او ست اگر احدے را بہ مرور دہور و بعد محن شدیدہ نعمتے عطا شدہ نہ پندارد کہ عطائے الٰہی بدوں ایں قسم محن ممکن نیست جائز است کہ بہزار درجہ بہتر ازاں در یک لمحہ عطا فرماید"

حضرت شہیدؒ کا یہ ارشاد ان لوگوں کے لئے ہے جو کہ مقامات سلوک طے کر کے تصوّف اور روحانیت میں درجہ کمال کو پہنچ چکے ہیں یا علمی کمالات میں بڑا درجہ حاصل کر چکے ہیں ایسے باکمال اشخاص کے لئے بھی جبکہ یہ حکم ہے کہ عام مسلمانوں کی تعظیم اور تکریم میں کوتاہی روا نہ رکھیں اور حسب مرتبہ و درجہ ہر ایک کے ساتھ ادب کا معاملہ جاری کریں کیونکہ (الف) کوئی مسلمان کم از کم لفظ اللہ اپنی زبان سے نکالنے میں کوتاہی نہیں کرتا خواہ ایک ہی دو مرتبہ ہو اور یہ لفظ نہایت ہی بڑا مرتبہ رکھتا ہے اور اس کا اجر و ثواب بے حد و بے پایاں ہے اس لفظ پاک کی وجہ سے کہنے والے میں بھی بڑائی اور عظمت آجاتی ہے (ب) ابتداء میں ہر شخص خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو نطفہ (منی کا قطرہ) پھر علقہ (خون کا جما ہوا قطرہ) پھر مضغہ (گوشت کا ٹکڑا) پھر بے جان انسانی ڈھانچہ پھر جان دار ایسا ڈھانچہ تھا کہ اس میں کچھ سمجھ نہ تھی اور چلنے پھرنے بولنے وغیرہ تمام ضروریات زندگی اور اسباب شرف و عزّت سے عاجز اور بے کار تھا۔ اور ان تمام باتوں میں تمام انسان برابر ہیں۔ ہر انسان کو اپنی تمام ابتدائی حالتوں کو سوچنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ ان حالتوں کے ہوتے ہوئے ہمارے لئے فخر و تکبّر اور دوسروں کی حقارت کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں (ج) انسان کو اپنا انجام سوچنا چاہیئے روحانی حیثیّت سے خاتمہ ایک عظیم الشان امر ہے جس پر تمام زندگانی اور اُس کے اعمال و اخلاق اور عزّت و شرافت وغیرہ کا مدار ہے اگر خاتمہ بہتر ہُوا تو دنیاوی تمام عمر شرافت اور عزّت والی ہے اور تمام اعمال سوارت ہیں اور اگر خدا نخواستہ خاتمہ خراب ہوا تو اعمال اکارت ہوگئے اور شرافت نسبی تو درکنار شرافت انسانی بھی مِٹ گئی۔ اور اسفل السافلین میں داخل ہو کر کتّے اور سُور وغیرہ ذلیل ترحیوانات سے بھی گر گیا اور دوزخ کا کُندہ بن گیا۔ مگر اس خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ کیسا ہوگا۔ کہیں خدا نخواستہ اس مغرور اور گھمنڈی انسان شریف النسب کا خاتمہ بُرا نہ ہوجائے اور وہ

چوپایوں سے بھی بدتر ہوجائے اور کہیں اس شخص کا خاتمہ جس کو یہ رذیل اور ذلیل کہتا تھا بفضلہٖ تعالیٰ اعلیٰ اور احسن ہوجائے اور وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین اور اصحاب نجات میں سے ہوجائے اور جسمانی حیثیت سے بھی مرنے کے قریب جبکہ ہوش و حواس اور عقل و قوت میں فرق آگیا تو کوئی شرف باقی نہ رہا ومنکم من یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئا۔ اور روح نکلنے کے بعد تو جسم انسانی خواہ شریف کا ہو یا رذیل کا بادشاہ کا ہو یا فقیر کا، قوی کا ہو یا ضعیف کا جس حالت پر پہنچ جاتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ جماد محض ہو کر پھولتا پھٹتا ہے۔ سڑتا گلتا ہے۔ کیڑے پڑتے ہیں بدبو سخت پیدا ہوتی ہے پیپ اور لہو بہتا ہے اور زمین میں مل کر مٹی ہوجاتا ہے۔ یہاں نہ شرافت نسبی کچھ کام کرتی ہے نہ دولت و ثروت نہ حکومت و قوت۔ (د) رحمت اور انعام خداوندی کی بے نیازی اور وسعت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ دم کی دم میں ذرہ کو پہاڑ اور قطرہ کو سمندر بنا دے تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ عامی مسلمان کو قطب الاقطاب بنا دے جاہل کو عالم اور دیوانہ کو افلاطون کردے تو کچھ مستبعد نہیں۔ ایک چرواہا جاہل امسیت کردیا واصبحت عربیا عالما کا نعرہ لگانے لگے تو کیا بعید ہے ایک اسّی برس کے آتش پرست اور بتوں کے پجاری کو نعمت ایمان عطا کر کے قطب زماں اور غوث دوراں بنا دے تو کچھ دور نہیں۔ ناقابل کو قابل بنانا اور نااہل کو اہل کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ؎

دادِ حق را قابلیّت شرط نیست ❊ بلکہ شرط قابلیّت داد ہست

خلاصہ یہ کہ فخر بالانساب جو کہ مسلمانوں میں ہر جگہ اور بالخصوص ہندوستان میں اور بالاخص سادات اور پیرزادوں اور شیوخ میں پایا جاتا ہے نہایت جھوٹا تکبر اور بہت سی خرابیوں کا باعث ہے۔ باوجودیکہ اسلام نے اس کی جڑ کھود ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی مگر بدقسمتی سے اس کا قلع قمع نہیں ہوا۔ بلکہ ہندوستان میں آکر برادران وطن کی دیکھا دیکھی اور بڑھ گیا۔ حقیقی کمال علم و عمل، عمدہ اخلاق اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی میں ہی ہے۔ جس کی بناء پر اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کو شرف امتیاز اپنے ہمعصروں اور اخلاف پر حاصل ہوا تھا۔ ان کی اولاد اور احفاد کو بھی اگر اسلاف کا اتباع اور ویسے اعمال و اخلاق وغیرہ حاصل ہوں تو وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کو خلف صدق اور

سپوت کہا جاسکے ورنہ مثل پسر حضرت نوح علیہ السلام ناخلف اور کپوت ہی شمار ہونگے ایسے ناخلفوں اور بدکرداروں کو چاہیئے تھا کہ ہمیشہ خائف رہیں کہ کہیں خدا کا غضب اور قہر بداعمالیوں کی وجہ سے اسلاف کرام سے سلسلہ نسب اور اس کی شرافت منقطع کرتا ہوا پسر حضرت نوح (علیہ السلام) کی طرح انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح کا اعلان نہ کردے اور اسلاف کرام کی برکتوں سے محرومیت کا عذاب الیم نہ چکھا دے اُلٹے یہ لوگ کبر اور غرور بلکہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل توہین و تحمیق میں منہمک ہوگئے ہیں ان لوگوں کی ایسی حرکات ناشائستہ کیوجہ سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ غریب مسلمانوں اور پیشہ ور مسلم برادریوں اور نو مسلم خاندانوں کے دل اور دماغ پر سنگین اور دلخراش ٹھیس لگتی ہے بلکہ اشاعت اسلام اور اس کی ہمہ گیری میں بھی فرق پڑتا ہے۔ اسلامی اصول اور اس کا تفوق چکنا چور ہوتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے حجاب بنتے ہیں۔ اُمت مرحومہ کی زیادتی میں روڑے اٹکتے ہیں جس کی اسلامی تعلیمات میں انتہائی ممانعتیں وارد ہیں۔ والعیاذ باللہ۔

انہیں وجوہ سے مجھ کو بہت ڈر لگتا ہے اور شرم معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ اعمال و اخلاق اور اس کم مائگی پر سیّد یا پیرزادہ اپنے کو کہوں یا لکھوں اور اپنے اس نسب پر فخر کروں۔ مگر اس میں بھی چوں کہ شک نہیں ہے کہ غیر اختیاری نعماء الٰہیہ میں سے یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے یعنی جیسے کہ انسان کا پیدا ہونا تمام اعضا کا صحیح و سالم ہونا، خوبصورتی اور اعضاء کا تناسب، ذکاوت اور حافظہ وغیرہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ہیں جن میں بندہ کے اختیار اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے اور ان پر بندہ کو ہمیشہ شکر گذار رہنا چاہیئے اور تحدث بالنّعمۃ کرنا اور دل میں سوچنا اور اللہ تعالیٰ کو شکر گذاری سے خوش کرنا چاہیئے۔ اسی طرح یہ شرافت نسبی بھی ایک غیر اختیاری نعمت اور عطیہ خداوندی ہے اس پر شکر گذاری کرنا اور حسب ارشاد واما بنعمۃ ربک فحدث۔ تحدیث کرنا ضروری ہے اس لئے اس مقام پر رسالہ ہذا میں یہ ذکر کیا گیا۔

حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ صراط مستقیم میں فرماتے ہیں۔

فائدہ باید دانست کہ در جوہر اولاد کرما استعدادے مکنون بطریق میراث از آبائے کرام

ایشاں ودیعت می نہند لیکن آں محض استعداد در ہیچ یکے از امور معاشیہ ومعادیہ کار آمدنی نیست۔ آرے اگر ہماں استعداد بر روئے کار آید و بسبب تعلیم وتعلم وتشرع وتدین جلوہ گر شود البتہ مظہر امور عظیمہ ومصدر منافع جلیلہ خواہد شد۔ ایں استعدادات مکنونہ را بنا بہ استعداد ارث از لیہ کہ نصیبہ ہر شخص در ازل الآزال استعدادے از استعدادات صالحہ یا فاسدہ گردیدہ باید فہمید امابنائے مجازات بر محض آں استعدادات نیست لہٰذا مادامیکہ آثار آں استعداد بر منصہ ظہور نہ رسد در کارخانہ مجازات ہیچ اعتداد بآں استعداد نہ۔ آرے ایں قدر یقینی است کہ بسبب مصادفت اسباب ہدایت وضلالت آثار صلاح وفساد فراخور استعداد ظہور می نماید پس ترتب ثمرات بالفعل بر آثار است اگرچہ ارتباطے اخفی باستعدادات ہم میدارد ولیکن ارتباط ثمرات باستعدادات بس خفی وکثیر التخلف است وبآثار بس ظاہر وقلیل التخلف مثلاً منافع حرب بالآلات آں ارتباط ظاہر میدارد وبجوہر حدید ارتباطی خفی۔ لہٰذا شمشیر پولادی زنگ خوردہ آں کار نمی کند کہ شمشیر مصقل از آہن خام۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل کمال کی اولاد میں ایسے جوہر قدرۃً رکھتی ہے کہ اگر ان جواہر اور رقابلیتوں کو کام میں لایا جائے تو بڑی سے بڑی کامیابیوں اور جلد سے جلد منزل مقصود پر پہنچنے کی نوبت آئے اور اگر ان استعدادوں اور قابلیتوں کو کام میں نہ لایا جائے تو جس طرح وہ ہاتھ اور وہ پیر بالکل بیکار ہو کر رہ جاتا ہے جس کو پکڑنے اور چلنے سے معطل کر دیا گیا ہو اور جس طرح سے فولادی تلوار زنگ کی وجہ سے آہستہ آہستہ فنا ہو جاتی ہے اسی طرح ان ارباب کمال کی اولاد بھی بے علمی اور بدعملی کی وجہ سے نہ صرف کمال سے محروم رہ جاتی ہے بلکہ بسا اوقات شرف انسانیت سے بھی محروم ہو جاتی ہے اس لئے شریف خاندانوں کا فرض اکمل یہ تھا کہ وہ میدان علم وعمل میں بہت زیادہ جد وجہد کریں تاکہ ان کا ذاتی جوہر زنگ کھا کر فنا نہ ہو جائے اور ان کو حسب وعدۂ یقینی وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا اپنے اسلاف کرام کی ہمرکابی اور ہم مکانی نصیب ہو اور یہ اتباع اسلاف باوجود قلت عمل اسلاف کے درجات عالیہ تک پہنچانے کا ذریعہ

بن سکے۔ واللہ ولی التوفیق۔

ذریعہ معاش خاندان

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت خاندان کے پاس تیرہ یا چودہ گانوں تھے جن کی وجہ سے مشترکہ خاندان نہایت ثروت اور رفاہیت سے گذران کرتا تھا۔ مشہور ہے کہ تخت دہلی سے کسی زمانہ میں بہتّر دیہات کی جاگیران اطراف میں تین خاندانوں پر تقسیم ہوئی تھی جن میں سے ایک الہداد پور کا ہمارا خاندان بھی تھا جس کو چوبیس گانوں دیئے گئے تھے۔ چوں کہ کاغذات ضائع ہو گئے اس لیئے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ عطیہ کس بادشاہ کے وقت میں ہُوا تھا اور کس وجہ سے ہوا تھا۔ والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ بادشاہ دہلی کے یہاں پرچہ گذرنے پر مصارف خانقاہ کے لئے یہ دیہات دیئے گئے تھے (واللہ اعلم)

۱۸۵۷ء میں خانقاہ وغیرہ کے کوئی آثار باقی نہ تھے۔ اور ان میں مالکانہ تصرفات اہل خاندان کے جاری تھے اور اس سے پہلے گیارہ گانوں غیر معلوم انقلابات اور اسباب کی بناء پر قبضہ و اقتدار سے نکل چکے تھے۔ انگریزی حکومت کے زمانہ میں جو قدر و منزلت زمینوں اور جائدادوں کی بڑھ گئی ہے وہ بلکہ اس کا عشر عشیر بھی زمانۂ سابق میں نہ تھا معمولی ضرورتوں میں زمینوں کو فروخت کر دینا رہن رکھ دینا بلکہ دوسروں کو بخشدینا معمولی، خدمتوں کے صلہ میں گانوں کا گانوں ہبہ کر دینا وغیرہ وغیرہ مسلمانوں اور بالخصوص مسلم رؤسا کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ غرضیکہ انہیں وجوہ کی بناء پر صرف تیرہ گانوں باقی رہ گئے تھے۔ الہداد پور، جبرادن پور، چاند پور، گوبھرون پور، مہری پور، فرید پور، رسول پور بھکنا پور وغیرہ۔

اس زمانہ میں انتظام زمینداری اکبر علی صاحب مرحوم میرے حقیقی نانا کے ہاتھ تھا، ۱۸۵۷ء کے آخری ایام میں جبکہ وہ ضلع بستی کے بعض دیہات سے واپس ہوتے ہوئے دریائے گھاگھرا کو کشتی میں عبور کر رہے تھے اور متعلقین کو دوسری کشتی میں اس سے پہلے بھیج چکے تھے آندھی چلی اور کشتی منجدھار میں اُلٹ گئی تو وہ اس حالت کو دیکھ کر تلوار لیکر دریا میں کُود پڑے۔ تیر کر دریا کو پار کرنا چاہا مگر پانی زور پر تھا اسلیئے ڈوب گئے۔ اسکے بعد ہر قسم کی کوشش بچانے کی کی گئی مگر ڈوبنے سے بچنا تو درکنار لاش تک کا پتہ نہ چلا۔ مرحوم سے بعض بیٹھی کے اجہ سے عداوت اور سخت دشمنی تھی اس نے موقع پاکر مکان پر حملہ کر دیا اور چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اس کا مطالبہ یہ تھا کہ اکبر علی صاحب مرحوم کے لڑکوں کا سر لوں گا۔ مرحوم کے تین لڑکے، تصدق حسین، تفضل حسین، عبدالغفور اور لڑکی (والدہ ماجدہ مرحومہ) یہ بچے نوعمر تھے۔ چونکہ اُس وقت امن کامل طور پر نہ ہوا تھا اور نہ گانوں میں اتفاقاتِ وقت سے کوئی بااثر قوی ہستی جو کہ راجہ اور اس کے سپاہیوں کا مقابلہ کرتی موجود نہ تھی عورتوں نے یہ احساس کرکے کہ مبادا یہ دشمن بچوں کو قتل نہ کر دے۔ رات میں خادمات کا بھیس بدل کر بچوں کو لے کر شہر ٹانڈہ محلہ قصبہ میں جو کہ گانوں سے بہت قریب تھا چلی گئیں۔ وہاں، قرابت داری پہلے سے تھی۔ شہر میں راجہ کا حملہ کرنا ممکن نہ تھا۔ جب راجہ کو گھر خالی معلوم ہوا تو تمام اسباب اور سامان لوٹ لیا۔ ایک مہینہ تک گاڑیوں میں لُوٹ کا مال منتقل کرتا رہا اور اُن دیہات پر قبضہ کر لیا جو کہ زیرِ تصرف تھے۔ صرف دو گاؤں جڑ دان پور اور الہداد پور اس کے قبضہ سے محفوظ رہ گئے۔ انہیں دو میں مختلف ورثاء خاندان کے حصے ہوئے۔ بڑے ہو کر ہمارے ماموں صاحبان نے ان دیہاتوں کے لئے دیوانی میں دعوے دائر کئے مگر قلت سرمایہ اور دیوانی کے مصارف کی کثرت کی وجہ سے ایک مالدار زمیندار راجہ بھیٹی کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بلکہ بقیہ زمینداری سے بھی ہاتھ دھونا پڑا کیونکہ مصارف مقدمہ کے لئے اپنے حصوں کو مہاجنوں کے یہاں رہن کر چکے تھے اور امید رکھتے تھے کہ کامیاب ہو کر چھڑا لیں گے۔ قرضہ سودی تھا اُس سے خلاصی ناممکن تھی۔ نہایت تنگی اور افلاس سے سب کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ مدار آمدنی پیری مُریدی اور نذرانہ پر رہ گیا۔ ہر دو مذکورہ بالا گاؤں میں دادا مرحوم کا حصہ دو آنے آٹھ پائی تھا۔ فقط سیر کی زمین باقی تھی جس میں ہمارے تایا اشرف علی صاحب مرحوم زراعت کرتے تھے۔

والد صاحب مرحوم کی پیدائش اور تربیت

والد صاحب مرحوم الہداد پور ہی میں ۱۸۵۷ء سے چار پانچ برس پہلے پیدا ہوئے ۱۸۵۷ء میں اُن کو ہوش و حواس تھا اور اس سے پہلے کی رفاہیت اور یہ کہ اُن کے لئے مٹکے لڈوؤں وغیرہ سے بھرے رہتے تھے یاد تھے۔ والد صاحب مرحوم تین بھائی تھے۔ پیر علی، نوازش علی، تیغ علی (رحمہم اللہ تعالےٰ) نوازش علی اور تیغ علی مرحومین لاولد تھے۔ صرف پیر علی مرحوم صاحبِ اولاد ہوئے۔ چونکہ منجھلے دادا تیغ علی مرحوم اور ان کی اہلیہ مرحومہ کو اولاد کا بہت شوق تھا اسلئے جبکہ دادا مرحوم

کے منجھلے بیٹے نجیب اللہ پیدا ہوئے تو انہوں نے اُن کو متبنّیٰ بنایا اور گود لے لیا مگر قضائے الٰہی سے اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ اس کا اثر سب پر بہت ہوا۔ اس کے بعد جب والد صاحب مرحوم پیدا ہوئے تو دادا صاحب مرحوم نے زور دیا کہ اب اس بچہ کو لے لو وہ تامل کرتے تھے مگر اُن کو مجبور کیا گیا بالآخر انہوں نے والد صاحب مرحوم کو لے لیا اور دونوں میاں بیوی مرحومین نے نہایت محبت اور شفقت سے والد صاحب مرحوم کو پالا۔ تقدیر الٰہی نے ایسی پلٹی کھائی کہ ۱۸۵۷ء تک تینوں بھائی (دادا مرحومین) انتقال کر گئے گھر میں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی مربی صاحب اثر باقی نہ رہا۔ زمینداری اور ثروت چھن گئی۔ فلاکت اور ادبار نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ منجھلی دادی مرحومہ نے نہایت تنگدستی کی حالت میں والد صاحب کی پرورش کی۔ میں نے اُن کو بچپن میں دیکھا ہے فرمایا کرتی تھیں کہ میں نے چرخے کا سوت کات کر حبیب اللہ کو پالا ہے۔

والد صاحب مرحوم نے فضل و کرم خداوندی سے ذہن اور حافظہ بہت عمدہ پایا تھا۔ طبیعت نہایت تیز اور مستقیم تھی اس یتیمی اور افلاس کی حالت میں ٹانڈہ میں علمی درس گاہوں میں پہنچتے رہے اور قرآن شریف فارسی اور اسکول اُردو میں مڈل کلاس پاس کر لیا۔ اور عنفوانِ شباب ہی میں ٹانڈہ کے قریب ہی پرائمری اسکول "التفات گنج" میں منشیٰ ۶ روپیہ ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ اس ملازمت کی بنا پر کسی قدر بسر اوقات کی سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ کاش اگر اس زمانہ میں کوئی مربی تکفل کرنے والا ہوتا تو وہ اپنی تعلیم میں بہت بڑی ترقی کر سکتے۔ التفات گنج میں اُن کو بطور خود ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ تنخواہ اور ملازمت میں ترقی بغیر نارمل اسکول پاس کئے نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے اُن کو لکھنؤ جانا پڑا اس زمانہ میں تمام صوبہ میں نارمل اسکول صرف لکھنؤ میں تھا۔ وہاں پہنچ کر طبعی ذکاوت کی بنا پر بہت جلد عمدہ طریقہ پر کامیاب ہوئے اور پاس ہوتے ہی قصبہ صفی پور ضلع اناؤ میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور پھر بانگر مئو میں تبدیل کر دیئے اور وہاں متواتر کئی برس تک مقیم رہے۔ اسی تنگی اور افلاس اور فکرِ معاش کی وجہ سے علوم عربیہ حاصل نہیں کر سکے۔ اگرچہ لوگ اُن کو مولوی کہتے تھے مگر وہ علوم عربیہ سے بالکل ناواقف تھے صرف فارسی، اُردو، ہندی، بھاشا سے واقف تھے اور اسکول میں تدریسی مشغلہ کرتے تھے اس زمانہ میں ایسے لوگ مولوی کہے جاتے تھے۔

نارمل پاس کرنے کے بعد انگریزی بعض احباب کی ترغیب سے شروع کی مگر شروع کرنے کے بعد پہلی ہی شب میں خواب میں دیکھا کہ دونوں ہاتھ پائخانہ سے ملوث ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کو انگریزی سے نفرت ہوگئی اور ملازمت کی کوشش میں کامیاب ہوگئے۔

والد صاحب مرحوم کی شادی

جبکہ والد صاحب مرحوم اٹھارویں سال میں تھے اور انفات گنج پرائمری اسکول میں ملازم تھے منجھلی دادی صاحبہ مرحومہ نے ضروری سمجھا کہ شادی کر دی جائے پہلے گزر چکا ہے کہ نانا اکبر علی صاحب مرحوم جائداد کے متولی ومتصرف تھے۔ اور ۱۸۵۷ء میں دریائے گھاگھرا میں ڈوب گئے تھے۔ تین لڑکے نوعمر اور ایک لڑکی (والدہ صاحبہ مرحومہ) چھوڑ گئے تھے والدہ صاحبہ اُن کی وفات کے وقت چھ مہینہ کی تھیں ان سب بچوں کی تربیت یتیمانہ طریقہ پر نہایت تنگدستی سے ہوئی۔ کیونکہ باقیماندہ زمینداری کی آمدنی بہت کم تھی اور کوئی بڑی عمر والا نہیں تھا۔ نانی صاحبہ مرحومہ بہت منتظم اور تعلیم یافتہ تھیں۔ انہوں نے فارسی اردو وغیرہ بچوں کو حسبِ رواج وقت پڑھائی۔ دادی صاحبہ مرحومہ نے کوششِ بلیغ کی کہ رشتہ خاندان ہی میں ہو جائے چنانچہ وہ کامیاب ہوگئیں اور جبکہ والدہ مرحومہ کی عمر چودہ برس کی تھی شادی ہو گئی۔ سب سے بڑے بھائی محمد صدیق صاحب مرحوم الہداد پور ہی میں ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔

نانی صاحبہ مرحومہ موضع نندرولی علاقہ بیکاپور ضلع فیض آباد کے سادات خاندان میں سے تھیں اُن کے ماموں بہت بڑے کامل ولی اللہ اور صاحب علم تھے انہوں نے نانی صاحبہ کی تربیت فرمائی تھی، علاوہ ہندی اردو لکھنے پڑھنے کے نانی صاحبہ طریقت اور تصوف میں باکمال تھیں۔ کشفِ قبور وغیرہ میں اُن کو مہارتِ تامہ تھی، ریاضت شاقہ اور ذکر و اذکار وغیرہ میں بہت زیادہ جدّوجہد فرمائی تھیں انہوں نے والدہ مرحومہ کو بھی اردو ہندی پڑھائی، ہندی لکھنا بھی سکھایا۔ اور ہندی بھاشا میں ہنس جواہر۔ پدماوت وغیرہ کتابیں بھی پڑھائیں تصوف کا چسکہ بھی پیدا کرادیا جو کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز سے بیعت ہو جانے کے بعد اور بھی زیادہ ہوگیا۔ چنانچہ باوجود کثیر الاولاد ہونے کے وہ ہمیشہ شب خیز اور تہجد گزار رہیں۔ اخیر شب میں اٹھ کر صبح تک ذکر و شغل مناجات وغیرہ میں مشغول رہتی تھیں، ان کا اخیر تک معمول رہا کہ روزانہ دو سو مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ کرتی تھیں۔ امور خانہ داری میں اخیر تک نہایت جفاکش تھیں۔

مدینہ منورہ میں پہنچنے کے بعد عسرت اور تنگدستی کی بناء پر اپنے گھر کا آٹا خود پیسنا پڑتا تھا حالانکہ کبھی ہندوستان میں اس کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مگر اس پیرانہ سالی میں روزانہ ایک طرف خود اور دوسری طرف تینوں بہوؤں میں سے ایک کو باری باری بٹھلا کر آٹا پیسا کرتی تھیں ان کی محبت بھی اولاد سے عاقلانہ تھی اولاد کو تعلیم کے لئے جدا کرنے میں انہوں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا بچوں کی تعلیم و تربیت کا انہیں بہت خیال تھا اور بچپن ہی سے مذہبی جذبات اور اخلاقی اصلاح کی تعلیم و تربیت کا کہانیوں اور چٹکلوں وغیرہ میں خیال رکھا کرتی تھیں۔ مرحومہ کا سلسلہ نسب حسب ذیل ہے۔

بنت اکبر علی بن مخدوم بخش، بن تراب علی بن شاہ مدن (مرحومین) شاہ مدن مرحوم کے تین لڑکے تھے تراب علی، ہدایت اللہ، نور اشرف مرحوم کی اولاد میں والد صاحب مرحوم تھے اور تراب علی مرحوم کی اولاد میں والدہ صاحبہ مرحومہ اور ان کے تین بھائی تصدق حسین، تفضل حسین، عبد الغفور، جن میں سے عبد الغفور مرحوم لاولد فوت ہوئے اور اوّل الذکر ہر دو صاحبوں کی اولاد موجود ہے۔ شاہ مدن صاحب مرحوم کے تیسرے صاحبزادے ہدایت اللہ لاولد فوت ہوئے۔ والدہ صاحبہ مرحومہ ۱۳۲۳ھ میں مدینہ منورہ میں فوت ہو کر بقیع شریف میں مدفون ہوئیں۔ انکے بعد والد صاحب مرحوم نے ضروریات خدمت کی وجہ سے متعدد نکاح کئے مگر وہ راحت حاصل نہ کر سکے جس کی ضرورت اور خواہش تھی والدہ مرحومہ بہت زیادہ صاحبِ نصیب تھیں جب سے شادی ہوئی مال اور اولاد کی ترقی گھر میں ہوتی رہی۔ اگرچہ بعض چھوٹی اولاد نے اُن کے سامنے انتقال کیا مگر جوان اولاد کی جدائی کا صدمہ اور کثرت سے اولاد کے مرنے کا صدمہ اُن کو نہیں پیش آیا۔

والد صاحب مرحوم نے بانگرمئو سے قصداً کم تنخواہ پر تبدیلی کرائی کیونکہ جو کچھ حصہ جائداد کا تھا وہ بھی ضائع ہو رہا تھا۔ تائے صاحب مرحوم اس کو رہن سے نہ واگذاشت کرا سکتے تھے اور نہ متغلب شرکاء کے جور و ستم سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ والد صاحب مرحوم نے ٹانڈہ پہنچ کر بٹو دھن پر قرض لیا اور جائداد مرہونہ کو واگذاشت کیا اور چھ سات برس میں قرض بھی جائداد کی آمدنی سے ادا کر دیا۔ پھر تقسیم حصص کی درخواست دے کر تقسیم کرایا۔ اس طرح تائے صاحب مرحوم اور ان کی اولاد کے لئے بھی بہت آسانیاں ہوگئیں اور خود والد صاحب مرحوم کو بھی زمینداری سے منافع حاصل کرنے کا موقعہ ملا اور بغیر قرض دام کے اولاد کی تقریبیں وغیرہ انجام دے سکے۔

والد صاحب مرحوم کی اولاد

اُن کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئے مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم سب سے بڑے لڑکے تھے۔ ۱۲۸۸ھ میں بمقام الہداد پور پیدا ہوئے اور ۱۳۴۱ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پا کر بقیع شریف میں مدفون ہوئے سان سے اولاد ذکور وانات متعدد ہوئیں۔ نکاح بھی متعدد ہوئے مگر اُن کے بعد صرف ایک لڑکا مولوی وحید احمد مرحوم زندہ رہا جو کہ صاحبِ اولاد ہو کر ٹانڈہ الہداد پور میں متوفی ہوا تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں بفضلہ تعالےٰ سب زندہ ہیں فرید احمد، رشید احمد، سعید احمد سلمہم اللہ تعالےٰ۔ صفیہ عرف (دبیرہ) اور رضیہ سلمہما اللہ تعالےٰ مولانا سید احمد صاحب مرحوم ۱۲۹۳ھ میں بمقام بانگرمئو پیدا ہوئے اور غالباً ۱۳۵۸ھ ماہ شوال میں یا ۱۳۵۹ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور بقیع میں مدفون ہوئے باوجود متعدد نکاحوں اور متعدد اولاد ذکور وانات کے سوائے ایک لڑکی کے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، مرحوم نے مدینہ منورہ میں مدرسہ شرعیہ کی بنیاد ڈالی جس کا نام مدرسۃ العلوم الشرعیہ لیتامیٰ المدینۃ النبویہ رکھا چونکہ حکومتِ وقت نے علوم جدیدہ کے لئے بالخصوص جنگِ عظیم کے بعد متعدد مدارس قائم کر دیئے تھے اور علوم شرعیہ کی طرف سے بہت بے توجہی کر دی تھی۔ ترکی حکومت کے زمانہ میں جس قدر بھی توجہ علوم شرعیہ کی طرف باقی تھی وہ بھی باقی نہیں رکھی گئی تھی اس لئے اہلِ مدینہ منورہ کے بچے نہایت ضائع اور علوم دینیہ سے بالکل بیگانہ ہو رہے تھے اس ضرورت کو محسوس کر کے یہ مدرسہ قائم کیا اور باہمت اہل خیر ہندوستانیوں نے امداد واعانت کی۔ اس لئے اس مدرسہ سے فیض بہت ہوا۔

ہر دو بھائی مرحومین دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ دیوبند جانے سے پہلے اردو مڈل اسکول میں بہت اعلیٰ درجہ میں پاس ہو چکے تھے اور قرآن شریف اور فارسی کی تعلیم والدین مرحومین سے حاصل کر چکے تھے۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کو بارگاہِ رشیدی (قدس اللہ سرہ العزیز) سے خلافت اور اجازت عطا کی گئی تھی اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کئی برس خانقاہ میں مقیم اور شرف خدمت گزاری حاصل کرتے ہوئے ذاکر وشاغل رہے مگر حضرت رحمۃ اللہ سے شرفِ اجازت حاصل نہ ہوا بعد میں حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (رحمۃ اللہ علیہما) نے اجازت عطا فرمائی۔ مدینہ منورہ میں ہر دو صاحب علوم دینیہ کی تدریس بھی کرتے رہے۔

جمیل[۳] احمد مرحوم ذیقعدہ ۱۳۰۲ھ میں الہداد پور میں پیدا ہوئے عربی درسیات کی وسطانی کتابیں پڑھتے تھے کہ والد صاحب مرحوم نے ہجرت کی، مدینہ منورہ میں پہنچ کر ترکی مدرسہ رُشدیہ میں داخل کر دیا چونکہ طبیعت نہایت ذکی تھی اور فنون عربیہ میں اچھی استعداد حاصل کر چکے تھے بہت تھوڑی مُدت میں عمدہ ترقی کی اور ہر درجہ میں سب لڑکوں سے اوّل نمبر رہنے لگے۔ باش صنف کا تمغہ اُن کو دیا گیا اور اساتذہ کی خصوصی توجہ منعطف ہوئی، اور جب مدرسہ رُشدیہ کے سب درجوں کو ختم کر چکے تو حکومت ترکیہ کے مصارف سے تمام جماعت فارغہ کو استنبول بھیجا گیا۔ جن میں باش صنف مرحوم ہی تھے۔ اُس وقت گورنر مدینہ عثمان پاشا تھے اور زمانہ سلطان عبدالحمید خاں کا تھا اس جماعت کے بھیجنے کے وقت عثمان پاشا مرحوم نے خصوصی تزک اور اہتمام کیا اور باب عالی میں بذریعہ تار اطلاع دی سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کے حکم سے مدینہ منورہ کے لڑکے ہونے کی بنا پر استنبول میں ان کا خصوصی استقبال ہوا اور تزک و اہتمام سے جہاز سے اتارے گئے اور پھر خصوصی توجہات کے ساتھ مدرسہ اعدادیہ میں داخل کر دیئے گئے پہلے ہی سال کے امتحان میں مرحوم وہاں بھی تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ میں اوّل نمبر ثابت ہوئے جس کی وجہ سے وہاں کے حکام اور اساتذہ کی بہت زیادہ توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔ مگر تقدیراتِ الٰہیہ نے مساعدت نہیں کی دوسرے سال میں مرضِ دق میں مبتلا ہو گئے۔ کئی مہینے بیمار رہے ہر قسم کا علاج کیا گیا مگر افاقہ نہ ہوا بالآخر مدینہ منورہ واپس آ کر کچھ دنوں بیمار رہ کر نوجوانی کی عمر میں وفات پائی اور مدینہ منورہ میں بقیع شریف میں مدفون ہوئے والد صاحب مرحوم کو اس کا زیادہ صدمہ ہونا طبعی امر تھا۔

محمود[۴] احمد سلمہ اللہ تعالیٰ ۱۳۰۵ھ شوال میں الہداد پور میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کے وقت آٹھ برس کی عمر تھی معمولی اُردو وغیرہ پڑھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں اُن کو بھی ترکی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ جملہ درجات میں کامیابی کے بعد عثمان پاشا مرحوم نے اُن لڑکوں کو جو کہ درجہ علیا میں پاس کر چکے تھے استنبول نہیں بھیجا بلکہ مختلف اداروں میں بطور اُمیدوار داخل کر دیا۔ چنانچہ عزیزم محمود احمد سلمہٗ کو محکمہ قضا میں داخل کر دیا جس میں انہوں نے بہت جلد ترقی کی اور تھوڑے ہی دنوں میں باضابطہ تنخواہ دار صنف اہل تحریر میں ملازم ہو گئے۔ جنگ عظیم کے بعد زمانہ حکومت شریف حسین میں باش کاتب یعنی میر منشی ہو گئے، اور زمانہ حکومت سعودیہ میں جدہ کے قاضی بنا دیئے گئے۔ مگر چونکہ جدہ میں باوجود کئی سال رہنے

کے وہاں کی ہوا موافق نہیں آتی تھی، حکومت سے مدینہ منورہ کی تبدیلی کی درخواست کی مگر کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے استعفا دے کر مدینہ منورہ میں مشاغلِ تجارت اختیار کر لئے جس کی ابتدا انہوں نے ملازمت قضا کے وقت سے شروع کر دی تھی۔ جرمنی سے آبپاشی کی مشینیں منگا کر مدینہ منورہ میں باغوں والوں کو پہنچاتے تھے اور ایک کارخانہ آن کی درستی اور اوزاروں وغیرہ کا بھی کھولا جس میں اُن کو اچھی آمدنی ہوئی چونکہ ایام ملازمت میں حکومت وقت کو ان کی استعداد و قابلیت بہت زیادہ اطمینان بخش ثابت ہوئی تھی اور پبلک کو کسی قسم کی ان سے شکایتیں بھی نہیں ہوئیں۔ اس لئے حکومتِ مدینہ منورہ متعدد مہم محکموں میں ان کا وجود ضروری سمجھتی رہتی ہے۔ اور اُن کو بلا معاوضہ اور بعض میں با معاوضہ ممبر بنا رکھا ہے۔ بحمد للہ کامیابی سے بسر اوقات کر رہے ہیں۔ ایک لڑکا حبیب اللہ جوان اور چند لڑکیاں ہیں۔ حبیب اللہ موصوف ہی اس وقت مدرسہ شرعیہ کا مہتمم اور بانی ہے۔

والد صاحب مرحوم کے تین لڑکیاں ہوئیں، ایک لڑکی زینب ۱۲۹۹ھ ہجری میں دیوبند میں پیدا ہوئی اور تین چار برس زندہ رہ کر وفات پا گئی۔ دوسری لڑکی نسیم زہرا ۱۳۱۱ھ ہجری میں پیدا ہوئی اور وہ بھی سال ڈیڑھ سال کی ہو کر وفات پا گئی۔ تیسری لڑکی ریاض فاطمہ مرحومہ ۱۳۰۵ھ یا ۱۳۰۶ھ میں پیدا ہوئی اور ۱۳۳۰ھ میں ایک بچی چھوڑ کر مدینہ منورہ میں توفی ہوئی اس کی بچی بھی کچھ دنوں کے بعد وہاں ہی وفات پا گئی۔ دونوں بقیع شریف میں مدفون ہوئے۔

والد صاحب مرحوم کی زندگی میں مدینہ منورہ میں ان کے خاندان سے تقریباً تینتیس ۳۳ یا پینتیس ۳۵ نفوس مرے اور وہیں مدفون ہوئے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

والد صاحب مرحوم کی تعمیرات ہندوستان میں

جدّی مکان میں تائے صاحب کی کثرتِ اولاد اور پھر والد صاحب کی کثرتِ اولاد وغیرہ کی وجہ سے نیز دوسرے رشتہ داروں کی شراکت کی وجہ سے بھی ضروری معلوم ہوا تھا کہ مستقل مکان بنوائیں چنانچہ بزمانہ قیام بانگرمئو مکان کی بنیاد رکھی اور تنخواہ کا بڑا حصہ اس میں صرف کرتے رہے اور اپنے آپ نہایت تنگی سے بسر کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مہینوں صرف چنوں کے چبا لینے پر وقت گزارا بحمد للہ مستقل مکان وسیع اور راحت پہنچانے والا بنوا لیا۔ اگرچہ خام اور کھپریل ہی کا

تھا مگر وسیع اور بہت کارآمد تھا۔ ٹانڈہ پہنچنے کے بعد اس میں اور بھی وسعت کر لی گئی۔

والد صاحب مرحوم کی ہجرت مدینہ

ٹانڈہ کے قیام میں حُسن انتظام کی بنا پر زمین بھی رہن سے خلاص کرالی گئی تھی اور تقسیم بھی مشترک حصہ داروں سے کرالی گئی تھی اور اطمینان سے آمدنی بھی جائداد کی جاری ہوگئی تھی۔ اور بغیر مقروض ہوئے اولاد کی تقریبیں، عقیقے، ختنے، شادیاں انجام پاتی رہیں۔ واقعہ یہی ہے کہ والدین مرحومین کا حُسنِ انتظام ہی تھا کہ اس تھوڑی تنخواہ میں اور معمولی زمین میں وہ سپید پوشی کے ساتھ کثیرالاولاد گھرانہ کا روزمرّہ کا خرچ، تعلیمی اخراجات، تقریبیں پوری کرتے رہے حالانکہ کسی قسم کی بیرونی آمدنی نہ تھی۔ اوّل تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو بیرونی آمدنی کا موقع ہی نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ والد صاحب مرحوم بہت زیادہ متشرع تھے کسی ناجائز آمدنی کو کسی طرح روا ہی نہیں رکھتے تھے۔ اگر غور کیا جائے تو بجز کرامت کے اور کوئی صورت نہیں معلوم ہوتی۔ وہ ہمیشہ آمدنی میں سے پس انداز کر کے ایسی بڑی بڑی تقریبات کا استقبال فرماتے رہتے تھے۔ بڑے بھائی اور منجھلے بھائی صاحب کا ۱۳۰۸ھ شوال میں نکاح کیا اوّل الذکر کی بارات شہزاد پور میں چھ کوس کی دوری پر گئی۔ اور ثانی الذکر کی شادی ماموں تفضل حسین صاحب مرحوم کے یہاں گاؤں ہی میں ہوئی۔ زیورات، جوڑوں، مہمانوں، ولیمہ وغیرہ میں خاصی مقدار خرچ ہوئی جو کہ پس انداز مقدار سے پوری ہوئی۔ پھر ۱۳۱۲ھ میں میری شادی قنال پور پرگنہ اتر ولیہ ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی اور مصارف کثیرہ برداشت کرنے پڑے۔ مگر ایک پیسہ قرض نہیں لیا۔ اگرچہ آج ہماری آمدنیوں وغیرہ کی مقابلیت پر یہ حالت بہت گری ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر والدین مرحومین پر جو حالت اُن کے ابتدائی زمانہ طفولیت اور عنفوان شباب میں گزری تھی۔ اس پر نظر کرتے ہوئے بہت اعلیٰ درجہ کی شمار ہوتی تھی اور وہ بہت مطمئن اور خوش و خرم نظر آتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم سہوارہ اور بلند شہر میں بصیغہ تدریس ملازم ہو گئے تھے۔ اگرچہ میرے اور بھائی سیّد احمد صاحب مرحوم کے مصارف دارالعلوم دیوبند تحمل کرتا تھا مگر والد صاحب مرحوم اخراجاتِ زائدہ کے لئے ایک ایک روپیہ ماہوار ضرور بھیجا کرتے تھے کبھی کبھی ہم لوگ قرضدار بھی ہو جاتے تھے جس میں ہماری بے وقوفیوں کا بہت زیادہ دخل ہوتا تھا اور اس پر بہت زیادہ ملامت بھی کی جاتی تھی۔ مگر اس کو ادا بھی وہی فرماتے تھے۔ اسی طرح

ایام تعطیل سالانہ میں دیوبند سے وطن تک آمد و رفت کا خرچ بھی تحمل کرنا پڑتا تھا اور اسی وجہ سے دوسرے سال مکان جانا ہوتا تھا۔ اس وقت میں ان کی دور بین نظر اس طرف متوجہ تھی کہ اولاد کے لئے باغات لگائیں اور مکان میں وسعت دیں کہ ۱۳۱۳ھ میں بروز جمعہ ۲۲ ربیع الاوّل والدین ماجدین کے پیر و مرشد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہ العزیز کا بعمر ایک سو پانچ برس انتقال ہو گیا۔ یوں تو ہر مرید کو اپنے مرشد سے تعلق خاطر اور عشق کم و بیش ہوتا ہی ہے۔ مگر والدین مرحومین کو اور بالخصوص والد صاحب کو بہت ہی زیادہ شغف تھا۔ مدتوں خدمت میں رہنا ہوا تھا ذکر و شغل استغفار باطنی اور قطع منازل سلوک کی نعمت حاصل ہوئی تھی، مولانا مرحوم کی خصوصی عنایت اور توجہ بھی ان پر زیادہ رہتی تھی۔ اس لئے عرصہ تک بہت زیادہ مغموم رہا کئے۔ فراقِ مرشد میں متعدد قصائد بھی لکھے جن میں سے اکثر قصائد بھاکھا زبان میں بہت زوردار ہیں۔ جب کہ یہ احوال گزر رہے تھے بھائی سید احمد صاحب نے ایک خط میں والد صاحب مرحوم کو لکھ دیا کہ میاں (ہم سب اولاد آن کو میاں کہا کرتے تھے) اب ہندوستان رہنے کی جگہ نہیں رہی، اب تو مدینہ منورہ چل بسئے باغ وغیرہ لگانے کی فکر فضول ہے۔ یہ کلمات ایسے مؤثر واقع ہوئے جیسے کہ اسپرٹ میں دیا سلائی ہوتی ہے۔ اس خط کو دیکھنا تھا کہ عشقِ محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور ہر دم یہی پیچ و تاب رہنے لگا اور یہ دھن پیدا ہو گئی کہ تمام گھرانہ کو لے کر وہیں چلنا چاہئیے۔ تدبیریں سوچنے لگے۔ اس گیارہ بارہ نفوس والے خاندان کے سفرِ مدینہ منورہ کا بوجھ معمولی بوجھ نہ تھا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آپ خود جائیے اور حج و زیارت کر آئیے، مگر نہ مانا۔ بیٹوں کی سسرال والوں نے زور دیا تو جواب دیا کہ اپنی اپنی لڑکیوں کی طلاق لے لو۔ میں تو اپنے لڑکوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ بہوؤں کو خود کہا کہ جس کو چلنا منظور نہ ہو وہ اپنے خاوند سے طلاق لے لے مگر ہندوستانی رسم و رواج اور طرزِ معاشرت میں جس قدر یہ امر مبغوض ہے ہر ایک جانتا ہے۔ میری کتابیں ادب اور ہیئۃ وغیرہ کی کچھ باقی تھیں میں نے عرض کیا کہ آپ تشریف لے جائیں میں ایک دو سال بعد آجاؤں گا فرمایا کہ مدینہ منورہ میں پوری کر لینا۔ میرے خسر حقیقی تو بہت عرصہ پہلے فوت ہو چکے تھے میری اہلیہ کو اس کے حقیقی ماموں شیخ کفایت اللہ صاحب مرحوم فتاپوری نے پالا تھا اور وہی شادی وغیرہ کے متکفل تھے۔ ریاست بلرام پور میں ملازم تھے۔ ان دنوں

بعہدۂ معتمد ریاست لکھنؤ میں مقیم تھے انہوں نے مجھ کو روکنا چاہا اور والد صاحب سے کہا کہ میں خود لکھنؤ میں موجود ہوں میں حسین احمد کو اپنے پاس یہاں رکھ کر حکیم عبدالعزیز صاحب (مرحوم) کے یہاں طب پڑھانا چاہتا ہوں اس کو یہاں چھوڑ دیجئے، والد صاحب نے جواب دیا کہ کیا حسین احمد کو گھوڑے پر سوار کرانے کے بعد میں گدھے پر سوار کردوں گا۔ اس کو علوم دینیہ کی تعلیم دلائی گئی ہے اس سے بڑھ کر کونسی تعلیم ہے۔ الغرض دوستوں، رشتہ داروں، اغیار سبھوں نے سمجھایا مگر حسبِ قول شاعر ؎

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہاں تک ان کا جوش اور عشق بڑھا ہوا تھا کہ زمانہ سفر حجاز میں جبکہ گورنمنٹ کی طرف سے سختیاں بہت زیادہ کی جارہی تھیں (جن کا ذکر آگے آئے گا) الہ آباد کے قرنطینہ کی سختیاں دکھلا کر ایک صاحب نے کہا کہ اس سال ارادہ نہ کیجئے تو فرمانے لگے کہ اگر مجھ کو یہ کہا جائے کہ تجھ کو توپ کے منہ پر باندھ کر گولا چلائیں گے اور تو مدینہ منوّرہ پہنچ جائے گا تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ گھر میں سوائے بھائی سیّد احمد صاحب مرحوم کے پوری طرح ہم خیال حضرت والد صاحب کا کوئی نہ تھا۔ بڑے بھائی صاحب نے جب اس قدر عزم مصمم والد صاحب کا دیکھا تو حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بطور شکایت عرض کیا آپ نے فرمایا کچھ حرج نہیں چلے جاؤ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت ابھی تک میری تعلیم باطنی پوری نہیں ہوئی میں اس کو انجام دینا چاہتا تھا تو فرمایا کہ اب ساتھ چلے جاؤ پھر سب کو چھوڑ چھاڑ کر چلے آنا۔ خلاصہ یہ کہ شوق و اضطراب والد صاحب کا بڑھتا رہا اور انہوں نے فکر کی کہ کسی طرح جائداد کا حصّہ فروخت ہو جائے تو روانہ ہو جائیں۔ اس جدّ وجہد میں عرصہ لگ گیا۔ بڑی کوششوں کے بعد ایک رئیس ٹانڈہ کے راجہ علی حسین تیار ہو گئے اور غالباً تین ہزار روپیہ پر دونوں گاؤں الہداد پور اور جٹوان پور کا زرعی حصّہ فروخت کر دیا۔ سکنائی حصّہ بھی فروخت کرنا چاہا مگر کوئی آدھی تہائی قیمت دینے والا بھی نہ ملا اس لئے وہ فروخت نہ کیا گیا۔ اور بالآخر اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں روانگی ہو گئی۔ جس کا تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا۔

والد صاحب مرحوم کے مختصر حالات

حضرت والد صاحب مرحوم جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ قدرت

کی فیاضیوں سے بہت کچھ فیضیاب ہوئے تھے دل اور دماغ بے نظیر پائے تھے اگر ماحول مساعدت کرتا تو بے نظیر متبحر اور محقق عالم ہوتے اور علمِ معرفت اور تصوف میں بھی اعلیٰ درجہ حاصل کرتے یا اگر دنیوی علم حاصل کرتے تو قابلیت کی بنا پر اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے مناصب حاصل کرتے تاہم باوجود ہر قسم کی عسرت اور تنگدستی کے جس نے اُن کو بچپن کے زمانہ سے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا انہوں نے حیران کن ترقی کی اور نہ صرف عسرت اور تنگدستی کو دور کیا بلکہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ذکر و فکر و مراقبہ میں جدّ وجہد کی اور بڑے درجہ تک اس میں کامیاب ہوئے کشف اُن کا بہت قوی اور زیادہ تھا۔ متعدد مکاشفات ان کے صحیح ثابت ہوئے انہیں میں سے یہ بھی ہے کہ انہوں نے مدینہ منورہ میں ایک مرتبہ فرمایا تم میں سے ایک شخص کو ہندوستان جانا ہوگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ قرعۂ فال مجھ دیوانہ پر پڑے گا۔ دنیا اور اہلِ دنیا سے اُن کو نفرت تھی۔ حضرت مولانا گنج مراد آبادی سے ان کو خلافت اور اجازت زندگی میں ظاہراً انہیں ملی تھی مگر بعد از وفات حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو والد صاحب نے خواب میں دیکھا کہ میں تم کو اجازت بیعت دیتا ہوں۔ اس بنا پر دو شخصوں کو ٹانڈہ میں بیعت کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی اولاد کو (حالانکہ وہ علوم دنیاویہ میں اعلیٰ قابلیت کا اظہار کر چکے تھے اور بڑے بھائی صاحب مرحوم اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم مڈل کلاس کے امتحانوں میں تمام صوبہ اودھ کے تمام طلباء میں نمبر اوّل نکلے تھے) انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں کیا اور علوم دینیہ ہی کی طرف لگایا۔ ہمیشہ یہی فکر رہی کہ میری اولاد انہیں علوم عربیہ میں اعلیٰ قابلیت حاصل کرے انہوں نے جبکہ ہم سب بڑے ہو گئے تھے جمع کیا اور فرمایا کہ میں نے تم سبھوں کو اس لئے پرورش کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں جہاد کرو اور کچھ کر کے شہادت حاصل کرو۔ اُن ہی کی رغبت اور خواہش کی وجہ سے ہم سبھوں کو طریقت کا شوق ہوا اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے دربار کی خاکروبی کا شرف حاصل ہوا۔ انہیں کی حسنِ توجہ کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف ہندوستان میں اس بارگاہ کی حاضری اور اس کا توسل نصیب ہوا بلکہ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بھی باوجود مشکلات اپنی اولاد کو اس دربار دُربار میں بھیجا اور جبکہ اخیر میں بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو کئی برس گنگوہ شریف کے قیام میں لگ گئے تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ سید احمد اگر کسی

قابل ہو تو اس کو اجازت دے کر یہاں بھیج دیجئے مجھ کو اس کی ضرورت ہے اور اگر کسی قابل نہیں ہوا تو بہتر ہے کہ آپ کی چوکھٹ پر سر مار کر وہیں مر جائے۔ اس کلام پر حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ مولوی سید احمد کے والد چونکہ سلوک اور طریقت سے واقف ہیں اس لئے اس کی قدر اور منزلت جانتے ہیں اور پھر بھائی سید احمد صاحب کو مزید تاکید ذکر وغیرہ کی فرمائی اور حسنِ توجہ زیادہ کر دی۔ مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں اتباع سنت اور التزام جماعاتِ خمسہ وغیرہ میں باوجود ضعف اور اور پیرانہ سالی انتہائی کوشاں رہتے تھے۔ سخت سردیوں اور سخت گرمیوں میں بھی اسطرح اوقات کی پابندی فرماتے تھے کہ ہم نوجوان اس سے عاجز رہتے تھے۔ اپنے اوراد و وظائف مراقبہ وغیرہ کے اخیر تک نہایت پابند رہتے تھے۔ امور خانہ داری اور ضروریات تعمیر وغیرہ کے انجام دینے میں بھی انتہائی جفاکشی کرتے رہتے تھے۔ بسا اوقات تعمیری اوقات میں گارا بنانا۔ پتھروں اور گارے کا معماروں تک پہنچانا، روڑوں وغیرہ کو جمع کرنا اور غیر تعمیری اوقات میں اینٹ پاتھنا۔ بازار میں ہر روز جا کر مناسب تعمیرات اشیاء کا خریدنا۔ کھونٹیوں اور چارپائی کے پایوں کا بنانا وغیرہ وغیرہ۔ (حالانکہ کبھی ہندوستان میں ان چیزوں کے کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی) اور جب ہم میں سے کوئی کہتا تھا کہ اب آپ پیرانہ سالی کے اس درجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ آپ کو صرف آرام کرنا چاہیئے آپ دن رات ان مشقتوں میں کیوں بسر کرتے ہیں تو فرماتے کہ مجھ سے پڑے پڑے بیکار نہیں رہا جاتا۔ سلب مرض وغیرہ اعمال نقشبندیہ میں ان کو عمدہ ملکہ تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ سخت خطرہ میں اسی وجہ سے پھنس گئے تھے جبکہ ایک سخت مریض کا ٹانڈہ میں انہوں نے سلب مرض کیا تو وہ مریض تو اچھا ہو گیا مگر خود مرض میں اس قدر مبتلا ہو گئے کہ لوگ ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ کیونکہ سلب مرض میں ان کا طریقہ تھا کہ اوّلاً مرض کو اپنے اوپر کھینچتے تھے اور پھر اپنے اوپر سے دفع کر دیتے تھے اس مرتبہ چونکہ مرض شدید تھا اس لئے طبیعت سنبھال نہ سکی اور نہ دفع کر سکی بالآخر خود مبتلا ہو گئے۔

تعویذ اور عملیات میں بھی ان کو اچھا خاصا ملکہ اور کامل مہارت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایک زمانہ میں مجھ کو اس کی اس قدر مہارت ہو گئی تھی کہ امراض کے لئے نقش خود تصنیف کیا کرتا تھا اور ان سے فوائد ہوتے تھے مجھ کو زبانی اجازت اعمال ونقوش دیتے

وقت فرمایا کہ اس بیاض میں (ان کی اپنی قلمی بیاض) جس قدر اعمال ہیں میرے زکوٰۃ دیئے ہوئے ہیں۔ تجھ کو زکوٰۃ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تجھ کو اجازت دیتا ہوں مگر بہتر یہ ہے کہ یہ تمام اعمال میرے سامنے ایک مرتبہ کرے۔ مگر میں نے بے وقوفی اور کاسل سے اس سے اعراض کیا اور مشاغل علمی کو اہمیت دیتا ہوا اس مشغلہ کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا جس کی وجہ سے بعد میں پچھتانا پڑا۔

علاوہ خاندانی اعمال کے والد صاحب مرحوم نے لکھنؤ اور صفی پور وغیرہ کے قیام کے زمانہ میں بہت سے اعمال مشاہیر سے حاصل کئے تھے۔ پھر اس پر مزید یہ ہوا کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے جبکہ اُن کے پاس رسالہ معدن الاعمال والمسائل موی محمد رمضان صاحب مرحوم بوڑیوی نے چھپوا کر بھیجا تو والد صاحب کو بلا کر یہ رسالہ دیا اور فرمایا کہ میں ان تمام اعمال کی جو اس میں مذکور ہیں تم کو اجازت دیتا ہوں۔

۱۳۲۷ھ میں جبکہ میں ہندوستان میں تھا والد صاحب مرحوم نے اسی رسالہ معدن الاعمال کی پیشانی پر خود مندرجہ ذیل عبارت تحریر فرمائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین۔

امابعد۔ میں عبد ضعیف حبیب اللہ اس کتاب کے سارے عملیات وتعویذات کے کرنے و لکھنے وکسی کو (مگر اہل کو) بخش دینے کی اجازت فرزند حسین احمد کو اسی طرح دیتا ہوں جس طرح سے مجھ کو حضرت مرشد مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بلا عمل واداے زکوٰۃ کے بخشا وعطا فرمایا ہے۔

پس اس کو بھی عمل کرنے وزکوٰۃ دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ انشاءاللہ تعالےٰ وہ قادر مطلق یونہی خلق اللہ کو نفع دیوے گا۔ اسی طرح سے دوسری قلمی کتاب کی بھی میں نے اس کو اجازت دی۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچاوے آمین۔ اگر فرزند سید احمد بھی طلب وخواہش رکھتے ہوں تو اُن کو بھی یہ اجازت نامہ بس ہے۔ فقط۔

حبیب اللہ بقلم خود
۲۰ جمادی الثانی ۱۳۲۷ھ

انہوں نے مدینہ منورہ پہنچ کر مصارف سفر میں سے جو سرمایہ بچا تھا حسب قواعد فرائض وراثت تقسیم کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ میں نے ہجرت کی نیت کی ہے میں تو یہاں ہی مرنے کے لئے آیا ہوں۔ تم سبھوں کو میری طرف سے اجازت ہے خواہ یہاں رہو یا ہندوستان چلے جاؤ۔ چونکہ ایسے شفیق مربی ضعیف العمر کا تنہا چھوڑنا انتہائی بے مروتی تھا اس لئے نہ کوئی اولاد میں سے اور نہ والدہ ماجدہ اُن کے فراق پر راضی ہوئے۔ اگرچہ سوائے والد ماجد مرحوم کسی نے بھی ہجرت کی نیت نہیں کی تھی اور سب نے قصد کیا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہیں یہاں ہی رہیں گے۔ اور سرمایہ مذکور سے تجارت وغیرہ کا ارادہ کیا گیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

والد صاحب مرحوم کو طبعی طور پر شاعری سے بھی دلچسپی تھی اور بالخصوص ہندی بھاشا میں ان کے قصائد بہت زوردار اور مؤثر اور مضامین تصوف سے بھرے ہوئے ہیں فارسی اور اردو میں نعتیہ اشعار اُن کے بہت ہیں۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے فراق میں (بعد از وصال) بہت پُر درد اشعار انہوں نے لکھے ہیں۔ جن میں سے چند قصائد برفغان دل ہاشمی وغیرہ میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ اگر ان کے لکھنے میں طول نہ ہوتا تو میں مکمل یہاں اُن کو درج کرتا۔ مگر بطور نمونہ یہ چند اشعار لکھتا ہوں جن سے والد صاحب مرحوم کی قابلیت اور افتاد طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

قطعات

نعت در فارسی

این جمال وحُسنِ عالم سوز تو — وین رُخِ پُرنور دل افروز تو
کرد بسمل صد ہزاراں جبرئیل — ناوکِ مژگان سینہ دوز تو

دیگر

جان و دل رامی برد یک آن تو — این چہ حسن است اے عجائب شان تو
سوخت از دردت حبیب ار چہ عجب — اے بسا جبرئیل شد قربان تو

دیگر

اے بہار باغِ رضوان کوئے تو — بلبل سدرہ اسیر موئے تو
سجدہ ریزاں آمدہ سویت حبیب — اے ہزاراں کعبہ در ابروئے تو

قطعہ نعت اُردو

چارہ نا چارہ جو محفل سے ترے جاتے ہیں — حسرت و رنج و قلق ساتھ وہ لیجاتے ہیں
جان سے جانا ہے ترے پاس سے جاناں جانا — جیتے جاتے ہیں مگر مُردہ بنے جاتے ہیں
ایک ہم ہی رہے اس بزم میں باقی ساقی — لوگ میخانے سے پی پی کے چلے جاتے ہیں
اے رسولِ عربی آپ کی فرقت کے قتیل — پل محشر سے سُبک پار اُتر جاتے ہیں
سر رہے یا نہ رہے پہ رہے سودا سر میں — عشقِ احمدؐ کا خدایا یہی ہم چاہتے ہیں

اس حبیبِ دل خستہ پہ نظر ہو جائے
درد مندوں کی دوا آپ کئے جاتے ہیں

نعت در مخلوط بھاکا و اُردو!!!

یہ کیسا روگ ہے مجھ کو کہاں مرا دل لُبھاتا ہے
وہ موہن روپ ہے کیسا جو آنکھوں میں سماتا ہے

کہاں ڈھونڈوں کدھر جاؤں جتن کوئے نہیں بنتے
پھرا کرتا ہوں من ہی میں یہی آتا اور جاتا ہے

کبھی صحرا میں گردِ باد بن کر خاک اڑاتا ہوں
کبھی دریا میں جوں غواص غوطہ کا لگاتا ہے

میں سارے باغ و پھلواری پھری پیو پیو پیا رٹتی
پتہ دے اے صبا تو ہی کہاں وہ گل پھولاتا ہے

کہوں میں کیا چلی کیدھر برہ کی آگ دل بھیتر
میں بالم کھوج میں نکلی مجھے پردیس جانا ہے

بہت دن بیتے اے سکھیو نبا یوں درس پیتم کا
ہوئی کوئی خطا ایسی کہ من موہن کو ہانا ہے

مدینہ ہے زمین پر یا کہ ہے عرشِ بریں اوپر
وہیں وہ شیام بستا ہے مجھے وہ دیس جانا ہے

نہ آگر روپ ہے میرے نہ کوئی ڈھنگ آتا ہے
نہ چوندر رنگ میں بورے جیا مورا ڈرانا ہے

میں عاجز بے نوا بندی کنیزک زاد سے کمتر
اور اس پر یہ دماغ اپنا کہ تجھ پر دل دوانا ہے

زن و فرزند میں خود بھی دل و جاں بھی سبھی تجھ پر
تصدق یا نبی اللہ تو محبوب یگانہ ہے

بصارت تیز کرتی ہے حبیب اُس کوچہ کی مٹی
دل و جاں خانماں سب بیچ وہ سرمہ لگانا ہے

فراقِ مرشد حضرت مولانا فضل الرحمٰن قدس اللہ سرہٗ العزیز گنج مرادآبادی میں

بھاکھا زبان میں فرمایا جس کو ہندی اصطلاح میں بروگ کہتے ہیں

کون بنتہا مورا جیا بورانا — کھ برہا ہیا ساتے بانا
کون اگن دیکھے یہ ماہین — جہ نین جرون برون جگ ماہین
گوسوامی موری بانہ گہیتا — کہاں گیو مورے کنور کنہیا
رکھ مدہ بن تم ڈھونڈہن جاؤں — کہاں پاؤں سرچرنن ناؤں!
کون سہاگ بھاگ اب مورین — جوہیں سنگ نہ لاگیوں تورین
تم بن کو مورا دھیر بندھیّا — تم بن کو مورے بیر ہریا
کون کاج مورا جوبن بارا — جوچھٹ گیو کنتہہ رتنارا!
پیو کھوجت سب کھوئے کے پایوں پیارن — سوموا کنتہہ ہران ہے تنے کھو جو سہیلی آن
ہوں جوگن توری بھیکہہ بھکاری — کہاں ڈھونڈھوں تم جوگی مورا ری
کون دیس مورے جوگی چھائے — کہہ کارن موہہ سنگ نہ لائے
نلج ہوں گھر بار تجب اؤں — پی توری کھوج کہیں سن پاؤں
ہے پنڈت گن گیان گو سائیں — تم تیئیں آگہ کتو جگ ناہیں!
ہے پنڈت پہ بھی بیداگی — الکھہ پیم بیراگ سبھاگی
کون کون گن گیرت بکھانوں — جب تم ہنیو نہ دوجا جانوں
تمہیں نین میں بھیوں سریکھا — اندہ ہیتون سو نینن دیکھا
تم بن میں کھیّا بھبوں کہاں ڈھونڈوں کنجائے — جو درشن میں پاؤں پڑہ ون اگن میں واہائے۔الخ

بھجن (مناجات) بھاکا زبان میں

روز کی بدریا سے جیا گھبرائے گنو.....رے — رات کی اندھیریا سے من ڈر کھائے گنو...رے

(دیفیض باطنی سے)

نہیں آئے ساجن نہیں آئے سامی چیتر گجریا سے کہیں ہلہائے گئو........
سپنے مانہہ درس جو دینہوں! پریم کی چندریا ہمیں پھرآئے گئو.......
پڑگیو آئے کے بھول بھلیاں ساتھ کی گھٹریا جولائے گنوا یگئو.......
کہو حبیب کہاں من موہے کوئی نظریا سے چت بورائے گئو.......

زمانہ شباب اور مدرسی میں اُن کی طبیعت ریاضی اور حساب میں بہت ہی زیادہ تیز تھی ہر ایک کے مشکل سے مشکل سوالات آناً فاناً میں حل کر دیتے تھے۔ مگر آخری عمر میں تصوّف کا اس قدر غلبہ ہوگیا تھا کہ سب کو بھلا بیٹھے تھے۔ اور جب کبھی ایسے مسائل کا تذکرہ آتا تو فرما دیتے کہ اب میں سب بھول گیا۔ جفاکش اس قدر تھے کہ جس احاطہ میں مکان بنوایا ہے چھ سات کنوئیں اور پاخانے اور بالوعے اپنے ہاتھوں سے کھودے۔ حالانکہ وہاں کی زمین جس (یعنی جمے ہوئے کنکروں والی ہے) بڑی مشکلوں سے گھنٹہ بھر میں ڈیڑھ دو بالشت زمین کھودی جاتی تھی۔

موصوف مدینہ منوّرہ میں یا تو ذکر و فکر اور اوراد و ظائف صلوٰۃ وسلام میں مشغول رہتے تھے یا کبھی کبھی اپنے ہم مہاجرین ہند اہل صلاح و تقویٰ کے پاس بیٹھ کر دل بہلاتے تھے۔ عام لوگوں سے میل جول نہایت کم تھا اور نہ فضول اور لایعنی باتوں میں وقت ضائع فرماتے تھے حُقہ پینے کے بہت عادی تھے۔ اور چونکہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم حُقہ پیتے تھے اس لئے ان کا ہر مرید تقریباً اس کا عادی پایا جاتا تھا۔ عرب میں خمیرہ تمباکو نہ ہونے کی وجہ سے ہم لوگ جس طرح بھی ہوتا ہے تمباکو لے جانے اور منگوانے کی کوششیں کرتے تھے ترکی حکومت کے سخت کسٹم کی وجہ سے اس میں دقتوں کا سامنا بھی ہوتا تھا۔ پان اور تمباکو کھانے کے بھی عادی تھے۔

۱۳۳۳-۳۴ھ میں جبکہ جنگ عمومی ہو رہی تھی اور حکومتِ ترکیہ بھی داخل جنگ تھی اور حضرت مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز اور مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز حجاز تشریف لے گئے تھے اور شریف حسین نے انگریزوں سے مل کر بغاوت کر دی تھی تو مختلف اسباب کی بناء پر مدینہ منوّرہ کی پولیس کو ہمارے خاندان سے خصوصاً اور تمام ہندوستانیوں سے عموماً بدظنی پیدا ہوگئی (جس کا کچھ ذکر آگے آئے گا) بنابریں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے

مدینہ منورہ سے روانگی مکہ کے بعد جناب والد صاحب کو معہ ہر دو بھائیوں مولانا سیّد احمد صاحب مرحوم و عزیزم محمود سلمہٗ کے اڈریانوپل بے خبری کی حالت میں گرفتار کرکے بھیج دیا گیا۔ بچوں اور عورتوں کو مدینہ منورہ ہی میں چھوڑ دیا گیا۔ بہت کچھ عرض کیا گیا مگر فوجی حکام بھتے کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اس زمانہ میں مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد کی ایک بہن، بھائی سیّد احمد صاحب مرحوم کے نکاح میں تھیں علاوہ ازیں موصوف سے اور تعلقات قدیمہ بھی تھے بدیں وجوہ انہوں نے بچوں اور عورتوں کی خبر گیری میں بہت زیادہ ہمدردی اور جفاکشی کا ثبوت دیا۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

اس وقت عورتوں اور بچوں میں میری زوجہ اور ایک لڑکی دس گیارہ برس کی زہرہ اور ایک لڑکا اشفاق تقریباً ڈیڑھ سال کا اور بھائی سیّد احمد صاحب کی اہلیہ اور والد صاحب مرحوم کی اہلیہ ضعیف العمر تھیں۔ اس تعدی اور ظلم کا اثر ان کی طبیعت پر نہایت زیادہ ہونا ضروری تھا طبعی طور پر ان ضعفاء سے جدائی اور پھر تمام عمر کی وہ خواہش کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری (جس کی وجہ سے وہ کسی جگہ حتیٰ کہ مکہ معظمہ اور حج کے لئے بھی مدینہ منورہ سے نکلنا گوارا نہ کرتے تھے اور یہیں دفن ہونے کے آرزومند تھے) کے فوت ہونے کی وجہ سے غیر معمولی اثر اُن کے قلب اور دماغ پر پڑا تھا۔

اڈریانوپل نہایت سرد شہر ہے وہاں پر ان تینوں کو لے جاکر نظر بند کر دیا گیا۔ شہر سے ایک میل باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ تین اشرفی (نوٹ) ہر ایک کے لئے ماہوار مقرر کر دیا گیا۔ ترکی نوٹ اس وقت میں بہت زیادہ گر گیا تھا۔ والد صاحب کی ضعیف طبیعت وہاں کی سخت سردی کو برداشت نہ کر سکی اور ذات الجنب میں مبتلا ہو کر اڈریانوپل پہنچنے کے ایک ماہ بعد وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون اڈریانوپل ہی میں مدفون ہوئے۔

والد صاحب مرحوم مستجاب الدعوات بہت زیادہ تھے۔ ایسے بہت سے واقعات پیش آئے تھے کہ جس نے اُن کو ستایا جس کے واسطے انہوں نے بد دعا کی وہ پنپنے نہیں پایا رحمہ اللہ ورضی عنہ وارضاہ۔ واقعہ یہی ہے کہ والدین مرحومین میں اللہ تعالیٰ نے جو خوبیاں جمع کی تھیں وہ بہت کم لوگوں میں اجتماعی طور پر پائی جاتی ہیں۔ ؎

ابونا اب لو کان للناس کلھم اب مثلہ اغناھم بالمناقب

والد صاحب مرحوم کا آخری حصہ عمر بالخصوص والدہ مرحومہ کی وفات کے بعد بہت

زیادہ مکدّر اور رنجیدہ گزرا ہے ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور گھرانے کے نفوس تقریباً چالیس نفر یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ خود فرماتے تھے کہ تقریباً چالیس نفر اپنے گھرانے کے میں نے اپنے ہاتھ سے مدینہ منورہ میں دفن کئے ہیں۔ مگر انتہائی ضبط اور صبر و استقلال پر عمل پیرا رہے۔ آخری زمانہ میں اُن کی اُمیدوں اور آرزوؤں کا خون اس طرح ہونا انتہائی مصیبت تھا۔ کہ وفات اور دفن بھی مدینہ منورہ میں حاصل نہ ہو سکا۔ ذلک تقدیر العزیز العلیم میں اُس زمانہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ انگریزی اسارت میں تھا۔ مالٹہ میں اُن کے انتقال کی خبر پہنچی تو نہایت قلق ہوا مگر بجز صبر و شکر چارہ ہی کیا تھا۔ فللّٰہ الحمد والشکر علی ما قدر و قضی۔

میری تعلیم و تربیت اور ایامِ طفولیت

مجھ کو ہوش و حواس آئے تو میں نے اپنے آپ کو ٹانڈہ میں پایا۔ بانگرمئو بالکل یاد نہیں۔ والدین مرحومین کو اولاد کی تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اور بہت زیادہ خیال تھا اور اس کے لئے والد مرحوم بہت زیادہ سختی کرتے تھے۔ ہر بچہ کو جبکہ وہ چار برس کا ہو جاتا تھا پڑھنے کے لئے بٹھا دیتے تھے اور نہ پڑھنے اور یاد نہ کرنے اور کھیلنے پر خوب مارتے تھے۔ اس لئے مجھ کو کھیلنے کا موقع آزادی کے ساتھ صرف چار برس کی عمر تک ملا ہے جب اس عمر کو پہنچا تو گھر میں والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی اور اس کے بعد سیپارہ پڑھنا پڑتا تھا۔ صبح ساڑھے نو بجے تک یہ قید اور پڑھائی گھر میں ہوتی تھی اور ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول میں جانا پڑتا تھا۔ اسکول الہداد پور سے تقریباً ایک میل یا کچھ زائد دوری پر ہے۔ اسکول کی تعلیم میں بھی مدرسین اس زمانہ میں خوب مار پیٹ کرتے تھے۔ اس وقت مجھ کو دفعہ آٹھ میں داخل کر دیا گیا۔ (اس زمانہ میں درجوں کی ترتیب اسی طرح تھی۔ مڈل کلاس کو اوّل درجہ کہا جاتا تھا اور سب سے نیچے کا درجہ آٹھواں کہلایا جاتا تھا) چار بجے شام تک اسکول میں مقید رہنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد والد صاحب مرحوم کے ساتھ ہی گھر آنا ہوتا تھا۔ گھر پر بھی سخت قید تھی باہر نکلنا۔ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنا اس کی بالکل اجازت نہ تھی اور اگر کبھی غفلت دیکھ کر یا والد صاحب کی غیبوبت میں موقعہ پا کر نکل جاتا تھا تو جب پتہ چل جاتا تھا تو سخت مار پڑتی تھی۔ ایک بکری والد صاحب نے اچھی نسل کی پال رکھی تھی اسکول جاتے اور واپس آتے ہوئے اسکو اور اسکے بچوں کو ساتھ رکھنا پڑتا تھا چونکہ اسکول کا احاطہ

بڑا ہوتا تو وہ لانبی رسی میں باندھ دی جاتی تھی اور دن بھر اس طرح چرتی رہتی تھی اور دیگر اوقات فارغہ یا تعطیل میں مکان کے قریب جنگل میں اس کو اور اس کے بچوں کو چرانا پڑتا تھا۔ (اس طرح یہ سنت نبوی علیہ السلام ادا کرنی پڑی تھی) گاؤں میں میرا ہم عمر لڑکا ماموں زاد بھائی جواد حسین مرحوم تھا موقعہ پاکر اس کے ساتھ گولی کھیلتا تھا۔ صرف دو گھروں میں ہم آزادی کیساتھ جا سکتے تھے۔ ایک تائے صاحب مرحوم کے یہاں اور دوسرے ماموں تفضل حسین صاحب مرحوم کے گھر میں۔ گر چونکہ تائے صاحب مرحوم کے یہاں کوئی ہم عمر لڑکا نہ تھا اس لئے وہاں جانا بے سود ہوتا تھا جواد حسین مرحوم کے یہاں بھی کھیلنے کی اگر خبر ہو جاتی تھی تو مار پڑتی تھی۔ بہر حال ایام طفولیت میں صرف گولی کھیلنے کی نوبت آئی اور وہ بھی چھپ چھپ کر۔ آزادی کے ساتھ وہ نصیب نہ ہوا۔ پتنگ اڑانا یا گیند کھیلنا یا گلی ڈنڈا کھیلنا وغیرہ کبھی وہاں نصیب نہ ہوا۔ گاؤں میں بعض ہم عمر اور بھی لڑکے تھے مگر ان کے گھروں میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ بھائی سید احمد صاحب مرحوم اور میں اپر اتلی کے تھے اس لئے وہ ہمیشہ کاٹ کرتے تھے (جیسے کہ فطرتاً اوپر اتلی کے بھائیوں کی عادت ہوتی ہے) وہ طبعی طور پر ابتدا سلیم الطبع تھے کھیل کود کی طرف بہت کم رغبت رکھتے تھے اور والدین مرحومین کی منشاء کے مطابق زیادہ رہتے تھے چھوٹے بچوں کی خبر گیری میں والدہ مرحومہ کی بہت زیادہ امداد کرتے تھے۔ میں جب کبھی غفلت دے کر کھیلنے کیلئے نکل جاتا تھا تو وہی تلاش کرنے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ اور وہ گوشمالی کرتے ہوئے لاکر والد صاحب مرحوم کے سامنے پیش کر دیتے تھے اور پھر مار پڑتی تھی۔ الحاصل آٹھ برس اس طرح وطن میں قیام رہا اس میں پانچویں سیپارہ تک والدہ مرحومہ سے اور پانچ سے اخیر تک والد مرحوم سے قرآن شریف ناظرہ پڑھنا ہوا اس کے بعد آمد نامہ، دستور الصبیان، گلستاں کا کچھ حصہ مکان پر پڑھنا ہوا اور اسکول میں دوئم درجہ تک پڑھنا ہوا۔ اس وقت اسکول میں فنون اور کتب بہت زیادہ تھے۔ تمام اقسام حساب جبر و مقابلہ تک مساحت اور اقلیدس مقالہ اولی تمام جغرافیہ عمومی و خصوصی، تاریخ عمومی و خصوصی مساحت عملی (تختہ جریب وغیرہ سے زمین ناپ کر باقاعدہ نقشہ بنانا) تحریر املا، شکست لکھنا اور پڑھنا۔ اردو کورس وغیرہ سب اس عمر میں پوری طرح یاد اور مشق کر چکا تھا۔ اور ہر چیز میں اس قدر مہارت ہو چکی تھی کہ از بر بخوبی جواب دے سکتا تھا جبکہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہوا اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم اردو مڈل کلاس پاس کر کے ذیقعدہ ۱۲۰۳ھ میں دیوبند

بھیج دیئے گئے بڑے بھائی صاحب پہلے سے وہاں پڑھتے تھے اُن کی کتابیں آخری تھیں۔
جب وہ شادی ہو جانے کے بعد جانے لگے تو بھائی سید احمد صاحب بھی اُن کے ساتھ کر دیئے گئے۔ اب ہم مکان پر اس حیثیت سے آزاد ہو گئے کہ ہم کو ڈھونڈھ کر گھروں میں سے نکال لانے اور والد مرحوم کے سامنے پیش کر دینے والا کوئی نہیں رہا. طبیعت میں کھیل کود کا شوق تھا ہی. جہاں والد صاحب مرحوم نے کسی کام کو یا کسی کو بلانے کیلئے بھیجا تو اسکو انجام دیا اور ماموں صاحب کے گھر میں گھس گئے اور سجاد حسین مرحوم کے ساتھ کھیلنا شروع کیا۔ وہاں ہر ایک ہم سے محبت سے پیش آتا تھا اور ہماری اس مظلومیت پر کہ ہم کو کھیلنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہے تیلی کے بیل کی طرح دن رات لکھنے پڑھنے میں لگا رہنا پڑتا ہے. ہم سے ہمدردی رکھتا تھا۔ اس وجہ سے والد صاحب کو سخت کلفت پیش آئی اگرچہ مارا پیٹا بھی بہت زیادہ مگر بے سود معلوم ہوا دو چار دن مار کا اثر رہا پھر وہی کھیل کا شوق سوار ہوا. بالآخر والد صاحب مرحوم نے طے کر لیا کہ اسکو یہاں نہ رکھنا چاہیئے اور دیو بند ہی بھیج دینا چاہیئے چنانچہ تین مہینہ بھائی صاحبوں کی روانگی کے گزرنے کے بعد جناب منشی فیروز الدین صاحب بٹالوی مرحوم کے ساتھ دیو بند بھیج دیا۔
منشی صاحب مرحوم بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب کے باشندہ اور والد صاحب مرحوم کے بہت زیادہ دوست اور فیض آباد میں محافظ دفتر تھے۔ پیر بھائی ہونے کی وجہ سے آپس میں بہت زیادہ خلوص اور ربط تھا. وہ کسی ضرورت سے اپنے وطن بٹالہ کو جا رہے تھے. والد صاحب مرحوم نے ان کو کہا کہ حسین احمد کو اپنے ساتھ لیتے جایئے اور دیو بند پہنچا دیجئے چونکہ سہارنپور ہی ہو کر ان کا راستہ تھا اس لئے ان کو کوئی دقت نہ تھی. چنانچہ اوائل صفر ۱۳۰۹ھ میں میں اُن کے ساتھ دیو بند پہنچ گیا اور ہر دو بھائیوں کے زیر سایہ انہیں کے کمرہ میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مکان کے قریب رہنے لگا۔ یہ کمرہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے سامنے کوٹھی میں واقع تھا۔
یہاں پہنچنے کے بعد گلستان اور میزان شروع کی۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ آپ تبرکاً اس کو دونوں کتابیں شروع کرا دیں۔ مجمع میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم اور دوسرے اکابر علماء موجود تھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا خلیل احمد صاحب سے فرمایا کہ آپ شروع کرا دیں چنانچہ اُنہوں نے ہر دو کتابوں کو شروع کرا دیا اور پھر بھائی صاحب نے میزان، منشعب پڑھائی۔ اگرچہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہو چکا مگر جسم اس قدر دبلا اور پستہ تھا کہ کوئی دیکھنے والا یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس

کی عمر گیارہ سال سے زائد ہے اس وجہ سے مجھ پر وہاں شفقت زیادہ کی گئی وہاں اس قدر دور کے نو عمر اور چھوٹے طالب علم عموماً نہیں جاتے ہیں اور چونکہ میں تحریر و حساب وغیرہ سے بخوبی واقف تھا۔ خط بھی فی الجملہ اچھا تھا اس لئے اساتذہ کے یہاں خانگی خطوط اور خانگی حسابات کی خدمت اور گھروں میں جانا اور پردہ کا نہ کیا جانا وغیرہ کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ (رحمہا اللہ تعالیٰ) بہت زیادہ شفقت فرماتی تھیں۔ مستوراتی منشی مشہور ہو گیا تھا۔

دیوبند پہنچنے کے بعد وہ ضعیف سی کھیل کود کی آزادی جو کہ مکان پر تھی وہ بھی جاتی رہی دونوں بھائی صاحبان اور بالخصوص بڑے بھائی صاحب سب سے زیادہ سخت تھے خوب مارا کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم تو ممکن ہے کہ ان کو مارتے وقت یا بعد میں کچھ شفقت آجاتی ہو مگر یہاں تو وہ بھی نہ تھی۔ بہر حال اس تقید اور نگرانی نے مجھ میں علمی شغف زیادہ سے زیادہ اور لہو و لعب کا شغف کم سے کم کر دیا۔ فرحمھما اللہ وجازاھما احسن الجزاء۔

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمات

بھائی صاحب مرحوم نے گلستان کے تو شاید ایک ہی دو سبق پڑھائے مگر میزان منشعب خوب توجہ سے پڑھائی۔ جب دونوں خوب یاد ہو گئیں تو اس کے بعد پنج گنج، صرف میر حضرت حکیم محمد حسن صاحب مرحوم کے پاس یکے بعد دیگرے پڑھیں۔ اور یہ اسباق مدرسہ کے اوقات کے علاوہ خارج میں ہوئے اور اسی طرح بہت سے اسباق خارج اوقات میں عصر کے بعد مغرب کے بعد عشاء کے بعد ہوتے رہے جن کی وجہ سے مجھ کو جلد ترقی کرنے کا موقعہ ملتا رہا اور اپنے ہم سبقوں کو نیچے درجات میں چھوڑ کر اگلی جماعتوں اور کتابوں میں شمول کا امتیاز حاصل ہو گیا۔ اور اس شغف اور پابندی کو دیکھ کر اساتذہ کرام نے بھی اپنی عنایتیں زیادہ سے زیادہ مبذول فرمائیں۔

خلاصہ یہ کہ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا اس مدت میں مندرجہ ذیل کتابیں مندرجہ ذیل اساتذہ کے پاس ہوئیں۔

(۱) حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز۔ دستور المبتدی، زرادی، زنجانی، مراح الارواح قال اقول مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصدیقات، قطبی تصورات،

میر قطبی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابو داؤد، تفسیر بیضاوی شریف، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی حاشیہ خیالی، موطا امام مالک موطا امام محمد رحمہما اللہ تعالےٰ۔

(۲) مولانا ذوالفقار علی صاحب (والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما) فصول اکبری

(۳) مولانا عبدالعلی صاحب رحمہ اللہ مدرس دوم دارالعلوم مسلم شریف۔ نسائی شریف ابن ماجہ، سبعہ معلقہ حمد اللہ، صدرا، شمس بازغہ۔ توضیح تلویح، تصریح،

(۴) مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند تلخیص المفتاح۔

(۵) مولانا الحکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس درالعلوم دیوبند۔ پنج گنج، صرف میر نحو میر، مختصر معانی، سلم العلوم، ملا حسن۔ جلالین شریف، ہدایہ اوّلین۔

(۶) مولانا المفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند۔
شرح جامی بحث فعل، کافیہ، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنز الدقائق، شرح وقایہ، شرح مأتہ عامل۔ اصول شاشی۔

(۷) مولانا غلام رسول صاحب مرحوم بفوی مدرس دارالعلوم دیوبند۔
نورالانوار، حسامی، قاضی مبارک۔ شمائل ترمذی،

(۸) مولانا منفعت علی صاحب مرحوم،
میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میبذی، خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، سراجی،

(۹) مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم۔ شرح ملا جامی بحث اسم۔

(۱۰) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ مقامات حریری۔ دیوان متنبی۔

(۱۱) بڑے بھائی صاحب مرحوم۔ میزان الصرف، منشعب۔ ایساغوجی۔

غرضیکہ ان مختلف علوم و فنون کی یہ سر سٹھ کتابیں جو سترہ فنون سے متعلق ہیں ساڑھے چھ برس کی مدت میں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ کتابیں عموماً درس نظامی اور نصاب درس ولی اللہی سے تعلق رکھنے والی ہیں جو کہ ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں جاری ہیں کچھ کتابیں ادب، ہیئۃ، عروض، طب وغیرہ کی جو کہ داخل نصاب تھیں باقی رہ گئی تھیں، سفر حجاز کی وجہ سے وہ پوری نہ ہو سکیں۔

حضرت شیخ الہند صاحب رحمۃ اللہ علیہ اوّل مدرس تھے اور ان کے پاس طلبہ کی بڑی بڑی کتابیں ہوتی تھیں۔ ابتدائی کتابیں اُن کے پاس نہ ہوتی تھیں اور نہ ہو سکتی تھیں۔ مگر چونکہ حضرت

رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھتیجے منشی حبیب حسن صاحب ہماری جماعت میں تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اُن سے بوجہ اُن کی حقیقی والدہ کے فوت ہو جانے اور قرابت قریبہ کے بہت زیادہ انس تھا اور اس وجہ سے بھی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ہم تینوں بھائیوں پر بہت زیادہ شفقت تھی اور بڑے بھائی صاحب مرحوم خدمت میں غیر معمولی حاضری دیتے اور امور خدمت انجام دیتے رہتے تھے اس لئے رعایت خاصہ فرماتے رہے اور مندرجہ بالا ابتدائی کتابیں بھی مجھ کو پڑھائیں۔ پڑھنے میں بدشوق میں ہمیشہ رہا ہوں کتابوں کا پوری طرح مطالعہ کرنا اور سبق پڑھنے کے بعد کتاب کو دیکھنا یا تکرار کرنا بہت کم ہوا۔ البتہ اس کا ہمیشہ التزام کیا کہ اسباق میں حاضری ضرور دیتا رہا اور حتی الوسع مقام درس میں سبق سمجھ لینے کی پوری جدوجہد کرتا تھا۔ جب تک ابتدائی کتابیں ہوئیں جن کا تقریری امتحان ہوتا تھا امتحانوں میں عمدہ اور اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتا رہا مگر جب تحریری کتابیں آئیں (یعنی درجہ وسطےٰ اور اوپر کے درجہ کی وہ کتابیں جن میں تحریری امتحان ہوتا تھا) اُن میں پہلے سال چھ کتابوں میں سے تین میں فیل ہو گیا۔ چونکہ تحریری امتحانوں میں تمام کتاب میں سے صرف تین سوال دیئے جاتے تھے اور کوئی تعین مبحث اور باب و فصل کی طالب علم کو بتلائی نہیں جاتی تھی اس لئے اگر پوری کتاب پر اچھی طرح عبور نہ ہو اور مباحث اچھی طرح یاد نہ ہوں امتحان میں کامیاب ہونا سخت مشکل ہوتا تھا۔ نیز قاعدہ یہ بھی تھا کہ تینوں سوالوں کے انفرادی نمبروں کو تین پر تقسیم کرکے اوسط نمبر نکالا جاتا تھا جس پر مدار کامیابی ہوتا تھا اس لئے اگر دو سوالوں کے جوابات عمدہ سے عمدہ بھی لکھے جائیں اور ایک کا جواب کچھ نہ ہو تو نمبر اوسط تین پر تقسیم ہونے کے بعد کامیابی کے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے سخت محنت کرنا ضروری ہوتا تھا اور بغیر اس کے پاس ہونا انتہائی دشوار ہوتا تھا اس بناء پر میں نے ایام امتحان میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ رات کو کتاب ابتداء سے اخیر تک مطالعہ کرتا تھا اور تمام رات میں صرف ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کم سوتا تھا۔ نیند کے دور کرنے کے لئے نمکین چاء کا انتظام کرتا تھا جب بھی نیند غالب آتی تھی اس چاء کو پیتا تھا جس سے گھنٹہ دو گھنٹہ کو نیند جاتی رہتی تھی کیونکہ میں ہمیشہ سے نیند سے مجبور رہتا ہوں اور بالخصوص کتب بینی کے وقت تو نیند بہت ہی غالب آجاتی ہے۔ اس طریقہ پر عمل کرنے کی وجہ سے مجھ کو تحریری امتحان کی مشکلات پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد بحمد اللہ کسی کتاب میں فیل ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ بلکہ اپنی

جماعت میں اکثر امتیازی نمبر حاصل کرتا رہا۔

دارالعلوم دیوبند کا امتحان

دارالعلوم دیوبند کا امتحان ابتداء سے نہایت سخت رکھا گیا ہے خواہ تقریری ہو یا تحریری طالب علم کو تقریری امتحان میں کوئی جگہ بتائی نہیں جاتی۔ جہاں سے ممتحن چاہے فوری طور پر پوچھتا ہے طالب علم کو موقع امتحان پر غور و فکر کا موقع اور وقت نہیں دیا جاتا البتہ داخلہ کے امتحان میں کچھ آسانیاں کی جاتی ہیں اور تحریری امتحان میں بھی کسی جگہ کو کتاب میں سے متعیّن نہیں کیا جاتا۔ صرف اس دن اور وقت کا اعلان کیا جاتا ہے جس میں امتحان ہونے والا ہے۔

پرچہ ہائے سوالات نہایت حفاظت سے چھپوائے جاتے ہیں جن کا پتہ لگنا طلبہ کو محال ہوتا ہے۔ تمام کتاب میں سے جس مقدار کو طلبہ نے پڑھا ہے صرف تین سوال دیئے جاتے ہیں مفروضہ نمبر کچھ نہیں ہوتے اور نہ زائد سوالات دیئے جاتے ہیں تاکہ طالب علم ان دس بارہ سوالات میں سے انتخاب کرکے جو سوالات پسند آئیں ان کو لکھے اور مفروضہ نمبروں سے ایک تہائی حاصل کر لینے پر کامیاب شمار کیا جا سکے۔ کاش اگر ایسا کیا جا سکتا (جیسا کہ سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں وغیرہ میں رائج ہے) تو شاید ناکام طلباء کا وہاں وجود ہی باقی نہیں رہتا۔

امتحان گاہ میں حفاظت وغیرہ کا انتظام مکمل کیا جاتا ہے جس کی بناء پر طلبہ کو استمداد و استعانت کا موقعہ بالکل حاصل نہیں ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ دوسرے مدارس عربیہ میں اس قدر نگہداشت اور سختی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے عربی تعلیم میں بہت زیادہ خامیاں ہوتی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور ممتحنین بھی دوسرے مدارس کے امتحانات اور پرچہ ہائے امتحان اور جوابات میں مجبور کئے جاتے ہیں کہ وہ کہیں بھی ایسی سختی عمل میں نہ لائیں جس کے وہ عادی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب دارالعلوم کا طالب علم کسی ادارہ (مولوی فاضل۔ مولوی عالم وغیرہ) میں داخل ہو جاتا ہے یا انگریزی زبان کے درجات میں تعلیم حاصل کر کے امتحان دیتا ہے تو وہ اپنی جماعتوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر لیتا ہے جس کی نظیریں بکثرت موجود ہیں۔

دارالعلوم میں جب داخل ہوا تو اہتمام جناب حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کا تھا تھوڑے عرصہ کے بعد جناب منشی فضل حق صاحب مرحوم مہتمم مقرر کئے گئے اور حضرت حاجی صاحب مرحوم مذکور الصدر بمنزلہ صدر مہتمم و رکن مجلسِ شوریٰ اُن کے نگہبان ہو گئے۔

پھر کچھ عرصہ کے بعد مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مقرر ہو گئے اور پھر بعض وقائع کی بناء پر غالباً ۱۳۱۲ھ میں مولانا الحافظ احمد صاحب خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ مہتمم مقرر ہوئے اور تا حیات یعنی ۱۳۴۷ھ تک عہدۂ اہتمام پر رونق افروز رہے ان کے زمانہ اہتمام میں دارالعلوم نے بہت زیادہ ترقی کی۔

جس زمانہ میں داخل مدرسہ ہوا اس زمانہ میں بیشتر طلبہ کی امداد اہالی دیوبند کھانوں سے کیا کرتے تھے۔ اصحاب استطاعت ایک ایک یا دو دو یا اس سے زائد طالب علموں کا کھانا دو وقتہ اپنے یہاں مقرر فرما دیتے تھے اور یہی طریقہ ابتدائی قیام مدرسہ سے تھا۔ وظائف خوراک نقدی صورت میں ابتداء میں بہت کم تھے مگر بعد میں ایسے ناخوشگوار واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے عام طلبہ کو خوراک کے نقدی وظائف دارالعلوم کی طرف سے جاری کرنے ضروری معلوم ہوئے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد دارالعلوم میں مطبخ کا انتظام ہو گیا جس کی بناء پر اہل شہر کی امداد طعام اور نقدی وظیفہ تقریباً نفی کے حکم میں ہو گیا۔

ہم تینوں بھائیوں کا بھی اُس زمانہ میں دارالعلوم کی طرف سے کھانا مقرر کیا گیا چنانچہ میرا کھانا حضرت مولانا حافظ احمد صاحب خلف الصدق مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے یہاں اور بڑے بھائی صاحب کا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں اور بھائی سید احمد صاحب کا دوسری جگہ مقرر ہوا۔ جب تک میں دیوبند میں رہا تقریباً تمام مدت اقامت میں میرا کھانا حضرت حافظ صاحب موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے درِ دولت پر رہا۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

کھانوں کے تقرر کی وجہ سے طالب علم بالکل متفرغ ہو کر مشاغل علمیہ میں منہمک ہو سکتا تھا۔ نقدی وظائف یا اپنے پاس سے کھانے میں وقت بہت ضائع ہوتا تھا۔ اگرچہ میں بدشوق اور محنت و جفاکشی سے جان چور ہمیشہ سے تھا مگر بحمد اللہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا علمی شغف اور اور طبعی تناسب بھی روز افزوں ہوتا گیا اور اسی وجہ سے لہو و لعب بھی غیر مرغوب ہو گیا۔ اگرچہ بعد میں قیود شدیدہ سے آزاد ہو گیا تھا۔ مگر مجھ کو اس سے بہت کم دوچار ہونے کا موقع ملا۔

ابتداءً ابتداء میں مجھ کو منطق اور فلسفہ سے بہت شغف رہا۔ پھر علم ادب سے شغف ہو گیا۔ مقاماتِ حریری اور دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ کے قصائد اور عبارتیں کی عبارتیں ازبر یاد ہو گئیں تھیں۔ پھر علم حدیث سے شغف ہو گیا اور پہلے دونوں شغفوں

میں کمی آگئی اور علم حدیث کے انہماک ہی میں دورِ طالب علمی ختم ہو گیا۔

ابتداء سے نمبر ہائے امتحانیہ ۱۸-۱۹-۲۰ مقرر تھے۔ اوّل درجہ بیس کا تھا اور اوسط انیس[۱۹] کا اور ادنیٰ اٹھارہ کا اس سے کم نمبر پر طالب علم انعامی نمبروں سے گرا ہوا شمار ہوتا تھا اور اس کو فیل ہونیوالا کہا جاتا تھا اگر کوئی طالب علم غیر معمولی استعداد والا ہوتا اس کو ممتحن بیس سے زائد نمبر بھی دیتا تھا جو کہ درجہ اعلیٰ کے نمبروں میں سے سمجھا جاتا تھا بحمد اللہ اس زمانہ میں اکیس اکیس اور بائیس بائیس اور تیئس تیئس بھی متعدد کتابوں میں نمبر آتے رہے۔ اس کے بعد اراکین مدرسہ نے امتحانی اور تعلیمی ضرورتوں کی بناء پر اس قاعدہ میں تبدیلی کی اور ادنیٰ درجہ کامیابی کا چالیس اور متوسط درجہ بیتالیس اور اوّل درجہ پچاس مقرر کیا۔ اس تغیر کے بعد امتحانات میں اکاون، باون، ترپن اور صدراہیں پچھتر نمبر تک حاصل ہوئے۔ والحمد للہ۔

ہندوستان سے مدینہ منورہ کا سفر

۱۳۱۶ھ میں جبکہ میں اکثر کتب درسیہ سے فارغ ہو چکا تھا صرف علم ہیئۃ میں سے شرح چغمینی۔ سبع شداد اور ادب میں سے حماسہ۔ تاریخ یمینی۔ طب میں سے موجز قانونچہ شرح اسباب نفیسی اور علم عروض کی رائج کتابیں۔ فقہ میں سے درمختار وغیرہ باقی تھیں کہ والد صاحب مرحوم کا سامانِ سفر حجاز و عرب مکمل ہو گیا۔ مزروعہ زمین جس قدر بھی والد صاحب مرحوم کے حصہ میں الہداد پور اور جڑوان پور میں تھی اس کو ٹانڈہ کے ایک رئیس نے خرید لیا اور سکنائی زمین اس خیال سے نہیں بیچی کہ ممکن ہے اولاد میں سے کوئی واپس آئے تو کم از کم رہنے کے لئے تو اس کو ٹھکانہ مل جائے مسکونہ مکان کی قیمت بھی نہایت کم ملتی تھی اس لئے بھی اس کو فروخت نہیں کیا۔ زمین کی آمدنی اور تنخواہ وغیرہ سے کچھ روپیہ والد صاحب نے پس انداز کر رکھا تھا اس لئے مجموعہ تقریباً پانچ ہزار روپے ہو گیا تھا ضروریاتِ سفر فرش، لباس وغیرہ بھی سب مکمل کر کے والد صاحب مرحوم نے اعلان کر دیا کہ شعبان ۱۳۱۶ھ میں روانہ ہو جائیں گے میں نے استدعا کی کہ مجھ کو ایک سال کے واسطے چھوڑ دیا جائے تاکہ میں بقیہ کتب پڑھ لوں اس کے بعد میں آجاؤں گا تو اس کی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ مدینہ منورہ میں چل کر پڑھ لینا۔ خلاصہ یہ کہ بارہ آدمیوں کا مختصر سا قافلہ اس سفر کے لئے تیار کیا گیا۔ والدینؒ مرحومین۔ بھائی محمد صدیق صاحب[۵] مرحوم معہ زوجہ و پسر وحید احمد۔ بھائی سید احمد صاحب مرحوم معہ زوجہ حسین احمد[۹] معہ زوجہ۔ عزیزم محمود احمد سلمہ۔ ہمشیرہ[ؒ] عزیزہ ریاض فاطمہ مرحومہ۔ عزیزم[ؒ] جمیل احمد مرحوم۔

اس برس بمبئی اور سواحل بحر ہند میں طاعون تھا اس لئے مغربی ہند کے تمام بندر بند تھے کسی سے جہاز کو سفر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف مشرقی ہند خلیج بنگال میں چاٹگام سے اجازت شمالی اور مشرقی ہند کے حصوں کے باشندوں کو دے دی گئی تھی اور قرنطینہ کے لئے پنجاب میں انبالہ یوپی میں الہ آباد۔ بنگال میں چاٹگام مقرر کیا گیا تھا اور ہر جگہ پر ان میں سے کیمپ حجاج بنائے گئے تھے۔ الہ آباد کیمپ میں شعبان کے آخر میں ہمارا قافلہ داخل ہوا۔ یہ کیمپ شہر سے باہر دریا کے قریب جہاں پر گنگا جمنا ملتے ہیں ایک پرانی کوٹھی میں بنایا گیا تھا دس بارہ دن یہاں قیام کیا گیا ڈاکٹری معائنہ ہوتا تھا۔ اہل شہر میں سے کسی کو ہم سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیمپ میں سوائے مامورین کے کسی کو داخل نہیں کیا جاتا تھا مولانا محمد حسین صاحب مرحوم الہ آبادی تشریف لائے تو ان کو بھی اندر داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ صرف دروازہ کیمپ پر دور دور سے باتیں ہو سکیں۔ اس عرصہ میں ہمارے تمام کپڑے خواہ مستعمل تھے یا غیر مستعمل ایک بڑے کڑاہ میں دوا ڈالے ہوئے کھولتے ہوئے پانی میں پکائے گئے جس سے پشمینہ اور اونی کپڑے اور رنگے تھان وغیرہ خراب ہو گئے (حالانکہ دوسرے بڑے بڑے مقامات قرنطینہ میں صرف مستعمل سوتی کپڑے بھاپ کے انجن میں ڈسین فکٹ کئے جاتے ہیں کامران، بمبئی، کراچی وغیرہ میں یہی حال ہے) اگرچہ مدت قرنطینہ صرف دس روز تھی مگر گاڑی وغیرہ کے انتظام کی وجہ سے کچھ دیر لگ گئی اور رمضان کی دسویں یا بارہویں کو ہم روانہ ہو سکے ریل گاڑی میں ایسا ڈبہ منگایا گیا تھا۔ جس میں ایک کمرہ سلاخوں والا تھا جس میں خطرناک قیدی سفر کرائے جاتے ہیں۔ اس میں ہم سبھوں کو بٹھایا گیا اور عام مسافروں سے بالکل الگ تھلگ رکھا گیا۔ محافظ کیمپ ہمارے ہمراہ تھا جو کہ اسٹیشنوں پر ہماری حفاظت کرتا تھا کہ کسی شخص سے ہماری ملاقات نہ ہونے پائے۔ اس طرح ہم سفر کرکے الہ آباد بنڈیل ہٹی گوالنڈو، چاندپور ہوتے ہوئے چاٹگام پہنچے۔ جب تک ہم ای۔ آئی۔ آر پر سفر کرتے رہے ہماری پوری نگرانی ہوتی رہی۔ جس اسٹیشن پر ایکسپریس ٹھہرتی تھی وہاں سے تار پہنچ جاتا تھا اور سپاہی کمرہ کے سامنے آکر محافظت کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا۔ بنڈیل کے بعد یہ تمام انتظام ختم ہو گیا صرف محافظ کیمپ جو کہ ہمدرد مسلمان تھا اس کی نگرانی باقی رہی۔ کرایہ ریل اور جہاز ہم سے پہلے ہی الہ آباد میں وصول کر لیا گیا تھا۔ چاٹگام اسٹیشن سے ایک دو اسٹیشن پہلے پہاڑتلی اسٹیشن کے قریب ریلوے لائن کے کنارے حجاج کا کیمپ بنوایا گیا تھا جو کہ

وہاں کی رنگین پہاڑیوں سے ملا ہوا تھا۔ ایک انگریز افسر تمام کیمپ کا مع چند کانسٹبلوں کے محافظ تھا۔ ہم سب اس کیمپ میں داخل کر دیئے گئے اور خس پوش بانس کی پردہ دار بیرک میں ہم کو ٹھہرا دیا گیا۔ اس کیمپ میں پہلے سے صرف صوبہ بنگال کے مختلف اضلاع کے حجاج موجود تھے۔ یوپی سے فقط ہمارا خاندان تھا آخر میں پنجاب سے بھی کچھ لوگ سیالکوٹ وغیرہ کے آگئے تھے۔ کچھ ترکستان چینی اور سرحد کے لوگ بھی آئے۔ جہاز کے انتظار میں اسی کیمپ میں ایک مہینہ سے کچھ زائد ٹھہرنا پڑا۔ اواخر شوال میں حاجی قاسم کمپنی کا زبیدہ جہاز چاٹگام پہنچا اور ہماری انتظار کی گھڑیاں اختتام کو پہنچیں۔ اس سال اس جہاز کے بعد ایک دوسرا جہاز مرزاپور بھی چاٹگام سے روانہ ہوا تھا۔ اس کے بعد کوئی جہاز نہیں گیا۔

سپرنٹنڈنٹ کیمپ ہم لوگوں پر کچھ مہربان ہو گیا تھا اس نے کپتان جہاز سے اوپر کے حصہ پر ایک بہت بڑا کمرہ جو کہ جہاز کے وسطانی حصہ میں کسی زمانہ میں ڈاک کے لئے مخصوص تھا (کیونکہ یہ جہاز غالباً پی او کمپنی سے حاجی قاسم کمپنی نے خریدا تھا) دلوا دیا جس کی وجہ سے نہایت اطمینان سے تمام خاندان ایک ہی محفوظ و پردہ دار کمرہ میں سفر کر سکا۔ تقریباً سترہ اٹھارہ دن سفر کر کے جہاز عدن ہوتا ہوا کامران پہنچا۔ وہاں ہم سب اتارے گئے اور دس دن تک حجاج کیمپ میں ٹھہرنا پڑا۔ فی کس دس دس روپیہ فیس قرنطینہ دینی پڑی (اب قاعدہ بدل گیا ہے۔ جہاز کے کرایہ کے ساتھ ساتھ کامران کی فیس دس دس روپیہ وصول کر لی جاتی ہے۔ جہاز کامران پہنچتا ہے اور قرنطینہ کے افسر اور ڈاکٹر جہاز پر آ کر فیس وصول کر کے اجازت روانگی کی دیتے ہیں۔ کپتان اور جہاز کے ڈاکٹر کی رپورٹ دربارہ صحت مسافرین قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ ہاں اگر جہاز میں بیماری ہیضہ وغیرہ ہو اور ڈاکٹر رپورٹ کر دے تو مسافروں کو اتارنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

وہاں سے روانگی کے تیسرے دن جہاز جدہ پہنچا۔ جدہ کے پورٹ اسٹیشن پر پورٹ اسٹیشن کی فیس تقریباً ساڑھے سات روپے یا کچھ زائد فی کس لی گئی نیز کرایہ کشتی بھی وصول کیا گیا۔ اس کے بعد ہم کو مطوف کے کارندے کے حوالے کر دیا گیا۔

(اب پورٹ کی فیس وغیرہ کا قاعدہ بدل گیا ہے جہاز کے ٹکٹ کے ساتھ یہ بھی وصول کر لیا جاتا ہے اور کپتان فی کس مقرر مقدار حکومت حجاز کو ادا کر دیتا ہے۔

یا کمپنی کے نمائندے سے حکومتِ حجاز وصول کر لیتی ہے۔ مشہور ہے کہ اب فی کس پچیس روپیہ وصول کئے جاتے ہیں۔ البتہ کرایہ کشتی اب بھی پورٹ اسٹیشن پر وصول کیا جاتا ہے۔ وہاں نکلنے پر کسٹم میں تمام اسباب کا معائنہ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی محصولی مال ہو تو اس پر محصول وصول کیا جاتا ہے) بالآخر ذیقعدہ کی ۲۴ یا ۲۵ تاریخ کو ہم مکّہ معظمہ پہنچے۔ سید ابوبکر رشیدی مرحوم کو مطوف بنایا گیا تھا ان کے ایک صبی (کارندہ) بنگالی تھے اُن کے مکان پر محلہ جیاد میں قیام کیا۔ اگرچہ اُن کا مکان نہایت تنگ تھا مگر ہم لوگ بالکل ناواقف تھے اور ٹھہرنا بھی کم تھا اس لئے کچھ کنج و کاؤ نہیں کیا گیا۔ مختلف قسم کی تکالیف پر صبر کیا گیا۔ طواف قدوم سے فارغ ہو کر حضرت قطب عالم مولانا الحاج امداد اللہ صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی بارگاہ عالی میں حاضری کا شرف حاصل کیا۔ اور پھر روزانہ حاضر ہوتے رہے۔ درمیان میں مجھ کو چند روز بخار بھی آیا جس سے حاضری میں کمی ہوئی حج اور عمرہ کے مناسک ادا کرنے کے بعد غالباً ۲۵ یا ۲۶ ذی الحجہ کو مدینہ کی روانگی ہوئی اور تقریباً بارہویں دن محرم ۱۳۱۷ھ کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ منورہ میں شرفِ حضور حاصل ہوا۔ حرم نبوی کے باب النساء کے قریب زقاق البدور کے کنارہ پر ایک مکان کرایہ پر لے کر قیام کیا گیا۔ مگر چونکہ وہ مکان تنگ تھا اس میں اتنے کمرے نہ تھے کہ چار پردہ دار علیحدہ علیحدہ رہ سکیں نیز اس میں کنواں بھی نہ تھا اس لئے سخت تکالیف کا سامنا ہوا۔

(نوٹ) مدینہ منورہ میں ہر مکان میں کنواں ہونا ضروری ہے۔ جو مکان کنوئیں سے خالی ہو وہ نہایت کم کرایہ پر اٹھتا ہے اور لوگ اُس میں رہنے سے احتراز کرتے ہیں۔ کیونکہ استعمال کے لئے وضو، غسل، برتنوں کے دھونے کپڑوں کے دھونے استنجاء وغیرہ کے لئے پانی کی بہت ضرورت ہوتی ہے اگر ان مصارف کے لئے سقہ سے پانی منگایا جائے تو بہت زیادہ خرچ پڑتا ہے وہاں پر سقہ اس زمانہ میں صرف ایک مشک پانی پر ڈھائی روپیہ (ایک مجیدی) ماہوار لیا کرتا تھا۔ عموماً سقوں کو صرف پینے اور کھانا پکانے کے پانی کیلئے رکھا جاتا ہے سقے نہر زرقا سے (جس کے تمام شہر میں متعدد مخزن بنے ہوئے ہیں) پانی لاتے ہیں۔ یہ پانی نہایت شیریں اور ہلکا ہے۔ گھروں میں جو کنوئیں پائے جاتے ہیں ان کا پانی شیریں نہیں ہوتا۔ بلکہ کم و بیش کھاری ہوتا ہے جو کہ استعمال کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔

نہر زرقاء کی مجمل کیفیت

نہر زرقاء بنی اُمیہ کے زمانہ کی جاری کی ہوئی نہر ہے جو کہ قبا کی پہاڑیوں میں سے کھود کر نکالی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مروان بن حکم نے جبکہ وہ وہاں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حاکم تھا اُن کے حکم سے نکلوائی تھی۔ چونکہ اس کی آنکھیں ازرق یعنی نیلگوں تھیں اس لئے اس نہر کو زرقاء کہا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مروان بن حکم کی ماں یا دادی کا نام یا لقب زرقا تھا۔ اس لئے اس نہر کا نام زرقا ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا پانی نہایت صاف و شفاف تھا اور دُور سے ازرق یعنی نیلگوں معلوم ہوتا تھا اس لئے اس کو زرقا کہا گیا۔ اب بھی اس کا وہ سُوت جو کہ قدیمی ہے اور پہاڑ کی طرف سے مجمع الماء (وہ کنواں جس میں دو سوت جمع کئے گئے ہیں) میں گرتا ہے۔ نہایت صاف اور شفاف ہے۔ اوپر سے نیلگوں ہی معلوم ہوتا ہے۔ غرضیکہ یہ نہر بہت قدیمی ہے اور تمام شہر مدینہ منورہ میں اسی کا پانی استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر یہ نہر کاریز کی طرح سے زمین دوز ہے۔ سطح زمین کی اونچائی کی وجہ سے نیچے نیچے لائی گئی ہے اور شہر میں مختلف مقامات پر اس کے مخزن بنا دیئے گئے۔ جن میں پتھر کی وسیع پیمانہ پر سیڑھیاں لگا دی گئی ہیں لوگ نیچے اتر کر نہر سے پانی بھرتے ہیں لوہے کی ٹونٹیوں سے ہر وقت پانی گرتا رہتا ہے۔ اس سے مشکیں اور برتن بھرے جاتے ہیں۔ یہ ٹونٹیاں دن رات جاری رہتی ہیں بعض جگہوں پر اسی نہر میں کنواں بنا دیا گیا ہے اس میں ڈول رسی سے کام لیا جاتا ہے چونکہ قدیمی نہر کا پانی بعد کو شہر کیلئے کافی نہیں ہوتا تھا اس لئے قباء کے چند کنوؤں کا بھی پانی (جس میں سے بیر اریس بھی ہے جس کو بیر خاتم بھی کہتے ہیں کیونکہ اسی کنویں میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے یا اُنکے غلام سے گر کر مفقود ہو گئی تھی) ملا دیا گیا ہے قباء کے باہر ایک مجمع الماء ہے جو کہ بشکل وسیع کنویں کے بنا ہوا ہے وہاں دونوں سوت آکر مل جاتے ہیں۔ کنوؤں والا سوت اگرچہ شیریں ہے مگر اس کا پانی گدلا ہے۔ قبا کے تمام کنویں شیریں ہیں اور زمین بھی شیریں ہے اور اسی طرح قربان اور عوالی کا بھی حال ہے اس کے علاوہ چند اور بھی زمین دوز نہریں قبا اور دیگر اونچی سطحوں سے نکالی گئی ہیں مگر وہ شہر کے باہر باہر گذرتی ہیں اُن کا پانی اس قدر شیریں نہیں ہے۔ یہ نہریں باغوں کے واسطے نکالی گئی ہیں مدینہ منورہ کے شمال و مغرب کی زمین بہت پست ہے وہاں پہنچ کر یہ نہریں سطح باغات پر آجاتی اور باغوں میں کھیتی اور درختوں کی آبپاشی انہیں نہروں سے ہوتی ہے۔

جبلِ اُحد کے غربی اور شمالی جوانب میں ایسے بہت سے باغات ہیں۔ ان کو عیون کہتے ہیں۔ انہیں میں یہ نہریں گذرتی ہیں اور ان کا پانی انہیں میں ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ان کی جدوجہد کی وجہ سے بہت سی نہریں نکالی گئی تھیں اور مدینہ منوّرہ میں اس قدر زراعت بڑھ گئی تھی کہ غلّہ مدینہ منوّرہ کے مصارف سے بچ کر ملک شام وغیرہ کو تجارت کے لئے ہزاروں من کی مقدار میں جاتا تھا۔ مگر درمیانی زمانے کے انقلابات نے ان نہروں کو بند کر دیا تھا۔

سلطان عبدالمجید خاں مرحوم نے اس طرف توجہ کی اور تعمیر حرم محترم نبوی علیہ السلام کے بعد کچھ نہریں جن کا سراغ مل سکا صاف کرائیں (واضح ہو کہ موجودہ عمارت مسجد نبویؐ کی سلطان موصوف ہی کی بنوائی ہوئی ہے جس میں بہت زیادہ مصارف کی نوبت آئی ہے) ان باغوں اور نہروں سے غلّہ اور کھجوریں وغیرہ پیدا ہوتی ہیں مگر کافی نہیں ہوتے۔

(نوٹ) مدینہ منورہ کی جنوبی اور مشرقی جانب اُونچی ہے اس کی سطح پر متعدد بستیاں کچھ فاصلہ پر آباد ہیں درمیان میں کھجوروں، انار، انگور، انجیر، آڑو وغیرہ کے باغات ہیں۔ انہیں بستیوں کو عوالی کہتے ہیں انہیں میں سے قربان اور قبا بھی ہیں۔ زمانہ رسالت (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) اور زمانہ خلافت میں یہاں آبادیاں بہت تھیں مگر اب بہت کم رہ گئی ہیں۔

نہر زرقاء کے لئے ترکی حکومت نے اخیر زمانہ میں انجن لگوا کر نلوں کے ذریعہ پانی شہر میں تقسیم کر دیا تھا جس کی وجہ سے اہل شہر کو بہت آسانی ہو گئی ہے مگر وہ مخازن سابقہ بحالہا قائم ہیں۔

الغرض زقاق البدود کے اس مکان کی دشواریاں دیکھ کر دوسرے مکان کو لینے اور پہلے عقد اجارہ کو فسخ کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ مدینہ منوّرہ میں مکانات ماہواری کرایہ پر نہیں ملتے بلکہ سالانہ کرایہ پر ملتے ہیں البتہ حجاج کو یومیہ کے حساب سے یا تا قیام قافلہ کرایہ پر دیئے جاتے تھے۔ جو کہ بہت گراں پڑتا ہے۔ ماہ محرم میں مکانات کرایہ پر اٹھائے جاتے ہیں۔ حارۃ الاغاوات میں ایک وسیع مکان لیا گیا اور اس میں قیام کیا گیا۔ غالباً وہ مکان ایک سو بیس (۱۲۰) روپیہ میں لیا گیا تھا۔

حضرت والد صاحب مرحوم نے مدینہ منوّرہ پہنچ کر جو مقدار نقود کی مصارف سے بچی

تھی حسب حصص شرعیہ ہم لوگوں پر تقسیم کر دی اور فرمایا کہ میں تو ہجرت کی نیت کی ہے اس لئے میں تا زیست یہاں ہی رہوں گا تم لوگوں کو اختیار ہے کہ یہاں رہو یا ہندوستان چلے جاؤ۔ یہ روپیہ واپسی کے لئے کافی ہے۔ ہم لوگوں نے ہجرت کی نیت نہیں کی تھی۔ کیونکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز اور پھر حضرت قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ہجرت کی نیت کرنے سے منع فرما دیا تھا اور یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہجرت کرنے والوں پر امتحانات شدید ہوتے ہیں جس میں اکثر لوگ پھسل جاتے ہیں اور ہجرت توڑ کر اوطان کو واپس ہو جاتے ہیں اور گنہگار ہوتے ہیں۔ صرف قیام کی نیت کرنا اگر احوال سازگار رہوئے قیام کرنا ورنہ جب جی چاہے واپس ہو جاتا حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز تو یہ بھی فرمایا تھا کہ میں نے بھی ہجرت کی نیت اس وقت کی تھی جب کہ میں ایک مرتبہ بیمار ہو کر زندگی سے مایوس ہو گیا تھا اور فرمایا کہ جس کو صرف دُنیا مقصود ہو وہ جدّہ میں رہے اور جس کو دین و دنیا مقصود ہو وہ مکہ معظّمہ میں رہے اور جس کو صرف دین مقصود ہو وہ مدینہ منوّرہ میں رہے کیونکہ ہندوستانیوں کے لئے خصوصاً اور دوسروں کے لئے عموماً جدّہ میں اسباب معیشت بہت اور آسان ہیں اور مکہ معظّمہ میں اس سے زیادہ اور سہل تھے مکہ معظّمہ میں ہندوستانی بکثرت آباد بھی ہیں مگر مدینہ منوّرہ میں اسباب معیشت نہایت ہی کم ہیں اور گرانی زیادہ ہے۔ بہرحال ہم میں سے کسی نے بھی سوائے حضرت والد صاحب مرحوم کے ہجرت کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ صرف قیام کا ارادہ تھا مگر والد صاحب مرحوم کو اکیلا چھوڑ کر چلا آنا نہ والدہ ماجدہ مرحومہ کو گوارا ہوا اور نہ اور کسی کو سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ہم جب تک آپ زندہ ہیں یہاں ہی رہیں گے۔ والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ یہ نقد ہمیشہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتا کوئی آمدنی ہندوستان سے ہمیشہ جاری رہنے والی نہیں ہے۔ عموماً اہل مدینہ کی گذران ان وظائف اور تنخواہوں پر ہے جو کہ اُن کو ترکی حکومت یا دوسرے ممالک سے ملتی ہیں اس لئے کوئی طریقہ معیشت کے لئے عمل میں لانا چاہیئے۔ اس لئے قرار پایا کہ تجارت کی جائے کیوں کہ کوئی صورت ملازمت یا دستکاری یا زراعت وغیرہ کی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ باب الرحمۃ اور باب السّلام کے درمیان میں ایک دوکان کرایہ پر لی گئی جس میں پرچونی سامان چاء، شکر، صابن، چاول، دال وغیرہ رکھا گیا۔ تھوک فروش

تاجروں سے خرید کر مال لایا جاتا تھا اور وہاں ٹھیکہ طریقہ پر فروخت کیا جاتا تھا۔ نیز قرار پایا کہ کھجوروں کے موسم میں جبکہ باغوں سے کھجوریں کٹ کر نیلام کے بازار میں خرید لی جائیں اور اُن کو محفوظ مخزنوں میں ذخیرہ کر لیا جائے اور موسم حج میں ان کو فروخت کر دیا جائے۔ مدینہ منورہ میں کرایہ کے ایسے مکانات ہیں جن میں بڑے بڑے مغربی مٹکے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ مٹکے افریقہ کے مغربی شمالی حصّہ میں مٹی کے نہایت مضبوط بنائے جاتے ہیں۔ اُن کا منہ چھوٹا ہوتا ہے۔ نہایت مضبوط ہوتے ہیں افریقہ سے جہازوں اور کشتیوں پر عرب کے بندرگاہوں تک لائے جاتے اور پھر اُونٹوں پر لاد کر مدینہ منوّرہ پہنچائے جاتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں لوگوں کی آمدنی کے لئے یہ جائداد کا حکم رکھتے ہیں۔ اُن کا کرایہ سال بھر کے لئے کیا جاتا ہے۔ اگرچہ عرب اور مدینہ منوّرہ میں بکثرت مٹکے بڑے منہ والے مختلف مقدار کے بنائے جاتے ہیں مگر وہ اتنے مضبوط اور کارآمد نہیں ہوتے وہ اقسام کھجوروں کی جن میں کیڑے لگ جانے کا خوف زیادہ ہوتا ہے ان مٹکوں میں بھر کر خوب دبا دی جاتی ہیں اور پھر اُوپر سے ام جراون (ہلیّہ) کھجور بھر کر پھر نمک بھر کر مٹی سے مٹکوں کا منہ بند کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے کھجوریں سال سال دو دو سال محفوظ رہتی ہیں۔

مدینہ منورہ میں کھجوروں کی بہت سی قسمیں پیدا ہوتی ہیں۔ خلاصۃ الوفاء اور دیگر تاریخی کتابوں میں ان کے اقسام تقریباً ایک سو تیس ذکر کئے گئے ہیں۔ ہر ایک قسم کا مزہ رنگ، وضع وغیرہ جُدا جُدا ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں تقریباً چالیس قسمیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ہر ایک صنف علیحدہ علیحدہ فروخت ہوتی ہے۔ امام جراون بھی ایک قسم کھجوروں کی ہے اس زمانہ میں اس کا نام ہُلیّہ ہے۔ رطب (تازہ و تر کھجور) کے زمانہ میں سب سے پہلے اس کی ہی رطب ہوتی ہے اور بکثرت کھائی جاتی ہے۔ سوکھنے کے بعد یہ سیاہ اور سخت ہو جاتی ہے۔ اس کے دانے چھوٹے ہوتے ہیں اور سوکھنے کے بعد اس میں جلے ہوئے گڑ کا مزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی پیداوار بہت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے جب پہلے پہل قبا میں وارد ہوئے تو آپ کے سامنے کلثوم بن الہدم رضی اللہ عنہ نے اسی کا خوشہ پیش کیا تھا وہ زمانہ رطب کا تھا آپ نے اس کے لئے دعاء فرمائی تھی۔ اس کھجور کو مٹکوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

خلاصہ یہ کہ کئی سو روپے کی کھجوریں اس طرح خرید لی گئیں اور رباط العجم میں مخزن کرایہ پر لے لیا گیا اور وہ اس کے مٹکوں میں بھر دی گئیں اور بعض اقسام جو کہ بغیر مٹکوں میں بھرنے کے محفوظ رہ سکتی ہیں جیسے ام جردان (کہبیر) لُبانہ، شُخّل (رہبدانہ) وغیرہ وہ سکونت کے مکان ہیں کسی جگہ ذخیرہ کر لی گئیں۔ تھوک مال کی خرید بڑے بھائی مولانا محمد صدیق احمد صاحب مرحوم کرتے تھے ان کو اس کا شوق بھی تھا اور مہارت بھی بہت جلد حاصل ہو گئی تھی دوکان پر میں اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم باری باری بیٹھتے تھے اور کبھی کبھی بڑے بھائی صاحب مرحوم بھی بیٹھتے تھے۔ تھوڑے عرصہ میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس طریقہ سے اگرچہ آمدنی ہے مگر کرایہ دوکان اور دیگر مصارف منہا کرنے کے بعد آمدنی اتنی نہیں ہو سکتی جو کہ روزمرّہ کے اخراجات کو کافی ہو سکے اس لئے میں نے سلسلہ کتابت علی الاُجرت شروع کر دیا۔ عربی نسخ خط میں کتابیں نقل کرتا تھا اور اُجرت حاصل کرتا تھا۔ مدینہ منوّرہ میں اس وقت دو کتب خانے منتظم تھے۔ ایک کتب خانہ شیخ الاسلام[1] اور دوسرا محمودیہ۔ ان دونوں میں قلمی کتابیں نایاب بکثرت تھیں۔ مجاورین مدینہ (باہر کے باشندے جو مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں) اور اہالی شہر اور زائرین کو بسا اوقات کسی کتاب کی ان کتب خانوں سے ضرورت پڑتی ہے تو وہ ان کو نقل کرواتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مصر یا مغربی افریقہ وغیرہ سے بھی لوگ کسی کتاب کی نقل چاہتے ہیں تو اپنے نمائندوں کے ذریعے سے یہاں سے نقل حاصل کرتے ہیں۔ مگر ہر دو کتب خانوں میں اس کی اجازت نہیں تھی کہ کتاب کتب خانہ سے باہر نکالی جائے البتہ انتظام تھا کہ جو شخص کسی کتاب کو نقل کرنا یا مطالعہ کرنا چاہے وہ کتب خانہ ہی میں آکر استفادہ کرے۔ روزانہ کتب خانہ ۳ بجے عربی (یعنی ۹ بجے افرنجی) سے لے کر ۸ بجے عربی (۲ بجے افرنجی) تک کھلا رہتا ہے۔ اس لئے بجز اس مدّت کے دوسرے اوقات میں لکھنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ بنا بریں آمدنی بہت تھوڑی ہوتی تھی اس زمانہ میں چند اور بھی اشخاص یہ مشغلہ کرتے تھے۔ باقی اوقات میں مشاغل سلوک اور درس و تدریس کا سلسلہ میں نے جاری کر لیا تھا۔ نیز چونکہ ادبیات میں بعض کتابیں باقی رہ گئی تھیں اس لئے مدینہ منوّرہ کے مشہور اور معمر ادیب مولانا الشیخ آفندی عبدالجلیل برادہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس شام کو کچھ ادب کی کتابیں ہم تینوں بھائی پڑھتے رہے۔ مشاغل سلوک کی تفصیل علیحدہ آئے گی۔

---

[1] کتب خانہ شیخ الاسلام اب بھی منتظم حالت میں ہے مگر کتب خانہ محمودیہ منتظم نہیں رہا۔ ان دونوں کے لئے استنبول میں اوقاف تھے جن کی آمدنی کا بڑا حصّہ اس نظام کے لئے صرف ہوتا تھا مگر موجودہ حکومت ترکیہ نے انکو ضبط کر لیا ہے۔

مدینہ منوّرہ میں درس وتدریس کا سلسلہ

درس وتدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جبکہ ہم تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو منجملہ رخصت کرنے والوں کے خود حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک پیدل تشریف لائے تھے۔ راستہ میں پُرزور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا۔ چاہے ایک دو طالب علم ہی ہوں اس لئے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض بعض طلبہ ہندوستانی اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے۔ اگرچہ عربی زبان میں عرصہ تک کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی تھی مگر بولنے کی مشق نہ تھی اس لئے اشکال کا سامنا ہوا مگر حسب ہدایت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اوقات کتابت کے دوسرے اوقات میں اس کام کو شروع کر دیا (اس زمانہ میں بہت سے علماء اعزازی طریقہ پر حرم محترم نبوی (مسجد نبوی علیہ السلام) میں پڑھایا کرتے تھے۔ اس سے مجھ کو ایک تو فائدہ یہ ہوا کہ ابتدائی کتابیں صرف ونحو فقہ وغیرہ کی محفوظ ہوگئیں اور دوسرے یہ کہ زبان صاف ہوگئی۔ اہل علم میں عموماً اور علماء حجاز میں خصوصاً حسد اور رقابت کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ اس لئے جب کوئی عالم آتا ہے تو اس کی طرف آنکھیں بہت اٹھتی ہیں اور تنقیدی معاملات اکثر پیش آتے ہیں۔ علماء ہند چونکہ عربی بولنے کے عادی نہیں ہوتے اس لئے بسا اوقات شکست کھاجاتے ہیں۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں پہلے سے علمائے ہند کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کیوں کہ حضرت شیخ محمد عابد انصاری سندی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت شاہ عبد الغنی نقشبندی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ردولوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد اسحٰق صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ بڑے بڑے پائے کے علماء گذرے تھے جن کے غیر معمولی علم اور اعلےٰ استعداد وقابلیت کا سب کو اقرار تھا۔ بہت سی تصانیف اور بہت سے شاگرد ان کے وہاں موجود تھے آخر الذکر ہر دو حضرات اس زمانہ میں زندہ بھی تھے۔ اگرچہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی جلالی اور زاہدانہ طبیعت کی وجہ سے عام طور پر لوگوں کو استفادہ ممکن نہ ہوسکا تھا مگر ان کی اعلیٰ استعداد اور انتہائی قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ بہرحال ہمارے جیسے ٹٹپونجیوں کے لئے ان عربی علماء کے میدان امتیاز وامتحان

میں پیش قدمی یا اعتبار پیدا کرنا نہایت مشکل امر تھا اس لئے ہمارا گوشہ گمنامی میں ایک ایک دو دو طالب علموں کو پڑھانا اور ابتدائی کتب نحو و صرف و فقہ وغیرہ سے اشتغال رکھنا بہت مفید ہوا۔ ۱۳۱۸ھ شوال تک میں اسی طرح ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علموں کو پڑھاتا رہا۔ حلقات درس و تدریس میں کوئی امتیازی شان پیدا نہیں ہوئی اس لئے کسی کی تنقیدی نظر نہیں پڑی۔ ۱۳۱۸ھ ذیقعدہ میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ارشاد کے مطابق گنگوہ شریف کا سفر کیا اور ۱۳۲۰ھ ماہ محرم میں واپس مدینہ منوّرہ پہنچا۔ اس وقت سے سلسلہ تعلیم بڑے پیمانہ پر جاری ہوا جس کا مفصّل حال آگے آئے گا۔

مدینہ منوّرہ کی معیشت ان ایام کی

اگرچہ حسب دعوات نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) مدینہ منوّرہ میں برکات مادیہ بھی بڑے درجہ میں پائی جاتی ہیں اور پیمانہ ہائے ارزاق صاع و مد و وزن وغیرہ میں اس قدر برکت محسوس ہوتی ہے کہ اور جگہ حتیٰ کہ مکہ معظمہ میں بھی اس کا آدھا نہائی حصہ بھی نہیں پایا جاتا اور کیوں نہ ہو۔ ارشاد ہے اللھم اجعل بالمدینۃ ضعفی ما بمکۃ من البرکۃ دوسری روایت ہے ضعفی ما بمکۃ من البرکۃ مگر باوجود اس کے وہاں گرانی اور مالوفات وطنیہ کے نہ پائے جانے اور اسباب معیشت کی قلت بلکہ عدم موجودگی وغیرہ کی وجہ سے ہر ملک کے باشندوں کو نہایت سختیاں پیش آتی ہیں نیز باشندگان مدینہ منوّرہ اگرچہ عموماً نرم طبیعت اور خوش اخلاق ہیں مگر اپنے آپ کو تمام عالم اسلامی سے اشرف اور سب کا پیرزادہ سمجھتے ہیں کسی بیرونی شخص کو مساوات کا درجہ اپنے قلب اور دماغ میں نہیں دے سکتے۔ حالانکہ عموماً بیرونی ہی اشخاص کی اولاد میں کسی کو دو کسی کو تین کسی کو چار یا کم و بیش پشتیں مدینہ منوّرہ میں رہتے ہوئے ہو گئی ہیں۔ زمانہ سعادت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آج تک کا رہنے والا کوئی خاندان وہاں نہیں ہے۔ ایک گھرانہ انصار میں سے کہا جاتا ہے مگر اس کی بھی دو یا تین پشتیں باہر گزری ہیں مگر جو شخص بھی مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوا ہے وہ باہر کے لوگوں کو اپنے سے نیچا اور کمتر دیکھتا ہے چاہے وہ لوگ اس کے باپ دادا کے ہم وطن بلکہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ بالخصوص اگر بیرونی شخص کی زبان عربی نہ ہو وہ تو اور بھی گرا ہوا اُن کی نظروں میں معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک امر طبعی ہے کیونکہ ہر ملک اور قوم میں

غریب الوطن خواہ وہ اپنے وطن میں کیسا ہی عزت والا کیوں نہ ہو کم درجہ کا اور ضعیف شمار ہوتا ہے۔ پھر اہل مدینہ کو جناب رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مجاورت (پڑوسی ہونے کا شرف) نہایت غیر معمولی شرف ہے اس کی وجہ سے ان کو جو بھی برتری حاصل ہو کم ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے المدینۃ مھاجری ومضجعی من الارض وحق علی امتی ان یکرموا جیرانی ما جتنبوا الکبایر فمن لم یفعل ذلک سقاہ اللہ من طینۃ الخبال عصارۃ اھل النار (قط فی الافراد عن جابر) (طب عن معقل بن یسار) اس کے علاوہ شرفِ مدینہ اور مجاورین مدینہ کے متعلق بہت سے ارشادات کنز العمال جلد ۶ اور دیگر کتب حدیث میں موجود ہیں

علاوہ ازیں اپنے وطنی رشتہ داروں اور احباب (جن سے سلاسل زندگانی وطن میں وابستہ تھے) وہ سب چھوٹے ہوئے ہوتے ہیں اور سابقہ ان لوگوں سے پڑتا ہے جو کہ بالکل اجنبی اور نئے ہوتے ہیں وہ اس نو وارد کے مرتبہ اور عزت سے واقف نہیں ہوتے اور نہ وہ ان لوگوں کے مراتب سے واقف ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مختلف وجوہ سے نو وارد آفاقیوں کو وہاں پر سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من صبر علی لاوائھا کنت لہ شفیعا او شھیدا یوم القیامۃ (جس نے مدینہ کی سختیوں پر صبر کیا تو میں اس کی خصوصی شفاعت قیامت میں کروں گا یا یہ فرمایا کہ میں اس کی بہتری کی گواہی دوں گا) دوسری روایت میں فرمایا من استطاع ان یموت بالمدینۃ فلیمت بھا فانی اکون لہ شفیعا او شھیدا یوم القیامۃ (جس سے یہ ہو سکے کہ مدینہ منورہ میں مرے تو یہاں ہی مرے کیونکہ میں اس کی خصوصی شفاعت کروں گا یا فرمایا کہ میں خصوصی گواہی دوں گا)

ہم لوگوں کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بالخصوص عورتوں کو۔ اُن کے وطن اور اعزہ سے تو اُن کو جدا ہونا ہی پڑا تھا۔ یہ مصیبت بجائے خود کیا کم تھی مگر وہاں قیام کی صورت میں افلاس اور عادات و رسوم و اختلاف مواسم و ہوا وغیرہ کی وجہ سے بھی نئی نئی مشقتیں اٹھانی پڑیں۔ اگرچہ ہمارا خاندان غریب تھا مگر تاہم بہت سے کاروبار خانہ داری برتن مانجنا یا دھونا جھاڑو دینا وغیرہ گھر میں نوکر عورتیں انجام دیا کرتی تھیں مگر وہاں

پہنچ کر یہ سب کام بھی انہیں کو کرنے پڑتے تھے۔ کھانا پکانا تو یہاں وطن میں بھی حسبِ معمول عزباں کو انجام دینا ہوتا ہی تھا مزید برآں ان کو آٹا بھی خود ہی پیسنا پڑا۔ حالانکہ یہ مشقت کبھی بھی اُن کو وطن میں تحمل نہ کرنا پڑی تھی والدہ مرحومہ باوجود ضعیف العمری بہت زیادہ جفاکش اور عالی ہمت تھیں اپنی ہر بہو کی اگرچہ باری مقرر کر دی تھی مگر خود ہر ایک کے ساتھ چکی پیسنے میں اور دوسرے کاروبار میں لگی رہتی تھیں۔ علیٰ ہذا القیاس عورتوں کو اپنے اور اپنے خاوندوں اور بچوں کے کپڑے بھی دھونے پڑتے تھے حالانکہ اس کا سابقہ کبھی بھی ان کو وطن میں نہ ہوا تھا۔ مگر مدینہ منورہ میں سب لوگ اپنے اپنے گھروں ہی میں کپڑے دھوتے ہیں متوسط طبقہ اور غریب طبقہ والوں کی بیویاں دھوتی ہیں اور بڑے طبقہ والوں کی باندیاں دھوتی ہیں۔ عموماً گھروں میں استری اور کلف کا سامان پایا جاتا ہے۔ اہل مدینہ نہایت خوش پوشاک اور خوش خوراک ہیں مگر دھوبیوں کا دستور نہیں۔

اس میں عورتوں کو ابتدا ابتدا میں ناگواری ہوئی مگر چارہ ہی کیا تھا کرنا پڑا اور آہستہ آہستہ عادت ہو گئی ہم مردوں کو بھی بسا اوقات کپڑوں کا دھونا اور مشکوں میں میٹھا پانی کندھوں پر لاد کر لانا پڑتا تھا جس کو ہم رات کو جبکہ نہر کے مخزن کی بھیڑ کم ہو جاتی تھی انجام دیتے تھے۔ یہ کام مجھ کو اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو انجام دینا پڑتا تھا کیونکہ ایک مشک پانی جو کہ روزانہ سقہ سے لیا جاتا تھا بارہ آدمیوں کے پینے اور کھانے میں ڈالنے کیلئے کافی نہ ہوتا تھا۔

کھانا بھی سرمایہ اور محاصل کی کمی کی وجہ سے نہایت معمولی ہوتا تھا۔ والد مرحوم نہایت منتظم طبیعت کے تھے۔ اکثر بازار کی سستی سے سستی ترکاری لاتے تھے اور کبھی کبھی گوشت اور اکثر دال پکتی تھی۔ روٹی اور چاول حسبِ عادت وطن مستعمل ہوتے تھے۔ کھجوروں کی تجارت مذکورہ میں نفع تو ہوا مگر کم۔ البتہ کھجوریں کھانے میں بہت آئیں۔

۱۳۱۸ھ کے محرم میں ایک دوسرا مکان کرایہ پر لیا گیا جو کہ بہ نسبت پہلے کے زیادہ صاف اور وسیع تھا۔ سرمایہ روزانہ مصارف میں کم ہوتا گیا۔ کیونکہ دوکان کی آمدنی کم ہوتی تھی اور بہت سے لوگوں نے قرض لے لے کر ادا کرنے کا نام تک نہیں لیا اس کی وجہ سے بہت زیادہ سرمایہ ضائع ہو گیا۔ ہم میں اتنی طاقت نہ تھی کہ عربوں وغیرہ سے لڑائی کریں اگر ایسا نہ ہوتا تو فی الجملہ آمدنی حد کفالت تک ضرور ہوتی۔ مختلف تجربوں کے بعد ۱۳۱۸ھ کے اواخر

میں یہی مناسب معلوم ہُوا کہ دکان اُٹھالی جائے۔ بھائی سیّد احمد صاحب مرحوم کو بعض نووارد سیٹھوں کے یہاں بچّوں کی تعلیم کی ملازمت مل گئی اور مجھ کو اور بڑے بھائی صاحب کو ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ میں سفر ہندوستان پیش آگیا۔ ہر دو کے پاس تقریباً ساٹھ ساٹھ روپیہ سفر کے لئے تھا (اس کی تفصیل علیحدہ آئے گی) یہ زمانہ گھر والوں پر نہایت سخت گذرا بھائی سیّد احمد صاحب مرحوم کی تنخواہ صرف بیس روپیہ ماہوار تھی۔ اندوختہ باقی نہ تھا ہم دونوں سفر میں تھے۔ اس لئے تنگ ہو کر والد صاحب مرحوم نے ۱۰۰ روپئے ایک اپنے ملنے والے میمن سیٹھ سے قرض لئے اور اس کی دال چانول خریدی۔ ایک وقت کھچڑی اور ایک وقت نمکین پیچھ پر تمام گھر والوں کا گذران کئی ماہ تک رہا۔ ہم جبکہ ہندوستان پہنچے تو والد صاحب مرحوم کے پیر بھائیوں نے جن کے والد صاحب مرحوم سے بہت زیادہ تعلقات تھے کچھ روپیہ آپس میں چندہ کر کے ہدیتہً والد صاحب مرحوم کو دیئے اُن کو ہم نے بذریعہ ہنڈی بھیجا تب والد صاحب مرحوم نے وہ قرض ادا کیا اور کسی درجہ میں کھانے پینے میں وسعت کی۔ یہ ہی چند مہینے ہمارے گھر والوں پر سختی کے مدینہ منورہ میں گذرے ہیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ فراخی ہوتی گئی۔ بحمد اللہ فاقوں کی نوبت کسی کو اور کبھی نہیں آئی۔ حالانکہ بہت سے لوگوں کو مہینوں فاقوں کی نوبت آئی ہے۔ قطبِ عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کو فرماتے ہوئے میں نے خود سُنا کہ ایک ہفتہ تک موصوف کو صرف زمزم کے پانی پر گذارہ کرنا پڑا۔ اس اثناء میں ایک مخلص دوست سے جو کہ بہت زیادہ اخلاص کا مدعی تھا چند پیسے قرض مانگے تو اُس نے ناداری کا بہانہ کر کے انکار کر دیا۔ حالانکہ واقع میں نادار نہ تھا۔ حضرت قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا کہ میں اس کے انکار سے سمجھا کہ منشاء الوہیت یہی ہے اس لئے میں بھی صبر کر کے بیٹھا ہو گیا۔ ایک ہفتہ گذر جانے کے بعد جبکہ ضعف و نقاہت بہت زیادہ ہو گیا تھا رات میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز کو خواب میں دیکھا ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اپنے باورچیخانہ کا ناظم اور مہتمم بنا دیا۔ صبح کو اندھیرے میں ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے دروازہ کھولا تو اُس نے ایک تھیلی دی جس میں سو ریال تھے اور پھر چلا گیا۔ اس کے بعد سے عسرت نہیں ہوئی۔ اسی طرح حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مجددی دہلوی اور حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی دہلوی قدس اللہ اسرارہما اور

اُن کے خاندان والوں پر عرصہ تک فاقوں کی نوبتیں آتی رہیں۔ مگر ہمارے خاندان والے اس امتحان شدید سے محفوظ رہے اور رہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ امتحان بقدر قوت ایمان ہوا کرتا ہے اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل (الحدیث)

حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ نے دعا بھی رخصت کرتے وقت ہمارے لئے فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس خاندان کو امتحان شدیدہ میں مبتلا نہ فرمائے کیا عجب ہے کہ یہ اسی کا اثر ہو۔

۱۳۱۸ھ کے آخر میں جبکہ ہم سفر ہند میں تھے یہ واقعہ پیش آیا کہ جس مکان میں ہم سب سکونت پذیر تھے اور امتحان کی گھڑیاں گذار رہے تھے اُس کے مالک نے نوٹس دیا کہ سال ختم ہو رہا ہے یا تو سال بھر کا کرایہ معہ زیادتی دو ورنہ گھر خالی کردو۔ یہ امر نہایت دشوار تھا۔ روزمرّہ کا خرچ تو دو چار آنہ میں چل سکتا تھا مگر کرایہ مکان سال بھر کا بجز سوا سو ڈیڑھ سو کے نہیں ادا ہو سکتا۔ اگر مرد ہی مرد ہوں تو کہیں بھی گلی کوچہ، مدرسہ یا مسافر خانہ وغیرہ میں گذر کرلیں پردہ نشین عورتیں اور بچّوں کو کہاں لے جایا جائے۔ مالک مکان سے کچھ مہلت طلب کی گئی مگر وہ راضی نہ ہوا۔ مدینہ منوّرہ میں بعض بعض مسافر خانہ (رباطین) پردہ دار خاندانوں کے لئے وقف ہیں مگر کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ بہت زیادہ دوڑ دھوپ کے بعد بیرونِ باب مجیدی ایک مکان ایک حیدرآبادی رئیس نواب جانی میاں صاحب کا ملا جو کہ زیر تعمیر تھا۔ روپیہ ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کی تعمیر رکی ہوئی تھی۔ اس میں متعدد کمرے پردہ دار تھے۔ اس کے متولی صاحب ڈاکٹر محمد خواجہ مرحوم حیدرآبادی نے مہربانی کر کے رہنے کو تا اجراء تعمیر مفت دیدیا اس مکان میں دروازے کھڑکیاں طاقچے وغیرہ نہیں تھے صرف صدر دروازہ چیر کی لکڑی کا لگا ہوا تھا۔ مگر حضرت والد صاحب مرحوم کو یہ ہی غنیمت معلوم ہوا مالک مکان حیدرآباد ہی میں تھے۔ الحاصل تمام گھرانہ یہاں آگیا۔ اور ٹاٹ کے پردوں وغیرہ سے ہوا اور سردی وگرمی اور پردے کا تحفظ کرلیا گیا۔ مگر ان حالتوں سے حضرت والد صاحب کی سمجھ میں آگیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو مکان بن جانا ضروری ہے۔ بغیر مکان کے رہنا نہیں ہو سکتا۔ وہ اس فکر میں تگ و پو کرنے لگے۔ عمارت میں مدینہ منوّرہ میں بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے اور نقد کچھ پاس نہ تھا مگر ان کی عالی ہمتی میں کمزوری نہ ہوئی۔ ایک افتادہ زمین جس میں کسی زمانہ میں کھجوروں کا باغ تھا فروخت ہوتی ہوئی قریب میں معلوم ہوئی یہ زمین

حجرہ مطہرہ نبویہ کے خاص خادموں آغادات حرم (خصی غلام خادمین حجرہ مطہرہ نبویّہ) پر وقف تھی ایسی زمینیں بیکار ہونے کے بعد بحکم قاضی فروخت کیجاتی ہیں جس میں منافع زمین فروخت کردیئے جاتے ہیں اور اصل زمین برائے وقف باقی رکھی جاتی ہے جس کا کرایہ سالانہ خریدار کو حسب قرارداد متولی وقف دینا پڑتا ہے یہ کرایہ معمولی ہوتا ہے۔ زمینیں بحسب مخازن فروخت ہوتی ہیں (ایک مخزن بیس گز لانبا اور پانچ گز چوڑا ہوتا ہے) فی مخزن کچھ قیمت مقرر ہوجاتی ہے۔ اس زمانہ میں زمینیں سستی تھیں۔ وہاں مکانات مثل ہندوستان پھیلے ہوئے صحن والے نہیں بنائے جاتے بلکہ تین تین چار چار طبقہ کے اُونچے مثل بمبئی کلکتہ وغیرہ کے بنائے جاتے ہیں اس لئے اگر کوئی پھیلا ہوا مکان بنائے بھی تو اوّلاً گرانی زمین کی وجہ سے خرچ زیادہ پڑتا ہے ثانیاً ارد گرد کے اونچے مکانات کی وجہ سے پردہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ چونکہ اس وقت والد صاحب مرحوم کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی تھی اس لئے اتنا بڑا قطعہ خریدنا ضروری ہوا جس میں چھ مکان بن جائیں چنانچہ ایک نقشہ بنا کر اتنا بڑا قطعہ خرید لیا۔ اس قطعہ میں باغ کا اصلی کنواں اور مٹی کا بہت بڑا ڈھیر بھی پڑتا تھا۔ جو کہ زمانہ قدیمہ میں باغ کی عمارت کا گرا ہوا ڈھیر تھا۔ روپیہ پاس نہ تھا مگر جب حضرت والد صاحب مرحوم نے سفر سے بچا ہوا سرمایہ تقسیم کیا تھا تو بہن (ریاض فاطمہ مرحومہ) کا حصّہ بھی لگایا تھا سبھوں کا روپیہ تو ضروریات میں خرچ ہوتا رہتا تھا مگر اس کا حصّہ اس کے نکاح کے مصارف کیلئے محفوظ رکھا تھا اس میں سے پانچسو روپیہ قرض لیکر زمین کی قیمت میں ادا کیا گیا۔ ایک اور مشکل حائل تھی کہ حسب قوانین دولت ترکیہ کسی غیر رعایا کو کوئی ملکیّت حاصل کرنے کا اختیار نہ تھا۔ رعیت نامہ حاصل کرنے کے لئے عرصہ درکار تھا۔ اس لئے فوری کارروائی یہ کی گئی کہ زمین بنام ڈاکٹر رفاقت علی صاحب[1] مرحوم خریدی گئی اور بیعنامہ انہیں کے نام رجسٹری کرالیا گیا اور اُدھر رعیت نامہ کی درخواست دیدی گئی۔ چوں کہ کسی انگریزی یا دوسری حکومت کی رعیّت کے لئے اُسی وقت رعیت نامہ دیا جا سکتا تھا جبکہ اس کی سابقہ حکومت اجازت دیدے اور دعویدار نہ ہو۔ اس لئے وہ عرضی جدّہ میں انگریزی وائس کونسل کے پاس باضابطہ بھیجی گئی۔ اور وہاں سے بعد از استصواب حکومت ہند تحریر آئی کہ ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

---

[1] مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد کے والد ماجد۔ یہ اصل باشندے دیوبند کے تھے مگر عرصہ دراز سے مدینہ منوّرہ میں مقیم تھے اور حکومت ترکیہ میں بعہدہ ڈاکٹر افواج ملازم اور میجری کا

تب حضرت والد صاحب مرحوم کے نام پر رعیت نامہ جاری کیا گیا۔ اس میں تقریباً چھ مہینہ یا زیادہ عرصہ لگ گیا۔ رعیت نامہ آجانے کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم نے زمین کا بیعنامہ حضرت والد صاحب مرحوم کے نام کر دیا۔ اسی زمانہ میں وہ روپیہ جو والد صاحب مرحوم کے پیر بھائیوں اور احباب نے دیا تھا اور ہم نے ہنڈی کر کے بھیج دیا تھا پہنچ گیا۔ جس سے ہمشیرہ مرحومہ کا روپیہ بھی ادا کر دیا گیا اور مٹی کے ڈھیر سے کچی اینٹیں تھپوالی گئیں۔ اس ڈھیر میں دبے ہوئے بہت سے پتھر قدیم عمارت کے نکلے جو کہ عمارت میں کام آئے اور بہت مفید ثابت ہوئے اور تھوڑے سے پتھر خرید بھی لئے گئے اور ضروری سمجھا گیا کہ تمام قطعہ زمین کا احاطہ بنوا لیا جائے۔ چنانچہ ہمارے پہنچنے سے پہلے تمام زمین کا چاروں طرف سے احاطہ بنوا لیا گیا۔ بنیادوں میں پتھر لگائے گئے اور اوپر کی دیوار کچی اینٹوں کی تقریباً بارہ تیرہ فٹ یا زیادہ اُونچی بنوائی گئی۔ جس سے تمام قطعہ کی زمین محفوظ اور مستور ہو گئی۔

ہم دونوں بھائی جبکہ ۱۳۲۰ھ کے محرم میں گنگوہ شریف سے واپس حج بدل وعمرہ ادا کرتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچے تو یہ احاطہ بنا ہوا تھا۔ ہماری واپسی ہندوستان سے حج بدل پر ہوئی تھی بجز اس کے کوئی صورت واپسی کی قلت سرمایہ کی وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز ہی نے یہ دونوں حج بدل اپنے بعض رشتہ داروں کے دلوائے تھے جس میں مدینہ منورہ تک پہنچ جانے کا صرفہ تھا) اس وقت تمام خاندان ان حیدر آبادی رئیس کے مذکورہ بالا مکان میں مقیم تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد میں شمسیہ باغ معروف بہ تو طیہ کے مدرسہ میں (جس کو اس زمانہ ہی میں جاری کیا گیا تھا) بعہدہ مدرسی ۲۰ روپئے ماہوار پہ ملازم ہو گیا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم بھی ایک نو وارد، سودانی سیٹھ کے یہاں اُس کے بچوں کی تعلیم کے لئے ملازم ہو گئے۔ میں نے اس زمانہ میں مشغلہ کتابت ترک کر دیا اور چونکہ طلبہ کا ہجوم ہوا اس لئے خارج از مدرسہ اوقات میں حرم محترم نبوی میں کتابیں پڑھانے لگا۔ صبح کی نماز کے بعد، عصر کے بعد، مغرب کے بعد بلکہ عشاء کے بعد بھی مختلف علوم وفنون کی کتابیں شروع کرا دیں۔ اب اس وقت میں طلبہ کی مقدار کی زیادتی کی وجہ سے لوگوں کی آنکھیں اٹھیں اور تنقیدات کا ارادہ کیا گیا۔ مگر چونکہ زبان عربی صاف ہو چکی تھی اور ابتدائی کتابیں منج گئی تھیں ادھر میں نے حافظہ کی تقویت کے لئے علماء خیر آباد کا طریقہ اختیار کیا تھا کہ نفس کتاب یا شرح یا حاشیہ پڑھانے وقت سامنے نہ رکھتا

تھا بلکہ طالبِ علم کے قرأتِ عبارت کے بعد مسائل پر تقریر کرتا اور سمجھاتا تھا گھر پر کتاب اور اس کی شرح و حواشی خوب دیکھ کر مسائل کو منضبط کر کے جاتا تھا، حالانکہ علماء مدینہ وغیرہ نہ صرف کتاب بلکہ اس کی شرح بھی ہاتھ میں لیکر پڑھایا کرتے تھے اور تقریر کرتے وقت اکثر عبارت شرح یا حاشیہ کی سُنا دیتے تھے بالعموم یہی طریقہ رائج تھا البتہ خاص خاص ماہر حضرات بلا کتاب پڑھاتے تھے مگر اُن کے پاس نہ تمام علوم و فنون کی کتابیں ہوتی تھیں اور نہ وہ زیادہ وقت صرف کرتے تھے) اس لئے عام طلباء اور علماء میں دھاک بیٹھ گئی اور سمجھنے لگے کہ اس کو تمام فنون درسیہ میں نہ صرف مہارت ہے بلکہ محفوظ بھی ہیں۔ اسی بناء پر سمجھ دار اور جدوجہد کرنیوالے طلبہ کا اجتماع میرے پاس بہت زیادہ ہو گیا جس سے متعدد مدرسین حرم محترم کو حسد ہوا اور رقابت بھی پیدا ہو گئی۔ ناظر مدرسہ شمسیہ باغ کو اصرار تھا کہ جو طلبہ تجھ سے پڑھتے ہیں وہ مسجد نبویؐ میں نہیں بلکہ مدرسہ میں آکر پڑھا کریں مگر سب طلبہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ طلبہ صرف اہل مدینہ ہی نہ تھے بلکہ ترک۔ بخاری۔ قازانی، قزقی، ترکستانی، کابلی، مصری وغیرہ بھی تھے۔ ناظر مدرسہ کا یہ بھی اصرار تھا کہ خارج از مدرسہ اوقات میں کہیں بھی نہ پڑھایا جائے۔ اس قسم کی چند اور رکاوٹیں پیش آئیں جن کی وجہ سے مجبوری مدرسہ کی ملازمت سے استعفاء دینا پڑا اور یہ ارادہ کر لیا گیا کہ لوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو اس کے کفیل جناب باری عز اسمہٗ کی کفالت پر رکھا جائے چنانچہ استعفاء دینا پڑا۔ اور کتب درسیہ کا میدان وسیع کر دیا گیا۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی اور یہ عرض کیا کہ جو تعلیم طریقت کے شغل کی عالیجاہ نے فرمائی ہے جب اس کے لئے بیٹھتا ہوں تو نیند غالب آجاتی ہے۔ نیز خطرات اور وساوس سخت پریشان کرتے تھے۔ اور یہ طلباء علوم کا اصرار بہت زیادہ ہے مجبور ہو کر میں نے دن و رات کا اکثر حصہ اسی میں صرف کر رکھا ہے جواب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ پڑھاؤ خوب پڑھاؤ۔ اس سے ہمّت زیادہ بڑھ گئی۔ روزانہ چودہ اسباق پڑھاتا تھا۔ پانچ سبق صبح کو تین یا چار ظہر کے بعد دو عصر کے بعد دو مغرب کے بعد۔ ایک عشاء کے بعد۔ وہاں ظہر کی نماز زوال ہوتے ہی پڑھی جاتی ہے اور عصر کی بعد مثلین ہوتی ہے اس لئے ظہر اور عصر کے درمیان میں بہت وسیع وقت ملتا ہے۔

ڈاکٹر محمد خواجہ صاحب مرحوم ناظر مدرسہ شمسیہ کو ان کی عدم تابعداری اور استغفار کی وجہ سے کاوش ہو گئی اور انہوں نے نوٹس دے دیا کہ مکان خالی کر دو ہم کو تعمیر کرانی ہے ایک مہینہ کی مہلت تم کو دی جاتی ہے اس بنا پر والد صاحب مرحوم نے ضروری سمجھا کہ احاطہ مذکور میں ہی چند کمرے گذران کے لائق اپنے ہاتھوں سے بنا لئے جائیں۔ کیونکہ نہ کسی مکان کے مستقل کرایہ پر لینے کی طاقت ہے اور نہ مکان بنوانے کی۔ سرمایہ کوئی نہ تھا اور اگر کچھ ہوتا بھی تو دوسرے کے مکان میں خرچ کرنے سے بہتر اپنے مکان میں خرچ کرنا تھا۔ کچی اینٹیں تھپوائی ہوئی موجود تھیں۔ عورتوں اور بچوں کو لے کر روز وہاں جاتے تھے اور خود اپنے ہاتھ سے دیوار بناتے تھے اور ہم تینوں اینٹیں ڈھوتے تھے اور عورتیں گارا لاتی تھیں۔ الحاصل اسی طرح احاطہ کے جانب شرقی شمال میں پانچ کوٹھریاں ایک غسلخانہ ایک پاخانہ اور ایک پردہ کی دیوار ان تمام کوٹھریوں کے سامنے اپنے ہی ہاتھوں سے سب نے مل کر بنائی۔ کوٹھریوں کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں چھت اتنی اونچی بنائی گئی کہ اگر چارپائی پر کھڑے ہوں تو سر چھت میں نہ لگے مگر زیادہ نیچی بھی نہ رہے۔ کڑی کی جگہ ببول کی موٹی موٹی شاخیں جو کہ بدوی لوگ شہر میں فروخت کرنے کے لئے لاتے ہیں دور دور لگائی گئیں اور ان پر کھجور کے پتوں کے ڈنٹھل قریب قریب بچھائے گئے۔ اور ان پر کھجور کے بوریئے بچھا دیئے گئے اور ان پر گلاوہ (تر مٹی) بچھا کر خشک مٹی ڈال دی گئی چھت اتنی مضبوط نہ تھی کہ بلا تکلف اس پر آدمی چل سکے اور نہ اتنی موٹی تھی کہ زور کی بارش کو روک سکے چھپر کی طرح ڈھلوان رکھی گئی تھی اس طرح پر دھوپ اور سردی سے حفاظت ہو گئی معمولی بارش کی بوندوں سے بھی حفاظت ہوتی تھی۔ مگر زور کی بارش میں (جو کہ مدینہ منورہ میں بہت کم ہوتی ہے) سب پانی اندر آتا تھا۔ اسطرح پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرات کی مشابہت حاصل ہو گئی۔ تقریباً پندرہ بیس روز کی محنت و مشقت میں یہ تعمیر پوری ہو گئی۔ پڑھنا پڑھانا ان دنوں بالکل بند کر دیا گیا تھا زیادہ تر محنت حضرت والد صاحب مرحوم کرتے تھے وہ اگرچہ ضعیف العمر تھے مگر عالی ہمت اور جفاکش ہم نوجوانوں سے بہت زیادہ تھے۔ ان سے بلا مشغلہ بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ اس عمارت کے تیار ہو جانے پر ہم سبھوں کو اس قدر خوشی ہوئی جو حد بیان سے باہر تھی گویا ہم سب قید غلامی سے آزاد ہو گئے اپنے مکان میں جہاں چاہیں بیٹھیں جہاں چاہیں سوئیں، جہاں چاہیں پانی گرائیں۔ روشنی کھلی ہوئی تھی۔ ہوائیں بڑے صحن دار مکان کی طرح آتی تھیں کوئی ٹوکنے اور کہنے والا نہ تھا۔ کرایہ کا فکر اور تقاضوں کا کھٹکا باقی نہ رہا تھا۔ پانی بھی اس کنوئیں کا تقریبا

شیریں تھا۔ صرف پینے اور کھانا پکانے کے لئے ایک مشک پانی سقہ لاتا تھا۔ الحاصل بہت زیادہ اطمینان کی صورت یہاں پیدا ہوگئی اور سابقہ مکان کو (جس میں پہلے سے رہتے تھے) ایک مہینہ کی میعاد سے پہلے ہی ترک کرکے یہاں چلے آئے ان ہی کوٹھڑیوں میں نہایت آزادی اور ہشاشی وبشاشی کے ساتھ کئی سال متواتر جب تک احاطہ کے جنوب و مغرب والے مکان کے دو طبقہ مکمل و تیار نہ ہوگئے رہنا ہوا۔ اس تعمیر کو دیکھ کر اور لوگوں کو بھی شوق پیدا ہوا اور ارد گرد میں تھوڑے ہی عرصہ میں متعدد عمارتیں بن گئیں اور آبادی روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ زمینیں گراں ہوگئیں۔ بالخصوص جبکہ ریل آگئی تو اس طرف کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ افسوس کہ شریف حسین کے فتنہ کے بعد یہ تمام حصہ اجاڑ ہوگیا اور اس قدر بدامنی بعد کے زمانہ میں پھیلی کہ وہاں بود و باش مشکل ہوگئی۔

بھائی سیّد احمد صاحب مرحوم کا سفر گنگوہ شریف:

جناب بھائی سیّد احمد صاحب بھی سفر مدینہ منورہ زیدشرفاً کرتے وقت حضرت قطبِ عالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے تھے مگر جب میں طلب کیا گیا اور بڑے بھائی صاحب مجھ سے پہلے چھپ کر روانہ ہوگئے تھے اور پھر مکہ معظمہ سے مل کر ساتھ ساتھ ہندوستان اور گنگوہ شریف پہنچے تھے (جیسا کہ آگے مفصّل آئے گا) تو بھائی سیّد احمد صاحب مرحوم کا ہماری واپسی پر تقاضا ہوا کہ اب مجھ کو اجازت ہونی چاہیئے تاکہ میں بھی بارگاہِ رشیدیہ میں پہنچ کر منازل سلوک طے کروں۔ والدین ماجدین رحمۃ اللہ علیہما ایسے مقاصد جلیلہ میں بہت زیادہ شیر دل تھے انہوں نے خوشی سے اجازت دے دی اور سنہ ۱۳۲۰ھ کے اواخر میں وہ روانہ ہو کر گنگوہ شریف پہنچے اور تقریباً تین سال متواتر ان کو اس بارگاہِ عالی میں حاضر باشی اور خدمت گذاری کا شرف حاصل رہا حضرت قطبِ عالم رحمۃ اللہ علیہ کا وصال بھی انہیں کے زمانہ حاضری میں ہوا۔ وصال کے چند مہینہ کے بعد وہ واپس مدینہ منورہ ہوئے۔ ان کو اگرچہ حضرت قدس اللہ سرہ العزیز نے اجازت بیعت اور اور خلافت عطا نہیں فرمائی تھی مگر حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما نے بعد کو اجازت عطا فرما دی تھی۔ تاہم جہاں تک مجھے معلوم ہے بھائی صاحب مرحوم نے سلسلہ ارشاد و تلقین جاری نہیں فرمایا۔ واللہ اعلم۔

ہاں اُن کی عالی ہمّتی اور بے انتہا جد و جہد سے مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ وجود میں آیا

جس سے بحمد اللہ علوم دینیہ اور حفظ و قرأت قرآن کا عظیم الشان سلسلہ جاری ہوا اور اب تک جاری ہے۔ یہ صدقہ جاریہ اللہ تعالیٰ کی نہایت مبارک اور اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ اور بانی مرحوم اور اہل امداد و اعانت کے لئے موجب فلاح و نجاح ہو۔ آمین۔

وظائف کا ہم لوگوں کے لئے تقرر میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ عموماً اہل مدینہ کی گزران کا ذریعہ اُن کے وہ وظائف ماہانہ یا سالانہ تھے جو کہ دولت عثمانیہ ترکیہ یا دوسری اسلامی ریاستوں اور امراء وغیرہ کیطرف سے آیا کرتے تھے اور لوگوں کو مختلف حیلوں سے دیئے جاتے تھے مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام) میں تقریباً ڈیڑھ سو یا اس سے زائد اذان دینے والے مقرر تھے دو سو سے زائد امام تھے جن میں تقریباً ستر اشخاص خطیب تھے سال میں ایک مرتبہ خطیب کی باری آتی تھی اسی طرح مسجد شریف میں جھاڑو دینے والوں، روشنی کرنے والوں، حجرۂ مطہرہ نبویہ کی خدمت کرنے والوں، عماراتی کاموں کو انجام دینے والوں وغیرہ وغیرہ کی بہت بڑی تعداد تھی جن کی بڑی بڑی تنخواہیں خزینہ جلیلہ (محکمہ اوقاف حرم محترم نبوی) سے جاری تھیں۔ یہ اوقاف سلاطین آل عثمان اور دیگر امراء بلادِ اسلامیہ کی طرف سے ممالک ترکیہ اور عربیہ وغیرہ میں زیر نظارت حکومت ترکیہ تھے اسی طرح اور بہت سے امراء اسلام کی طرف سے تخصیصے تھے۔ وہاں خصفہ اس جماعت کو کہتے ہیں جو کہ وقت معین پر مسجد نبوی میں جمع ہو کر قرآن شریف۔ بخاری شریف۔ دلائل الخیرات یا حزبِ اعظم وغیرہ پڑھ کر صاحبِ خیرات کے لئے دعا کرتی ہے اور ماہوار ان کو تنخواہ دی جاتی ہے اس دعاگوئی کی جماعتوں کی بہت بڑی تعداد ہمیشہ رہتی تھی۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں تجارت اور زراعت پیشہ لوگ بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور اس زمانہ میں بھی تھے مگر وہاں کی تجارت اور زراعت اور دیگر پیشے اس قدر کمزور تھے کہ وہاں کی گرانی اور اعلیٰ معیشت کو (جو کہ وہاں کے لوگوں میں بہت زیادہ پھیل گیا تھا) متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حجاج کی آمد کے وقت اکثر لوگ سائل اور بھیک مانگنے والے نظر آتے ہیں۔ اُن کے معیشت کے اعلیٰ معیار کیلئے یہ آمدنیاں بھی کافی نہیں ہو سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل مدینہ مقروض ہو کر دیارِ اسلامیہ کا سفر کرتے ہیں اور مسلمانوں سے استدعا اعانت و امداد کرتے ہیں زمانہ ہائے سابق میں معیارِ معیشت نہایت سادہ اور قلیل المصارف بدویانہ تھا! اسلئے وہ ایسے شرمناک اطوار اختیار نہ کرتے تھے اور قناعت وصبر کی زندگی جفاکشی و محنت کا طریقہ اختیار کئے ہوئے تھے۔

زراعت میں صرف وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جس کے پاس سرمایہ بھی ہو اور خود اپنے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ دن رات زراعت میں لگا رہے۔

افسوس کہ جنگ عمومی کے بعد جبکہ حکومت ترکیہ کا تعلق حجاز، شام، فلسطین، عراق سے اُٹھ گیا اور شریف حسین اور عربوں کی غداری نے عالم اسلامی اور بالخصوص ملک عرب کو اعدا اسلام کے آہنی پنجوں میں ڈال دیا تو یہ وجوہ وظائف و خیرات اور آمدنی و اوقاف ممالک ترکیہ سب بند ہو گئیں، اسنبول اور ایشیائی روم کے اوقاف پر نئی حکومت ترکیہ نے قبضہ کر لیا اور ان کو قومی اور ملکی مصارف میں صرف کرنے لگے۔ جو وظائف سلاطین آلِ عثمان اپنی جیب خاص سے اہلِ حرمین کو دیتے تھے جس میں بڑا حصہ اہل مدینہ کا تھا وہ بوجہ ابطال ملوکیت سب بند ہو گیا شام کے اوقاف پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ وعلیٰ ہذا القیاس عراق اور فلسطین وغیرہ میں بھی ایسی ہی صورتیں پیش آئیں اس لئے اہل حرمین کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔

ریاست بھوپال اور حیدر آباد سے بھی خصوصاً وہاں جاری تھے، بالخصوص رئیس بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ کے جانے کے بعد بھوپال سے یہ خیرات بہ نسبت سابق زیادہ ہو گئی تھی۔ مکہ معظمہ میں تو اس کا سلسلہ نواب سکندر جہاں بیگم مرحومہ والدہ ماجدہ نواب شاہ جہاں بیگم مرحومہ والیہ ریاست بھوپال کے زمانہ سے جاری تھا۔ مگر مدینہ منوّرہ میں بہت تھوڑی مقدار پر نواب شاہ جہاں بیگم نے جاری کیا تھا۔ ریاست حیدر آباد کی طرف سے پہلے سے بڑے پیمانہ پر اس قسم کے خیرات کے مختلف سلسلے جاری تھے۔ رباطین، مسافر خانے، ہسپتال وغیرہ خود ریاست کی طرف سے بھی اور بعض بعض امراء ریاست کی طرف سے بھی جاری تھے۔ ہندوستانی مہاجرین اور مقیمین حرمین شریفین کی ان وسائل سے عموماً پرورش ہوتی تھی خلاصہ یہ کہ عموماً اہل مدینہ منوّرہ کے معاشیات کا دارومدار ان ازمنہ اخیرہ میں بالخصوص سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کے زمانہ سے وظائف پر ہو گیا تھا۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ دیگر ذرائع کی طرف بہت ہی کم توجہ کرتے تھے۔ اس سے پہلے زمانہ میں آبادی بھی کم تھی اور حجاز کی کفالت دولت مصریہ کے سپرد تھی وہاں کے ترکی گورنر اور خدیوی یکے بعد دیگرے متعدد اوقاف کی آمدنیوں سے حجاز کی خبر گیری رکھتے تھے۔ وقفی زمینوں سے خاندانوں کے نام گیہوں کی مقداریں سالانہ جاری تھیں اس مقدار کو اردب کہتے تھے (ایک اردب غالباً چوبیس مد کا ہوتا ہے اور ایک مد چھ سیر پختہ کا ہوتا ہے) اس طرح سے کسی کے نام ایک کسی کے نام دو یا زیادہ اردب

سرکاری دفتر میں لکھے ہوئے تھے سالانہ یہ غلہ مصر سے آتا تھا اور ایک مخزن میں جس کو شونہ کہتے تھے جمع کیا جاتا تھا اور حسب کاغذات اہالی مدینہ منورہ اور اہالی مکہ کو تقسیم کر دیا جاتا تھا بدوؤں کے قبائل کے لئے بھی اسی طرح غلہ مقرر تھا۔ علاوہ ازیں بدوی قبائل کے لئے نقد بھی مقرر تھا۔ جو کہ محمل شامی کے ساتھ (استنبول اور شام و روم کے اوقاف وغیرہ سے) اور محمل مصری کے ساتھ (مصر کے اوقاف وغیرہ سے) آتا تھا اور ہر منزل پر بدوی قبائل کے شیوخ کو اور بعض بعض کو مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں دیا جاتا تھا۔ ان وظائف اور غلہ جات سے صرف بدوی قبائل کی پرورش ہی مقصود نہ تھی بلکہ یہ بھی مقصودِ اعظم تھا کہ یہ حجاج و زوار کو نہ ستائیں بلکہ اُن کی حفاظت کے ذمہ دار بنیں۔ زمانہ سابق میں لوٹ مار کرنے والے قبائل نے اپنے افلاس کا اظہار کر کے لوٹ مار کا سبب یہی بنایا تھا۔ اس لئے سلاطین سابقہ نے اُن کے لئے یہ وظائف مقرر کر دیئے تھے تاکہ بسر اوقات کی صورت ہو اور قبائل حجاج کو نہ ستائیں زیادہ خرابیاں حجاز میں جو بدوی قبائل سے ظہور میں آتی رہیں اُن کا سبب بھی یہی ہوا۔ کیونکہ شرفاء مکہ جو کہ حکومتِ مصریہ اور بعد کو حکومتِ ترکیہ کی طرف سے مقرر ہوئے تھے اور قبائل عربان (بدوی) اور اہل حجاز کی نگرانی اُن کے ذمہ کی جاتی تھی وہ جائز یا ناجائز وجوہ سے یہ مقررہ وظائف قبائل کو وقت پر نہیں پہنچاتے تھے اس لئے وہ قبائل قوافل حجاج کو لوٹتے تھے۔ اگر یہ چیز سلاطین سابقہ سے مقرر ہوئی ہوتی یا مقرر ہونے کے بعد وقت پر پہنچتی رہتی تو یہ مشکلات پیش نہ آتیں۔

چنانچہ عثمان پاشا مرحوم جبکہ والی حجاز مقرر ہوا تو اس نے شریف مکہ کے اختیارات میں مداخلت کر کے اُن کو عضو معلول بنا دیا اور تمام قبائل بدویہ کا مقررہ وظیفہ اُن کے منازل میں پہنچانے کا انتظام دائمی کر دیا۔ اس کا اثر اس قدر قوی ہو گیا کہ لوٹ و غارت بالکل بند ہو گئی اور امن کامل حجاز میں ایسا پھیل گیا کہ حجاج و زوار ایک ایک دو دو اونٹ پر سفر کرتے تھے اور کوئی گزند اُن کو نہیں پہنچتا تھا۔ حکومت اسلامیہ مصریہ اور ترکیہ نے اپنے تمام قلمرو میں ہتھیار کی آزادی دے رکھی تھی اس لئے بدوی قبائل بارہا حکومت کے مقابلہ پر بھی آجاتے تھے اور کشت و خون کی نوبت آتی تھی۔ آج بھی حکومت سعودیہ نے اسی قسم کا مکمل امن و امان قائم کر دیا ہے۔ جو کہ عثمان پاشا کے زمانہ میں تھا مگر یہ سیاست دہشت کی اور جابرانہ ہے جس کو ترکی حکومت نے ممالک اسلامیہ میں کبھی جاری نہیں کیا مجبوری کبھی کبھی ایسی دہشت کی نوبتیں آتی تھیں مگر بہت کم اور اس میں بھی جانب لطف و مرحمت ملحوظ رہتی تھی۔ سعودی حکومت نے شریر اور سربرآوردہ فسادی لوگوں کو قتل کر دیا اور تمام قبائل سے ہتھیار

چھین لئے اور پولیس و فوج کی شدید نگرانی قائم کر دی جس کی وجہ سے حجاز کی کایا پلٹ گئی اور مکمل امن وامان کا دور دورہ ہوگیا۔ موجودہ بدوی قبائل اور عربی طبائع کے لئے ہمیشہ سے یہی طریقہ موزوں ہے۔

علاوہ ازیں حکومتِ مصریہ کا دونوں جگہوں (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) میں مستقل لنگر خانہ قائم تھا اور اب تک قائم ہے جس میں روزانہ فقرا اور مساکین کو صبح کو روٹی اور شوربا تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس لنگر خانہ کو تکیہ مصریہ کہتے ہیں اس کی نہایت شاندار اور وسیع عمارت مدینہ منورہ میں باب العنبریہ کے پاس قشلہ کے مقابل موجود ہے اور اسی طرح مکہ معظمہ میں بھی ہے۔ بہت سے مساکین صرف اسی پر گذران کر لیتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ۱۳۲۳ھ ہی میں بعض کرم فرماؤں کی عنایت و توجہ سے حضرت والد صاحب مرحوم کے لئے پندرہ بیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ دعا گوئی بھوپال سے مقرر ہوگیا جس سے بڑی ڈھارس پیدا ہوگئی۔

نواب سلطان جہاں بیگم مرحوم کی آمد پر لوگوں نے ان کو خصفہ بنانے کی ترغیب دی چنانچہ انہوں نے دس بارہ آدمیوں کو بخاری شریف روزانہ پڑھنے اور دعا کرنے کے لئے مقرر کیا۔ ان میں کچھ لوگ اہل مدینہ تھے اور کچھ ہندوستانی۔ ہندوستانیوں میں بڑے بھائی صاحب کا اور میرا نام بھی تھا اور کچھ عرصہ بعد بھائی سید احمد صاحب کا نام بھی آگیا تھا۔ ہر شخص کو دس دس روپیہ ماہوار مقرر کیا گیا تھا۔ بعض لوگوں کو خصوصی وظائف بھی بیگم صاحبہ مرحومہ نے مقرر فرمائے تھے مسجد نبوی میں ٹھنڈے پانی کی سبیل بھی بیگم صاحبہ مرحومہ نے جاری فرمائی تھی۔ چونکہ نقشوں کا مرتب کرنا اور خط و کتابت اور مراسلات وغیرہ کو انجام دینا ناظر الیصال وظائف مدینہ منورہ شیخ حسن عبدالجواد صاحب سے نہیں ہوسکتا تھا وہ اُردو نوشت و خواند اور حساب سے واقف نہ تھے اس لئے محرر کی ضرورت پڑی اور انہیں کی درخواست پر مجھ کو ۵ے ماہوار پر یہ خدمت بھی سپرد کی گئی۔ میں تعطیل کے ایام میں یعنی جمعہ اور سہ شنبہ کو اس کو ہمیشہ انجام دیتا تھا کیونکہ حرمین شریفین میں ہفتہ میں یہ دو دن تعطیل کے ہوتے ہیں۔ ان میں درس و تدریس عام طور پر نہیں ہوتی۔ پھر آخر میں میرا نام خصفہ میں باقی نہیں رہا بلکہ پوری تنخواہ للعہ ماہوار انہیں تحریرات کے سلسلہ میں کر دی گئی۔ نواب بہاولپور مرحوم بھی بسلسلہ زیارت حرمین و حج و عمرہ تشریف لے گئے تو مولانا صاحب[1] مرحوم وزیر اعظم ریاست کی سعی سے عہ روپیہ

---

[1] مولانا رحیم بخش صاحب مرحوم منصب وزارت کے علاوہ ویسے بھی ریاست کے معاملات میں بہت دخیل تھے مولانا موصوف حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے متوسلین میں سے تھے اور نواب صاحب مرحوم کی آمد سے پہلے ہی مدینہ منورہ آچکے تھے۔ اس لئے آپ سے کچھ شناسائی پہلے سے تھی۔ منہ

ماہوار مقرر ہو گئے مگر یہ رقم سالانہ سالگرہ کے جشن پر آیا کرتی تھی۔

اس طرح پر مجموعہ خاندان کی ایک دائمی آمدنی رفتہ رفتہ ہو گئی اور فی الجملہ اتنی آمدنی ہو گئی کہ قناعت اور اطمینان کے ساتھ مشاغلِ علمیہ و دینیہ میں منہمک ہو سکیں۔ اگرچہ اس درمیان میں کھانے پینے کی تنگیاں پیش آئیں مگر بفضلہ تعالیٰ ایسی نوبت کبھی پیش نہیں آئی کہ کوئی فردِ خاندان بھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا یا اس قسم کے پیشہ کا ارادہ کرتا جس میں ایسی نوبتیں آتی ہیں یا ایسی کارروائی کرنے پر مجبور ہوتا جس میں حلال و حرام کا امتیاز نہ ہوتا والحمد للہ۔ ہم نے بہت سے مہاجرین کو ایسے ناشائستہ اعمال میں مبتلا پایا ہے۔ جو آمدنی اس طرح ہوتی تھی سب والد صاحب مرحوم کے سامنے پیش کر دی جاتی تھی وہ حسبِ رائے خود صرف فرماتے تھے۔

علیحدگی خورد و نوش

مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک تمام کاروبارِ خانہ داری مشترک تھا۔ والدہ ماجدہ مرحومہ نے اپنی تینوں بہوؤں میں باری مقرر کر رکھی تھی۔ کھانا سب کا ایک ہی جگہ پکتا تھا والدہ صاحبہ تقسیم فرما دیا کرتی تھیں۔ باری والی عورت پخت و پز کے تمام کام اپنی باری پر انجام دیتی تھی اور زائد مشاغل میں سب شریک رہتی تھیں مگر طبعی طور پر ان تینوں عورتوں میں کچھ تنافس اور تنافر کی نوبت آئی۔ بالخصوص اس بنا پر کہ بھائی سید احمد صاحب مرحوم کی اہلیہ مرحومہ والدہ ماجدہ مرحومہ کی حقیقی بھتیجی تھیں اور باقیماندہ دو عورتیں اجنبی خاندانوں کی تھیں۔ اس لئے وہ چاہتی تھیں کہ تمام نظامِ خانہ داری ہر ایک کا علیحدہ کر دیا جائے مگر سرمایہ کی کمی اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ناگوار امور پر صبر کرنا اور کرانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ ہم دونوں بھائی سفرِ گنگوہ شریف میں تھے ایک روز والدہ ماجدہ مرحومہ نے خواب میں دیکھا کہ حجرہ مطہرہ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں قبر شریف پر چارپائی بچھی ہوئی ہے اور اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے آرام فرما رہے ہیں اور والدہ ماجدہ پیچھے بیٹھی ہوئی آپؐ کی کمر دبا رہی ہیں۔ یکایک سامنے سے بڑے بھائی صاحب مرحوم کی اہلیہ (وحید مرحوم کی والدہ) آئیں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدہ ماجدہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ان کو جدا کیوں نہیں کر دیتی ہو۔ یہ خواب والدہ صاحبہ نے صبح کو والد ماجد سے ذکر کیا تو اسی روز والد صاحب نے سب کو جدا کر دیا مگر چونکہ بھائی سید احمد صاحب کی اہلیہ خواہشمند نہ تھیں اور قرابت قریبہ کی وجہ سے کوئی گرانی اُن پر نہ آتی تھی اس لئے وہ والدہ ماجدہ ہی کے ساتھ رہیں جو جو جنسیں غلہ وغیرہ اور گوشت ترکاری اور دیگر ضروریات کی آتی تھیں خام تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ بعد اجراء وظائف بھی عرصہ تک بہ طریقہ

جاری رہا۔ مگر بعد میں والد صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اپنی اپنی آمدنی کو اپنی ضروریات میں خرچ کرو۔

پختہ مکانوں کی تعمیر

اگرچہ فوری طور پر جلدی میں مذکورہ بالا چند کوٹھڑیاں اپنے ہاتھوں بنالی گئی تھیں مگر یقیناً ان میں گزران نہیں ہو سکتی تھی۔ گرمی کے زمانہ میں مدینہ منورہ کی لو اور شدت تمازت میں ان میں بسر کرنا از حد مشکل تھا۔ علیٰ ہذا القیاس سردی کے شدت کے زمانہ میں اور زور کی بارش میں۔ اس لئے ضروری تھا کہ پختہ مکان بنایا جائے اور جلد بنایا جائے اس لئے اس کی طرف پوری توجہ والد صاحب مرحوم نے اسی وقت سے کر دی۔ جو رقوم اُن کے پیر بھائی اور احباب ہندوستان سے بھیجتے تھے یا جو رقوم ہمارے بعض احباب وغیرہ موسم حج و زیارت میں دے جاتے یا اور کوئی بالائی آمدنی ہو جاتی تھی اس کو روزمرّہ کے مصاف خانہ داری میں صرف نہیں کرتے تھے بلکہ تعمیر ہی میں لگانا ضروری سمجھتے تھے۔ جس کی وجہ سے نہایت تنگی اور نہایت معمولی غذا پر سب کو بسر کرنا پڑتا تھا۔ کبھی پتھر خرید لئے۔ مدینہ منورہ کے شرق اور غرب اور جنوب میں زمین دوز سنگ خارا کے پہاڑ ہیں انہیں کو حرّہ اور لابہ کہتے ہیں۔ یہ پتھر سیاہ اور نہایت سخت ہوتے ہیں انہیں سے مدینہ منورہ کی عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ اونچے پہاڑ بھی قریب میں واقع ہیں بالخصوص سلع مگر اُن کے پتھر سنگ خارا کی قسم کے نہیں ہیں اور نہ اتنے مضبوط ہیں۔ پتھروں کی تجارت اور گھڑائی کرنے والے انہیں زمین دوز حرّوں میں سے بارود سے پتھروں کو توڑ کر پھر پتھروں سے ٹکڑے کر کے گدھوں اور خچروں پر لادتے اور مواضع تعمیر تک پہنچاتے ہیں اور فی حمل (بوجھ) بھاؤ مقرر ہو جاتا ہے۔

کبھی لکڑی خرید لی (مدینہ منورہ میں کڑیوں کے لئے کھجوروں کے تنے عموماً کام میں آتے ہیں اور مضبوط ہوتے ہیں جو لوگ بہت زیادہ امیر ہیں اور اپنی عمارت امیرانہ بنوانا چاہتے ہیں وہ چھت میں جاوی لکڑیاں تین تین چار چار پانچ موٹائی والی لگاتے ہیں چونکہ یہ جاوی لکڑیاں بہت گراں پڑتی ہیں اس لئے عام طور پر کڑیوں میں استعمال نہیں ہوتیں۔ البتہ دروازوں، کھڑکیوں، طاقچوں اور طاقوں، روشندانوں وغیرہ میں جاوی ہی لکڑیاں مستعمل ہوتی ہیں۔ معمولی اور غرباء کے مکانات میں جھاؤ اور ببول کی موٹی شاخیں بجائے کڑی کے استعمال کی جاتی ہیں۔ کڑیوں پر کھجور کے پتوں کے ڈنٹھر (جرید سے) رکھے جاتے ہیں اور اُن پر کھجور کے بورئے بچھائے جاتے ہیں اور اُن پر گلاوہ (گارا) اور اس پر خشک مٹی بچھائی جاتی ہے۔

کبھی اور ضروریات خرید لیں کبھی اس مجموعہ ضروریات سے عمارت تعمیر کرالی۔ معماروں اور

مزدوروں کے ساتھ خود بھی لگے رہتے تھے اور ہم بھائیوں کو بھی ساتھ لگنے کی تاکید فرماتے تھے بسا اوقات میں مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھاتا ہوتا تھا اور آدمی آتا کہ والد صاحب بلاتے ہیں طلبہ کو رخصت کر کے حاضر ہوتا تو فرماتے کہ مٹی اٹھانے والا یا اینٹ اٹھانے والا مزدور نہیں آیا تم اس کام کو انجام دو۔ بمجبوری تمام دن یہ کام کرنا پڑتا اور تمام اسباق کو معطل کرنا پڑتا۔ بسا اوقات ایک ایک دو دو ہفتہ اسباق کو معطل کر کے تمام اوقات اسی تعمیری خدمات میں صرف کرنا پڑتے بڑے بھائی صاحب مرحوم اور دوسرے بھائیوں اور بچوں کو بھی ایسا کرنا پڑتا تھا مگر چونکہ میں سب میں زیادہ مضبوط اور نوجوان تھا اس لئے مجھ پر نزلہ زیادہ گرتا تھا چھوٹے بھائی جمیل احمد مرحوم اور محمود احمد بھی اگر اپنی تعلیمات سے فارغ ہوتے تو وہ بھی یہ کام انجام دیتے۔ گارا بنانا، گارا ڈھونا، اینٹیں پاتھنا، اینٹیں معمار تک پہنچانا، پانی بھرنا گارے کے لئے وغیرہ تمام ضروریات عمارت ہم لوگ انجام دیتے رہے۔ البتہ تعمیر کرنا اور پتھروں کا گھڑنا اور ان کو موقع تعمیر تک پہنچانا یہ ہم سے نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اس کے کرنے والے مزدور ضرور رکھے جاتے تھے۔ اس طرح تقریباً دو سال میں پہلے مکان کے دو طبقے تیار ہو گئے۔ تب ان عارضی اور چھوٹے کمروں سے منتقل ہو کر سب یہاں آ گئے۔ ان دو طبقوں میں سات کمرے وسیع ہوادار تیار ہوئے۔ ہر طبقہ میں پائخانہ، غسل خانہ، باورچی خانہ اور کنواں تھا۔ تیسرے طبقہ اور چھت کی پردہ دار تعمیر بعد میں ہوئی۔ اس کے بعد والد صاحب مرحوم نے دو مکانات اور تعمیر کرائے مگر ان میں ہم لوگوں نے زیادہ کام نہیں کیا کیونکہ تعلیمی مشاغل کا بہت حرج ہوتا تھا۔ اگرچہ والد صاحب مرحوم خود لگے رہتے تھے البتہ زیادہ مشقت کا کام نہیں کرتے تھے۔ جس زمانہ میں تعمیری کام نہیں ہوتا تھا اس زمانے میں بھی والد صاحب مرحوم خالی نہیں بیٹھتے تھے۔ اوقات وظائف و اوراد سے فارغ ہونے کے بعد نیلام کے بازار میں چلے جاتے اور لکڑیاں یا اور مفید چیزیں خرید لاتے۔ جلانے کی لکڑیوں میں سے جو لکڑی کارآمد ہوتی اس سے چارپائیوں کے پائے یا پٹی یا کھونٹیاں وغیرہ اپنے ہاتھ سے بنا لیتے اگرچہ یہ کام کبھی ہندوستان میں نہیں کیا تھا مگر ضرورت ہر چیز کی تعلیم دے دیتی ہے۔ نیلام کے بازار سے بڑھئی کے اوزار ہر قسم کے خرید لائے تھے۔ اُن سے یہ معمولی کام کر لیتے تھے۔ چنانچہ اپنے ہی ہاتھوں سے سب کے لئے چارپائیاں وغیرہ بنا دی تھیں۔ رحمہ اللہ تعالےٰ وارضاہ و جازاہ عنا احسن الجزاء۔

والد صاحب مرحوم نے بعد کو اس تمام تعمیر کو اس خوف سے کہ مبادا کوئی شخص اولاد میں سے فروخت کر کے

چلا جائے وقف علی الاولاد کر دیا۔ شریف حسین کے زمانہ حکومت میں یہ تمام محلہ اوجڑ ہوگیا تھا بلکہ بیرون باب مجیدی جو کہ قبل از جنگ عمومی نہایت آباد اور قیمتی متعدد محلّات کو مشتمل ہوگیا تھا۔ صرف ان محلوں کی آبادی تقریباً تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی مگر شریف موصوف کی بغاوت کی وجہ سے وہ آفت آئی کہ صرف چند سو کی آبادی رہ گئی۔ تمام مدینہ منورہ کی تقریباً سوا لاکھ یا اس سے زائد مردم شماری تھی جنگ کے بعد امن کے زمانہ میں صرف بارہ تیرہ ہزار کی مردم شماری رہ گئی۔

سور البلد (شہر پناہ کی دیوار) کے باہر کی آبادی نہایت خطرناک ہوگئی۔ چوروں اور قزاقوں کا دور دورہ ہوگیا۔ امن و امان کافور ہوگیا۔ لوگ اپنے اپنے بیرونی مکانات چھوڑ کر (جو باقی رہے تھے) اندرون شہر پناہ رہنے پر مجبور ہوگئے۔

بعد از واپسی از ایڈریانوپل و شام بھائی سید احمد صاحب اور محمود احمد نے اپنے اس مکان کی سکونت نہیں چھوڑی چوروں نے حملہ کیا اور بھائی صاحب مرحوم پر گولی چلائی مگر اللہ تعالےٰ کے فضل سے زخم معمولی ہؤا اس لئے مجبوراً مکان خالی کر کے اندرون شہر پناہ متصل باب النساء کرایہ پر مکان لے کر سکونت اختیار کی اور بیرونی مکانات کی حفاظت کے لئے کہ کہیں چور دروازوں اور کڑیوں اور طاقوں وغیرہ کو اکھاڑ نہ لے جائیں تنخواہ دے کر تکرونیوں کو رکھ دیا۔

نفوس کا ابتلاء اور امتحان

کھانے پینے اور سکونت کے بارہ میں جو کچھ کڑا اور سخت امتحان پیش آیا اور جس طرح بتوفیق اللہ تعالےٰ اس کا تحمّل کیا گیا اس کی مختصر سرگذشت تو گذر چکی اس کے ساتھ نفوس کا ابتلاء بھی عجیب و غریب گذرا۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ والد صاحب مرحوم کی اولاد ایک لڑکی اور ہم پانچ لڑکے۔ جو کہ بوقت سفر مدینہ منورہ موجود اور زندہ تھے اس سے پہلے دو بہن لڑکیاں اور لڑکے خورد سالی ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ وہ رفیق سفر نہیں ہو سکے تھے۔ یہ چھ موجودہ اولاد ہی تھی جن میں تین کی شادیاں ہندوستان ہی میں ہو چکی تھیں۔ بڑے بھائی صاحب صاحبِ اولاد بھی تھے۔ وحید احمد مرحوم جو کہ ۱۳۱۳ھ میں ٹانڈہ ہی میں پیدا ہؤا تھا اور اس سفر حجاز میں تقریباً چار برس کا تھا، والد صاحب کی باقی تین اولاد شادی کی عمر کو نہیں پہنچی تھی والد صاحب مرحوم کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ ہی میں اُن کی شادی کر دیں گے اور یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ میں نے اولاد کو عربی پڑھائی ہے اس لئے وہاں پر اُن کی ملازمتیں بھی بآسانی ہو جائیں گی اور یہ بھی خیال تھا کہ یہ سب میری اولاد پھلے پھولے گی۔ اور آپس میں اپنی اولاد کی شادی بیاہ کر کے ترقی کر جائے گی اور ایک اچھا خاصا کنبہ اور خاندان بن جائیگا

مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ ملازمتوں کا سلسلہ تو خیال خام ابتداہی میں نکلا۔ اگرچہ کچھ عرصہ کے بعد اس میں کامیابی ہوگئی۔ بالخصوص چھوٹے بھائیوں کی ترکی تعلیم کے بعد جمیل احمد مرحوم (جو کہ ۱۳۰۲ھ میں ٹانڈہ میں پیدا ہوا تھا اور بوقت وفات تقریباً اکیس برس کی عمر رکھتا تھا) کا اگر انتقال نہ ہو جاتا تو قوی امید تھی کہ وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہوتا۔ اور اچھی تنخواہ ہوتی۔ محمود احمد سلمہ (جو کہ ۱۳۰۸ھ شوال میں بہ مقام ٹانڈہ پیدا ہوا اور اس سفر حجاز میں آٹھ برس کی عمر رکھتا تھا) جب کہ ترکی کالج سے فراغت حاصل کی تو اُس کو فوراً محکمہ قضا میں عارضی جگہ محرری کی دے دی گئی جس میں وہ ترقی کرتے کرتے بڑے عہدوں تک پہنچ گیا۔ اسی طرح انہوں نے وحید مرحوم کو بھی ترکی کالج میں داخل کر دیا تھا چنانچہ اُس نے بھی ترکی میں اچھی استعداد پیدا کر لی تھی۔ مگر نسل اور اولاد کے متعلق والد صاحب مرحوم کا خیال بالکل غیر قابل تعبیر خواب ثابت ہوا۔

میں جس وقت ۱۳۱۸ھ کے آخر میں گنگوہ شریف کو روانہ ہوا تو گھر میں حمل تھا اور بڑے بھائی صاحب کا دوسرا بچہ حمید احمد پیدا ہو چکا تھا جو کہ مدینہ منورہ میں ۹ جمادی الاوّل ۱۳۱۷ھ میں پیدا ہوا تھا۔ میرے سفر کے ایام میں بچی پیدا ہوئی۔ ۱۳۲۰ھ کے ابتداء میں جبکہ ہم دونوں ہندوستان سے واپس آئے تو پہلے پہل کچھ دنوں کے بعد میری بچی کا انتقال ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد بڑے بھائی صاحب کے دوسرے بچے حمید احمد کا انتقال ہوا۔ بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے کئی بچے پیدا ہوئے مگر سب کے سب ایام رضاعت ہی میں انتقال کر تے گئے۔ بالآخر اُن کی اہلیہ نسوانی امراض میں مبتلا ہو گئیں۔ مدینہ منورہ میں بہت کچھ علاج کیا گیا مگر فائدہ نہ ہوا۔ میرے سفر ثانی ہند میں (جس کا تذکرہ آگے آئے گا) وہ ہندوستان گئیں کیونکہ اُن کے حقیقی بھائی ڈاکٹر ہیں انہوں نے تقاضا کیا تھا کہ ہمشیرہ کو یہاں بھیج دو میں علاج کروں گا وہ اپنے بھائی کے پاس تقریباً ایک سال یا زیادہ رہیں مگر کوئی معتد بہ فائدہ نہیں ہوا۔ ۱۳۲۸ھ میں اُن کو پھر مدینہ منورہ بھیج دیا گیا اور یہاں آکر چند ماہ بیمار رہ کر ۱۳۲۹ھ میں انتقال کر گئیں۔

۱۳۲۲ھ میں والدہ صاحبہ مرحومہ کا انتقال ہوا اور اس کے کچھ عرصہ بعد جمیل احمد مرحوم استنبول سے تپ دق اور سل میں مبتلا ہو کر آیا اور چند مہینہ زندہ رہ کر راہی ملک عدم ہوا۔ والدہ مرحومہ کے انتقال کی وجہ سے والد صاحب مرحوم کو اپنی خدمات ضروریہ میں سخت تکالیف برداشت کرنی پڑتی تھیں اس وجہ سے ہم سبھوں نے مناسب سمجھا کہ والدہ مرحومہ

کی خالہ زاد بہن کو جو عرصۂ دراز سے لاولد بیوہ تھیں اور اُن کے تعلقات بھی والدہ صاحبہ مرحومہ اور ہم سبھوں سے بہت زیادہ تھے اُن کو بلا لیا جائے اور والد صاحب سے اُن کا نکاح کر دیا جائے چنانچہ والد صاحب مرحوم کو اس پر راضی کر لیا گیا اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو لکھ دیا گیا کہ واپس ہوتے ہوئے تم خالہ صاحبہ کو اپنے ساتھ لیتے آؤ۔ ۱۳۲۴ھ کے ابتدا میں وہ معہ خالہ صاحبہ کے آئے اور والد صاحب سے اُن کا عقد ہو گیا۔ اس سے اگرچہ فی الجملہ اُن کو کچھ راحت ہوئی مگر جو آرام والدہ مرحومہ کی موجودگی میں جو کہ مزاج اور عادت سے واقف تھیں حاصل ہوتا تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ والد صاحب مرحوم کو حقّہ کی اس قدر عادت تھی کہ پاخانہ میں بھی حقہ لے کر جاتے تھے اور رات میں اُٹھ اُٹھ کر پیا کرتے تھے۔ بدن دبوانے کی بھی عادت تھی۔ بہر حال وہ بھی کچھ دنوں زندہ رہ کر رحلت فرما گئیں۔

بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو یہ بھی لکھا گیا کہ ماموں زاد بھائی فاروق احمد کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئیں تاکہ ہمشیرہ کا عقد اس سے کر دیا جائے۔ والدہ مرحومہ کو اس رشتہ کی خواہش بھی تھی کیونکہ وہ ان کا حقیقی بھتیجا تھا۔ اگرچہ والد صاحب اس کے غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے پسند نہ کرتے تھے۔ مگر خاندان میں دوسرے لڑکے کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے راضی ہو گئے تھے۔ فاروق احمد موصوف کے والدین اس وقت موجود تھے وہ اس رشتہ پر راضی تھے۔ اُن سے والد صاحب مرحوم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ فاروق احمد کو میں یہاں رکھوں گا اور عربی تعلیم دلواؤں گا چند سال رہے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد جی چاہے گا وہ معہ اپنے متعلقین کے ہندوستان چلا جائے گا اور جی چاہے گا یہاں ہی قیام پذیر رہے گا۔ چنانچہ وہ بھی بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے ساتھ آ گیا اور اس کا عقد ہمشیرہ مرحومہ سے کر دیا گیا اور اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر دیا گیا۔ عربی کی ابتدائی کتابیں شروع کرائی گئیں مگر وہ بدنصیب ایک سال رہ کر خفیہ طریقہ پر بھاگ گیا۔ اس نے اپنی بیوی کے کچھ زیور خفیہ طریقہ پر فروخت کر کے زادِ راہ حاصل کیا اور ہندوستان پہنچ گیا۔ چند مہینوں کے بعد اس کے لڑکی ۱۸ محرم ۱۳۲۵ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئی۔ اس کے والدین مرحومین کا تقاضا رہا کہ ہماری پوتی اور بہو کو ہندوستان بھیج دو مگر والد صاحب مرحوم کو فاروق احمد موصوف کی نالائقی سے اسقدر صدمہ ہوا تھا کہ وہ بھیجنے پر راضی نہیں ہوئے اس کے کچھ عرصہ کے بعد بڑے بھائی صاحب مرحوم کی اہلیہ مرحومہ (والدہ وحید) تپ دق اور سل میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہوئی تھی۔ صرف وحید احمد مرحوم ایک لڑکا چھوڑا بھائی صاحب مرحوم کو

تنہائی کی سخت تکالیف پیش آئیں۔ سیّد فرزند علی صاحب مرحوم بریلی کے ایک مہاجر تھے ان کی لڑکی سے بھائی صاحب مرحوم کا عقد کر دیا گیا۔ اس نکاح کو تقریباً ڈیڑھ سال یا اس سے کچھ ہی زائد گذرے تھے کہ ایامِ زچگی میں اس کا بھی انتقال ہوگیا۔ بچہ بھی زندہ نہ رہا۔ پھر بھائی صاحب مرحوم نے ایک بنارس کی مہاجرہ عورت سے (جو کہ اُس زمانہ میں بیوہ تھیں اور کشمیری خاندان سے تھیں) نکاح کیا۔

۱۳۲۶ھ کے ابتداء میں میری پہلی اہلیہ مرض دِق وسِل میں مبتلا ہوکر چند مہینے بیمار رہ کر راہی ملک عدم ہوئی۔ ایک لڑکی زہرا جو کہ ۱۳۲۳ھ میں پیدا ہوئی تھی چھوڑ گئی۔ جو کہ ۱۳۲۷ھ میں بمقام دمشق فوت ہوگئی۔

ہمشیرہ مرحومہ بھی مرض دِق وسِل میں مبتلا ہوئی اور سال بھر سے زیادہ بیمار رہ کر ۱۳۲۹ھ کے ابتداء میں راہی ملک عدم ہوئی۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس کی لڑکی بھی انتقال کر گئی جو تقریباً چار برس کی تھی۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کے اس تیسری زوجہ سے بچّہ پیدا ہوا مگر وہ بھی کچھ عرصہ زندہ رہ کر فوت ہوگیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد یہ اُن کی تیسری اہلیہ بھی انتقال کر گئیں۔

عزیزم محمود احمد سلمہٗ کا عقد ایک بریلی ہی کے خاندان میں شیخ ریاض الدین صاحب مہاجر کی ہمشیرہ سے کیا گیا چند مہینوں کے بعد والد صاحب مرحوم سے اور شیخ ریاض الدین صاحب اور اُن کے خاندان سے نااتفاقی ہوگئی جس کی وجہ سے آمد و رفت بند ہوگئی۔ صلح کی کوششوں میں ناکامی ہوئی۔ آخر کار اہلیہ محمود احمد بیمار ہوئی اور تپ دق میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہوگئی۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کا چوتھا عقد ڈاکٹر رفاقت علی صاحب مرحوم کی لڑکی سے ہوگیا۔ اُس سے ایک لڑکا بھائی صاحب کے ہوا جو کہ پیدا ہونے کے چند دنوں بعد فوت ہوگیا۔ پھر بھائی صاحب بھی ۱۳۳۰ھ میں وفات پا گئے۔ اس طرح خاندان کے افراد کا برابر وفیاتی سلسلہ جاری رہا۔ والد صاحب مرحوم کے سامنے ہی تقریباً بتیس ۳۲ یا تینتیس ۳۳ نفوس مدینہ منورہ میں وفات پا گئے اور خاندان کے بڑھنے کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

بیعت و حضوری بارگاہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز

استفادہ طریقت و روحانیت

پہلے ذکر آچکا ہے کہ خاندان کے اسلاف اہل معرفت و طریقت تھے صرف اخیر میں دو تین پشتیں دنیادار زمینداروں کی ہو گئی تھیں۔ نیز یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ شاہانِ دہلی سے خاندان کو چوبیس گاؤں دیئے گئے تھے۔ شاہ مدن رحمۃ اللہ علیہ کے بعد شاہ نور اشرف مرحوم نے سجادہ طریقت اور دوسرے بیٹے تراب علی مرحوم نے جائداد کا انتظام سنبھالا۔ اس طرح خاندان میں دو پٹیاں قائم ہوگئیں مگر خاندان میں کوئی شخص باہر کسی دوسرے خاندان سے بیعت نہ ہوتا تھا۔ والد صاحب مرحوم سب سے پہلے باہر بیعت ہوئے۔ جس کی صورت یہ پیش آئی کہ اُن کی شادی نانا اکبر علی مرحوم کی دختر سے ہوئی (نانا صاحب مرحوم ۱۸۵۷ء میں تمام جائداد کے متصرف تھے اور ۱۸۵۸ء میں امن قائم ہونے پر ضلع بستی سے واپس آتے ہوئے دریائے گھاگرا میں کشتی اُلٹ جانے سے ڈوب گئے تھے) نانی صاحبہ مرحومہ نندرولی ضلع فیض آباد کی رہنے والی تھیں اور صاحب کشف و نسبت تھیں۔ انہوں نے اپنے ماموں سے میکہ ہی میں سلوک طے کیا تھا اُن کے ماموں بہت بڑے صاحب نسبت تھے۔ والد صاحب مرحوم کو انہوں نے ہدایت کی تھی کہ تمہارے گھرانے میں مرید کرنے کا طریقہ جاری ہے مگر یہ غلط ہے جب تک کسی کامل سے بیعت ہو کر منازلِ سلوک طے نہ کر لئے جائیں مرید کرنا جائز نہیں قیامت میں سخت وبال ہوا گا۔ اس لئے والد صاحب مرحوم کو شیخ طریقت کی تلاش تھی۔ خاندان کے دوسرے لوگوں نے بغیر سلوک خاندانی نام پر یہ سلسلہ جاری کر رکھا تھا اور اِن خاندانوں میں جو کہ اضلاع بستی، گونڈہ، گورکھپور وغیرہ میں سلسلہ اسلاف میں داخل ہوتے جاتے تھے اور نذرانہ وغیرہ وصول کرتے تھے اور لوگوں کو مرید بھی کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم جب صفی پور میں مدرس اور ہیڈ ماسٹر ہوئے تو چونکہ گنج مرادآباد شریف قریب تھا اور ان اطراف میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا شہرہ تھا۔ ان کی کرامت اور بزرگی بہت زیادہ زبان زد عوام و خواص تھی۔ اس لئے حضرت مولانا موصوف کی خدمت میں آمد و رفت شروع کی اور

وہ کمالات جو اہل اللہ میں ہونے چاہئیں دیکھ کر گرویدہ ہوگئے اور انہیں سے بیعت ہو گئے اور حسب تعلیم وارشاد فرائضِ سلوک انجام دینے لگے۔ جہاں تک معلوم ہے حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز نے طریقہ قادریہ کا سلوک حضرت والد صاحب مرحوم کو تلقین فرمایا تھا اور پھر جب تبدیلی بانگرمئو کی ہو گئی تو بہت زیادہ حاضری کا موقعہ مل گیا کیونکہ بانگرمئو گنج مراد آباد سے بہت ہی زیادہ قریب ہے غالباً دو یا تین ہی میل کا فاصلہ ہے۔ پھر والدہ مرحومہ کو بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہی سے بیعت کرایا۔

خاندان کے لوگوں نے والد مرحوم پر باہر بیعت کرنے پر اعتراضات بھی کئے مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ والد صاحب کے ارشاد پر ہم تینوں بھائیوں مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم اور مولانا سید احمد صاحب مرحوم اور راقم الحروف کو بھی دیوبند سے بعض اوقات میں واپسی پر گنج مراد آباد بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

جب بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا محمد صدیق صاحب) دیوبند میں فارغ التحصیل ہوئے تو انہوں نے حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت ہونے کی اجازت والد صاحب مرحوم سے طلب کی۔ والد صاحب کی منشا طبعی طور پر یہی تھی کہ وہ حضرت گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز ہی سے بیعت ہوں۔ دونوں میں عرصہ تک خط وکتابت رہی بالآخر والد صاحب مرحوم نے ان کو حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت ہونے کی اجازت دے دی اور وہ اُن سے بیعت ہو گئے۔ اس عرصہ میں بھائی صاحب مرحوم بلند شہر اور سہوارہ وغیرہ بصیغہ تدریس ملازم رہے اور حسب تعلیم ذکر وشغل بھی برابر کرتے رہے۔ ۱۳۱۶ھ میں جبکہ والد صاحب مرحوم نے بعد وفات حضرت مولانا گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز ارادہ ہجرت کیا (چونکہ والد صاحب مرحوم کو حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بہت گہرا تعلق تھا اور تقریباً اُن میں فنا تھے۔ اس لئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے ان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ ہندوستان میں بسر کرنا نہایت ناگوار معلوم ہونے لگا۔ اسی وقت سے اس فکر میں ہو گئے کہ کوئی انتظام کرکے معہ جملہ متعلقین مدینہ منورہ میں گزر بسر کی جائے) اور ماہ شعبان میں بارادہ توجہ وطن بھائی صاحب جائے ملازمت سے دیوبند پہنچے تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھائی صاحب مرحوم سے فرمایا کہ ان دونوں (بھائی سید احمد صاحب اور حسین احمد) کو حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت کرادو خدا جانے یہاں سے جانے کے بعد کس کے

پلّے پڑجائیں۔کہیں کسی بدعتی سے وابستہ نہ ہوجائیں۔بھائی صاحب مرحوم نے ہم سے فرمایا میں نے عرض کیا کہ میں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوں گا۔واقعہ یہ تھا کہ اگرچہ گنگوہ میں ایام طالب علمی میں بارہا حاضری کی نوبت آچکی تھی مگر حسنِ عقیدت اور محبت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہی سے تھا بچپن سے اُن کی خدمت میں رہنا ہوا تھا اور ابتدائی کتابوں سے لیکر آخری کتابوں تک کا اکثر حصہ انہیں سے پڑھتا رہا تھا مضامین علمیہ اور اخلاق عالیہ اور اعمالِ صالحہ کے مشاہدات حاصل ہوئے تھے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ایسے الطاف و کرم فرماتے تھے جو کہ اولاد کے لئے ہوتے ہیں۔اس لئے پوری وابستگی انہیں سے تھی۔حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کو بہت بڑا عالم ضرور جانتا تھا مگر قلبی تعلق ایسا نہ تھا اور نہ طریقت کا کامل سمجھتا تھا۔بھائی صاحب مرحوم نے جواب دیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ بیعت نہیں کرتے میں نے خود بہت کوشش اپنے لئے کی تھی جب نہیں راضی ہوئے اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت ہو جانے کا ہی ارشاد فرمایا تب میں وہاں بیعت ہوا۔تم دونوں کے لئے بھی ان کا یہی ارشاد ہے۔بالآخر وہاں ہم دونوں حاضر ہوئے۔اس زمانہ میں حضرت اُستاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی وہاں ہی خانقاہ میں رہتے تھے اور مشاغل سلوک کے انہماک کے ساتھ حضرت قطبِ عالم رحمۃ اللہ علیہ کی ڈاک کی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تھے۔بھائی صاحب مرحوم نے اُن کو خط لکھ دیا تھا کہ ان دونوں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کرا دیجئے۔جب ہم دونوں وہاں پہنچے تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے دونوں کو یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ مولوی صدیق احمد صاحب نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں مولوی سیّد احمد اور حسین احمد کو بیعت ہونے کے لئے بھیجا ہے وہ حاضر ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ بیعت فرمانے میں بہت زیادہ رد و قدح فرمایا کرتے تھے بالخصوص لکھے پڑھے اور عربی تعلیم یافتہ لوگوں کے متعلق تو بہت زیادہ کنج و کاؤ اور گفت و شنید کی نوبتیں آتی تھیں بعض حاضرین اور بے تکلف خدام مثل مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم کاندہلوی کے دریافت کرنے پر یہ فرمایا کہ میں دیکھتا

ہوں کہ کس شخص کو مجھ سے قلبی مناسبت ہے اور کتنی مناسبت ہے۔ اگر مناسبت نہیں ہوتی تو میں انکار کر دیتا ہوں ورنہ بیعت کر لیتا ہوں بہرحال ہم دونوں پیش ہوئے تو کچھ پس و پیش نہیں فرمایا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے پیش فرمایا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت فرما لیا۔ مگر کچھ تلقین نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے بیعت تو کر لیا اب تم مکہ معظمہ جا رہے وہاں حضرت (حضرت قطبِ عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز) موجود ہیں اُن سے عرض کرنا وہ ذکر تلقین فرما دیں گے۔ پس اسی روز ہم دیوبند واپس آ گئے۔ اور پھر وطن کو روانہ ہو گئے۔ دیوبند سے رخصت ہوتے وقت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پیدل اسٹیشن تک ساتھ تشریف لائے اور راستہ میں صدر چوکی کے پاس وصیت فرمائی کہ پڑھانا نہ چھوڑنا خواہ ایک ہی طالب علم پڑھنے والا ہو۔

بیعت کے برکات

اگرچہ بیعت بادل نخواستہ ہوئی تھی مگر اُس کے آثار مبارکہ میں نے اپنے اندر اُسی دن سے محسوس کئے۔ اس سے پہلے کبھی کبھی نماز چھوٹ جاتی تھی مگر اُس روز سے برابر مداومت ہو گئی کبھی قضا نہیں ہوئی اور اگر کسی عذر قوی سے بلا اختیار فوت بھی ہو گئی جو کہ شاذ و نادر ہوئی تو قضا کر لی گئی (جو نمازیں بیعت سے پہلے کبھی کبھی فوت ہوئی تھیں ان کو بھی ایام اسارت احمد آباد میں تخمینہ کر کے ادا کرنے کی توفیق ہوئی واللہ الحمد) بیعت کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک میدان ہے اور اُس کے بیچ میں ایک قبر ہے جو کہ حضرت خواجہ علاؤالدین صابر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے خواب میں میں ایک ہی قبر کو دونوں بزرگوں کی قبر سمجھ رہا ہوں۔ میں اُس قبر کی طرف جا رہا ہوں اور بالکل قریب پہنچ گیا ہوں۔ میں نے اس خواب کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لکھ کر بھیجا۔ وطن پہنچتے ہی الہ آباد کو جو کہ اُس زمانہ میں یو پی کے حجاج کے لئے قرنطینہ کا مقام مقرر کیا گیا تھا روانگی ہو گئی۔ وہاں تقریباً پندرہ بیس دن قیام کرنا پڑا۔ یہ جگہ شہر کے باہر پراگ کے قریب خصوصی انتظام کے ساتھ حجاج کے لئے علیحدہ بنائی گئی تھی۔ وہیں جواب منگایا۔

حضرت اُس وقت گنگوہ شریف میں بارادہ قیام رمضان شریف مقیم تھے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس خواب کو حضرت قطبِ عالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا تو تعبیر میں فرمایا

کہ لکھ دو کہ منزل مقصود کو پہنچے گا۔ یہ جوابی خط الہ آباد میں قرنطینہ کے کیمپ میں موصول ہوا سفر حج کرتے ہوئے جبکہ اواخر ماہ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ میں حاضری مکہ معظمہ نصیب ہوئی تو جائے قیام پر اسباب وغیرہ منظم کرنے کے بعد حضرت قطبِ عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے یہاں صبح کو حاضر ہونے کی عزت نصیب ہوئی۔ موصوف اس وقت بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ اکثر لیٹے رہتے تھے صبح کو مثنوی شریف پڑھایا کرتے تھے اُس وقت پلنگ پر کچھ دیر بیٹھ جاتے تھے۔ مولانا محب الدین صاحب مرحوم اور مولانا شفیع الدین صاحب مرحوم اور چند حضرات حاضر درس ہوتے تھے۔ جب ہم سب مع والد مرحوم حاضر بارگاہ ہوئے تو حضرت قطب عالم نے بہت توجہ فرمائی۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا سلام و پیام سن کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک نہایت محبت سے تذکرہ فرماتے رہے اور فرمایا کہ تمنا ہے کہ ایک مرتبہ پھر زندگی میں اُن سے ملاقات ہو جاتی۔

بالآخر ہم دونوں بھائی (سید احمد صاحب اور راقم الحروف) نے عرض کیا کہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ہم کو بیعت تو کر لیا تھا مگر یہ فرمایا تھا کہ تلقینِ ذکر حضرت سے حاصل کر لینا تو آپ نے پاس انفاس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ روز صبح کو آکر یہاں بیٹھا کرو اور اس ذکر کو کرتے رہو۔ چنانچہ جب تک مکہ معظمہ میں رہنا ہوا حتی الامکان روز حاضر ہوتے رہے۔ چونکہ زمانہ حج قریب تھا اس لئے جلد ہی وہ وقت آگیا کہ جس میں عرفات منیٰ وغیرہ کا سفر ہوا حج سے فارغ ہونے کے بعد پھر خدمت میں چند دنوں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

جب قافلہ حجاج اخیر عشرہ ذی الحجہ ۱۳۱۶ھ میں مدینہ منورہ کو روانہ ہونے لگا تو خلافِ معمول بعد از ظہر ہم تینوں کو حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت نے بہت شفقت فرمائی اور سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ تم کو اللہ تعالٰے کے سپرد کرتا ہوں ہم نے سکوت کیا تو فرمایا کہو ہم نے قبول کیا۔ ہم نے حسبِ تلقین اُس عمل کیا۔ حضرت رحمۃ اللہ نے دعا فرمائی ہم نے رخصتی مصافحہ کیا۔ اور پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد کچھ ایسی مشغولیتیں پیش آئیں کہ تعلیم کردہ ذکر پر مداومت نہ ہو سکی۔ چند مہینہ کے بعد حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کا ماہ جمادی الاوّل میں وصال ہو گیا۔

مکہ معظمہ سے روانہ ہونے کے بعد چوتھے روز جبکہ قضیمہ سے رابغ کو قافلہ جارہا تھا رات میں اونٹ پر سوتے ہوئے خواب میں دیکھا کہ جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ہیں۔

میں قدموں پر گر گیا۔ آپ نے میرا سر اُٹھا کر فرمایا کیا مانگتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جو کتابیں پڑھ چکا ہوں وہ یاد ہو جائیں۔ اور جو نہیں پڑھی ہیں اُن کے سمجھنے کی قوت ہو جائے تو فرمایا کہ تجھ کو دیا۔

مدینہ منورہ پہنچنے سے کچھ عرصہ بعد بعض ہندوستانیوں اور بعض عربوں کی خواہش ہوئی کہ سلسلۂ تعلیم جاری کیا جائے۔ نحو و صرف وغیرہ کی کتابیں ایک ایک دو دو آدمیوں کو خالی اوقات میں حسبِ ارشاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حرم محترم نبوی میں پڑھانے لگا۔ اور دن کے باقی اوقات میں دوکان کا کام کرتا تھا یا کتابت کا۔ کیونکہ روزگار کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لئے یہ مشغلہ تھا کہ اجرت پر بعض کتابوں کو کتب خانہ سے نقل کرتا اور کبھی کبھی اس دوکان پر بیٹھتا (جو بڑے بھائی صاحب نے بازار میں کھولی تھی جس میں شکر، اچار، چاول، صابون وغیرہ بکتا تھا اور نوبت بنوبت ہم تینوں اس پر بیٹھتے تھے) ان مشاغل نے اسقدر مشغول کیا کہ ذکر پر کوئی مداومت نہ ہو سکی۔ حضرت قطبِ عالم قدس اللہ سرہُ العزیز کے وصال کے بعد شوق پیدا ہوا کہ تعلیم کردہ ذکر پر مداومت کی جائے۔ چنانچہ حرم محترم (مسجدِ نبوی) میں بیٹھ کر پاس انفاس کیا کرتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں حضرت قطبِ عالم گنگوہی قدس اللہ سرہُ العزیز سے محبت اور تعلق، قلب میں بڑھنا شروع ہوا اور محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح بعض درخت جلد جلد بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس طرح حضرت گنگوہی کی محبت بڑھ رہی ہے یہاں تک کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق پر اُن کا تعلق بہت بڑھ گیا حالانکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق کم نہیں ہوا بلکہ اپنی حالت پر ہی قائم رہا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلسلہ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم کی نسبت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور گریہ کی حالت طاری ہونی شروع ہو گئی۔ اس اثناء میں رویاء صالحہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت خواب میں بکثرت ہونے لگی۔ نیز ذکر کی وجہ سے جسم میں بے اختیاری حرکات بھی ہونے لگیں مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں چونکہ لوگوں کا مجمع ہر وقت رہتا ہے اس لئے ایسا وقت مقرر کیا جس میں کم سے کم مجمع رہے وہ وقت آفتاب نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد کا تھا۔ چنانچہ روزانہ ایسے وقت میں ناشتہ کر کے باوضو مسجد شریف میں داخل ہو کر تحیۃ المسجد ادا کر کے مواجہہ شریف (قبر مبارک کے سامنے کی وہ جگہ جو کہ چہرہ مبارکہ کے سامنے ہے) میں حاضر ہوتا۔ آداب و الفاظ شرعیہ زیارت کے بعد جس قدر ممکن ہوتا الفاظ صلوٰۃ و سلام بجا لا کر پھر مسجد شریف میں جہاں خالی جگہ پاتا وہاں بیٹھ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ (جسقدر بھی ملتا تھا) ذکر میں مشغول رہتا تھا مگر جب آثارِ ذکر جسم پر زیادہ ظاہر ہونے لگے تو لوگوں کی تشویش کی وجہ سے حرم سے نکل کر شہر کے باہر جنگل میں جانے لگا

مسجد شریف کی مشرقی جانب جدھر بقیع شریف ہے (مدینہ منوّرہ کا مقبرہ) آبادی نہیں ہے ادھر نکل جاتا تھا اور کبھی مسجد الاجابہ میں (یہ مسجد مشہور ہے اور اب بالکل جنگل میں واقع ہے یہاں پر بعض ادعیہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول ہوئی ہیں) اور کبھی اسی کے قریب کھجوروں کے جھنڈوں میں تنہا بیٹھ کر ذکر کرتا رہتا تھا۔ اسی حالت پر ایک مدت گذری جو حالتیں یا رویاء صالحہ وغیرہ پیش آتی تھیں اُن کو قلمبند کر کے گنگوہ شریف بھیجا کرتا تھا۔ ایک روز مسجد نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بانتظار جماعت بوقت ظہر یا عصر بیٹھا ہوا تھا یکبارگی ایسا معلوم ہوا کہ میرا تمام جسم حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا جسم ہو گیا ہے یہ حالت اس قدر قوی ہو گئی کہ میں اپنے جسم کو اپنا نہیں پاتا تھا اور تعجب سے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹتا تھا کہ دیکھوں یہ میرا جسم ہے یا نہیں اگر نہ ہوگا تو تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ یہ حالت تھوڑی دیر گھنٹہ دو گھنٹہ رہی پھر زائل ہو گئی۔ میں نے اس حالت کو بھی لکھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ یہ حالت فنافی الشیخ ہونے کی ہے۔

سنہ ۱۳۱۸ھ شوال میں والانامہ گنگوہ شریف سے وارد ہوا کہ اگرچہ وہاں سب کچھ ہے مگر بہتر ہوتا کہ تو ایک جھپٹہ کے لئے گنگوہ آجاتا۔ چونکہ والد صاحب مرحوم اور بھائی صاحبان میری مشغولی ذکر اور بعض رویاء وغیرہ سے واقف تھے ادہر اس والانامہ سے بھی واقف ہو گئے تھے اس لئے جبکہ میں نے اس والانامہ کے مضمون کی وجہ سے سفر کی اجازت طلب کی تو والد صاحب مرحوم نے بجز قلت خرچ اور کوئی عذر پیش نہیں فرمایا اور یہ واقعی تھا کیونکہ اس مدت میں سرمایہ تقریباً قریب الختم ہو چکا تھا اس لئے مجبوراً سکوت کرنا اور سفر سے باز رہنا پڑا۔ مگر بڑے بھائی صاحب کو (مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم) جو کہ تمام کاروبار تجارت اور ضروریات کے انجام دینے والے تھے اور ہندوستان سے روانگی پر جبکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے انہوں نے اپنے ذکر و شغل میں ناکامی کی شکایت کی تھی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا تھا کہ اب تو چلے جاؤ پھر وہاں سب کو چھوڑ کر چلے آنا۔ یہ مقولہ یاد آگیا اور اُن کی آتش شوق بھڑک اُٹھی اور انھوں نے خفیہ طریقہ پر انتظام شروع کر دیا۔ ماہ ذیقعدہ میں جبکہ ایک قافلہ مدینہ منوّرہ سے رابغ کو روانہ ہو رہا تھا اس کے ساتھ چھپ کر بارادہ ہندوستان روانہ ہو گئے اور اپنے ساتھ ساٹھ یا ستر روپے لے گئے۔ گھر میں جب دن بھر نہیں آئے تو تلاش ہوئی ان کے کمرہ میں

ایک تحریر لکھی ہوئی پائی گئی جس میں انہوں نے اپنے ارادہ وغیرہ کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔ اس پر مطلع ہونے کے بعد حضرت والد صاحب مرحوم نے مجھ کو فرمایا کہ اب تو بھی جا۔ تجھ کو تو وہاں سے طلب کیا گیا تھا مگر وہ روانہ ہوگئے ہیں۔ خرچ کے نہ ہونے کی وجہ سے میں متوقف تھا۔ ان کو راستہ میں تنہائی کی وجہ سے تکلیف ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے زادِ راہ کا انتظام کر دیا۔ بھائی صاحب مرحوم رابغ سے بادبانی جہاز پر جدّہ پہنچے راستہ میں تکلیف زیادہ ہوئی طبیعت میں استقلال اور جفاکشی کم تھی۔ تنہائی بھی تھی۔ جدّہ میں کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہ ملا۔ دو چار روز جدّہ میں رہ کر پریشان ہوگئے اور والد صاحب مرحوم کو مفصّل خط لکھا کہ اب میں اپنے کئے پر پشیمان ہوں اور چونکہ حج کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ حج کر کے واپس آجاؤں گا۔ والد صاحب مرحوم عزائم کے بہت پختہ تھے ان کو ناگوار ہوا اور مجھ کو کہا کہ تو جا کر ان کو واپسی کے ارادہ سے باز رکھ اور تم دونوں ہندوستان کو روانہ ہو جاؤ۔ مجھ کو بھی تقریباً ساٹھ روپے سفر خرچ کے لئے عطا فرمائے اور مال لانے والے قافلہ میں جبکہ وہ مال پہنچا کر واپس ینبع البحر کو جا رہا تھا تاجروں کے ذریعہ پشت شتر کرایہ کر کے روانہ کر دیا۔ اگرچہ قوافل ینبع سے پانچ یا چھ دن میں آتے ہیں مگر یہ خالی اونٹ تھے مختصر راستوں سے پہاڑوں میں ہوتے ہوئے رات دن چل کر دو یا تین دن میں ینبع پہنچ گئے اتفاق سے خدیوی ڈاک کا جہاز جدّہ جانے والا آیا ہوا تھا فوراً اُس پر سوار ہو گیا اور اگلے روز جدّہ پہنچ گیا وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائی صاحب مرحوم گھبرا کر مکّہ معظمہ روانہ ہوگئے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک جہاز بمبئی سے آیا ہوا ہے اور وہ بمبئی واپس ہونے والا ہے۔ میں نے اس کو غنیمت کبریٰ سمجھ کر یہ چاہا کہ میں جلد سے جلد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں بھائی صاحب مرحوم سے پہلے پہنچ جاؤں اور اُن کو اس جلد بازی اور چھپ کر چلے آنے کی سزا دیدوں۔ اس کا ٹکٹ چالیس روپے میں خرید لیا اور ایک خط مکّہ معظمہ میں بھائی صاحب کو اور ایک مدینہ منوّرہ میں والد صاحب مرحوم کو تفصیلی لکھ دیا۔ اور اپنی روانگی کی اطلاع دے کر جہاز پر سوار ہو گیا۔ مگر ایک روز کے بعد ہی بمبئی سے تار آگیا کہ جہاز بمبئی نہ آئے بلکہ جدّہ ہی میں ٹھہرا رہے حج کے بعد حجاج کو لیکر واپس ہو۔ اس بناء پر ایک یا دو دن جہاز میں رہنے کے بعد جدّہ واپس آنا پڑا۔ یہ تاریخیں آخر ذی قعدہ کی تھیں۔ ٹکٹ کے روپئے واپس لے کر اب یہی ضروری معلوم ہوا کہ مکّہ معظمہ روانہ ہو کر نعمت حج اور رفاقت

بھائی صاحب مرحوم کا شرف حاصل کیا جائے چنانچہ والد صاحب مرحوم کو اطلاع دیدی اور چونکہ خرچ کم تھا اور اسباب بھی زائد نہ تھا۔ یکم ذی الحجہ کو شام کے وقت پیدل مکہ معظمہ روانہ ہو گیا۔ قربِ حج کی وجہ سے راستہ میں پیدل جانے والوں کی کثرت تھی۔ اخیر شب میں بحرہ پہنچ کر کچھ آرام کیا اور پھر دن بھر چل کر شام کو مکہ معظمہ پہنچا۔

بھائی صاحب مرحوم میرے خط اور جہاز کی خبر سے سخت پریشان اور پشیمان ہو گئے تھے اس واقعہ سے بہت خوش ہوئے۔ بفضلہٖ تعالےٰ ادا مناسک حج سے فارغ ہو کر جب جدّہ پہنچے تو کرایہ جہاز فی کس ۶۵ روپیہ تھا۔ ہم دونوں کے پاس مصارف مکہ معظمہ اور مصارف حج کی وجہ سے اس قدر مقدار باقی نہیں رہ گئی تھی جو کہ اس وقت کے دخانی جہازوں کے کرایہ کے لئے کافی ہو سکے اگرچہ حج پیدل ہی دونوں نے کیا تھا۔ قیام بھی مولانا شفیع الدین صاحب کے پاس تھا مگر خورد و نوش وغیرہ کے مصارف میں اس قدر خرچ ہو چکا تھا کہ ہر ایک کے پاس چالیس چالیس روپیہ تقریباً باقی تھا۔ جہاز کے کرایہ کی کمی کا انتظار کیا گیا مگر کم نہ ہوا اور وہ روانہ ہو گیا۔ پھر دوسرا جہاز آیا اور اس کا بھی کرایہ اسی قدر گراں تھا وہ بھی روانہ ہو گیا۔ اب بجز اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ یا تو جدّہ میں مہینہ دو مہینہ ٹھہر جائے اور آخری جہاز کا جب وقت آئے تو مساکین کے ساتھ روانہ ہوں جو کہ قلتِ حجاج کی وجہ سے یقینی نہ تھا یا مدینہ منوّرہ واپس ہو جائیں یا بادبانی کشتیوں میں مسقط یا مکلا یا عدن کو روانہ ہو جائیں اور وہاں سے کراچی یا بمبئی کو دخانی جہازوں پر روانہ ہوں۔ مگر جدّہ کا خرچ پہلے امر کی اجازت نہ دیتا تھا۔ وقت بھی ضائع ہوتا تھا۔ دوسرا امر مقصد کے بالکل مخالف تھا۔ تیسرے امر پر بھائی صاحب راضی نہ ہوتے تھے کیوں کہ رابغ سے جدّہ تک وہ بادبانی کشتی ہی میں آئے تھے اور اس میں ان کو سخت تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔ بلکہ وہ تقریباً ارادہ توڑ چکے تھے جدّہ میں ہم میمنوں کی رباط (مسافر خانہ) میں مقیم تھے۔ ایک شخص مستری غلام محمد مرحوم امرتسر کے باشندہ وہ بھی ہندوستان جانا چاہتے تھے اور قلتِ خرچ کی وجہ سے دخانی جہاز میں سفر نہ کر سکتے تھے۔ میں نے اور انہوں نے بھائی صاحب مرحوم کو تیسرے امر پر بمشکل آمادہ کیا اور ایک بڑی کشتی مسقط جانے والی بادبانی جس کو بغلہ کہتے ہیں حاصل کی۔ مبلغ دس روپے فی کس میں اس کا ٹکٹ لیا۔ جب چھوٹی کشتی پر سوار ہو کر (کیوں کہ بغلے اپنی بڑائی کی وجہ سے وسط سمندر میں رہتے ہیں) وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بغلہ چھوٹ گیا۔

مجبور ہو کر واپس ہوئے۔ اب بھائی صاحب مرحوم اور بھی مخالف ہو گئے مگر ایک دوسرے بغلہ کا پتہ چلا اس کے لئے بہ مشکل تمام بھائی صاحب کو آمادہ کیا۔ انہوں نے اس کو بہ مشکل اس شرط پر قبول فرمایا کہ یہ بغلہ نہ ملا تو پھر ضرور بالضرور مدینہ منوّرہ واپس ہو جائیں گے۔ مگر خدا کے فضل سے یہ بغلہ مل گیا اور ہم اس پر اسی کرایہ میں سوار ہو گئے یہ بغلہ بحرین کے تاجروں کا تھا وہ کھجوریں لے کر آئے تھے اور ان کو فروخت کر کے نیز حج سے فارغ ہو کر واپس ہو رہے تھے۔ اس میں تقریباً ایک سو بیس مسافر تھے کچھ اباضی (خارجی) مسقط کے باشندے تھے اور تقریباً ستر یا اسّی بنگالی حجاج تھے اور تین شخص ہم ہندوستانی تھے اور دس پندرہ کشتیبان تین تجر کے تھے۔ چونکہ ہوا قدرے مخالف تھی اس لئے بغلہ کو وسط سمندر میں کشتیبان نہیں چھوڑتے تھے بلکہ کنارہ کنارہ پر چلاتے تھے اور چونکہ اس دریا میں کنارے پر پہاڑیاں پانی میں زیادہ ہیں اس لئے رات کو ٹھہر جاتے تھے اور دن بھر چلاتے تھے پندرہ دن میں عدن کے قریب پہنچنا ہوا۔ مگر وہاں پر ہوا بالکل مخالف ملی اس لئے مکلہ (باوجودیکہ دخانی جہاز سے صرف ایک دن کی مسافت ہے) پندرہ دن میں پہنچنا ہوا۔ خلاصہ یہ کہ جدّہ سے ایک مہینہ میں مکلہ پہنچنا ہوا۔ باوجودیکہ ہم نے احتیاطی طور پر کافی خورد و نوش کا سامان لے لیا تھا مگر سب ختم ہو گیا جس کی وجہ سے کشتی والوں سے چاول وغیرہ قرض لینے پڑے اور پھر مکلہ پہنچ کر ان کو ادا کیا گیا۔ مکلہ پہنچنے تک مخالف ہوا کی وجہ سے بغلہ میں حرکت بہت زیادہ ہوتی تھی اس لئے بھائی صاحب مرحوم اور مستری غلام محمد صاحب کو چکّر اور قے بہت آتی رہی۔ سائبان نہ ہونے کی وجہ سے سایہ کی بھی تکلیف رہتی تھی۔ مگر مکلہ سے ہوا موافق ملی تو کشتیبانوں نے بغلہ کو وسط سمندر میں ڈال دیا۔ رفتار بھی خوب تیز ہو گئی اور رات دن چلتا ہوا اس لئے سات دن میں مسقط پہنچ گئے۔ حرکت بھی ایسی نہیں ہوئی جس سے متلی یا چکّر یا قے ہوتی۔ مجھ کو چونکہ بحری سفر میں چکّر نہیں آتا اس لئے اس تمام سفر میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی اس بحری سفر میں میں نے ایک شب کو خواب میں دیکھا کہ حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مکّہ معظّمہ میں حاضر ہوا ہوں آپ نے فرمایا تو جو کھجوریں مدینہ منورہ کی دے گیا ہے اس کو آکر تقسیم کر دے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تو آپ کے لئے لایا ہوں۔ میرے یہاں تو ان کی دوکان ہے۔ تو فرمایا کہ نہیں تو ان کو تقسیم کر دے میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں کھجوریں کن دقّتوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس خواب کو میں نے گنگوہ شریف

پہنچ کر جب حضرت مرشد قدس اللہ سرہٗ العزیز سے ذکر کیا تو فرمایا کہ تجھ کو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے یہاں سے اجازت ہوگئی میرے یہاں سے بھی ہو جائے گی اس تعبیر پر میں شرمندہ ہوگیا کیونکہ میرے وہم وخیال میں بھی اس وقت اجازت حاصل کرنے کی طلب نہ تھی اور خیال ہوا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سمجھیں گے کہ طلبِ خلافت اس کی غرض و غایت ہے۔

مسقط کے قریب ہی ایک آبادی مطرح ہے اس میں صرف اہل سُنّت والجماعت رہتے ہیں مگر مسقط کی زیادہ تر آبادی اباضیوں (خوارج) کی ہے اگرچہ حکومت دونوں جگہ سلطان مسقط ہی کی ہے جو کہ اباضی ہے۔ اس لئے بغلہ والوں نے مطرح میں ہی ہم کو اُتارا کیونکہ وہ سب سُنّی شافعی تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ ڈاک کا جہاز کراچی جانے والا ایک روز پہلے جاچکا ہے۔ اب چھ سات دن کے بعد جائے گا۔ اس لئے وہاں سات دن ٹھہرنا پڑا۔ انگریزی عہدیدار کسٹم کا ہندوستانی مسلمان تھا اُس نے جگہ دے دی وہاں قیام کیا گیا اور ساتویں دن جب جہاز آیا تو دو روپیہ فی کس پر کراچی کا ٹکٹ لے کر اس پر سوار ہو گئے اور ایک دن رات سفر کرنے کے بعد کراچی پہنچنا ہوگیا۔ ڈیڑھ مہینہ سے زیادہ میں یہ سفر طے ہُوا۔ ربیع الاوّل کا وسط ہو چکا تھا۔ ہمارے پاس جو کچھ نقد تھا وہ اس قدر خرچ ہو چکا تھا کہ سہارنپور کا ٹکٹ لینے کے بعد راستہ میں کھانے کے لئے صرف تین چار آنے باقی رہ گئے تھے مگر جب ہم نے ڈاک گاڑی پر بیٹھنا چاہا تو ٹکٹ کلکٹر نے روک دیا۔ اور کہا کہ اسباب زائد ہے اس کو وزن کرواؤ۔ ہم نے دکھلایا کہ وزن زیادہ نہیں ہے گاڑی کا وقت قریب ہے جانے دیجئے مگر اس نے نہ مانا۔ تلوانے لو بعض غیر ضروری چیزوں کے پھینکنے میں اس قدر دیر لگ گئی کہ گاڑی چھوٹ گئی۔ بالآخر دوسری پسنجر گاڑی میں روانگی ہوئی جو کہ لاہور تک نہیں جاتی تھی۔ اس لئے اس نے راستہ میں چھوڑ دیا اور وہاں ایک شب پڑا رہنا پڑا اور جو چند آنے کھانے کے لئے ہمارے پاس تھے وہ بھی خرچ ہو گئے۔ اگلے دن ڈاک گاڑی میں روانگی ہوئی تو کھانے کا کچھ سامان نہ تھا بالآخر مطرح سے کچھ مسقط کے حلوے کے ڈبّے ہم نے ہدیہ کے لئے خریدے تھے ان کو مسافروں کے ہاتھ فروخت کر کے روٹی کھائی اخیر شب میں گاڑی سہارنپور پہنچی۔ چونکہ ہمارے پاس مدینہ منوّرہ کی کھجوریں اور دیگر تبرکات تھے اور کھجوروں پر چُنگی لگنی ضروری تھی۔ پیسے پاس نہ تھے اس لئے معہ اسباب اسٹیشن

کی مسجد میں ٹھہر گیا اور بھائی صاحب حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم کی خدمت میں اس لئے چلے گئے کہ وہاں سے کچھ پیسے لاکر بگھی والوں کو دے دیئے جائیں گے مگر مولانا مرحوم نے ان کو روک لیا اور کسی خادم کو معہ پیسوں کے بھیجدیا۔ پھر حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کی سعادت مجھ کو بھی نصیب ہوئی۔ بھائی صاحب مرحوم وہاں سے براہ راست گنگوہ شریف روانہ ہو گئے مگر میں نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے دیوبند حاضر ہو لوں اس کے بعد وہاں سے گنگوہ شریف کا قصد کروں گا۔ جو ہدایا وہاں کے حضرات کے ہیں وہ بھی پہنچا دیئے جائیں گے اور ان کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہو جائے گا اور پھر باطمینان گنگوہ شریف میں قیام ہو سکے گا۔ گنگوہ شریف کے لئے جو تبرکات عامہ تھے وہ بھائی صاحب اپنے ساتھ لے گئے مگر حجرہ شریفہ کا غبار، مسجد شریف کی کھجوریں (اس زمانہ میں صحن مسجد نبویؐ میں بھی چند درخت کھجوروں کے تھے) اور بعض خصوصی دیگر تبرکات میرے ہی پاس تھے چونکہ حجرہ مطہرہ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام) کے خاص خدّام جن کو آغاوات کہتے ہیں مجھ سے پڑھا کرتے تھے اس لئے خصوصی تبرکات مجھ کو حاصل کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ میں اوّل دیوبند گیا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اساتذہ کرام سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ میری ایک غرض اس میں یہ بھی تھی کہ میں حضرت مرشد قدس اللہ سرہٗ العزیز کی بارگاہ میں تنہا اور پیادہ پا حاضر ہوں۔ بھائی صاحب پیادہ چلنے پر راضی نہ تھے۔

چونکہ ہم کو جدّہ سے روانہ ہو کر تقریباً دو ماہ گزر چکے تھے اس لئے حضرت والد صاحب مرحوم بیتاب تھے کیونکہ اس مدت طویل میں ان کو کوئی خبر ہماری نہیں ملی تھی وہ اس خیال میں تھے کہ جہاز آٹھ دس دن میں بمبئی پہنچتا ہے تو پندرھویں سولہویں دن بمبئی یا کراچی پہنچنے کی خبر آجانی چاہیئے اس لئے انہوں نے گنگوہ شریف حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں خط بھیجا کہ بقصد حاضری بارگاہ عالی میرے فلاں فلاں لڑکے روانہ ہو چکے ہیں مگر ابھی تک کوئی خبر اُن کے پہنچنے کی معلوم نہیں ہوئی اس لئے فکر ہے۔ اس لئے وہاں بھی انتظار تھا۔ بھائی صاحب مرحوم کے پہنچنے سے پہلے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دو جوڑے نئے کپڑوں کے کرتہ پائجامہ تیار کرا رکھے تھے۔ جب بھائی صاحب پہنچے تو فرمایا کہ میں نے تم دونوں کے لئے ایک ایک جوڑا کپڑوں کا تیار کرا رکھا ہے۔ مگر جب دُوں گا کہ حسین احمد آجائے نیز پوچھا کہ حجرہ شریفہ کا غبار بھی لائے ہو یا نہیں۔ بھائی صاحب نے فرمایا کہ وہ حسین احمد

کے ساتھ ہے۔ جو تبرکات کھجوریں، زمزم وغیرہ بھائی صاحب لے گئے تھے ان کو پیش کیا اور شرف بقبولیت ہوئے۔

دیوبند میں ایک دن قیام کرنے کے بعد ظہر کے بعد پیدل روانہ ہوا اور چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لئے راتوں رات چل کر صبح کو نو دس بجے گنگوہ شریف پہنچا۔ اپنی نالایقی اور تن پروری اور راہ طریقت میں کسلمندی وغیرہ کی وجہ سے خجالت اور شرمندگی کا اثر بہت قوی تھا اس لئے راستہ میں برابر گریہ طاری رہتا تھا۔ اور شوق حضوری بارگاہ کشاں کشاں قدم بڑھا رہا تھا۔ بالآخر حاضر خدمت ہوا اور شرف ملاقات سے فیضیاب ہوا بہت زیادہ شفقت فرمائی اور وہ دونوں جوڑے عنایت فرمائے۔ چونکہ ان میں عمامے نہ تھے اس لئے بھائی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ہم اپنے اپنے عمامے لے آئے اور پیش کرتے ہیں آپ اپنی طرف سے ہم کو وہ عطا فرما دیں تاکہ جوڑا مکمل ہو جائے تو ارشاد فرمایا کہ نہیں پھر دیکھا جائے گا اس کے بعد ذات بحت کا مراقبہ تعلیم فرمایا اور کہا کہ یہ چیز وہاں کس طرح رکھی جا سکتی تھی۔

اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم کاندہلوی حاضر باش خدمت تھے اُن سے کہلوایا کہ دونوں سے پوچھو کیوں آئے ہیں اگر مدرسی یا ملازمت کے قصد سے آئے ہوں تو کوئی کوشش کی جائے۔ مجھ کو اس پر تعجب ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ میں کسی دنیاوی مقصد یا نفسانی غرض سے نہیں آیا۔ میرا مقصد بجز طلب ذات حق سبحانہ اور کوئی نہیں ہے۔ ارشاد ہوا تھا کہ ایک مہینہ کے لئے تو یہاں آ جا اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ میں کوئی دوسرا مقصد نہیں رکھتا اس کو سُن کر سکوت فرمایا۔

خانقاہ قدوسیہ میں ہر ایک کو ایک ایک حجرہ مل گیا اور وہاں رہنے لگے کھانے کے لئے ارشاد فرمایا گیا کہ ہمارے یہاں سے دونوں کا کھانا آیا کرے گا۔ چنانچہ جب تک قیام رہا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سے ہی کھانا آتا رہا۔ غبار حجرہ مطہرہ پیش کیا گیا اس کو سرمہ میں ڈلوایا اور روزانہ اس سرمہ کو استعمال فرماتے رہے۔ مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی کھجوروں کے تین دانے پیش کئے گئے ان کو تقریباً (۲۷) حصّہ میں کر کے تقسیم فرمائے مدینہ منورہ کی کھجوریں جو تقسیم کی گئیں اُن کے متعلق ہدایت فرمائی کہ اُن کی گٹھلیاں پھینکی نہ جائیں اُن کو ہاون دستہ میں کٹوا کر رکھ لیا اور روزانہ اس میں سے تھوڑا سا پھانک لیا

کرتے تھے۔

میں نے تعلیم فرمودہ مراقبہ پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ عصر کے بعد جبکہ صحن میں مجلس عمومی فرماتے تھے تو میں اس مراقبہ میں حجرہ قدوسیہ (جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ رہتے تھے) کے برآمدہ میں ستون کے پیچھے (تقریباً دو تین گز فاصلہ سے) مشغول ہو جاتا تھا مغرب کے وقت تک مشغول رہتا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مثل مشائخ نقشبند توجہ اور حلقہ کی کوئی مجلس نہیں ہوتی تھی۔ البتہ مسترشدین اپنی اپنی جگہ اپنے مشغلہ قلبی میں مشغول ہو جاتے تھے۔ عادت شریفہ یہ تھی کہ صبح کی نماز کے بعد حجرہ شریفہ میں داخل ہوتے اور دروازہ بند کر لیتے۔ مشاغل روحانیہ میں مشغول رہ کر ڈیڑھ دو گھنٹہ دن چڑھنے کے بعد دروازہ کھلتا اور صحن میں گولر کے درخت کے نیچے بیٹھتے تھے۔ مہمانوں سے باتیں، خطوط کے جوابات، فتاویٰ وغیرہ اسی وقت انجام پاتے تھے۔ یہ عام مجلس تقریباً گیارہ بجے تک رہتی تھی مسترشدین کو اگر کوئی بات مجمع میں پوچھنی ہوتی تھی اسی وقت پوچھتے تھے۔ ذاکرین اپنے کمروں میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ مکان تشریف لے جاتے تھے اور کھانے کے بعد تشریف لاکر قیلولہ فرماتے تھے ظہر کے بعد حجرہ شریفہ میں دروازہ بند کر کے تلاوت قرآن شریف وغیرہ میں تھوڑی دیر مشغول رہتے تھے پھر دروازہ کھلتا تھا۔ اس زمانہ میں معجم کبیر طبرانی کا ایک قلمی نسخہ آیا ہوا تھا۔ چونکہ آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے اس لئے اسی وقت مجھ سے پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔

عصر کے بعد خدمت میں قریب بیٹھ کر مشغولیت مراقبہ سے مجھ کو نہایت قوی اور بہت زیادہ فائدہ ہوتا تھا۔ چند دنوں کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی میدان میں وہ گولر جو صحن حجرہ میں تھا اور اس کے سایہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ بیٹھا کرتے تھے کھڑا ہے اور اس میں گولر پکے ہوئے لگے ہیں کچھ لوگ ڈلے پھینک رہے ہیں تاکہ پکا ہوا گولر حاصل کریں میں نے بھی بہت کوشش کی مگر کوئی گولر ہاتھ نہیں آیا۔ یکایک دیکھا کہ ایک پکا ہوا گولر مع اس ٹہنی کے جس میں وہ لٹک رہا تھا (ڈہیپنی) خود بخود ٹوٹا اور لٹکتا ہوا نیچے اترتا ہوا آہستہ آہستہ میرے پاس آ گیا اور میں نے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس خواب کو میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا تو فرمایا کہ ثمرۂ مقصود ہاتھ آئے گا۔ ایک روز عشاء کے بعد دوسرے خدام کے ساتھ میں بھی حضرت رحمۃ اللہ کا بدن دبا رہا تھا میں پشت کی طرف تھا دباتے دباتے آنکھ جھپک

گئی تو دیکھا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ چالیس دن گذرنے کے بعد مقصود حاصل ہوگا۔ اس تاریخ کے ٹھیک چالیس دن گذرنے پر عصر کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھائی صاحب مرحوم سے فرمایا کہ اپنے اپنے عمامے لے آؤ۔ بھائی صاحب لے آئے۔ حضرت نے ہر ایک کے سر پر اس کا عمامہ باندھ دیا جس وقت حضرت رحمۃ اللہ میرے سر پر عمامہ باندھ رہے تھے مجھ پر زوردار گریہ طاری تھا اور اپنی کم مائگی اور خجالت کا شدید احساس تھا۔ اس کے بعد بھائی صاحب سے فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیسی دستار ہے بھائی صاحب نے عرض کیا کہ دستار فضیلت ہے فرمایا کہ نہیں دستار خلافت ہے میری طرف سے تم دونوں کو اجازت ہے۔

بھائی صاحب مرحوم کو بہت خوشی تھی مگر مجھ پر اس وقت سخت صدمہ تھا اور بار بار روتا تھا۔ کیونکہ اپنی ناقابلیت، نامرادی اور بدحالی مشاہد تھی اور اس صدمہ کا اثر چہرہ اور گفتار و رفتار وغیرہ پر ظاہر تھا۔ مولانا صادق الیقین صاحب مرحوم نے (موصوف کرسی ضلع لکھنؤ کے باشندہ اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے خاص خلفاء میں سے تھے) جبکہ اس صدمہ کا مذاکرہ ہو رہا تھا اور میں نے اپنی بے بضاعتی اور بدحالی کا تذکرہ کیا تھا فرمایا کہ مخبر صادق نے خبر دی ہے اس کا اعتبار ہونا ضروری ہے۔ اس کے دو تین دن بعد میں نے عرض کیا کہ سلسلہ نقشبندیہ کا سلوک بھی میں طے کرنا چاہتا ہوں تو فرمایا کہ جو تعلیم میں نے دی ہے وہ سب کی بالکل آخری تعلیم ہے یہاں پر تمام سلاسل مل جاتے ہیں۔ اسی کی مشق کرو۔ اسی میں جدوجہد کرکے پیر مرید سے بڑھ جائے یا مرید پیر سے بڑھ جائے۔

اس میں شک نہیں کہ اس مدت میں جو احوال اور کیفیات قلب پر وارد ہوتی تھیں یا جو رویاء صالحہ وغیرہ پیش آتی تھیں اُن کا تذکرہ حضرت رحمۃ اللہ سے کر دیا کرتا تھا۔ اثناء سلوک میں انوار مکاشفات الہامات وغیرہ بالکل پیش نہیں آئے۔ ایک مرتبہ برقی کیفیت کے انوار پیش آئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا تو وہ کیفیت بھی جاتی رہی۔ ہاں یہ بہت پیش آیا کہ اپنے سامنے بدر یا تیز روشنی کی شمع یا دائیں جانب ایک ایک یا دو دو شمع بین النوم والیقظہ دیکھتا تھا۔ جس کی تعبیر ظاہر ہے۔ یہ حالت مدینہ منورہ میں بھی اور بعد میں احمد آباد جیل وغیرہ میں بھی کبھی کبھی رہتی تھی۔ جس سے حضرت مرشد قدس اللہ سرہٗ العزیز اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی امداد معلوم ہوتی ہے۔

دو ماہ سے دو چار دن تقریباً زیادہ حاضر باشی کو ہو گئے تھے کہ یکبارگی بعد اجازت

یہ کیفیت پیش آئی کہ نماز میں بھی اور باہر بھی یہ تمام فضا بین السمٰوات والارض مجھ کو تنگ معلوم ہونے لگی اور نماز میں اس قدر اس کا اثر ہوا کہ جی چاہتا تھا کہ نماز توڑ کر بھاگ جاؤں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا تو فرمایا کہ کلیر شریف وغیرہ ہو آؤ۔ حضرت قطب عالم حاجی امداداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی جب قبض پیش آتا تھا تو ایسے مقامات پر تشریف لیجاتے تھے چنانچہ ہم دونوں کلیر شریف اور دیوبند وغیرہ گئے اور چند دنوں میں واپس آگئے۔ یہ حالت اس سفر میں جاتی رہی واپسی کے بعد تقریباً پندرہ دن قیام رہا۔ پھر فیض آباد اور بھوپال وغیرہ کا سفر پیش آگیا۔ وہاں سے واپسی پر موسم حج قریب آگیا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دو حج بدل اپنے اعزہ کے عطا فرمائے جن سے مدینہ منورہ تک واپسی کی صورت ہو گئی اس زمانہ میں بھی بمبئی اور کراچی کے بندر بند تھے۔ پوربندر سے حجاج کی جہاز کی روانگی مقرر ہوئی تھی۔ غالباً ابتدائی شوال میں جہاز روانہ ہوا۔ ذیقعدہ کے ابتداء میں جدہ پہنچا اور پھر بعد از حج ابتدائے ۱۳۲۰ھ میں مدینہ منورہ پہنچنے کا شرف حاصل ہوا۔

اس مدت میں طلبہ میں کافی شہرت ہو چکی تھی۔ ابتدائی کتابیں بھی صاف ہو چکی تھیں۔ عربی تقریر کی مشق بھی اچھی طرح ہو گئی تھی۔ اس لئے طلبہ کا ہجوم زیادہ ہوا۔ ضروری تھا کہ کچھ وقت مشاغل طریقت کے لئے روزانہ مقرر کیا جاتا اور اس میں تعلیم فرمودہ اشغال کو انجام دیا جاتا۔ مگر بدقسمتی سے جب بھی اس کے لئے بیٹھتا تو ہجوم خواطر واحادیث نفس وغلبہ نوم سے پریشان ہو جاتا۔ ادھر طلبہ کے ہجوم نے اس پر مجبور کر دیا کہ جس قدر بھی ممکن ہو ان کو اوقات تعلیم کے لئے دیئے جائیں۔ بالآخر اپنی بدقسمتی اور شومی احوال کی شکایت اور مشاغل تدریسیہ کی کیفیت حضرت قطب العالم قدس اللہ سرہٗ العزیز کی بارگاہ میں لکھی تو جواب آیا کہ "پڑھاؤ اور خوب پڑھاؤ" نفس کو یہ جواب خوب پسند آیا۔ مشاغل طریقت تو تقریباً چھوٹ گئے اور مشاغل تعلیمیہ اس قدر جملہ فنون میں بڑھ گئے کہ دن رات میں تقریباً تین گھنٹہ بہ مشکل سونا ہوتا تھا۔ باقی اوقات تدریس اور مطالعہ اور شخصی ضروریات میں صرف ہوتے تھے۔ اس سے علوم وفنون میں تو قوت بحمداللہ ترقی کرتی رہی مگر معرفت وطریقت میں پسماندگی ہی رہی۔

یہ کس قدر بدنصیبی تھی کہ حضرت قطب عالم مرشد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر باشی کا شرف تین مہینہ کامل بھی نصیب نہ ہوا۔ حالانکہ ان کی بارگاہ میں حاضری اور

مشغولیت سے جو فیض روحانی میں محسوس کرتا تھا وہ نہایت ہی عظیم تھا اور اصلاح حال بہت زیادہ ہوتی تھی۔ کاش کچھ عرصہ تک اس کے حصول کی نوبت آتی تو خدا جانے کہاں تک ترقی ہو جاتی۔ مگر ؎

تہید ستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

بد قسمتی نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایسے اسباب و عوارض پیش آ گئے جنہوں نے قیام نہ کرنے دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ گھر کے لوگوں پر مدینہ منوّرہ میں سخت عسرت کا حال گذر رہا تھا۔ والد صاحب مرحوم کے بھی تقاضے آتے تھے جن کی بناء پر بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جلد واپسی کا ارشاد فرمایا۔ بہر حال شومی قسمت اور طبعی رذالت، تن پروری، کسل مندی، عدم استقلال راحت طلبی وغیرہ نے ایسے گل کھلائے کہ باوجود ہر قسم کے سامان ترقی کے محرومیت ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ؎

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم
چند بر خود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے ایسی مقدس اور بابرکت اور کاملین اہل اللہ کے دروں تک پہنچایا جو کہ نہ صرف اپنے زمانہ کے ممتاز اور مایہ ناز اور آسمان طریقت و شریعت کے درخشندہ آفتاب تھے بلکہ صدیوں میں بھی زمانہ کو ایسی ہستیاں نصیب نہیں ہوئی تھیں مگر اپنی دناءت اور خست کی وجہ سے میں حقیقی معنوں میں ان بزرگوں بلکہ تمام سلسلہ کے لئے ننگ اور عار رہا۔ کاش ان قدموں کی برکت سے مغفرت اور اصلاح حال کی نعمت اور رضاء الٰہی حاصل ہو جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

یظن الناس بی خیراً وانی لشر الناس ان لم یعف عنی

بشارات اور رویاءِ صالحہ

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بیعت ہونے کے بعد ہی سے برکات کا سلسلہ اور فیوض اکابر طریقت میں اپنے اندر محسوس کرنے لگا تھا۔ بالخصوص جب سے بالالتزام ذکر مدینہ منوّرہ میں کرنے لگا تھا۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز فرماتے تھے کہ اکابر نے ارشاد فرمایا ہے کہ کچھ عرصہ سے (تقریباً سو برس یا اس سے زائد سے) ہندوستان میں برکات ذکر و شغل اٹھ گئی ہیں

یا اُٹھتی جاتی ہیں۔ وہ فیض جو زمانہ قدیم میں حاصل ہوتا تھا اب نہیں ہوتا۔ حرمین شریفین میں یہ فیض بدرجہ اتم موجود ہے (او کما قال)

بہر حال مدینہ منورہ زید شرفاً میں سلسلہ رویاء صالحہ وغیرہ بکثرت جاری رہا۔ مگر اس وقت لکھنے اور ضبط کرنے کا خیال نہیں ہوا۔

خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، اولیاء عظام، ائمہ فخام اور جناب باری عزّ اسمہٗ کو بارہا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ چونکہ قلم بند کرنے کی نوبت نہیں آئی اس لئے بلا ترتیب زمانہ جس قدر یاد ہے لکھتا ہوں۔

(۱) ایک مرتبہ دیکھا کہ آقائے نامدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد شریف کے شمالی دروازہ باب مجیدی کے باہر بجانب شمال منہ کئے ہوئے (قبلہ مدینہ منورہ اور مسجد نبوی کا بجانب جنوب ہے) مسجد سے نکل کر کھڑے ہیں اور آپ کے (دونوں ہاتھوں کا مجموعہ) میٹھے کدو (جس کو کہنڑا اور عرب میں دبا، روبی کہتے ہیں) کے بیج بھرے ہوئے ہیں میں سامنے سے حاضر ہوا جب میں قریب پہنچا تو آپ نے لپ کو نیچے سے کھول دیا کچھ بیج نیچے کو گرے تو میں نے دامن میں لے لئے ان کی مقدار تقریباً تیس عدد تھی۔

(نوٹ) مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کا شمالی دروازہ باب مجیدی کہلاتا ہے اور سور البلد کا دروازہ جو اس باب کے سامنے بجانب شمال واقع ہے اس کو بھی باب مجیدی کہتے ہیں۔ ہر دو دروازے سلطان عبدالمجید خاں مرحوم کے بنوائے ہوئے ہیں اس لئے ہر دو کو باب مجیدی کہتے ہیں۔

(نوٹ) مدینہ منورہ میں میٹھے کدو کے بیج بکثرت پائے جاتے ہیں لوگ ان کو بھاڑ میں بھنوا کر دوکانوں پر فروخت کرتے ہیں اس کا مغز (گری) لوگ کھاتے ہیں مگر مجھ کو خواب میں یہ احساس نہ تھا کہ یہ بیج بھنے ہوئے حسب عادت گری کھانے کے لئے ہیں۔ یا کچے ہیں جو کہ بونے کے لئے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہی آخری امر غالب خیال تھا۔

(۲) دیکھا کہ میں مسجد شریف میں منبر شریف کے سامنے بکبریہ کے نیچے (وہ اونچی چھت دار جگہ جس پر تکبیر کہنے والے چڑھ کر تکبیر کہتے ہیں اور اثنائے نماز میں انتقالات پر بلند آواز سے مقتدیوں کو آگاہ کرتے ہیں یہ جگہ مسجد شریف میں منبر کے سامنے چار یا پانچ گز بجانب

شمال واقع ہے لیٹا ہوں اور مجھ پر سبز شال پڑی ہے اور ایک شخص یہ کہتا ہے کہ تیرے قدم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم جیسے ہیں۔ اس کی تعبیر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اتباعِ سنت سے دی تھی۔

(۳) دیکھا کہ ایک جگہ پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کھلی ہوئی ہے میں نے دیکھا کہ لاش مبارک سفید کفن میں قبر کے پاس باہر ہے۔ کفن کھلا ہوا ہے۔ چہرہ مبارک نہایت تر و تازہ گورا گورا اور تمام جسم مبارک بھی تر و تازہ ہے اور آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام چت سو رہے ہیں مگر آپ کی لبیں اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں۔ میں نے قینچی سے آپ کی لبیں کتریں اور ناخنوں کو بھی کترا۔

(۴) روضہ مطہرہ (وہ حجرہ شریفہ جس میں قبر مبارک ہے) اس کے جنوبی دیوار (مواجہہ شریفہ کی جڑ میں ایک پختہ خندق تقریباً ڈیڑھ دو ہاتھ گہری اور کئی گز لانبی بنی ہوئی ہے جس کی لمبائی دیوار کی جڑ سے متصل متصل سر مبارک کی طرف سے پانوں کی طرف کو چلی گئی ہے۔ اور کچھ لوگ کھڑے ہو کر لانبی جھاڑو سے اس میں جھاڑو دے رہے ہیں میں ایسی ہی لانبی جھاڑو لے کر پہنچا تو وہ سب ہٹ گئے۔ میں نے تمام خندق میں جھاڑو دی اور پانی ڈال کر پانی کو جھاڑو ہی سے صاف کیا۔ میں جھاڑو سے پانی کو صاف کرتا ہوں اور صاف کردہ جگہ میں پانی خشک ہوتا جاتا ہے پھر دیکھتا ہوں کہ اس میں رومی قالین خوش رنگ بچھ گئے ہیں۔ خندق کے آگے بجانب قبلہ قبر شریف کی طرف چہرہ کئے ہوئے کچھ لوگ تلاوت قرآن شریف میں مشغول ہیں۔

(۵) دیکھا کہ میں باب السلام سے (مسجد نبوی کا سب سے بڑا دروازہ جو کہ بجانب مغرب واقع ہے) مسجد میں داخل ہوا اور حجرہ مطہرہ کی طرف جا رہا ہوں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک پر ایک کرسی پر رونق افروز ہیں۔ قبلہ کی طرف آپکا چہرہ مبارک ہے میں داہنی جانب سے حاضر ہوا (باب السلام مسجد نبوی میں قبلہ رُو ہونے والے کے لئے داہنی جانب پڑتا ہے) جب میں بالکل قریب پہنچا تو آپ نے مجھ کو چار چیزیں عطاء فرمائیں ان میں سے ایک علم ہے باقی تین اشیاء کو نہیں جانتا کیا تھیں۔ اس کے بعد میں کرسی کے پیچھے سے ہوتا ہوا ایک باغ میں (جو کہ بجانب قبلہ آنحضرت علیہ السلام کے آگے تقریباً دس بارہ گز دوری پر واقع ہے) داخل ہوا اس میں میوہ دار درخت ہیں جن کی اونچائی قد

آدم سے کچھ تھوڑی ہی زیادہ ہے ان درختوں کے پتے سیب کے پتوں جیسے ہیں اور اُن میں پھل کالے کالے لگے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ ان درختوں میں سے پھل چُن چُن کر کھا رہے ہیں۔ میں نے بھی ان سیاہ پھلوں کو توڑ کر کھایا۔ مقدار میں یہ پھل چھوٹے انجیر کے برابر تھے مگر ان کا مزہ ان موجودہ پھلوں سے سب سے علیحدہ اور اس قدر لذیذ تھا کہ اس قدر لذیذ پھل میں نے کبھی نہیں کھائے اس کے بعد میں نے ایک درخت اُسی باغ میں بڑے شہتوت کا دیکھا جس میں شہتوت لگے ہوئے ہیں جن میں کے پکے ہوئے پھل زرد رنگ کے ہیں۔ میں نے اس میں سے پکے ہوئے شہتوت توڑے اور میں سمجھ رہا ہوں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کسی قدر ناساز ہے۔ یہ شہتوت آپ کے واسطے لئے جا رہا ہوں۔

(نوٹ) میں نے اس خواب کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا اور عرض کیا کہ حضرت معلوم نہیں کہ اُن چار چیزوں میں سے جو کچھ مجھ کو عطا فرمائیں علاوہ علم کے باقی تین کیا تھیں تو حضرت نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی ملے وہ خیر ہی ہے

(۶) ایک روز ایک کتاب اشعار کی دیکھ رہا تھا اس میں ایک مصرعہ تھا "ہاں اسے حبیب رُخ سے ہٹا دو نقاب کو" یہ اس وقت بہت بھلا معلوم ہوا۔ میں مسجد شریف میں حاضر ہوا اور مواجہہ شریفہ میں بعد ادائے آداب و کلمات مشروعہ انہیں الفاظ کو پڑھنا اور شوقِ دیدار میں رونا شروع کیا۔ دیر تک یہی حالت رہی جس پر یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ حجاب دیواروں اور جالیوں وغیرہ کا حائل نہیں ہے اور آپ کرسی پر سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کا چہرہ مبارک سامنے ہے اور بہت چمک رہا ہے۔

(۷) جبکہ میں کراچی سے گنگوہ شریف کے قصد سے سفر کر رہا تھا اور گاڑی ملتان کے قریب چل رہی تھی خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں اور ہر دو صاحبوں کے ہاتھ ایک کے دوسرے سے تشبیک[۱] کئے ہوئے ہیں۔

---

[۱] یعنی ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں اس طرح ہے کہ ایک کی انگلیاں بھی دوسرے کی انگلیوں میں جال کی طرح پھنسی ہوئی ہیں جیسا کہ بے تکلفی اور انتہائی دوستی میں ساتھ چلنے کے وقت دو دوست ہتھیلی میں ہتھیلی اور انگلیوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں۔

(۸) میں نے خواب میں امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو اُن سے دونوں ہاتھ ملا کر بیعت کی اور یہ الفاظ کہے "ابایعك علی ما بایعت به النبی صلی اللہ علیہ وسلم"

(۹) دیکھا کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ ائمہ مذاہب اربعہ یا کہا کہ ائمہ طرق اربعہ تیرے لئے دُعا کرتے ہیں کیونکہ تو اثناءِ درس میں جب کسی کا ذکر آتا ہے تو اُن کے لئے رحمہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے یا کہا کہ دعا کرتا ہے اور میں نے خواب ہی میں دیکھا کہ کچھ لوگ مختلف مقامات پر گردو پیش بیٹھے ہوئے ہاتھ اٹھائے دعا کر رہے ہیں۔

(نوٹ) میں نے اپنی عادت ہمیشہ سے کر رکھی تھی کہ جب کسی پیغمبر کا اسم گرامی آئے تو علیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام یا علیہ السلام کہوں اور اگر کسی صحابی کا نام تنہا آئے تو رضی اللہ عنہ کہوں اور اگر سندِ حدیث میں دوسرے اکابر کے ساتھ آئے تو رضی اللہ عنہ وعنہم کہوں اور اگر ائمہ مذہب اور علماء و اولیاء سلف کا نام آئے تو اگر تنہا ایک کا نام آئے تو رحمہ اللہ تعالیٰ اور اگر چند کا نام آئے تو رحمہم اللہ تعالیٰ کہوں خواہ وہ اپنے مذہب کے ہوں یا شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ ہوں بشرطیکہ اہل سنت والجماعت ہوں۔

(نوٹ) افسوس ہے کہ اہل درس وطلباء اس کا خیال نہیں کرتے حالانکہ یہ امر بہت مہتم بالشان ہے اور کتب اصول حدیث وغیرہ میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ ملفوظات قطب عالم حضرت سیّد احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ مسمیٰ بہ صراط مستقیم میں حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ ص۱۳۸ میں فرماتے ہیں۔

"ونیز سالک ایں سلوک را باید کہ ذرادائے حقوق انبیاء و اولیاء بلکہ سایر مومنین و تعظیم ایشاں کوشش بلیغ کند کہ ہمہ ایشاں ساعی و شافع وے شوند و سعی و شفاعت انبیاء و اولیاء پر ظاہر است اما سعی ہر مومن پس دعائے خیر است پس تتوقع دعائے خیر کہ کار آمدنی دراں مقام است تفقد خاطر داری ہر مسلمان کند و ہمہ حقوق و تعظیمات در اتباع عزائم شرع شریف مودّی مے شود"

(۱۰) حضرت خواجہ ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا کہ ایک کرسی پر رونق افروز ہیں میں حاضر ہوا تو ایک کھجور کا تہائی حصہ مجھ کو عطا فرما کر کہا کہ باقی دو حصے اور مشائخ کے ذریعہ سے پہنچائے جائیں گے۔

(۱۱) دیکھا کہ گیارہ بارہ اولیاء اللہ کبار مشائخ میں سے تشریف لائے ہیں اور سب نے اجازت بیعت عطا فرمائی ہے۔

(۱۲) دیکھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہے اور اس میں آسمان سے معلق ڈول لٹک رہے ہیں جن کے وہ تار جن سے آسمان تک اُن کا علاقہ ہے میں دیکھ رہا ہوں اور وہ ڈول برابر یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور میں ڈولوں کو اُلٹتا ہوں تو مٹھائی زمین پر اقسام مختلفہ کی ڈھیر ہو جاتی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت بڑا ڈھیر مٹھائی کا ہو گیا ہے اور لوگ اس کو وہاں کھا رہے ہیں۔

(۱۳) اس زمانہ میں التزام کرتا تھا کہ باوضو سویا کروں۔ چنانچہ باوضو شب کو چھت پر سویا تھا اور یہ مکان بقیع شریف اور حجرہ مطہرہ کے تقریباً بیچ میں واقع تھا۔ نصف شب کے پہلے دیکھا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ تجھ کو امام زماں اور افسر جج بنائیں گے۔ میں نے اس خواب کو شرم کی وجہ سے نہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے اور نہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا۔ اور اسی طرح والد صاحب مرحوم اور بھائی صاحب بلکہ غالباً سوائے حکیم فرزند علی صاحب مرحوم دہلوی (مہاجر مدینہ منورہ) کسی سے بھی اب تک ذکر نہیں کیا۔ اپنی سیہ کاری اور بد اعمالی اور اپنی نالائقی و دناءت ذاتی اس قدر اس کے خلاف ہر طرف سے حاوی ہے کہ جس سے ایسے امور کا خیال میں بھی لانا اجتماع نقیضین کو خیال میں لانا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے مگر عالم اسباب میں موجودہ اسباب کسی طرح بھی اس کے مساعد نہیں معلوم ہوتے۔

(۱۴) ایک بہت بڑا درخت ہے جس کی ٹہنیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی سایہ افگن ہیں۔ اس درخت کے سب سے فوقانی سطح پر سمجھ رہا ہوں کہ جناب باری عز اسمہٗ جلوہ فرما ہیں۔ ہیبت و جلال بیحد محسوس کر رہا ہوں اور کچھ اوپر سے ارشاد ہو رہا ہے جس کی پوری تفصیل یاد نہیں رہی۔

(۱۵) ایک روز مسجد نبویؐ کے اگلے حصّہ کی محراب میں (جس کو محراب عثمانی کہا جاتا ہے جہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نماز پڑھاتے وقت کھڑے ہوتے تھے) ذکر کر رہا تھا کہ نیند آ گئی دیکھتا ہوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں۔ ان کو بارگاہ الٰہی سے حکم ہوا کہ تم فنا ہو جاؤ انہوں نے ایک بُرش پر جو کہ مثل اُلٹے طشت کے ہے اپنا سر فنا ہونے کے لئے رکھ دیا۔ اس خواب کو گنگوہ شریف لکھا تو جواب آیا کہ تیری نسبت عثمانی ہے اور اسی وجہ سے تو لوگوں کی حیاء کی بناء پر مسجد شریف چھوڑ کر جنگل میں ذکر کرنے کے لئے جاتا ہے۔

(۱۶) ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ میں مسجد شریف میں چار زانو بیٹھا ہوا ہوں اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز بائیں جانب تشریف فرما ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داہنی طرف سے تشریف لائے اور آپ کے دست مبارک میں کوئی کتاب ہے۔

(نوٹ) چونکہ عادت یہ تھی کہ اگر کوئی تکلیف یا مصیبت آنے والی ہوتی تھی تو اس قسم کا کوئی خواب دیکھتا تھا جس میں بجز جمعیت و امداد اور کوئی امر مفہوم نہیں ہوتا تھا تو مجھ کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ وہ کون سی صعوبت ہے جس کے دفعیہ کے لئے ہر دو مقدس آقا تشریف ارزانی اور امداد فرما رہے ہیں دو ہی چار روز گزرے تھے کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی آئے اور انہوں نے وہ عظیم الشان فتنہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ تعالےٰ اور ہم سبھوں کے متعلق اٹھایا کہ الامان والحفیظ مگر بفضلہ تعالیٰ وہ اور ان کی جماعت اس فتنہ میں جو کہ ہم سبھوں کے متعلق تھا کامیاب نہیں ہوئی اگرچہ اس کا اثر دیر تک کچھ نہ کچھ رہا۔

ان رویاء صالحہ کے علاوہ اور بھی رویاء واقع ہوئیں مگر مرور زمانہ کی بنا پر پوری پوری یاد نہیں رہیں۔ جن میں سے متعدد میں دودھ یا چھاچھ وغیرہ کا بھی پینا ہے۔ اگرچہ حسبِ ارشاد نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ذهبت النبوة وبقيت المبشرات قالوا وما المبشرات يا رسول الله قال الرؤيا الصالحة يراها المومن او ترى له۔ اور حسبِ ارشاد علیہ السلام من رانی فی المنام فقد رانی فان الشيطان لا يتمثل بی (او كما قال علیہ السلام)۔ ان رویاء صالحہ سے بہت کچھ امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ حسبِ ارشاد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ و دیگر اکابر بعض اشیاء عالم مثال میں متحقق ہوتی ہیں مگر اُن کا وجود اس قدر ضعیف ہوتا ہے کہ عالمِ شہادت تک پہنچتے پہنچتے وہ مضمحل ہو جاتی ہیں اس لئے اگرچہ رویاء صادقہ میں عالمِ مثال کی کوئی چیز دیکھی گئی ہے مگر بعض اوقات عالمِ شہادت میں وہ متحقق الوقوع نہیں ہوتی۔ نیز ہر رویاء کے لئے شروط و موانع وغیرہ ہوتے ہیں جو بسا اوقات دیکھنے والے کے ذہن سے جاتے رہتے ہیں اس لئے اُن کو متیقن الوقوع نہیں کہا جاسکتا۔ بنا بریں ان رویاء صالحہ وغیرہ پر کوئی یقین بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اوّلاً یہی امر مشتبہ ہے کہ آیا یہ رویاء منجملہ رویاء صالحہ ہے بھی یا نہیں کہیں خیالات مستقرہ فی القلب کا عکس تو نہیں ہے۔ یا کسی خلط کے غلبہ کا شگوفہ یا اضغاث احلام وغیرہ میں سے تو نہیں ہے اور اگر رویاء صالحہ میں سے ہو تو بھی اس کا من کل الوجوہ محفوظ رہنا مشتبہ ہے پھر اگر محفوظ بھی مانا جائے تو تعبیر مشتبہ رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بجز انبیاء علیہم السلام کی رویاء کے کسی کی خواب شریعت میں حجت نہیں۔ نہ کسی کا کشف اور نہ الہام قابل احتجاج ہے۔ ہاں امیدیں باندھنا اور جناب باری عز اسمہ کی رحمتوں پر نظر رکھنا

ہمیشہ بندوں کا فریضہ ہے کہ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ اور انا عند ظن عبدی بی۔

جیسے ارشادات عالیہ بہت کچھ امیدیں دلانے والے ارشادات ہیں۔ اگرچہ نہایت افسوس کے ساتھ مجبوراً یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بد اعمالی اور سوء احوالی اور آرام طلبی و نفس پروری وغیرہ ہر طرف سے مایوسی ہی دکھلا رہی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اکابر و اسلاف کی جوتیوں کے طفیل میں مستقبل میں کسی وقت فضل و کرم خداوندی دستگیری فرمائے۔

وما ذلك على الله بعزيز۔

(۱۷) احمد آباد جیل میں خواب میں دیکھا کہ ایک شخص اوپر سے کہہ رہا ہے کہ جو رحمتِ خداوندی حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کی طرف دنیا میں متوجہ کی گئی تھی وہ اب تیری طرف پھیر دی گئی۔

(۱۸) ایک مرتبہ ایک خواب بہت مفصل دیکھی جس میں سے اس قدر یاد ہے کہ میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں حضرت بہت زیادہ الطاف فرما رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو اپنے ضمن میں لے لیجئے۔ غالباً حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے قبول فرمایا اور پھر اسی خواب میں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی شرفِ حاضری حاصل ہوتا دیکھا۔

نکاح ثانی کے لئے میرا سفر ہندوستان

۱۳۲۶ھ میں جبکہ میری پہلی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہاں کی عورتوں سے خواہ وہ مہاجرین کی لڑکیاں ہوں یا اہالی شہر کی ہماری غربت اور ہمارے تمدن سے نباہ نہیں ہو سکتا اس لئے تجھ کو ہندوستان جانا چاہیئے اور وہاں عقد کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۳۲۶ھ کے آخر میں روانہ ہو کر ۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہنچا اور وطن میں رشتہ داروں کے پاس خطوط بھیجے اور متعدد مقامات پر کوششیں کیں۔ حضرت والد صاحب مرحوم نے بھی خطوط بھیجے تھے مگر وطن میں کوئی شخص رشتہ داروں میں سے لڑکی دینے کو راضی نہ ہوا اور یہ جواب سب نے دیا کہ اگر ہندوستان ہی میں قیام کریں تو ہم عقد کرنے کو تیار ہیں مگر اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ نکاح کر کے لڑکی مدینہ منورہ لے جائے۔ اس خط و کتابت اور گفت و شنید میں تقریباً چھ ماہ گزر گئے، جبکہ اپنے کنبہ اور برادری کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو پھر باہر گفت و شنید شروع کی گئی حضرت

حافظ زاہد حسن صاحب امروہی کی عنایات ہم لوگوں پر اور بالخصوص مجھ پر بہت زیادہ رہتی تھیں اور اب تک اُن کی عنایات بے انتہا مجھ پر مبذول ہیں۔ مدینہ منورہ میں بھی میری موجودگی میں وہ گئے تھے اور طالب علمی کے زمانہ سے اُن سے تعلقات تھے۔ انہوں نے کوشش فرمائی حکیم غلام احمد صاحب مرحوم بچھرایونی نہایت نیک خیال حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے متوسل تھے اور اپنے اکابر سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے حافظ زاہد حسن صاحب مرحوم سے اپنی منجھلی لڑکی کے متعلق پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ کوئی مناسب جگہ خیال میں رکھیں۔ جب میرے ارادوں کی اِطلاع حافظ صاحب موصوف کو ہوئی تو انہوں نے حکیم غلام احمد صاحب موصوف سے تحریک کی۔ چنانچہ حکیم صاحب موصوف عقد پر ان دونوں شرطوں سے راضی ہوگئے کہ عقد نکاح میں تمام بڑے اساتذہ اور حکیم مسعود احمد صاحب مرحوم اور مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم شرکت فرمائیں۔ اور حسین احمد جب بھی ہندوستان سے حجاز جائے تو ایک یا دو برس رہنے کے بعد ایک مرتبہ مع اپنی اہلیہ یہاں آئے ان دونوں شرطوں میں مجھے پس و پیش ہوئی مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ راضی اور متکفل ہوگئے۔ چنانچہ عقد ہوگیا۔ اور حسب شرط سب حضرات وہاں تشریف لے گئے۔ مرحومہ سے دو لڑکے الطاف احمد اور اشفاق احمد پیدا ہوئے اور یکے بعد دیگرے مع اپنی ماں کے ایام اسارت مالٹہ میں وفات پاکر مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے۔ ہر دو خورد سالی میں فوت ہوئے۔

مدینہ منوّرہ کی تعلیمی حالت اور دیوبند جانے کی اصلی ضرورت

۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک مسلسل طور پر میرا مشغلہ علمی مدینہ منورہ میں جاری رہا جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے تمام مشاغل معاش وغیرہ وغیرہ سے دست بردار ہوکر میں سفر گنگوہ سے واپس ہوتے ہی مسجد نبوی میں تعلیمی مشاغل میں تدریجاً منہمک ہوگیا حتیٰ کہ روزانہ چودہ چودہ کتابیں مختلف فنون کی پڑھاتا تھا اور چونکہ مدینہ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے تو اُن تعطیل کے ایام میں بھی خصوصی دروس چار پانچ ہوتے تھے بہت سی ایسی کتابیں جن کو ہندوستان میں پڑھایا نہیں جاتا ہے اور مدینہ منورہ مصر استنبول کے نصاب میں وہ داخل ہیں پڑھانی پڑیں۔ مثلاً احمد دمیہ دحلان، کفراوی، الفیہ، ابن عقیل شرح الفیہ ابن ہشام، وغیرہ (نحو میں) شرح عقود الجمان، رسالہ استعارات، رسالہ وضعیہ للقاضی عضد وغیرہ

(معانی و بیان میں) بدیعیہ ابن حجر (بدیع میں) نور الایضاح ملتقی الابحر، دُرَر وغیرہ وغیرہ، (فقہ میں) شرح جمع الجوامع للسبکی و شرح مستصفی الاصول، ورقات و شرح منتہی الاصول وغیرہ (اصول شافعیہ و مالکیہ میں) مسامرہ شرح مسایرہ، شرح طوالع الانوار، جوہرہ وغیرہ (عقائد میں) الفیۃ اصول الحدیث، بیقونیہ و دیگر رسائل اصولِ حدیث میں۔ اسی طرح فرائض اور منطق وغیرہ کے متعدد رسائل اور کتابیں جن کو یہاں سُنا بھی نہ تھا پڑھانا پڑا۔ چونکہ نفس فن میں ان فنون سے مناسبت تھی اس لئے کچھ دشواریاں پیش نہیں آئیں۔ جن کتابوں کو یہاں پڑھا تھا خواہ تفسیر کی یا حدیث، معانی کلام، فقہ یا اصول وغیرہ کی ان کی بھی بار ہا نوبت آئی اور بحمد اللہ نہایت کامیابی کے ساتھ یہ دروس جاری رہے۔ اکابر اساتذہ رحمہم اللہ تعالےٰ کی برکتیں اور دعائیں اور فضلِ خداوندی شاملِ حال تھا اس سے علمی ترقی ہوتی گئی اور افاضہ اور استفاضہ کا حلقہ روز افزوں ہوتا رہا اگر حافظہ جیّد اور عمدہ ہوتا تو یقیناً بہت بڑی استعداد اور ذخیرۂ علمی حاصل ہو جاتا۔ اس امر کا التزام تھا کہ کوئی کتاب بلا مطالعہ اور بغیر شروح و حواشی پر پوری طرح نظر ڈالنے اور سمجھے کے نہ پڑھائی جائے اسی وجہ سے دن و رات میں تقریباً تین ساڑھے تین گھنٹہ سونا ملتا تھا باقی اوقات مطالعہ یا تدریس یا ضروریات بشریہ وغیرہ میں صرف ہوتے تھے البتہ کبھی کبھی تمام دروس کا ناغہ کرکے دن کو بھی چھ سات گھنٹہ سو جاتا تھا جس سے ہفتہ بھر کا تکان رفع ہو جاتا تھا۔ اس زمانہ تعلیم میں جبکہ خوب سمجھ کر اور شروح و حواشی کو مطالعہ کرکے کتابیں پڑھانی پڑیں تو مضامین مستحضر ہو گئے کتب عالیہ حدیث و تفسیر و عقاید و اصول وغیرہ میں اور بالخصوص حدیث و تفسیر میں بعض بعض شبہا اور مشکلات پیش آتی رہیں جن کو حل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی اور طبعی طور پر زوردار خواہش ہوتی تھی کہ کسی طرح حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ تک رسائی ہو تو کتبِ حدیث پھر پڑھوں کیونکہ طالب علمی کے زمانہ میں اس طرح مضامین مستحضر نہ تھے اس لئے مشکل مسائل کے حل کرنے کی صورت پوری طرح سے نہ ہو سکی تھی اور عمر کا وہ حصہ لاابالی پن کا بھی تھا مگر اب اشد ضرورت ہے پہلی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کے بعد جبکہ والد صاحب مرحوم نے ہندوستان کے سفر کا ارشاد فرمایا تو میں نہایت خوشی سے اس پر تیار ہو گیا اور سیدھا دیوبند پہنچا اور ترمذی شریف اور بخاری شریف میں شریک ہو گیا۔ اور بالالتزام ان دونوں کتابوں کو پھر پڑھا مسائل پر پوری بحث کیا کرتا تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مرتبہ غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور خلافِ عادت تحقیقی جوابات نہایت وضاحت سے دیتے تھے جس سے بہت فائدہ ہوا حضرت رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ پہلے بھی بہت شفقت فرمایا کرتے تھے مگر اس مرتبہ بہت زیادہ عنایات فرمائیں۔ اور

علاوہ علمی افادات کے دنیاوی اور معاشی امور میں بھی مثل والد حقیقی بلکہ زیادہ توجہ فرماتے رہے میرا قیام بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں رہا۔ دوسرے نکاح کے بعد بھی اہلیہ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مکان ہی پر رکھا سفر و حضر میں ساتھ رہا۔ دارالعلوم میں بسلسلہ تدریس ملازم بھی ہوگیا۔ ایک مرتبہ ہدایہ اخیرین میں ایک مسئلہ ایسا آگیا کہ بہت غور و فکر اور حواشی و شروح کے مطالعہ سے بھی حل نہ ہوسکا سخت عاجز ہوکر حجرہ مطہرہ نبویہ پر حاضر ہوا اور بعد سلام و درود عرض کیا تھوڑی ہی دیر میں سمجھ میں آگیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں ایسے ایسے حکم اور علمی مضامین ملتے تھے کہ تمام مطولات و کتب قدیمہ میں ہاتھ نہیں آتے تھے اُن سے طبیعت کو بہت زیادہ اطمینان اور شرح صدر ہوتا تھا اور یہی حالت اب تک ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر ارمان پیدا ہوتا تھا کہ کاش یہ علوم مجھ کو بھی حاصل اور محفوظ ہو جائیں کیونکہ حضرت نانوتوی مرحوم کی تحقیقات نہایت ہی بلند پایہ اور مفید ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز کی تصانیف میں بھی تحقیقات اور حکمتیں بھری ہوئی ہیں اور نہایت مفید اور بلند پایہ ہیں مگر مجھ کو جو طمانینت اور بلند پائیگی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں ملتی تھی وہ وہاں نہ تھی اگرچہ تحقیقات کے انتہائی بلند پایہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مضامین سمجھ میں آنے دشوار ہوتے تھے اور چند صفحوں کے مطالعہ کے بعد طبیعت تھک بھی جاتی تھی اور بہت سی باتیں سمجھ میں بھی نہیں آتی تھیں تاہم اُن سے بہت سکون اور شرح صدر ہو جاتا تھا افسوس کہ حافظہ کی کمزوری کی بناء پر بہت سے مضامین تھوڑے عرصہ میں ضائع ہو گئے اور ہوتے رہے ایک روز بہت غلبہ شوق پیدا ہوا اور اُن علوم کے حاصل ہونے کی رغبت اس قدر زیادہ ہوئی کہ مواجہ شریفہ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) میں حاضر ہو کر بہت رویا اور ان علوم کے حاصل ہونے کی استدعا اور درخواست کرتا رہا اور اپنی بے بضاعتی اور جہالت کا شکوہ بھی کیا۔ دیر تک اسی حالت گریہ میں رہ کر واپس ہوا تو چند قدم ہی چلا تھا کہ یکایک قلب میں واقعہ ہوا۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ مگر افسوس کہ آج تک محرومی ہی ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہو جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

علوم میں جدّ و جہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر ہوا کہ اور علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے دروس میں اس کی مثال نہیں تھی۔ عوام کے اجتماع سے بعض بعض حلقے بڑے بڑے ہوتے تھے مگر پڑھنے والے اور جدّ و جہد علمی کرنے والے اوروں کے یہاں کم تھے اور

میرے یہاں حال برعکس تھا۔ عوام کو اس وجہ سے دلچسپی نہ ہوتی تھی کہ علمی بحثیں اُن کی سمجھ میں آنی دشوار ہوتی تھیں بعض بعض علماء ایسے بھی تھے کہ اُن کے یہاں پہلے پہل رجوع بہت زیادہ تھا مگر بعد میں کم ہو گیا اور اُن کے یہاں کے طلبہ بھی میرے یہاں آنے لگے۔ یہ سب برکتیں اُن ذواتِ مقدسہ کی تھیں جن کی جوتیاں اٹھانے کا شرف بعنایت ایزدی حاصل ہوا تھا ورنہ میں تو بالکل ہی ناکارہ اور خالی تھا اور آج تک خالی ہی ہوں۔ ؎

قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں بہ عبید سود کا اُن کے لقب ہے یوسف ثانی

کا منظر نظر آتا تھا۔ اس کی بنا پر جس طرح بہت بڑی جماعت محبین اور ارباب عقیدت کی پیدا ہو گئی۔ اسی طرح ایک جماعت حاسدین اور قیادر کی بھی پیدا ہوئی۔ اس میں غیر علمی ہندوستانیوں اور غیر ہندوستانیوں کی وہ جماعت بھی تھی جو محض اس بنا پر بغض رکھتی تھی کہ اس خاندان کو اس قدر قبولیت اور رفعت کیوں حاصل ہوتی جارہی ہے۔ اگرچہ میرے طرزِ عمل اور اکابر کے اتباع اخلاق و اعمال اور تواضع کی وجہ سے اُن کی کامیابی کی صورتیں منصۂ ظہور پر نہیں آسکیں مگر پھر بھی اُن کے دلوں میں حسد کے زخم ہرے ہوتے رہے۔

مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا قضیہ

۱۳۲۴ھ کے ابتداء میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہُ العزیز بعد از فراغتِ حج مدینہ منورہ تشریف لائے اور تقریباً پندرہ روز قیام فرمایا چونکہ موصوف میرے اساتذہ کرام میں سے تھے اس لئے طلباء مدینہ منورہ کا اُن کی طرف بہت ہجوم ہوا اور عموماً علماء مدینہ بھی ان کی زیارت اور دست بوسی کے لئے حاضر ہوتے رہے اور بہت بڑے مجمع نے اوائلِ کتب احادیث سنا کر مسجد شریف کے اندر بڑے حلقہ میں اجازت کتب حدیث و علوم لی۔ یہ امر اُن متعدد ہندوستانیوں کو نہایت شاق گزرا جو خود یا اُن کے اکابر حضرات علماء دیوبند اور اُن کے اسلاف رحمہم اللہ تعالےٰ سے کسی قسم کا خلاف رکھتے تھے۔ نیز جاہل ہندوستانیوں کو بھی اُن کے حسد نے اس پر مجبور کیا۔ ہم پر تو اُن کا داؤ اس لئے اب تک نہ چلا تھا کہ اہل مدینہ اور وہاں کے عمائد وغیرہ سے ہمارے تعلقات قوی ہو گئے تھے وہ خود یا اُن کے لڑکے اور احباب ہم سے پڑھتے تھے یا دوستی وغیرہ کا تعلق تھا۔ نیز ہماری کوئی تصنیف بھی جس سے اُن کو غلط افواہ پھیلانے کا موقع ملے موجود نہ تھی۔ ہر قسم کی کتب درسیہ

اہل سنت والجماعت کی زیر تدریس تھیں اس لئے ان کی غلط بیانیوں کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی تھی مگر حضرت مولانا مرحوم کی یہ عظمت و شوکت دیکھ کر اُن کے کلیجوں پر سانپ لوٹنے لگا۔ کتاب براہین قاطعہ حضرت مولانا مرحوم کی اہل بدعت کے لئے جس قدر سیف قاطع اور دلوں کو زخمی کرنے والی ہے۔ اس کو ان مخالفوں کا کلیجہ ہی جانتا ہے۔

چونکہ حضرت مولانا مرحوم قافلہ کی واپسی پر مجبور تھے اس لئے پندرہویں دن معہ اپنے رفقاء کے واپس ہو گئے۔ مگر مخالفین کے سینوں میں زخم کر گئے حضرت مولانا موصوف مرحوم کی واپسی کے بعد میں نے خواب دیکھا کہ میں مسجد شریف میں بیٹھا ہؤا ہوں اور میرے ایک طرف حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز تشریف فرما ہیں اور دوسری طرف (غالبًا داہنی جانب) جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کوئی کتاب لئے ہوئے تشریف لائے ہیں۔ بیداری پر مجھ کو فکر ہوئی کہ کیا بات ہے کہ ہر دو آقا میری امداد فرما رہے ہیں۔ دو تین دن کے بعد مولوی احمد رضا خاں صاحب مدینہ منورہ پہنچے۔ وہ مکہ معظمہ میں بعداز حج اپنے ایک رسالہ حسام الحرمین پر دستخط کرانے کے لئے کچھ ٹھہر گئے تھے۔ اُن کی آمد پر یہ زخمی جماعت (مخالف ہندوستانیوں وغیرہ کی) ان کے ارد گرد جمع ہو گئی اور ہماری بڑھتی ہوئی وجاہت اور رفعت سے جو خطرات ان کو اپنے عقائد اور خیالات کے متعلق اور اپنی اپنی پوزیشنوں کے بارہ میں نظر آرہے تھے پیش کیا۔ نیز یہ کہا کہ رسالہ حسام الحرمین کے خلاف اگر حسین احمد نے کوشش کی تو کامیابی نہ ہو سکے گی اور یہی عظیم الشان مقصد مولوی احمد رضا خاں صاحب کا تھا یعنی یہ کہ اس رسالہ کی تصدیق علماء مدینہ منورہ کر دیں اس لئے مشورہ ہؤا کہ بڑے بڑے حکام سیاسی اور مذہبی سے ملاقات اور تعارف کرایا جائے اور اُن کی خدمات میں نذرانے پیش کئے جائیں، وسائط مہیا کئے جائیں، متعدد رسائل مولوی صاحب موصوف کے پیش کر کے اُن کی علمیت سے مرعوب کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ اس فیض آبادی خاندان کو شہر بدر اور جلا وطن کر دیا جائے ایسا پہلے بہت مرتبہ ہو چکا تھا کہ کسی آفاقی عالم کا شہرۂ علمی ہؤا اور اس سے علماء یا اکابر مدینہ منورہ کو نفسانی یا واقعی خلاف پیش آیا تو اس کو بذریعہ حکومت جلا وطن کرا دیا چنانچہ علامہ شیخ محمود شنقیطی اور جبرسی وغیرہ سے ایسا معاملہ پیش آیا تھا کہ نفسانی اغراض مذہبی رنگ میں ظاہر ہوتی تھیں جیسا

کہ عموماً دیکھا جارہا ہے۔ چنانچہ اس پر عمل درآمد شروع کیا گیا اور بڑی تعداد نقود کی خرچ کی گئی دوڑ دھوپ شروع ہوگئی اور سازشوں کا جال پوری طرح بچھا دیا گیا۔ ہم بالکل بیخبر تھے کہ خبر پہنچی کہ رسالہ پر دستخط لئے جارہے ہیں اور ہمارے اور اساتذہ کرام کے متعلق وہابیت کا ہر باا ثر شخص سے پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے چونکہ سلطان عبدالمجید خاں مرحوم کے اوائل زمانہ حکومت میں نجدیوں کا حجاز پر غلبہ ہوچکا تھا اور انھوں نے دس برس مکہ معظمہ میں اور تین برس اخیر کے مدینہ منورہ میں حکومت کی تھی یہ لوگ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو تھے اور اپنے عقائد و اعمال میں نہایت سخت غالی تھے انہوں نے اہالی حرمین پر بہت زیادہ تشددات کئے تھے اور اپنے مخالف عقائد و اعمال والوں کو بہت زیادہ ستایا تھا اس اس لئے اہل حرمین کو اُن سے بہت زیادہ بغض اور تنفر تھا۔ بالآخر سلطان عبدالمجید خاں مرحوم نے خدیوی محمد علی پاشا مرحوم والی مصر سے بوقت صلح شرط کی کہ وہ اہل نجد کو حجاز سے نکالے چنانچہ خدیوی مرحوم نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو جرار فوج کے ساتھ بھیجا اور اُس نے نجدیوں کے قبضہ سے حجاز کو واگذاشت کیا۔ اس زمانہ سے حجاز میں یہ طریقہ جاری ہوگیا تھا کہ جس شخص سے تنفر پھیلانا منظور ہوا اس کو وہابیت کی طرف منسوب کردیا۔ اہلِ حجاز کو وہابیت سے اس قدر نفرت مظالم مذکورہ کی وجہ سے ہوگئی تھی کہ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ سے بھی اتنی نفرت نہ تھی۔ یہی طریقہ انگریزی حکومت نے بھی ہندوستان میں اپنے مخالفین کے ساتھ جاری کیا۔

بڑی مشکلوں سے رسالہ حسام الحرمین بعض اُن شخصوں کے پاس سے جن کے پاس تصدیق کے لئے گیا ہوا تھا دیکھنے کو مل گیا جس پر ہم نے فوراً اُس کی غلط بیانی اور افترا پردازی کا پول کھولنے کا تہیہ کرلیا۔

رسالہ حسام الحرمین کی حقیقت

علمائے دیوبند اور اُن کے اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے جامعین شریعت و طریقت پکے حنفی اور متبع اسلاف اہل سنت والجماعت ہیں اور سلسلہ تلمذ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی ثم المدنی حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی ثم المکی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ اسرارہم سے رکھتے ہیں جس طرح سلسلہ ارادت حضرت قطبِ عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور اُن کے مشائخ

طریقت چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ، سہروردیہ رحمہم اللہ تعالےٰ ورضی اللہ عنہم وارضاہم سے رکھتے ہیں۔ عقائد میں وہ اہلِ سنّت اشاعرہ اور ماتریدیہ کے متبع اور اعمال و فروع میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مقلد ہیں اُن کا علم محض زبانی نہیں ہے بلکہ اُن کے قلوب اور جوارح بھی حقیقۃً تقوی سے مزین اور منصبغ ہیں۔ اسی بناء پر اُن کا اثر محبوبیت اور مقبولیت کا مسلمانوں میں نہایت زیادہ اور گہرا ہمیشہ سے رہا ہے جیسا کہ اسلاف کرام میں بھی ایسے ہی لوگوں کا رہا کیا ہے۔ قرآن شریف اور احادیثِ صحیحہ ایسے لوگوں کی قبولیتِ عامہ کے کے گواہ عادل ہیں سورۂ مریم میں ہے۔ ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمن ودا مگر چونکہ حسب ارشاد قرآنی عادتِ خداوندی ہمیشہ سے یہ بھی جاری ہے کہ ہر پیغمبر کے لئے اہلِ باطل جنات وانسان میں سے کھڑے ہو کر آوازہ عداوت و تنفیر اٹھائیں اور سچے پیغمبروں کے خلاف سازشیں کریں۔ پارۂ ہشتم میں ہے۔ وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا ولو شاء ربک ما فعلوہ فذرھم وما یفترون۔ (ترجمہ) اور اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لئے انسانوں اور جنات کے شیطانوں کو دشمن بنایا جو کہ ایک دوسرے پر سجائے ہوئے (جھوٹے) قول کو دھوکا دینے کے لئے القا کرتے رہتے ہیں اور تیرا رب اگر چاہتا تو یہ نہ کرتے بس چھوڑ دے تو ان کو اور اُن کی افترا کی ہوئی باتوں کو) اُنیسویں پارہ میں ہے۔ وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمین وکفی بربک ھادیا ونصیرا۔ (ترجمہ) (اور اسی طرح ہم نے اہلِ جرائم میں سے ہر نبی کے دشمن بنائے اور تیرا رب ہدایت اور امداد کے لئے کافی ہے) غرض اس عالم امتحان و ابتلا میں عادتِ خداوندی یہ بھی ہے کہ ہر پیغمبر کے (خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور معجزات والا کیوں نہ ہو) دشمن انسان اور جنات میں سے کھڑے کئے جاتے ہیں اور وہ طرح طرح کی افترا پردازیاں اور سازشیں ان خدا کے سچے بندوں کے خلاف اٹھا کر مخلوق کو دھوکہ دیتے اور پیغمبروں کو ستاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام کے واقعات اور سوانح اس پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔ جبکہ انبیاء علیہم السّلام کا یہ حال ہوا تو اُن کے سچے وارثوں کو اس نعمت میں سے بھی حصہ ملنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں اکابر علماء راسخین اور اتقیاء صالحین کو ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ امام ابوحنیفہ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ

امام بخاری شمس الائمہ سرخسی وغیرہم رحمہم اللہ تعالےٰ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تو اریخ کے صفحات اس سے بھرے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اکابر صوفیہ کرام کے واقعات بھی صفحۂ عالم پر نمایاں ہیں۔ ہندوستان میں بھی انہیں اعداء اہل السُّنّۃ کی ریشہ دوانیوں میں سے ملتانی وغیرہ علماءِ سُوء کا فتوائے تکفیر مرتب کرنا اور اس پر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف علماء حرمین شریفین سے تصدیق کرانا۔ جہانگیر کے دربار میں شکایات کرا کے قلعہ گوالیار میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو قید کرانا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پہوچے اُتروا دینا، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب اور اُن کے بھائیوں اور اہل و عیال کو پیدل شہر بدر کرا دینا اور مکان وغیرہ کو ضبط کرا دینا۔ حضرت مرزا جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کو شہید کرانا۔ حضرت سیّد احمد صاحب شہید بریلوی اور شاہ محمد اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہما کے خلاف طوفان کھڑا کرنا وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن سے ایک جماعت کی عاقبت برباد ہوئی اور اُن اسلاف کرام کے لئے درجات کی بلندی اور زلّات و سیّئات کے محو ہونے کی بے بہا نعمت ہاتھ آئی۔

بہرحال اکابر علماء دیوبند کو بھی اسی وراثتِ نبوی میں سے عظیم الشان حصّہ ملنا ضروری تھا چنانچہ مل کر رہا اور ایسا کھلا ہوا جھوٹ ان کے خلاف استعمال کیا گیا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی اوّلاً ان کو اس رسالہ میں وہابی ظاہر کیا گیا حالانکہ محمد بن عبدالوہاب اور اس کے فرقہ سے ان حضرات کا دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ عقائد و اقوال جو طائفہ وہابیہ کے مشہور اور مابہ الامتیاز (بین اہل السُّنّۃ وبینہم) ہیں اُن کے خلاف اِن حضرات کی تصانیف بھری ہوئی ہیں۔ وہ وفات ظاہری کے بعد انبیاء علیہم السّلام کی حیاتِ جسمانی اور بقاء علاقہ بین الرُّوح والجسم کے منکر ہیں اور یہ حضرات صرف اس کے قائل ہی نہیں بلکہ مُثبت بھی ہیں اور بڑے زور شور سے اس پر دلائل قائم کرتے ہوئے متعدد رسائل اس بارہ میں تصنیف فرما کر شائع کر چکے ہیں رسالہ آبِ حیات نہایت مبسوط رسالہ خاص اسی مسئلہ کے لئے لکھا گیا ہے۔ نیز ہدیۃ الشیعہ۔ اجوبہ اربعین حصّہ دوم اور دیگر رسائل مطبوعہ مصنفہ حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہٗ العزیز اس مضمون سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہابیہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے سفر کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فقط مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے سفر کرنا چاہیئے

وہاں پہنچنے کے بعد زیارت بھی کرلی جائے۔ ہمارے اکابر زیارت مطہرہ کے لئے سفر کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ افضل المستحبات اور قریب واجب قرار دیتے ہیں بلکہ محض زیارت کے لئے سفر کرنا جس میں اور کوئی دوسری قربت منوی اور ملحوظ نہ ہو۔ افضل اور اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ رسالہ زبدۃ المناسک مصنفہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز بباب زیارۃ المدینہ اس پر شاہدِ عدل ہے۔

وہابیہ توسل بالانبیاء والاولیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بعد الوفاۃ ممنوع اور حرام قرار دیتے ہیں۔ یہ حضرات اس کو نہ صرف جائز بلکہ "ارجی للاجابت"[1] اور مفید قرار دیتے ہیں شجرات حضرات چشت رحمہم اللہ تعالےٰ اور آداب زیارت وادعیہ مدینہ منورہ اس پر شاہدِ عدل ہیں۔ جو کہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ اسرارہم کے متعدد تصانیف میں شائع ہو چکی ہیں۔

وہابیہ بارگاہِ نبوت میں گستاخانہ کلمات استعمال کرتے رہتے ہیں اور یہ حضرات بارگاہِ نبوت (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اس قدر اظہارِ عقیدت فرماتے ہیں کہ ظاہر بین اس کو غلو اور تجاوز عن الحد شمار کرنے لگتا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اپنی مشہور اور مقبول تصنیف "زبدۃ المناسک" کے آخری حصہ میں زیارۃ مدینہ منورہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا تذکرہ کرتے ہوئے حاضری مدینہ منورہ داخلہ مسجد نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) زیارت قبر مطہر۔ سلام پیش کرنے کے آداب۔ شفاعت اور توسل کی دعائیں اور مسجد شریف اور مدینہ طیبہ کے متبرک مقامات سے فیض حاصل کرنے کے لئے جو الفاظ تحریر کئے ہیں وہ اظہارِ عقیدت کے لئے واشگاف حقیقت اور اس عظمت واحترام کا بین ثبوت ہیں جس سے حضرت موصوف کا قلب معمور تھا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں وہ بلند پایہ مضامین ارشاد فرماتے ہیں جن کے حریم عظمت تک جلیل القدر علماء امت کا طائرِ فکر بھی پرواز نہیں کر سکتا تھا۔

---

[1] ارجی للاجابت۔ یعنی اس توسل کے بعد اس دعا کے قبول ہونے کی توقع زیادہ ہو جاتی ہے۔ (ناشر)

رسالہ آبِ حیات قبلہ نما۔ تحذیر الناس۔ ہدیۃ الشیعہ، اجوبہ اربعین، قاسم العلوم، مناظرہ عجیبیہ وغیرہ ایسے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں ان مطبوعہ تصانیف کو ملاحظہ فرماکر ہمارے بیان کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ صرف ایک فقرہ ملاحظہ فرمائیے۔ اجوبہ اربعین حصہ دوم صفحہ ۱۲۸ میں ہے۔

دوا ور سّر اس میں یہ ہے کہ افاضہ وجود و کمالاتِ وجود مخلوقات کی جانب اگرچہ خزانہ خداوندی ہی سے ہوتا ہے مگر بشہادت آیت النبی اولی بالمومنین اور آیۃ خاتم النبیین چنانچہ تقریرات مرقومہ بالا سے واضح ہو چکا اور نیز بشہادت دیگر آیات و تائید تحقیقاتِ ارباب مکاشفات وہ سب افاضہ بواسطہ حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح ہوتا ہے جیسے شب کو بواسطہ قمر افاضہ نور آفتاب ہوا کرتا ہے۔"

تمام انبیاء علیہم السلام کے جملہ کمالات اور علوم بلکہ نبوت و رسالت کو بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے حاصل ہونا نہایت مدلل اور مفصل طریقہ پر ثابت فرماتے ہیں۔ کمالات ولایت و قرب وغیرہ تو درکنار، نفس وجود جملہ عوالم و عالمیان کو بھی آپ ہی کے ذریعہ سے ثابت فرمارہے ہیں۔ قصیدہ مدحیہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

لگاتا ہاتھ نہ پتلے کو بوالبشر کے خدا
اگر وجود نہ ہوتا تمہارا آخر کار

جلو میں تیرے سب آئے عدم سے تا بوجود
بجا ہے تم کو اگر کہیئے مبدأ الآثار

بجز خدائی نہیں چھوٹا تجھ سے کوئی کمال
بغیر بندگی کیا ہے لگے جو تجھ کو عار

جو انبیاء ہیں وہ آگے تری نبوت کے
کریں ہیں امتی ہونے کا یا نبی اقرار

جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں
ترے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار

تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبی
تو نور دیدہ ہے گر ہیں وہ دیدۂ بیدار

بجز خدا کے بھلا تجھ کو کوئی کیا جانے
تو شمس نور ہے شپر نمط اولوا الابصار

یہ اشعار کسی اَل فل مارنے والے، اطراء مادح کرنے والے فی کل وادٍ یہیمون کے مصداق، مبالغ اور مفرط، غالی شاعر کے نہیں ہیں بلکہ ایک خدا رسیدہ محقق مجسمہ معرفت و حقیقت، امام اہل صدق و وفا غواص بحر طریقت امام

اہل کشف وشہود عارف بے بدل اور فاضل بے مثل کے ہیں جو کہ حقیقت اور واقعیت کے سوا کسی غلط مجاز اور مبالغہ کا روادار نہیں ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ذرا ان مضامین عالیہ اور استدلالات عجیبہ اور عظیمہ کو جو کہ مذکورہ بالا رسائل وغیرہ میں ہیں اہل فہم غور سے دیکھیں اور پھر اس واہی الزام و افترا پر غور کریں کہ معاذ اللہ یہ حضرات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑائی صرف اس قدر مانتے ہیں جیسے ہم میں سے بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی پر ہوتی ہے۔ جناب سید المرسلین خاتم النبیین علیہ السلام کے متعلق تمام انبیاء و مرسلین اور تمام اولیاء اور مومنین اور تمام صحابہ کرام و صدیقین کی ابوت روحانی کا بلکہ آپ کا تمام کمالاتِ وجود اور وجود کے لئے اہل عالم اور پروردگار کے درمیان میں واسطہ ہونا ثابت کرنے والا شخص اور اس کے متوسلین کیا اس لغو اور بیہودہ قول کے قائل ہو سکتے ہیں۔ ہاں اس حدیث کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے جس میں رویت اخوان کی تمنا ظاہر فرمائی گئی ہے لیکن ہر چیز کا محل اور موقعہ ہے۔

ع ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد

(۵) وہابیہ تصوف اور بیعت طریقت اور اس کے اشغال ذکر و مراقبہ و توجہ حلقہ ہائے ذکر وغیرہ کے سخت منکر ہیں اور یہ حضرات سب کے سب ان کے پابند ہیں۔

(۶) وہابیہ کے اکثر لوگ تقلید شخصی کے مخالف ہیں اور جو لوگ قائل بھی ہیں وہ نہایت ڈھیلے ہیں مگر یہ حضرات سب کے سب تقلید شخصی کو واجب اور اس کے تارک کو گناہ گار فرماتے ہیں سراج الائمہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تمام جزئیات و کلیات میں مقلد ہیں اور نہایت مضبوطی اور سختی سے اُن کا اتباع کرتے ہیں۔

(۷) وہابیہ ائمہ طریقت حضرت جنید بغدادی، سری سقطی، ابراہیم بن ادہم، شبلی، عبدالواحد بن زید، خواجہ بہاء الدین نقشبند، خواجہ معین الدین چشتی، غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ بہاء الدین سہروردی، شیخ اکبر ابن عربی شیخ عبدالوہاب شعرانی وغیرہ قدس اللہ اسرارہم اجمعین کی شان میں سخت گستاخی اور بے ادبی کے کلمات کہتے ہیں اور یہ حضرات اُن کی محبت اور تعظیم اور توسل کو بہت مفید اور ضروری اور باعثِ برکات اور موجب رضاء خداوندی سمجھتے ہیں۔ الغرض وہابیہ کے

عقائد و خیالات اور ان کے اعمال سے ان بزرگواروں کو دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور نہ تھا۔ وہابی مسلمانوں کو ذرا ذرا سی بات میں مشرک اور کافر قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے مال اور خون کو مباح جانتے ہیں اور جانتے تھے جیسا کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ردالمختار میں لکھا ہے اور جیسا کہ طائف وغیرہ کے معاملات سے حجاز میں ظاہر ہوا اور اُن اکابر کا متفق علیہ قول یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے کسی قول اور عقیدہ میں سو احتمال ہوں جن میں سے ننانوے احتمال کفر کے ہوں اور ایک احتمال بھی ایمان کا ہو تو اس کی تکفیر جائز نہیں ہے اور نہ وہ مباح الدم والمال ہو سکتا ہے بلکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز اپنے مکتوب انوار القلوب میں تصریح فرماتے ہیں کہ یہ قول فقہا "ننانوے احتمال" کا تحدیدی نہیں ہے بلکہ اگر کسی کے کلام میں ہزار احتمال ہوں جن میں سے نوسو ننانوے احتمالات کفریہ ہوں اور صرف ایک احتمال ایمان کا ہو تو اس کی بھی تکفیر جائز نہیں ۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

خلاصہ یہ کہ ان حضرات کی طرف تہمت وہابیت ایسی ہی تھی اور ہے جیسے کہ زنگی کو کافور اور دن کو رات کہنا۔ مگر انگریزی پروپیگنڈوں اور ڈیوائیڈ اینڈ رول کی پالیسی اور نفسانی سازشوں نے سب کچھ کرایا ؂

خرد کا نام جنوں رکھ لیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بہرحال اہل حرمین کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو کہ عوام مسلمانوں میں ہندوستان میں خاندان ولی اللہی اور حضرت امام زماں سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہم اور اُن کے متوسلین کے لئے حکومتِ انگریزی اور اُس کے آلہ کار اشخاص نے کیا تھا اور اُس کے ذریعہ سے جذبۂ جہاد و حریت کو بڑے درجہ تک مسلمانوں سے فنا کر دینے اور ان مجاہدین فی سبیل اللہ سے بالکلیہ متنفر کر دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ان حضرات پر وہابیت کا الزام لگا کر وہابیت کے نام سے عوام میں اس قدر نفرت پھیلائی گئی کہ شرک و کفر، عیسائیت اور یہودیت ہندویت اور بت پرستی سے مسلم عوام کو اتنی نفرت نہیں ہوئی جتنی کہ وہابیت سے ہوئی۔ مجھ کو بخوبی یاد ہے کہ غالباً ۱۹۲۵ء یا اسی کے قریبی زمانہ میں پنجاب کے اخباروں میں ایک واقعہ چھپا تھا کہ کسی گاؤں کا امام وہاں کے ایک ہندو بنئے

کا مقروض تھا قرضہ بڑھ گیا تھا بنئے نے تقاضا کیا اور آئندہ قرض دینا بند کر دیا امام صاحب نے اس کو سمجھایا مگر وہ بنیا نہ مانا اور کہا کہ جب تک پہلا قرضہ ادا نہ کر دو میں تم کو کچھ قرض نہ دوں گا۔ امام صاحب دھمکی دے کر چلے گئے اور مسجد میں بعد نمازِ جمعہ اعلان کیا کہ فلاں بنیا وہابی ہو گیا ہے اس لئے کسی قسم کا معاملہ خرید و فروخت آمد و رفت کا جائز نہیں ہے۔ تمام باشندگانِ دیہہ نے بنئے کا بائیکاٹ کر دیا۔ بنیا بے چارہ دن بھر دوکان پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تھا کوئی آدمی اُس کی دوکان پر نہیں آتا تھا اُس نے بعض لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ تو وہابی ہو گیا ہے اس لئے ہم تجھ سے لین دین نہیں کر سکتے۔ بالآخر بنئے نے جا کر امام صاحب سے صلح کی تو امام صاحب نے اگلے جمعہ کو اعلان کر دیا کہ بنئے نے وہابیت سے توبہ کر لی ہے اب لین دین جاری کر دو چنانچہ بازار کھل گیا۔ خیال کیجئے کہ بنئے کا ہندو اور بت پرست مشرک ہونا تو لین دین میں حارج نہ تھا مگر وہابی ہونا حارج ہو گیا۔

اہل اغراض ہمیشہ اس طرح بھولے بھالے مسلمانوں کو دھوکے دیتے رہے ہیں بمبئی، کاٹھیاواڑ، دکن، پنجاب وغیرہ میں اس کے ذریعہ سے کیا کیا فتنے نہیں اٹھائے گئے اور کتنے خون نہیں بہائے گئے (خدا ہی خوب جانتا ہے) اپنا اُلو سیدھا کرنے اور مخالف کو نیچا دکھانے کے لئے یہ ہتھیار نہایت مفید ان لوگوں کو دے دیا گیا تھا۔ اگرچہ اب عام مسلمانوں کی بیداری کی وجہ سے وہ کامیابی نہیں حاصل ہوتی جو پہلے ہوتی تھی مگر اب بھی موقعہ پر ضرور اس سے کام لیا جاتا ہے۔

رسالہ حسام الحرمین میں اس کے ساتھ ساتھ دوسری چال یہ چلی گئی کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اُس کے دعاوی مہدویت و نبوت اور توہین حضرت مسیح علیہ السلام اور ائمہ اہل بیت رضی اللہ عنہم وغیرہ کو ابتداء میں معہ توہب ذکر کیا گیا۔ جس پر ہر مسلمان طیش میں آجاتا ہے۔ اہل حرمین نے قیاس کیا کہ اسی طرح دوسرے اشخاص بھی ہوں گے۔ ہم نے ان مکائد کی تفصیل رسالہ شہاب ثاقب میں تفصیلاً لکھ دی ہے اس لئے اب اس پر روشنی ڈالنا تطویل کا باعث ہے۔ مختصراً چند ضروری باتیں عرض کرنا ہوں۔

حضرت شمس الاسلام حکیم الامۃ امام زماں مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ کھلی ہوئی تہمت لگائی کہ موصوف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیۃ زمانی یعنی نبی آخرالزمان ہونے کے منکر ہیں اور رسالہ تحذیر الناس کی کانٹ چھانٹ کر ایک عبارت معہ ترجمہ پیش کی۔ یہ عبارت مسلسل ذکر کی گئی تھی۔ حالانکہ اس کا پہلا ٹکڑا وسطانی اوراق تحذیر الناس کا تھا اور دوسرا اخیر کا اور تیسرا حصہ ابتداء کا۔ ان تینوں ٹکڑوں میں کوئی فاصلہ بھی نہیں دیا گیا تھا اور نہ یہ دکھلایا تھا کہ اتنا ٹکڑا فلاں صفحہ کا ہے اور اتنا فلاں صفحہ کا۔ الفاظ عبارت حسبِ ذیل ہیں۔

"بلکہ اگر بالفرض آپ کے زمانہ میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو جب بھی آپؐ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے بلکہ اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی بھی کوئی نبی ہو تو خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔ عوام کے خیال میں تو رسول اللہ کا خاتم ہونا بایں معنے ہے کہ آپؐ سب میں آخر نبی ہیں مگر اہل فہم پر روشن ہے کہ تقدم یا تاخر زمانہ میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔ (ترجمہ حسام الحرمین ص۱۳)

اس عبارت میں شروع سے (بدستور باقی رہتا ہے) تک کی عبارت صفحہ ۱۴ سطر ۱۵ کی ہے اور (بلکہ اگر بالفرض سے لے کر فرق نہ آئے گا) تک کی عبارت صفحہ ۲۸ سطر ۷ کی ہے اور (عوام کے خیال سے لے کر اخیر) تک کی عبارت صفحہ ۳ سطر ۳ کی ہے۔

ایک ظاہر بیں جو کہ رسالہ مذکورہ اور حضرت مولانا مرحوم سے واقف نہ ہو یقیناً ایسی عبارت سے دھوکہ کھا جائے گا اور سمجھنے لگے گا کہ صاحب تحذیر الناس اس مسلسل عبارت کو بتمامہا ایک جگہ لکھتے ہیں اور یہی اُن کا عقیدہ ہے۔ مگر ایسے تصرف سے تو ہر ایک کے کلام میں بلکہ کلام اللہ سے بھی معانی کفریہ پیدا کئے جا سکتے ہیں کہا جا سکتا ہے (معاذاللہ)

ان الذین امنوا وعملوا الصالحات اولئک اصحب النار ھم فیھا خلدون۔

اس عبارت اور رسالہ مذکور کو دیکھ کر میری حیرت اور استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ اس رسالہ کے صفحہ ۱۸ و ۱۰ پر نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیۃ زمانی کا اقرار کیا گیا ہے بلکہ متعدد دلائل سے اس کو ثابت بھی کیا گیا ہے اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیۃ زمانی اور آخر النبیین زماناً ہونے کے انکار کرنے والے کے کفر کو بھی ثابت کیا ہے اور اس کے دلائل قائم کئے ہیں۔

تحذیر الناس صفحہ ۱۰ سطر ۳ پر فرماتے ہیں۔

"سو اگر اطلاق اور عموم ہے تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالت التزامی ضرور ثابت ہے۔ ادہر تصریحات نبوی مثل "انت منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی او کما قال" جو بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے اسباب میں کافی ہے کیونکہ یہ مضمون درجہ تواتر کو پہنچ گیا ہے پھر اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا ہے گو الفاظ مذکور بسند متواتر منقول نہ ہوں سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و وتر وغیرہ باوجودیکہ الفاظ احادیث مشعر تعداد رکعات متواتر نہیں جیسا اس کا منکر کافر ہے ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا۔" (تحذیر الناس صفحہ ۱۰)

اور اسی رسالہ میں دوسرے صفحات میں بھی آپ کی خاتمیتہ زمانی کا اقرار کیا گیا ہے۔ ایسی کھلی ہوئی تصریح کے بعد بھی ان کی طرف ایسی تہمت نہایت زیادہ تعجب خیز بات تھی جس پر سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی معمولی مسلمان بھی جرأت کر سکے چہ جائیکہ ایک مدعی علم و تصوف اور مدعی مہارت علوم و فنون ایسی گھڑی ہوئی باتیں لکھ کر تکفیر کرے اور لوگوں سے اپنی تصدیق ہندوستان سے لے کر علماء حرمین تک سے کراتا پھرے کیونکہ تکفیر اور لعن کا مسئلہ نہایت خطرناک ہے حسب تصریح احادیث صحیحہ اگر تکفیر اور لعن کسی غیر مستحق کی طرف عائد کیجائے گی تو خود تکفیر اور لعنت کرنے والا اس کا مستحق ہو جاتا ہے اور وہ تکفیر و لعن اس پر لوٹ آتا ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی احمد رضا خان صاحب اور ان کی جماعت کس بھروسے پر اس قدر جری ہوئے۔ اختلافات کتنے بھی ہوتے رقابتیں کتنے ہی درجہ کی ہوتیں مگر اپنے ایمان کی سلامتی تو اشد ضروری تھی۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری تصانیف جیسے مناظرہ عجیبہ، آب حیات، قاسم العلوم وغیرہ میں اگر اثبات خاتمیتہ زمانی کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور اس سے غفلت تھی تو خیر یہی مگر اس رسالہ پر مطلع ہونا بالخصوص جبکہ اس سے بعد کی عبارت بھی پیش کی گئی ہیں ضروری تھا۔ یہ راز آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تین قسم کی خاتمیت ثابت فرماتے ہیں۔

اوّل خاتمیت ذاتی جس کو خاتمیت مرتبی بھی کہتے ہیں۔ یعنی جناب رسول اللہ صلی علیہ وسلم وصف نبوت کے ساتھ موصوف بالذات ہیں اور دوسرے انبیاء علیہم السّلام موصوف بالعرض اور آپ کے واسطے سے۔ جیسے کہ تمام اوصاف عرضیہ کا حال ہوتا ہے کہ موصوف بالذات ایک اور اوّل ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے اوصاف متعدی ہوکر دوسروں تک بعد میں پہنچتے اور ان کو موصوف بالوصف کر دیتے ہیں۔ جیسے عالم اسباب میں موصوف بالنور بالذات آفتاب ہے اور اس کے ذریعہ سے تمام کواکب وسیارات قمر وغیرہ اور دیگر اشیاء ارضیہ متصف بالنور ہیں۔ یہی حال وصف نبوت کا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے متصف بالذات ہیں اور اسی وجہ سے آپ کو سب سے پہلے نبوت ملی۔ جیسا کہ ارشاد ہے کنت نبیا وادم منجدل بین الماء والطین اور دوسرے حضرات آپ کے واسطے سے بعد میں متصف بالنبوۃ ہوئے اسی لئے سب سے آپ پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہد و پیمان عالم ارواح میں لیا گیا اور یہی راز اس ارشاد کا ہے "لوکان موسی حیا لما وسعہ الا اتباعی" اور حضرت عیسےٰ علیہ السّلام کا آخر میں آکر آپ کی شریعت پر چلنے کا یہی راز ہے۔ اور جس طرح اس عالم میں پادشاہی عہدوں اور قرابت میں سب سے اونچا اور آخری عہدہ اور منصب وزارت عظمیٰ کا ہے اس طرح مراتب قرب خداوندی میں سب سے آخری اور بلند مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جس طرح شہنشاہی عہدوں میں وزارت عظمیٰ پر تمام عہدہائے شہنشاہی ختم ہو جاتے ہیں اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام مراتب قرب خداوندی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتمیۃ ذاتی اور مرتبی کے موصوف ہیں۔

دوم خاتمیۃ زمانی یعنی آپ کا زمانہ نبوت اس عالم مشاہدہ و اجسام میں تمام انبیاء علیہم السّلام کے آخر میں ہے۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اسی رسالہ میں دلائل سے ثابت فرماتے ہیں کہ متصف بالنبوۃ الذاتیہ کے لئے خاتمیۃ زمانیہ لازم ہے اگرچہ بالنظر الی الذات نہ ہو مگر بالنظر الی الوجوہ الاخر لازم ہے اور اس کو مفصل طور سے ذکر فرمایا ہے اور متعدد دلائل قائم فرمائے ہیں (دیکھو صفحہ ۸ تحذیر الناس)

سوم خاتمیۃ مکانیہ یعنی زمین جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوئے

وہ تمام زمینوں میں بالاتر اور آخری ہے کے اوپر کوئی زمین نہیں ہے اور اس کے دلائل بھی قائم فرماتے ہیں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تمام ن کو جو کہ وارد فی القرآن ہے ان تینوں قسم کی خاتمیتوں کا حاوی فرماتے تمام سما، اس سے فقط خاتمیتہ زمانی سمجھتے ہیں وہ اس حصر کا انکار فرماتے ہیں۔

یقیناً جو تحقیق حضرت مولانا تہ اللہ نے اس رسالہ تحذیر الناس میں خاتمیتہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتب علیا کی ارشاد فرمائی ہے وہ نہایت اعلےٰ اور احکم اور نہایت دقیق و پُر مغز ہے جس سے بڑے بڑے علماء مصنفین کی تحریریں خالی ہیں البتہ شیخ اکبر اور علامہ سبکی رحمہم اللہ تعالیٰ کی تصانیف میں اس مضمون کا پتہ چلتا ہے مگر چشم بد اندیش کہ برکندہ باد۔ عیب نماید ہنرش در نظر۔ نے بجائے اس کے کہ شکریہ ادا کیا جاتا اور اس سے فائدہ حاصل کر کے ایمان او قلب کو مسرور اور قوی کیا جاتا معاملہ بالکل برعکس کر دیا۔ اس قسم کی صریح دروغگوئی و افتراپردازی و جرأت کی نظیر دنیا میں نہایت کم بلکہ غالباً پائی ہی نہیں جاتی یہ صرف مولوی احمد ر اخانصاحب ہی کی جدت طرازی کا نتیجہ تھا۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز پر افتراء

حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز پر یہ افتراء کیا کہ میرے پاس (مولوی احمد رضا خاں صاحب کے پاس) ایک فوٹو حضرت گنگوہی کے فتوے کا ہے۔ اس فتویٰ میں وف فرماتے ہیں کہ "معاذ اللہ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ کہتا اور اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ بولتا ہے تو اس کو کافر مت کہو" اس فتویٰ اور فوٹو کی وجہ سے تکفیر اور تشنیع شدید کی گئی تھی۔ حالانکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے فتویٰ اس واقعہ کے کئی برس پہلے چھپ کر شائع ہو چکے تھے جس میں تصریح موجود ہے کہ معاذ اللہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو جھوٹا اور کاذب بالفعل کہتا یا عقیدہ رکھتا ہے تو وہ کافر و ملحد و زندیق ہے۔ یہ فتویٰ نہ صرف اُردو زبان میں ہے بلکہ عربی میں بھی ہے اور اس کی تصدیق علماء حرمین شریفین سے بھی کرائی گئی ہے جو کہ فتویٰ رشیدیہ میں بعینہٖ موجود ہے مگر اس افتراپردازی اور جھوٹی تہمت تراشی کا کیا کیا جاوے جو کہ کھلے بندوں ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوئی جن کو ایک جماعت اپنا مقتدا امام اور پیر و مرشد

مانتی ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ (دیکھو فتاویٰ رشیدیہ جلد اوّل صفحہ ۱۱۸ و ۱۱۹)

ہاں مسئلہ امکان کذب ایک مشہور و معروف مسئلہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ کلام لفظی میں جناب باری عزاسمہٗ سے کذب کا صادر ہونا ممتنع بالغیر ہے یعنی داخل تحت القدرۃ ہو کر ممتنع ہے۔ اشاعرہ کے نزدیک شرعاً فقط اور ماتریدیہ کے نزدیک شرعاً و عقلاً دونوں طرح پر۔ بہر حال اہل سنت والجماعت جناب باری کے کلام لفظی میں خلاف واقع بات ہونے کو ممکن بالذات ممتنع بالغیر کہتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز اپنے رسالہ جہد المقل فی تنزیہ المعز والمذل (صفحہ ۴۲ جلد اوّل) میں محل نزاع کی تفصیل فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

واضح رہے کہ جملہ فرق اسلامیہ حق تعالیٰ شانہ کے متکلم ہونے کے قائل ہیں۔ کیفیت تکلم وحقیقت کلام میں مختلف ہونا جدا امر ہے مگر کلام لفظی کے عقد و اصدار کو سب مقدور باری کہتے ہیں بالخصوص اہل سنت والجماعت تو انعقاد کلام لفظی کو پوری صراحت کیساتھ بیان فرما رہے ہیں کسی قسم کا نزاع ہی نہیں البتہ سیزدہم صدی کے بعض علما نے یہ خلاف کیا کہ جملہ غیر مطابق للواقع کا عقد و تنزیل قدرت قدیمہ سے خارج ہے یعنی حالت قیام زید میں تو حق تعالیٰ شانہٗ جملہ زید قائم کو منعقد اور نازل فرما سکتا ہے لیکن حالت قعود زید میں جملہ مذکورہ کا ارشاد و انعقاد اس کی قدرت سے خارج اور اس کے اختیار سے ذات واجب معذور و عاجز ہے اور ایک دوسرے فریق کا یہ قول ہے کہ اہل سنت کے نزدیک جملہ مذکورہ کے تکلم پہ دونوں حالتوں میں قادر مطلق کی قدرت میں سر مو تفاوت نہیں مگر چونکہ وہ ذات بابرکات اپنے صفات و افعال میں جملہ قبایح سے منزہ اور تمام ذمایم سے مقدس ہے اس لئے کسی کلام غیر مطابق واقع کے تکلم کا ارادہ محقق نہیں ہو سکتا۔ اگر بالفرض حضرت آدم علیہ السلام سے اکل شجرہ یا فرعون لعین سے دعویٰ ربوبیتہ محقق نہ ہوتا تو بھی جملہ عصیٰ آدم ربہ اور فقال انا ربکم الاعلیٰ کے عقد و تکلم پہ حق تعالیٰ کو ایسی قدرت حاصل ہوتی جیسی اب ہے لیکن بوجہ کمال صدق وحکمت اور بسبب مقتضائے تقدس و رحمت ان جملوں کے تکلم کی نوبت آنی محال تھی۔ اور جس قدر کلام حق تعالیٰ شانہٗ کی ظاہر ہو چکی ہیں اور جن کے تکلم و ظہور کی نوبت آگے کو آئے گی سب ضروری الصدق ہیں۔ کسی کلام میں بھی اگر کوئی بوجہ احتمال کذب اس کی تصدیق و تسلیم میں متامل ہو تو زندیق و ملحد اور اسلام سے خارج ہے خلاصہ نزاع یہ نکلا کہ

صدق کے وجوب اور کذب کے امتناع پر سب متفق ہیں مگر حضرت مولانا اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ اور اُن کے اتباع بوجہ ارادہ و اختیار حق تعالیٰ شانہٗ صدق کو ضروری اور کذب کو محال فرماتے ہیں اور فریق ثانی بوجہ عدم قدرت و مجبوری صدق باری کو واجب اور کذب کو ممتنع بتلاتا ہے یعنی اُن کے نزدیک تو ایزد تعالیٰ نے اپنے اختیار سے صدق کا التزام اور کذب سے احتراز فرما رکھا ہے اور اُن کے نزدیک بوجہ مجبوری و عجز حق تعالیٰ سے صدق صادر اور کذب متروک ہو رہا ہے۔

یہی مسلک حضرت گنگوہی اور اسلاف دیوبند اور حضرت مولانا محمدؒ اسمٰعیل صاحب شہید قدس اللہ اسرارہم کا ہے۔ اس کو شرح مواقف، مسایرہ، تحریر الاصول وغیرہ معتبر کتبہائے کلام میں ذکر کیا گیا ہے۔ شرح مواقف میں ہے۔

اوجب جمیع المعتزلۃ والخوارج عقاب صاحب الکبیرۃ اذا مات بلا توبۃ ولم یجوزوا ان یعفوا اللہ عنہ بوجھین الاوّل انہ تعالیٰ اوعد بالعقاب علی الکبائر واخبر بہ ای العقاب علیھا فلولم یعاقب علی الکبیرۃ وعفا لزم الخلف فی وعیدہ والکذب فی خبرہ انہ محال والجواب غایۃ وقوع العقاب فاین وجوب العقاب الذی کلامنا فیہ اذلاشبھۃ فی ان عدم الوجوب مع الوقوع لا یستلزم خلفاً ولاکذبا لایقال انہ یستلزم جوازھما وھوایضا محال لانا نقول استحالۃ ممنوعۃ کیف وھما من الممکنات اللتی تشملھا قدرتہ تعالیٰ۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح مقاصد میں خاتمہ بحث قدرت میں فرماتے ہیں۔

المنکرون لشمول قدرتہ طوائف منھم النظام واتباعہ القائلون بانہ لایقدر علی الجھل والکذب والظلم وسائر القبائح اذلوکان خلقھا مقدوراً لہ لجاز صدورہ عنہ واللازم باطل لافضائہ الی السفہ ان کان عالماً بقبح ذلک وباستغنائہ عنہ والی الجھل ان لم یکن عالماً والجواب لانسلم قبح الشی بالنسبۃ الیہ کیف وھوتصرف فی ملکہ ولوسلم فالقدرۃ لاتنافی امتناع صدورہ نظرالی وجود الصارف وعدم الداعی وان کان ممکنا اھ"۔

علامہ محقق کمال ابن ہمام حنفی شارح ہدایہ اور ان کے تلمیذ علامہ ابن ابی الشریف

مقدسی شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ مسایرہ اور اس کی شرح مسامرہ میں فرماتے ہیں۔

ثم قال ای صاحب العمدة ویوصف اللہ تعالیٰ بالقدرة علی الظلم والسفہ الکذب کان المحال لا یدخل تحت القدرة ای لا یصلح متعلقا لہا وعند المعتزلة یقدر تعالیٰ علی کل ما ذکر ولا یفعل انتہی کلام صاحب العمدة وکانہ انقلب علیہ ما نقلہ عن المعتزلة اذ لاشک ان سلب القدرة عما ذکر من الظلم والسفہ والکذب ھو مذھب المعتزلة واما ثبوتہا ای القدرة علی ما ذکر ثم الامتناع عن متعلقہا اختیارا بمذھب ای فھو بمذھب الاشاعرة الیق منہ بمذھب المعتزلة ولا یخفی ان ھذا الیق ادخل فی التنزیہ ایضا اذ لاشک فی ان الامتناع عنہا ای عن المذکورات من الظلم والسفہ والکذب من باب التنزیہات عما لا یلیق بجناب قدسہ تعالیٰ فیسبر بالبناء للمفعول ای یختبر العقل فی ان ای نصلین ابلغ فی التنزیہ عن الفحشاء اھو القدرة علیہ ای علی ما ذکر من الامور الثلثة مع الامتناع ای امتناعہ تعالیٰ عنہ مختارا لذلک الامتناع او الامتناع ای امتناعہ عنہ لعدم القدرة علیہ فیجب القول بادخل القولین فی التنزیہ وھو القول الالیق بمذھب الاشاعرة اھ"

شرح عقائد عضدیہ مصنفہ محقق دوانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حاشیہ کلنبوی رحمہ اللہ تعالیٰ میں ہے۔

"وبالجملة کون الکذب فی الکلام اللفظی قبیحا بمعنی صفة نقص ممنوع عند الاشاعرة ولذا قال الشریف المحقق انہ من جملة الممکنات وحصول العلم القطعی لعدم وقوعہ فی کلامہ تعالیٰ باجماع العلماء والانبیاء علیہم السلام لا ینافی امکانہ فی ذاتہ کسائر العلوم العادیة القطعیة وھو لا ینافی ما ذکرہ الامام الرازی الخ"

تحریر الاصول محقق ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ اور اس کی شرح تقریر و تحبیر الاصول ابن امیر الحاج رحمہ اللہ تعالیٰ میں ہے۔

"وحینئذ ای وحین کان مستحیلا علیہ ما ادرک فیہ نقص ظھر القطع

اتصافه ای الله تعالی بالکذب ونحوه تعالی عن ذلک وایضاً لولم یمتنع اتصاف فعله بالقبح یرتفع الامان عن صدق وعده وصدق خبر غیره ای الوعد منه تعالی وصدق النبوة ای لم یجزم بصدقه اصلاً وعند الاشاعرة کسائر الخلق القطع بعدم اتصافه تعالی بشیٔ من القبائح دون الاستحالة العقلیة کسائر العلوم التی یقطع فیها بان الواقع احد النقیضین مع استحالة الاخر لو قدر انه الواقع کالقطع بمکة وبغداد ای بوجودهما فانه لا یحیل عدمهما عقلاً وحینئذ ای وحین کان الامر علی هذا لا یلزم ارتفاع الامان لانه لا یلزم من جواز الشیٔ عقلاً عدم الجزم بعدمه والخلاف الجاری فی الاستحالة والامکان العقلی لهذا جاز فی کل نقیصة اقدرته تعالی علیها مسلوبة ام هی ای النقیصة بها ای بقدرته مشمولة والقطع بانه لا یفعل ای المحال القطع بعدم فعل تلک النقیصة الخ الفصل الثانی فی الحاکم ج ۲ ص ۹۶

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اپنے رسالہ جہد المقل فی تنزیہہ المعز والمذل میں نہایت بسط سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور حضرت مولانا احمد حسن صاحب مرحوم کانپوری مصنف رسالہ تنزیہہ الرحمٰن اور مولانا عبد اللہ صاحب ٹونکی مرحوم (مصنف رسالہ عجالۃ الراکب) جو کہ امتناع ذاتی کے قائل ہیں ان کے دلائل کے واضح جوابات دیتے ہوئے ائمہ اہل سنت والجماعت کے نصوص استدلال میں پیش کئے ہیں یہ رسالہ نہایت مفید اور اس لائق ہے کہ اس کو ہمیشہ حرز جان بنایا جائے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر افتراء

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور و خلیفہ خاص حضرت گنگوہی و حضرت قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اسرارہما کے متعلق یہ افترا کیا کہ موصوف اپنی کتاب براہین قاطعہ میں معاذ اللہ شیطان کے علم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے زائد کہتے ہیں اور اس کو آپ سے اعلم قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ بھی افترا محض ہے براہین قاطعہ میں یہ مضمون نہ صراحۃً موجود ہے اور نہ یہ امر التزاماً بالالتزام الصریح کسی عبارت سے لازم آتا ہے سیاق اور سباق اس مضمون کے مخالف ہے۔ حضرت مولانا مرحوم

تمام علوم عالیہ اور کمالات علمیہ وعملیہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلم اور اشرف تمام عالم سے مانتے ہیں کوئی شخص بھی اولین و آخرین جن وانس ملک اور غیر ملک میں سے آپ کا ہم رتبہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں علوم خسیسہ رذیلہ جن کو شرف ذاتی حاصل نہیں بلکہ ان کا حصول ہی ناجائز اور خسیس ہے ان میں اگر کوئی بڑھ جائے اور اس کا اقرار یا ثبوت ہو جائے تو اس سے اعلمیت ثابت نہیں ہوتی اور نہ اس کا موصوف صاحب شرافت ہوسکتا ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ انّ من العلم لجھلاً اور فرماتے ہیں اَللّٰھم انی اعوذ بک من علم لاینفع الحدیث قرآن میں تصریح دما علمنا ہ الشعر وما ینبغی ہدہد کا یہ معاملہ اَحَطْتُّ بما لم تحط بہ الآیۃ حضرت سلیمان علیہ السلام سے اعلمیت کو کسی طرح مستلزم اشرفیت نہیں براہین قاطعہ ص۵۱ وص۵۲ کے دیکھنے سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ خود فرماتے ہیں "پس اعلیٰ علیین میں روح مبارک علیہ السلام کی تشریف رکھنا اور ملک الموت سے افضل ہونے کی وجہ سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ علم آپ کا ان امور میں ملک الموت کی برابر بھی ہو چہ جائیکہ زیادہ الخ۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب مرحوم کے متعلق افترا

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی خلیفہ خاص حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ تعالیٰ اسرارہما کے متعلق افتراء کیا کہ وہ اپنے رسالہ حفظ الایمان میں لکھتے ہیں کہ معاذ اللہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا علم زید وعمر بلکہ چوپایوں کے برابر ہے۔ حالاں کہ ان کی عبارت اور اسباق وسیاق بالکل اس کے خلاف ہے حضرت مولانا مرحوم اطلاق لفظ عالم الغیب کی بحث میں فرماتے ہیں ایسا علم غیب تو زید وعمرو بلکہ ہر صبی ومجنون بلکہ جمیع حیوانات وبہائم کے لئے بھی حاصل ہے الخ (حفظ الایمان ص۷) یہاں لفظ اتنا نہیں فرمایا ہے جس کا فرق ظاہر و باہر ہے۔ برابری مقدار میں لفظ اتنا میں ہوسکتی تھی لفظ ایسا میں نہیں۔ اور خود مولانا مرحوم نے اپنے رسالہ بسط البنان فی توضیح حفظ الایمان میں اس الزام کی تردید فرمائی ہے۔ اور اپنی عبارت کی ایسی عمدہ توضیح فرمائی ہے جس سے کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ ہم نے اپنے رسالہ الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب میں ان جملہ امور کے متعلق پوری تفصیل لکھ دی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب اور اُن کے ہمنوا مجاورین اہل ہند[1] نے

---

[1] مجاور عرف اہل مدینہ میں ہیں اُن غیر ملکوں کے باشندوں کو کہتے ہیں جو مدینہ میں پیدا نہ ہوئے ہوں اور باہر سے آکر اقامت پذیر ہو گئے ہوں۔

اس رسالہ کو (جو حسام الحرمین علی عنق اہل الکفر والمین نام سے موسوم کر کے بعد میں شائع کیا گیا) تصدیق اور مہر و دستخط کے لئے وہاں کے اہل علم اور مذہبی رؤسا کے سامنے پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ ان عنوانات سے ہر ناواقف مسلمان پورے غیظ و غضب میں آ جائے گا اور جو کچھ بھی اس سے ہو سکے گا کر گزرے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا بُرا بھلا لکھ دے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بعض ناواقفوں نے تو غیظ و غضب میں آ کر بلا شرط و استثناء تکفیر و تصدیق کر دی اور اکثر سمجھ دار اور محتاط لوگوں نے شرط لگائی کہ اگر واقع میں ان اشخاص کے ایسے ہی اقوال و عقائد ہیں اور اُن سے اس کے خلاف ثبوت نہیں ہے اور نہ اُنہوں نے رجوع کیا ہے تو بے شک جو کچھ مؤلف رسالہ نے لکھا ہے صحیح ہے۔

یہ کارروائی نہایت جدوجہد اور اخفاء کے ساتھ ہو رہی تھی ہم کو صرف اس قدر معلوم ہو سکا تھا کہ یہ اشخاص علماء اور مفتی صاحبان اور اہل اثر کے پاس دوڑ دھوپ کر رہے ہیں مگر کس مقصد کے لئے یہ کارروائی ہو رہی ہے؟ اس کا پتہ بالکل نہیں چلتا تھا اور صرف یہ خیال تھا کہ چوں کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب ابھی تشریف لائے تھے اور اُن سے یہاں کے اعاظم علماء اور اکثر طلباء ملے تھے اور سند حدیث اور اجازت وغیرہ حاصل کی تھی۔ اہل علم میں اُن کی بہت مقبولیت تھی اس لئے حاسدوں اور دشمنوں کو اُن کے خلاف اور اسی ذریعہ سے ہمارے خلاف پروپگنڈا کرنا منظور ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ اگر کوئی بات ہمارے یا ہمارے اکابر کے خلاف ہوگی تو کم از کم ہم سے پوچھا تو جائے گا۔ اسی حالت میں کئی روز گزر گئے۔ پھر تجسّس پر یہ معلوم ہوا کہ کسی تحریر پر تصدیق کرائی جا رہی ہے تو اس کی تلاش ہوئی کہ وہ تحریر کیا ہے۔ بالآخر شیخ عبدالقادر شلبی طرابلسی کے پاس جب وہ تحریر پہنچی تو اُنہوں نے مجھ کو بلا بھیجا اور یہ رسالہ دکھلایا میں نے ان کو حقیقۃ الامر سے مطلع کیا اور پھر میں امین الفتویٰ الشیخ عمر حماد مرحوم کے پاس گیا اور تحذیر الناس اور فتاویٰ رشیدیہ وغیرہ کی عبارتیں دکھلائیں تو انہوں نے بہت افسوس کیا پھر مفتی احناف "آفندی تاج الدین الیاس" مرحوم کے پاس پہنچا اور اُن سے تمام حقیقت بیان کی اُنہوں نے بھی افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم کو تو حقیقت کا علم نہ تھا تو نے ہم کو پہلے کیوں مطلع نہ کیا۔ چونکہ میرے تعلقات ان لوگوں سے پہلے سے بہت گہرے تھے مفتی صاحب موصوف کا نواسہ میرے پاس پڑھتا تھا نیز دوسرے اہل مدینہ

نوجوان بڑے خاندان والے یا احباب تھے یا مجھ سے پڑھتے تھے اس لئے میں نے اُن سے کہا کہ مجھ کو اعتماد تھا کہ اگر میرے مشائخ اور اساتذہ یا میرے متعلق آپ کے پاس کسی قسم کی کوئی خبر پہنچے گی تو آپ ضرور بالضرور مجھ سے اس بات کو دریافت کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم کو بالکل علم نہیں کہ یہ حضرات تیرے اساتذہ اور مشائخ ہیں۔ بہر حال اتنو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ ہم نے تصدیق میں کافی احتیاط کرلی ہے اور لکھ دیا ہے کہ اگر واقع میں ان اشخاص کے یہی اقوال اور عقائد ہیں اور رجوع ثابت نہیں ہے تو مصنف رسالہ کا قول صحیح ہے۔ اگر پہلے سے اس کا علم ہوتا تو ہرگز اتنی بھی تصدیق نہ کرتے۔ اسی طرح اور دوسرے اشخاص نے جواب دیا۔ اسی اثناء میں یہ بھی پیش آیا کہ افندی سید احمد برزنجی مرحوم مفتی شافعیہ کے پاس مولوی احمد رضا خاں صاحب پہنچے اور رسالہ مذکورہ کے ساتھ رسالہ علم غیب بھی پیش کیا مفتی صاحب نے بالشروط پہلے رسالہ کی تصدیق تو کردی تھی مگر مسئلہ علم غیب میں مخالفت کی آخر میں کچھ بحث ہوئی مفتی صاحب ناراض ہو گئے اور خفا ہو کر کہا کہ میری تصدیق واپس بھیجدو مگر مولوی احمد رضا خاں صاحب چلے آئے۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے رسالہ غایۃ المامول فی علم غیب الرسول (علیہ السلام) لکھا۔ جو کہ ہندوستان میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ مولانا منصور علی صاحب مرحوم رامپوری کی سعی وکوشش جو کہ اس زمانہ میں وہاں موجود تھے اس کی اشاعت میں زیادہ کارگر ہوئی۔

اس فتنہ پر یہ کوشش بڑے زور سے عمل میں لائی گئی تھی کہ انہیں حضرات کے تلامیذ اور متبعین حسین احمد اور اس کے برادران وغیرہ ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ آج تک ہم نے کوئی بات ان سے خلاف طریقہ اہل سنّت والجماعت نہیں دیکھی تو یہ جواب دیا کہ وہ چھپاتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ سب لوگوں کو گمراہ کردیں گے۔ اس پروپگنڈہ کو سید یٰسین مرحوم کابلی کے ذریعہ جو کہ عثمان پاشا والی مدینہ منورہ کے یہاں رسوخ کامل رکھتا تھا عثمان پاشا موصوف تک پہنچایا گیا مگر پول کھل جانے اور عنایت ایزدی کے شامل حال ہو جانے اور جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات نے ان کو ناکام کیا اور بحمد اللہ ہمارا کوئی بال بیکا نہ کر سکے۔ کچھ عرصہ تک ہندوستانی مجاورین اور بعض اُن کے ہمنواؤں میں کھچڑیاں پکتی رہیں مخالفتیں بھی لوگ کرتے رہے۔ مگر میرا حلقہ درس بڑھتا ہی رہا قبولیت عامہ اہل مدینہ اور اہل علم وفضل میں

روز افزوں ہوتی رہی۔ اور مخالف اشخاص کو ناکامی کے ساتھ ذلت کا بھی سامنا ہوتا رہا۔ اگرچہ ہم نے کبھی کسی سے انتقام اور توہین کا معاملہ نہیں کیا مگر منتقم حقیقی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں دو تین ہی سال میں تمام مخالفین کا قلع قمع ہو گیا۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

سفر ہندوستان دوسری مرتبہ

پہلے گزر چکا ہے کہ ۱۳۲۶ھ میں میری پہلی اہلیہ مرحومہ چند مہینہ تپ دق میں مبتلا رہ کر وفات کر گئی۔ ایک لڑکی تین چار برس کی چھوڑی۔ چوں کہ معیشت کی تنگی تھی۔ تمام خاندان کی آمد فی ماہوار سو روپیہ بھی نہ تھی۔ مدینہ منورہ کی گرانی پر یہ مقدار بڑی مشکل سے بھی اتنے بڑے خاندان کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ اس وقت بہ نسبت سابق بہت کچھ سہولتیں مہیا ہو گئی تھیں۔ مگر اسی کے ساتھ حضرت والد صاحب مرحوم کا یہ ارادہ کہ میں اپنی زندگی میں چھ مکان (ہر ہر اولاد کے لئے ایک ایک) بنا دوں یہ ایک ایسا عزم تھا کہ وہ کسی طرح وسعت کے ساتھ مصارف کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر مدینہ منورہ میں کسی خاندان میں خواہ اہالی مدینہ میں سے ہوتا یا مجاورین میں سے نکاح کا ارادہ کیا جاتا تو انتہائی دقتوں کا سامنا ہوتا۔ عرب کی عورتیں بہ نسبت ہندوستانی عورتوں کے زیادہ تر آزاد اور مصارف میں زیادہ تر وسعت پذیر ہیں۔ خورش اور پوشش کی فضول خرچیاں معمولی آمدنی سے پوری ہونی مشکل ہوتی ہیں۔ پھر آئے دن رشتہ داروں بالخصوص عورتوں کا آنا جانا۔ قیلہ[1] اور اجتماعات کرنا اور اور ان کے مصارف کا بار گراں اٹھانا معمولی بات نہ تھی۔ ہندوستانی مجاورین بھی رفتہ رفتہ وہاں کی عادات سے کم و بیش متاثر ہو گئے ہیں۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم اور عزیزم محمود سلمہ کے نکاحوں سے تجربہ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں کفو کا ملنا بھی سخت مشکل تھا۔ ان وجوہ کی بناء

---

[1] قیلہ غالباً قیلولہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ دوپہر میں آرام کرنے اور سونے کے ہیں۔ مگر اب عرف میں دن کے وقت چند احباب کا مجتمع ہونا اور کھانا اور اچار وغیرہ کا ایک مجلس میں تناول کرنا بالخصوص باغوں یا پہاڑوں یا سیلاب کے کناروں وغیرہ پر اور فرح و سرور کی باتیں عمل میں لانا مراد ہوتا ہے۔ عموماً اہل حرمین اوقات فراغ میں شہر کے باہر باغوں وغیرہ میں جاتے ہیں اور اپنے ساتھ ضروریات خورد و نوش لیجاتے ہیں اور دو دو چار چار دن یا کم و بیش وہاں رہتے ہیں۔ حسب مذاق وہاں خوشگواری سے اوقات کاٹتے ہیں۔ عورتیں بھی جاتی ہیں اور بسا اوقات یہ اجتماعات گھروں ہی میں ہوتے ہیں۔

پر ہندوستان کے سفر کرنے اور یہاں کفو میں عقد کرنے کا حکم والد صاحب مرحوم نے نافذ کر دیا اور اپنے احباب اور رشتہ داروں کو اس کا انتظام کرنے کیواسطے خطوط بھیج دیئے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میری اس زمانہ میں عین خواہش تھی کہ اب جبکہ کتب درسیہ اور مضامین عالیہ علم کلام و فقہ و اصول حدیث و تفسیر وغیرہ کے متخصص ہو چکے ہیں اور فنونی کتابوں پر عبور حاصل ہو چکا ہے کسی طرح حضرت استاذ الاساتذہ راس المحققین مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز تک باریابی ہو جائے تو اپنے اشکالات کو حل کرنے اور کتب حدیث کے دوبارہ پڑھنے کا شرف حاصل ہو۔ مگر اس تمنا کے پوری ہونے کے اسباب مہیّا نہ تھے۔ اس حادثہ کے واقع ہونے اور حضرت والد صاحب مرحوم کے اس حکم سے آرزوؤں کا باغ سرسبز ہو گیا اور بلا پس و پیش میں جناب حاجی شیخ احمد علی صاحب مرحوم و مغفور کے زیر سرپرستی روانہ ہونے کو تیار ہو گیا۔

شیخ احمد علی صاحب مرحوم کے احوال

شیخ صاحب نہایت معمر بزرگ تھے۔ تقریباً نوے برس یا اس سے زیادہ عمر تھی اگرچہ اصلی باشندہ ضلع اعظم گڑھ کے کسی دیہات کے تھے۔ مگر مدّت دراز سے اعزہ و اکارب اور زمینداری وغیرہ کو چھوڑ کر فیض آباد میں مقیم تھے۔ نہایت زاہدانہ اور مرتاضانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اہل فیض آباد بالخصوص حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے متوسلین ان سے بہت زیادہ مانوس تھے حضرت والد صاحب مرحوم سے بھی اُن کے تعلقات بہت گہرے تھے مرحوم دو سال یا کم و بیش سے مدینہ منورہ میں ہمارے ہی مکان میں مقیم تھے اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ حجاز کا سفر کر چکے تھے۔

مرحوم بہت زیادہ عابد و زاہد اور اتباع سنّت کے شائق تھے انہوں نے فیض آباد میں کوشش کر کے مدرسہ دینیہ کی بنیاد بھی ڈالی مدّا ٹاٹ شاہ مرحوم کی مشہور مسجد کے ایک کمرے میں اقامت پذیر تھے اور وہیں لڑکے بھی پڑھتے تھے انہیں کے نام پر یہ مدرسہ مدرسہ احمدیہ حنفیہ کے نام پر مشہور ہوا انہوں نے اس زمانہ میں لائق مدرس کی خواستگاری کی چنانچہ مولانا محمد ضرغام الدین صاحب صدیقی ساکن قصبہ کوال ضلع مظفر نگر مناسب تنخواہ پر بھیجے گئے۔ مولانا موصوف ایک معزز اور شریف خاندان کے ممبر ہیں۔ اُن کے اسلاف

پادشاہی زمانہ میں قصبہ کوال کے قاضی تھے۔ اُن کے خاندان میں علمی شغف اور دلچسپی برابر چلی آتی تھی اگرچہ انقلابات زمانہ سے معاشی مشکلات میں مثل دیگر شرفاء اسلام اُن کا خاندان بھی مبتلا ہو گیا تھا مگر علمی مذاق اور شرفاء کے عزائم و اخلاق بڑے پیمانہ پر موجود تھے مولانا موصوف بہت سی کتابوں میں میرے ہم سبق بھی رہے ہیں۔ ابتداء سے ان کی طبیعت نہایت صالح اور زاہد و مرتاض واقع ہوئی ہے۔ نوجوانی کی شوخیاں اور شرارتیں ان میں زمانہ طالب علمی میں بھی نہ تھیں۔ جب مدرس ہو کر فیض آباد پہنچے تو اُن سے جناب شیخ احمد علی صاحب مرحوم کی بہت موافقت آگئی اور رفتہ رفتہ موصوف وہاں کے مستقل رہنما اور قطب بن گئے۔ مدرسہ بھی مستقل عمارت اور وسعت کے ساتھ بن گیا اور بحمد اللہ اب تک شیخ صاحب مرحوم کا یہ فیض جاری ہے۔

شیخ صاحب مرحوم کی سرپرستی میں یہ سفر مدینہ منورہ سے ہندوستان تک نہایت خوشگواری اور برکات سے قطع ہوا اور راستہ میں نعمت حج وعمرہ بھی حاصل ہوئی۔ بمبئی سے روانگی پر جھانسی تک انہیں کے زیر سایہ سفر رہا اس کے بعد وہ کانپور کو روانہ ہو کر فیض آباد چلے گئے اور میں دہلی ہوتا ہوا دیوبند پہنچا۔ ترمذی شریف کا بہت تھوڑا حصہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ہو چکا تھا اس میں شریک ہو گیا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کے در اقدس پر قیام کیا۔ پھر مدرسہ میں ایک مخصوص حجرہ لے کر رہنے لگا۔

دیوبند کی حاضری کی باطنی وجہ

۱۳۲۳ھ تک دارالعلوم کی سرپرستی حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے متعلق تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو نہایت زیادہ خیال اس کی بہبودی اور ترقی کا تھا۔ عموماً مدرسین اور اراکین حضرت کے تلامیذ اور متوسلین ہی تھے اور تمام مشکلات اور مہمات میں آپ سے رجوع کرتے تھے اور بحمد اللہ کامیاب ہوتے تھے۔ مگر ۲۳ھ میں جبکہ حضرت قطب العالم رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا تو سوائے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جماعت میں کوئی ایسا بڑا نہ تھا جو کہ فرائض سرپرستی کے قابل سمجھا جائے اور تمام اراکین دارالعلو اور کارکنوں کا مربی ہو سکے اس لئے تمام جماعت نے حضرت مرحوم ہی کو سرپرست بنا لیا اور طبعی طور پر یہ ہونا بھی چاہیئے تھا۔ جب تک حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا سایہ تھا تو تمام ماتحتوں کو کوئی خصوصی فکر نہ ہوتی تھی۔ جیسے ماں باپ کی موجودگی میں اولاد کو امور

خانہ داری کی طرف سے اطمینان کلّی ہوتا ہے یہاں بھی یہی حال تھا۔ مگر اب حال دگرگوں ہو گیا۔ اب تمام افکار نے پسماندوں بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس اور مولانا حافظ احمد صاحب صدر مہتمم اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اگرچہ رسمی طور پر ہر دو حضرات مہتممین کے یہ عہدے بعد میں معین کئے گئے مگر باعتبار انجام دہی فرائض پہلے ہی سے چلے آتے تھے۔ اگرچہ اس وقت میں بھی مجلس اہل شوریٰ کی بعض بعض بہت معزز ہستیاں مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم و مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم۔ حاجی ظہور الدین صاحب مرحوم موجود تھیں مگر اُن پر بھی اس قدر افکار ترقی دارالعلوم اور بہبودی نے ہجوم نہیں کیا اور نہ اُن کی پیرانہ سالی اس کی اجازت دیتی تھی کیونکہ وہ حضرات بھی چراغ سحری سے زیادہ قوت نہ رکھتے تھے۔ نیز عام اطراف وجوانب میں اُن کی شہرت بھی ایسی نہ تھی۔ یہی تینوں حضرات جزئیات و کلیات دارالعلوم میں سرگرداں رہتے تھے اور بڑی بڑی اسکیمیں بناتے اور عمل میں لاتے رہتے تھے اور فتن وشرور کے دفع کرنے میں پوری سرگرمی دکھاتے تھے۔ اور بالاخص اس کا بار حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر بہت ہی زیادہ تھا۔ اسی زمانہ میں غالباً ۱۳۲۵ھ یا ۱۳۲۶ھ میں ایک ایسے مجمع میں جس میں دارالعلوم کی علمی ترقی پر غور وخوض ہو رہا تھا حضرت حافظ احمد صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ اگر مولوی انورشاہ کشمیری۔ مولوی عبیداللہ سندھی، مولوی مرتضیٰ حسن چاندپوری۔ مولوی سہول بھاگل پوری۔ مولوی عبدالصمد کرتپوری اور حسین احمد یہاں آکر جمع ہو جاتے تو دارالعلوم کی علمی ترقی بڑے اعلیٰ پیمانہ پر پہنچ جاتی۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا انورشاہ صاحب مرحوم دہلی چھوڑ کر کشمیر میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ مولانا عبیداللہ صاحب عرصہ سے سندھ ہی میں مقیم تھے۔ دیوبند کی آمد ورفت بھی عرصہ سے منقطع تھی۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب دربھنگہ میں مدرس اوّل اور بہت بڑے صاحب نفوذ تھے۔ مولانا محمد سہول صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بڑی تنخواہ پر ملازم تھے۔ مولانا عبدالصمد صاحب مرحوم رڑکی مدرسہ رحمانیہ میں مدرس اوّل تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات پسند آئی اور اگرچہ بظاہر سکوت کیا مگر خدا جانے کیا باطنی تصرف کیا کہ یہ سب اشخاص بغیر کسی ظاہری جدوجہد اور خط وکتابت کے یکے بعد دیگرے دیوبند پہنچ گئے

ممکن ہے کہ بعض بعض اشخاص سے کچھ ظاہری جدوجہد کی نوبت آئی ہو مگر اکثروں کو کسی قسم کی خط وکتابت اور طلب وفہمائش کی نوبت نہیں آئی۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اجتماع حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی تصرف سے واقع ہوا تھا۔ اس وقت مولانا عبید اللہ صاحب کا تشریف لانا کسی سیاسی اور پولیٹیکل جذبہ کے ماتحت بالکل نہیں تھا بلکہ اُن کا نصب العین دارالعلوم کو ترقی دینا اور تمام مُلک میں اس کی مضبوط ساکھ کا قائم ہوجانا طلباء قدیم (جو کہ دارالعلوم سے فارغ ہوچکے ہیں) ان میں یک جہتی اور مکمل تنظیم اور دارالعلوم کی ہر قسم کی بہبودی اور ترقی اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہوجانی۔ یہی امور اُن کے پیشِ نظر تھے اور اسی نصب العین کے ماتحت اُنھوں نے جمعیۃ الانصار وغیرہ حسب ارشاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ قائم کی تھی مرادآباد اور میرٹھ کے جلسے اسی اسکیم کے ماتحت ہوئے تھے۔ اسی نصب العین کے ماتحت اسلامی مدارس کی تنظیم بھی تھی۔ رولٹ رپورٹ میں جو ہذیانات مولانا موصوف کی آمد کے متعلق لکھے گئے ہیں مثل دیگر امور کثیرہ واقعیت سے خالی ہیں۔ یہ اجتماع کچھ عرصہ تک رہا اور اُس نے پھل پھول شاخیں اور کونپلیں نکالنی شروع کیں مگر فلک کج رو پشت کو پسند نہ آیا اور مقاصد میں کامیابی کی راہ میں اس نے سخت درسخت روڑے پیدا کر دیئے۔

دارالعلوم کی مدرسی اور جلسہ دستار بندی

میں ۱۳۲۷ھ تک دارالعلوم میں کتب دورہ میں سے ترمذی اور بخاری شریف کو جدوجہد کے ساتھ پڑھتا رہا۔ ۱۳۲۷ھ شوال میں اکابر نے مجھ کو تدریس کا حکم کیا۔ جلسہ اہل شوریٰ نے حضرات مہتمین رحمہما اللہ تعالیٰ کی خواہش اور تجویز کو پاس کر دیا کہ حسین احمد کو بالفعل بمشاہرہ للو ید ۳۴ ماہوار مدرس کر دیا جائے اور اس کے بعد جب بھی وہ مدینہ منورہ سے ہندوستان میں آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس شوریٰ مدرس کیا جائے چنانچہ مجھ کو متعدد اسباق اُوپر کی کتابوں کے دیئے گئے۔ اس سے مجھ کو علمی ترقی کے علاوہ مالی وسعت بھی حاصل ہوئی اور دوسری بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جب سفر فرماتے تو میں بھی ساتھ ہوتا اور شرف خدمت گزاری سے باریابی ہوتی۔ ۱۳۲۸ھ میں تجویز ہوا کہ دستار بندی کا جلسہ عرصہ دراز سے نہیں ہوا ہے اس کو عمل میں لانا چاہیئے۔

دستار بندی کی حقیقت اور رواج

زمانہ ہائے قدیمہ میں اس امر کے ظاہر کرنے کے لئے کہ طالب علم کتب درسیہ پڑھ کر اور علوم و فنون فقہ و حدیث میں ماہر ہو کر اس درجہ میں پہنچ گیا ہے کہ اس کے فتاوی قابل اعتماد سمجھے جائیں اور اس کی تعلیم و تدریس قابل اطمینان شمار ہو دو طریقے جاری کئے گئے تھے۔ ایک سند دینا جس میں اساتذہ اپنے تلامیذ کی کتب خواندگی اور اس کی صلاحیت علمی اور عملی اور اپنی اجازت ظاہر کیا کرتے تھے اور دوسرا طریقہ دستار بندی یا خرقہ عطا کرنے کا ہوتا تھا۔ مجمع عظیم میں اساتذہ تلمیذ کے سر پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھ دیتے تھے یا اپنا جبہ وغیرہ خرقہائے علماء عطا کرتے تھے۔ اس طریقہ ثانیہ سے عام و خاص میں تلمیذ کی قابلیت کا علم اور چرچا ہو جاتا تھا۔ بخلاف سند کے کہ اس کو سمجھنا اور پڑھنا صرف اہل علم سے ہو سکتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند قائم ہونے کے بعد فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا طریقہ جاری کیا گیا۔ دوسرے تیسرے سال اجتماع عظیم کیا جاتا تھا اور دستار بندی اور سند اور امتحان اور تقریر علمی کی رسوم جاری ہوتی تھیں۔ اس طریقہ سے دارالعلوم کی شہرت بہت زیادہ ہونے لگی نیز تعلیم عربی اور تحصیل علوم دینیہ کا جذبہ لوگوں میں بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا۔ یہ طریقہ غالباً ۱۳۰۱ھ تک جاری رہا مگر بعد میں کچھ ایسے عوائق پیش آئے کہ اس کی انجام دہی نہیں ہو سکی۔ طلبہ کو صرف سند دی جاتی تھی۔ مگر عام لوگوں اور بالخصوص فارغ التحصیل طلبہ کے تقاضے دستار بندی کے برابر ہوتے رہتے تھے جن کو لطائف حیل سے ارباب اہتمام ٹالتے رہتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند ۱۳۰۴ھ سے ۱۳۱۳ھ تک مختلف مشکلات میں مبتلا ہوتا رہا داخلی اور خارجی صدمات آئے دن پیش آتے رہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب مرحوم مدرس اوّل کا وصال، مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم مہتمم کی ہجرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اوّل کا مدرسہ سے بیزار ہو کر سفر بھوپال، ارباب اہتمام کی تبدیلی کبھی حضرت حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کبھی منشی فضل حق صاحب مرحوم کبھی مولانا محمد منیر صاحب مرحوم نانوتوی کبھی مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم یکے بعد دیگرے مہتمم ہوتے رہے۔ اس تغیر اور تبدل میں اندرونی انتظامات اور افکار میں بہت کچھ قلق اور شورشوں کا ظہور ہوتا رہا جس سے ارباب انتظام کو اتنی مہلت نہیں مل سکی کہ وہ اس جلسہ دستار بندی کا انتظام قائم کریں۔ ۱۳۱۳ھ میں انہیں شورشوں کے دبانے کے لئے حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور نواب

محمود علی خاں صاحب آف چھتاری مرحوم اور ملک کے دیگر اکابر جمع ہوئے۔ اور مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم کو مستقل مہتمم بنایا گیا۔ اُمید تھی کہ اب شورشوں کا قلع قمع ہو جائے گا مگر ۱۳۱۵ھ تک قلع قمع بالکلیہ نہ ہو سکا۔ اس کے بعد مکمل سکون پیدا ہوا۔ اس وقت سے ترقیاتِ دار العلوم کا دروازہ بڑے پیمانہ پر کھلنے لگا۔

چونکہ ایک طرف نو فارغ التحصیل طلبہ کی مقدار بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ جن کا اندازہ ہزار سے زیادہ تھا۔ اس لئے صرف عماموں کی بہم رسانی کے لئے زرِ کثیر کی ضرورت۔ مگر اس سے بڑھ کر مصاریف مہمانداری جو کہ ایسے اجتماع پر ضروری ہیں اُن سے منتظم حضرات بہت گھبراتے تھے۔ اوّل تو خود علماء فارغ التحصیل ہی کا شمار اتنا تھا کہ اُن کی مہمانداری کے لئے کافی مقدار کی ضرورت تھی۔ ثانیاً دار العلوم کی شہرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ معمولی اعلان پر دس پندرہ ہزار مسلمان ضرور اطراف و جوانب سے جمع ہو جائیں گے۔ چونکہ لوگوں کے مطالبے بہت زور کے اور زیادہ ہوتے اس لئے ہر دو حضرات مہتممین مرحومین نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر اس کی انجام دہی کا زور دیا اور اس کے فوائد اور تقاضوں وغیرہ کا ذکر کیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی موافق ہو گئے اور پھر تینوں حضرات نے مجلسِ شوریٰ میں پیش کر کے منظوری لی۔ اور ۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء جلسہ کا اعلان کر دیا۔ ضروریاتِ جلسہ کے لئے بہت بڑی رقم کی ضرورت تھی اس لئے طلبہ کے وفود اطراف و جوانب میں تحصیل چندہ کے لئے روانہ کئے گئے۔ مسلمانوں نے ہر صوبہ اور ہر گوشہ سے لبیک کہا اور تقریباً ایک ماہ سے کم میں جبکہ وفود واپس آئے تو اٹھارہ بیس ہزار روپے جمع ہو گئے تھے اور شہرہ بھی جلسہ کا اس کے ذریعہ سے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ تمام انتظاماتِ لازمہ بڑے پیمانہ پر انجام دیئے گئے اور بحمد اللہ اس حسن و خوبی سے تمام امور تکمیل پائے گئے کہ عوام تو درکنار خواص اور ماہرین کو سخت تعجب ہوتا تھا کہ ان بوریہ نشین غریب علماء نے اس قدر عظیم الشان شاہانہ کام کو کس طرح انجام دے دیا۔ مسلمان جوق جوق اطراف اور جوانب سے نہایت شوق اور محبت سے آ کر جمع ہو گئے۔ اہل شہر نے اپنے اپنے مکانات مہمانوں کے لئے خالی کر دیئے۔ مہمانی کے لئے نہایت بڑے پیمانہ پر مطبخ بنایا گیا۔ دہلی سے مشہور باورچی بلائے گئے۔ ہر قسم کی ضروریات کا مکمل انتظام کیا گیا۔ جملہ امور متعلقہ کے لئے شعبے قائم کئے گئے طلبہ اور ملازمین و مدرسین کی پارٹیاں تقسیم کار کے اصول پر بنائی گئیں

ہر ذمہ دار اپنے اپنے کام میں منہمک اور مشغول رہتا تھا مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نہایت ساکت و صامت تفکر کے دریا میں غرق نظر آتے تھے کبھی یہاں بیٹھ گئے کبھی وہاں ان تمام ایام میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ مراقب پائے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت ہی عظیم الشان بار آپ پر پڑا ہوا ہے جس کی فکر میں ڈوبے ہوئے اپنے پروردگار سے عرض معروض کر رہے ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی تھا۔ مشکلات خود بخود حل ہو جاتی تھیں جن امور کو عقدۂ لاینحل اور معمولی طاقتوں سے بالاتر سمجھا جاتا تھا وہ چٹکیوں میں انجام پاتے تھے۔ لوکل حکام نے بھی مدد دینے میں کوتاہی نہیں کی۔ مدرسہ کے تالاب میں نہر سے پانی لایا گیا۔ جس کی وجہ سے مجمع کے لئے وضو وغیرہ بہت آسانی ہوگئی۔ ٹیوب ویل جگہ جگہ گاڑے گئے۔ پنڈال نہایت وسیع بنایا گیا۔ علاوہ ظاہری انتظامات کی تکمیل کے باطنی تصرفات اور روحانی برکات کا ہر جگہ ظہور تھا۔ معمولی بات یہ تھی کہ باوجودیکہ ہر وقت کئی کئی سو من غلہ اور گوشت پکتا تھا مگر کسی جگہ کتا نظر نہیں آتا تھا۔ باوجودیکہ گرمیوں کا زمانہ تھا مگر مکھیوں کا اجتماع کہیں نہ تھا۔ غلاظت اور گندگی جو کہ ایسے مجامع میں عموماً پائی جاتی ہے کہیں دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ اس قدر عظیم الشان مجمع میں کوئی شخص کھانے اور مہمانی کے فرائض سے محروم اور شاکی نہیں پایا گیا۔ حالانکہ معمولی معمولی باتوں اور مجامع میں اس قسم کی بے عنوانیاں سیکڑوں پائی جاتی ہیں۔ اس زمانہ میں اخباروں نے جلسہ کی غیر معمولی کامیابی پر زوردار اور طویل طویل آرٹیکل شائع کئے۔

میرے ذمہ طلبہ کو عربی میں تقریر کرانے کی خدمت تعین کی گئی تھی چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں مختلف عنوانات پر تقریباً بارہ یا پندرہ طالب علم عربی تقریر کے ماہر ہو گئے تھے۔ ارباب انتظام کی خواہش تھی کہ ان سبھوں سے مجمع عام میں عربی میں تقریر کرائی جائے۔

جلسہ میں اوّلاً جناب قاری عبدالوحید خاں صاحب مرحوم مدرس تجوید اور اُن کے شاگردوں بالخصوص مولانا محمد طیب صاحب اور مولانا محمد طاہر صاحب وغیرہ نے باتجوید قرآن سنایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم و مغفور نے اپنا مطبوعہ خطبہ موسومہ ”دارالعلوم دیوبند کا زرین ماضی اور مستقبل“ جو کہ نہایت بسوط تھا اور اس میں دارالعلوم کی ماضی خدمات دینیہ اور علمیہ کو

واضح طور پر ظاہر کیا گیا تھا سُنایا۔ اس میں مستقبل کی ضروریات اور اراکین کے ارادوں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے بعد سب سے پہلے عربی زبان میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط تقریر فرمائی۔ اُن کے بعد میں نے تقریر کی جو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے متعلق تھی۔ پھر دو تین طلبہ نے تقریر کی۔ مگر طلبہ کی اُمنگیں مایوسی سے تبدیل ہوگئیں جبکہ عام حاضرین نے مطالبہ کیا کہ تقاریر اردو میں ہونی چاہئیں ہم لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔ چناں چہ ارباب انتظام نے مجبور ہو کر عربی تقریریں بند کرادیں اور اُردو میں تقریروں کا سلسلہ جاری کیا۔ اس کے بعد دوسرے اجلاس میں دستار بندی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دستار بندی ہوئی اس کے بعد میری دستار بندی کی گئی۔

میری دستار بندی اور اُس کا تعدد

مجھ کو ایک عمامۂ سبز حسب اصول مدرسہ دوسرے حضرات کی طرح مدرسہ سے ازدست حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بندھوایا گیا اور مجھ کو خصوصی طور پر علاوہ دستار مدرسہ حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحب۔ صاحبزادہ حضرت قطب العالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما نے دوسری دستار عطا فرمائی پھر جناب حکیم مولانا احمد صاحب رامپوری رُکن مجلسِ شوریٰ نے تیسری دستار عطا فرمائی۔ علاوہ عربی تقریر کے اُردو میں بھی مجھ کو تقریر کرنے کی نوبت آئی۔ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں اور مواعظ سے لوگوں نے بہت حظ لیا اور بہت زیادہ فوائد عام حاضرین کو حاصل ہوئے۔ افسوس کہ اتنے بڑے عظیم الشان مجمع کے لئے باوجود پنڈال کی وسعت کے مقرر کو آواز سب تک پہنچانا سخت مشکل ہوتا تھا۔ اُس وقت لاؤڈ اسپیکر جاری نہیں ہوا تھا ورنہ یہ مشکل پیش نہ آتی۔ اس مجمع میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم نے بھی تقریر فرمائی تھی۔ خلاصہ یہ کہ یہ جلسہ اپنی معنوی اور مادی برکات اور عظمتوں کی بنا پر اپنا آپ ہی نظیر تھا۔ دوسری جگہ اس کی مثال نہیں پائی گئی۔ پوری تفصیلات اس کی مستقل رسالہ کی شکل میں شائع کی گئی تھیں جو کہ دارالعلوم کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ اس میں دارالعلوم دیوبند کو بعد منہائی مصارف بڑی مقدار چندہ کی بھی حاصل ہوئی۔ اور اس کے بعد دارالعلوم نے نمایاں شہرت اور قبولیت ملک میں پیدا

کر کے ایسی ترقیاں کیں جن کا وہم و گمان بھی پہلے نہ تھا۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

ہندوستان سے واپسی حجاز

چونکہ مدینہ منورہ میں والد صاحب مرحوم اور دیگر اعزہ موجود تھے اس لئے طبعی تقاضا وہاں پہنچنے کا علاوہ اُس روحانی تقاضے کے جو کہ ان دیارِ مقدسہ کی حاضری کا ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے جاری تھا مگر اس سے بڑھ کر حضرت والد صاحب مرحوم کا آئے دن کا حکم تھا کہ جلد از جلد یہاں پہنچنا چاہیئے۔ نیز طلباء مدینہ منورہ کے اور دیگر اعزہ کے تقاضے تھے جو کہ بذریعہ والد صاحب مرحوم بار بار ہوتے رہتے تھے۔ اسی بنا پر ۱۳۲۹ھ میں ارادہ سفرِ حجاز کیا گیا اور چونکہ حیفا سے (جو فلسطین کا مشہور بندر ہے اور بحرِ ابیض کے مشرقی کنارہ پر واقع ہے) مدینہ منورہ تک ریلوے کا سلسلہ متصل ہو چکا تھا اس لئے یہی مناسب معلوم ہوا کہ بمبئی سے پورٹ سعید کا ٹکٹ لیا جائے اور وہاں سے حیفا جانے والے جہاز میں سفر کیا جائے اور وہاں سے مدینہ منورہ ریل میں سفر کیا جائے۔ عبدالباقی خاں صاحب مرحوم الہ آبادی نے خواہش ظاہر فرمائی کہ وہ اپنی والدہ ماجدہ کو بمعیت اپنے چھوٹے بھائی قاری عبدالوحید خاں صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم اور ایک ملازم حج کے لئے بھیجنا چاہتے ہیں۔ نیز اپنے والد ماجد مرحوم کی طرف سے حجِ بدل بھی کرانا چاہتے ہیں۔ اس بنا پر انہیں کے حسبِ منشاء سفر کی تیاری کی گئی چونکہ اُن کی والدہ ماجدہ مرحومہ نہایت ضعیف العمر اور بھاری بدن کی تھیں اس لئے اونٹوں کا اس قدر سفر اُن کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی بنا پر اُن کی رائے یہی تھی کہ بذریعہ حجاز ریلوے سفر کیا جائے بہرحال مع متعلقین بمبئی پہنچ کر ایک اسٹریمر جہاز میں تقریباً مبلغ ۶۹ روپے فی کس کرایہ پر پورٹ سعید کا ٹکٹ لیا گیا۔ دسویں دن جہاز پورٹ سعید پہنچ گیا۔ وہاں بطور قرنطینہ[1] اور بانتظار جہاز حیفہ پانچ چھ روز قیام کر کے پہنچنا ہوا اور وہاں سے ایک دن قیام کر کے مدینہ منورہ کو روانگی ہوگئی۔ غالباً اٹھارویں دن مدینہ منورہ میں پانچوں آدمی پہنچ گئے۔ مدینہ منورہ میں تقریباً ایک ماہ قیام کرنے کے بعد متعلقین کو وہاں چھوڑ کر مکہ معظمہ کو روانگی ہوئی۔ راستہ میں قاری عبدالوحید صاحب مرحوم کی والدہ ماجدہ جو کہ نہایت معمر تھیں بیمار ہوگئیں اور بعد از فراغت حج انتقال کر گئیں۔ مکہ معظمہ ہی میں مدفون ہوئیں۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد قاری

---

[1] کیونکہ حکم یہ تھا کہ کوئی بحری مسافر پورٹ سعید میں اترنے کے بعد جب تک چند دن وہاں قیام نہ کرے سفر نہیں کر سکتا۔

عبدالوحید صاحب معہ اپنے ملازم کے ہندوستان واپس آ گئے اور میں مدینہ منورہ واپس ہو گیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

تیسرا سفرِ ہندوستان

اپنے اعزہ و اقارب میں سے نکاح کے لئے کوئی اس وجہ سے راضی نہیں ہوا کہ جب مدینہ منورہ میں قیام ہے تو لڑکی وہاں چلی جائے گی اور پھر ملاقات نہ ہو سکے گی۔ باوجود انتہائی کوششوں کے ناکامی ہوئی تھی تو خاندان سے باہر کوشش کی گئی تھی اور جناب حافظ زاہد حسن صاحب امروہی دامت برکاتہم کی کوششوں سے حکیم غلام احمد صاحب بچھرایونی مرحوم راضی ہو گئے تھے مگر انہوں نے دو شرطیں کیں ایک تو یہ کہ بارات میں جملہ اکابر دیوبند معہ صاحبزادہ جناب حکیم مسعود احمد صاحب مرحوم تشریف لائیں اور دوسرے یہ کہ مدینہ منورہ پہنچ جانے کے دو برس بعد لڑکی کو یہاں پہنچایا جائے اور چند دنوں لڑکی ہمارے پاس رہ کر پھر مدینہ منورہ جائے۔ پہلی شرط تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ اور حکم سے باآسانی پوری ہو گئی تھی مگر دوسری شرط اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ کے حکم پر مان لی گئی تھی مگر اُس میں بہت تشویش تھی کہ آنا بڑا سفر اور اس قدر مصارف کس طرح آسان ہوں گے۔ چونکہ نکاح کے بعد دو برس سے زیادہ ہندوستان ہی میں اقامت ہو گئی تھی تو حکیم صاحب مرحوم سے عرض کیا گیا کہ اب تو اتنی طویل مدت یہاں گزر گئی اور آپ نے تمام معاملات اطمینان بخش ملاحظہ فرما لئے اب اس شرط کو ساقط کر دیجئے۔ مگر وہ نہ مانے میرے مدینہ منورہ پہنچنے کے ایک سال بعد ۱۳۳۰ھ میں وہ خود بھی حج کے لئے تشریف لائے اور مکان ہی پر ٹھہرے اور تمام معاملات اطمینان بخش دیکھے اس پر بھی اُن سے کہا گیا کہ اب تو آپ کو وہ شرط ساقط کر دینی چاہیئے آپ نے اپنی لڑکی سے ملاقات بھی کر لی اور ہر طرح معاملات دیکھ لیئے مگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ میں اگرچہ مل لیا ہوں مگر لڑکی کی ماں اور بہنوں کو بجز ملاقات کوئی وجہ تسلی کی نہیں ہو سکتی اِسلئے بمجبوری اُنکی شرط پوری کرنی ضروری ہوئی۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد برخوردار الطاف احمد پیدا ہوا تھا کہا گیا کہ یہ بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے سفر طویل اور سخت ہے اسلئے بھی مناسب نہیں کہ حسبِ شرط سفر ہندوستان کیا جائے مگر انہوں نے کچھ نہ مانا۔ بالآخر کچھ صورتیں مصاریف کی کر کے اوائل ۱۳۳۱ھ میں ہندوستان کے سفر کا ارادہ کیا گیا۔ چونکہ حجاز ریلوے میں طلباء اور ارباب علم کو حکومت ترکی کی طرف سے مفت ٹکٹ مل جایا کرتا تھا۔ ہمارے تعلقات ارباب دفاتر وغیرہ سے بہت وسیع ہو چکے تھے

اس لئے جیفا تک ٹکٹ حاصل کرنے میں خرچ بہت کم ہوا۔

عزیزم وحید احمد مرحوم کی معیت

بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب مرحوم ۱۳۰۳ھ میں بیمار ہو کر انتقال فرما گئے تھے اُن کی اگرچہ پہلی اور دوسری بیویوں سے اولادیں متعدد پیدا ہوئی تھیں مگر بجز پہلی اولاد وحید احمد مرحوم کے اور کوئی اُن کی وفات کے وقت موجود نہ تھی۔ وحید احمد مرحوم اس وقت ترکی مدرسہ میں پڑھتا تھا اور علوم جدیدہ اور زبان ترکی میں اچھی طرح ماہر ہو چکا تھا عربی کی بھی تعلیم ایک درجہ تک حاصل کر چکا تھا مگر وہ قابلِ اطمینان نہ تھی۔ میرے سفر ہندوستان اور وہاں تین برس قیام کی وجہ سے اس کی تعلیم عربی میں بہت خلل پڑ گیا تھا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم (اس کے والد) اُس کی تعلیم اور تربیت پوری طرح نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے دوسرے نکاحوں اور سوتیلی ماؤں کے معاملات کی وجہ سے نیز اُن کے مغلوب الغضب اور زیادہ سخت ہونے کی بناء پر بھی اس کو طبعی طور پر اپنے والد مرحوم سے لگاؤ نہیں تھا بلکہ مجھ سے اور والد صاحب مرحوم سے اس کو زیادہ تعلق تھا۔ اسی بناء پر والد صاحب مرحوم نے اُس کو ترکی اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ مگر وہاں کے لڑکوں کی صحبت میں اس کے اعمال و اخلاق پر غیر مستحسن اثر پڑ رہا تھا۔ وہ طبعی طور پر نہایت ذہین تھا زبان ترکی اور فنون جدیدہ رائجہ میں وہ اپنے درجوں میں ممتاز رہتا تھا۔ مگر علومِ جدیدہ اور فلسفہ طبیعیات اور یورپین فیشن کا جو زہریلا اثر مذہب کے خلاف اہل اسکول اور کالجوں پر پڑتا ہے اس سے وہ بھی مسموم ہو رہا تھا۔ اس لئے والد صاحب مرحوم کا ارشاد ہوا کہ اس کو ہندوستان لے جا اور دارالعلوم دیوبند میں علوم عربیہ کی تکمیل کرا۔

اواخر محرم ۱۳۲۱ھ میں میں اور وحید اور الطاف اور اس کی والدہ مرحومہ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر تین چار دن میں جیفا ہوتے ہوئے پورٹ سعید پہنچے وہاں چند روز ٹھہر کر ایک اٹالین جہاز میں بکرایہ ۵۵ فی کس بمبئی روانہ ہو گئے۔ جہاز میں مال تھا۔ مسافر بہت کم تھے۔ بالخصوص فرسٹ کلاس کے مسافر صرف دو چار ہی تھے۔ اواخر صفر میں کراچی ہوتا ہوا یہ جہاز بمبئی پہنچا۔ وہاں سے متعلقین کو بچھراؤں پہنچا کر میں دیوبند پہنچا۔ الطاف مرحوم کی صحت اچھی تھی چہرہ پر ذکاوت اور نجابت کے آثار نمایاں تھے۔ عورتوں کے ڈبہ میں متعدد عورتیں اس کو گھور گھور کر دیکھتی تھیں ایک عورت نے اُس کی ماں سے کہا کہ یہ بچہ یہاں کا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ چہرہ کی چمک اور آثار یہاں

کے بچوں جیسے نہیں ہیں اُس نے کہا یہ مدینہ منورہ میں پیدا ہوا ہے اور حجرہ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں وہاں کی عادت کے موافق چلّہ کے بعد داخل کیا جا چکا ہے۔ اس پر اور بھی عورتوں نے اس کو گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ اور اُس کی تیزی اور شوخی اور چہرہ کی نجابت وغیرہ کو سراہنے لگیں۔ تقدیر الٰہی کہ اُن میں سے کسی کی نظر لگ گئی اور فوراً اُس کو قے آئی اور بخار شروع ہو گیا۔ آگرہ جب گاڑی پہنچی تو اس کا بہت بُرا حال تھا۔ اسی بیماری کی حالت میں وہ اپنے ننہال بچھراؤں پہنچا اور تپ دق میں مبتلا ہو گیا۔ حضرت حکیم رحیم اللہ صاحب مرحوم بجنوری کے علاج سے فائدہ ہوا مگر اصلی حالت نے آخر تک عود نہیں کیا۔ بالآخر مدینہ منورہ لوٹنے کے چند مہینہ بعد چیچک میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔

اس مرتبہ میرا قیام ہندوستان میں صرف مہینوں رہا جس میں دیوبند میں رہنا زیادہ ہوا اور متعدد اسفار بھی پیش آئے۔ الطاف کی بیماری کی وجہ سے اطمینان نصیب نہیں ہوا۔

واپسی مدینہ منورہ تیسری مرتبہ

بہرحال اواخر ۱۳۳۱ھ میں بطور حج بدل حجاج کے جہاز میں واپسی کا سامان کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی مگر ٹرکی اور برطانیہ کے درمیان اعلان جنگ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ خبریں گرم تھیں۔ اسٹیمر میں رات کو روشنی نہیں کی جاتی تھی اور آبدوزوں اور جنگی جہازوں کے خطرات ہمیشہ ظاہر کئے جاتے تھے۔ بہرحال دسویں یا بارہویں دن جدّہ پہنچنا ہوا۔ اور اور پھر مکہ معظمہ میں ایام حج میں قیام کر کے اونٹوں کی سواری سے مدینہ منورہ ۱۳۳۲ھ محرم میں پہنچنا ہوا۔ اسی زمانہ میں ٹرکی کا اعلان جنگ بھی ہو گیا۔ اور فوج کشی وغیرہ کے سامانوں اور جنگی تحفظات وغیرہ کا اثر حجاز میں اور بالخصوص حرمین شریفین میں شروع ہو گیا۔ میں متعلقین کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ کر مشاغل تعلیمیہ وغیرہ میں حسبِ سابق مشغول ہو گیا۔ اسی اثناء میں جبکہ ترکی فوجیں حدودِ مصر کی طرف بھیجی جا رہی تھیں اور مجاہدین منظوعین (والنٹیروں) کی بھرتی کی جا رہی تھی تو ترغیبِ جہاد کے لئے مناخہ[1] مدینہ منورہ میں ایک بڑا جلسہ کیا گیا۔ اور مجھ کو تقریر کرنے کی نوبت آئی۔ مگر یہ تقریر اُردو میں تھی اور دوسرے حضرات نے بھی تقریریں کیں۔ مشہور خیری برادران بھی اُس زمانہ میں وہاں پہنچ گئے تھے اُن کی بھی تقریریں ہوئیں

---

[1] مدینہ منورہ کے غلہ بازار (اناج کی منڈی) میں ایک وسیع میدان ہے اور یہیں قافلے ٹھہرا کرتے ہیں۔

اور ایک مجمع مجاہدین اہل ہند وغیرہ کا متطوع (والنٹیر) کور میں داخل ہوگیا۔ جن میں مولانا محمد جان قازانی اور مولانا حرمت اللہ قازانی بھی تھے یہ ہر دو صاحبان روس کے باشندہ تھے اور بغرض تحصیل علوم دینیہ اوّلاً مدینہ منورہ پھر دیوبند آگئے تھے اور کتب درسیہ سے فراغت حاصل کر کے اسی سال مدینہ منورہ پہنچ گئے تھے۔ جمال پاشا کے زیر کمان جو حملے اور کارروائیاں کنال سوئز اور بیر سبع وغیرہ پر میدان تیہہ میں واقع ہوئیں اُن میں یہ جماعت شریک رہی اور بہت کچھ دادِ شجاعت و جوانمردی دیتی رہی۔

سیاست سے میرا تعلق

یہاں تک ذاتی اور خانگی حالات تھے۔ اِس جنگ عظیم نے سوانح زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ "یعنی سیاست سے میرا تعلق اور برطانوی سامراج کے مقابلے میں عزم انقلاب"۔ جس جس طرح میری علمی زندگی کا منبع فیض شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز تھے ایسے ہی سیاسی زندگی کا سرچشمہ بھی حضرت شیخ کے وہ افکار و خیالات اور وہ جذبات تھے جو عرصۂ دراز سے حضرت شیخ کے سینۂ پُرنور اور ضمیر روشن میں پرورش پارہے تھے اور جن کی چنگاریاں اس جنگِ عظیم نے بھڑکا دی تھیں۔ اس موقعہ پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حالات سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی رجحانات اور اُن کے اسباب و وجوہات پر تفصیل سے بحث کریں۔ اس بحث سے پہلے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سوانح سے ان صفحات کو مزین کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز

مختصر سوانح، انقلابی نشو ونما، جذبہ جہادِ حریت کی ابتداء

حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز جن کو تحریکِ خلافت میں مسلمانوں کی طرف سے لقب شیخ الہند دیا گیا تھا۔ قصبہ دیوبند ضلع سہارن پور کے باشندہ تھے۔ اُنکے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۰ء میں بعہدۂ ڈپٹی انسپکٹر مدارس بانس بریلی میں ملازم تھے وہاں ہی ۱۸۵۰ء کے اخیر یا ۱۸۵۱ء کے ابتداء میں مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ہوئی ۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ صغیر السن ہی تھے کہ اُن کے والد ماجد کا تبادلہ شہر میرٹھ کو ہوگیا۔ جب کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عمر چھ یا سات برس کی تھی۔ میرٹھ میں ہنگامہ انقلابِ آزادی ۱۸۵۷ء واقع ہوا۔ ۵۷ء کے واقعات کو اگرچہ صغیر سنی کی وجہ سے پوری طرح نہیں دیکھ سکے تھے مگر اجمالی طور سے یاد تھے۔ بڑے ہونے کے بعد اپنے والدین ماجدین اور اساتذہ اور گردوپیش سے وہ انسانیت سوز مظالم اور درندگی و بربریت کے معاملات جو انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ کئے تھے سُنتے اور معلوم کرتے رہے، ذہن ثاقب، طبیعت غیور، حافظہ نہایت قوی اور جرأت بے مثل قدرت نے عطا فرمائی تھی، بنا بریں تاریخی اطلاعات اور ان کی کھوج وتلاش اور ان کی یاد مثل دیگر امور علمیہ سینہ مبارکہ میں جاگزیں ہوتی گئی۔ پھر قدرت نے حضرت شمس الاسلام والمسلمین مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت شمس العلم والعلماء مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ اسرارہما کے در دولت تک پہنچا کر شرف شاگردی اور حاضر باشی بارگاہ عطا فرمایا۔ یہ ہر دو حضرات ۱۸۵۷ء میں شاملی تھانہ بھون وغیرہ میں جہادِ حریت کے علمبردار رہے تھے اور حضرت قطبِ عالم مولانا الحاج امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی سرپرستی میں بڑے بڑے کارِ نمایاں کر چکے تھے۔ اور اگرچہ برطانوی درندگی ان دونوں حضرات کو بھی مثل دیگر مجاہدین حریت صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتی تھی اور اگرچہ غداران ملت نے ان کو بھی اپنی ناعاقبت اندیشی سے پھنسانے کے لئے ایڑی چوٹی

کا زور لگایا تھا۔ مگر قدرت کے خفیہ ہاتھوں نے ان دونوں حضرات کی کھلی کھلی خوارق عادات کرامتوں سے حفاظت کی تھی۔ بہرحال حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ میں ان دونوں بزرگوں اور بالخصوص حضرت نانوتوی قدس اللہ اسرارہما کی صحبت اور شاگردی اور خدمت کی وجہ سے وہ تمام حالات جن کی وجہ سے انقلاب ۵۷ء کی کوششیں ہندوستانیوں نے کی تھیں اور وہ واقعات جو اس جنگِ آزادی میں پیش آئے تھے معلوم ہو کر محفوظ ہو گئے تھے جن کی بناء پر وہ جذبۂ حریت و ایثار اور اس کی آگ اور امورِ حکومت پر تنقیدانہ نظر پیدا ہو گئی تھی کہ جس کی نظیر بجز قرونِ اولیٰ عالم اسلام میں پائی جانی تقریباً ممتنع ہے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ صرف تفسیر و حدیث فقہ و اصول منطق اور فلسفہ حساب اور مساحت ہیئت اور معقولات کے ہی بحرِ ذخار نہیں تھے بلکہ اُن کو ادبیات عربیہ فارسیہ و اُردو، شعر و سخن اساتذہ فن کے مقالات اور قصائد و غزلیات اور مثنویات وغیرہ اس قدر یاد اور ازبر تھیں کہ سننے والا حیران ہو جاتا تھا اور تعجب کرنے لگتا تھا کہ ان کے حافظہ میں کس قدر بے شمار علوم اور محفوظات کے خزانے بھرے ہوئے ہیں اسی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نظر تاریخی معلومات اور سیاسی واقعات پر نہایت وسیع اور گہری تھی جس پر اطلاع پانے کے بعد انسان ششدر ہو جاتا تھا کہ یہ بے شمار امور کس طرح ان کے ذخائرِ علمیہ میں آ گئے۔ نیز حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تواریخ سلاطین ماضیہ خصوصاً شہنشاہانِ ہند اور اُن کے واقعات و انتظامات پر نہایت زیادہ عبور رکھتے تھے۔ ہندوستان کی اقتصادی، معاشی، سیاسی، تجارتی، صنعتی، تعلیمی انتظامی، جنگی، صحتی وغیرہ معلومات بھی اس قدر تھیں کہ بڑے سے بڑا ڈاکٹر اور اکانومک پروفیسر اُن تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اخبار بینی اور واقعات عالم پر اطلاع کا بہت شوق تھا۔ بہرحال ان کو انگریزی حکومت اور ہندوستان کے مندرجہ ذیل واقعات نے مجبور کیا کہ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر انگریزی استبداد اور مظالم کا مقابلہ کیا جائے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی پوری جدوجہد عمل میں لائی جائے اور کسی قسم کے خطرہ کو بھی مرعوب یا متاثر کرنے کا موقع نہ دیا جا سکے۔ اگرچہ ان اسباب کی تفصیل بہت طویل ہے جس کو ہم انشاء اللہ مستقل تالیف میں پیش کریں گے مگر اس موقع پر قطعاً نظر انداز کر دینا بھی مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا ہم مختصر طور پر ان وجوہ اور اسباب کو انگریزوں ہی

کی شہادتوں سے ذکر کرتے ہیں۔ یہ وہ وجوہ اور اسباب ہیں جن کو اکثر ہم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زبان فیض ترجمان سے اجمالی طور پر سنا کرتے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے واقعات ۵۷ء اور انگریزوں کے ہندوستانیوں پر بے شمار سنگین مظالم اور خلاف انسانیت بربریت کے مظاہرات خود دیکھے اور بہت قریب سے سنے تھے اس لئے ان کے قلب میں بہت زیادہ اثر اور جوش اُن کے خلاف تھا۔ سب سے بڑے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) انگریزی دور میں ہندوستانیوں کی توہین و تذلیل

انگریزوں سے پہلے کا ہندوستان سماجی اور معاشی لحاظ سے ہندوستانیوں کی آزادی اور عزت اور شوکت تمام دنیا میں مثل دیگر آزاد اقوام ہمیشہ سے تسلیم کی جاتی تھی۔ چونکہ یہاں کے علوم ہندسہ، حکمت و فلسفہ، حساب وغیرہ نے بے مثل ترقی کی تھی جس سے دوسرے ممالک ایشیا و افریقہ وغیرہ بھی فیضیاب ہوئے تھے اس لئے اور اس لئے کہ مسلمان بادشاہوں نے یہاں کے صنائع اور تجارت اور اخلاق و علوم میں چار چاند لگا دیئے تھے اور دُور دُور سے بڑے بڑے نامور اساتذہ کو بلا کر بھاری بھاری تنخواہیں دے کر اُن کے صنائع اور کمالات ملک میں پھیلا دیئے تھے اور اس لئے کہ دُور دراز ملکوں میں اُن کی تجارتیں اور آمد و رفت جاری تھی تمام اقوام اور ممالک میں نہایت عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ حکومت اور سلطنت کے یہی مالک تھے اور باوجود اختلاف مذاہب تمام امور سلطنت انہیں کے ہاتھ میں تھے۔ فرقہ واریت کا نام نہ تھا۔ تمام ہندوستانی دنیا میں ایک قوم شمار کئے جاتے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کے آنے کے بعد شہنشاہیت مسلمانوں کی قائم ہو گئی تھی مگر مسلمان بادشاہ یہاں ہی کے باشندے بن کر یہاں کی قومیت میں مندمج ہو گئے تھے انہوں نے اپنے علائق اپنے اصلی اوطان اور اقوام سے تقریباً منقطع کر لئے تھے اور ہندوستانی قومیت کے جزو لاینفک بن گئے تھے۔ امور حکومت میں یہاں کے اصلی باشندوں کو انہوں نے شریک ایسی طرح سے کر لیا تھا کہ جیسے ایک قوم اور ایک خاندان آپس میں شریک ہوتے ہیں شخصی سلطنت کا دارومدار سراسر رعایا کی خوشنودی پر تھا اور پنچائتوں کے قیام کی وجہ سے عام طور پر

عوام الناس کو حکومت خود اختیاری حاصل تھی اور ادنیٰ حکام سے لے کر بادشاہوں تک کے یہاں عام وخاص دربار ہوتے تھے جن میں ہر شخص کو اظہارِ رائے کا موقع ملتا تھا۔ اس بارہ میں سر بارٹل فریر نے لکھا ہے۔

"ایک دیسی شاہزادہ کا دربار بھی کونسل کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔ ایک اچھے حکمران کے زیر اثر اس دربار میں سب کی رسائی ہوتی ہے اور ہر ایک کو تقریر کرنے کی بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے اور یہی ذریعہ ہے جس سے وہ رعایا پر کسی قانون کے اثر کو محسوس کر سکتا ہے اور وہ اس طرح بے چینی کو پہلے ہی معلوم کر لیتا ہے۔" (رپورٹ آئینی اصلاحات مانٹیگو چیمسفورڈ صفحہ ۳۸)

(روشن مستقبل صفحہ ۲۹)

آپس میں رشتہ داریاں اور بیاہ شادی جاری کر رکھی تھی۔ ہر قسم کے عہدے وزارت عظمیٰ اور سپہ سالاری سے لے کر ادنیٰ انتظامی اور فوجی عہدوں تک بلا لحاظ نسل و رنگت اور مذہب و وطنیت حسبِ قابلیت مفتوح اقوام کو بھی دیتے رہتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو مہاراجہ، راجہ، تعلق دار بنایا۔ بڑی بڑی ریاستیں دیں، ہفت ہزاری، شش ہزاری، پنج ہزاری اور نیچے کے تمام منصب عطا کئے۔ سر پی سی رائے (مشہور بنگالی لیڈر) کہتا ہے "اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصبداری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور بڑے بڑے زمیندار بنا دیئے گئے اورنگزیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا، وائسرائے بنایا۔ یہاں تک کہ اس نے خالص مسلم صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت تھا!" (روشن مستقبل صفحہ ۱۴)

شہنشاہی درباروں سے لے کر عام سوسائیٹیوں تک میں سب مخلوط تھے اس لئے تمام ہندوستانی دنیا کی نظروں میں بھی اور آپس میں بھی عزت و شوکت اعلیٰ پیمانہ پر رکھتے تھے یہی نہیں بلکہ اپنی بے مثل ثروت، بے مثل تجارت، بے مثل دستکاری، بے مثل تمدن، اور بے مثل طاقت کی بنا پر اقوام عالم میں برتری اور سب سے فوقیت کا درجہ رکھتے تھے۔ کوئی ہندوستانی خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا ہو غیر ممالک میں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور نہ ہندوستان میں کوئی غیر قوم کا آدمی کسی ہندوستانی کو ذلیل دیکھ سکتا تھا۔

برنیر فرانسیسی کہتا ہے کہ "رعایا کی حفاظت اس طرح کی جاتی ہے جس طرح بادشاہ

اپنے خاندان کے افراد اور اہل و عیال کی کرتے ہیں۔ کسی طرح گوارا نہیں کیا جاتا تھا کہ کوئی فوجی یا پولیس یا کوئی اجنبی کسی رعیت پر کسی قسم کی دست درازی کرے۔"

حرفتی کمیشن جس کے تمام ممبر انگریز تھے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے :-

"ایسے زمانہ میں جبکہ مغربی یورپ میں جو کہ موجودہ طریق حرفت کا مولد و منتہا ہے غیر مہذب قبائل آباد تھے۔ ہندوستان اپنے حکمرانوں کی دولت اور کاریگروں کی اعلیٰ صنعت کے لئے مشہور تھا اور بہت بعد کے وقت میں جبکہ مغرب کے حوصلہ مند تاجر پہلے پہل ہندوستان میں نمودار ہونے لگے۔ یہ ملک زیادہ ترقی یافتہ یورپین اقوام سے کسی طرح گھٹا ہوا نہیں تھا۔" (علم المعیشہ)

سر تھامس منرو (برطانوی قبضہ سے قبل ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے) کہتا ہے۔

"ہندوستانیوں کا طریقہ کاشتکاری، بے مثل صنعت و حرفت ان کی صنعت و کاشتکاری کے معاملہ میں اعلیٰ استعداد، ہر قریہ میں ایسے مدارس کی موجودگی جس میں نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم ہوتی ہو، ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو اس کی عزت، عصمت اور عفت کا پوری طرح لحاظ رکھا جاتا ہو۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسے صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انگلستان و ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔"

لارڈ ولیم بنٹک (مشہور وائسرائے ہند و گورنر مدراس) ۱۸۳۲ء میں کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں۔ مسلمان اس ملک میں آباد ہو گئے جسے انہوں نے فتح کیا تھا وہ ہندوستانی باشندوں میں گھل مل گئے۔ ان میں بیاہ شادی کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیئے۔ فاتح اور مفتوح کے مذاق دلچسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی۔ کوئی فرق نہ تھا۔ بخلاف انگریزی پالیسی اس کے

برعکس ہے۔ اب سرد مہری، خود غرضی، بے پرواہی ہے جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمران ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے، اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے ''

(ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت از میجر باسو جلد ۴ ص ۴۶)

(روشن منتقبل ص ۲۵، ۲۶ و انصار دیوبند مورخہ ۱۶ جون ۱۹۲۸ء)

پنڈت سندر لال اپنی کتاب "بھارت میں انگریزی راج" میں فرماتے ہیں "اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمان یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانبداری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بیشمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں الخ "

انگریزی دور اور سماجی تباہی اور بربادی

مگر جب سے انگریزی راج شروع ہوا اسی وقت سے ہندوستانیوں کی قومی توہین اور تذلیل اور نسلی اور وطنی امتیاز اور رنگت اور یورپین اور نیٹو (دیسی) کا ذلیل کرنے والا تفرقہ شروع ہوا جو کہ طاقت اور قوت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا انتہائی درجہ کو پہنچ گیا باوجودیکہ انگریز پردیس سے بطور مہمان تجارت کے لئے آئے تھے اور شہنشاہان ہندوستان کے رحم و کرم سے تجارت کی اجازت حاصل کر کے فرمانات شاہی کے سایہ میں روز افزوں ترقی کرتے رہے اور پھر شہنشاہانِ اسلام پر ڈورے ڈال کر دیوانی (ریونیو) کی ملازمت حاصل کر کے انتظامی امور میں دخیل ہوتے اور پھر غداریاں کرتے ہوئے تمام نظامِ سلطنت کو رفتہ رفتہ ملیامیٹ کر کے تقریباً سو برس ۱۷۶۵ء سے ۱۸۶۴ء تک میں ہندوستان کے بادشاہ بن گئے۔ ۱۷۶۵ء کے کچھ بعد سے ہی ہندوستانی افسروں کو آہستہ آہستہ خلافِ معاہدہ نکالنا شروع کیا اور جن عہدوں کو کوئی انگریز قبول کر سکتا تھا ان پر انگریزوں کو مقرر کیا۔

سر جان شور کہتا ہے (۱۸۳۳ء میں انگریزی قانون اور نظام پر بحث کرتے ہوئے) " ہر وہ عہدہ عزت اور منصب جس کو قبول کرنے کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو آمادہ کیا جا سکتا ہے، ہندوستانیوں کے لئے بند کر دیا گیا ہے "

(حکومت خود اختیاری ص ۲۷)

اور جو چھوٹے عہدے تھے اور تنخواہوں کی اُن میں زیادہ مقدار نہیں ہوسکتی تھی اُن سے بھی مسلمانوں کو نکال کر ہندوؤں کو مقرر کیا۔ یورپینوں اور انگلو انڈینوں کو ان کے عہدوں پر بہ نسبت سابق کئی کئی گنا زیادہ تنخواہیں دیں۔ فوجی عہدوں کے ذمّہ دار مناصب سے ہندوستانیوں کو بالکل خارج کر دیا اور حیلہ یہ کیا کہ بغیر افواج پر قبضہ کرنے کے مالیات کا وصول کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس طرح تمام فوجی قوت بھی ہاتھ میں لے لی۔ لارڈ کارنوالس نے ایسی اسکیم بندوبست آراضی کی بنائی کہ تمام عملہ پُرانے نظام کا درہم برہم ہوگیا۔ ہندوستانی حکومت کے ارکان نان شبینہ کو محتاج ہوگئے اور تمام طاقت یورپین لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ملک کی صنعت اور تجارت کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا اور اس کی جگہ یورپین تجارت اور دستکاری کو ٹھونس دیا گیا۔ جو ہندوستانی تجارت اور دستکاری سے بسر اوقات کرتے تھے وہ فاقوں میں مبتلا ہوگئے۔ زمین کے لگان اور مال گذاری میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ کاشتکار آبادی تباہ و برباد ہوگئی۔ وصولی لگان اور قرضہ اور سود کے ایسے قوانین بنائے اور نافذ کر دیئے کہ کاشتکار اور زمیندار اپنے ذاتی سرمایوں، گھر کے زیورات، کاشتکاری کے آلات اور جانوروں تک کے فروخت کرنے، اور جائدادوں کو رہن رکھنے اور بیچ ڈالنے کے لئے مجبور ہوگئے۔ الحاصل کوئی طریقہ ہندوستانیوں کو عزّت اور خوشحالی سے بسر کرنے کا باقی نہیں رکھا۔ جو سرمایہ ہندوستانیوں کے پاس مال و دولت کا صدیوں سے چلا آتا تھا اُسکو جائز اور ناجائز طریقوں اور من مانے قوانین وغیرہ سے اپنے قبضہ میں لاکر انگلستان منتقل کر دیا۔

سر میلکم لوئس جج عدالت عالیہ (ہائیکورٹ) مدراس و ممبر کونسل نے اپنے ایک رسالہ میں لندن سے لکھا تھا ”ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا، اُن کے قانون وراثت کو منسوخ کیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا مذہبی رسم و رواج کی توہین کی۔ عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کرلیں، سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا، امراء کی ریاستیں ضبط کرلیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ انہیں تکلیف دیکر مالگذاری وصول کی۔ سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انہیں آوارہ بنا دینے والے بندوبست قائم کئے۔“

(رسالہ ہندوستان کی سیاسی ترقی ص۳۰) (روشن مستقبل ص۷۶)

لارڈ میکالے لکھتا[۵] ہے۔

---

[۵] ماخوذ از میکالے کا مضمون ہسٹنگز کے متعلق ص۶۲۳ دربارہ قوانین کورٹ

در بات بات پر حلف لیئے جاتے تھے درآنحالیکہ قسم کھانا آبرو دار ہندوستانی کے نزدیک گناہ ہے۔ اس کے علاوہ مشرق میں کسی شریف آدمی کے زنانہ مکان میں غیر مرد کا گھس جانا یا کسی عورت کو بے پردہ دیکھ لینا ناقابل برداشت ظلم سمجھا جاتا ہے جس کا بدلہ صرف خون سے لیا جا سکتا ہے۔ مگر یہی مصیبتیں تھیں جن کا نشانہ بنگال اور بہار کے شریف گھرانے بنائے جاتے تھے۔ ہندی رعایا کے بدترین لوگوں کا ایک گروہ ان کے گرد جمع ہو گیا تھا جن میں حلاف، فتنہ پرداز اور جعلساز سب ہی تھے اور ان کے ماسوا نظارت کا وہ قزاق عملہ تھا جس کے سامنے انگریزی حوالات کے بدترین شحنے بھی ایماندار اور رحمدل معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوستانی شرفا جو بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے گرفتار ہو کر کلکتہ بھیجے گئے اور قید خانہ میں بند کر دیئے گئے۔ شریفوں کے زنانخانے وہ چیز ہیں کہ مشرقی سلاطین جو کسی چیز کا احترام نہیں کرتے ان کا احترام کرتے ہیں مگر اب یہی زنانخانے تھے جہاں ناظروں اور امینوں کے گروہ گھس جاتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی دیکھی گئی ہیں کہ حرم سرا کی حفاظت میں بعض نے لڑکر ڈیوڑھیوں پر جانیں دے دیں۔ مرہٹوں کے حملے سے صوبہ میں یہ ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی جو انگریزی قانون کی اس یورش سے ظہور میں آ رہی ہے۔" (روشن مستقبل ص ۶۶)

"مگر تمام دیگر مشکلات سے زیادہ تکلیف دہ یہ چیز تھی کہ عدالتوں میں ہندوستانیوں اور یورپینوں میں امتیاز کیا جاتا تھا جب تک کمپنی کے لوگ اس ملک میں صرف تجارت کرتے تھے تو بوجہ غیر ملکی ہونے کے زیادہ بُرا نہ تھا کہ وہ اپنے ہم قوموں کی حمایت کرتے۔ مگر ملک کا حاکم بن جانے کے بعد یہ لازم تھا کہ مثل پچھلے حکمرانوں کے انصاف کرنے میں قطعی غیر جانبدار رہتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور نہ صرف اہلِ ہند اور اہلِ یورپ میں بلکہ دیسی عیسائیوں اور دوسرے مذہب والے ہندوستانیوں کے درمیان امتیاز کیا۔ چنانچہ ۱۸۲۷ء میں جب جدید جیوری کا قانون نافذ ہوا تو راجہ رام موہن رائے نے اس کے خلاف ہندو مسلمانوں کی طرف سے ایک احتجاجی عرضداشت پُر زور الفاظ میں پارلیمنٹ میں بھیجی اس میں لکھا گیا کہ عدالتوں میں مذہبی امتیاز قائم کر دینے سے ہندوستانیوں میں سخت ناراضی ہے۔ اس قانون کی رُو سے معزز ترین ہندوستانی کا مقدمہ ایک دیسی عیسائی حاکم کر سکتا ہے۔ برخلاف اسکے دیسی عیسائی کا مقدمہ ایک ہندوستانی کی عدالت میں نہیں جا سکتا۔ نیز یہ کہ ہندوستانیوں کے مقدمات کے فیصل کرنے کے لئے جوری بٹھائی جاتی ہے تو اس میں کوئی ہندوستانی اس جوری کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ ان امور سے ہندوستانیوں کی انتہائی ذلّت اور خواری ہو رہی ہے۔" (سوانح راجہ رام موہن رائے (انگریزی) از نیٹسن ص ۴۵)

سر تھامس منرو اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

وضع قوانین میں ان کا (ہندوستانیوں کا) کوئی حصّہ نہیں اور قانون کے عمل درآمد میں اُن کو بہت کم دخل ہے باستثناء چند نہایت چھوٹے عہدوں کے وہ کسی بڑے عہدہ تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول نہیں پہنچتے۔ وہ ہر ہر جگہ ایک ادنیٰ قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں۔ تمام فوجی اور دیوانی وہ عہدے جو کچھ بھی اہمیّت رکھ سکتے ہیں اب یورپینوں کے قبضہ میں ہیں جن کا پس انداز روپیہ خود ان کے ملک کو چلا جاتا ہے۔" (ت صفحہ ۱۶۶ جلد دوم)

(حکومت خود اختیاری صہ۱)

سرسیّد نے اسباب بغاوت ہند میں لکھا ہے:۔

"بے عزّتی ایسی بد چیز ہے کہ اس سے دل پر زخم ہو جاتا ہے جو اچھا نہیں ہوتا۔ گورنمنٹ نے ہندوستانیوں کو نہایت بے وقر کر دیا ہے۔ صاحب کا پیشکار صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔ دراصل انگریز اور ہندوستانی مثل آگ اور سوکھی گھاس کے ہیں یا مثل پتھر کے دو ٹکڑوں کے ہیں سفید اور کالے جن میں فاصلہ دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے اور یوں تصوّر کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستان میں کوئی جنٹل مین نہیں ہے۔" (روشن مستقبل صہ۸۸)

مسٹر ہولٹ کمنزی ۱۸۳۰ء میں لکھتا ہے (مال اور دیوانی کی یادداشتیں ذکر کرتے ہوئے)

"یہ عمل نہایت حیرت انگیز ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ ایسے نیک دل انگریزوں کا برتاؤ بھی حقارت آمیز رہا ہے جو فی الواقع نہایت نیک تھے الخ" (حکومت خود اختیاری صہ۱۸)

مسٹر لڈلو اپنی کتاب برٹش انڈیا میں لکھتا ہے۔

"انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کے فتح ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے اُبھرتے کے اس کے تمام باشندے ذلیل ترین ہو جائیں گے۔" (حکومت خود اختیاری صہ۱۹)

خلاصہ کلام یہ کہ مندرجہ بالا شہادتیں اور ان کے علاوہ بے شمار ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی اس قدر تذلیل و توہین کی کہ جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ انہوں نے عدالتوں اور کورٹوں میں توہین کی۔ اُنہوں نے فیصلوں میں توہین کی۔ آئے دن ایسے ایسے واقعات رُونما ہوئے کہ فوجی اور سول گوروں سے ہندوستانی ذلیل ہوتے یا مارے جاتے رہے اور یہ کہہ کر یا فیصلہ کر کے ٹال دیا جاتا کہ مقتول کی تلی بڑھ گئی یا خراب ہو گئی تھی۔ گوروں کے مقدمات ہندوستانی ججوں کے یہاں فیصل

نہ ہو سکتے تھے۔ ریل کے ڈبوں میں ہندوستانی اور یورپین کا تمیز کیا گیا۔ شاہراہوں اور تفریح کے مقامات میں اُن کا تمیز کیا گیا۔ شہروں اور عام گذرگاہوں پر ایسے ایسے کتبے اور سائن بورڈ اور مجسمے نصب کئے گئے جن پر توہین آمیز عبارتیں لکھی گئیں۔ اجلاسوں کی نشستوں میں تمیز کیا گیا۔ جس کو گوارہ نہ کرتے ہوئے سر سید آگرہ کے اجلاس سے واپس آگئے تھے۔ عہدوں اور تنخواہوں کا انتہائی تمیز اور توہین کا معاملہ ہمیشہ جاری رہا۔ ۱۸۵۷ء میں وہ وہ مظالم ہندوستانیوں کے ساتھ عمل میں لائے گئے جن کو جانوروں کے ساتھ بھی کوئی انسان گوارا نہیں کرتا۔ ہندوستانیوں کی توہین و تذلیل، قتل و غارت۔ بربادی اور ہلاکت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا گیا۔ بیرونِ ہند، ہندوستانیوں کو وحشی، نیم تعلیم یافتہ، جاہل، غیر مہذب، قلی وغیرہ مشہور کیا گیا۔ ان کو غیر قابل حکومت، ناسمجھ، نالائق بتلا کر ناقابل آزادی بتلایا گیا، ان کو مذہبی دیوانے، کنگال لڑاکو دکھلایا گیا۔ ایک ناکتخدا امریکی عورت مس میو سے رسوائے عالم کتاب مدر انڈیا لکھوا کر تمام دنیا اور بالخصوص امریکہ میں بے حد شائع کیا گیا۔ ساؤتھ افریقہ، امریکہ کینیڈا، آسٹریلیا، کینیا، ماریشس، نیوزی لینڈ اور دیگر ممالک یوروپیہ و افریقہ میں ہندوستانیوں کو حقوقِ شہریت سے ممنوع کرایا گیا۔ اس قسم کی بے شمار توہین و تذلیل کی ایسی کارروائیاں ہمیشہ عمل میں لائی گئیں جن کو معمولی غیرت اور شرافت والا انسان بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور جن سے ہر شریف النفس انسان کے دل زخموں سے چور چور ہو گئے تھے۔

(۲) اخلاقی تباہی

انگریزوں سے پہلے ہندوستانیوں کے اخلاق

ہندوستان قدیم زمانہ سے روحانی پیشواؤں کا مرکز رہا ہے اور انہیں کا اثر تھا کہ انگریزی عروج تک یہاں کے عام باشندے اعلیٰ ترین کیرکٹر اور اخلاق کے عادی تھے۔ سر تھامس مزو جو کہ شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں آیا تھا ہندوستانیوں کی تہذیب اور تمدن کو دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ اسی بنا پر وہ اپنے مقالہ میں جس کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ہندوستانیوں کے اوصاف ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے۔ ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو اس کی عزت، عصمت عفت

کا لحاظ رکھا جاتا ہو یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یوروپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر انگلستان اور ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔" یہ الفاظ صاف طور سے بتلا رہے ہیں کہ ہندوستانیوں میں اس نے ایسے اخلاق جمیلہ اور اعمال حسنہ کا مشاہدہ کیا تھا جن کے حاصل کرنے کی وہ اہل انگلستان کو ترغیب دیتا ہے اور اُن کے حاصل ہونے سے انگریزوں کے لئے بہت فائدہ دیکھتا ہے۔ اس زمانہ میں عام طور سے ہندوستانیوں میں مہمان نوازی، انسانی ہمدردی، غرباء اور مصیبت زدوں پر شفقت اور رحم، عہد و پیمان کا تحفظ اور پابندی، خدا ترسی اور سچائی، امانت داری اور سخاوت وفاداری اور صداقت، دیانت داری اور عدالت، بلند حوصلگی اور شرافت، بیدار مغزی جفاکشی، چستی اور بیداری، شجاعت اور مردانگی وغیرہ اوصاف جمیلہ بڑے پیمانہ پر پائے جاتے تھے۔ سچ بولنا تو اس قدر ضروری سمجھا جاتا تھا کہ جرائم پیشہ اشخاص بھی اس کے بہت زیادہ پابند ہوتے تھے۔ کرنیل سلیمان (جس نے ٹھگوں کی سرکوبی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے) کہتا ہے:۔

"میرے تجربہ میں صدہا مثالیں ایسی آچکی ہیں کہ ایک آدمی کی دولت آزادی اور زندگی جھوٹ سے بچ سکتی تھی مگر وہ جھوٹ ہی نہ بولا۔" (روداد بھائی حکومت خود اختیاری ص۸۸)

اور یہی وجہ تھی کہ تجارتی بہی کھاتے نہایت معتبر شمار کئے جاتے تھے اور اُن کی شہادتیں فیصلوں میں نہایت زیادہ قابل اعتبار سمجھی جاتی تھیں۔ سر ارسکن پیری رایک سب کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے) کہتا ہے۔

"تجارتی کھاتوں کی وہ حرمت تھی کہ کسی متنازعہ لین دین کے بارہ میں ان کا پیش ہو جانا عدالت کے نزدیک ناقابل تردید شہادت سمجھا جاتا تھا۔" (روداد بھائی ص۱۹۴

حکومت خود اختیاری ص۸۸)

آج بھی ان مقاموں کے بسنے والے ہندوستانیوں میں جو موجودہ تمدن اور نظام سے بہت دُور ہیں پُرانے اخلاق جمیلہ کی تیز جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مصنف حکومت خود اختیاری لکھتا ہے۔

"جو لوگ پہاڑوں پر جاتے ہیں وہ روزانہ دیکھتے ہیں کہ پہاڑیوں میں جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کی قابلیت اب تک پیدا نہیں ہوئی جو مال ان کے سپرد کر دیا جاتا ہے اُسے وہ راستہ میں ہاتھ نہیں لگا سکتے اور اگر صحیح مقام کا پتہ نہیں چلتا تو اُسے پولیس کی سپردگی میں دے دیتے ہیں جن کی دیانت داری خود مشتبہ ہوتی ہے۔ یہ عادات اُن کی اس وجہ سے قائم ہیں کہ اُن کا اصلی وطن پہاڑوں میں موجودہ تمدن سے دُور ہے۔" صـ۸۸)

مگر افسوس ہے کہ انگریزی راج نے ہندوستان کی ان تمام خوبیوں کو تقریباً مٹا دیا۔ اور ان کے بجائے تمام بداخلاقیاں اور بُرائیاں پیدا کر دیں۔ لارڈ میکالے کہتا ہے۔

"زمانہ سابق میں جس طرح زوردار اور باثر لوگوں کو افیون کے پوست پلا کر کاہل، پست ہمت اور بدعقل بنا دیا جاتا تھا۔ ہمارا انتظام سلطنت اسی طرح اہل ہند کو بے کار کر دے گا۔" (حکومت خود اختیاری)

اخلاقی بربادی کے اسباب و ذرائع

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارکان شرافت و اخلاق سے تہی دامن تھے

مذکورہ بالا بُرائیوں اور کیرکٹر کی کمزوریوں کے اسباب متعدد ہیں۔

اوّل یہ کہ ابتداء میں جن انگریزوں کی آمد و شد اور جن کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ کی ملکیت تھی وہ اصل سے ایسے ہی ذلیل و خوار اخلاق والے تھے۔ اور اکثر ایسے لوگ بھی تھے جو کہ یہاں پر آکے ایسے ہی بدترین اخلاق و اعمال قصداً اختیار کر لیتے تھے۔ کمپنی کے ذمہ دار لوگ ایسوں ہی کو اپنی اغراض کے لئے چنا کرتے تھے۔ چنانچہ مدراس کے بڑے پادری صاحب نے ۱۶۷۶ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کو مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے۔

"آپ کے ملازموں کی بداعمالیوں سے ہندوستانیوں کی نظروں میں آپ کے خدا کی جتنی بے عزتی ہوتی ہے اور آپ کا مذہب جتنا بدنام ہو رہا ہے اس کی کیفیت اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ کے آنسوؤں کی ندیاں بہہ جائیں جو لوگ آتے ہیں ان میں بعض تو قاتل ہیں۔ بعض آدمیوں کو بھگا لیجانے کا کام کرتے ہیں اور بعض انگلستان میں بیویاں چھوڑ کر آتے ہیں اور یہاں پھر شادیاں کر

لیتے ہیں۔"

(برٹش انڈیا کے قدیم کاغذات از وہیلر منڈ) (روشن مستقبل صفحہ ۳۴)

سنہ ۱۶۰۰ء میں جبکہ کمپنی نے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے گورنمنٹ انگلستان کو درخواست دے رکھی تھی اور منظوری کا مسئلہ زیر غور تھا تب گورنمنٹ کی طرف سے کمپنی والوں کو لکھا گیا تھا کہ تم اپنی مہم میں سرایڈورڈ مائیکل بوردن کو نوکر رکھ لو تو اس کے جواب میں کمپنی کا عجیب وغریب حسب ذیل ریزولیوشن بھیجا گیا۔

"کسی ذمہ داری کے کام پر جنٹل مین کو نہ رکھا جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ ہمیں اپنے کاروبار کے لئے اپنے ہی قسم کے لوگوں کا انتخاب کرنے کی اجازت دی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرفاء کو نوکر رکھنے سے (کمپنی کے) عوام الناس (حصہ دار) شبہ میں پڑ کر روپیہ واپس لینے لگیں۔"

(تاریخ برٹش انڈیا مصنفہ جیمس مل صفحہ ۲۳) (روشن مستقبل صفحہ ۳۵)

مذکورہ بالا شہادتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے چھٹے ہوئے بدمعاش بدکار رنگڑے اور لوفر جرائم پیشہ لوگ ہندوستان بھیجے جاتے تھے ایسے لوگوں کے اقتدار اور ان کی کثرت سے جو کچھ نتائج قبیحہ پیدا ہوں گے وہ ظاہر وباہر ہیں۔ علاوہ ازیں جو انگریز انگلستان میں جرائم پیشہ نہیں بھی تھے ان لوگوں کی صحبت اور مالدار بننے کی شدت حرص اور طمع اور سزا سے بے خوفی کی بناء پر یہاں بدترین جرائم پیشہ بن جاتے تھے۔ وارن ہسٹنگس (جو کہ ہندوستان کا مشہور گورنر اور ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیاد رکھنے والوں میں سے نمبر اوّل شمار کیا جاتا ہے) کہتا ہے۔

"انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے۔ جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرأت کر ہی نہیں سکتا ہندوستان میں اُن کے ارتکاب کیواسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اُس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا"۔

(علم المعیشۃ برنی صفحہ ۵۸۹)

یہ ہسٹنگس صاحب وہی ہیں جنہوں نے انتہائی وحشت اور بربریت سے روہیلہ قوم اور ان کی حکومت کو محض تھوڑے سے لالچ میں نواب اودھ سے ساز باز کر کے برباد کر ڈالا۔ جن کی ملعون بداعمالیوں کا پول اس مقدمہ کی مسل سے کھلتا ہے جو اُن پر انگلستان

میں قائم کیا گیا تھا مگر ایسے وحشی درندے بھی اس زمانہ کے انگریزوں کی بداعمالیوں کے شاکی ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے کیسے لوگ یہاں آئے اور انہوں نے کیسی کیسی زہریلی گیس ہندوستان میں پھیلائی ٹامس سڈ ہنسہم کہتا ہے۔

"میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں کہ بمقابلہ اور قوموں کے انگریز غیر ممالک میں سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش آرہا ہے۔"

(علم المعیشۃ برنی صفحہ ۵۸۹)

ہسپانیوں وغیرہ کے شرمناک مظالم امریکہ وغیرہ میں تو مشہور ہیں ہی مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انگریزوں نے جو مظالم اور ملعون بداعمالیاں ہندوستان میں کی ہیں وہ ڈچوں، پرتگیزوں، ہسپانیوں وغیرہ کے مظالم سے بدرجہا زائد اور ننگ انسانیت تھے اور ان کا کیرکٹر سب سے زیادہ گرا ہوا تھا۔ ایسے کیرکٹر والوں کی وجہ سے جو کچھ بربادی اخلاق اور اعمال کی اور جس قدر ان کی وجہ سے ملک کی ابتری پیدا ہو وہ ظاہر باہر ہے۔

ان بداعمال اور بداخلاق نجس کیرکٹر والے انگریزوں نے حسب طبع اپنے گردا گرد ایسے ہی جرائم پیشہ بد اطوار لوگوں کو جمع کر لیا اور اُن کے ذریعہ سے لوٹ مار غارت گری اور انسانیت سوز مظالم کا بازار گرم کر دیا۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز ٭ کبوتر با کبوتر باز با باز

مسٹر سی ہل کہتا ہے۔

"جس زمانہ میں کمپنی کی ملازمت محض تجارتی تھی اور کمپنی کے ملازمان ملک کے حالات سے ناواقف تھے تو وہ اکثر چھوٹے ملازموں سے جو بنئے کہلاتے تھے کام لیا کرتے تھے۔" (روشن مستقبل صفحہ ۱۵)

مسٹر برک ان بنیوں کے متعلق مندرجہ ذیل کلمات لکھتا ہے۔

"بنیا یا دیوان انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا ہے۔ وہ ان تمام چال بازیوں فریب اور عیاریوں سے واقف ہوتا ہے جو مظالم کی سزا سے بچنے کے لئے ایک غلام استعمال کرتا ہے۔ بنیا لوٹتا ہے۔ استحصال بالجبر کرتا ہے۔ غارت گری کرتا ہے اور پھر اس میں سے جس قدر مناسب سمجھتا ہے اپنے صاحب کو بھی دے دیتا ہے۔ ان بنیوں نے بڑے بڑے گھر اُلٹ دیئے ہیں ملک کو برباد

کر دیا ہے اور سرکاری مالگذاری کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔"

خود حکام وقت (انگریز) ان کے ذریعہ سے ذاتی نفع حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے علاقے بنیوں کے نام ٹھیکے پر دیئے جاتے تھے لیکن اصلی ٹھیکہ دار کوئی بااختیار انگریز ہوتا تھا جو خود پردہ میں رہتا تھا۔ چنانچہ انہیں انگریز ٹھیکہ داروں کی بدولت پُرانے پُرانے شریف اور خاندانی ہندو اور مسلمان اپنی اپنی زمینداریوں سے جبراً اور ملک کے دستور کے خلاف بے دخل اور محروم کر دیئے گئے۔

اس وقت کے قانون کی رُو سے ایک شخص کو ایک لاکھ سے زیادہ مال گزاری کا ٹھیکہ دینا جائز نہ تھا مگر بڑے بڑے صاحب لوگوں کے بنئے قانون سے آزاد تھے۔ خود وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کا بنیا کنتو بابو تیرہ لاکھ کا ٹھیکیدار تھا۔ (برک مقدمہ ہسٹنگز جلد اوّل صہ ۱۳۹)

ایک دوسرا بنیا گنگا گوبند بھی وارن ہسٹنگز کا آلہ کار تھا اور اس کی نسبت دارالعوام میں جولائی ۱۷۸۵ئ میں ایک حساب دکھایا گیا تھا جس کی رُو سے گنگا گوبند سنگھ کی کمائی تین کروڑ بیس لاکھ روپے کے قریب پہنچتی تھی۔ (برک مقدمہ ہسٹنگز جلد اوّل صہ ۲۱۳)

اسی طرح گورنر کے دیوان رام چند کی نسبت بیان کیا گیا تھا کہ وہ ساٹھ روپے ماہوار کا ملازم تھا مگر اُس نے ساڑھے بارہ کروڑ کے قریب ترکہ چھوڑا۔ کمپنی کے ایجنٹ روپ کشن کے پاس اتنی دولت تھی کہ اُس نے ماں کے مرنے پر نو سے لاکھ روپیہ صرف کیا۔ یہی وہ بنئے تھے جن کو خاک سے اُٹھا کر انگریزوں نے آسمان پر پہنچا دیا۔ پہلے ٹھیکوں کے ذریعہ بڑی جائدادوں پر قابض ہوئے اور پھر دوامی بندوبست کے بعد مالک بن گئے۔ آگے چل کر سود وغیرہ محدود کر دیا گیا۔ اور قرضوں میں اراضیاں اور جائدادیں نیلام ہونے کا قانون نافذ کیا گیا۔ ان قوانین سے قدیم شریفوں اور سیٹھوں کے گھرانے برباد ہو گئے اور بڑے بڑے علاقے ان نئے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ پُرانے زمینداروں پر ان بنیوں نے جو جو ظلم کئے اور جن جن فریبوں کے ساتھ انہیں لوٹا اس کا اندازہ صرف دیبی سنگھ کی مثال سے ہوسکتا ہے دیبی سنگھ بھی کلکتہ کی حکومت کے محبوب بنیوں میں سے تھا چنانچہ بنگال کے بڑے بڑے علاقے اسی کو ٹھیکہ پہ دیئے گئے تھے۔ دیبی سنگھ آبرودار لوگوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر حوالات میں رکھتا اور اضافہ کا اقرار کرتا تھا اُس نے مال گزاری کے علاوہ نئے نئے محصول اور ابواب ایجاد کر لئے تھے۔ اور جب زمیندار پر بقایا ٹوٹتی تو اس کی زمینداری سستے داموں نیلام کرا کر

خود مول لے لیتا اور یہ قیمت بھی اسی روپیہ سے ادا کرتا جو انہیں زمینداروں سے پیشگی وصول کر چکا ہوتا۔ اس ہٹیئے نے اکثر معافیاں چار چار آنہ بیگہ کے حساب سے مول لے لی تھیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ علاقے کے علاقے ویران ہو گئے اور بقول مسٹر برک زمیندار گھر بار اور نوکر چاکر سب چھوڑ کر نکلے اور بھاگنے سے پہلے اپنی آنکھوں دیکھ لیا کہ وہ اوقاف نیلام ہو رہے ہیں جو انہوں نے یا اُن کے بزرگوں نے خدا کی راہ میں اس لئے دے رکھے تھے کہ اُن کی آمدنی سے بیواؤں، یتیموں، لنگڑے، لولوں اور اپاہجوں کی امداد کی جائے۔ وہ جائدادیں بھی جو انہوں نے کفن دفن اور مرنے کی رسموں کے لئے علیحدہ کر رکھی تھیں فروخت کر دی گئیں افسوس کہ جاں کنی کے وقت سکون اور اطمینان سے گذر جانے کا سہارا بھی اس ظالم ہاتھ نے قطع کر دیا۔ اُف کیسا ظالم ہاتھ تھا جس کا ظلم چتا کی آگ سے زیادہ جلانے والا، قبر سے زیادہ حریص اور موت سے زیادہ بے رحم تھا۔" (روشن مستقبل صفحہ ۵۲-۵۳-۵۴ از برک کی تقریر جلد اوّل صفحہ ۲۱۹-۲۲۰)

سر ولیم وڈربرن لکھتا ہے۔

"بالعموم ہمارے اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنے خلاف مزاج سچّی باتیں ناگوار معلوم ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے وہ لوگوں کے معتمد علیہ اشخاص کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے اور اپنی مراعات و کرم ان لوگوں کے لئے مخصوص رکھتے ہیں جو ذلیل ترین، خوشامدی اور ہندوستانیوں کے مفاد کے لئے سخت خطرناک جماعت ہے۔" (حکومت خود اختیاری صفحہ ۵ از تقاریر و تحاریر وڈربرن صفحہ ۲۰۴/۲۰۸)

پھر یہی نہیں ہوا کہ ایسے جرائم پیشہ بد اخلاق اور بد اعمال لوگ ایک مرتبہ آکر ملک میں بس گئے بلکہ ایسے لوگوں کی آمد کا دوامی طور پر تانتا باندھ دیا گیا۔ ہر سال ایک جماعت اپنی حرص و آز پوری کر کے اور چند سال یہاں لوٹ مار غارت گری و حشیانہ درندگی عمل میں لا کر لوٹتی تھی اور دوسری جماعت ویسی ہی آدھمکتی تھی۔ اس قسم کے لوگوں کی شکایت میں کرناٹک کے بد قسمت نواب نے ڈائرکٹر ان کمپنی کو حسب ذیل مضمون کا خط لکھا تھا۔

"آپ کے نوکروں کا اس ملک میں کوئی کاروبار تو ہے نہیں۔ نہ آپ انھیں معقول تنخواہیں دیتے ہیں پھر بھی چند ہی سال میں وہ کئی کئی لاکھ اشرفیاں کما کر واپس جاتے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں بغیر کسی ظاہری ذرائع کے یہ بے حساب

کمائی کہاں سے آتی ہے ہم اور آپ دونوں سمجھتے ہیں۔"

(روشن مستقبل ص۳۸ از تصانیف برک جلد ۳ ص۱۹۷)

دُوسری جگہ برک کہتا ہے :-

"تاتاریوں کی یورش سے بیشک ہندوستانیوں کو نقصان پہنچتا تھا مگر ہماری حفاظت ہندوستان کو تباہ کئے ڈالتی ہے۔ نوعمر لونڈے ملک پر حکومت کر رہے ہیں۔ جہاں کے باشندوں سے نہ اُن کا میل جول ہے اور نہ اُن سے ہمدردی ہے۔ دولت کی ہوس اور تیز مزاجی جتنی کہ کسی جوان میں ہو سکتی ہے وہ ان لوگوں میں بھری ہوئی ہے اور ملک میں اُن کی آمد کا تانتا لگا ہُوا ہے ایک کھیپ لوٹتی ہے تو دوسری پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستانی رعایا کے سامنے مستقبل کی صرف ایک مایوس کُن صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک غیر محدود زمانہ تک ان موسمی شکاری پرندوں کے نئے غول اسی طرح آتے جاتے رہیں گے جن کی بھوک ہر مرتبہ اور تیز ہوتی رہے گی۔ دراں حالیکہ جس چیز کے وہ بھوکے ہیں وہ کمیاب ہوتی جائے گی۔"

(روشن مستقبل ص۴۹ از تصانیف برک جلد ۳ ص۷۸ و ۹ے)

خلاصہ یہ کہ ایسے بدکردار انگریزوں کے اقتدار ان کے گوشہ گوشۂ ملک میں پھیل جانے اور آزادانہ طور پر ایسی بداعمالیاں کرنے سے ملک کی ثروت اور دولت تو برباد ہوئی ہی تھی، ان لوگوں کے اخلاق اور اعمال بھی بہت زیادہ بگڑ گئے جو انگریزوں کے حاشیہ نشین اور ارکان تھے۔ وہ انگریزوں کی حمایت حاصل کر کے ہر قسم کے خطروں سے اپنے آپ کو محفوظ پاتے تھے اور من مانی کارروائیاں کرتے تھے۔ نیز عام ہندوستانیوں پر یہ اثر پڑا کہ جو عادتیں اور اخلاق پہلے سے بُری سمجھی جاتی تھیں اُن کی بُرائی ان کے دلوں سے جاتی رہی۔ کیوں نہ ہو الناس علی دین ملوکہم اس لئے عام طور پر جعلسازی، بداخلاقی، بدعہدی، ظلم و ستم پھیل گئے۔ فالی اللہ المشتکی۔

دوم یہ کہ انگریزوں کی بے آئینی اور ریا آئینی (جن کے وہ ہی خود وضع کرنے والے تھے) لوٹ اور غارت گری، دولت اور ذرائع۔ دولت کی بربادگی کی بناء پر لاکھوں اور کروڑوں افراد اور خاندان فاقہ مست اور کنگال ہو گئے۔ اس لئے جان بچانے اور دنیاوی زندگی

سنبھالنے کے لئے لوگ ہر قسم کے جرائم اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور اُن اخلاق اور عادات میں مبتلا ہو گئے جو کہ شرافت انسانی کے لئے ننگ و عار ہیں اور جن کو وہ مذہبی یا اخلاقی حیثیت سے بُرا سمجھتے تھے ملعون غلامی اور ہلاک کر دینے والے فقر و فاقہ نے ان کو ایسی عادتوں کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ سر جان شور جس کا تعلق بنگال سول سروس سے تھا قانون اور نظام انگریزی پر بحث کرتے ہوئے ۱۸۳۳ء میں کہتا ہے۔

"لیکن ہندوستان کا عہد زریں گذر چکا ہے، جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اس کا جزو اعظم (بڑا حصہ) ملک کے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے اور اس کے قدرتی عمل اس بدعملی کے ناپاک نظام نے معطل کر دیئے ہیں۔ جس نے لاکھوں نفوس کی منفعت کو چند افراد کے فائدے کی خاطر قربان کر دیا ہے۔

برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ان پرانے تاجروں پر جلد تباہی آ گئی۔ انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔"

(حکومت خود اختیاری ص ۲۷-۲۶)

مسٹر سیول میرٹ ممبر کونسل ۱۸۳۶ء میں لکھتا ہے:۔

"برطانیہ کا دورِ حکومت مہربان و مقبول بنایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہنچ گیا ہے اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس وقت لوگ خوشحال تھے۔۔۔۔۔۔ یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا ہے۔" (حکومت خود اختیاری ص ۲۸)

افلاس اور غربت کے انتہائی درجہ پر پہنچ جانے کے بعد طبعی طور پر انسان ایسے اخلاق اور اعمال کا مرتکب ہو جاتا ہے جو کہ نہ صرف شرافت اور اعلیٰ معیار کے مخالف ہوں بلکہ وہ عموماً انسانیت سے گذر کر درندگی اور وحشت و بربریت کے بدترین مظاہروں پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ چوری کرنے، اور چھچے پن کو عمل میں لانے ڈاکے ڈالنے، لوگوں کو قتل کرنے ٹھگی اور دھوکہ بازی کو اختیار کرتے، بے حیائی اور فواحش کے کرنے اور کرانے اور اس قسم کے دیگر نجس اور مکروہ اعمال کا بیشتر ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ انگریزوں

نے عموماً ہندوستانیوں کے ساتھ کسی ہمدردی کا کبھی خیال نہیں کیا یہ پردیسی اور غیر قوم تھے روپیہ کمانے اور ہندوستان کو لوٹ کر اپنا خزانہ بھرنے کا نصب العین دن رات اُن کے سامنے رہتا تھا اُن کو کوئی التفات ہندوستانیوں کی بہبودی کی طرف نہ تھا ان کی بلا سے ہندوستانی جئیں یا مریں، ان کا کیرکٹر بنے یا بگڑے اُن کو تو اپنا اُلّو سیدھا کرنا تھا۔ سرجان سیلمان (اپنی شہادت میں) کہتا ہے۔

"ملک کے تمام ذمّہ داری کے عہدوں سے ہندوستانیوں کے خارج ہونے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ انتظامی قابلیت کے نشوونما کرنے کے مواقع جاتے رہے اور جو کچھ بھی اُن کی قابلیت تھی وہ رفتہ رفتہ زائل ہوگئی۔ اس کے ساتھ اُن کے مالی تنزل نے اُن کے کیرکٹر کو اُس درجہ تک گرا دیا جس پر مظلوم اور محکوم قومیں پہنچ جاتی ہیں۔" (حکومت خود اختیاری صفحہ ۱۵)

لارڈ منٹو وائسرائے ہند نے ۱۸۱۱ء میں ایک طویل یادداشت لکھ کر کورٹ آف ڈائرکٹران کو بھیجی جس میں یہ دکھایا کہ "علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہے۔ ہندو مسلمانوں کی مذہبی تعلیم نہ ہونے سے دروغ حلفی اور جعلسازی کے جرائم بڑھ رہے ہیں اور سفارش کی کہ متعدد کالج قائم کئے جائیں اور تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے۔" (روشن مستقبل صفحہ ۲۲۷)

سوم یہ کہ حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں سے ہندوستانیوں کو ایک قلم خارج کرکے تمام بڑے عہدوں پر انگریزوں نے انگریزوں ہی کو مقرر کیا بلکہ حسب تصریح سرجان شور جس ادنیٰ سے ادنیٰ عہدے کو انگریز قبول کر سکتا تھا اُس پر انگریز ہی کو مقرر کیا ہاں جو عہدے بہت چھوٹے تھے ان سے مسلمان ملازمین کو نکال کر ہندوؤں کو مقرر کیا کیونکہ وہ انگریزوں کی پوری چاپلوسی کرتے تھے اور انگریزوں کی خواہشات کو پوری کرنے میں کسی بداخلاقی اور بدعملی سے دریغ نہیں کرتے تھے خواہ وہ کیسی ہی اور کتنی ہی ہندوستانی قوم کے لئے مضر کیوں نہ ہو جن کے کچھ واقعات ہم نے پہلے اُن بنیوں کے جو کہ صاحب لوگوں کے مقرب ہوتے ہیں وجہ اوّل میں بطور نمونہ ذکر کر دیئے ہیں۔ حالانکہ شہنشاہ دہلی سے جو فرامین انگریزوں نے حاصل کئے تھے اور جن کے ذریعہ سے دیوانی کے اختیارات ان کو ملے تھے اُن میں شرط تھی کہ وہ ان شاہی نظامات کی جو کہ پہلے سے چلے آتے تھے پوری طرح حفاظت کریں گے۔ مگر انگریزوں

نے ان نظامات کی بہت تھوڑے دِنوں تک مراعات کی اور پھر رفتہ رفتہ ان کو توڑنا شروع کر دیا کیونکہ اُن کے باقی رکھنے میں انگریزوں کی وہ لالچ اور طمع پوری نہیں ہوتی تھی جس کو وہ اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے اور جس کے لئے وہ تمام ہندوستان کو لوٹ کھسوٹ کر انگلستان کے خزانوں کو پُر کر سکتے اور اپنے افراد کی ملعون خواہشات کو پوری کر سکتے تھے۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں ص۲۲۵ پر لکھتا ہے۔

"بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے۔ قانوناً ہم صرف شہنشاہ دہلی کے دیوان تھے یعنی چیف ریونیو افیسر۔ مسٹر ایچی سن کی دستاویزات میں ۱۲/ اگست ۱۷۶۵ء کا فرمان یا ایسٹ انڈیا کمپنی کی سہ ماہی رپورٹ ۱۸۱۲ء رپورٹ ع۱۴ سے لے کر ع۲۰ تک)
اسی بنا پر مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہم کو اسی اسلامی طریقہ پر کاربند رہنا چاہیئے جس کے انتظام کا ہم نے اس وقت ذمہ لیا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقع یہی تھا"

پھر صفحہ ۲۲۸ پر اسی کتاب میں لکھتا ہے۔

"سو سب سے بڑی ناانصافی وہ ہے جس کا مسلمان امراء انگریزی حکومت کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے لیکن جوں ہی ہم نے اپنے آپ کو طاقت ور پایا اس وعدے کو فراموش کر دیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظام دیوانی کا مطالعہ کیا تو اس قدر ایک طرفہ، اس قدر ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اس کو برقرار رکھتے تو تہذیب کے لئے باعث ننگ ہوتے"

بہرحال انگریز بحیثیت ملازمت شہنشاہی فرمانوں اور معاہدوں اور شروط کے ذریعہ سے مالیات کے ناظم بنائے گئے تھے جن میں اسلامی نظام کو برقرار رکھنا مشروط تھا۔ مگر اُنہوں نے رفتہ رفتہ سب کو توڑ ڈالا اور تمام عہدوں سے ہندوستانیوں کو نکال کر انگریزوں اور خوشامدی

ہندوؤں سے بھر دیا۔ اور نیا نظام ایسا بنایا کہ جس کا خرچ بہت زیادہ تھا۔ اور انگریزوں کے لئے ہندوستانیوں کے خون چوسنے کا بہت زیادہ سامان ہاتھ آتا تھا۔ مگر انگریزی عیاری یہ تھی کہ خلاف واقفیت پورے نظام کو ایک طرفہ، اصول انسانیت کے خلاف، ناکارہ تہذیب کے لئے باعث ننگ قرار دیا جا رہا ہے (جیسا کہ ڈاکٹر ہنٹر اور بہت سے دوسرے انگریز پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں) حالانکہ یہ بات انگریزی نظام میں پائی جاتی ہے۔ پُرانے نظام کو ایسا کہنا برعکس نہند نام زنگی کافور کا مصداق ہے۔ پُرانا نظام جبتک رہا ہندوستان بانفاق پھیلتا اور پھولتا اور ترقی پذیر رہا۔ اور جب سے یہ نیا نظام انگریزی قائم ہوا ہندوستان روز بروز بربادی کے بھینٹ چڑھتا رہا اور بالآخر ہلاکت کے انتہائی مرحلہ پر پہنچ گیا۔ جیسا کہ سرجان شور ببیول میرٹ ڈبلوجی پیڈر، وڈربرن وغیرہ کے اقوال بتلا رہے ہیں۔

مسٹر فلپ فرانسس جو کہ بنگال کونسل کا ممبر تھا لکھتا ہے۔

”ایک انگریز کو یہ معلوم ہو کر تکلیف ہونی چاہیئے کہ جب سے کمپنی کو دیوانی ملی ہے اہل ملک کی حالت پہلے سے بدتر ہوگئی ہے اور یہ کمپنی کی تجارت وغیرہ کا نتیجہ ہے۔ میرے خیال میں یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ ملک ایک شخصی اور مطلق العنان حکومت کے زیر سایہ تو سرسبز ہوتا رہا مگر جب انگریزوں کے تصرف میں آیا تو تباہی کے کنارے پہنچ گیا۔“ (حکومت خود اختیاری صفحہ ۶۹ انان ہیپی انڈیا صفحہ ۳۳۴)

ڈبلوڈبلو ہنٹر لکھتا ہے (ہمارے ہندوستانی مسلمان) ۲۲۶

”انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمان عہدہ داروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اٹھائے کہ اس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پُرانے طریق کار پہ لگائی وہ اس قدر پُر فریب تھی کہ اس کا اندازہ پیش از وقت نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو میرا مطلب اُن تبدیلیوں سے ہے جو لارڈ کارنوالس نے جاری کیں اور جن سے ۱۷۹۳ء کا دوامی بندوبست مرتب ہوا۔ اس بندوبست سے ان مسلمان افسروں کا کاروبار زیر دستی ہمارے ہاتھ میں آگیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنے والوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے اور جن کے

سپاہیوں کو مالگزاری جمع کرنے کا جائز حق پہنچتا تھا۔"

بہرحال انگریزوں نے عروج اور قوت پاتے ہی تمام ہندوستانیوں کو ذمّہ دار عہدوں سے خارج کردیا جیساکہ صاحب حکومت خود اختیاری لکھتا ہے "ہندوستان میں انگریزی عملداری کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہندوستانی ابتداء سے بڑے عہدوں سے خارج کردیئے گئے۔ قوانین بنانے میں اور ملک کے درمیان انصاف کرنے میں اُن کا کوئی اختیار باقی نہیں ہے۔ عملداری کی اس خصوصیّت کے مضر اثرات کا اندازہ منجملہ دیگر انگریزوں کے سرطامس منرو کو بخوبی ہوا جس کا اظہار انہوں نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"قوانین کے عملدرآمد میں ان کو بہت کم دخل ہے۔ باستثناء چند نہایت چھوٹے عہدوں کے کسی بڑے عہدہ تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول، نہیں پہنچتے وہ ہر جگہ ایک ادنیٰ قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں۔۔۔۔ تمام فوجی اور دیوانی عہدے جو کچھ بھی اہمیّت رکھ سکتے ہیں اب یورپینوں کے قبضہ میں ہیں جن کا پس انداز روپیہ خود اُن کے ملک کو چلا جاتا ہے۔"

اس طرح ذمّہ دار عہدوں سے نکل جانے کی بناء پر ہندوستانیوں کے کیرکٹر اور اخلاق پر نہایت مضر اور ہلاکت آفریں اثر پڑا اور وہ بدترین اخلاق میں مبتلا ہوگئے۔ چنانچہ سرتھامس منرو ۱۸۲۳ء میں لکھتا ہے۔

"اگر برطانیہ کسی بیرونی سلطنت کا مفتوحہ ملک ہوجاتا اور اس کے باشندے اپنے ملک کے انتظامات سے خارج کردیئے جاتے تو اُن کے تمام علوم اور تمام علم و ادب خواہ وہ مذہبی ہوں یا دنیوی اُنہیں ایک یا دو نسلوں کے بعد کمینہ، چالاک، دغاباز اور بے ایمان قوم ہوجانے سے نہ بچا سکتا تھا۔"

(حکومت خود اختیاری صہ ۱۹)

لارڈ میکالے کہتا ہے:۔

"زمانہ سابق میں جس طرح زردار اور باثر لوگوں کو افیون کے پوست پلاکر کاہل، پست ہمّت اور بدعقل بنا دیا جاتا تھا۔ ہمارا نظام سلطنت اسی طرح اہل ہند کو بے کار کردے گا۔" (حکومت خود اختیاری صہ ۲۰)

مسٹر لڈلو اپنی کتاب برٹش انڈیا میں لکھتا ہے:۔

"انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان فتح ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے اُبھرنے کے اس کے تمام باشندے ذلیل ترین ہو جائیں گے"۔ (حکومت خود اختیاری ص ۱۹)

چنانچہ یہی نتیجہ ہوا کہ انگریزی حکومت کی صدسالہ حکومت نے ہندوستانیوں کو اخلاقی اور کیرکٹری حیثیت سے انتہائی پستی میں ڈال دیا۔ سر تھامس منرو کہتا ہے:۔

"انگریزی صوبجات کے رہنے والے فی الواقع ہندوستان میں حد سے زیادہ ذلیل اور کمینے ہیں"۔ (حکومت خود اختیاری ص ۱۹)

الحاصل سینکڑوں زمیندار، ہزاروں سپاہی اور بے شمار ملازم بے روزگار ہو گئے اور انہوں نے لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ ناگپور سے لے کر خلیج بنگال تک تیئس ہزار پنڈاری لوٹ مار کرتے پھرتے تھے جنہوں نے ۱۸۱۹ء کے موسم سرما میں صرف دس دن کے اندر (۱۸۲) آدمی قتل کئے (۵۰۰) زخمی کئے۔ تین ہزار کو طرح طرح کی ایذائیں دیں اور تقریباً ایک کروڑ کا مال لے گئے۔ (روشن مستقبل ص ۱۵۰ از "اغیار کے گھر سے" از فیسٹنگ ص ۲۵)

چہارم ہائی کورٹ، سپریم کورٹ اور تمام ادنیٰ کورٹوں کے وہ قوانین اور کارنامے ہیں جن کا تعلق مالیات سے یا فوجداری یا انتظامی امور وغیرہ سے ہے۔ یہ سب قوانین عدل و انصاف اور ان کی عملی کارروائیاں زمانہ سابق میں نہایت سادہ اور بے خرچ تھے۔ ان میں فریقین کو نہ دور دراز کے اسفار کی زحمتیں پیش آتی تھیں نہ مہینوں اور سالوں کے انتظار اور دوڑ دھوپ کی تکالیف ہوتی تھیں۔ نہ سرمایہ اور دولت کی بربادی کی مصیبتیں سامنے آتی تھیں۔ ان قوانین کی رُو سے عموماً حقیقی اہل حق اپنے حق کو پہنچ جاتے تھے۔ عیاری، مکاری، فریب و دھوکہ بازی رشوت اور جعلسازی وغیرہ پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ ان کے اجراء کے دو طریقے تھے۔ ایک رعایا کی طرف سے دوسرا بادشاہوں کی طرف سے۔ ہر دو طریق میں رعایا پر ایک پیسہ کا بھی بار نہیں پڑتا تھا۔ اوّل الذکر کا یہ حال تھا کہ رعایا کی طرف سے گاؤں گاؤں میں پنچایتیں قائم تھیں جو کہ بمنزلہ حکومت خود اختیاری کے تھیں۔ گاؤں کے پنچ مدعی اور مدعا علیہ کے چال چلن اور ان کی عادتوں اور اخلاق، مقامی رسوم اور حالات سے بخوبی واقف ہوتے تھے، گواہوں اور قسم کھانے والوں کو بخوبی

پہچانتے تھے، فریقین کی زبانوں کو جانتے تھے اس لئے عموماً فیصلے صحیح اور حقانی یا قریب قریب صحیح کے ہونے تھے۔ ہر گاؤں کے جھگڑوں کا فیصلہ وہیں یا وہیں کے قریبی مقام میں ہو جاتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی بدچلن یا بدمعاش گاؤں میں رہ سکے کیوں کہ گاؤں کی پنچائیت کو اختیار تھا کہ وہ بدمعاش بدچلن اور چوُر کو سزا دے سکے۔

سر طامس منرو اسی پنچائتی نظام کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ لکھتا ہے:۔

"ہر موضع مع اپنے بارہ پوروں کے مثل ایک چھوٹی سی ریاست کے ہے جس میں اس کے مقدم پٹیل یا راڈی بطور اس کے سردار کے ہیں۔ اور ہندوستان اسی قسم کی ریاستوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے جنگ کے زمانہ میں باشندوں کی نظر اپنے گاؤں کے سردار کی طرف ہوتی ہے جب تک کہ ان کا موضع محفوظ اور سالم ہے گاؤں کے باشندے سلطنتوں کے ٹوٹنے اور تقسیم ہونے کے بارہ میں اپنے آپ کو تکلیف نہیں دیتے وہ اس امر کی پرواہ نہیں کرتے کہ ملک کس کے ہاتھ میں منتقل ہوتا ہے۔ ہر صورت میں اندرونی نظام غیر مبدل رہتا ہے۔ ان تمام حالات میں گاؤں کا سردار بدستور اپنے گاؤں کا کلکٹر مجسٹریٹ اور کاشتکاروں کا سردار رہتا ہے"

(حکومت خود اختیاری صک)

ثانی الذکر یعنی پادشاہوں کی طرف سے جو طریقہ انصاف کا جاری تھا اسکی کیفیت یہ تھی کہ پادشاہوں کی طرف سے ایسی عدالتیں قائم کی گئی تھیں جو کہ برائے نام شاہی تھیں مگر اُن پر بادشاہ کا اثر نہیں تھا۔ ان میں مسلمانوں کے معاملات قرآن شریف اور فقہ (اسلامک لاء) کی رُو سے اور ہندؤوں کے معاملات دھرم شاستر کی رُو سے طے ہوتے تھے اور اُن کی طاقت کی یہ کیفیت تھی کہ ذاتی امور میں بادشاہ بھی مفتیوں کے فتوؤں اور شرعی فیصلوں کے تابع ہوتے تھے۔ اس مضمون کو انگلستان کے مشہور مقرر اڈمنڈ برک نے پارلیمنٹ کی ایک تقریر میں خوب واضح کیا تھا جس کے چند الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"جناب والا میں ایشیا کی حکومتوں کی نسبت جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن میں سے کسی کو خود سری کے اختیارات حاصل نہ تھے اور اگر کسی کو تھے تو وہ انہیں کسی دوسرے کو سپرد نہ سکتا تھا میں پُر زور الفاظ میں کہہ سکتا ہوں

مشرقی ممالک کی حکومتیں خود مختارانہ اختیارات کا نام تک نہیں جانتیں ایشیاء کا بڑا حصّہ مسلمان حکمرانوں کے تحت میں ہے اور اسلامی حکومت کے معنے ہی قانونی حکومت کے ہیں۔ عیسائی بادشاہوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قانون میں بدرجہا زیادہ مضبوطیاں ہیں اُن کا اپنے قانون کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے اس لئے رعایا سے لیکر بادشاہ تک سب کے سب یکسانیت کے ساتھ قانون اور مذہب دونوں کے پابند ہیں اگر کوئی شخص قرآن کی ایک آیت بھی اس مضمون کی دکھا دے کہ اس کی رُو سے کسی کو خود مختارانہ اختیارات حاصل ہیں تو میں تسلیم کروں گا کہ میں نے اس کا اور ایشیا کے حالات کا بیکار مطالعہ کیا ہے۔ قرآن شریف میں ایک لفظ بھی اس بارہ میں نہیں ہے برخلاف اس کے اس قانون کا ہر ہر حرف ظالموں کے خلاف گرج رہا ہے۔ اس قانون کی شرح کرنے والے علماء یا قاضیوں کا طبقہ موجود ہے جو اس کا محافظ قرار دیا گیا ہے اور جو بادشاہ کی ناراضی سے محفوظ ہے اور جسے بادشاہ ہاتھ نہیں لگا سکتا ان کے بادشاہوں تک کو حقیقی اعلیٰ طاقت حاصل نہیں ہے بلکہ وہاں کی حکومت ایک حد تک جمہوری ہے ''

(روشن مستقبل صفحہ ۲۰/۱۹ از تقاریر ایڈمنڈ برک جلد اوّل صفحہ ۱۰۴/۵۱)

برخلاف اس کے اب بجائے مواضعات کے صدر مقامات میں جو گاؤں سے تیس چالیس میل یا کم و بیش فاصلہ پر ہوتے ہیں جا کر انصاف ہوتا ہے۔ اور پھر انصاف ہونے کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ کے پاس کافی روپیہ اور اثر ہو۔ اور جو شخص جائز و ناجائز طریقوں سے روپیہ کما کر عدالتوں میں اور حکام کے یہاں حاضری دیتا رہتا ہے وہ تمام گاؤں پر غالب ہوتا ہے پھر متوسط لوگوں کی آمدنی چونکہ بہت زیادہ گھٹ گئی ہے اور گھٹتی جا رہی ہے اس لئے وہ عدالتی کارروائیوں کے اخراجات نہیں اٹھا سکتے۔ اب کلکٹر صاحب کے ہاتھ میں سب اختیارات ہیں۔ وہ گاؤں سے فاصلہ پر بہت دور رہتے ہیں۔ ہندوستانیوں بالخصوص غیر انگریزی تعلیمیافتہ اور دیہاتیوں اور قصباتیوں سے خلط ملط اپنی کسرِ شان اور خودداری کے خلاف اور اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ کسی کالے اور نیٹو سے بات کرنا انگریزی عزت اور شان و جلال کے بالکل منافی جانتے ہیں۔ اس لئے وہ

ہندوستانیوں کے چال وچلن سے واقف نہیں ہیں۔ گاؤں کا بدترین شخص حکام رسی کر کے اپنا اثر اور رسوخ قائم کر لیتا ہے اور کلکٹر صاحب سے پروانہ تقرر وغیرہ حاصل کر کے لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے۔ کاش یہ حالت حکام اور عدالتوں تک ہی محدود رہتی تب بھی ضرر اور نقصان برداشت کیا جا سکتا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ عدالتیں تمام ملک کے لئے مرکز اور نمونہ بن گئیں ہیں۔ مثلاً ہر روز ملک کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے اشخاص کسی نہ کسی حیثیت سے انہیں عدالتوں کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ جو ممالک اس وقت برسر عروج ہیں وہاں کے لوگوں کے دماغ، صنعت و حرفت تجارت اور زراعت اور دولت کے ذریعہ سے دولت پیدا کرنے کے طریقوں میں مصروف رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے لوگ جب صبح اٹھتے ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ تو حاکم اور عمال، بیرسٹر اور وکیل، مدعی مدعا علیہ عرضی نویس اور محرر، گواہ اور دلال کی شکل میں کچہریوں کا رخ کرتے ہیں اور جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں وہ تمام دن مقدمات کے نتیجوں کے انتظار میں رہتے ہیں اور رات کو بیٹھکوں اور چوپالوں میں بیٹھ کر نفاذ لگان اور اضافہ لگان، بٹوارہ اور داخل خارج کے چرچوں میں مصروف رہتے ہیں اور ان معاملات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سازشیں کرنے اور جھوٹی شہادتیں مرتب کرنے میں مصروف رہ کر بدترین بد اخلاقیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

لارڈ میکالے لکھتا ہے:۔

"بہت کم انگریز ایسے ہوں گے جو اس امر کو تسلیم نہ کریں گے کہ انگریزی قانون باوجود حالی کی ترقیوں کے نہ تو سستا ہے اور نہ اس کی رو سے فیصلے جلد ہوتے ہیں پھر بھی ہمارے ملک یعنی انگلستان میں اس کا نشوونما ہو گیا۔ بعض امور میں وہ ہمارے محسوسات کے مطابق ڈھال دیا گیا اور بعض امور میں ہمارے محسوسات رفتہ رفتہ اس کے مطابق ڈھل گئے ہیں۔ ہمیں اس کے بدترین نقائص کو برداشت کرنے کی بھی عادت ہو گئی ہے اور اس لئے اگرچہ ہم اس کی شکایت کئے جاتے ہیں۔ تاہم اس کی ہم پر ایسی ہیبت طاری نہیں ہوتی۔ جیسی کہ ایک معمولی سی نئی تکلیف دہ چیز کی ہوتی ہے مگر ہندوستان میں بالکل مختلف حالت پیدا ہو گئی ہے۔ انگریزی قانون

جو انگلستان سے لایا گیا ہے اس میں وہ تمام بُرائیاں ہی موجود نہیں ہیں جن سے ہم انگلستان میں تکلیف اٹھا رہے تھے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہیں اور وہ ایسی بُرائیاں ہیں جس کے مقابلے میں انگلستان کی بدترین بُرائیاں ہیچ ہیں۔ وہ قانون جو کہ انگلستان میں دیر طلب ہے اس ملک میں اس سے کہیں زیادہ دیر طلب ہے جہاں کہ ہر جج کو اور ہر بیرسٹر کو ایک مترجم کی امداد درکار ہوتی ہے۔ اس ملک میں یہ قانون کہیں زیادہ گراں ہے جس میں کہ مشیران قانونی ایک دُور دراز ملک سے لائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ہر انگریز کا معاوضہ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف سے لیکر ایک سائیس یا گھڑی ساز تک کا انگلستان کی شرح سے کہیں زیادہ ادا کیا جاتا ہے..... ان وجوہ سے کلکتہ میں وکلاء کی جو فیس ادا کی جاتی ہے وہ انگلستان کی فیس سے سہ چند ہوتی ہے۔ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے مقابلہ میں اگرچہ بہت غریب ہیں تاہم جو تکلیف دہ تاخیر اور خرچ انگریزی قانون کی وجہ سے پیش آتا ہے وہ اس کو ان نقائص کے مقابلے میں جو اس قانون کے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے موجود ہیں زیادہ اہم نہیں سمجھتے اُن کی عزت ان کی فطرت اُن کے مذہب، ان کی عورتوں کی عفت کے قومی محسوسات کو اس بدعت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مال کی کارروائیوں میں پہلا قدم جو اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ مال گزاری کے بقایا میں لوگ گرفتار کئے جانے لگے۔ درآں حالیکہ ایک معزز ہندوستانی کے لئے گرفتاری محض نظر بندی نہ تھی بلکہ بدترین ذاتی بے عزتی تھی۔ ہر مقدمہ کی ہر منزل پر حلف لئے جانے لگے۔ درانحالیکہ معزز ہندوستانیوں کے نزدیک یورپ کے فرقہ کو بہ نسبت (جو قسم کو معیوب سمجھتا ہے) یہ طریقہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ مشرقی ممالک میں معزز گھرانوں کے زنانخانہ میں غیر آدمی کا داخل ہونا یا عورتوں کے چہرہ کو دیکھ لینا ایسی ناقابل برداشت زیادتی سمجھی جاتی ہے اور اس کو موت سے بھی زیادہ خوفناک خیال کیا جاتا ہے اور جس کا انتقام صرف خونریزی سے لیا جا سکتا ہے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے نہایت معزز خاندانوں کو اس قسم کی بے عزتیوں کا سامنا ہوا۔ اگر ہمارے

ملک میں دفعتہً ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جائے جو ہمارے لئے ایسا ہی نیا ہو جیسا کہ ہمارا قانون ہماری ایشیائی رعایا کے لئے ہے تو یہ خیال کرنے کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی اس وقت کیا حالت ہو جائے گی۔ اگر ہمارے ملک میں یہ قانون نافذ ہو کہ کسی کے قسم کھا لینے سے جس کا قرضہ ہم پر ہے اسے یہ حق ہو جائے گا کہ وہ معزز اور مقدس ترین اشخاص اور پردہ نشین خواتین کی ہتک کر سکے۔ ایک افسر کے بید لگائے جا سکیں۔ ایک پادری کو کٹھرے میں ٹھونسا جا سکے۔ شریف عورتوں کے ساتھ اس طریقہ سے سلوک کیا جا سکے جس کا نتیجہ واٹ ٹائلر[1] جیسا بلوہ ہو۔ تو اس وقت ملک کی جو حالت ہو جائے گی اس کا تصوّر کرنے سے دل کانپتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں سپریم کورٹ (عدالت عالیہ) نے جب اپنے قانون کو اپنے تمام مقبوضات ہند میں وسعت دینے کی کوشش کی تو قریب قریب اسی قسم کی کیفیت یہاں پیدا ہو گئی۔ اس سے ہراس و خوف کا عہد شروع ہو گیا اور وہ خوف اس خیال سے کہ خدا جانے اس کی تہ میں اور کیا کیا مصائب پوشیدہ ہیں بہت زیادہ ہو جاتا تھا یعنی جو مصیبتیں لوگوں پر پڑ رہی تھیں وہ آیندہ پیش آنے والی مصیبتوں کے خوف کے مقابلے میں کم تھیں کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ عجیب و غریب عدالت آگے چل کر اور کیا رنگ لائے گی۔ چونکہ ... ہندوستان کے لوگ سمندر کے نام سے ڈرتے تھے اس لئے وہ خوف زدہ ہو کر کہتے تھے کہ یہ عدالت کالے پانی کے اس پار سے آئی ہے۔ اس عدالت کو ججوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا کہ وہ ان کروڑوں انسانوں کے رسم و رواج سے جن پر وہ بے قید حکومت کرتے تھے واقفیت رکھتا ہو۔ مقدمات کی مثلیں اس خط میں لکھی جاتی تھیں جس سے

---

[1] انگلستان میں رچرڈ دوم کے عہد حکومت سے قبل کاشتکاروں پر بہت سختیاں ہوتی تھیں ۱۳۸۱ء میں ہر بالغ مرد اور عورت پر ایک نیا ٹیکس لگایا گیا تھا جس کی مقدار ایک شلنگ فی کس تھی۔ اس پر کاشتکاروں نے ایک عظیم الشان بلوہ کیا۔ اس بلوہ کا سردار واٹ ٹائلر تھا۔

ہندوستانی قطعاً ناواقف تھے اور فیصلے اس زبان میں صادر کئے جاتے تھے جس سے لوگ بالکل ناآشنا تھے۔ ان عدالتوں کے گرد ہندوستانی آبادی کے بدترین لوگ جمع ہو گئے، یہ لوگ چغلخور جھوٹے گواہ مقدمہ ساز دغاباز اور سب سے بڑھ کر ترقی کرنے والے لوگوں کا وہ گروہ تھا جس کے مقابلہ میں انگلستان کے بدترین پتّے باز نہایت دیانت دار اور رفیق القلب معلوم ہوتے ہیں ...... یہ انگریزی مشیران قانونی جس سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیلے اس سرعت کے ساتھ حملہ آور بھی نہ پھیلے تھے۔ زمانہ سابق کے تمام ایشیائی اور یورپین ظالموں کی غیر انصافیاں سپریم کورٹ (عدالت عالیہ) کے انصاف کے مقابلہ میں برکت معلوم ہوتی ہیں۔"

(حکومت خود اختیاری ص ۱۵، ۱۶، ۱۷ از مکالیز)

خلاصہ یہ ہے کہ ان عدالتوں اور ان کے قوانین سے ہندوستانیوں کے اخلاق اور اعمال پر نہایت ہی زہریلا اثر پڑا اور ان کے اخلاق انتہائی درجہ میں گرتے چلے گئے اور ہر طرف بد اخلاقیوں اور بد اعمالیوں کا دور دورہ ہو گیا۔

(۳) انگریزی دور میں علم سے محرومی

انگریزوں نے ہندوستانیوں کو جاہل بنا دیا

پہلی حالت یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر حکومت کے اوّلین فرائض اور بنیادی اصولوں میں سے یہ امر ہے کہ وہ رعایا میں علم کی روشنی زیادہ سے زیادہ پھیلائے اور اس کے ذریعہ سے ان کے اخلاق انسانیہ اور اعمال معاشیہ میں ترقی دے ان کی جہالتوں اور بدکرداریوں کو دُور کرے۔ ان کو مہذب اور شائستہ اور متمدن بنائے رعایا کے ہر فرقہ اور ہر خاندان کے افراد کو یکساں طور پر مواقع اور سہولتیں تعلیم پانے کی پیدا کرے۔ چنانچہ زمانہ سابق میں ہندوستان میں ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک اس کا انتظام بغیر کسی فیس اور معاوضہ کے کیا جاتا تھا۔ بادشاہوں، نوجوانوں، امراء اور اہل ثروت

کی طرف سے جائدادیں تعلیمی مصارف کے لئے وقف کردی گئیں تھیں۔ اس طرح صوبہ بنگال میں صوبہ کا چوتھائی حصّہ اسی کے لئے وقف تھا۔ جیسا کہ مسٹر جیمس گرانٹ کے تخمینہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ سرکاری خزانوں سے ان کی امداد ہوتی تھی۔ صاحب روشن مستقبل لکھتا ہے۔

"اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ والیان ملک اور امرائے تعلیم کی پوری سرپرستی کرتے تھے اس کے لئے جاگیریں دیتے اور جائدادیں وقف کرتے تھے۔

دہلی کی مرکزی حکومت ٹوٹ جانے پر بھی صرف اضلاع روہیلکھنڈ میں جو دہلی سے قریب تر تھے پانچہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے۔ اور حافظ الملک (نواب روہیلکھنڈ حافظ رحمت خاں مرحوم) کی ریاست سے تنخواہیں پاتے تھے۔" (حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۷۴)

ہر ہر قریہ اور دیہات میں ایسے مدارس موجود تھے جن میں لکھنے پڑھنے، حساب وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی جیسا کہ سر تھامس منرو کا مقالہ ہم نقل کرچکے ہیں۔ کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ کی حالت بتلاتا ہوا لکھتا ہے کہ صرف شہر ٹھٹہ سندھ میں چارسو کالج مختلف علوم وفنون کے تھے۔ وہ لفظ کالج کا لکھتا ہے۔ اسکول، پرائمری اسکول یا مکتب نہیں لکھتا ہے جبکہ دارالسلطنت دہلی سے ایک ہزار میل سے زیادہ دوری پر بستے والے شہر میں اس قدر کالج تھے تو پھر شہر دہلی، آگرہ اور دیگر شہر ہائے یوپی، بہار، بنگال، اڑیسہ، مدراس، بمبئی، سندھ، پنجاب وغیرہ کے بڑے شہروں کے متعلق قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہاں تعلیمی حالت کیا ہوگی۔ مقریزی کتاب الخطط میں لکھتا ہے (بزمانہ محمد تغلق مرحوم) صرف شہر دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔

مسٹر کیر ہارڈی نے میکس مولر کے حوالہ سے لکھا ہے۔

"انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے۔ اس طرح چارسو آدمیوں کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا۔ نبز لڈلو نے تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ ہندوؤں کے ہر موضع میں جو اپنی قدیم حالت پر رہے بچے عموماً لکھ پڑھ سکتے ہیں مگر جس جگہ ہم نے مثل بنگال کے پرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں سے گانوں کا اسکول غائب ہوگیا ہے۔"

(تاریخ باسو جلد پنجم صلا۱۴ روشن مستقبل ص۱۲۴)

اسی طرح انڈین ریفارم سوسائٹی نے جو کہ ۱۸۵۳ء میں انگلستان میں قائم تھی اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے۔

"ہندوؤں کے زمانہ میں ہر موضع میں ایک مدرسہ ہوتا تھا۔ ہم نے چوں کہ دیہاتی کمیٹیوں یا میونسپلٹیوں کو توڑ دیا اس سے اُن کے باشندے مدارس سے بھی محروم ہو گئے۔ اور ہم نے اُن کی جگہ کوئی چیز قائم نہیں کی"

(روشن مستقبل ص۱۲۴)

الحاصل یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ زمانہ سابق میں لکھے پڑھے لوگ زیادہ ہوتے تھے اس کی تصدیق امور مذکورہ بالا کے علاوہ مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر لیبٹر کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ لالہ لاجپت رائے نے اپنی کتاب ان ہیپی انڈیا میں انگریزی سررشتہ تعلیم کے افسروں کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ زمانہ سابق میں ہندوستان میں خواندوں کی تعداد موجودہ زمانہ سے زیادہ تھی۔ (حکومت خود اختیاری ص۸۵)

انگریزی دور اور جہالت کا زور

مگر انگریزوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت اگر ہندوستان میں رہی تو وہ ہماری حکومت کو فنا کر دیں گے اس لئے انہوں نے تعلیم گاہوں کو ملیا میٹ اور تعلیم کو نیست و نابود کر دیا اور تعلیم کی تمام موقوفہ زمینوں کو ۱۸۳۸ء میں سرکاری قبضہ میں لے لیا۔ سر ولیم ڈگبی پوسپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے۔

(ضمن سوال و جواب میجر جنرل سمتھ کے۔ سی۔ بی)

"سوال ع۵۶۳۰ کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کر سکتے ہیں کہ دیسیوں کو اُن کی طاقت کا علم نہ ہو۔

جواب۔ میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چھ کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں جسے آجکل رائے کی بادشاہت کہتے ہیں اس لئے جوں ہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے اُن کے قومی اور مذہبی تفرقے دُور ہو جائیں گے جن کے ذریعہ سے اب تک ہم نے اس ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے یعنی مسلمانوں

کو ہندوؤں کے خلاف کرنا اور علیٰ ہذا القیاس تعلیم کا اثر یہ ضرور ہوگا کہ اُن کے دل بڑھ جائیں گے اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی۔"

(خوشحال برطانوی ہند ترجمہ اسپرس برٹش انڈیا صـ ۱۰۹)

اسی بناء پر انگریزوں نے تعلیم اور تعلیم گاہوں کو برباد کیا اور چونکہ ان کا نصب العین زیادہ سے زیادہ مالی منافع حاصل کرنا تھا اس لئے بھی انہوں نے ہندوستانیوں کو تعلیم دینا اپنے مقاصد کے خلاف سمجھا۔ بہرحال تھوڑے سے ہی عرصہ میں جبکہ تعلیمگاہیں مٹ گئیں اور اُن کی جگہ دوسرے اسکول اور کالج وغیرہ قائم نہ کئے گئے اور پرانے تعلیم یافتہ لوگ آہستہ آہستہ وفات پا گئے تو چاروں طرف ہندوستان میں جہالت اور نادانی کا دَور دَورہ ہو گیا چنانچہ ۱۸۲۳ء میں آنریبل الفنسٹن اور آنریبل الیف وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی جس کا اقتباس حسب ذیل ہے:۔

"انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے۔ ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اُس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی کی ہمت افزائی کے تمام ذرائع کو ہٹا لیا ہے بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے اس الزام کو دُور کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہیئے"۔ (روشن مستقبل صـ ۱۲۸)

ہم اس سے پہلے لارڈ منٹو وائسرائے ہند کی ۱۸۱۱ء والی یادداشت کا اقتباس ذکر کر چکے ہیں جو کہ اُنہوں نے کورٹ آف ڈائرکٹران کو بھیجی تھی اور اس میں اقرار کیا تھا کہ علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہے ہندو مسلمانوں میں مذہبی تعلیم نہ ہونے سے دروغ حلفی اور جعلسازی کے جرائم بڑھ رہے ہیں۔ اور سفارش کی تھی کہ متعدد کالج قائم کئے جائیں اور تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے۔

ہندوستان کو ہمیشہ غلام رکھنے کی ہوس اور اس کو ہمیشہ لوٹتے رہنے کی ملعون خواہش کی وجہ سے انگریز ہمیشہ یہی پالیسی رکھتے رہے کہ ہندوستانیوں کی ذہانت بالکل برباد کر دی جائے ان میں علمی بے داری پیدا نہ ہونے دی جائے۔ اُن کے ہر قسم کے کمالات فنا کر دیئے جائیں اور ان کو غلامی کی بدترین خدمت گذاریوں کاشتکاریوں وغیرہ ہی میں ہمیشہ مبتلا رکھا جائے تاکہ ہماری برتری ہمیشہ قائم رہے اور ہم ہندوستان کے اعلیٰ

حاکم بنے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷۹۲ء میں جبکہ مسٹر ولبر فورس نے پارلیمنٹ میں اس مضمون کی تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں پروٹسٹنٹ مذہب کے عقیدے کی عبادت اور تعلیم کے ذرائع مہیا کئے جائیں اور اس مقصد کے لئے وقتاً فوقتاً پادری بھیجے جائیں تو مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان تجاویز کی شدت سے مخالفت کی اور کہا۔ کہ

"ایک مذہب کے قائم ہو جانے سے انسانوں کے مقاصد متحد ہو جاتے ہیں اور اگر یہ ہو گیا تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو اپنے مذہب میں لانے کا اصول اس اٹھارویں صدی میں خلاف مصلحت ہے۔ اگر چند لاکھ عیسائی بھی وہاں ہو گئے تو اس سے سخت مصیبت آ جائے گی۔ امریکہ میں درسگاہیں اور کالج قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی طرح جب نوجوان پادری اندرون ہند میں پھیلیں گے تو کمپنی کے فوائد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جس ہندوستانی کو تعلیم حاصل کرنی ہو وہ انگلستان چلا آئے۔"

(روشن مستقبل ص۱۲۵ از تاریخ تعلیم میہیو ص۲۰۳)

تعلیم گاہوں اور علم کا فنا کر دینا اور فنا ہو جانا کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا اسلئے مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی اور عہدہ داران کمپنی کے ہر قسم کے خلاف کے باوجود آوازیں اٹھتی رہیں اور چیخ پکار ہوتی رہی۔ بہت سے منصف مزاج انگریز ہندوستانیوں کی موافقت بھی کرتے رہے جس کے نتیجہ میں ۱۸۳۴ء میں تعلیمی ضروریات انجام دینے اور اس کے پروگرام وغیرہ کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا اجلاس ۷ مارچ ۱۸۳۵ء میں منعقد ہوا اور لارڈ میکالے اس کے صدر بنائے گئے۔ کمیٹی اور اس کے صدر نے ہندوستانیوں کے لئے تعلیم گاہیں بنانے اور تعلیم کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا مگر ہر ہر قدم اور ہر ہر شعبہ میں ایسے امور کو لازم قرار دیا جس سے تعلیم عام ہو سکے نہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ علوم میں کامیابی ہو سکے اور نہ اُن کا کیر کٹر اعلیٰ درجات حاصل کر سکے نہ ایسی چیزیں اور سہولتیں اس میں رکھی گئیں کہ وہ ایک آزاد قوم کے نمبر شمار کئے جا سکیں۔

تمام فنون و علوم کی تعلیم انگریزی زبان میں لازمی قرار دی گئی۔ ظاہر ہے کہ سات ہزار میل کی وہ زبان جس سے ہندوستانیوں کو کوئی مناسبت نہیں جبکہ فنون اور علوم کو حاوی

ہو کر ہندوستانی بچوں کے لئے ذریعہ تعلیم بنائی جائے گی تو اُن کے اذہان پر ان فنون میں مہارت پیدا کرنے کے لئے کس قدر ثقیل بوجھ پڑے گا۔ اگر یہ فنون ان کی مادری زبان میں پڑھائے جاتے اور انگریزی زبان بحیثیت زبان ثانوی درجہ پر تسلیم کی جاتی تو ان کو ان فنون میں کس قدر زیادہ اور کس قدر جلد مہارت تامہ حاصل ہو جاتی۔

پھر جو فنون داخل درس کئے گئے وہ ایسے اور اتنے ہرگز نہ تھے جن سے وہ ماہر ہو کر صنائع اور ترقیات معاشیہ و حربیہ وغیرہ کے ایسے درجوں پر پہنچ سکیں جن پر یورپین اقوام جرمنی، برطانیہ، روس، جاپان وغیرہ پہنچیں۔

فضول اور زائد از حاجت کتابیں اور فنون ایسے بھر دیئے گئے جن میں دماغ کمزور اور بیکار ہو جاتا۔ رہا اور کوئی معتد بہ کمال حاصل نہیں ہوتا تھا۔

نصاب میں وہ کتابیں سائنس اور طبیعات کی داخل کی گئیں جن کی خیالی اور موہوم مگر مزین باتیں تو عمر بچوں کو مذہب اور عقائد دینیہ سے یک قلم منحرف کر کے لا مذہب اور بے دین بنا دیں۔

سب سے بڑا مقصد ان ممبران کمیٹی کا یہ رہا کہ انگریز حکام کو اپنے اپنے آفسوں میں کلرک اور ترجمان مہیا ہو جائیں اور انگریزی تہذیب اور انگریزوں کا کلچر ہندوستانیوں میں رائج ہو کر ان کو ہندوستانی اخلاق قدیمہ اور روحانیت و مذہبیت سے دور اور انگریزی اخلاق جدیدہ اور ان کی ڈپلومیسیوں سے نزدیک کر دے اُن میں دنیا طلبی اور خود غرضی اور نفاق کی ایسی اسپرٹ آجائے جس کی علمبردار اور تمام یورپین اقوام سے بڑھ کر برطانیہ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ لارڈ میکالے اور اس کی کمیٹی اپنی تعلیمی اغراض و مقاصد اور اُن کی اسکیم کی رپورٹ میں مندرجہ ذیل کلمات تحریر کرتی ہے۔

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو" (روشن مستقبل ص ۱۳۱ از تاریخ التعلیم میجر باسو ص ۱۰۵)

اسی کے ساتھ ساتھ وہ رائے جو لارڈ میکالے کے قلب کے اندرونی پردوں کے اندر چھپی ہوئی تھی وہ وہ تھی جو کہ انہوں نے اپنے والد کو ایک چٹھی میں لکھ کر بھیجی تھی اس

اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

"اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے۔ کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عملدرآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بُت پرست بھی باقی نہ رہے گا۔"

(روشن مستقبل صفحہ ۱۳۲ از تاریخ التعلیم میجر باسو صفحہ ۱۰۵)

چنانچہ ان مقاصد کا ظہور بہت تھوڑے عرصہ میں ہو گیا اور ان کالجوں اور اسکولوں اور یونیورسٹیوں سے جو لڑکے فارغ ہو کر نکلنے لگے وہ اپنے اسلاف کے مذہب اور اُن کے طریقوں سے بیزار اور متنفر ہوتے تھے اور چونکہ موجودہ مذہب عیسوی میں ایسی معقولیت اور جاذبیت نہ تھی کہ وہ اپنی طرف ان کو کھینچ سکے نیز خود انگریز بھی عموماً اس مذہب پر قائم نہیں ہیں اُن کی عیسائیت صرف قومیت کے درجہ تک ہے عمل اور عقیدہ میں کوئی تاثر نہیں ہے اس لئے وہ الحاد اور لادینیت کی دلدل میں پھنس کر اخلاق حسنہ اور خدا ترسی سے بالکل دُور ہو جاتے رہے۔

ڈبلو ڈبلو ہنٹر کہتا ہے۔

"ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آبا و اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔"

(ترجمہ رسالہ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۰۲)

الغرض باوجود اس شور اشوری اور اتنی تعلیمی جدوجہد کے مظاہروں اور کمیشنوں اور کمیٹیوں اور ایجنسیوں کے اعلانات اور کالجوں اور یونیورسٹیوں اور اسکولوں کی بلند بانگی کے جب پینتیس ۳۵ برس کے بعد ۱۸۷۱ء میں پہلی مردم شماری ہوئی تو تمام ہندوستان میں خواندہ (یعنی پڑھے لکھے لوگوں کا خواہ اُردو ہو یا انگریزی یا فارسی یا ناگری وغیرہ) انسانوں کا فی صدی اوسط (۳۰۲) پایا گیا۔ وہ انگریزی نظام جو کہ نہایت بلند بانگ دعاوے کے

۔ سانحہ ۱۷۶۳ء یا اُس کے قریبی زمانہ سے شروع کیا گیا تھا اور اس کے محاسن اور خوبیوں اور انسانی خدمات کے ہمیشہ راگ گائے جاتے رہے۔ ننو برس سے زائد مدت میں ہندوستان میں خواندہ لوگوں کی تعداد فیصدی (۲ء۳) پیدا کر سکا اس سے انگریزوں کی سچائی اور انسان دوستی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ بقول مسٹر لڈلو اور ڈاکٹر لیٹنر و دیگر ماہران تعلیم (حسب تصریحات ان ہیپی انڈیا) انگریزی حکومت سے پہلے عام طور پر بکثرت خواندہ تھے۔ پس کم از کم فیصدی ۵۱ خواندوں کا اوسط ہونا چاہیئے۔ پھر ۱۸۷۱ء میں اس اوسط کا پایا جانا کیا صریح طور پر دلالت نہیں کرتا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی منشومہ اغراض کے لئے علم اور اس کی درس گاہوں کو دشمنی کی نظر سے دیکھ کر بربادی کرنے کا سلسلہ ہمیشہ رکھا ہے اور جو کمیشن و کالج وغیرہ کی حکایات سامنے رکھی جاتی تھیں وہ محض دکھا دے اور طفل تسلی کے لئے تھیں۔ ۱۸۷۱ء سے ۱۹۲۱ء تک پچاس برس کے عرصہ میں خواندہ لوگوں کا اوسط جو کچھ بڑھا وہ صرف ۴ فیصدی ہے کیونکہ ۱۹۲۱ء میں خواندہ لوگوں کی تعداد (۳ء۷) فیصدی ہے۔ سوویٹ روس نے صرف پچیس برس کے اندر یعنی ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک ۸ فی صدی تعلیم یافتوں سے اسی فیصدی یا اس سے زائد اپنے ملک روس میں تعلیم یافتہ بنا دیئے۔ جاپان نے ایک صدی سے کم میں اپنے ملک میں (۹۵) فی صدی سے زیادہ تعلیم یافتہ بنا دیئے اور ایسی حیرت انگیز ترقی کی کہ یورپ کی حکومتیں اس سے لرزہ براندام ہو گئیں مگر انگریزی حکومت تقریباً پونے دو سو برس میں (یعنی ۱۷۶۵ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک) فیصدی دس تعلیم یافتہ بنا سکی۔

"حسب بیان مسٹر جان گنتھر ۱۹۴۳ء میں جبکہ امریکہ اور انگلستان میں فی صدی ایک بھی خواندہ اور جاہل نہ تھا۔ تو ہندوستان میں فیصدی نوّے جاہل محض اور خواندہ پائے جاتے ہیں۔" (مدینہ بجنور مورخہ ۹ رجون ۱۹۴۳ء از کامن سنس امریکہ)

"حالانکہ سوویٹ روس نے ایسے تعلیم یافتہ بنائے جنہوں نے جرمنی جیسی ترقی یافتہ اور سائنسداں قوم کو شکست دے کر نہ صرف اپنے ملک سے نکال باہر کر دیا بلکہ اُن کے پایۂ تخت میں گھس گئے برخلاف اس کے انگریزوں نے جو تعلیم یافتہ ہندوستان میں بنائے وہ معمولی سے معمولی

صنائع پر قادر نہیں ہیں سوائے اس کے کہ دفاتر میں کلرکی کی خدمتیں انجام دیں اور کسی قسم کی قابلیت اُن میں نہیں پائی جاتی اور کیوں نہ ہو سائمن رپورٹ کے موافق جبکہ انگلستان میں صرفہ تعلیم فی کس سالانہ ۲ پونڈ ۱۵ شلنگ یعنی لہ للعہ اور امریکہ فی کس سالانہ صہ تھا تو ہندوستان میں صرفہ تعلیم فی کس سالانہ ۹ پنس یعنی ۹/ تھا۔ اور ۱۹۴۳ء میں حسب بیان مسٹر جان گنتھر جبکہ امریکہ فی کس سالانہ تعلیم پر چار سوڈالر خرچ کر رہا تھا اور انگلستان فی کس دو سوڈالر خرچ کر رہا تھا تو ہندوستان میں برطانیہ فی کس سالانہ تین ڈالر خرچ کرتا تھا۔" (امریکی اخبار کامن سنس ۱۹۳۴ء)

جب اس قدر خود غرضی اور کوتہ اندیشی اور ہندوستان دشمنی سے کام لیا جائے تو بجز اس کے کیا نتیجہ ہوگا۔ انہیں ملعون اغراض کی بناء پر ہمیشہ انگریزوں نے ہندوستان میں تعلیم کی مد میں ایسی ایسی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کیں جن کی بناء پر یہ ملک انتہائی جہالت میں پھنس کر رہ گیا۔ ۱۹۲۵-۲۶ء میں ہندوستان کی آمدنی میں سے جبکہ ڈیفنس پر فی صدی (۲۹،۵) اور انتظام ملکی پر (۲۹،۲) خرچ کیا جا رہا تھا تو مد تعلیم پر (۰٫۷) صرف کیا جاتا تھا۔ مدت دراز سے ہندوستان میں جبریہ تعلیم کا مسئلہ چل رہا ہے مگر سب سے بڑی رکاوٹ اس کے راستہ میں یہی رہی کہ اس کام کے لئے کافی روپیہ نہیں ملا۔ جب بھی تعلیمات پر سوال اٹھایا گیا تو یہی جواب ہوتا تھا کہ بجٹ میں روپیہ نہیں ہے حالانکہ ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ کے قریب فوج پر اور اسی طرح بڑی بڑی رقوم پولیس وغیرہ پر صرف کی جاتی رہیں جن کی غرض صرف اس قدر تھی کہ برطانوی حکومت کی سطوت اور جبروت قائم رہے اور اس سے رعایا کا ایک ایک فرد حکام کے چنگل میں پھنسا رہے۔

سر جان سائمن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

"ہندوستان کے مشکلات کی جڑ بالیقین فوج ہے۔ مرکزی حکومت ہند کے موجودہ اخراجات کا ساڑھے باسٹھ (۶۲ ½) فیصدی ڈیفنس پر صرف ہو جاتا ہے جو دنیا بھر سے زائد صرفہ ہے۔ تمام مملکت برطانیہ کی نسبت دو سے تین گنا تک ہندوستان ڈیفنس پر زائد صرف کرتا ہے۔ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۸ء میں برطانیہ عظمیٰ کے مصارف جنگ ۴۹ فیصدی

بڑھے۔ نوآبادیات کے ۳۲ فیصدی۔ مگر ہندوستان کے اعداد اس مدّت میں دوگنے ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی افواج کے اخراجات ہندوستان میں ہیبت ناک ہیں۔ ایک انگریز سپاہی کا صرفہ ہندوستانی سپاہی سے چوگنا پانچ گنا زیادہ ہوتا ہے۔ توپ خانہ اور ہوائی فوج میں ہندوستانی کو کمیشن ملنا ممنوع ہے۔" (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۳۰ء)

برخلاف اس کے انگلستان میں جنگ عظیم کے دوران میں اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ثانوی تعلیم کو جبریہ کر دیا جائے۔ وہ وقت ایسا سخت تھا کہ سلطنت کو فوجی اخراجات کے لئے لاکھوں روپیہ روزانہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر عین جنگ کے زمانہ میں ۱۹۱۸ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس کی رُو سے انگلستان کے ہر بچّہ کے لئے ہائی اسکول تک کی تعلیم جبریہ اور مفت کر دی گئی اور جس طرح بن پڑا اس کے لئے روپیہ فراہم کیا گیا۔ (حکومت خود اختیاری ص ۸۵)

انہیں وجوہ سے سر ڈی ہملٹن نے کہا تھا کہ

"اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اس طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومن نے انگلستان چھوڑا تھا تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہوگی نہ حفظانِ صحت کا سامان ہوگا اور نہ ہی دولت ہوگی۔"

(روزانہ ملّت دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۳۲ء)

(۴) لوٹ کھسوٹ اور مالی بربادی

انگریزوں نے ہندوستان کو لوٹ کھسوٹ کی شرمناک پالیسی سے حد درجہ غریب اور مفلس بنا دیا

انگریزی عروج سے پہلے ہندوستان نہایت زیادہ دولت مند اور سرمایہ دار ملک تھا۔ جس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتی تھی۔ اور یہ دولت مندی اس ملک میں قرنہا قرن اور صدیوں سے چلی آتی تھی جس کا تمام عالم میں شہرہ تھا اور جس کی وجہ سے دنیا

کی قوموں کی لالچی آنکھیں ہمیشہ اسکی طرف اُٹھتی رہتی تھیں۔ اور کیوں نہ ہو قدرت کی فیاضیوں نے اس کی سرزمین میں ایسے اسباب اور سامان مہیا کر دیئے تھے جن سے دولت مندی سرمایہ داری، خوشحالی، فارغ البالی پھوٹ پھوٹ کر چاروں طرف پھیلتی تھی۔ یہاں کے راجاؤں اور بادشاہوں نے ہمیشہ ملک کی دولت اور ثروت میں اضافہ اور زیادتی کی پالیسی جاری رکھی۔ اگر کوئی راجہ یا بادشاہ ظالم بھی ہوتا تھا تو اس کا حاصل کیا ہوا مال ہر پھر کر یہاں ہی رہتا تھا۔ اگر کسی بیرونی حملہ آور نے یہاں سے کچھ مال لوٹ کر کسی دوسرے ملک کو کبھی منتقل بھی کیا تھا تو یہاں کے تاجر اور دستکار بہت تھوڑے سے عرصہ میں اس کو مصنوعات ہندیہ کے عوض مع المضاعف واپس لے آتے تھے۔ ڈاکٹر واکز کہتا ہے۔

"ہندوستان کی دولت، تجارت اور خوشحالی نے سکندر اعظم کے دل پر گہرا اثر کیا اور جب وہ ایران سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا تو اس نے اپنی فوج کو کہا کہ اب تم اس سنہرے ہندوستان کی طرف کوچ کر رہے ہو جہاں نہ ختم ہونے والے خزانے ہیں۔ اور جو کچھ انہوں نے ایران میں دیکھا ہے اس کا ہندوستان کی دولت کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتا"

(رسالہ تلک جلد اوّل ص۶)

پروفیسر ہیرن "ہسٹاریکل ریسرچ" صفحہ (۲۶۸) میں کہتا ہے:۔

"ہندوستان پُرانے زمانہ میں دولت کے لئے مشہور تھا" (رسالہ تلک جلد اوّل ص۶)

چیمبرس انسائیکلو پیڈیا میں ہے۔

"صدیوں تک ہندوستان اپنی دولت مندی کے واسطے مشہور رہا"

(رسالہ تلک ج ا ص۶)

تھارنٹن اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے:۔

"یورپ کو تہذیب سکھانے والے یونان اور اٹلی جب بالکل جنگلی حالت میں تھے ہندوستان اس زمانہ میں درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور دولت کا مرکز تھا۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے صنعت و حرفت کے کاروبار جاری تھے۔ یہاں کے باشندے دن رات اپنے اپنے کاروبار میں

مشغول رہتے تھے۔ یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے لائق اور کاریگر صناع موجود تھے جو یہاں کی خام پیداوار سے اتنا نفیس اور عمدہ مال تیار کرتے تھے جس کی دنیا بھر میں مانگ ہوتی تھی۔ مغرب اور مشرق کے تمام ممالک ان اشیاء کو بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ یہاں سوت اور کپڑے اس قدر عمدہ اور باریک نفیس وخوبصورت بنتے تھے کہ دنیا میں کوئی ملک بھی ان کی برابری نہ کر سکتا تھا۔" (رسالہ مظلوم کسان صہ ۱۳)

فرانس کے مشہور سیاح برنیر نے اپنی چٹھی میں مسٹر کالبرٹ کو ہندوستان کی نسبت لکھا تھا کہ:۔

"وہ ایسی بے تہا خلیج ہے جس میں دنیا بھر کے سونا اور چاندی کا بڑا حصہ ہر طرف سے آکر جمع ہو جاتا ہے اور بہ مشکل ایک طرف سے باہر کو نکلتا ہے۔"
(روشن مستقبل صہ ۱۵ از رسالہ)

ہندوستان نے اپنی آزادی کے لئے کس طرح جدوجہد کی مصنفہ مسز اینی بسنت)
عبداللہ وصاف مورخ لکھتا ہے:۔

"حضرت آدم (علیہ السّلام) کے زمانہ سے اس وقت تک شرق سے لیکر غرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں باہر کے ملکوں سے سونا اور چاندی اور قیمتی سامان اور جنس آتی ہو اور اس کے بدلے میں کانٹے، جڑی بوٹی، مٹی، سنگریزے اور مختلف قسم کی جڑیں باہر جاتی ہوں اور یہاں سے سامان کی خریداری کے لئے کسی ملک کو کبھی روپیہ نہ گیا ہو۔" (روشن مستقبل صہ ۱۶)

لارڈ میکالے لکھتا ہے:۔

"باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لیٹروں کی موجودگی کے مشرقی ممالک میں صوبہ بنگال باغ ارم سمجھا جاتا تھا اس کی آبادی بے حد و غایت بڑھتی تھی۔ غلّہ کی افراط سے دُور دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے اور لندن اور پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی بیبیاں یہاں کے کرگھوں کے

نازک ترین کپڑے زیب تن کرتی تھیں" (روشن مستقبل ص۱۲)

میجر باسو لکھتا ہے:۔

"رعایا کی خوشحالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دورِ حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دولت مندی اور آرام و چین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلا شبہ بے مثل و بے نظیر تھا" (روشن مستقبل ص۱۶)

"بنگال کے جگت سیٹھوں کا کاروبار بنک آف انگلینڈ کے برابر پھیلا ہُوا تھا جو کہ انگلستان کا سب سے بڑا بنک ہے اور بقول کپتان الگزنڈر نڈر ہملٹن سورت کے ایک تاجر مسمی عبدالغفور کا سرمایہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرمایہ کے برابر تھا۔ انہیں وجوہ سے ہندوستان کی دولت کو لارڈ کلایو نے لازوال دولت کہا تھا۔ (روشن مستقبل ص۱۶)

فاہین چینی اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے:۔

"یہاں کی رعایا نہایت خوشحال اور فارغ البال ہے۔ کسی قسم کا مالیہ یا محصول ادا کرنا نہیں پڑتا اور یہ افسروں کی ڈالی ہوئی رکاوٹیں ہی ان لوگوں کے کاروبار میں حائل ہیں۔ جو سرکاری زمین جوتتے ہیں وہ پیداوار کا بہت تھوڑا حصہ بطور لگان ادا کرتے ہیں۔ راجہ کسی کو بدنی سزا نہیں دیتے"

(رسالہ مظلوم کسان ص۱۳)

نکو موڈی کانتی (مشہور انگریز) اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے:۔

"گنگا کے کنارے بڑے بڑے اور نہایت خوبصورت شہر آباد ہیں جن کے اردگرد دل خوش کرنے والے باغیچے لگے ہوئے ہیں شہروں کے باہر نہایت خوبصورت کھیت لہرا رہے ہیں، یہاں گویا سونے کے دریا بہہ رہے ہیں موتی اور جواہرات کی بھی کوئی انتہا نہیں"

(رسالہ مظلوم کسان ص۱۴)

مسٹر وڈ ۱۸۷۱ء میں لکھتا ہے:۔

"سراج الدولہ کے انتقال کے بعد جن لوگوں نے بنگال میں ہو کر کوچ کیا

ہے اُن سے اس بات کی تصدیق کرانا چاہتے ہیں کہ اس وقت یہ سلطنت دنیا میں سب سے زیادہ دلمتند آباد اور کاشت کے لحاظ سے بہترین تھی یہاں کے شرفاء اور تاجر دولت اور عیش میں لوٹ لگاتے تھے اور ادنیٰ درجہ کے کسانوں اور کاریگروں پر خوش حالی اور آسائش کی برکتیں نازل ہوتی تھیں۔" (روشن مستقبل ص۴۴)

"۱۷۷۳ء میں تقریباً ایک ہزار قسم کے سکّے کم و بیش تمام ملک میں جابجا رائج پائے گئے خاص کر (۱۳۹) قسم کی طلائی مہریں (اشرفیاں) (۱۶) قسم کے طلائی ہن جو پگوڈا بھی کہلاتے تھے (۵۵۶) قسم کے نقرئی روپئے اور (۲۱۴) قسم کے دوسرے ممالک کے سکّے۔ صرف احاطۂ بمبئی کو لیجئے کہ عدالت ہائے دیوانی کی ہدایت کے واسطے جو مروجہ سکّوں کی فہرست بنائی گئی تھی اس میں (۳۸) طلائی سکّوں اور (۱۲۷) نقرئی سکّوں کے نام درج ہیں تاکہ ان سکّوں کی قدر و قیمت معلوم رہے اور انگریزی روپئے سے مبادلہ کرنے میں سہولت ہو گویا (۱۶۵) قسم کے طلائی اور نقرئی سکّے بخوبی رائج تھے اور تانبے کے الگ تھے۔" (معاشیات ہند ص۲۱۷)

شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں سونے کے سکّے مندرجہ ذیل وزن کے تھے۔

مہر شاہی جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ تھی۔	دوسری اشرفی	تیسری اشرفی
۱۰۲ تولہ سونا	۹۰ تولہ	۵۰ تولہ

چوتھی اشرفی	پانچویں اشرفی	چھٹی اشرفی	ساتویں اشرفی	آٹھویں اشرفی
۲۵ تولہ	۲۰ تولہ	۳ تولہ	۲ تولہ	۱ تولہ

نویں اشرفی۔ ۷ اگرین یعنی ۱۱ ماشہ (معیشت الہند ص۳۱۴)

شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں حسب ذیل سکّے تھے۔

مہر شاہی جس کا نام نور شاہی تھا۔	دوسری اشرفی جس کا نام نور سلطانی تھا۔
۱۰۰ تولہ	۵۰ تولہ

تیسری اشرفی جس کا نام نور دولت تھا۔	چوتھی اشرفی نور کرم۔	پانچویں اشرفی نور مہر
۲۰ تولہ	۱۰ تولہ	۵ تولہ

آٹھویں اشرفی رواجی	ساتویں اشرفی نورانی	چھٹی اشرفی نورجہانی
۳ ماشہ	۶ ماشہ	ا تولہ

مندرجہ بالا تفصیل سونے کے سکّوں کی تھی چاندی کے سکّے بھی جہانگیر کے زمانہ میں انہیں اوزان کے تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

جہانگیری	کوکب سعد	کوکب بخت	کوکب مراد	کوکب اقبال	کوکب سعد
ا تولہ	۵ تولہ	۱۰ تولہ	۲۰ تولہ	۵۰ تولہ	۱۰۰ تولہ چاندی

خیر قبول	نثاری	سلطانی
½ تولہ	۳ ماشہ	۶ ماشہ

(ترجمہ تزکِ جہانگیری صث۱)

صاحب علم المعیشۃ لکھتا ہے۔

"ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کی دولت کے افسانے اقالیم دنیا میں مشہور تھے اور کہتے ہیں کہ یہی جنس تھی جس نے ایشیا اور یورپ کی جنگجو اور عالی ہمت اقوام کو اس سرزمین کی طرف کشاں کشاں کھینچا تھا۔ یونانی، عرب ترک، تاتار آئے اور بے شمار زروجواہر اور دیگر بیش بہا سامان لے گئے اکبر اعظم نے ہندوستان کو اپنا گھر قرار دیا اور پھر ہندوستان کی دولت ہندوستان ہی میں رہی۔ اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے آگرہ اور دہلی کے خزانوں کی پڑتال کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ چھ ماہ تک کئی ہزار نفوس چاندی کے سکّے تولنے میں مصروف رہے اور معلوم ہوا کہ خزانہ شاہی کا صرف ایک کونہ تولا جا سکا ہے۔ اشرفیوں اور جواہرات کی نوبت نہیں آئی اورنگ زیب فوراً اس مہم کو بند کرا کے دکن کی مہم پر چلا گیا۔"

(علم المعیشت صث۲۵)

مذکورہ بالا شہادتیں اور اُن جیسی بہت سی شہادتیں تاریخ میں موجود ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان قدیمی زمانہ سے بہت زیادہ دولت مند اور سرمایہ دار ملک تھا۔ روئے زمین پر اس جیسا دولت مند کوئی ملک نہ تھا۔ سونا اور چاندی اور جواہرات اور سچے موتی جس قدر اس ملک میں بکثرت لوگوں کے پاس پائے جاتے تھے دوسرے ملک اس سے تقریباً خالی تھے۔ بعض تاریخیں بتلاتی ہیں کہ ۱۷۶۲ء میں صرافوں کی دوکانوں پر

شہروں میں اشرفیوں اور روپیوں کے ڈھیر ایسے لگے ہوتے تھے جیسے منڈیوں میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ دوسری قومیں ہندوستان کا قصد کر کے یہاں آتی رہیں۔ یورپین اقوام پرتگیز، ڈچ، فرنچ، انگریز وغیرہ بھی اسی بناء پر سمندری راستوں سے یہاں بار بار آتے رہے اور سبھوں نے یہاں سے بہت زیادہ مال و متاع حاصل کیا یہی وجہ تھی کہ پیٹر اعظم (پہلا زار روس) نے اپنی وصیتوں میں حکومت روس کو وصیت کی تھی کہ وہ ہندوستان کو اپنے قبضہ میں لا کر وہاں سے سونا اور چاندی حاصل کرے۔ اور پھر تمام دنیا پر اس کے سرمایہ کے ذریعہ سے حکومت کرے۔ یہاں کی بسنے والی رعایا نہایت خوشحال اور فارغ البال تھی۔ نہایت آرام اور چین سے زندگی بسر کرتی تھی۔ یہاں کا بادشاہ جشن کے دن سال بھر میں دو دفعہ سونے اور چاندی اور قیمتی فلزات میں تولا جاتا تھا اور جو کچھ وزن میں چڑھتا تھا غریب رعایا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

جہانگیر اپنی کتاب (تزک جہانگیری) میں لکھتا ہے:۔

"اوّل میں سونے سے تلا نین من دس سیر چڑھا ہندوستانی حساب سے پھر باقی فلزات اور اقسام خوشبویوں اور کیفیات میں بارہ دفعہ تلا اور اسی طرح سال میں دو بارہ میں اپنا وزن کرتا ہوں کہ ہر بار سونا چاندی اور باقی فلزات (دھاتیں) اور ریشم اور عمدہ کپڑوں میں اور اقسام غلّہ سے وزن کرتا ہوں اوّل شروع سال شمسی میں۔ دوبارہ قمری میں اور نقد اور سامان اپنے تلنے کا الگ تحویلداروں کو دیتا ہوں کہ فقراء اور حاجت مندوں کو تقسیم کر دیں" (دیکھو ترجمہ تزک جہانگیری صفحہ ۴۱، ۴۲، ۹۱، ۹۸، ۱۲۶)

کتاب مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح شہنشاہ جہانگیر مرحوم سال میں دو مرتبہ ان اشیاء سے بارہ بارہ مرتبہ تلتا تھا اور جو کچھ وزن میں چڑھتا تھا فقراء اور محتاجوں میں تقسیم کرتا تھا اسی طرح اس کا باپ شہنشاہ اکبر بھی کرتا تھا اور جہانگیر کے بعد بھی شاہان مغلیہ اس پر عامل رہے۔

روزانہ شام کو جب بادشاہ کی سواری سیر کے لئے ہاتھی پر نکلتی تھی تو دو توڑے ہزار ہزار روپیئے کے ہاتھی پر بادشاہ کے دائیں اور بائیں رکھے جاتے تھے اور وہ

راستہ میں بادشاہ پہ نچھاور کئے جاتے تھے۔ ہر شب میں بادشاہ کے سرہانے ایک توڑا ہزار روپئے کا رکھا جاتا تھا اور صبح کو رعایا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی خیرات اور رعایا پروری بغیر بے شمار دولت کے نہیں ہو سکتی۔

مقریزی کتاب الخطط جلد ثانی صفحہ ۴۷ اپر لکھتا ہے:۔

"شہنشاہ محمد تغلق مرحوم سالانہ دو لاکھ جوڑے کپڑوں کے رعایا میں تقسیم کرتا تھا۔ دس ہزار گھوڑے علاوہ فوجیوں کے ہر سال رعایا میں تقسیم کرتا تھا۔ روزانہ دو وقتہ بڑے بڑے حکام میں سے بیس ہزار آدمی شاہی مہمان خانہ میں کھایا کرتے تھے۔ شاہی باورچی خانہ میں روزانہ ڈھائی ہزار گائیں اور دو ہزار بکریاں مہمانوں کے لئے ذبح ہوتی تھیں۔ دو سو علماء ہر روز بادشاہ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ شہر دہلی میں ستر شفا خانے عام رعایا کیواسطے جاری تھے۔ دو ہزار مسافر خانے اور باطین مسافروں اور غریب الوطنوں کے لئے بنے ہوئے تھے۔ ایک ہزار مدرسے تھے۔"

انکیٹیل ڈیوپیران ۱۸۰۰ء میں لکھتا ہے:۔

"جب میں مرہٹوں کے ملک میں داخل ہوا تو میں نے خیال کیا کہ میں سادگی اور مسرّت کے زمانہ میں ہوں جہاں فطرت اب تک غیر مبدّل تھی اور جنگ اور مصیبت سے کوئی آشنا نہ تھا، باشندے خوش، قوی اور بہت زیادہ تندرست تھے مہمان نوازی کے جذبات عام تھے دوستوں ہمسایوں اور اجنبیوں کے استقبال کے لئے ہر چیز بطریق مساوات تیار تھی۔" (مدینہ بجنور جلد ۲۱ ۵۲ مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۲ء)

مذکورہ بالا جیسی تصریحات سے ہر صوبہ کے متعلق تاریخی کتابیں یورپین اور غیر یورپین مصنفوں کی بھری ہوئی ہیں (طوالت کے خوف سے ہم نقل نہیں کر سکتے) یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کو پرانے زمانہ میں جنّت نشان کے لقب سے ملقب کیا جاتا تھا۔ مگر خدا جانے اس بے شمار دولت اور بے نظیر سرمایہ کو زمین کھا گئی یا آسمان اچک لے گیا۔ یا آندھی اڑا لے گئی۔ اب ماہرین اقتصادیات جو اعداد و شمار پیش کرتے ہیں ان سے ہندوستان دنیا کی ادنیٰ سے ادنیٰ سلطنت سے گرا ہوا ہے۔ مگر افسوس کہ ہندوستان

اور ہندوستانیوں کی بدنصیبی اور بدقسمتی نے وہ دن دکھایا کہ وہ جنت نشان ملک یورپین اقوام اور بالخصوص برطانی قوم کے ہاتھوں جہنم نشان اور تمام دنیا سے زیادہ مفلوک فاقہ مست اور محتاج ہو کر رہ گیا جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ "اولوالعزمی اور جہازرانی میں پرتگال والے یورپ بھر میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور کوئی دوسری قوم اُن سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی چنانچہ ہندوستان اور یورپ کے درمیان بحری راستہ سب سے پہلے اُنہیں پرتگیزوں نے دریافت کیا۔ اُنہوں نے سمندر میں جہاز چھوڑ کر افریقہ کے ساحل کے برابر چلنا شروع کیا حتیٰ کہ جنوب میں پہنچ کر جو مڑے تو بحر ہند میں آ نکلے۔ ہوتے ہوتے ایک مشہور پرتگیز کپتان واسکوڈے گاما چند جہاز لے کر ۱۴۹۸ء میں ہند کے مغربی ساحل پر آیا اور شہر کالیکٹ میں وارد ہوا۔ وہاں کا راجہ زمورن کہلاتا تھا اُس نے واسکو ڈے گاما کو شاہ پرتگال کے نام ایک خط دیا جس میں تحریر تھا کہ میرے ملک میں دار چینی لونگ، کالی مرچ اور ادرک کثرت سے ہوتے ہیں میں تمہارے ملک سے سونا چاندی مونگا اور قرمزی مخمل چاہتا ہوں۔ اس وقت سے سو برس بعد یعنی ۱۵۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک ہند کی بحری تجارت بالکل پرتگیزوں کے ہاتھ میں رہی۔ انہوں نے مقام گوا میں ایک مضبوط قلعہ بنا لیا تھا۔ آج تک یہ مقام پرتگیزوں کے قبضہ میں چلا آتا ہے۔ یورپ کی باقی قوموں نے جو دیکھا کہ ہندوستان کی تجارت سے پرتگال والے مالا مال ہو گئے ہیں اور اُنہوں نے اپنے ملک اور شہروں کو رشک جنت بنا لیا ہے تو اُن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور شوق پیدا ہوا کہ کسی نہ کسی طرح اس تجارت میں شریک ہونا چاہیئے۔ پس ہالینڈ، انگلستان، فرانس، ڈنمارک، جرمنی سویڈن کے تاجروں نے اپنے اپنے جہاز بھیجنے شروع کئے مگر کچھ کامیابی ہوئی تو صرف ہالینڈ۔ انگلستان اور فرانس والوں کو باقی کو کچھ نفع نہ ہوا۔" (علم المعیشت صـ۵۷۲)

چنانچہ ۱۵۹۹ء میں انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے یہاں کی پبلک اور حکام ہمیشہ سے مہمان نواز واقع ہوئے تھے انہوں نے انگریزوں کے ساتھ ہمدردانہ طریقہ پر مراعتیں ہر قسم کی کیں۔ صاحب معیشۃ الہند لکھتا ہے صفحہ (۳۱۸) برطانوی عہد کی ابتداء بھی کیا ہی عجیب ہوئی جو قوم آج اس طرح ہند پر مسلط اور حکمراں ہے وہ آج سے سوا تین سو سال پہلے محض تجارت کے خیال سے یہاں پہنچی تھی۔ سـ

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال ؛ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ملجائے

۲۴ ستمبر ۱۵۹۹ء انگلستان کے حق میں کیسا مبارک دن تھا جبکہ لندن کے چند تاجروں نے آپس میں مل کر تہیّہ کیا کہ مشرقی ممالک سے تجارت شروع کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اس غرض سے باقاعدہ ایک کمپنی قائم ہوئی جس میں لندن کے دوسو سے زیادہ تاجر اور امراء شریک تھے ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو ملکہ الزبتھ نے اس کمپنی کو شاہی منشور کے ذریعہ سے بلاشرکت غیرے ممالک مشرق سے تجارت کرنے کے پورے حقوق عطا فرمائے گویا کمپنی کو مشرقی تجارت کا باضابطہ اجارہ مل گیا۔ کوئی اور انگریزی کمپنی اس میں دخل نہیں پا سکتی تھی۔ سترہویں صدی کے شروع میں کمپنی کی طرف سے کچھ انگریز تاجر ہندوستان پہنچے۔ چنانچہ ۱۶۱۲ء میں اوّل مغربی ساحل پر بمقام سورت انہوں نے کاروبار شروع کیا۔ شہنشاہِ جہانگیر کا زمانہ تھا نوواردوں نے جن جن رعایات کی بارگاہ سلطانی میں استدعا کی وہ بخوشی عطا ہوئیں۔ ۱۶۱۶ء میں کمپنی نے مشرقی ساحل پر بمقام سولی پٹم کارخانہ کھولا۔ ۱۶۴۰ء میں مقامی راجہ سے مدراس کی زمین لگان پر حاصل کی اور اس کا کچھ حصّہ خرید کر وہاں قلعہ تعمیر کیا۔ بنگال میں تجارت کرنے کی اجازت کمپنی نے شہنشاہِ شاہجہاں سے ۱۶۳۴ء میں حاصل کی ۱۶۴۰ء میں بمقام ہگلی ایک کارخانہ قائم ہوا جو ۱۶۹۰ء میں بعض مصلحتوں کی وجہ سے کلکتہ کو منتقل ہو گیا۔ اور اسی کے طفیل سے موجودہ شہر کی بنا پڑی اور جہاں آج بمبئی آباد ہے یہ جزیرہ کبھی پرتگال والوں کے قبضہ میں تھا۔ چارلس دوم نے جب ایک پرتگالی شہزادی سے شادی کی تو پرتگال کی طرف سے ۱۶۶۲ء میں یہ جزیرہ دلہن کے جہیز میں ملا۔ چنانچہ چارلس نے آمدنی کے خیال سے ۱۶۶۸ء میں یہ اراضی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ۱۰ پونڈ سالانہ لگان پر اٹھادی (آج وہاں دس پونڈ سالانہ کرائے پر ایک جھونپڑی ملنی مشکل ہے۔ اس طرح ہندوستان کے تینوں باموقع بندرگاہ کلکتہ بمبئی، مدراس ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ آگئے اور پھر ملک میں کمپنی جس طرح پھیلی اظہر من الشمس ہے۔

حکومت اور صولت کے نشہ میں یہ بات یاد رکھنی یا تسلیم کرنی دشوار ہے کہ کسی زمانہ میں یورپ بالخصوص انگلستان کے نوواردتاجروں پر ہندوستان کے فرمانرواؤں نے اپنی بے تعصبی اور دریا دلی سے کیا کیا احسان کئے اور کیسی کیسی رعایات ومراعات روا رکھیں جو بعد کو فریق ثانی کی چالاکی اور احسان فراموشی سے خود اُن کے حق میں وبال جان بن

گئے اور دوسروں کے واسطے خیر اندیشی اپنے حق میں سخت ناعاقبت اندیشی ثابت ہوئی اگرچہ تاریخ ہند کے اس پہلو پر بہت اہتمام اور احتیاط سے پردہ ڈالا گیا ہے۔ مگر گذشتہ تین صدی کی تاریخ ہند کا یہ سب سے بڑا سبق ہے کہ ہندوستانی فرمانرواؤں کے بیجا رعایات اور بے محل اعتماد نے ہندوستان کو آنکھوں دیکھتے ہاتھوں سے نکال دیا۔" (معیشۃ الہند صفحہ ۲۱۸)

غرضیکہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کو ہندوستان کے پادشاہوں اور فرمانرواؤں نے وہ وہ رعایتیں اپنی بے تعصبی اور دریادلی سے عطا کیں کہ آج یورپ کی تمدن کی مدعی قومیں اور انسانیت کی خدمت گذاری کی بلند بانگ دعاوی کرنے والی پادشاہتیں کسی دوسری قوم اور نو وارد مسافروں کے ساتھ روا نہیں رکھتیں۔ یہ اور ایسی مراعات تو درکنار حقوق شہریت تک بھی دوسروں کو نہیں دیتیں۔ لارڈ کلایو لکھتا ہے:۔

"شہر مرشد آباد مثل لندن کے وسیع آباد اور خوشحال ہے مگر فرق یہ ہے کہ مرشد آباد میں ایسے ایسے افراد ہیں جو جائداد کے مالک ہونے میں انگلستان کے لوگوں سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں مرشد آباد میں لاکھوں آدمی رہتے ہیں اگر وہ یورپینوں کو تباہ کرنا چاہتے تو محض لاٹھیوں اور پتھروں سے کر دیتے۔" (روشن مستقبل صفحہ ۴۴)

چاہیئے تو یہ تھا کہ اگر انگریزوں میں تہذیب اور انسانیت و شرافت، عدل و انصاف مروت اور اخلاق ہوتے تو ہمیشہ ممنون احسان رہ کر دائرہ قانون اور انصاف کے ماتحت شکر گذاری کے ساتھ اپنی جائز تجارت میں مشغول رہتے مگر انہوں نے ابتداء ہی سے ان مراعاتوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اپنی بربریت اور جعلسازیوں اور چالاکیوں اور غداریوں کو ہمیشہ کام میں لاکر ہر طرح ہندوستان میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھا۔ اور لوٹ کھسوٹ کو اس قدر دن رات مختلف پیرایوں سے کام میں لاتے رہے کہ ہندوستان کی دولت مندی ایک کہانی بن کر رہ گئی اور ہندوستان تمام دنیا میں سب سے زیادہ غریب فاقہ زدہ کنگال ملک ہو گیا یہاں کی آبادی کروڑوں کی مقدار میں بھوک کیوجہ سے ایڑیاں رگڑتی ہوئی موت کے گھاٹ اتر گئی۔ یہ سلسلہ ابتدائی تجارت سے لے کر آخری ایام حکومت تک تین سو برس سے زائد عرصہ میں برابر جاری رہا مگر ان دنوں میں ذرا بھی رحم دلی پیدا نہ ہوئی اور ہندوستانیوں کی لاچارگی اور مصیبتوں کا خیال بھی نہیں

آیا۔ بے شک سنگدل حملہ آوروں کی عادت رہی ہے کہ وہ فتحیابی پر اپنی مفتوح قوموں اور ملکوں کو لوٹا کرتے تھے۔ مگر امن قائم ہو جانے اور اطاعت کا دم بھر لینے کے بعد سخت سے سخت سنگ دل اور وحشی حملہ آور لوٹ کھسوٹ کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لاتے تھے مگر انگریز قوم اطاعت اور فرماں برداری کا دم بھرنے والی ہندوستانی رعایا کے متعلق بھی اسی لوٹ کھسوٹ کی تگ و دو اور فکر اور کوشش میں مشغول رہی۔ اور نئے نئے انسانیت سوز طریقوں اور قوانین سے ہندوستانی پبلک اور امراء کو برباد کرتی رہی۔ اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے ہم معتمد انگریزوں کی شہادتوں سے مختصر طور پر کچھ شہادتیں نقل کرتے ہیں۔ سر ولیم ڈگبی ممبر پارلیمنٹ اپنی کتاب پراسپرس برٹش انڈیا میں انگریزی ادوار کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتا ہے:۔

"جو کچھ ۱۹۰۱ء میں (جبکہ ہندوستان میں نہایت مہلک قحط پڑا ہوا تھا اور روزانہ لاکھوں آدمی بھوک اور فاقوں سے مرتے تھے) ہمارے طریقۂ حکومت ہند میں دکھائی دے رہی ہے جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے اور جو کہ غیر معمولی غربت ہندوستانی براعظم میں پھیل رہی ہے وہ ہماری اس طرزِ حکومت کا نتیجہ ہے جو نیک نیتی سے مگر غلطی سے پہلے سے شروع کی گئی اور اب تک بحال رکھی گئی وہ اصولِ حکومت تین قسم کے ہیں۔

اوّل تسلّط بذریعہ تجارت، ہندوستان کی دولت علانیہ سمیٹنا منگے طور سے ۱۷۰۰ء[1] سے ۱۷۵۷ء تک۔

دوم تسلّط بذریعہ اطاعت بالجبر۔ ہندوستان انگلینڈ کے لئے ہے آغاز سے انجام تک ۱۷۵۷ء سے ۱۸۳۲ء تک۔

سوم تسلط بذریعہ پوست۔ خوش معاملگی کا دکھاوا اور زور کے ساتھ ہندوستانی قوم کو ادنیٰ حالت میں لازمی طور پر قائم رکھنا۔ ۱۸۳۳ء سے ۱۹۰۱ء تک۔"

(خوشحال برطانوی ہند ترجمہ پراسپرس برٹش انڈیا ص ۱۲)

---

[1] اس دور کا آغاز ۱۶۰۰ء سے ماننا چاہیئے یعنی جب سے ہندوستان میں کمپنی کی تجارت کا دور شروع ہوا (سیاسی تاریخ ہند از سر جان میلکم)

اب ہم ان تینوں اصول حکومت اور تینوں ادوار کے حالات تفصیلیہ مختصر طور پر بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں ان تینوں دوروں اور اصول حکومت میں یہ امر مشترک رہا ہے کہ ہندوستان کی دولت اور سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے اور انگلستان کو پہنچایا جائے۔ اگرچہ طریقہ حصول میں اختلاف نظر آتا ہے۔

تسلّط بذریعہ تجارت
کمپنی کا پہلا دور جو دورِ تجارت کہلاتا ہے
از ۱۶۰۸ء تا ۱۷۵۷ء

پہلے دَور کے متعلق سرولیم ڈگبی لکھتا ہے ؛ "ننگے طور سے علانیہ ہندوستان کی دولت ابتداء سے ۱۷۵۷ء تک (یعنی جنگ پلاسی کے زمانہ تک) سمیٹ کر انگلستان کو پہنچائی گئی۔ اس کی کیفیت خود کمپنی کے ڈائرکٹروں کی مندرجہ ذیل یادداشت سے معلوم ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"ہمارے خیال میں یہ بڑی دولت جو ہم نے ہندوستانی تجارت سے حاصل کی ہے ظالمانہ اور جابرانہ دستور العمل سے مہیّا ہوتی ہے۔ ایسا دستور العمل جس کی نظیر نہ کسی ملک میں ملتی ہے اور نہ کسی زمانہ میں ملے گی"

(تنظیم امرتسر جلد ۱۵ عـ ۹، ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء)

یادداشت مذکورہ بالا میں لفظ بڑی دولت کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کی مختصر کیفیت اس سے معلوم ہوتی ہے کہ مصنف رسالہ "ایسٹ انڈیا ٹریڈ" صفحہ ۳۰ و ۶۱ پر لکھتا ہے۔

"سب سے پہلے ۱۶۰۱ء میں ہندوستان کو جہاز روانہ کئے اور کچھ ایسی مبارک گھڑی سے تجارت شروع کی کہ ہر سفر میں منافع بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ بارہویں سفر میں ہر حصہ دار کو (۳۳۴) فی صدی نفع ہوا۔ انگلستان کی آمدنی میں بھی دن دونی رات چوگنی زیادتی ہوگئی۔ ۱۶۱۳ء میں برطانیہ کی سرکار کو کمپنی نے (۱۳۰۰۰) تیرہ ہزار پونڈ محصول ادا کیا۔ اور ۱۶۶۲ء میں یہ رقم چالیس ہزار تک پہنچی۔ ہندوستان میں پہلے بیس سال کے اندر یہ لوگ تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ پونڈ کا سونا چاندی لائے جس کے بدلے ہندوستان کی مصنوعات خرید کرلے گئے۔ ان اعداد سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا کاروبار شروع ہی میں کس پیمانہ پر پہنچ گیا تھا۔ حالانکہ کمپنی کا مشترک سرمایہ ابتداء میں کل تیس ہزار پونڈ تھا جس کو لندن کے ایک سو ایک تاجروں نے مل کر ہندوستانی تجارت

کے لئے جمع کر کے ملکہ الزبتھ کے دربار میں محضر پیش کرتے ہوئے اجازت کا معیار بنایا تھا جس پر ۳۱ دسمبر سنہ ۱۶۰۰ء میں شاہی منشور کیا گیا تھا۔"
(معیشتہ الہند ص۶۶۳)

لیکن یہ بڑے بڑے منافع اٹھانا ناممکن تھا۔ اگر ہندوستانی تاجروں اور ہندوستانی حکومتوں نے ان کو محبت کے ساتھ اپنے دامن میں جگہ نہ دی ہوتی۔" (روشن مستقبل ص۳۲)

بادشاہ انگلستان چارلس اوّل نے (جن کا زمانہ حکومت سنہ ۱۶۲۵ء لغایت سنہ ۱۶۴۹ء ہے) کمپنی سے دس ہزار پونڈ بطور نذرانہ بنام قرض حسنہ کیا تو کمپنی یہ مقدار پیش نہ کر سکی جس سے چارلس اوّل خوش نہ ہوا اور کمپنی کی حسب خواہش امداد میں اُس نے کوتاہی کی پھر کرام ول بادشاہ انگلستان کا دور آیا (جو سنہ ۱۶۵۰ء سے سنہ ۱۶۶۲ء تک رہا) اور اسی کے عہد میں انگلستان میں جمہوری طریقہ قائم ہوا) کمپنی نے اس کو ساٹھ ہزار پونڈ بطور نذرانہ بنام قرض حسنہ پیش کیا۔ کیونکہ اُس نے کمپنی کی دل کھول کر امداد کی تھی۔

صاحب معیشت الہند لکھتا ہے۔

"غرضکہ کرام ول کی حمایت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو آخری وقت میں تباہی سے بچا لیا اور مردہ تن میں روح پھونک دی۔ کمپنی کا سرمایہ ضرورت اور توقع سے زیادہ بڑھ گیا کاروبار کی گرم بازاری شروع ہو گئی کمپنی نے اپنی حیثیت کے موافق کرام ول کا بہت شکریہ ادا کیا۔ تقریباً ساٹھ ہزار پونڈ قرض حسنہ کے نام سے بطور نذرانہ پیش کئے تاہم کمپنی کرام ول کی بہت شکر گذار تھی۔"
(معیشت الہند ص۶۷)

پھر چارلس دوم سنہ ۱۶۶۱ء سے فرمانروائے انگلستان ہوا اُس نے کمپنی کی امداد میں بہ نسبت سابق بادشاہوں کے بہت زیادہ حصہ لیا۔ صاحب معاشیات ہند ص۶۷ پر لکھتا ہے۔

"کرام ول نے آخری زمانہ میں کمپنی کے مردہ تن میں جان ڈالی تو چارلس دوم نے اس کو جوان رعنا بنا دیا۔ بادشاہ کی موافقت اور حمایت سے کمپنی کے کاروبار کو خوب فروغ ہوا چنانچہ چارلس دوم کا عہد کمپنی کی تاریخ میں ایک مستقل دور شمار ہوتا ہے۔ کمپنی نے بھی احسان شناسی اور شکر گزاری

میں کوئی کمی نہیں کی۔ دل کھول کر نذرانے پیش کئے اور مختلف مواقع پر قرض حسنہ کے نام سے معقول رقمیں داخل کیں چنانچہ تخمینہ کیا جاتا ہے کہ تین چار لاکھ پونڈ چارلس کو کمپنی سے وصول ہوئے"۔

مذکورہ بالا شہادتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کمپنی جس کا سرمایہ ابتدائی ۱۶۰۱ء میں کل تیس ہزار پونڈ تھا تقریباً ساٹھ برس تجارت کرنے کے بعد اس قدر دولت مند ہو جاتی ہے کہ بادشاہ انگلستان کو تین چار لاکھ پونڈ بطور نذرانہ پیش کرتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے اس مدت میں ہندوستان کی اس عجیب و غریب تجارت سے خدا جانے کتنے کروڑ پونڈ حاصل کر لئے ہوں گے۔ جب لاکھوں پونڈ نذرانہ پیش کرتی ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں کمپنی کو پرتگیزوں، ہالینڈی ڈچوں، فرانسیسیوں جرمنوں وغیرہ سے مقابلہ کرنا پڑا اور ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ بار ہا اپنے کاروبار تجارت بلکہ اپنے وجود کو بھی فنا کے گھاٹ اُتر جانے کا خطرہ نظر آنے لگا اگر چارلس اوّل اور کرام ول چارلس دوم اپنے اپنے زمانہ میں کمپنی کے سنبھالنے میں حصّہ نہ لیتے تو وہ یقیناً صفحہ ہستی سے مٹ جاتی۔

اس زمانہ میں کمپنی کے علاوہ دوسری جماعتیں انگریزوں کی بھی انفراداً یا اجتماعاً ہندوستان میں تجارت کرتی تھیں اس لئے کمپنی کو خوب کھل کر کے لوٹ کھسوٹ اور من مانی کارروائیوں میں پُوری آزادی نہ تھی، آپس میں مخالفتیں اور روک ٹوک رہا کرتی تھی بالآخر ۱۷۰۰ء میں ان سبھوں کی ایک ہی جماعت بنا دی گئی جو کہ زیر سرپرستی حکومت انگلستان تجارت میں پیش قدمی اور انہماک کرتی رہی اور حکم ہو گیا کہ کوئی انگریز انفراداً یا اجتماعاً علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی کاروبار ہندوستان میں نہ کرے۔

چنانچہ ۱۷۰۰ء سے کمپنی نے نیا مگر زوردار قدم اٹھایا اسی لئے سر ولیم ڈگبی ۱۷۰۰ء ہی سے پہلا دور بتلاتا ہے۔ حالانکہ اس وقت تک کروڑوں اشرفیاں یہاں سے انگلستان کو لے جا چکی تھی۔ مگر ۱۷۰۰ء سے تجارتی لوٹ کھسوٹ نئے اور پُرزور طریقہ پر جاری ہوئی اور ۱۷۵۷ء تک خالص تجارتی طور پر جاری رہی۔ اس وقت میں پرتگیز بالکل اور ڈچ تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ اب کمپنی بالکل کھل کھیلی اور اس قدر نفع کمایا کہ اس کی کوئی حد اور نہایت ہی باقی نہ رہی۔

ڈائرکٹروں کی یادداشت میں جو ظالمانہ اور جابرانہ دستورالعمل سے اس تجارت کے مہیا ہونے اور اس کی کسی ملک اور کسی زمانہ میں نظیر نہ ملنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کی حقیقت مندرجہ ذیل شہادتوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ہم پہلے ایسی شہادتیں پیش کر چکے ہیں کہ کمپنی کے کارکن ہمیشہ ہی کوشش کرتے تھے کہ کوئی جنٹلمین اور شریف آدمی ہندوستان میں کمپنی کا ملازم ہو کر نہ آئے کیوں کہ وہ شریفانہ طریقہ تمام لین دین اور معاملات میں اختیار کرے گا تو وہ جابرانہ لوٹ کھسوٹ جو کہ بے اندازہ منافع حاصل کرنے کے لئے ہم عمل میں لاتے اور سرکار کمپنی کو سالانہ پہنچاتے رہتے ہیں وہ بند ہو جائے گی تو خطرہ ہے کہ وہ اپنے اپنے سرمایہ کو واپس لے لیں اور کمپنی ٹوٹ جائے اس لئے تمام کارکنان کمپنی جرائم پیشہ ڈاکو، قاتل، چور، جعلساز بدمعاش اور غیر شریف لوگوں کو جمع کرتے تھے اور ایسے ہی لوگوں کو وہاں سے بلاتے تھے اور انتہائی بربریت اور جبر وظلم عمل میں لاتے تھے۔ چنانچہ ہم مسٹر جیمس مل کا مقالہ تاریخ برٹش انڈیا صفحہ ۲۳ سے نقل کر چکے ہیں کہ ۱۶۰۰ء میں جبکہ کمپنی نے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے درخواست دے رکھی تھی اور منظوری کا مسئلہ زیر غور تھا تو گورنمنٹ انگلستان کی طرف سے کمپنی والوں کو لکھا گیا کہ تم اپنی مہم میں سرابڈورڈ مائیکل بورن کو نوکر رکھ لو تو اس کے جواب میں ایک عجیب وغریب ریزولیوشن کی نقل بھیجی گئی جس کا مطلب حسب ذیل تھا۔

"کسی ذمہ داری کے کام پر جنٹلمین کو نہ رکھا جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ ہمیں اپنے کاروبار کے لئے اپنے ہی قسم کے لوگوں کا انتخاب کرنے کی اجازت دی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرفا کو نوکر رکھنے سے کمپنی کے عوام الناس حصہ دار شبہ میں پڑ کر روپیہ واپس لینے لگیں۔"

الغرض کمپنی کی بناوٹ ایسے ہی لوگوں سے تھی اور چونکہ اس وقت کمپنی کا مقصد اصلی اور نصب العین تجارتی منافع تھا اس کے حصہ داروں کی مجلس منتظمہ (کورٹ آف ڈائرکٹرس) سب سے پہلے اپنے سالانہ منافع پر نظر رکھتی تھی۔ لہذا کمپنی کے وہ ملازم جو ہندوستان میں خرید وفروخت پر مقرر تھے چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پاتے تھے۔ فیکٹری کے صدر کو تین سو پونڈ سالانہ ملتے تھے جو کہ سب سے اونچی تنخواہ تھی۔ محرروں اور

دوسرے ملازمین کو دس سے لے کر چالیس پونڈ سالانہ تک دیئے جاتے تھے اور قیام و طعام کمپنی کے ذمہ ہوتا تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں پونڈ دس روپیہ کو چلتا تھا اس لیئے کمپنی کے عام ملازمین کو آٹھ روپیہ ماہوار اور کھانے سے لے کر لیفٹیننٹ ۳۳ روپئے ماہوار اور کھانا تک ملتا تھا اور ملازمت کے ساتھ تجارت کا نفع ایک غیر معین چیز تھی۔ اس کے لئے وہ لوگ چھ ماہ کا سفر کر کے یہاں آتے تھے۔ ان تنخواہوں پر بھلے مانس اور شریف لوگ تو کاہے کو اپنے گھر بار چھوڑ کر آتے تھے۔ چنانچہ ملک کے نکمے اور شریر جرائم پیشہ لوگ جن کو وہاں روٹی ملنی مشکل تھی بالخصوص اس وجہ سے کہ اس زمانہ میں انگلستان میں قحط بہت زیادہ پڑتا تھا اور ہندوستان میں بہت زیادہ ارزانی تھی ہندوستان کے لئے ٹوٹ پڑے۔ جن کی وجہ سے کمپنی کی فیکٹریاں بداعمالیوں کے اڈے بن گئیں ان لوگوں نے ہر قسم کے مظالم اور وحشیانہ کارروائیاں بے تحاشا جاری کیں۔ اور ہر طریقہ پر روپیہ پیدا کرنے میں جدوجہد عمل میں لاتے رہے۔ چنانچہ نواب کرناٹک کا مندرجہ ذیل مقالہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں جو کہ انہوں نے کمپنی کے ڈائرکٹروں کو لکھا تھا۔

"آپ کے نوکروں کا اس ملک میں کوئی کاروبار تو ہے نہیں۔ نہ آپ انہیں معقول تنخواہ دیتے ہیں پھر بھی چند ہی سال میں وہ کئی کئی لاکھ اشرفیاں کما کر واپس جاتے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں بغیر کسی ظاہری ذرائع کے یہ بے حساب کمائی کہاں سے آتی ہے ہم اور آپ دونوں سمجھ سکتے ہیں۔"

انہیں جیسے لوگوں کے متعلق وارن ہسٹنگز نے مندرجہ ذیل مقالہ لکھا تھا جس کو ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔

"انگریز ہندوستان میں آ کر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے۔ جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرأت کر ہی نہیں سکتا، ہندوستان میں اُن کے ارتکاب کے لئے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔"

سرٹامس منہم کہتا ہے:۔

"میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں کہ بمقابلہ اور قوموں کے انگریز غیر ممالک میں سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں۔ اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش

آرہا ہے۔"

مدراس کے بڑے پادری صاحب کی اس تحریر کو جو انہوں نے انگریز جرائم پیشہ رذیل اور شریر لوگوں سے تنگ آکر کمپنی کے ڈائرکٹروں کو ۱۷۶۶ء میں لکھی تھی ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں جو کہ حسب ذیل تھیں۔

"آپ کے ملازموں کی بداعمالیوں سے ہندوستانیوں کی نظر میں آپ کے خدا کی جتنی بے عزتی ہوتی ہے اور آپ کا مذہب جتنا بدنام ہو رہا ہے اس کی کیفیت اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ کے آنسوؤں کی ندیاں بہہ جائیں۔ جو لوگ آتے ہیں ان میں بعض تو قاتل ہوتے ہیں۔ بعض آدمیوں کو بھگا لے جانے کا کام کرنے والے اور بعض انگلستان میں بیویاں چھوڑ کر آتے ہیں اور یہاں پھر شادیاں کر لیتے ہیں۔"

غرض کہ کمپنی نے تمام کارکن ایسے ہی دنی الطبع اور غیر شریف قصدًا جمع کیے تھے جن کو کسی شرمناک اور انسانیت سوز کارروائی سے رکاوٹ نہ تھی اور اپنے مقاصد ملعونہ لوٹ کھسوٹ اور زرکشی میں نہایت آزادی سے بلاخوف وخطر ہر قسم کی کارروائی کرتے تھے۔ مشتے نمونہ از خروارے کرناٹک کا ایک تاریخی واقعہ ملاحظہ ہو۔

ان کے روپیہ کمانے کے مختلف قسم کے طریقے تھے ان میں سے ایک قرضہ دینا بھی تھا مگر جس نوعیت کے یہ قرضے ہوتے تھے اُن کی نظیر دنیا میں ملنی مشکل ہے۔ چنانچہ مسٹر برک نے ایک قرضہ کی نسبت لکھا ہے:۔

"نواب کرناٹک کو روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ کیونکہ فوج کی تنخواہ تقسیم نہ ہوتی تھی جس سے وہ فساد برپا کرتی رہتی تھی۔ مدراس کونسل نے دوستانہ طور پر سمجھایا کہ ان شوریدہ سر فوجیوں کو دبائیے۔ نواب نے جواب دیا کہ روپیہ سے مجبور ہوں کیا کروں۔ اس پر انگریزی حکومت نے چند ساہوکاروں کو آمادہ کر دیا کہ نواب کو چار لاکھ اشرفی (ریکوڈا) قرض دے دیں۔ یہ ساہوکار مسٹر ٹیلر، مسٹر میجنڈی، مسٹر کال تھے۔ یہ راضی تو ہو گئے مگر اس شرط پر کہ مدراس کی انگریزی حکومت نواب کی ضمانت کرے۔ چنانچہ ضمانت کر لی گئی اور طے پایا کہ چند اضلاع قرض خواہوں کو سپرد کر دیئے جائیں جن کی

مالگزاری سے وہ اپنا سود وصول کرتے رہیں۔ اس کے مطابق نواب سے معاہدہ ہوگیا اور اُس نے فوراً سپاہیوں کو علیحدہ کرکے اعلان کردیا کہ ان کی چڑھائی تنخواہیں ادا کردی جائیں مگر ان انگریز ساہوکاروں کے پاس سے قرضہ کا روپیہ نہ آیا۔ بڑے تقاضوں کے بعد جواب آیا تو یہ تھا کہ نقد زرِ نذر پیہہ اس وقت نہیں ہے۔ چار ماہ کے اندر ادا کردیا جائے گا۔ سرِدست ہم آپ کو رقعہ لکھے دیتے ہیں کہ اس میعاد کے اندر روپیہ دے دیں گے۔ نواب نے افسروں کو بلاکر حال بتایا اور کہا کہ فوجیوں کو سمجھا بجھا کر مطمئن کر دو کہ چار مہینہ بعد تنخواہ مل جائے گی۔ مگر چار مہینے کی جگہ پورے دو سال گزر گئے اور فوجیوں کی بقایا پوری ادا نہ ہوئی۔ جس کی وجہ سے نواب کو مزید دو سال کی تنخواہیں دینا پڑیں۔ مگر ساہوکاروں کی اس قدر نادہندی کے باوجود نواب کی ریاست کی مالگزاری قرضہ کے سود میں اسی دن سے جس دن سے کہ رقعہ لکھا گیا تھا جانے لگی۔ گویا انہیں اضلاع کی مالگذاری سے موعودہ رقم بااقساط دی گئی۔ غالباً دنیا میں یہ ایک ہی مثال ہو گی کہ روپیہ کی ادائیگی سے قبل قرض خواہوں کو جائداد پر قبضہ مل جائے۔ اور اس سے وہ اپنے سود کا روپیہ وصول کرنا شروع کردیں اور پھر اُلٹا قرض داروں کے نام غیر ادا شدہ رقم کا رقعہ لکھیں اور مرہونہ جائداد سے وصول کرکے دو سال بعد قرض داروں کو روپیہ دیں۔

(روشن مستقبل ص ۳۹ از تصانیف برک جلد ۳ ص ۲۰۵ تا ۲۱۰)

یہی وہ کیمیا بنانے کے نسخے تھے جن سے تھوڑے ہی دنوں میں انگریز ساہوکار اور تاجر اور ان کا ملک مالا مال ہونے لگا۔ ابھی کرناٹک کی مرہونہ جائداد سے کمائی کرنے کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ بنگال کے خزانوں کے دروازے اُن پر کھُل گئے۔ بہرحال ۱۸۵۷ء تک کمپنی کا یہ شرانت اور انسانیت سوز طریقہ تجارت جابرانہ اور ظالمانہ طور کا جاری رہا جس سے نہایت عظیم الشان دولت ہندوستان سے چوس لی گئی۔

کمپنی کا دوسرا دَور
تسلّط بذریعہ اطاعت بالجبر
از ۱۷۵۷ء تا ۱۸۳۲ء

اس کے بعد دوسرا دَور شروع ہوتا ہے جس کی ابتداء جنگ بنگال یعنی نواب سراج الدولہ کی پلاسی کی لڑائی سے ہوتی ہے۔ سر ولیم ڈگبی اس کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ لکھتا ہے:۔

کمپنی کا دوسرا دَور جو کہ جبر کا کہلاتا ہے۔ دوم تسلّط بذریعہ اطاعت بالجبر۔ ہندوستان انگلینڈ کے لئے ہے آغاز سے انجام تک۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۳۲ء تک۔ اس کی تفصیل نہایت ہی دردانگیز اور دہشت ناک ہے اور اس قدر طویل ہے کہ اس کے لئے دفتروں کی ضرورت ہے ہم اس مقام پر نمونہ کے طور پر چند شہادتیں پیش کریں گے جن سے حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ مگر ان شہادتوں سے پہلے واقعہ کی تفصیل پر مختصر روشنی ڈالنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

کلکتہ میں بیٹھ کر انگریزوں نے ایک سازش کا سلسلہ شروع کیا جس میں میر جعفر اور امی چند شریک تھے۔ انگریز مورخ واقعات لکھتے نہیں بلکہ تصنیف کرتے ہیں۔ اس سازش کو اس بددلی کا نتیجہ بتلاتے ہیں جو بنگال کے ہندو محکوم کو مسلمان حاکم سے پیدا ہو گئی تھی اس الزام کی تردید ہمارے مبحث سے خارج ہے۔ بہرکیف سازش مکمل ہوتے ہی جنگ چھیڑ دی گئی اور پلاسی کے میدان میں دونوں لشکر بالمقابل آ گئے۔ سراج الدولہ کے چالیس ہزار پیادے اور پندرہ ہزار سوار انگریزوں کے صرف تین ہزار سپاہ کے مقابلہ میں تھے۔ لیکن انگریزوں کی قوت کا مدار تعداد پر نہیں بلکہ نظم اور دوسری چیزوں پر تھا۔ یہ دوسری چیزیں کیا تھیں۔ یہ فریب اور نمک حرامی دغا اور سازش تھیں جن میں سراج الدولہ گھرا ہوا تھا اور باوجود نام نہاد کثیر جمعیت کے درحقیقت اکیلا اور بے یار و مددگار تھا چنانچہ صبح کے آٹھ بجے سے دن کے بارہ بجے تک کل چار گھنٹہ میں اس تاریخی جنگ کا فیصلہ سراج الدولہ کے خلاف ہو گیا۔

انگریزوں کی طرف سے سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر کو نمک حرامی کے صلہ میں مرشد آباد کی سند دی گئی۔ اس جنگ کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریزی فوج میں سے صرف تئیس سپاہی اور نواب کی فوج میں پانچ سو آدمی کام آئے یہ تعداد جلیانوالہ باغ اور بلوہ کانپور کے مقتولین سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اس جنگ نے

ایک وسیع اور شاداب ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ فورٹ ولیم میں سونے کا مینہہ برسنے لگا۔ میر جعفر کی طرف سے تین لاکھ پونڈ یعنی تیس لاکھ روپیہ کلائیو کو نذر کیا گیا۔ اور کلکتہ کا جنوبی علاقہ اسے جاگیر میں دیا گیا۔ جس کی آمدنی دس لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اس طرح ساٹھ ہزار پونڈ یعنی چھ لاکھ روپیہ کونسل کے ممبروں کو پیش کیا گیا۔ یہ تو ذاتی انعامات تھے۔ کمپنی کے ہرخرچہ اور تاوان کے مطالبات ان سے الگ تھے جن کو اس وقت پورا کرنے کی گنجائش خزانہ میں نہ رہی تھی اس لئے صرف نصف کی ادائیگی ہو سکی۔ چوبیس پرگنہ کا علاقہ کمپنی کی جاگیر ٹھہری۔ بقول میکالے۔

"کمپنی اور اس کے نوکروں پر موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ اسّی لاکھ روپیہ دریا کے راستہ مرشد آباد سے کلکتہ روانہ کر دیا گیا۔ سو سے زیادہ کشتیاں تھیں۔ جھنڈیاں اڑ رہی تھیں اور باجا بجتا جاتا تھا۔ چند ماہ پہلے جو کلکتہ ویران تھا آج ایسا خوشحال ہو گیا کہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا تجارت چمک اٹھی۔ ہر انگریز کے گھر میں دولت کے آثار دکھائی دینے لگے۔"

(سوانح کلائیو مصنفہ میکالے ص ۵۱)

اس جنگ کی کامیابی سے جو ۱۷۵۷ء میں ہوئی کمپنی کے خالص تجارتی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ جو ۱۶۰۸ء سے شروع ہو کر پورے ڈیڑھ سو سال تک رہا اور اب تک ایک وسیع ملک ہاتھ میں آجانے سے تجارت کے ساتھ حکومت کا دور شروع ہوا۔

(روشن مستقبل ص ۴۱، ۴۲)

علاوہ اس مقدار کے جو میر جعفر سے حاصل کی گئی عام لوٹ کا بازار بھی گرم کیا گیا چنانچہ لارڈ کلائیو کہتا ہے (دربارہ لوٹ بنگال)

"تین کروڑ انسانوں کو لوٹ کر کلکتہ میں عظیم الشان دولت بہت جلد جمع کر لی گئی تھی۔ ہندوستانی قدیم زمانوں میں معمولی معمولی نظام کی خرابی پر اپنے حاکموں کو برطرف کر دیا کرتے تھے۔ مگر انگریزی حکومت سنگدل سے سنگدل وحشی اور مستبد حکومتوں کی طرح ظالم اور سخت تھی۔ مزید براں تمام تمدنی طاقتور ہتھیاروں سے مسلح تھی۔"

(تنظیم امرتسر مورخہ ۲۸/ اگست ۱۹۲۸ء)

یہی لارڈ کلایو دوسری جگہ کمپنی کے کارکنوں کے متعلق لکھتا ہے :۔
"میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس قدر بدعملی، رشوت خواری اور زیادہ ستانی کا منظر بجز بنگال کے کسی ملک میں دیکھا یا سُنا نہیں گیا۔"
(حکومت خود اختیاری ص۱۱۰ از سوانح عمری لارڈ کلایو مصنفہ میلکم)
بروکس اینڈرسن کہتا ہے (کتاب قانون تمدن وتنزل)
یہ مالا مال خزانے کروڑوں آدمیوں کی کمائی انگریزوں نے ہتھیا کر لندن اُسی طرح بھیجدی جس طرح رومن نے یونان اور پونٹس کے خزانے اٹلی بھیجدیئے تھے۔ ہندوستانی خزانے کتنے قیمتی تھے، کوئی انسان بھی اس کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ لیکن وہ کروڑوں اشرفیاں ہوں گی۔ اتنی دولت اس وقت کی مجموعی یورپین دولت سے بہت زیادہ تھی جب میں ۱۷۵۰ء میں انگلستان آیا تو یہاں بڑے بڑے شہر تھے جہاں کوئی بینک نہ تھا۔ بنگال کی چاندی نے انگلستان پہنچ کر نہ صرف دولت میں بے شمار اضافہ کیا بلکہ اس کی رفتار بھی بہت تیز کردی۔"
(تنظیم امرتسر مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء وحکومت خود اختیاری ص۷۹ از ان ہیپی انڈیا ص۳۴۳)
سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے۔ از کتاب "قانون تہذیب وتنزل" مصنفہ بروک ایڈمسن)
"معرکہ پلاسی کے بعد ہی بنگالہ کی دولت لُٹ لُٹ کر لندن پہنچنے لگی اور اُس کا اثر فوراً ہی ظاہر ہوگیا۔ کیونکہ ماہران فن اس امر پر متفق ہیں کہ صنعت وحرفت کا انقلاب ۱۷۶۰ء سے شروع ہوا۔ بقول بینز کے ۱۷۶۰ء سے پہلے لنکا شائر میں سوت کاتنے کے جو چرخے رائج تھے وہ ایسے ہی سیدھے سادے ہوتے تھے جیسے ہندوستانی چرخے۔ ایجاد بجائے خود ایک بیجان چیز ہے۔ بہت سی ایجادات صدیوں تک دبی پڑی رہیں اور جب تک انہیں حرکت دینے والی قوت پیدا نہ ہوگئی وہ دنیا کے سامنے نہ آسکیں۔ یہ قوت ہمیشہ روپیہ سے فراہم ہوتی ہے۔ صنعت وحرفت میں انگلستان کی برتری کرناٹک اور بنگالہ کے خزانوں کا فیض ہے۔ جو اس

وقت کے فائدے کے لئے حاضر تھے۔ پلاسی کی جنگ فتح ہونے سے پہلے جبکہ سونے کا دریا انگلستان کی طرف بہنا شروع نہ ہوا تھا ہماری صنعت و حرفت کا بازار ٹھنڈا تھا۔ چرخوں کے لحاظ سے سوت کاتنے اور کپڑا بننے میں لنکا شائر کو ہندوستان پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی البتہ وہ دستکاری جس نے ہندوستانی کپڑے کو صناعی کا عجوبہ بنا رکھا تھا لنکا شائر میں کیا مغرب میں کہیں بھی موجود نہ تھی۔ جو حال روئی کا تھا وہی لوہے کا بھی تھا کان کنی اور آہن گری دونوں کام انگلستان میں بہت معمولی رفتار سے چل رہے تھے۔" (انڈسٹریل رپورٹ مالوی ص۳۰۲)

میجر وینگیٹ کہتا ہے:۔

"ایسٹ انڈیا کے ڈائرکٹروں کے سرسری اندازہ کے ساتھ بڑی آسانی سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ پلاسی اور جنگ واٹرلو کے درمیانی زمانہ میں ہندوستان سے انگلستان کو پندرہ ارب روپیہ جا چکا تھا۔"

لارڈ میکالے دربارہ لوٹ بنگال لکھتا ہے۔

"اس طریقہ سے بے شمار دولت بہت جلد کلکتہ میں جمع ہو گئی دراں حالیکہ تین کروڑ انسان حد درجہ برباد کر دیئے گئے۔ بیشک ان لوگوں کو مظالم میں رہنے کی عادت تھی مگر وہ مظالم اس قسم کے نہ تھے کمپنی کے لوگوں کی چھوٹی انگلی انہیں سراج الدولہ کے پٹھے سے زیادہ موٹی معلوم ہوتی تھی پرانے زمانے کے حکام کے زمانہ میں اُن کے ہاتھ میں ایک علاج تھا وہ یہ کہ جب ظلم ناقابل برداشت ہو جاتا تو وہ بغاوت کر کے حکومت توڑ دیتے تھے مگر انگریزی حکومت ہلائے ہل نہیں سکتی تھی۔ یہ حکومت وحشیوں کی سی حد درجہ ظالمانہ حکومت ہونے کے ساتھ جدید تہذیب کے آلات کی طاقت سے مضبوط تھی۔"

(حکومت خود اختیاری از مضامین میکالے نسبت لارڈ کلایو ص۹)

سر ولیم ڈگبی کہتا ہے:۔

"قبل اس کے کہ جنگ پلاسی فتح ہوئی اور ہندوستان کے خزانے بہہ بہہ

کر انگلستان میں آنے شروع ہوئے ہمارے ملک انگلستان کا جوار بھاٹا نہایت نیچا تھا۔ خود انگلستان کی صنعتی ترقی بنگال کے بیشمار دولت کے ذخیروں اور کرناٹک کے خزانوں کی بدولت ہوئی۔" (روشن مستقبل صـ۴۸)

لارڈ میکالے لکھتا ہے:۔

"دولت کے دریا یہاں سے انگلستان کو بہتے چلے جاتے تھے۔"
(روشن مستقبل صـ۴۸)

سر جان شور (جس کا تعلق بنگال سول سروس سے تھا قانون ۱۹۳۳ء پر بحث کرتے ہوئے) لکھتا ہے:۔

"لیکن ہندوستان کا عہد زرّیں (سنہرا زمانہ) گذر چکا ہے۔ جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اُس کا جزو اعظم ملک کے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے۔"
(حکومت خود اختیاری صـ۲۶)

اس زمانہ میں کمپنی نے ایک اور عجیب و غریب نئی تجارت کی بنا ڈالی اور وہ گدّیوں کی تجارت تھی۔

محمد علی کو کرناٹک میں اور میر جعفر کو بنگال میں تخت دلانے سے یہ تجربہ ہُوا تھا کہ سلطنت کے ہر انتقال سے انگریزی خزانہ مالا مال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میر جعفر کو ہٹا کر میر قاسم کو مسند پہ بٹھایا گیا۔ میر قاسم نے بغاوت کی تو پھر میر جعفر سے سودا کر لیا گیا۔ اس کے بعد نجم الدولہ سے سودا کیا گیا۔ اس سوداگری سے انگریزوں نے جو نفع حاصل کیا اس کی مقدار پانچ کروڑ کے قریب ہوتی ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۷۵۷ء میں میر جعفر کی تخت نشینی پر ۳۰۰۱۰۷۵۰ کروڑ
۱۷۶۰ء میں میر قاسم کی تخت نشینی پر ۲۶۲۷۶۹۰ لاکھ
۱۷۶۳ء میں میر جعفر کی دوسری تخت نشینی پر ۱۴۱۸۴۹۹۰ کروڑ
۱۷۶۵ء میں نجم الدولہ کی تخت نشینی پر ۱۹۷۶۹۰۰ لاکھ

۴۹۴۰۰۳۳۰ کروڑ

اسی قسم کے طریقوں سے ۱۷۷۰ء تک جو رقم کمپنی اور اس کے ملازمین کے پاس پہنچی اس کی میزان ساڑھے اونتیس کروڑ روپیہ کے قریب ہوتی ہے جس میں فوجی اخراجات

"تاوان، نذرانے اور مالگذاری کی بچت بھی شامل ہے" (روشن مستقبل ص۴۸)
"کمپنی کی لوٹ کھسوٹ اور زرکشی کا سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہا اور تقریباً بیس برس کے بعد مسٹر برک نے ہسٹنگز کے مقدمہ کے دوران میں اس کل رقم کا جو اس وقت تک یہاں سے انگلستان پہنچ چکی تھی چالیس کروڑ کے قریب اندازہ کیا تھا"
(روشن مستقبل ص۴۸ از تقاریر برک مقدمہ ہسٹنگز ص۱۷ ج۱)

حکومت اور اس نئے اور عجیب طریقہ کی لوٹ کھسوٹ کی تجارت کے ساتھ ایک اور عجیب و غریب طریقہ حاصل کیا گیا کہ فرخ سیر بادشاہ دہلی کی لڑکی جل گئی اس کا علاج دہلی کے اطبا کے قابو میں نہیں آیا تو ڈاکٹر ہملٹن کو کمپنی نے پیش کیا اتفاق ایسا پیش آیا کہ ڈاکٹر ہملٹن مذکور کا علاج کامیاب رہا اور لڑکی درست ہوگئی۔ فرخ سیر بہت خوش ہوا اُس نے حسب عادت پادشاہان ہند اس کو زر و جواہر سے مالامال کرنا چاہا۔ ڈاکٹر ہملٹن نے اس کے لینے سے انکار کردیا اور اس کے عوض میں یہ استدعا کی کہ کمپنی کو اس ٹیکس سے جو تجارت پر لیا جاتا ہے مستثنیٰ کردیا جائے۔ اہل دربار شاہی اس کے زہریلے نتائج تک نہ پہنچ سکے اور پادشاہ سے فرمان اس قسم کا جاری کرادیا کہ کمپنی کے تمام کارکن تجارتی ٹیکس سے مستثنیٰ رکھے جائیں۔ یہ حکم جاری ہونا تھا کہ انگریزوں نے تمام ملک میں اودھم مچادی اور ہر قسم کی تجارت میں گرم بازاری شروع کردی اور کروڑوں کا سودا کرنے لگے۔ ہندوستانی تاجروں کے تمام کاروبار بند ہوگئے اور طرح طرح سے انگریزوں نے ہر قسم کی تجارت پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت کی کیفیت کا نقشہ مندرجہ ذیل تاریخی تحریر سے معلوم ہوگا۔

"پلاسی کی لڑائی کے بعد بنگال کی حکومت اب برائے نام میر جعفر کی رہ گئی اور سلطنت پر در پردہ قبضہ کمپنی کا ہوگیا۔ اس طرح ذمہ داری نواب کی رہی اور اختیارات کمپنی کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس صورت حال میں کمپنی کو ناجائز مالی فائدے اُٹھانے کا خوب موقعہ ملا جو اس کا اصلی مقدمہ تھا اور اس نادر موقعہ کے مل جانے سے کمپنی کے سینوں میں حرص و آز کے جذبات بہت مشتعل ہوگئے زرکشی اور اخاذی (لوٹ) کی لگن بے لگام ہوگئی۔ اس سے قبل ڈاکٹر ہملٹن فرخ سیر کا معالج رہ کر انگریزی

مال کو تمام محصولوں سے مستثنیٰ کرا چکا تھا۔ حالات سب سازگار جمع ہو گئے تھے اس لئے کمپنی کے ملازموں نے نجی تجارت شروع کردی اور ایسی شروع کی کہ بنگال میں شاید ہی کوئی بڑی منڈی ہو گی جہاں گھی، پان، بانس چانول بھس وغیرہ کی خرید و فروخت انگریز نہ کرتے ہوں۔ دیسی سوداگر جنہیں سرکاری محصول بھی دینا پڑتے تھے کمپنی کے مال کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے انگریز تاجروں سے خود نواب ڈرتا تھا۔ اس لئے اس کی پولیس اور اس کی کچہریاں ان کو سزا نہ دے سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کے نام سے لوٹ شروع ہو گئی۔ انگریز سوداگر جس مال پر ہاتھ رکھ دیتے اس کو خریدار آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا اس لئے یہ لوگ اس مال کو من مانی قیمت پر خرید لیتے تھے اور اپنا مال نکالنا ہوتا تو جب تک کہ اس کی نکاسی نہ ہو جاتی دوسرے سوداگر دوکان بند رکھنے پر مجبور ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ جس ہندوستانی تاجر کو محصول سے بچنا ہوتا تو وہ کسی انگریز گماشتہ کی مٹھی گرم کرکے اس سے ایک دستک حاصل کر لیتا جس سے کسی محصل کی مجال نہ تھی کہ مال پر محصول مانگ سکتا اس کی وجہ سے کمپنی کے ادنیٰ ادنیٰ محرر دیسی سوداگروں کے ہاتھ دستکیں بیچ بیچ کر دو دو تین تین ہزار روپیہ ماہوار پیدا کر لیتے تھے۔ خود نواب بے دست و پا تھے۔ زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے تو یہ کہ ظالم ملازموں کی شکایت انہیں کے بے رحم افسروں سے کرتے چنانچہ میر قاسم نے حکام کمپنی سے حسب ذیل فریاد کی :۔

”ہر پرگنہ گانوں اور منڈی میں انگریزی گماشتے نمک، چھالی، گھی، چانول بھس، بانس، مچھلی تمباکو وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے ہیں، رعایا کا مال زبردستی اُٹھا لیجاتے ہیں اور چوتھائی قیمت بھی نہیں دیتے۔ اور ان کے ظلم و جبر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے مال کے بدلہ ایک کی جگہ پانچ زبردستی لے لیتے ہیں۔ ان بے عنوانیوں کی بدولت نیز محصولوں کی معافی کے سبب مجھے پچیس لاکھ روپیے کا نقصان ہو رہا ہے“

(روشن مستقبل ص ۴۶ از تاریخ دت ص ۲۳)

مگر ایسی شکایتوں کا اثر ہی کیا ہوتا دولت کی چاٹ نے کمپنی کے لوگوں کو رحم و انصاف کے جذبات سے خالی کر دیا تھا بالآخر مجبور ہو کر میر قاسم نے دیسی سوداگروں کو بھی محصول سے معاف کر دیا اس پر انگریز بگڑ گئے اور ایسے بگڑے کہ میر قاسم کو بنگال چھوڑ کر شمالی ہند کی طرف جانا پڑا اور پھر وہاں سے شجاع الدولہ والیٔ اودھ اور شاہ عالم کی مدد لے کر بنگال کا رُخ کیا تو انگریزوں سے ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر شکست کھائی اس سے اگلے سال ۱۷۶۵ء میں الہ آباد کا مشہور صلح نامہ ہوا جس کی رُو سے کمپنی کو بادشاہ دہلی کی طرف سے بنگالہ کا دیوان یعنی مال گزاری وصول کرنے والا افسر مقرر کر دیا گیا اور اس کے بدلے میں بادشاہ کا نذرانہ مقرر ہو گیا۔ نواب بنگال کے ذاتی مصارف اور انتظامی محکموں کے اخراجات کے لئے ایک رقم معین کر دی گئی۔ اور قرار پایا کہ ان دو مصارف کی منہائی کے بعد جو بچے وہ کمپنی کا ہو اس معاہدہ کے وقت تک تو انگریزی عمل دخل بے ضابطہ طور پر تھا۔ اب شاہی فرمان کی رُو سے انگریزی قبضہ کے جواز کی سند مل گئی۔" (روشن مستقبل ص ۷۶، ۷۷)

اس کے بعد کمپنی کے لئے ایک اور نیا طریقہ لوٹ کھسوٹ کا ہاتھ آ گیا۔ زمین کا بندوبست اور اس کا لگان اس کا ٹھیکہ اور نیلام اس کی مال گزاری کا اضافہ یہ سب نئے نئے ذرائع پیدا ہو گئے۔ دیوانی ملنے کے بعد ہی اضافہ مالگذاری کیا گیا۔ اور پہلے لگان پر فیصدی نوے یا اس سے زائد اضافہ کیا گیا۔ جس سے کاشتکار بالکل تباہ ہو گئے اور کمپنی کے یہاں سونے کی بارش ہونے لگی۔ الحاصل اس تمام دَور میں جس کی ابتداء جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء سے ہوتی ہے جابرانہ طور پر طرح طرح سے دولت اور سرمایہ کی لوٹ جاری ہوئی اور بے شمار خزانے ہر طرف سے لٹ لٹ کر لندن میں پہنچنے لگے۔ کمپنی ایک طرف تو قسم قسم کی تجارت سے خوب ہاتھ پاؤں پھیلا کر لوٹتی تھی دوسری طرف حکومت کے ذریعہ سے خوب من مانی لوٹ کھسوٹ کرتی تھی۔ بکسر کی فتح کے بعد لارڈ ویلزلی کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی گورکھپور روہیلکھنڈ جنوبی دوآبہ کے علاقوں پر قابض ہو گئی اور اسی عہد میں کرناٹک کے نواب کو معزول اور ٹیپو سلطان کو شہید کر دینے کے بعد

وہ تمام علاقے حاصل کر لئے گئے جو اب مدراس کے احاطہ میں شامل ہیں اور وہاں کے تمام خزانے لوٹ کر انگلستان میں پہنچا دیئے گئے (ان علاقوں کے حاصل کرنے میں جو بدنیتی اور بدعہدی کمپنی کی طرف سے عمل میں لائی گئی اس کی تفصیل اس جگہ خارج از مبحث ہے) یہ جابرانہ اور غیر آئینی طریقہ ۱۸۳۲ء تک برابر جاری رہا۔

کمپنی کا تیسرا دَور
تسلّط بذریعہ پوست یعنی خوش معاملگی کا دکھلاوا
از ۱۸۳۳ء تا ۱۹۰۱ء

اس کے بعد تیسرا دَور شروع ہوتا ہے جس کو سر ولیم ڈگبی تسلّط بذریعہ پوست (یعنی خوش معاملگی کا دکھاوا اور زور کے ساتھ ہندوستانی قوم کو ادنیٰ حالت میں لازمی طور پر قائم رکھنا) بتلاتا ہے یہ دَور ۱۸۳۳ء سے آخر تک قائم رہا۔ یہ دَور آئینی دور کہلاتا ہے اس دَور میں مطیع اور فرماں بردار رعایا کے لوٹنے اور زائد سے زائد کھسوٹنے کے نئے نئے قوانین طرح طرح کے بنائے گئے جن میں کوئی دخل ہندوستانیوں کو نہیں ہوتا تھا اور انگریز اپنے مقاصد و اغراض کے ماتحت اپنی آہنی قوت اور مضبوط شکنجہ کے بل بوتے پر گھمنڈ کر کے بغیر رحمت اور عدل و انصاف کے جو قانون چاہتے تھے بناتے تھے اور خوشنما الفاظ میں شائع کرتے رہتے تھے۔ محکوم رعایا ہند کی خواہشوں اور ضرورتوں کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا تھا بلکہ ان سے زیادہ دولت چوستے رہنا اور ان کو دائمی غلامی میں جکڑ بند رکھنا انگریز کا مطمح نظر ہوتا تھا۔ چوں کہ تاج برطانیہ پر کمپنی کی دو رُخی پالیسی تاجرانہ اور ملوکانہ کی شکایتیں بہت زیادہ ظاہر کی گئیں تھیں اور کہا گیا تھا کہ تاجرانہ ہوس اور طمع زر کشی میں کمپنی کے ارکان اس قدر بدمست ہیں کہ ان کو ذرہ برابر بھی رعایا کی بہبودی اور زندگی کی پرواہ نہیں ہے۔ تاجرانہ ہوس اور حصول منفعت کے لئے انہوں نے حکومت کو ذریعہ بنالیا ہے جس کی وجہ سے تمام ملک برباد ہوتے ہوتے آخری رمق پر پہنچ گیا ہے۔ پادشاہت کے جذبہ رعایا پروری کا ان میں ذرا بھی وجود نہیں ہے اس وجہ سے تاج برطانیہ نے کمپنی کو ۱۸۳۲ء سے تجارتی حیثیت سے نکال دیا اور حکم کر دیا کہ وہ صرف ملک گیری اور حکومت کے فرائض انجام دے اور علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوسرے انگریز اور ان کی کمپنیاں آزادی سے تجارتی خواہشات پوری کریں۔ اس میں اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اراکین کی چیرہ دستی ہندوستانیوں پر

کچھ کم ہو گئی مگر اس کے ملازموں کے بجائے دوسرے انگریز تاجروں اور ان کی کمپنیوں کی یورہ دستی پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی چونکہ تجارتی آمدنی کم ہو گئی اس لیئے اس کے کارکنوں نے نئے نئے طریقے لوٹ کھسوٹ کے برتنے شروع کر دیئے اور ہوس ملک گیری کی سازشیں روز افزوں ہونے لگیں۔ ہندوستانی راجاؤں کا ہمیشہ سے دستور تھا کہ اگر کوئی راجہ لاولد ہوتا تھا تو وہ اپنے خاندانی یا غیر خاندانی بچے کو اپنا متبنیٰ قرار دیتا تھا اور وہ ریاست کا بعد میں حقیقی بیٹے کی طرح مالک قرار دیا جاتا تھا۔ اس کی طرح متعدد ریاستیں ہندوستان میں موجود تھیں۔ ہندوستانی بادشاہ اور رجواڑے اور خود کمپنی کے افسر ہمیشہ سے اس کو تسلیم کرتے چلے آتے تھے مگر ہوس ملک میں کمپنی نے یکبارگی اس طریقہ کو ناجائز قرار دے کر غیر معتبر ہونے کا اعلان کر دیا اور تقریباً پندرہ ریاستیں اپنے قبضہ میں کر لیں۔ اسی طرح بلاوجہ صوبہ سندھ صوبہ اودھ، صوبہ پنجاب وغیرہ کو یکے بعد دیگرے اپنے قبضہ میں لے آئے۔ الحاصل اس زمانہ میں ایسے ایسے طریقے عمل میں لائے جانے لگے کہ جن پر ملمع تو بہت خوبصورت ہوتا تھا اور لوٹ کھسوٹ پہلے سے زیادہ ہوتی تھی اور ساتھ ساتھ بسا اوقات بغیر ملمع کے بھی دوسرے دور کی یادگاریں قائم کی جاتی تھیں۔ اسی دَور کے متعلق سر ولیم ڈگبی پراسپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے:۔

"مگر اس میں شبہ نہیں کہ آج ہندوستان اس سے زیادہ شرمناک طور پر لوٹا جا رہا ہے جتنا کہ اس سے پہلے کبھی لوٹا گیا تھا۔ ہماری ابتدائی حکومت کی باریک چابک اب آہنی زنجیر بن گئی ہے۔ کلایو اور ہسٹنگس کی لوٹ اس نکاس کے مقابلہ میں ہیچ ہے جو روز افزوں ترقی کے ساتھ ایک ملک دوسرے ملک کا خون جان بہا کر مالا مال کر رہا ہے۔"

(خوشحال برطانوی ہند ترجمہ پراسپرس برٹش انڈیا صفحہ ۱۳)

منٹگمری مارٹن سنہ ۱۸۳۸ء میں لکھتا ہے:۔

اگر دولت کا ایسا مسلسل اور روز افزوں سیلان انگلستان سے ہونے لگے تو ایک دن وہ بھی محتاج ہو جائے۔ پھر خیال فرمایئے کہ ہندوستان پر کتنا سخت اثر ہونا چاہیئے جہاں معمولی مزدور کو دو یا تین پینس روزانہ اُجرت ملتی ہے۔"

(حکومت خود اختیاری ص۵۳)

سر جان سلیوین نے جو کہ مدراس کے بورڈ آف ریونیو کا صدر رہا تھا لکھا ہے:-

"ہمارا طرز حکومت اسپنج سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ وہ گنگا کے دہارے سے تمام نعمتیں چوس لیتا ہے اور ٹیمز کے کنارے نچوڑ دیتا ہے۔"

(حکومت خود اختیاری ص۷۶)

سر جان شور (جس کا تعلق بنگال سول سروس سے تھا اور بعد میں وائسرائے بھی ہو گیا تھا) ۱۸۳۳ء کے قانون کے متعلق ۱۸۳۷ء میں بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان (پرانے تاجروں) پر جلد تباہی آگئی۔ انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر صورت سے تمام ہندوستانی قوم کو اپنی اغراض کا غلام بنا لیا جائے۔ ان پر محصولات اتنے لگا دیئے ہیں کہ ان پر اضافہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ یکے بعد دیگرے جو صوبہ ہمارے تصرف میں آیا ہے اس کو مزید وصولیابی کا میدان بنا لیا گیا ہے اور ہم نے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ دیسی والیان ملک جتنا وصول کرتے تھے اس سے ہماری آمدنی کس قدر زیادہ ہے۔ ہر وہ عہدہ عزت اور منصب جس کو قبول کرنے کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو آمادہ کیا جا سکتا ہے ہندوستانیوں کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنی انتہائی سخت اور جابر حکومتیں گذری ہیں ان میں ایک برطانوی حکومت ہے جس کے دور میں حکومت اور ذی ثروت افراد بشرطیکہ وہ بے اندازہ دولت رکھتے ہوں، دونوں انصاف کا خون کر سکتے ہیں اور کر چکے ہیں جس کے عہد میں ظلم کی دادرسی تقریباً ایک ناممکن چیز ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رعایا ہم سے نفرت کرتی ہے اور ہر طاقت کا خیر مقدم کرنے اور اس کے پرچم کے نیچے جمع ہونے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ اس میں قدرت ہو کہ

ہمیں تباہ کرسکے۔" (حکومت خود اختیاری صـ۲۷)

مسٹر اے، جی ولسن اپنے ایک آرٹیکل میں جو کہ ۱۸۸۲ء میں فورٹ نائٹ لی ریویو میں شائع ہوا تھا لکھتے ہیں:۔

"اس بد قسمت ملک (ہندوستان) سے ہر سال پورے تین کروڑ پونڈ (پینتالیس کروڑ روپیہ) ہم مختلف طریقوں سے کھینچ لیتے ہیں۔ وہاں کے باشندے کی اوسط کمائی پانچ پونڈ سالانہ ہے بلکہ بعض جگہ اس سے بھی کم ہے مگر زیادہ کہیں نہ ہوگی۔ اس حساب سے ساٹھ لاکھ سے زیادہ کمانے والوں کی آمدنی ہمارے خراج میں چلی آتی ہے۔ گویا متعلقین کو شامل کرنے کے بعد تین کروڑ انسانوں کی وجہ کفاف ہم لے لیتے ہیں جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ ہندوستان کے کل سرمایۂ معاش کا دسواں حصّہ ہر سال ہمارے پاس کھنچ آتا ہے۔" (حکومت خود اختیاری از ان ہیپی انڈیا صـ۳۴۱)

مذکورہ بالا اندازہ اس دولت کا جو کہ ہر سال ہندوستان سے کھنچ کر انگلستان پہنچتی رہتی تھی۔ ۱۸۸۲ء کا ہے مگر اس میں ہر سال اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ اگرچہ ہندوستان کی حالت روز بروز گرتی جاتی تھی مگر بے رحم اور سنگ دل برطانیہ کی وحشیانہ بھوک روپیوں کی ہمیشہ بڑھتی رہی اس لئے ہندوستانی خراج بھی ہمیشہ بڑھتا رہا۔ مسٹر ہنڈومن (مشہور حسابدان انگلستان کا) ۱۹۰۶ء میں تخمینہ اس مقدار کا چالیس ملین پونڈ سالانہ کرتا ہے۔ یعنی ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ (ان ہیپی انڈیا۔ حکومت خود اختیاری صـ۸۱)

سر ولیم ڈگبی نے پراسپرس برٹش انڈیا میں آئینی طریقہ پر ہندوستان سے جانے والی دولت کی تخمینی مقدار ۱۹۰۰ء تک کی چھ ہزار اسّی ملین پونڈ لکھی ہے۔

(دیکھو حکومت خود اختیاری صـ۸۱)

چونکہ ایک ملین دس لاکھ کا ہوتا ہے اس لئے یہ مقدار چھ ارب آٹھ کروڑ پونڈ ہوگی چونکہ اس زمانہ میں پونڈ کا بھاؤ پندرہ روپیہ تھا اس لئے ۱۹۰۰ء تک آئینی طریقہ پر ہندوستان سے نکلنے والی دولت کی مقدار اکیانوے ارب بیس کروڑ روپیہ ہوئی یعنی ۰۰۰،۰۰،۰۰،۰۰ ۹۱۲۰ ارب روپئے۔

اور ابتدائی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۶ء تک مسٹر ہنڈومن کے تخمینہ کے مطابق ایک

ایک ارب چوراسی کروڑ پونڈ ہوتی ہے جس کے روپئے ستائیس ارب ساٹھ کروڑ ہوتے ہیں۔ ۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۲۷۶,۰۰۰ ارب روپئے۔ لہٰذا ۱۸۳۲ء سے ۱۹۴۵ء تک آئینی طریقہ پر نکلنے والی دولت کا اندازہ (۱۱۸۸۰۰۰۰۰۰۰۰) ایک کھرب اٹھارہ ارب اسّی کروڑ روپیہ ہے۔

مگر امریکہ میں تقریر کرتے ہوئے ۱۹۳۳ء میں وٹھل بھائی پٹیل سابق پریسیڈنٹ آل انڈیا اسمبلی نے بتلایا تھا کہ بینک آف انگلینڈ میں ہندوستان کا تیس ارب پونڈ جا چکا ہے (یہ مطالبہ معہ اس کے سود کے برطانیہ کو ادا کرنا چاہیئے) ہندوستان انگلستان کے ذمّہ واجب الادا قرضہ پر چار کروڑ پونڈ سالانہ سود کا مطالبہ کرتا ہے۔

(اخبار ملّت دہلی مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۳۳ء جلد ۸ نمبر ۱۴)

وٹھل بھائی پٹیل کے ذکر کردہ اعداد کے حساب سے انگلستان پہنچنے والے روپیوں کی مقدار چار سو پچاس ارب روپیہ ہوتی ہے۔ جو کہ بنک آف انگلینڈ میں ۱۹۳۳ء تک پہنچے۔ یعنی چار کھرب پچاس ارب روپیہ۔

یہ مقدار اس سرسری اندازہ کے روپیوں کی ہے جو انگلستانی بنکوں میں آئینی اور غیر آئینی طریقوں سے ۱۹۳۳ء تک پہنچے تھے اور مذکورہ بالا مقدار یعنی ایک سو اٹھارہ ارب اسّی کروڑ کی مقدار اس آئینی طریقوں سے پہنچنے والے روپیوں کی ہے جس کو سر ولیم ڈگبی اور مسٹر ہنڈرسن نے ۱۸۳۲ء سے لیکر ۱۹۴۵ء تک کی ذکر کی ہے مگر وہ مقدار جو کہ غیر آئینی طریقہ پر مختلف طریقوں سے لوٹ کھسوٹ کر کے دورِ ثانی یعنی ۱۷۷۵ء سے ۱۸۳۲ء تک اور تجارتی طریقوں سے ۱۶۰۸ء سے ۱۷۵۷ء تک دورِ اوّل میں گئی ہے اس سے خارج ہے جس کا اندازہ کرنا سخت مشکل ہے۔ البتہ مسٹر بروکس ایڈمسن نے اس کے اس حصّہ کی مقدار جو کہ واٹرلو اور پلاسی کی جنگ وغیرہ کے زمانہ میں حاصل کی گئی تھی مجمل طریقہ پر یہ بتلائی تھی کہ وہ کروڑوں اشرفیاں ہوں گی۔ اور کہا تھا کہ اس عہد میں یورپ والوں کے پاس سونے چاندی کی مقدار جتنی تھی نسبتاً ہندوستان سے جانے والی دولت کی مقدار زیادہ تھی۔ اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستان کے سونے اور چاندی کے سمندر کو خشک کیا ہے۔

مذکورہ بالا طریقوں میں ایک عجیب وغریب طریقہ زرکشی اور لوٹ کا یہ جاری کیا

گیا کہ ۱۷۹۲ء سے ہندوستان کے قومی قرضہ کی مد قائم کی گئی۔ ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے لئے اپنی قوم سے کچھ قرضہ لیا تھا (جس کی مقدار آئندہ اعداد و شمار میں آئے گی) اور جو برابر بڑھتا گیا۔ بقول لالہ لاجپت رائے انگریزوں نے ہندوستانیوں کو قبضہ میں کیا ہے تو اس میں لطف یہ ہے کہ روز اوّل سے آخر دم تک برطانیہ کی گرہ سے ایک کوڑی بھی خرچ نہیں ہوئی اور ہندوستانیوں ہی کے مال اور انہیں کے خون سے ملک قبضہ میں لے لیا گیا۔ اسی پر بس نہیں کی گئی، ملک گیری، تجارت کی توسیع، علمی تحقیقات غرض کہ ہر قسم کے مصارف جو انگریزوں کو ایشیاء بھر میں کہیں اٹھانا پڑے ہندوستان کے خزانے سے ہی پورے کئے گئے۔ ان کے منافع ہمیشہ انگریزوں کی جیب میں جاتے رہے اور خرچہ یا خسارہ ہوتا تھا تو ہندوستان کے سر منڈھا جاتا تھا۔ مسٹر آر سی۔ دت کہتے ہیں:۔

"ہندوستان کا سارا قومی قرضہ جو کمپنی کے صد سالہ عہد میں بڑھا وہ صرف اس وجہ سے کہ جو مصارف انگلستان میں ہوتے تھے ان کا بار ہندوستان پر ڈالا جاتا تھا۔"

ہندوستان کے قومی قرضہ کی یہ نوعیت معلوم کرنے کے بعد دیکھنا چاہیئے کہ اس میں سال بسال کیا اضافہ ہوتا رہا۔ ذیل کے اعداد ان ہپی انڈیا سے ماخوذ ہیں۔

سنہ ۱۷۹۲ء	۷۰ لاکھ پونڈ	سنہ ۴۶-۱۸۴۵ء	۴ کروڑ ۳۵ لاکھ
سنہ ۱۷۹۹ء	ایک کروڑ پونڈ	سنہ ۵۱-۱۸۵۰ء	۵ کروڑ ۵۰ لاکھ
سنہ ۱۸۰۵ء	دو کروڑ دس لاکھ	سنہ ۱۸۵۷ء	۶ کروڑ ۵۰ لاکھ
سنہ ۱۸۲۹ء	۳ کروڑ	سنہ ۱۸۵۸ء	۶ کروڑ ۹۵ لاکھ
سنہ ۱۸۳۶ء	۳ کروڑ تیس لاکھ	سنہ ۱۸۶۰ء	۱۰ کروڑ
		سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء	تیس کروڑ ستر لاکھ

ذیل کے اعداد انڈین ایر بک سے لئے گئے۔

سنہ ۱۹۲۴ء　اڑتالیس کروڑ اٹھاون لاکھ چالیس ہزار

سنہ ۱۹۲۵ء　اکیاون کروڑ سترہ لاکھ اسی ہزار (حکومت خود اختیاری صہ ۸)

سنہ ۱۹۲۸ء میں ہندوستان کا غیر ملکی قرضہ ایک ارب پونڈ ہو گیا۔ یعنی پندرہ ارب روپیہ

(مدینہ بجنور ۲۵ فروری ۳۰ء)

اس قرضہ پر ہندوستان کو ہر سال (۸۰) کروڑ روپیہ سود کے طور پر ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ (۰۴) کروڑ روپیہ وہ ہے جو ہندوستان کو وزیر ہند کی وساطت سے ادا کرنا پڑتا ہے اگر اس میں سے سترہ کروڑ نکال دیئے جائیں جو سرکاری قرضوں کے طور پر دیئے جاتے ہیں اس لئے کہ یہ رقم بھی ایک ارب پونڈ میں شمار ہو چکی ہے۔ تو بقیہ (۲۳) کروڑ روپیہ باقی رہ جاتا ہے اس طرح کل سالانہ واجب الادا رقوم ایک سو کروڑ روپیہ یا ایک ارب روپیہ بنتی ہے۔"

(بیان ایسوسی ایٹڈ چیمبر آف کامرس یعنی جمعیتہ ایوانہائے تجارت نزد سائمن کمیشن از مدینہ بجنور مورخہ ۲۵ فروری ۳۰ء)

اس قرضہ کی ایک دوسری نوعیت نہایت پُر لطف اور عجیب ہے وہ یہ کہ اپنے مقاصد ملعونہ کے لئے جو جنگ بھی ایشیا یا افریقہ وغیرہ میں کیجاتی ہے یا توسیع مملکت کی غرض سے ہندوستانی ریاستوں اور صوبوں کو اپنے قبضہ میں لایا جاتا ہے ان میں ہندوستانی سپاہی اور رسد اور اسلحہ استعمال کئے جاتے ہیں ہندوستانیوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ غنیمت یعنی لوٹ اپنے قبضہ میں لائی جاتی ہے اور مصارف جنگ ہندوستان کے ذمّہ رکھ کر انڈین نیشنل ڈیبٹس کی مقدار میں شامل کر لیا جاتا ہے اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں تاج برطانیہ ہندوستان کو کمپنی سے چار کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ پر خریدتا ہے اور وہ مقدار بھی ہندوستان ہی کے ذمّہ اسی مقدار میں شامل کی جاتی ہے اور اس کا سود اور سود در سود ہندوستان سے ہی دلوایا جاتا ہے گویا کہ بکری خریدی گئی اور اس سے کہا گیا کہ تو ہی اپنی قیمت ادا کر۔ اسی میں مصارف جنگ نوابان، بنگال و مرہٹہ و نیپال و افغانستان و جنگ ثانی کابل وسوڈان و مصر و تبت و چین و جنوبی افریقہ ٹرانسوال وغیرہ سب داخل ہیں۔

۱۸۳۲ء سے اُمید افزا شاہی اعلانات اور فصیح و بلیغ تقریروں کے ساتھ کمپنی کا خالص انتظامی دور شروع ہوُا۔ مگر اسی کے ساتھ شجر ہند کے تنہ میں کمپنی کے قرضہ کا گھن مستقل طور پر لگا دیا گیا اور عملاً یہ قرار دیا گیا کہ یہ قرضہ کبھی ادا نہ ہوگا۔ واضح ہو کہ ۱۸۳۳ء میں انگلستان کے قانون کی رُو سے انتہائی شرح سود پانچ فیصدی تھی اور ہندوستان میں دام دوپٹ کا قانون رائج تھا جس کی رُو سے دائن کو خواہ قرضہ پر سو برس کیوں نہ گذر جائیں اصل رقم قرضہ سے زیادہ سود نہ مل سکتا تھا۔ مگر سلطنت برطانیہ نے کمپنی کے تمام تجارتی سرمایہ کی کثیر رقم پر برخلاف انگلستان اور ہندوستان کے رواج کے ساڑھے دس فیصدی سود قرار دیا اور یہ طے کیا کہ چالیس سال یعنی ۱۸۷۴ء تک قرضہ ادا نہ کیا جائے بلکہ صرف سالانہ سود دیا جائے اور باوجود سال بسال سود دیتے رہنے کے ۱۸۷۴ء کے بعد سو فی صدی زائد رقم دے کر قرضہ سے سبکدوشی حاصل کی جائے۔"

(حکومت خود اختیاری ص۲)

"ظاہر ہے کہ ہر شخص، ہر ریاست، ہر سلطنت کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ قرضہ سے سبکدوشی حاصل کی جائے مگر کمپنی کا قرضہ وہ ہے جس کی ادائیگی عملاً ناممکنات سے ہے کتنے نیک خیال وائسرائے ایسے آئے جنہوں نے ملک کے اخراجات میں تخفیف کر کے بچت بڑھائی چنانچہ نیک دل وائسرائے سر ولیم بنٹنگ نے جن کے زمانہ میں کمپنی سے تجارتی حق لے لیا گیا تھا ملک میں بیشمار اصلاحات اور تحقیقات کیں جو کہ سب ہوم چارجز کی نذر ہوئیں مگر جس نسبت سے صاحب موصوف ہندوستان میں ہر دل عزیز بنے اُسی نسبت سے انگلستان میں مطعون ہوئے۔" (حکومت خود اختیاری ص۲)

"ہندوستان میں ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۵ء تک مسلسل ایسے حکمراں رہے جو ہر طرح ملک کی ترقی میں ساعی رہے اور اُنہوں نے اپنے زمانہ میں کوئی ایسی لڑائی نہ لڑنے دی جس سے ہندوستان پر خرچہ کا بار پڑتا اسی کے ساتھ زرعی صنعتی اور تجارتی ترقی کے لئے اُنہوں نے دوامی بندوبست

کئے اور ہندوستان کے مال پر محصول میں کمی اور انگلستان کے مال پر بیشی کرنے کی کوشش کی لیکن ایک بھی پیش نہ چلی اور باوجود ایسی صلح کے اور مصالحانہ پالیسی کے ان اٹھارہ سال میں ہندوستان کے قرضہ کا بار آٹھ کروڑ پونڈ سے بڑھ کر ۱۳½ کروڑ پونڈ تک پہنچ گیا۔" (حکومت خود اختیاری صفحہ ۴۴)

اسی زمانہ میں انگریزوں میں توسیع مملکت کا ولولہ (کوئین وکٹوریہ کے اعلان ۱۸۵۸ء کے خلاف) پیدا ہوا اور فارورڈ پالیسی (پیش قدمی) کی جدوجہد شروع ہوئی۔ لارڈ نارتھ بروک پر (جو کہ اس زمانہ میں وائسرائے ہند تھے) زور ڈالا گیا کہ وہ اس پالیسی پر عمل کریں۔ وہ اس کو ہندوستان کے لئے مضر سمجھتے تھے۔ بالآخر ان کو مجبور ہو کر ۱۸۷۶ء میں استعفاء دے کر انگلستان واپس ہونا پڑا۔ ان کی جگہ پر لارڈ لٹن کو مقرر کیا گیا۔ انھوں نے پیش قدمی کی تعمیل میں کابل کو مشن بھیجا اور کوئن وکٹوریہ کے اعلان مشہور کے توڑنے اور بدعہدی کے معاملہ کو عملدرآمد کرتے ہوئے کابل کی لڑائی عمل میں لائی گئی۔ جس پر دو کروڑ پونڈ صرف ہوا۔ اس میں انگلستان نے صرف پچاس لاکھ پونڈ دیا اور باقی ڈیڑھ کروڑ کا بار ہندوستان پر رکھا گیا جو کہ اس کے قومی قرضہ میں شمار کیا گیا۔

لارڈ سالسبری ۱۸۸۱ء میں جبکہ وہ وزیر ہند تھا لکھتا ہے:۔

"ہندوستان سے اتنی کثیر رقم بھیجی جاتی ہے اور اس کا نعم البدل کچھ نہیں دیا جاتا۔ یہ زخم بجائے خود کیا کم ہے لیکن ہندوستان کے بدن پر لگتا ہے تو اور زیادہ گہرا لگتا ہے۔ اگر خون ہی بہانا ہے تو چھری اس حصہ جسم میں بھونکنا چاہیئے جہاں لہو بہت سا یا کافی جمع ہو۔ نہ کہ دیہاتی رقبوں میں جو پہلے ہی سے خون کی قلت کی وجہ سے نحیف وناتوان ہو رہے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہندوستان کے بدن سے یہ لہو بہنا رُک جانا چاہیئے۔"

(حکومت خود اختیاری صفحہ ۴۵)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستان کے قرضہ اور سود اور سرمایہ کے سیلاب بجانب انگلستان کے اعداد و شمار اور اس کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ وہ کس قدر خوفناک ہے۔ ان حالات میں تعجب ہے کہ ہندوستان کے لوگ زندہ کس طرح ہیں۔ یقیناً ان احوال میں خوشحالی اور فارغ البالی جو کہ زمانہ قدیم میں اہل ہندوستان کی امتیازی شان تھی

بالکل معدوم ہوگئی اور ان کی زندگی نہایت گری ہوئی اور کشاکش بلکہ مردگی کی زندگی رہ گئی۔
سر چارلس ایلیٹ چیف کمشنر آسام ۱۸۸۸ء میں لکھتا ہے۔

"میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ کاشتکاروں کی نصف تعداد ایسی ہے جو سال بھر تک نہیں جانتی کہ ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا کسے کہتے ہیں"

(حکومت خود اختیاری ص۸۲)

مسٹر اروِن ڈپٹی کمشنر رائے بریلی کہتے ہیں:۔

"کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ (شہروں کے باشندے) خوراک کی قلت سے جو تکلیف اٹھاتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو کسانوں کو برداشت کرنا پڑتی ہے بالخصوص پردہ نشین مسلمان عورتوں اور مفلس شرفاء کو جن کا وقت بگڑ گیا ہے جو شرم سے بھیک تک نہیں مانگ سکتے اور جن کو کچی پکی جائداد پر گزر کرنا پڑتی ہے نرخ کی گرانی بری طرح ستاتی ہے"

(حکومت خود اختیاری ص۸۳)

مسٹر اے اے پرسل ممبر پارلیمنٹ ہندوستان کے سفر سے واپس ہو کر ہندوستان کے مزدور پیشہ لوگوں کے متعلق لکھتا ہے:۔

"یہ لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں" (حکومت خود اختیاری ص۸۳)

ایک امریکن مشنری کا مقالہ لالہ راجپت رائے نقل کرتے ہیں:۔

"جنوبی ہندوستان کے لوگ زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں جہاں لوگ مردار گوشت کھا کھا کر رہتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں کوئی عام قحط بھی نہیں بتایا جاتا تھا"

(حکومت خود اختیاری ص۸۳)

مسٹر ڈبلیو ایس بلنٹ کہتا ہے۔

"میں ہندوستانی مالیہ کے اسرار بہترین استادوں سے حاصل کر رہا ہوں اور یہ معلم گورنمنٹ کے سیکرٹیری اور کمشنر وغیرہ ہیں۔ اس مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم اسی طرح ملک کو ترقی دیتے رہے تو ایک دن وہ آئے گا کہ ہندوستانی مجبور ہو کر ایک دوسرے کو کھانے

لگیں گے۔ کیوں کہ اپنے ہم جنسوں کے سوا کوئی دوسری چیز ہی نہ مل سکے گی۔" (حکومت خود اختیاری ص۸۳)

مسٹر سیول میر بٹ ممبر کونسل نے ۱۸۳۶ء میں لکھا تھا۔

"برطانیہ کا دور حکومت مہربان اور مقبول بتایا جاتا ہے۔ مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہنچ گیا ہے اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس وقت لوگ خوشحال تھے۔ یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا ہے۔" (حکومت خود اختیاری ص۲۷-۲۸)

مسٹر اے برسل ممبر پارلیمنٹ ۱۹۲۸ء میں لکھتا ہے۔

(ہندوستان میں دورہ کرنے اور کئی مہینہ یہاں کی حالت اپنی آنکھ سے دیکھنے کے بعد) ہندوستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے اپنی پیدائش سے لے کر اپنی وفات تک کبھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ درانحالیکہ برطانیہ کو حکومت کرتے ہوئے سو برس سے زائد ہو چکے ہیں۔ لیکن جن علاقوں میں برطانوی تعلق بہت گہرا ہے اور گہرا رہا ہے۔ مثلاً صوبجات بمبئی و بنگال میں وہاں صفائی و حفظان صحت کا کوئی قابل ذکر انتظام موجود نہیں۔ چھپی ہوئی بغاوت سارے ملک میں موجود ہے۔ ۲۵ کروڑ سے زیادہ تعداد اس آبادی کی ہے جسے ساری عمر پیٹ بھر کر چاول بھی نہیں نصیب ہوتے۔"

(اخبار سچ لکھنؤ مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۲۸ء از ڈیلی ہیرلڈ لندن مورخہ ۴ مئی ۱۹۲۸ء)

مسٹر سائمن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:۔

(الف) عام آبادی انتہائی افلاس میں ہے۔

(ب) سوشل خدمات مثلاً تعلیم، حفظان صحت، صفائی وغیرہ کا صرفہ مغربی معیار سے نہایت گرا ہوا ہے۔ اور بعض شعبوں میں تو بالکل صفر ہے۔"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۰ء از رپورٹ سائمن کمیشن)

ایچ۔ ایم۔ ہنڈمن (مشہور ماہر اقتصادیات)

"ہندوستان روز بروز کمزور و ناتوان ہوتا جا رہا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ

عوام کی زندگی کا خون آہستہ آہستہ مگر دن بدن تیز روی کے ساتھ نکلا جا رہا ہے۔" (اپیح ہنڈمینس بینک کراپٹ سی آف انڈیا از مالیات عامہ)

ڈاکٹر روڈر فورڈ (۱۹۲۷ء کے متعلق)

"ہر جگہ زندگی کی کش مکش اندوہ ناک ہے۔"

(دی۔ ایچ رت فورٹس ماڈرن انڈیا ص۱۵۶ از مالیات عامہ)

یہی ڈاکٹر روڈر فورڈ (دیہاتیوں کی تکالیف بیان کرتا ہوا) لکھتا ہے۔

"میرے غم و افسوس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ میں برطانوی باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان کی جسمانی حالت کا ذمہ دار ہوں جس نے ان کو دھیمے مگر تکلیف دہ طریقہ پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہم برطانوی باشندے ان کی اس حالت کے ذمہ دار ہیں جس نے تخفیف مالیہ اور اجراء نہر کی کوئی اسکیم جاری نہیں کی جس سے قحط کا سدِّ باب ہوتا۔"

(ماڈرن انڈیا از مالیات عامہ)

مسٹر پیٹر فریبن (ممبر پارلیمنٹ و صدر کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ) ۱۹۳۰ء میں۔

"برطانیہ عہد و پیمان کے ذریعہ ہندوستان کے بھلے کے لئے حکومت کرنے کا پابند ہے۔ لیکن کیا ہم نے اس عہد کی پابندی کی ہے۔ میں نے اُوپر جو واقعات و حقائق بیان کئے ہیں وہ اس سوال کا جواب دیں گے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کو ہوم رول مل گیا تو عوام جمہور پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ ایک سو برس کے برطانی راج سے جو مصیبت ہندوستان پر نازل ہوئی ہے اس سے زیادہ مصیبت ناممکن ہے۔ جو قانون ساز مجلسیں ہم نے قائم کی ہیں ان میں عوام کی نمائندگی نہیں ہوتی اور ہم نے محصول کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں ہی کے دوش پر رکھا ہے۔ سرکاری رپورٹ میں ہندوستان کے متعلق یہ الفاظ ہیں:۔

"قحط ہندوستان کی فاقہ کشی کی منہ بولتی تصویر ہے۔" مسلسل فاقہ کرنے والوں کی تعداد چار کروڑ سے لے کر سات کروڑ تک ہے الخ

(مدینہ بجنور مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء از انڈین نیوز لندن)

مسٹر ڈبلوجی ہیڈر ۱۸۷۳ء میں کہتا ہے (موصوف صوبہ جات متوسط میں ملازم تھا)
"ایک ایسی رائے جس پر ہر شخص متفق ہے اگر قابل اعتماد ہو سکتی ہے تو یہ صحیح ہے کہ اہل ہند ہماری زیر حکومت بد سے بد تر حالت کو پہنچے جاتے ہیں۔ یہ اہم مسئلہ ہے جس پر حکومت کو توجہ کرنا ضروری ہے"

(حکومت خود اختیاری صفحہ ۳۸ از دادا بھائی صفحہ ۵)

افسوس کہ ہندوستان کی انتہائی بربادی اور فاقہ کشی اس قدر بدحالی پر پہنچ جانے کے بعد بھی برطانیہ کو رحم نہ آیا بلکہ اس کی درندگی اور لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری بڑھتی ہی رہی۔ مندرجہ ذیل اعداد سے معلوم ہوگا کہ کس طرح ٹیکس کی زیادتی ہندوستانی عوام کے ضعیف و ناتوان کندھوں پر جاری رہی۔ ٹیکسوں کی تفصیل بحساب فی کس۔

۱۸۷۱ء میں فی کس		۱ روپیہ	۱۳	آنے	۹	پائی
۱۸۸۱ء	″ ″ ″ ″	۲ روپئے	۲	″	۱۱	″
۱۸۹۱ء	″ ″ ″ ″	۲ ″	۳	″	۱۱	″
۱۹۰۱ء	″ ″ ″ ″	۲ ″	۱۰	″	۲	″
۱۹۱۱ء	″ ″ ″ ″	۲ ″	۱۳	″	۱۱	″
۱۹۱۳ء	″ ″ ″ ″	۳ ″	۱	″	۹	″
۱۹۲۰ء	″ ″ ″ ″	۵ ″	۱۱	″	۔	۔
۱۹۲۲ء	″ ″ ″ ″	۶ ″	۷	″	۔	۔
بالفعل نومبر ۱۹۲۳ء	″ ″ ″ ″	۷ ″	۔	۔	۔	۔

(اخبار وکیل امرتسر جلد ۲۹ ع ۶۳ ۲۴ نومبر ۱۹۲۳ء)

باوجودیکہ ہندوستان ۱۸۷۱ء سے پہلے ہی فلاکت کی انتہائی پستی کو بقول سول میریٹ اور سر جان شور وغیرہ پہنچ چکا تھا مگر سنگدل انگریزوں کے لالچ کی آگ بھڑکتی ہی رہی اور دولت حاصل کرنے کی بھوک ہمیشہ روز افزوں ہوتی رہی حتیٰ کہ پہلی جنگ عمومی کے بعد تو تحصیل دولت کی جدّوجہد بہت ہی زیادہ بڑھ گئی جس سے ہندوستانیوں کی بربادی اور مذلت بیحد اور بے نہایت ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ارزانی کے بجائے گرانی اور قحط

کاشت کی کمی اور ذرائع کاشت کا فقدان

ہندوستان زیادہ پیداوار والا اور سستا ملک تھا انگریزوں نے اس کو قحط اور کال کا مرکز اور نہایت گراں ملک بنا دیا۔ پیداوار بھی بہت کم دی جس کی وجہ سے بہت زیادہ آبادی مرگئی ــــــــــــ

ہندوستان کو قدرت نے نہایت زیادہ زرخیز ملک بنایا ہے۔ اس میں ہر قسم کے اناجوں کی کاشت اور پیداوار کے طرح طرح کے ذرائع مہیا کر دیئے ہیں جن کی وجہ سے زمانہ قدیم سے یہاں بافراط غلّہ پیدا ہوتا رہتا تھا اور یہاں کے باشندے ہمیشہ خوشحال اور فارغ البال رہتے تھے قحط اور کال کا نام تک ملک کے عام باشندے تقریباً نہیں جانتے تھے۔ اس قدر پیداوار ہوتی تھی کہ اس زمانہ کی ارزانی سُن کر نہ صرف تعجب ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات گذشتہ تاریخی تصریحات کو اس زمانہ کے لوگ محال اور جھوٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ ہم پہلے مسٹر تھارنٹن کا قول نقل کر آئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ " یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی"۔ اسی طرح سر تھامس منرو کی ہندوستانیوں کے طریقہ کاشتکاری اور ان کی اعلیٰ استعداد کی پُر زور تعریف اور ثنا و صفت مذکور ہو چکی ہے۔ ہم اس سے پہلے لارڈ میکالے کا بہ نسبت صوبہ بنگال یہ مقالہ بھی ہدیہ ناظرین کر چکے ہیں کہ :۔

" باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لیٹروں کے مشرقی ممالک میں بنگال باغ ارم یا نہایت دولت مند ملک سمجھا جاتا تھا اس کی آبادی بے حد اور بہت زیادہ بڑھتی تھی۔ غلّہ کی افراط سے دُور دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے۔ اور لندن اور پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی بیبیاں یہاں کے کرگھوں کے نازک کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھیں"۔

بہرحال انگریزی اقتدار سے پہلے یہاں کی پیداوار غلہ جات کی بہت زیادہ تھی اور نہایت زیادہ ارزانی اور سستے بھاؤ سے تمام اناجوں کے اقسام اور ضروریات زندگی فروخت ہوتی تھیں جس کی وجہ سے تمام باشندگان ہند نہایت خوشحال اور فارغ البالی، راحت اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ عموماً ان کو اناج اور خورد و نوش کی کمی ستاتی نہ تھی۔ (۱) چنانچہ سر ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن تاریخ ہند جلد ۳ میں شہنشاہ علاؤالدین خلجی مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ[1] مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھتا ہے۔

گیہوں	۱۱۹ سیر یعنی دو من ۳۹ سیر	بوراکھانڈ	۱۵ سیر
چانول	۱۷۹ " " ۴ " ۱۹ "	گھی	۳۳ "
چنا	۱۷۹ " " ۴ " ۱۹ "	لال کھانڈ	۲۴ "
اُڑد	۱۷۹ " " ۴ " ۱۹ "	سرسوں کا تیل[2]	۲۷ "
جَو	۲۲۴ " " ۵ " ۲۴ "		

(۲) شہنشاہ محمد تغلق مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ حسب ذیل تھا۔

گیہوں فی من پختہ	شالی دھان فی من پختہ	چانول فی من پختہ	چنا فی من پختہ
۹/	۶/	۹/	۳/

شکر سفید فی من پختہ	مصری فی من پختہ	بیل فربہ فی راس	بکری فربہ فی راس	بھینس فربہ فی راس
۳/	۱۲/	عا	عصہ	عا

مرغ ۔/ بکری کا گوشت (اخبار خلافت روزانہ بمبئی ۲ نومبر ۱۹۲۳ء)

(نوٹ) اسی زمانہ میں ابن بطوطہ ہندوستان میں آیا ہوا تھا وہ اپنے سفر نامہ میں بنگال کی سیاحت کے متعلق لکھتا ہے کہ بنگال میں گرانی کے زمانہ میں ایک روپیہ کا تین من چاول فروخت ہوتا تھا۔ اور ارزانی کے زمانہ میں ایک روپیہ کا ۶ من تک چاول فروخت ہوتا تھا۔ روئی کا کپڑا ایک روپیہ میں ۳۰ گز تک تھا۔

---

[1] یہ بھاؤ اس زمانہ کے اوزان اور سکوں کو موجودہ زمانہ کے اوزان اور سکوں کے حساب سے برابر کر کے لکھ دیا گیا ہے۔ (اخبار ہمدرد دہلی جلد ۵ نمبر ۲۶)

[2] اخبار انقلاب لاجواب لاہور میں تاریخ فرشتہ سے ۲۷ سیر ہے اور یہی صحیح ہے۔

(۳) شہنشاہ فیروز تغلق کے زمانہ کا بھاؤ حسب ذیل تھا۔

گیہوں فی من پختہ	جَو فی من پختہ	چنا فی من پختہ	گھی فی سیر پختہ	شکر فی سیر پختہ
۵ر	۳ر	۳ر	۲½ پیسہ	۳½ پیسہ

(خلافت ۲ر نومبر ۱۹۲۳ء)

(۴) شہنشاہ ابراہیم لودھی مرحوم کا زمانہ

غلّہ فی روپیہ	گھی فی روپیہ	کپڑا فی روپیہ
۱۰ من	۵ سیر	۱۰ گز

ایک خاندان عزت کے ساتھ ۵ر روپیہ ماہوار میں بسر کر سکتا تھا۔ ایک سوار معہ گھوڑا اور سائیس اور سپاہیوں کے آگرہ سے دہلی تک عصہ ر میں سفر کر سکتا تھا۔

(خلافت ۲ر نومبر ۱۹۲۳ء)

(۵) شہنشاہ اکبر مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ۔

گیہوں فی من	جَو فی من	شالی دھان فی من	چنا فی من	مونگ فی من
۸ر	۵ر	۱۲ر	۵ر	۱۱ر
ماش فی من	موٹھ فی من	شکر سفید فی من	شکر سُرخ فی من	گھی فی من
۱۰ر	۶ر	؎ ۱۲ر	عہ ۴ر	؎ر
تیل فی من	نمک فی من	بکری فربہ	چاول خوشبودار فی من	جوار فی من
عا ۱۱ر	۶ر	عہ ۸ر	عا	۶ر
باجرہ فی من	دال فی من	مَیدہ فی من	دُودھ فی من	گڑ فی مَن
۵ر	۶ر	۱۳ر	۱۵ر	عہ ۷ر

(خلافت ۲ نومبر ۱۹۲۳ء)

اکبر کے دوسرے زمانہ کا بھاؤ۔

گیہوں فی روپیہ	مونگ فی روپیہ	تیل فی روپیہ	نمک فی روپیہ
۴ من	¾۷ من	ایک من ۲۴ سیر	۲۰ من ۳۰ سیر
کھانڈ فی روپیہ	باجرہ فی روپیہ	گھی فی روپیہ	
۱۸ سیر	۳ من	۱۵ سیر	

(انتخاب لاجواب لاہور ۲۱ اگست ۱۹۲۸ء)

(۶) شہنشاہ جہانگیر کا زمانہ

ٹامس کورائٹ جو کہ ۱۶۱۶ء میں آیا تھا کہتا ہے کہ ایک آنہ روز میں ایک آدمی نہایت آرام سے بسر کر سکتا تھا" (خلافت ۲ر نومبر ۱۹۲۳ء)

(۷) شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ۔

شہر ڈھاکہ میں چاول فی روپیہ (۸۰۰) پونڈ بکتا تھا (سفرنامہ کپتان الیگزنڈر ہملٹن جلد ۲ صہ ۲۵)

ڈھاکہ میں تمام ضروریات زندگی اس قدر ارزاں دستیاب ہوتی تھیں کہ یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ملک بیحد آباد تھا۔ (سفرنامہ کپتان الیگزنڈر ہملٹن جلد ۲ صہ ۳۲)

کارمنڈل کے ساحل پر مچھلی ۳ر کی ۲۰ پونڈ آتی تھی (" " " " " ا صہ ۳۷۵)

کٹک میں مکھن ۱ر آنے کا آدھ سیر آتا تھا اور ۲ر میں ایک سو مچھلیاں اتنی بڑی بڑی فروخت ہوتی تھیں کہ ان میں سے صرف دو مچھلیاں ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کو کافی ہوں۔ (سفرنامہ کپتان الیگزنڈر ہملٹن جلد ا صہ ۳۹۲)

نمک ایک کراؤن یعنی ۶ر کو ایک ٹن یعنی ۲۸ من آتا تھا (" " " " صہ ۵۵)

گائے کا گوشت تین فارد نگ (کچھ کوڑیوں) میں نصف سیر بکتا تھا (" " " صہ ۱۶۱)

آئین اکبری میں جو قیمتوں کے متعلق اعداد و شمار درج ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ سولہویں صدی کے آخر میں شمالی ہندوستان میں بالخصوص دارالسلطنت کے آس پاس ۱۹۱۰-۱۲ء کے نرخوں کے حساب سے سامان خورد و نوش کم از کم ۷-۸ گنا، روغنیات کم از کم ۱۰-۱۲ گنا اور کپڑا کم از کم ۵-۶ گنا ارزاں تھا۔ البتہ دھات کا سامان کچھ ایسا ارزاں نہ تھا۔ اور ولائتی چیزیں جن سے آج بازار پٹے پڑے ہیں مقابلتہً کہیں گراں تھیں عام قیمتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۶۰۰ء کے روپئے کی قدر و قیمت ۱۹۱۲ء کے روپئے سے کم از کم ۶-۷ گنا زیادہ تھی اور ۱۹۲۰ء کے روپئے سے کم از کم ۱۰-۱۲ گنا زیادہ گویا اکبر کے عہد میں صرف ۵ر روپئے ماہانہ آمدنی کا غریب خاندان اس خوش حالی سے بسر کرتا تھا کہ آج پچاس روپے والے کو

وہ بات نصیب نہیں۔ جو دس روپئے کا ملازم تھا وہ آج کل سو روپئے والے سے کم نہ تھا اور جس کو سو ملتے تھے وہ آج کل کے ہزار روپئے والے سے زیادہ آرام اٹھاتا تھا۔ حالانکہ روپئے کی نوعیت میں شکل وصورت کے سوا فرق نہیں آیا۔ وہی چاندی روپیہ جو جب تھا سو اب ہے۔ لیکن قدر وقیمت میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا اور یہ فرق بھی ۱۸۵۷ء کے بعد سے جبکہ سرکار انگریزی کا باقاعدہ دور دورہ شروع ہوا بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس سے قبل بھی فرق تھا مگر کم۔ قدر زر کی یہ تخفیف ملک کے حق میں بحیثیت مجموعی مضر ہے یا مفید یہ ایک جداگانہ بحث ہے جس کا بیان صرف دولت میں زیادہ برمحل ہوگا۔ یہاں صرف جتانا مقصود تھا کہ اگرچہ بظاہر روپیہ وہی کا وہی رہا لیکن گزشتہ تین صدی اور بالخصوص گذشتہ چھ سال میں یعنی جنگ کے زمانہ سے اس کی قدر وقیمت میں بہت کمی ہوگئی۔ اس تبدیلی کے اسباب اور ان کی تشریح و توجیہہ مسئلہ گرانی اور قدر زر سے متعلق ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

(معیشت الہند صفحہ ۳۱۵)

یہ مذکورہ بالا حساب صاحب معیشت الہند نے ۱۹۲۰ء کی قیمتوں سے کیا ہے جب کہ تمام سامان خورد ونوش وغیرہ بہ نسبت موجودہ زمانہ (۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے) چوگنا یا اس سے زائد ارزاں تھا۔ اگر آج کے مقابلہ پر حساب کیا جائے تو یقیناً ۵۰ روپیہ ماہوار آمدنی والا اکبر کے زمانہ آجکل کے دوسو روپیہ پانے والے سے اور دس روپیہ ماہوار آمدنی والا اس زمانہ میں آج کل کے چار سو روپیہ حاصل کرنے والے سے اور سو روپیہ آمدنی والا آجکل کے چار ہزار کی آمدنی والے سے زیادہ آرام اُٹھاتا تھا۔ سونے اور چاندی کا فرق بھی نہایت ممتاز نظر آتا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں مہر شاہی جس کا وزن ۱۰۲ تولہ ہوتا تھا ایک ہزار روپیہ کی ہوتی تھی یعنی سونا اُس وقت میں دس روپیہ تولہ تھا مگر آج سو روپیہ تولہ سونا نہیں ملتا۔ بہرحال ہندوستان انگریزی عروج اور اقتدار سے پہلے نہایت ارزاں اور سستائی والا ملک تھا۔ اس میں اناج اور تمام ضروریاتِ زندگی بالخصوص خورد ونوش کی اشیا کی نہایت زیادہ کثرت اور ارزانی تھی یہاں کے باشندے نہایت چین اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر بقول شاعر ؎

چلی سمت غیب سے اِک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں وہ ہری رہی

انگریزوں کا ملعون اقتدار اور منحوس زمانہ آیا اور حالت پلٹنی شروع ہوئی اور بجائے ارزانی گرانی اور بجائے کثرت قِلّت اور بجائے آسودگی فرسودگی ظاہر ہونے لگی۔ انگریزی اقتدار سے پہلے اناج منوں کے حساب سے فروخت ہوتا تھا مگر اس کے بعد کم ہوتے ہوتے سیروں اور چھٹانکوں تک نوبت پہنچ گئی۔ عام آبادی قحط اور گرانی کی وجہ سے لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اترنے لگی۔ چنانچہ خاص کلکتہ میں جو انگریزی اقتدار کا مرکز بن گیا تھا حسب ذیل مہنگائی بڑھتی رہی۔

سنہ		فی روپیہ	چانول	گیہوں	سرسوں کا تیل
۱۷۳۸ء	میں	"	۳۰ سیر ۲ من	۲۰ سیر ۲ من	۱۲ سیر
۱۷۵۰ء	"	"	۱۰ سیر ۲ من	۱۰ سیر ۲ من	۱۰ سیر
۱۷۵۸ء	"	"	۳۰ سیر ا من	۳۵ سیر ا من	½۸ سیر
۱۷۸۲ء	"	"	۵ سیر ا من	۵ سیر ا من	۷ سیر
۱۸۲۵ء	"	"	۳۰ سیر	۳۲ سیر	۶ سیر
۱۸۵۸ء	"	"	۱۵ سیر	۱۸ سیر	۵ سیر
۱۸۸۰ء	"	"	۱۲ سیر	۱۱ سیر	½۴ سیر

(ایسٹ انڈیا کمپنی کا غیر مطبوعہ ریکارڈ برٹش میوزیم میں)

جس طرح کلکتہ میں گرانی بڑھتی رہی اسی طرح جہاں جہاں بھی انگریزی اقتدار پہنچتا رہا گرانی تیز ہوتی رہی۔ چنانچہ کمپنی کے آخری زمانہ میں یعنی ۱۸۵۷ء میں خورد و نوش کی اشیاء کا بھاؤ حسب ذیل تھا۔

گیہوں فی روپیہ	چانول فی روپیہ	چنا فی روپیہ	گھی فی روپیہ
۳۶ سیر پختہ	½۱۸ سیر پختہ	½۵۱ سیر پختہ یعنی ایک من ½۱۱ سیر	۴ سیر

(انتخاب لاجواب لاہور مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۲۸ء)

ملکہ وکٹوریہ کا عہد حکومت ۱۸۹۰ء میں

دودھ فی روپیہ	گھی فی روپیہ	چنافی روپیہ	چانول فی روپیہ	گیہوں فی روپیہ
۹ سیر	۲ سیر	۲۸ سیر	۱۲ سیر	۲۵ سیر

(اخبار انتخاب لاجواب لاہور مورخہ ۲۱ راگست ۱۹۲۸ء)

جارج پنجم کا عہدِ حکومت

دال فی روپیہ	چنافی روپیہ	گھی فی روپیہ	چانول فی روپیہ	گیہوں فی روپیہ
۴ سیر	۹ سیر	۸ چھٹانک	۴ سیر	۸ سیر

دودھ فی روپیہ ۴ سیر (اخبار انتخاب لاجواب لاہور مورخہ ۲۱ راگست ۱۹۲۸ء)

جارج پنجم کے بعد کا زمانہ اُس سے بھی زیادہ منحوس اور تاریک آیا جس میں ۱۹۴۰ء سے لے کر آج تک چار سیر فی روپیہ بھی گیہوں نہیں مل سکتا بلکہ عموماً فی روپیہ دو سیر پختہ بھی ملنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ یو پی میں گیہوں چھبیس ۲۶ روپیہ من اور چانول چالیس ۴۰ روپیہ من اور بنگال میں ساٹھ روپے من چانول فروخت ہو رہا ہے۔ چور بازار (بلیک مارکیٹ) کھلا ہوا ہے لاقانونی کا زور ہے۔ کنٹرول کا بھاؤ بھی چار سیر فی روپیہ نہیں ہے۔ اس طرح تمام ضروریاتِ زندگی، نہایت زیادہ مہنگی ہو گئی ہیں۔ جس کی نظیر کبھی بھی اس ملک ہندوستان میں پائی نہیں گئی۔ سابقہ زمانہ میں قحط کے زمانہ میں بھی اس قدر گرانی نہیں ہوتی تھی۔ انگریزی عہدِ حکومت میں اس طرح گرانی کے اسباب مختلف ہیں۔ ان میں سے زیادہ مؤثر مندرجہ ذیل امور ہیں۔

گرانی کے اسباب

(الف) یہاں کے نقود اور سونے چاندی سے جن کو لوٹ کھسوٹ کر انگریزوں نے انگلستان پہنچایا وہاں پر اُن سے بڑے بڑے بینک کھولے گئے تجارت کی انتہائی گرم بازاری کی گئی۔ ملیں اور مشینیں قائم کی گئیں۔ اور ہندوستان سے خام اشیاء کو کھینچ کر انگلستان پہنچایا گیا۔

(ب) جب تک ہندوستان کی صنعت اور تجارت زندہ تھی مامون تجارت

کے اصول کو جاری کر کے انگلستان میں ہندوستانی مال پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس اور قانونی پابندیاں قائم کی گئیں اور ہندوستانی مال کو انگلستان نکال باہر کیا گیا۔

(ج) ہندوستان کی صنعت اور تجارت کو مٹایا گیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(د) ہندوستان کی صنعت اور تجارت کے بند اور قریب المرگ ہو جاتے ہی فری ٹریڈ (آزاد تجارت) کی پالیسی کا اعلان کیا گیا اور ہر قسم کے مصنوعات اور تجارتی اشیاء کو نہایت معمولی اور کم سے کم ٹیکس کے ساتھ ہندوستان میں داخل کر کے ہندوستان کو یورپین بالخصوص انگریزی مال کی منڈی بنا دیا گیا۔ ہر شہر میں ہر منڈی میں ولائتی مال بے شمار ٹھونسا گیا اور ان کی قیمتوں کے اکثر حصوں سے غلہ اور خام اشیاء خرید کر انگلستان اور دوسرے ملکوں کو بھیجا گیا۔ جس کی بناء پر جوں جوں بدیسی مال ہندوستان میں زیادہ داخل ہوا اسی مقدار پر خام اشیاء یہاں سے نکلتی رہیں اور اناج کی مہنگائی بڑھتی رہی۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار کلکتہ کے ملاحظہ ہوں۔

سنہ	انگریزی کپڑا	کلکتہ میں چانول اُس وقت فی روپیہ	آٹا گیہوں کا فی روپیہ	تیل فی روپیہ
۱۸۰۰ء	بالکل نہیں آیا	۵ سیر ا من	۵ سیر ا من	۶½ سیر
۱۸۱۴ء	۸ لاکھ گز کپڑا آیا	۳۷ سیر	۲۷ سیر	۵½ سیر
۱۸۲۱ء	۲ کروڑ گز " "	۳۰ سیر	۳۳ سیر	۵ سیر
۱۸۳۵ء	۵ کروڑ گز " "	۲۴ سیر	۲۲ سیر	۴½ سیر
۱۸۷۵ء	۱۶ کروڑ گز " "	۱۷ سیر	۱۴ سیر	۱ سیر
	ایک ارب ۵۶ کروڑ گز	۴½ سیر	۴½ سیر	۱¼ سیر

(ہ) ہندوستان سے غلہ نہایت فراوانی اور کثرت سے جہازوں میں بھر بھر کر انگلستان اور دیگر ممالک میں بھیجا گیا چنانچہ اخبار ملت دہلی مورخہ ۱۶ر جولائی ۱۹۳۲ء لکھتا ہے کہ رائل ایگریکلچر سوسائٹی کی ۱۸۸۳ء کی رپورٹ میں درج ہے کہ ۱۸۸۳ء میں ۱۱ کروڑ ۸۶ لاکھ ۸۳ ہزار ۷ سو ۱۰ من گیہوں ہندوستان سے باہر گیا یعنی فی منٹ دو سو اُنتیس من اوسطاً ہندوستان سے گیہوں نکالا گیا۔ سرکاری اعداد و شمار کی چوتھی اشاعت میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار اوسطاً ہر منٹ میں اناج نکلنے کے درج کئے گئے ہیں۔

چانول ہر منٹ میں	گیہوں ہر منٹ میں	ارہر کی دال ہر منٹ میں	مسور کی دال ہر منٹ میں	مونگ پھلی ہر منٹ میں
۱۱۸ من	۶۵ من	۵۰ من	۵۵ من	۵۵ من

۱۹۱۳ء میں غلّہ وغیرہ کی برآمد کے مندرجہ ذیل اعداد شائع کئے گئے

چانول	گیہوں	کپاس	جوٹ	چاء
چھ کروڑ پچھتر لاکھ من	تین کروڑ پچاس لاکھ من	ڈیڑھ کروڑ من سے کچھ کم	سوا دو کروڑ من	چھتیس لاکھ من سے زیادہ

(معیشت الہند صہ ۹۵)

پنڈت دیاشنکر دوبے تے رسالہ مظلوم کسان صفحہ ۸۳ میں گیہوں کی بیرونی برآمد سال وار حسبِ ذیل دکھلائی ہے۔

۱۹۱۵-۱۶ء تیئس لاکھ اسی ہزار ٹن گیہوں

۱۹۱۶-۱۷ء اُنتیس لاکھ دس ہزار ٹن گیہوں

۱۹۱۷-۱۸ء پینتالیس لاکھ دس ہزار ٹن گیہوں۔ اور چانول کی برآمد ۱۹۱۸-۱۹ء میں چھپن کروڑ پچاس لاکھ من دکھلائی ہے۔

یہ وہ اعداد و شمار ہیں جو (ہندوستان سے غلّہ کی برآمد کے) سرکاری محکموں نے شائع کئے تھے۔ جب کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے امور میں بہت زیادہ رازداری اور پردہ پوشی سے کام لیا جاتا تھا تاکہ تنقید کرنے والوں کو زیادہ موقع اعتراض کرنے کا ہاتھ نہ آئے۔ بہرحال یہ اعداد و شمار بھی کچھ کم نہیں ہیں اس قدر اناج کے نکل جانے سے جو تباہی فاقہ اور گرانی ہندوستان میں آسکتی تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ چنانچہ ہندوستان تمام دنیا کے ملکوں میں سب سے زیادہ مفلس ملک ہوگیا اور ہندوستانیوں کی آمدنی کا تناسب ساری دنیا کے مہذب ملکوں میں سب سے کم ہوگیا اور اُن کی زندگی دُنیا بھر کے فاقہ مستوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ اجیرن بن گئی۔

(و) آئین اکبری اور دوسری قدیمی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی عروج سے پہلے ہندوستان کی پیداوار کسی زرخیز سے زرخیز ملک سے کم نہ تھی بلکہ دنیا میں کوئی ملک غذائیات کی پیداواری میں ہندوستان کی برابری نہیں کرسکتا تھا مگر انگریزی عہد حکومت میں پیداوار نہایت زیادہ گھٹ گئی ہے جس کی معنوی وجہ بادشاہ کی بدنیتی اور خودغرضی تھی جو کہ

رعایا کی بہبودی کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ ہر امر میں اس کا مطمح نظر ہندوستانیوں کو لوٹنا اور اپنی قوم اور ملک کو پرورش کرنا اور نفع پہنچاتا رہنا ہے روحانی پیشواؤں کی واضح تصریحات پائی جاتی ہیں کہ بادشاہ کی نیک نیتی اور بدنیتی کا اثر رعایا کی خوشحالی اور بدحالی پر نہایت زیادہ پڑتا ہے اور ظاہری وجہ کاشتکاری اور زیادتی پیداوار کے ذرائع اور وسائل میں کمی اور ناپیدگی تھی۔ کاشتکار اور زمیندار پر مختلف قسم کی مالیات کا اتنا بوجھ ڈال دیا گیا تھا کہ وہ کھاد، آلات کشاورزی بیل، جانوروں کا چارہ، زمین چھوڑے رکھنا، مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ لگانا آبپاشی حاصل کرنا اور اس قسم کی دوسری سہولتوں کو پوری طرح مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ خصوصاً حیوانات زراعت کی انتہائی گرانی اور ان کے چارہ کی کمی اور مہنگائی کاشتکاروں کے لئے ہر ہر قدم پر سخت رکاوٹ پیدا کرتی تھی۔ جو بیل فیروز تغلق کے زمانہ میں دو روپیہ کو آتا تھا وہ آج دو سو روپے میں حاصل نہیں ہوتا۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان جو کہ زراعتی صلاحیت کی حیثیت سے تمام دنیا میں امتیازی شان والا شمار کیا جاتا تھا اس دور حکومت میں کس قدر پست کر دیا گیا۔

۱۹۰۷ء کی پیداوار کی اوسط گیہوں کی فی ایکڑ بہ نسبت دیگر ممالک حسب ذیل ہے۔

سلطنت متحدہ انگلستان و آئرلینڈ فی ایکڑ	جرمنی فی ایکڑ	فرانس فی ایکڑ
۲۵ من کے قریب	۲۴ من سے کم	۱۶ من کے قریب

ریاست ہائے متحدہ امریکہ فی ایکڑ ۔ ۱۱ من سے کم

ہندوستان فی ایکڑ۔ ۹ من سے کچھ زیادہ

(معیشت الہند ص ۹۷)

چانول کی پیداوار فی ایکڑ حسب ذیل ہے۔

ہسپانیہ	اٹالیہ	ہندوستان
۶۲٫۹	۴۳٫۰	۱۴٫۹

جبکہ دنیا کی تمام مملکتیں اپنی اپنی سلطنتوں اور حکومتوں سے زراعت کی ترقی کے لئے بے شمار امدادیں حاصل کر رہی تھیں ہندوستان زراعتی ترقی کے ذرائع میں مثل دیگر تعمیری امور کے نہایت بے بس اور کمزور تھا۔ بقول مسٹر پیٹر فریمن

(ممبر پارلیمنٹ و صدر کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ) ہندوستانی گورنمنٹ زراعت پر ہندوستان کی آمدنی سے فی صدی صرف ایک خرچ کرتی ہے (دیکھو مدینہ بجنور مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء از انڈین نیوز لندن) ظاہر ہے کہ ایسی بے توجہی میں زراعت کس طرح ترقی کر سکتی تھی۔ حالانکہ تنزل زراعت کے بے شمار اسباب چاروں طرف سے بڑھتے چلے جاتے رہے جن میں سے عام ہندوستانیوں کا روز افزوں افلاس اور اس پر روز افزوں ٹیکس و مال گزاری سب سے بڑا سبب تھا اور یہی وجوہ اس کے باعث ہوئے کہ وہ انگلستان جس میں زمانہائے سابق میں یعنی برطانیہ کے ہندوستان پر قبضہ کرنے سے پہلے بہت زیادہ قحط پڑتا رہتا تھا۔ قحط سے تقریباً محفوظ ہو گیا۔ کیوں کہ اس میں بے شمار دولت اور اناج ہندوستان سے کھنچ کھنچ کر پہنچنے لگا۔ اور وہ ہندوستان جس میں ہمیشہ غلّہ کی افراط اور انتہائی ارزانی رہا کرتی تھی قحط اور کال کا گھر بن کر رہ گیا۔ ۱۰۰۰ء یعنی گیارہویں صدی عیسوی سے لیکر ۱۷۰۰ء یعنی سترہویں صدی کے ختم تک سات سو برس کے قحط کے دونوں ملکوں کے مقابلتاً اعداد و شمار حسب تصریح سر ولیم ڈگبی صدی وار حسب ذیل ہیں۔

صدی	انگلستان	ہندوستان	وسعت قحط
گیارہویں صدی ۱۰۰۰ء سے ۱۱۰۰ء تک	۲۰ قحط	۲ قحط	ہر دو مقامی
بارہویں صدی ۱۱۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک	۱۵ قحط	۱ قحط	دہلی کے گرد و نواح میں
تیرہویں صدی ۱۲۰۰ء سے ۱۳۰۰ء تک	۱۹ قحط	۳ قحط	مقامی
چودہویں صدی ۱۳۰۰ء سے ۱۴۰۰ء تک	۱۶ قحط	۳ قحط	مقامی
پندرہویں صدی ۱۴۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک	۹ قحط	۲ قحط	مقامی
سولہویں صدی ۱۵۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک	۱۵ قحط	۳ قحط	مقامی
سترہویں صدی ۱۶۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک	۶ قحط	۳ قحط	غیر معین

سترہویں صدی تک انگلستان کے کل قحط ۱۰۰ اور ہندوستان کے ۱۷ قحط ہوتے ہیں مگر ہندوستان میں برطانیہ کے آنے اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد دونوں ملکوں کی حالت میں نمایاں انقلاب ہو گیا۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔

اٹھارویں صدی (از ۱۷۰۰ء تا ۱۸۰۰ء) انگلستان میں ۷ قحط اور ہندوستان میں ۱۷۰۰ء سے ۱۷۴۵ء تک ۴ قحط اور ۱۷۶۹ء سے ۱۸۰۰ء تک ۷ قحط (کُل ۱۱ قحط) صوبہ جات شمالی مغربی۔ دہلی و سندھ (مقامی)

اُنیسویں صدی (از ۱۸۰۱ء تا ۱۹۰۰ء) انگلستان میں صرف ایک قحط اور ہندوستان میں ۳۱ قحط۔ (جن کی وسعت تمام ہندوستان پر حاوی تھی اور جو اپنی نوعیت میں شدید تھے)

ہندوستان میں انیسویں صدی کے اکتیس قحطوں کی تفصیل حسب ذیل ہے جس میں سر ولیم ڈگبی نے ہر چوتھائی صدی کا حساب علیحدہ علیحدہ دکھایا ہے۔

۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء تک ۵ قحط	اس چوتھائی صدی میں قحط سے پچاس لاکھ آدمی مر گئے۔
۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۰ء تک ۲ قحط	اس چوتھائی صدی میں قحط سے دس آدمی مر گئے۔
۱۸۵۱ء سے ۱۸۷۵ء تک ۶ قحط	اس چوتھائی صدی میں قحط سے پچاس لاکھ آدمی مر گئے اور دوسرے مورّخ ایک کروڑ لکھتے ہیں۔
۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۰ء تک ۱۸ قحط	اس چوتھائی صدی میں دو کروڑ ساٹھ لاکھ آدمی صرف قحط سے مر گئے[1]

الغرض انگریزی حکومت سے پہلے ہندوستان میں قحط عموماً مقامی ہوتے تھے اور نہایت کم ہوتے تھے اور نہایت کم ہوتے تھے اور جلدی جلدی نہیں پڑتے تھے۔ چھ سو برس میں کل قحطوں کی تعداد ہندوستان میں سترہ اٹھارہ سے زائد نہیں ہے مگر انگریزی عہد حکومت میں نہایت وسیع اور بہت زیادہ اور جلد جلد ایک ہی صدی میں اکتیس قحط ایسے ایسے واقع ہوئے جن سے ملک نہایت زیادہ برباد ہو گیا اور یورپ کے

---

[1] اخبار انیس لودھیانہ مورخہ ۲۷ جون ۱۹۲۵ء۔ مقالہ در قحط درمیان ہندوستان و انگلستان و پراسپرس برٹش انڈیا)

بہت سے ملکوں کی آبادی سے زیادہ آدمی بھوک سے مر گئے۔ مسٹر جے۔ کیر ہارڈی۔ (موسس لیبر پارٹی آف انگلینڈ) اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:۔

"۱۸۶۱ء سے ۱۹۱۱ء تک یعنی پچاس برس کے عرصہ میں بھوک اور فاقہ سے مرنے والوں کی تعداد ہندوستان میں تین کروڑ نفوس کی تھی"

سر ولیم ڈگبی پراسپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے:۔

"ساری دنیا میں جنگوں کی وجہ سے ایک سو سات برس میں یعنی ۱۷۹۳ء سے ۱۹۰۰ء تک پچاس لاکھ کے قریب نقصان جان ہوا ہے، مگر ہندوستان میں قحطوں سے صرف ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۰ء تک ایک کروڑ نوے لاکھ سے زیادہ جانیں ضائع ہوئیں"

پہلے زمانہ کے قحطوں میں وسعت نہیں ہوتی تھی اور نہ جلدی جلدی پڑتے تھے وہاں جانیں ضائع نہیں ہوتی تھیں لوگوں کے پاس سرمایہ وافر تھا اناج کتنا بھی مہنگا ہو جاتا تھا خرید کر جان بچا لیتے تھے مگر انگریزی زمانہ میں سرمایہ لُٹ کر باہر چلا گیا تھا۔ گراں اناج کے خریدنے کی قوت لوگوں میں باقی نہیں رہی تھی اس لئے موت کے گھاٹ عام لوگوں کو اُترنا پڑتا تھا۔ سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے کہ:۔

"اُن قحطوں اور اموات کا سبب انگریزی مؤرخ آسمانی اسباب یعنی بارش کو قرار دیتے ہیں مگر یہ عُذر نہایت لنگ ہے۔ بارش کا نہ ہونا قلت فصل اور غلّہ کی کمی کا باعث ہو سکتا ہے مگر اصلی سبب اس ہلاکت کا افلاس ہے کہ لوگ ناداری کی وجہ سے غلّہ اپنے گردونواح کے ان صوبوں سے خرید نہیں سکتے جن میں غلّہ بکثرت پیدا ہوا تھا۔ سخت افلاس کے باعث لوگ ذرا سا بھی بار اُٹھا نہیں سکتے"

(خوشحال برطانوی ہند ترجمہ پراسپرس انڈیا۔)

مگر حقیقت میں اس صدی یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک میں بارش کی قلت بھی نہیں ہوئی۔ سر ولیم ڈگبی نے قحط کے سالوں کے متعلق اعداد و شمار اور متعدد انگریز ماہرین کی شہادتیں پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ان ایّام میں بارش کی کبھی بھی ایسی کمی نہیں ہوئی جس سے قحط پڑنا اور ایسی ہولناک بربادیاں ہوتیں۔ ماہرین اقتصادیات کا

اندازہ ہے کہ ملک کے ہر حصّہ میں اگر اکیس انچ بارش ہو جائے تو فصلیں بغیر آبپاشی کے تیار ہو سکتی ہیں مگر قحط کے سالوں میں بارش کا اوسط ہر جگہ ہمیشہ بیس انچ سے زائد ہی رہا کیا۔ ۱۸۶۶ء میں اڑیسہ میں قحط پڑا حالانکہ اُس سال بارش وہاں پر چھیاسٹھ انچ ہوئی۔ ۱۸۶۶ء میں بمبئی میں قحط پڑا حالانکہ وہاں پر بارش پچاس انچ ہوئی ۱۸۷۷ء میں مدراس میں قحط پڑا حالانکہ وہاں پر بارش چھیاسٹھ انچ ہوئی اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اناج بازاروں میں بکثرت موجود بھی رہتا ہے مگر صرف افلاس اور انتہائی غربت ہی باعث ہلاکت ہوئی قحط کے کمیشن کی رپورٹ ہے کہ موافق موسموں میں چودہ کروڑ ٹن غلّہ ہندوستان میں سال بھر خرچ کرنے کے بعد بچ رہتا تھا بعض انگریز مورخین نے یہ بھی ناکام کوشش کی ہے کہ آبادی کی زیادتی کو باعث قحط و ہلاکت قرار دیں مگر یہ بھی غلط ہے ہندوستان کی آبادی فی مربع میل یورپ کے بہت سے ممالک سے اوسطاً زیادہ تھی اور نہ اس میں آبادی کی افزائش زراعتی زمینوں کی افزائش سے زیادہ ہوئی۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان آبادی کی حیثیت سے کیا درجہ رکھتا ہے۔

۱۹۱۱ء میں	۱۹۲۱ء میں	۱۹۲۱ء میں
بلجیم فی مربع میل	ہالینڈ	انگلستان و ویلز
۵۸۹ نفوس	۴۵۴ نفوس	۴۰۵ نفوس
۱۹۲۱ء میں	۱۹۲۱ء میں	۱۹۲۱ء میں
جاپان فی مربع میل	اٹالیہ	جرمنی
۳۱۷ نفوس	۲۹۳ نفوس	۲۹۰ نفوس
۱۹۲۱ء میں	۱۹۲۱ء میں	۱۹۲۱ء میں
چین	آسٹریا	ہندوستان فی مربع میل
۲۶۶ نفوس	۲۶۶ نفوس	۲۱۱ نفوس

(نوٹ) اگرچہ بعض خاص خاص حصّوں میں ہندوستان میں آبادی فی مربع میل تمام ملکوں سے بہت زیادہ ہے۔ مگر مجموعہ ہندوستان کی آبادی کا اوسط دوسو گیارہ ہی ہے۔

الغرض ہندوستان باعتبار اوسط آبادی ان تمام ملکوں سے بہت کم ہے مگر افلاس اور قحط کی حیثیت سے سب سے زیادہ بڑھا ہوا کر دیا گیا ہے۔ علی ہٰذا القیاس ہندوستان

میں اضافہ آبادی فی صدی سات ہوا ہے۔ مگر اضافہ کاشت فی صدی آٹھ یا اس سے بھی زائد ہوا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر اس پروپیگنڈے کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے جو کہ بہت سے انگریز اور ان کے ایجنٹ انگریزی حکومت کی برتری کے حق میں کیا کرتے ہیں۔ کہ انگریزی حکومت سے پہلے ہندوستان میں امن و امان کسی طرف بھی اطراف ہند میں نہ تھا۔ عموماً لڑائیاں ہوا کرتی تھیں جن سے مخلوق تباہ و برباد ہوا کرتی تھی۔ مگر انگریزی حکومت نے تمام ملک میں ہر طرف امن و امان ایسا قائم کر دیا جس کی نظیر زمانہا گذشتہ میں نہیں ملتی"۔ کیونکہ اوّلاً یہ کہنا ہی غلط ہے کہ انگریزی حکومت کے زمانہ میں ہمیشہ اطراف ملک میں امن و امان رہا۔ ۱۷۵۷ء یعنی جنگ پلاسی سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کا ایک صدی کا زمانہ داخلی ہندوستان میں تمام لڑائیوں اور جنگ سے بھرا ہوا ہے جن میں عموماً ہندوستانی زیادہ تر ہلاک ہوتے رہے اور ہندوستان ہی کا سرمایہ لوٹا جاتا رہا۔ اسی صدی میں نواب سراج الدولہ والی مرشد آباد بنگال کی لڑائی میر قاسم نواب اودھ وغیرہ کی پٹنہ اور بکسر کی لڑائی۔ روہیلکھنڈ کی طویل و عریض۔ کرناٹک اور دکن کی لڑائیاں سلطان ٹیپو مرحوم کی لڑائیاں۔ مرہٹوں سے لڑائیاں نیپال اور بھوٹان کی لڑائیاں پنجاب اور اودھ اور سندھ بمبئی وغیرہ کی لڑائیاں ہیں۔ جن میں بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔ اور آخر ۱۸۵۷ء کی مشہور لڑائی ہے جس سے تمام ہندوستان انتہائی بربادی کے گھاٹ پر اتار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد بیرون ہند کی لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا جس میں افغانستان پر چار مرتبہ حملوں میں لاکھوں ہندوستانی مارے گئے مغربی اور شمالی سرحد کے آزاد قبائل سے صوات، بنیر، چترال، بنوں، کھجوای آفریدیوں، سعودیوں جھمندیوں، وزیریوں وغیرہ سے یکے بعد دیگرے مختلف اوقات میں بار بار لڑائیاں ہوئیں اور لاکھوں نفوس کام آئے۔ نیز بلوچستان کی لڑائیاں، برہما جنوبی اور شمالی، تبت وغیرہ اطراف ہند کی لڑائیاں۔ پھر بیرون ہند چین، سمالی لینڈ، سوڈان، مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ مصر وغیرہ کی لڑائیاں اور آخر میں ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اوّل جس میں ہندوستانی جانیں بیحد و بے حساب ضائع ہوئیں۔ یعنی عراق (ماسوپوٹامیہ) عدن۔ فلسطین۔ شام (سوریہ) چناق قلعہ، سمرنا، ایشیائے کوچک، بلجیم، فرانس وغیرہ کی لڑائیاں ہیں۔ جو کہ جرمنوں اور ترکوں

اور اُن کے خلفاء سے واقع ہوئیں اور ان میں ہندوستانی جانیں پانی کی طرح ضائع ہوئیں اور کروڑوں اشرفیاں اور روپیہ اور کروڑوں ٹن رسد وغیرہ برباد ہوئی کیا یہ چیزیں ہندوستان کی بربادی میں کچھ کم اثر انداز ہوئی تھیں۔ حالانکہ ان لڑائیوں کی بنیاد محض انگریزی شہنشاہیت و اقتدار اور برطانوی تجارت کی برتری تھی۔ ہندوستان کا کوئی مفاد پیش نظر نہ تھا۔ پھر اس کے بعد جنگ عظیم ثانی جو کہ ۱۹۳۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۳ء کے آخر تک جاری رہی اور برطانوی مفاد کی خاطر ہندوستان کی ہر چیز کو یورپین قربانگاہ پر چڑھا دیا گیا۔ ان لڑائیوں میں جس قدر ہندوستان کا دوسو برس کے اندر نقصان ہوا ہے، انگریزی اقتدار سے پہلے زمانہ میں ہزاروں برس میں بھی نہیں ہوا تھا۔ ہم اگر ان لڑائیوں سے قطع نظر کریں تو ان قحطوں کی وجہ سے باوجود امن وامان جس قدر جانی نقصان تمام ہندوستان کو صرف ڈیڑھ صدی میں برداشت کرنا پڑا ہے تمام دنیا کو ایک ہزار برس کی جنگوں سے برداشت کرتا نہیں پڑا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار ؀

(۷) ہنرمندی کے بجائے بے ہنری

ہندوستان ذرائع دولت و معیشت میں صنعتی اور تجارتی حیثیت سے تمام دنیا سے فائق تر تھا۔ انگریزوں نے اپنی خود غرضی سے اس کی صنعت اور تجارت دونوں کو تباہ و برباد کر دیا۔

ہندوستان زمانہ نہایت قدیم سے صنعتی اور تجارتی ملک تھا۔ اس میں بکثرت ہر جگہ صنعتی کارخانے قائم تھے۔ ہر صنعت کے اعلیٰ درجہ کے ماہر دستکار پائے جاتے تھے جو کہ یہاں کی خام پیداوار سے نہایت نفیس ایسی عمدہ اشیاء تیار کرتے تھے جن کی اطراف عالم میں نہایت زیادہ مانگ اور قبولیت ہوتی تھی۔ خشکی اور تری کے راستوں سے اُن کی تجارت، ایشیاء یورپ، افریقہ اور مشرق بعید میں ہوتی تھی اور ہر سال کروڑوں اشرفیاں ان کی قیمت میں ہندوستان میں آتی تھیں۔ جن کی وجہ سے کاروباری لوگ

نہایت آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں بے کاری کا نام و نشان تک نہ تھا۔ فاقہ مستی اور غربت و افلاس کا یہاں کے باشندہ پر سایہ بھی نہیں پڑتا تھا۔ ہر طرف آرام اور چین کا غلغلہ تھا۔ یہاں کے لوگ فارغ البالی اور خوشحالی میں کروٹیں لیتے تھے۔ چنانچہ ہم مسٹر تھارنٹن کا قول مندرجہ ذیل اس کے سفر نامہ سے نقل کر چکے ہیں۔ وہ کہتا ہے :

"یورپ کے تہذیب سکھانے والے یونان اور اٹلی جبکہ بالکل جنگلی حالت میں تھے ہندوستان اس زمانہ میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور دولت کا مرکز تھا۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے صنعت اور حرفت کے کاروبار جاری تھے۔ یہاں کے باشندے دن رات اپنے کاروبار میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی۔ جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے لائق اور کاریگر صناع موجود تھے جو یہاں کی خام پیداوار سے اتنا نفیس اور عمدہ مال تیار کرتے تھے کہ جس کی دنیا بھر میں مانگ ہوتی تھی۔ مغرب اور مشرق کے تمام ممالک ان اشیاء کو بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ یہاں سوت اور کپڑے اس قدر عمدہ اور باریک نفیس و خوبصورت بنتے تھے کہ دنیا میں کوئی ملک بھی ان کی برابری نہ کر سکتا تھا۔" (رسالہ مظلوم کسان ص ۱۳)

نیز ہم پہلے کتاب علم المعیشت سے حرفتی کمیشن کی رپورٹ مندرجہ ذیل اقتباس نقل کر چکے ہیں۔

"ایسے زمانہ میں جبکہ مغربی یورپ میں جو کہ موجودہ طریق حرفت کا مولد و منتہا ہے غیر مہذب قبائل آباد تھے۔ ہندوستان اپنے حکمرانوں کی دولت اور اپنے کاریگروں کی اعلیٰ صنعت کے لئے مشہور تھا اور بہت بعد کے وقت میں جبکہ مغرب کے حوصلہ مند تاجر پہلے پہل ہندوستان میں نمودار ہونے لگے یہ ملک زیادہ ترقی یافتہ یورپین اقوام سے کسی طرح گھٹا ہوا نہیں تھا۔"

مسٹر مریڈ تیھ ٹاونسنڈ اپنی کتاب ایشیا اور یورپ میں لکھتا ہے :۔

ہندوستان کے معمولی کاروباری لوگوں کے واسطے ہماری حکومت کسی طرح مبرّا از خطا نہیں ہو سکتی۔ اور ہماری حکومت سے یہ خرابی کبھی دُور نہیں ہو سکتی۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ ہماری حکومت نے ہندوستانیوں کی زندگی بالکل بے لطف بنا دی ہے۔ عام انگریزوں کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ ہماری حکومت سے پہلے ہندوستانی زندگی کیسی پُر لطف تھی اور کاروباری اور با ہمت لوگوں کے واسطے ہر ایک کاروبار میں کیسی آسانیاں میسّر تھیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے کاروباری ہندوستانی نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔"

(رسالہ تلک صفحہ ۱۱)

انگریز مصنفین اپنی اغراض ملعونہ کے ماتحت ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے کہ زمانہ قدیم سے ہندوستان صرف زراعتی ملک رہا ہے۔ مگر ڈاکٹر فرانسس بکانن (فرانسس بوچانن) جن کو لارڈ ویلزلی نے ۱۸۰۰ء میں جنوبی ہند کی معاشیات کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا تھا تمام ملک میں دورہ کر کے بچشم خود معائنہ کرتے ہیں اور تین ضخیم جلدوں میں رپورٹ مکمل کر کے لندن میں شائع کرتے ہیں جس پر عام طور پر انگریز مطلع ہو کر اس قدر پسند کرتے ہیں کہ کمپنی ان کو شمالی ہند کے دورہ کرنے اور وہاں کے حالات بچشم خود دیکھ کر قلمبند کرنے پر پھر مقرر کرتی ہے۔ چنانچہ اس کی تکمیل بھی تین ضخیم جلدوں میں ہو کر لندن میں شائع کی گئی۔ اس کتاب میں اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ کا ہندوستان کا معاشی حال نہایت تفصیل سے مذکور ہے اُس سے نتیجۂ ذیل اخذ کر کے صاحب علم المعیشۃ صفحہ ۵۸ میں لکھتا ہے۔

"یہ خیال غلط ہے کہ سدا سے ہندوستان کا عام پیشہ زراعت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی زمین اور آب و ہوا کاشت کے واسطے بے حد موزوں ہے اور ہمیشہ سے ہندوستان میں کاشتکاروں کی ایک بڑی جماعت چلی آتی ہے۔ لیکن جیسا کہ یقین دلایا جاتا ہے، یہ بیان خلافِ واقعہ ہے کہ من حیث القوم ہندوستانیوں کا ذریعہ معاش زراعت ہی زراعت رہا ہے بلکہ جو جماعت طرح طرح کی صنعت و حرفت سے اپنی روزی کمانی

تھی وہ اگر کاشتکاروں سے زیادہ نہ تھی تو بہت کم بھی نہ تھی۔ ڈاکٹر بوچانن کا قول ہے کہ جامہ بافی کی صنعت و حرفت کا ہندوستان میں اس قدر رواج اور عروج تھا کہ زراعت کے مانند اس کو بھی عام ملکی پیشہ قرار دینا بیجا نہ ہو گا۔ کروڑہا بندگانِ خدا اسی پیشہ پر بسر اوقات کرتے تھے۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ قسم تک روئی اور ریشم کا کپڑا یہاں پر بکثرت تیار ہوتا اور مقامی صرف کے علاوہ دُور دراز ممالک تک جاتا تھا۔ روپہلی کلابتون بٹ کر صدہا قسم کے زربفت تیار کرتے تھے جس سے بادشاہوں کے جسم و محلات کی زینت و آرائش ہوتی تھی۔ اُون سے غریبوں کے واسطے کمبل اور اُمرا کے واسطے شال تیار ہوتے تھے جو اب تک عجائبات مصنوعات میں نمبر اوّل شمار ہوتے ہیں۔ ہندوستانی ململ۔ اطلس۔ کمخواب۔ جامہ وار۔ چکن۔ چھینٹ نفاست و خوبی میں اب تک بطور ضرب المثل زبان زد ہیں۔ ان کی پائیداری ہر کسی کو مسلّم ہے۔ کپڑوں پر اس غضب کی سوزن کاری ہوتی تھی کہ پُرانے کشیدے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ فرش و فروش کا کل سامان چادریں، شطرنجیاں۔ دریاں بکثرت تیار ہوتی تھیں۔ تانبے پیتل کے خوشنما ظروف۔ سونے چاندی کے نظر فریب زیورات۔ گوناگوں رنگ۔ اعلیٰ درجہ کے تیل و عطر ہر قسم کا چرمی سامان۔ طرح طرح کے ہتھیار۔ لکڑی پر نقاشی اور ہاتھی دانت کا عجیب و غریب کام۔ اور نہایت پائدار کاغذ۔ غرضیکہ ناگزیر ضروریات کی کل چیزیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی بہت سی تعیشات ایک صدی کی بات ہے ہندوستان میں اس کثرت سے ہوتی تھیں کہ دیگر ممالک یہاں سے مال منگا منگا کر استعمال کرتے تھے۔ صنعت و حرفت کا ہر طرف چرچا تھا۔ مصنوعات کی دور دور پاس شہرت تھی۔ باوجودیکہ کافی امن میسّر نہ تھا۔ لوگوں کو کس قدر ذرائع معاش حاصل تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پیدائش کے دونوں اہم صیغے یعنی زراعت اور صنعت و حرفت اپنے ہی ہاتھ میں تھے۔ اور اگر حالات مساعدت کرتے اور مزاحمتیں سدّراہ نہ ہوتیں تو جس قوم نے آج سے ایک صدی پہلے مصنوعات میں

اس قدر ترقی کر لی تھی معاشی ترقیات میں آج اس کا کیا درجہ ہوتا۔ لیکن ہندوستان کچھ ایسے جال میں پھنسا کہ اس کی صنعت و حرفت تھوڑے ہی عرصہ میں دم توڑنے لگی۔ اور اب تک حالت نزع میں گرفتار ہے۔ ۷۵ فی صدی آبادی کی وجہ معاش کا بار زراعت پر آپڑا۔ باقی ماندہ لوگ ملازمت، معمولی صنعت و حرفت اور بے کاری میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ زراعت ہندوستان کے سر منڈھی گئی۔ اور اکثر صنعت و حرفت ممالک یورپ نے سنگوالی۔ اس تقسیم عمل سے ہندوستان کا جو نفع نقصان ہو رہا ہے اس سے قبل تجارت بین الاقوام میں واضح کیا جا چکا ہے۔

(علم المعیشتہ صفحہ ۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲-)

مذکورہ بالا صنائع اور دستکاریوں کے علاوہ جہاز بنانے میں ہندوستانیوں کی مہارت نہایت بے نظیر اور کامل تھی اور اسی طرح جہاز رانی اور سمندروں کی واقفیت میں بھی وہ نہایت اعلیٰ پایہ رکھتے تھے۔

صاحب علم المعیشت لکھتا ہے:۔

"پارچہ بافی اور دیگر صنعتوں کی ترقی یافتہ حالت تو بخوبی مسلّم ہے۔ لیکن یہ سُن کر شاید تعجّب ہو کہ اس زمانے کے لحاظ سے ہندوستان کے لوگ جہاز کے کام میں بھی خوب ہوشیار اور ماہر تھے۔ یوں تو جہاز سازی اور جہاز رانی ہندوستان کی بہت قدیم صنعت اور بہت قدیم پیشہ ہے۔ لیکن یہ ایک وسیع تاریخی بحث ہے جس کے واسطے یہاں کوئی گنجائش نہیں تاہم اٹھارہویں صدی کے آخر تک بھی یہ حالت تھی کہ لارڈ ویلزلی گورنر جنرل اپنے ایک مراسلہ میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کو حسب ذیل تحریر فرماتے ہیں۔

کلکتہ کے بندرگاہ میں دس ہزار ٹن کے قریب جہاز موجود ہیں۔ جو ہندوستان ہی میں تیار ہوئے ہیں اور اس قسم کے ہیں کہ ان میں انگلستان کو مال جا سکتا ہے۔ خانگی جہازوں کی جو تعداد کلکتہ کے بندرگاہ میں موجود ہے۔ بنگال میں جہاز سازی کی صنعت نے جو کمال حاصل کر لیا ہے اور عمدہ چوبینہ

کی کثرت کی بدولت یہ صنعت جس سرعت سے ترقی کر سکتی ہے ان تمام باتوں کے مدّنظر یہ امر یقینی ہے کہ بنگال کے انگریزی تاجر جس قدر مال انگلستان لے جانا چاہیں کلکتہ کے بندرگاہ میں لندن جانے کے واسطے کافی جہاز دستیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن مشہور مورّخ ٹیلر صاحب کا بیان ہے کہ ہندوستان کا مال لے کر ہندوستانی جہاز جب لندن کے بندرگاہ میں پہنچے تو وہاں ان جہازوں کو دیکھ کر سنسنی پیدا ہو گئی۔ گویا کہ خدانخواستہ دریائے ٹیمس میں کسی غنیم کا جنگی بیڑہ گھس آیا۔ لندن کے جہاز سازوں نے شور برپا کر دیا کہ ان کا کاروبار تباہ ہوا چاہتا ہے اور انگلستان میں تمام جہاز سازوں کے خاندان بھوکوں مر جائیں گے۔ کمپنی بھی اس مخالفت سے مرعوب ہو گئی اور بالآخر حکم دے دیا کہ ہندوستانی جہازوں سے کام نہ لیا جائے اور وہ لندن کے بندرگاہ میں نہ آئیں، بلکہ ہندوستان کے جہاز راں بھی ملازم نہ رکھے جائیں۔ کیونکہ جب وہ لندن پہنچ کر وہاں کے حالات دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں ہماری وہ وقعت باقی نہیں رہتی جو بالعموم ہندوستان میں پیدا ہو گئی ہے اور جو حکمرانی کے واسطے لازم ہے اور واپس جا کر وہ لوگ اپنے ملک میں ہمارے قصّے سناتے ہیں۔ اس سے بڑی خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا مادّی۔ اخلاقی۔ کاروباری اور سیاسی ہر لحاظ سے ہندوستانی جہاز رانوں کا لندن آنا مناسب نہیں۔ اسی طرح اُنیسویں صدی کے شروع سے ہندوستان کی یہ صنعت بھی کس مپرسی کے ہاتھوں تباہ ہو گئی۔ ورنہ خدا جانے اب تک کس درجہ ترقی حاصل کر لیتی۔“

(معیشتہ الہند صفحہ ۶۹۸-۶۹۹-۷۰۰)

مسٹر مکرجی اپنی کتاب تاریخ ہندوستان میں لکھتا ہے۔ صـ ۲۳۳

”ایک انگریز مقیم بالاسور اپنے خط مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۶۷۶ء میں ڈائرکٹران کمپنی آف لندن کو لکھتا ہے بہت سے انگریز جہاز راں تاجروں کے جہاز و بادبان ہر سال یہاں تیار ہوتے ہیں۔ پرانے اور بہترین قسم کے ساگوان یہاں بکثرت موجود ہیں اور بہترین لوہا بھی بافراط دستیاب ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کے کاریگری

کے کام مثلاً بولٹو، میخ، کیل، لنگر وغیرہ یہاں کے لوہار نہایت ہوشیاری سے انجام دیتے ہیں مضبوط جہاز تیار کرتے ہیں اور صحت و درستگی کے ساتھ جہازوں کو پانی میں اتار دیتے ہیں یہاں کے کاریگر ہر ہوشیار کاریگر سے مقابلہ کرسکتے ہیں۔ (مالیات عامہ ص۱۵)

نیز یہی مسٹر مکرجی اسی اپنی کتاب تاریخ ہندوستان ص۲۴ میں لکھتا ہے:۔

۱۸۰۲ء کے بعد کے زمانہ میں بھی ہندوستان سے جنگی اور تجارتی جہاز بن کر انگلستان جایا کرتے تھے۔" (مالیات عامہ ص۱۶ از رادھا کمار مکرجی بیس اے ہسٹری آف انڈیا شپنگ)

نیز یہی مسٹر مکرجی اسی اپنی کتاب تاریخ ہندوستان ص۲۵ میں لکھتا ہے:۔

"انگلستان والے یہاں کے مشاق کاریگروں سے نقشہ بنوا لیا کرتے تھے۔"

(مالیات عامہ ص۱۶)

سر ولیم ڈگبی پراسپرس برٹش انڈیا ص۹۰۸ میں لکھتا ہے:۔

۱۸۰۸ء میں گورنر جنرل نے اپنے آقاؤں کو لندن لیڈن ہال میں رپورٹ کی کہ کلکتہ کی بندرگاہ میں دس ہزار ٹنے جہاز موجود ہیں جو اسی جگہ بنائے گئے ہیں اور ہندوستان سے انگلینڈ کو مال تجارت پہنچانے کیلئے کارآمد ہیں۔ کلکتہ کے بندرگاہ میں جسقدر جہاز موجود ہیں اور جس کمال کو جہاز بنانے کا کام بنگال میں پہنچ چکا ہے اور لکڑی کی بہتات کیوجہ سے اس میں بہت جلد ترقی ہونے کی اُمید ہے اُسکے لحاظ سے یہ یقینی امر ہے کہ اس بندرگاہ میں اس قدر جہاز برابر تیار ہوسکیں گے جس قدر پرائیویٹ انگریز سوداگر ان کو مال تجارت پہنچانے کے لئے درکار رہوں گے۔

نیز سر ولیم ڈگبی اسی کتاب پراسپرس برٹش انڈیا میں بمبئی کے متعلق ایک انگریز لفٹنٹ کرنل اے واکر کی رپورٹ ۱۸۸۱ء اور اُس کا مشورہ نقل کرتا ہے جو درج ذیل ہے۔

"صرف بمبئی میں سوداگری کے دو جہاز یا ایک جہاز اور جنگی جہاز انگریزی بحری فوج کیلئے اٹھارہ مہینوں میں تیار ہوسکتے ہیں اوّلاً بمبئی کے ڈاک (جہاز بنانے کی جگہ) اس قابل ہیں کہ بڑی سے بڑی طاقت کا جہاز بھی ان میں تیار ہوسکتا ہے (اوّلاً) گجرات اور ملابار کے جنگلوں کے درمیان واقع ہونیکی وجہ سے لکڑی کا بکثرت پہنچنا (ثانیاً) اچھی قسم کی سن کا ہندوستان میں بکثرت پیدا ہونا (ثالثاً) انگریزی بحری فوج کا یورپ کا تیار شدہ جہاز ہر بارہ سال کے بعد از سر نو تیار کیا جاتا ہے (رابعاً) بمبئی کا ساگوان

کا بنا ہوا جہاز پچاس سال سے بھی زیادہ چل سکتا ہے (خامسًا) بمبئی کے بہت سے جہاز چودہ پندرہ سال کے بعد بحری فوج کے لئے خریدے گئے تو نہایت مضبوط پائے گئے۔ جہاز موسوم بہ ووسرایڈورڈ ہیوز "آٹھ سفر سوداگری کے کر چکا تھا کہ بحری فوج کے لئے خرید اگیا۔ حالانکہ یورپ کا کوئی جہاز بھی چھ سفر سلامتی کے ساتھ طے نہیں کر سکتا۔ (سادسًا) بمبئی میں جو جہاز بنتے ہیں اُن پر انگلینڈ کی بہ نسبت پچیس فی صدی کم لاگت لگتی ہے"۔

مندرجہ بالا حساب سے سر ولیم ڈگبی نے ایک بیڑہ بحری جہاز کی تیاری کا موازنہ باعتبار مُدّت اور باعتبار مصارف وغیرہ حسب ذیل درج کیا ہے۔

بمبئی میں بحری جہاز	۱۸ ماہ یعنی ڈیڑھ برس میں ۲۰ عدد فوجی بحری جہاز	تین برس میں ۴ عدد فوجی بحری جہاز	پندرہ برس میں ۲۰ عدد فوجی بحری جہاز (یعنی ایک بیڑہ)
انگلینڈ کا جہاز	صرفہ تعمیر ۱۰۰ پونڈ	صرفہ ترمیم و تجدید ۵۰ سال ۳۰۰ پونڈ	کل صرفہ پچاس برس میں ۴۰۰ پونڈ
بمبئی کا جہاز	صرفہ تعمیر ۷۵ پونڈ	صرفہ تعمیر و ترمیم ۵۰ سال ۷۵ پونڈ	کل صرفہ پچاس سال میں / بچت فیصدی ۳۲۵ پونڈ

صاحب حکومت خود اختیاری صفحہ ۶۶ میں لکھتا ہے:۔

"بعض اصحاب یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان ہمیشہ سے محض ایک زرعی ملک رہا ہے۔ حالانکہ گذشتہ صفحات میں بکثرت انگریزوں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں جن سے واضح ہے کہ ہندوستان کی صنعت کس درجہ پر رہی ہے اور کس طرح وہ توڑی گئی۔ تاہم اُن تحریرات پر میں چند امور اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ نواب مرزا یار جنگ صاحب چیف جسٹس حیدر آباد دکن نے کپتان الگزنڈر ہملٹن کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ یہاں صرف ایک شہر کے مختلف کارخانوں میں پچاس ہزار پارچہ باف کام کرتے تھے اور جو سامان تیار ہوتا تھا اس کا جزوِ اعظم بیرونی ممالک کو بلکہ خاص کر یورپ کو جاتا تھا۔ برخلاف اس کے یورپ سے جو مال آتا تھا وہ نہایت کم تھا۔

مثلاً ۱۷۹۴ء کی نسبت معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں انگلستان سے صرف (۱۵۶) پونڈ کپڑا آیا۔ پروفیسر ولسن نے لکھا ہے کہ "لوہا" ڈھالنے کی صنعت اس ملک (انگلستان) میں صرف چند سال سے ہے۔ ہندی لوہا ڈھالنے اور اسپات بنانے کا کام نامعلوم زمانہ سے جانتے ہیں۔"

مسٹر راناڈے نے ۱۸۹۲ء میں لکھا تھا کہ "دہلی کی مشہور لوہے کی لاٹ جو پندرہ سو سال کی پرانی ہے اُس سے لوہا ڈھالنے کی صنعت کا اندازہ ہوتا ہے۔"

مسٹر بال کو جو کہ ہندوستان کے محکمہ پیمائش کے افسر رہے ہیں انہیں تسلیم ہے کہ "وہ چند سال پہلے تک دنیا کے سب سے بڑے کارخانوں میں اتنی بڑی لاٹھ کا ڈھالنا ناممکنات سے تھا اور اب بھی بہت کم کارخانے ایسے ہیں جو اتنی کثیر مقدار دھات کو ڈھال سکتے ہیں۔"

ایک اور مصنف کا بیان ہے کہ لندن میں فولاد ہندوستان کے نام سے فروخت کیا جاتا تھا۔ مسٹر ڈگبی نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں جہاز سازی نہایت اعلیٰ درجہ کی حالت میں تھی مگر انگریز اُسے گوارا نہ کر سکے۔ مسٹر ٹیلر نے لکھا ہے کہ لندن کی بندرگاہ میں جب ہندوستان کا مال ہندوستان کے بنتے ہوئے جہازوں میں پہنچا تو اُس سے وہاں کے بااختیار لوگوں میں اس قدر پریشانی پھیلی کہ کسی دشمن کے بیڑے سے بھی نہ پھیلتی۔ لندن کے جہاز سازوں نے اس شور و غوغا کرنے میں نمایاں حصہ لیا اور کہا کہ ہمارا کاروبار بربادی کے کنارے آلگا ہے اور ہمارے بال بچے یقیناً فاقہ کشی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ (ماخوذ از رپورٹ صنعتی کمیشن ۱۹۱۹ء)

اس چیخ و پکار سے ڈائرکٹران کمپنی پر اثر پڑا اور انہوں نے جہاز سازی کی صنعت ہندوستان کی بندرگاہوں سے توڑ کر انگلستان کی فاقہ کشی کے خطرہ کو ہندوستان کی طرف روانہ کر دیا۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستان قدیم زمانہ سے صنعتی اور تجارتی ملک تھا۔ یہاں ہر قسم کی اعلیٰ اور ادنیٰ صنعتوں کے بے شمار کارخانے قائم تھے جن سے ملکی ضروریات اور ذرائع ترقیات پوری ہوتی تھیں اور تمام دنیا کے ممالک نفع حاصل کرتے تھے۔ بیرونی ملکوں سے ہر سال کروڑوں اشرفیاں انہیں مصنوعات کی قیمت میں ہندوستانی

تاجر حاصل کرتے تھے اور ہندوستانی باشندے کروڑوں آدمیوں کی تعداد میں یہاں کی صنائع اور تجارتوں کے ذریعہ سے آرام اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر برطانیہ کو ہندوستانیوں کا عیش و آرام نہ بھایا اور اُن کی آنکھوں میں کھٹکنے اور چبھنے والا کانٹا بن کر دن و رات بے چین کرنے لگا۔ مدبرین برطانیہ نے سوچنا شروع کیا کہ کس طرح ہندوستان کی صنعت اور تجارت پر چھاپہ مارا جائے اور اس کی تمام صنعتوں اور تجارتوں پر اپنا قبضہ جمایا جائے۔ تنہائیوں میں، مجمعوں میں، حکومت کے ایوانوں میں اس کے لئے تذکرے جاری ہوئے اسکیمیں بنائی گئیں ریزولیوشنس پاس ہوئے اور نت نئے طریقے مظالم کے ایسے ایسے جاری کئے گئے جن کی انسانی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ تہذیب کا دعویٰ کرنے والی قوم اور انسانیت کی خدمت کا ڈھونگ رچانے والی ملت نے وہ وہ انسانیت کش طریقے بنائے اور ہندوستان میں جاری کئے جن کے سامنے قدیمی زمانہ کے ظالم سے ظالم اور جابر سے جابر بادشاہوں اور قوموں کے وحشیانہ مظالم بھی ہیچ تھے اور جن کو فراعنہ مصر اور بربرہ افریقہ اور وحشی تاتاری بھی انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتے۔

بربادی صنعت و تجارت کی داستان الم

جوش رقابت اور پے در پے حملے۔ بربادی صنعت و تجارت کے ڈپلومیٹک طریقے

---

(۸) صاحب علم المعیشۃ صفحہ ۵۸۲ میں ہندوستانی تجارت کی خارجہ سرگزشت لکھتے ہوئے کہتا ہے "وہ اٹھارویں صدی کے نصف تک ہندوستانی مصنوعات بلا تکلف انگلستان جاتی رہیں۔ لیکن انگریز جیسی معاملہ فہم اور وقت شناس قوم فوراً تاڑ گئی کہ اگر یہی لیل و نہار رہیں اور ہندوستانی مصنوعات یونہی بلا روک ٹوک بکثرت ملک میں آتے رہے تو ملکی صنعت کا پنپنا محال ہے بلکہ رہی سہی جو کچھ ہے وہ بھی خاک میں مل جائے گی اور ہمیشہ کے واسطے ہندوستان کا دست نگر بننا پڑے گا عام مرفہ الحالی اور ملکی ترقی پر صنعت و حرفت کے زوال سے جو نیاہ کن اثر پڑتا وہ اس بیدار مغز اور مآل اندیش قوم سے مخفی نہ تھا۔ چناں چہ جونہی دیکھا کہ ہندوستانی مصنوعات کا ملک پر تسلط ہوتا جاتا ہے فوراً چونک

اُٹھی اور ہر قسم کی پیش بندی شروع کر دی۔ جیسا کہ قبل بتایا جا چکا ہے سوتی اُونی، ریشمی، زریں غرضیکہ ہر قسم کے کپڑے تیار کرنے میں ہندوستان نے وہ کمال حاصل کیا تھا کہ اگر صریح ثبوت موجود نہ ہوتے تو اس کا یقین کرنا دشوار ہوتا اور جامہ بافی کا ملک بھر میں اس قدر کاروبار پھیلا ہوا تھا کہ زراعت کے مانند وہ بھی قومی صنعت کہلاتا تھا۔ نہ صرف غرباء اور متوسط الحال لوگوں کی مستورات بوقت فرصت سُوت کات کر نفع اُٹھاتی تھیں بلکہ اچھے اچھے گھر کی بہو اور بیٹیاں چکن اور کشیدے کاڑھنا اور طرح طرح کی سوزن کاری باعث فخر و امتیاز خیال کرتی تھیں۔ کروڑہا بندگانِ خدا کی روزی اسی صنعت و حرفت سے وابستہ تھی۔ دیگر ممالک کو کپڑا بھی بکثرت بھیجا جاتا تھا چنانچہ ہندوستان میں پارچہ بافی کا عروج دیکھ کر انگلستان والوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور بنظر دوراندیشی رقابت کے جوش میں انہوں نے سب سے اوّل ہندوستان کی اسی صنعت پر وار کیا اور وہ ایسا کاری پڑا کہ کچھ ہی عرصہ میں ہندوستانی پارچہ بافوں کا حال زار و نزار ہو گیا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ولایت کے کپڑا بُننے والوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ نہ کپڑے کی عمدگی میں ہندوستان والوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ اُس کی ارزانی میں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی کپڑا انگلستان میں خود وہاں کے کپڑے پر غلبہ پا رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ انگلستان کی یہ صنعت کسی روز بالکل بے جان ہو جائے گی تو انہوں نے شور مچانا شروع کیا۔ حکومت قوم کے ہاتھ میں تھی۔ حکمران طبقہ مستعد اور بیدار مغز تھا۔ صناعوں کی معروضات پر فوراً توجہ کی۔ اُن کی شکایات کو معقول اور بجا پا کر اختیارات حکومت سے کام لیا۔ اور نہ صرف ملک کو تباہی سے بچا لیا بلکہ اس مستقل عظمت و طاقت کی بنیاد قائم کر دی یعنی جامہ بافی کی صنعت کو بذریعہ قانون مامون کر دیا اور کون نہیں جانتا کہ انگلستان کی مرفہ الحالی و اقتدار کو لنکاشائر مانچسٹر اور لورپول کی کپڑے کی ملوں نے شروع سے آج تک کس قدر سیراب و شاداب بنا رکھا ہے۔

۱۷ مارچ ۱۷۶۹ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ولایت سے اپنے اعلیٰ عہدہ داروں کے نام بنگال کو ایک عام خط بھیجا جس میں بتاکید تحریر یہ تھا کہ ہر طرح سے بنگال میں ریشم خام کی پیداوار

بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ریشمی کپڑوں کی تیاری گھٹانی۔ بلکہ روکنی چاہیئے تاکہ ریشم خام ہندوستان سے ولایت آئے اور ریشمی کپڑا یہاں سے تیار ہو کر ہندوستان جائے۔ اس غرض کو پورا کرنے کا ایک یہ طریق بھی بتایا گیا تھا کہ کپڑا بننے والوں کو کسی نہ کسی طرح خود کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور بطور خود کام کرنے سے ان کو روکا جائے۔ تاکہ کل کاروبار کمپنی کے ہاتھ میں آجائے اور وہ اس میں جیسی ردّ و بدل مناسب سمجھے بآسانی کر سکے۔

انگلستان کے دارالعوام کی طرف سے جو ایک منتخب کمیٹی ہندوستان کے حالات پر غور کرنے کیواسطے مقرر کی گئی تھی اُس نے اپنی رپورٹ میں جو ۱۷۸۳ء میں شائع ہوئی تھی ڈائرکٹران کمپنی کے مذکورہ بالا خط کی تعریف اور تائید کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اس خط میں ہندوستانی پیداوار خام کی ترقی اور مصنوعات کی مزاحمت کے بارہ میں جو پالیسی صاف صاف بیان کی گئی ہے اس سے بنگال کی صنعت و حرفت کو ضرور صدمہ پہنچے گا۔ اگر اس خط کی ہدایات پر عمل ہو سکا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان جیسے صنعت و حرفت والے ملک میں ایسا انقلاب نمودار ہو گا کہ اس میں نری پیداوار خام پیدا ہونے لگے گی۔ جو انگلستان کے مصنوعات میں کام آئے گی۔ سب سے عمدہ اثر جو ظاہر ہو چکا وہ یہ ہے کہ ریشم بننے والے اب کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ اگر اب وہ لوگ بطور خود کام کرنا چاہیں تو بھی اُن کو روکنا چاہیئے۔ اور اگر نہ مانیں تو سرکار اُن کو سخت سزا دے اور بطور خود کام کرنے کی قطعاً ممانعت کر دے۔ (علم المعیشۃ صفحہ ۵۸۴)

بربادی صنعت و تجارت کے ڈپلومیٹک طریقے

خلاصۂ کلام یہ کہ ہندوستان کی صنعت اور تجارت کے مٹانے کے لئے تین طریقے اختیار کئے گئے۔ اوّل یہ کہ ہندوستانی کاریگروں کو صنعت سے روکا جائے۔ دوم یہ کہ ہندوستان کے مال کو انگلستان میں داخل نہ ہونے دیا جائے اور تجارت عامون کے فلسفہ کو اس قدر خوشنما اور ضروری بتایا جائے کہ لوگ چاروں طرف اس کے گرویدہ ہو کر اُسی کو حق اور صحیح ماننے لگیں اور کہنے لگیں کہ ہر ملک کا فرض ہے کہ دوسرے ملکوں کی ارزانی پیداوار کی درآمد ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ سے روک کر اپنے یہاں کی صنعت و حرفت کو

ترقی دینے کی کوشش کرے تاکہ کچھ عرصہ میں ملکی پیداوار بھی اسی قدر ارزاں ہو جائے اور خارجی پیداوار کی ضرورت ہی نہ رہے۔ سوم یہ کہ اپنی مصنوعات کو ہندوستان میں ٹھونسا جائے اور اس کو اس قدر ارزاں کر دیا جائے کہ ہندوستانی صنعت گھٹتے گھٹتے بالکل فنا ہو جائے اور اس امر کے لئے آزاد تجارت کا فلسفہ بروئے کار لایا جائے اور تمام دنیا کو سمجھایا جائے کہ حق یہی ہے کہ اپنے ملک اور غیر ملک کی پیداوار میں کوئی اور امتیاز نہ ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی چیز دوسرے ملک سے ارزاں دستیاب ہو سکے تو بلا تکلف اس کو منگا لیا جائے اور ٹیکس قائم کر کے اس کی درآمد روکی نہ جائے۔ اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں پیدا نہ ہو سکے تو سرکاری امداد سے اس کو ترقی دینے اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنے کی کوشش نہ کی جائے۔ انگریز ڈپلومیٹروں نے ہندوستان کے ساتھ تینوں طریقے نہایت معصومانہ انداز میں اختیار کئے جن کی کچھ تفصیل ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

پہلا طریقہ اوّل الذکر (یعنی ہندوستانیوں کو صنعت اور دستکاری سے جابرانہ طریق پر روکنا) اس کی ابتداء ۱۷۶۹ء ۱۷ ؍مارچ سے ہوئی اور پھر اس کے قوانین اور جابرانہ اعمال ایسے ایسے اختیار کئے گئے کہ جن کے سننے سے انسانی جگر اور قلب تھرا اُٹھتا ہے اور درندگی کی وحشیانہ مثالیں سامنے آجاتی ہیں۔ ۱۷۶۹ء کے خط میں ہدایت کی گئی تھی کہ بنگال کے کاریگروں کو کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور اگر وہ نہ مانیں اور بطور خود کام کرنا چاہیں تو اُن کو روکا جائے۔ چنانچہ ۱۷۸۳ء کی مذکورہ بالا رپورٹ میں اس کے نتائج ذکر کرتے ہوئے منتخب کمیٹی کہتی ہے۔

> ”سب سے عمدہ اثر جو ظاہر ہو چکا وہ یہ ہے کہ ریشم بُننے والے اب کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ اگر اب وہ لوگ بطور خود کام کرنا چاہیں بھی تو اُن کو روکنا چاہیئے اور اگر نہ مانیں تو سرکار اُن کو سخت سزا دے اور بطور خود کام کرنے کی قطعاً ممانعت کر دے۔“

اس بندش کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ اوّلاً ریشمی کپڑے کی پیداوار اپنے قابو میں کر کے حسب ہدایات ڈائرکٹران اس کی مقدار گھٹائی جائے۔ ثانیاً جس قدر کپڑا بھی تیار کرایا جائے من مانی اُجرت دے کر ارزاں تیار کرایا جائے۔ ریشمی کپڑوں کی خوبی اور نفاست نے دنیا کو گرویدہ بنا رکھا تھا وہ یا تو تیار ہی نہ ہوں یا اگر ہوں تو ہندوستانیوں کو نفع وابھی

حاصل نہ ہو۔ اس طرح مجبور کرنے کے لئے کاریگروں کے ساتھ جو معاملے کئے گئے اُن پر مندرجہ ذیل اقتباسات سے روشنی پڑتی ہے۔

سر تھامس منرو ۱۸۱۳ء میں پارلیمنٹ کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے کہتا ہے۔

"ملازمان کمپنی نے خاص خاص نوربافوں کو ایک عمارت بارہ محل میں جمع کر کے اُن پر پہرہ بٹھا دیا اور اس وقت تک رہا نہ کیا جب تک کہ انہوں نے معاہدہ نہ کیا کہ وہ سوائے کمپنی کے اپنا مال کسی اور کے ہاتھ فروخت نہ کریں گے۔ جب کبھی نرخ پر نوربافوں کی طرف سے اعتراض ہوتا تو کمپنی کی ایک کمیٹی اپنی رائے کے موافق نرخ قرار دیتی اور نوربافوں کو قبول کرنا پڑتا اُن کو کچھ رقم پیشگی دے دی جاتی ہے جس کی ادائیگی سے اُن کو عمر بھر سبکدوش ہونا محال ہے۔ اگر کوئی نورباف معاہدہ کی پوری پابندی نہ کرتا تو اس کی نگرانی کے واسطے ایک شحنہ تعینات کر دیا جاتا تھا جس کا طلبانہ ایک آنہ روز اُسی نورباف سے وصول کیا جاتا تھا۔ شحنہ کے پاس ایک سونٹا بھی ہوتا تھا جس سے وہ بلا تکلف تنبیہ الغافلین کا کام لے سکتا تھا اور لیتا تھا۔ مزید براں نوربافوں پر جرمانہ کیا جاتا تھا جو کہ اُن کے تانبے پیتل کے برتن نیلام کرنے سے وصول ہوتا تھا۔ اس طرح سے کپڑا بننے والی جماعت بالکل کمپنی کے پنجے میں دبی رہتی تھی۔" (علم المعیشتہ ص۵۸۸)

مسٹر کاکس بیان کرتے ہیں،۔

"صرف اُس ایک کارخانہ میں جس کے وہ نگراں تھے ڈیڑھ ہزار نورباف کام کیا کرتے تھے۔ نوربافوں کے ساتھ جو کچھ برتاؤ کیا جاتا تھا وہ کوئی بے ضابطہ کارروائی نہ تھی۔ بلکہ قوانین کی رُو سے اس کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۷۹۲ء کے ریگولیشن ۳۱ میں یہ سب حالات مذکور ہیں اور نیز ہندوستانی زمینداروں کو تنبیہ ہے کہ کمپنی کے تجارتی افسروں کو نوربافوں سے معاملہ کرنے میں وہ کبھی نہ روکیں۔ نہ اور کسی طرح کی مزاحمت کریں اور ہمیشہ ادب سے پیش آئیں جبکہ ہندوستان کے سرمایۂ ناز صناعوں کے ساتھ من حیث الجماعت الیسا برتاؤ کیا جائے جیسے کہ کوئی صیاد پرندوں کو

پنجرے میں بند کر کے کرے تو صنعت و حرفت کا جو کچھ حشر ہو گا اور بیان محتاج بیان نہیں۔ یہ چمن تو آزادی کی آب و ہوا میں لہلہاتا ہے۔ غلامی اس کے حق میں خزاں کا حکم رکھتی ہے" (علم المعیشۃ صفحہ ۵۸۸ - ۵۸۹)

(ہندوستانی تجارت خارجہ کی سرگذشت)

فرانسس براؤن پارلیمنٹ کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

"آگے چل کر ہندوستانی کپڑے کی تجارت کو تباہ کرنے کے لئے کمپنی نے جولاہوں کے چرخوں، کپڑا بنانے کے اوزاروں اور کرگھوں تک پر بھاری ٹیکس لگا دیا"

انگریزی سوداگر سر ولیم بولٹس کا بیان حسب ذیل ہے:۔ (از پارلیمنٹری رپورٹ)

"کمپنی کے گماشتے بازار کے بھاؤ سے چالیس فی صدی کم قیمت پر جولاہوں سے زبردستی کپڑا لیتے تھے۔ اگر وہ مچلکہ کے مطابق کپڑا نہیں دے سکتے تھے تو ان کا سامان اسی وقت فروخت کر کے کمی پوری کی جاتی تھی۔ اور کچا ریشم نکالنے والے ناگوروں کے ساتھ اتنا ظلم کیا جاتا تھا کہ ایسی مثالیں پائی گئی ہیں کہ ریشم نکالنے کے لئے انہوں نے اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالے ہیں"

سر ولیم بولٹس ۱۷۷۲ء میں کہتا ہے:۔

"اصل یہ ہے کہ تمام اندرون ملک کی تجارت اور ایک خاص طریقے سے کمپنی کا پورب میں روپیہ لگانا یہ سب مسلسل مظالم کا ایک منظر رہا ہے۔ جس کے مضر اثرات شدت کے ساتھ ہر نور باف اور ہر کاریگر محسوس کر رہا ہے۔ ہر سامان جو تیار کیا جاتا ہے وہ کمپنی کی مخصوص ملکیت ہو جاتا ہے اور انگریز اپنے بنیوں اور کالے رنگ کے گماشتوں کی مدد سے خود رائی کے طریقے سے طے کرتے ہیں کہ ہر کاریگر کتنا مال اور کس قیمت پر دے گا اور ان امور میں بالعموم غریب جولاہے کی رضامندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ گماشتے جو کمپنی کے ملازم ہوتے ہیں ان لوگوں سے جس چیز پر چاہتے ہیں دستخط کرا لیتے ہیں اور اگر جولاہے وہ روپیہ لینے سے انکار کرتے ہیں تو وہ روپیہ زبردستی اُن کی کمر میں بندھوا یا جاتا ہے اور پھر اُن کو کوڑے

مارے جاتے ہیں۔ اس محکمہ میں جو جو بدمعاشیاں کی جاتی ہیں وہ وہم وقیاس میں بھی نہیں آسکتیں۔ ہر چیز کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب جولاہے کو خوب ٹھگا جاتا ہے کیونکہ کمپنی کے گماشتے جو قیمت مقرر کرتے ہیں وہ بالعموم بازار کی قیمت سے (۱۵) فیصدی سے لے کر (۴۰) فی صدی تک کم ہوتی ہے۔ اسی قسم کا غیر منصفانہ برتاؤ خام ریشم بننے والوں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے اور اس امر کی مثالیں موجود ہیں کہ ان لوگوں نے ریشم کاتنے کی تکالیف سے تنگ آکر خود اپنے انگوٹھے کٹوا ڈالے تاکہ وہ اس جبر و تعدّی سے محفوظ رہیں۔"

(حکومت خود اختیاری صـ۱۰)

۲۸ فروری ۱۹۲۸ء کو روزنامہ خلافت جلد ۷ نمبر ۴۸ میں ولیم بولٹس وغیرہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

(۱) جو کپڑا بننے والے کمپنی کے ایجنٹوں کے بنائے ہوئے راضی نامے جنہیں مچلکہ کہا جاتا تھا اس پر عمل کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ ان کا مال ضبط کر کے کھڑے کھڑے نیلام کر دیا جاتا تھا۔ کچا ریشم نکالنے والوں کے ساتھ طرح طرح کی زیادتیاں کی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ اُن کے انگوٹھے کاٹ لئے جاتے تھے تاکہ وہ اپنا کام نہ کر سکیں۔

(۲) کپڑا بننے والوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ اپنے مفاد کے خلاف کمپنی کا کام کریں۔ چنانچہ ان پر بڑے بڑے جرمانے کئے جاتے تھے تاکہ وہ کمپنی کا کام کریں۔ کپڑا بننے والوں کو سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں اور اس طرح انہیں مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ کپڑا بننے کا کام چھوڑ دیں۔

(۳) تجارتی بورڈ کی ڈائری بابت ۱۷۹۳ء اور ۱۸۱۱ء میں ان غریب کپڑا بننے والوں اور ملک کے کاریگروں کو جو غلاموں کی طرح کمپنی کا کام کرتے تھے سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں اُن پر جرمانے ہوتے تھے قید دی جاتی تھی۔ کوڑے پڑتے تھے اور ان پر ایسی پابندیاں لگائی جاتی تھیں جس کے باعث کپڑا بننے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی جاتی تھی۔

مسٹر میتھ ٹاونسنڈ اپنی کتاب ایشیا اور یورپ میں لکھتا ہے:۔

"ہندوستان کے معمولی کاروباری لوگوں کے واسطے ہماری حکومت کسی طرح بھی مبرا از خطا نہیں ہو سکتی اور ہماری حکومت سے یہ خرابی کبھی دُور نہیں ہو سکتی۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہماری حکومت نے ہندوستانیوں کی زندگی بالکل بے لطف بنادی ہے عام انگریزوں کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ ہماری حکومت سے پہلے ہندوستانی زندگی کیسی پر لُطف تھی اور کاروباری اور باہمت لوگوں کے واسطے ہر ایک کاروبار میں کیسی آسانیاں میسّر تھیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے کاروباری ہندوستانی نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔" (رسالہ تلک ص۱۱)

صاحب روشن مستقبل صفحہ (۶۱) میں رومیش چندر دت کی کتاب ہندوستان کی اقتصادی تاریخ سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"کمپنی کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان کی صنعت کو برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ کھلے ہوئے احکام صادر کئے گئے کہ بنگال میں ریشم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ریشم کے کپڑے تیار کرنے کو روکا جائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ریشم بافوں کو جبریہ کمپنی کے کارخانوں میں ملازم رکھ لیا گیا۔ اور دوسرے کسی گاہک کی فرمائش پر کپڑا بُننے کی ممانعت کر دی گئی۔" (رومیش چندر دت ص۴۵)

اسی طرح جنوبی دکن کی چھینٹوں اور سوتی کپڑوں کی صنعت برباد کر دی گئی۔ جولاہوں کو زبردستی گھیر کر لایا جاتا۔ اُن پر سپاہی مسلط کر دئے جاتے تھے اور جب تک وہ یہ معاہدہ نہ کر لیتے کہ اور کسی کے لئے کپڑا نہ بُنیں گے انہیں نکلنے نہ دیا جاتا اگر وہ کمپنی کا کپڑا پہنچانے میں دیر کرتے تو سزا کے مستوجب ہوتے۔" (رومیش چندر دت صفحہ ۲۶۴ و ۲۴۵)

"ہندوستان کی ان صنعتوں کو تباہ کرنے کے لئے کمپنی اور برطانوی حکومت دونوں یکساں آرزومند تھے۔ اس کا اندازہ اُس شرح محصول سے کیا جا سکتا ہے جو برطانیہ کے ساحل پر ہندوستانی مال کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ ۱۸۱۳ء میں اکثر کپڑوں پر ۶۸، اور ۷۰، فی صدی لیا جاتا تھا۔"

(رومیش چندر دت ص۲۶۱)

صاحب معیشت الہند صفحہ (۲۹۶) میں لکھتا ہے۔

"سترہویں صدی میں انگریزی صناع اور دستکاروں پر جو وقت گزرا اس سے کہیں زیادہ مصیبت ہندوستانی صناعوں اور دستکاروں کے سر پر اٹھارویں صدی عیسوی میں آپڑی اُن کا روزگار بھی مارا گیا۔ اور کوئی پرسان حال بھی نہ تھا۔ اوّل تو خانہ جنگیوں کی بدولت ملک خود پامال دوسرے صنعت وحرفت کا گلا گھونٹا گیا۔ لوگوں پر مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ ہندوستانی تاریخ میں اٹھارہویں صدی بہت خوفناک اور بہت افسوسناک ہے۔ اچھے اچھے صنعتی شہر ویران ہوگئے صنعتیں برباد ہوگئیں۔ صناع تباہ ہوگئے۔ اور بحالت مجبوری زراعت عام لوگوں کا پیشہ بن گئی۔"

آگے چل کر صفحہ (۲۹۷) میں لکھتا ہے۔

"بہر حال اٹھارہویں صدی سے ہندوستان کی تجارت کا نقشہ بدل گیا چنانچہ کمپنی کے خطوط جو ولایت سے آتے تھے ان میں صاف ہدایات درج ہیں کہ جہاں تک ہوسکے سامان خام کی پیداوار بڑھانی چاہیئے اور مصنوعات روکنی چاہئیں۔ اور اس کام میں قانون سے مدد لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔ مثلاً بنگال کے ریشم بُننے والوں کو قانوناً ممنوع تھا کہ کمپنی کے کارخانہ کے سوا گھر پر کام کریں اور اس کی خلاف ورزی تعزیری جُرم تصور کی جاتی تھی۔ جس کی سخت سزا ملتی تھی۔ علاوہ بریں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر انگلستان میں کروڑگیری از حد بڑھادی گئی اور اس کے برعکس ولایتی مصنوعات کی درآمد پر ہندوستان میں کوئی کروڑگیری نہ تھی اور تھی تو برائے نام مقرر تھی۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں بھی تسلیم ہوگیا کہ بے شک ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایسا انتظام کردیا ہے کہ ہندوستان میں مصنوعات گھٹیں اور خام سامان بڑھے اور اگر یہ انتظام رہے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کا نقشہ بدل جائے گا۔ صنعتیں غائب ہوجائیں گی اور برطانیہ عظمیٰ کی صنعتوں کے واسطے وہاں صرف سامان خام پیدا ہونے

لگے گا۔ فہو المراد۔"

مذکورہ بالا شہادتوں اور اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی صنعت و حرفت مٹانے کے لئے نہایت وحشیانہ مظالم اور بربرانہ تعدیاں کی ہیں جن کی بناء پر صناعوں اور کاریگروں نے مجبور ہو کر صنعت و حرفت چھوڑ دی۔ ممکن ہے کہ ناظرین کو تعجب پیدا ہو کہ انگریزوں نے اپنی ہندوستانی رعایا پر اس قدر بے دردی اور جفا کاری کے مظاہرے کس طرح روا رکھے جو کہ بالکل خلاف انسانیت ہیں اور پھر اس زمانہ میں ہندوستانی حکومتوں اور غیرت مند رعایا نے ان مظالم کو کس طرح برداشت کیا اسی شبہ کے جواب میں صاحب علم المعیشت صفحہ (۵۸۹) میں لکھتا ہے۔

"تعجب ہوگا کہ آخر انگریزوں نے ایسی چیرہ دستی ہندوستانی صناعوں پر کیوں کی اور کس طرح کی۔ کاروباری لوگوں کی منفعت طلبی اور خود غرضی ضرب المثل ہے۔ انگریز اس وقت آج کل کی طرح تو حکمراں تھے نہیں گو بعض حصے اُن کے قبضہ میں آنے شروع ہو گئے تھے لیکن اب تک وہ اپنا خاص کام تجارت سمجھتے تھے نہ کہ حکومت پس ان کو تو اپنے نفع سے غرض تھی۔ رعایا کی آسائش اور بہبودی سے اُن کو کیا سروکار۔ رہی حکومت مغلیہ اُس میں ہاتھ پیر ہلانے تک کی سکت باقی نہ تھی اور وہ صرف برائے نام جاری تھی۔ پھر کون تھا جو غریب اطاعت شعار ہندوستانی صناعوں کو من چلے انگریزی تاجروں کی دست برد سے بچاتا خود وارن ہسٹنگز جو کمپنی کی طرف سے ہندوستان میں گورنر رہ چکا ہے اور جو سلطنت ہند کے بانیوں میں نمبر اوّل شمار ہوتا ہے کہتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے۔ جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرأت کر ہی نہیں سکتا ہندوستان میں اُن کے ارتکاب کے واسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اُس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا" اسی طرح پر ایک دوسرے صاحب ٹامس سڈ ہنسہم فرماتے ہیں کہ "میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں کہ بمقابلہ اور قوموں کے انگریز ممالک غیر میں سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش آرہا ہے" حاصل کلام یہ ہے کہ اس زمانہ میں انگریز اپنے

کو محض تاجر خیال کرتے تھے اور آزاد ملک کا باشندہ ہونے کی وجہ سے نڈر اور امن چلے تھے۔ صدیوں کی اطاعت و فرماں برداری کرتے کرتے ہندوستان کے لوگ پست ہمت اور ذلیل ہو چکے تھے۔ ملک میں کوئی ایسی حکومت قائم نہ تھی جو حقوق و انصاف کی نگہداشت کر سکتی۔ پس انگریزوں کا جو کچھ بھی طرزِ عمل تھا وہ کچھ عجیب نہ تھا۔

بربادی صنعت و تجارت کا دوسرا طریقہ

تجارت مامون[1] کے فلسفہ کی اشاعت

دوسرا طریقہ ہندوستان کی صنعت و حرفت کے برباد کرنے کا تجارت مامون کے فلسفہ کو پھیلا کر ہندوستانی مال کو انگلستان میں داخل ہونے سے روکنے کا ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔ ۱۶۰۰ء کی ابتداء میں انگریز ہندوستان میں مثل دیگر اہل یورپ، جرمنی، ہالینڈ، فرانس، ڈنمارک وغیرہ یہاں کی تجارت سے دولت کمانے کے لالچ میں آئے۔ کیوں کہ ایک صدی کی تجارت ہند سے پرتگیزوں نے اپنے ملک کو رشک جناں بنا لیا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان اپنی بے شمار دولت، اعلیٰ صنعت، ارزانی تجارت کی وجہ سے جنت نشان بنا ہوا تھا، یہاں کے بادشاہوں اور باشندوں نے اس ملک کو جنت نشان بنا دیا تھا۔ لوگوں کی زبان حال چلا چلا کر کہہ رہی تھی ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ٭ ہمین است و ہمین است و ہمین است

(دیکھو تصریحات پروفیسر مکس ملر، تھامس منرو، ابن بطوطہ وغیرہ)

---

[1] تجارت مامون یعنی دوسرے ملکوں کی ارزاں پیداوار کی درآمد بھاری ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ روک کر اپنے یہاں کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کرنا۔ اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں ارزاں پیدا نہ ہو سکے تو حکومت کی امداد سے اس کو ترقی دینا اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنا تاکہ کچھ عرصہ میں اپنے ملک کی پیداوار اسی قدر ارزاں ہو جائے۔ اور دوسرے ملکوں سے مال منگانے کی ضرورت نہ رہے۔

انگریزوں نے یہاں کی نفیس اور سستی چیزیں بالخصوص ریشمی، اُونی، سُوتی کپڑے انگلینڈ پہنچائے۔ وہاں کے باشندوں نے ایسی چیزیں کبھی دیکھی بھی نہ تھیں۔ وہ نہایت زیادہ پسند کی گئیں اور ہاتھوں ہاتھ بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہونے لگیں۔ اس سے انگریزوں کو تجارت میں نہایت زیادہ نفع ہُوا۔ اور دن دُگنے رات چوگنے دولت بڑھنے لگی۔ صاحب معیشت الہند صفحہ (۶۸۱) میں لکھتا ہے :-

"عہد قدیم سے لے کر قرون وسطیٰ تک جو اہل ہنود اور مسلمانوں کا دَور ہے اس میں زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان کی گوناگوں صنعتیں بہت اعلیٰ پیمانہ پر ترقی یافتہ نظر آتی ہیں۔ دُور دراز تک ممالک جاتی ہیں۔ اور بے نظیر شمار ہوتی ہیں۔ انہیں مصنوعات کی خاطر اہل یورپ بھی ہندوستانی تجارت کے شیدائی تھے اور اس راہ میں جان و مال لٹاتے تھے اس زمانہ میں ہندوستان کے سوتی، اُونی، ریشمی کپڑے اور قالین، موتی، جواہر اور زیورات، مرصع اور طلائی، اور نقرئی سامان، خوشبوئیں، رنگ اور مصالحے چوبینہ کا کام لوہے کا سامان، فولاد کے آلات اور ہتھیار، غرضکہ تمدن اور تمول کی اعلیٰ ضروریات دُور دُور کے ممالک یہاں سے منگاتے تھے۔ چونکہ اُن کے مصنوعات کو یہاں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ اور ہر قسم کا سامان خام یہاں بافراط پیدا ہوتا تھا۔ بالعموم برآمد کی قیمت بشکل نقرہ طلا وصول ہوتی تھی۔ جہاز سازی اور جہازرانی کے فن میں بھی ہندوستان نے اس درجہ ترقی کر لی تھی کہ اس کے بادبانی جہازوں میں دُور دُور تک مال آتا جاتا تھا ممکن ہے کہ ہندوستان کی معاشی درماندگی میں یہ باتیں عجیب سنائی دیں۔ لیکن یہ سب اُمور کچھ تخیلات اور قیاسات نہیں بلکہ واقعات ہیں اور توقع سے بڑھ کر تاریخی شہادتیں موجود ہیں جن کی تفصیلات کے واسطے جُداگانہ تصانیف درکار ہیں۔" اس لئے انگلینڈ کی مصنوعات ماند پڑ گئیں۔ اور انتہائی کس مپرسی میں مبتلا ہو گئیں۔ ہندوستان میں وہاں سے سونا اور چاندی بکثرت ان اشیاء کی قیمت میں کھنچ کر آنے لگا۔ وہاں کے صناعوں اور کاریگروں کا چاروں طرف سے شور و غوغا شروع

ہُوا کہ اگر اسی طرح ہندوستان کا مال ہمارے ملک میں آتا رہا تو ہمارے تمام کاریگر اور اُن کے بچے بھوکوں مر جائیں گے اور ملک کی دولت نکل کر باہر چلی جائے گی ملک برباد ہو جائے گا۔

صاحب معیشت الہند صفحہ (۶۹۱) میں لکھتا ہے۔

" ہندوستانی مصنوعات خاص کر کپڑے کو جب انگلستان میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور اُن کا رواج بڑھا تو وہاں ہر طرف بیکاری پھیل گئی اور سخت برہمی پیدا ہوئی۔ حتیٰ کہ سودیشی کی تحریک جس کا اب مضحکہ اُڑایا جاتا ہے بڑے زور شور سے انگلستان میں نمودار ہوئی۔ سرکار نے بھی اس کی پوری تائید کی نتیجہ یہ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ انگلستان بڑی بڑی صنعتوں کا مرکز بن گیا۔ اور ہندوستان میں زراعت کے سوا کچھ باقی نہ رہا ذیل میں ہمعصر بیانات اور تحریرات کے چند مستند اقتباسات درج ہیں جن سے اُس زمانے کے کاروباری حالات اور انقلابات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ سترہویں صدی کے آخری زمانہ میں صنعت وحرفت کی مختلف جماعتوں کی طرف سے پارلیمنٹ میں بے شمار محضر اور درخواستیں پیش ہوئیں ان میں سے چند بطور مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہوں۔

(۱) درخواست گذار۔ پھولدار، دھاریدار اور ریشمی کپڑا تیار کرتے ہیں اور اُون اور ریشم ملا کر بھی کپڑے بنتے ہیں اور یہی ذریعہ معاش ہے لیکن جب سے ہندوستان کا ریشمی اور سوتی کپڑا آیا اور اس کا رواج بڑھا یہاں کا کاروبار بالکل مارا گیا۔ اگر ہندوستانی کپڑا نہ روکا گیا تو یہ صنعت یہاں بالکل تباہ ہو جائے گی۔

(۲) اس نواح میں ریشمی اور اُونی ریشم ملا ہُوا کپڑا بُنا جاتا ہے، اور لوگوں کا یہی عام پیشہ ہے کچھ دنوں قبل تک خوب فراغت سے بسر ہو رہی تھی۔ لیکن چند روز سے کاروبار بہت گھٹ گیا اور لوگ بیکاری سے پریشان ہیں! استدعا یہ ہے کہ ہندوستانی کپڑے کی تجارت روک کر ملکی صنعت کو پناہ دیجائے۔

(۳) پارچہ بافی اور اس سے متعلق دوسری صنعتیں ہم لوگوں کا خاص پیشہ تھا اور

انہیں پر معاش کا مدار تھا۔ لیکن اب وہ سب صنعتیں غائب ہو رہی ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان سے ریشمی اور سوتی کپڑا آ رہا ہے نتیجہ یہ کہ جو لوگ پہلے دوسروں کی مدد کرتے تھے آج وہ خود بیکار اور محتاج ہیں لہذا عرضی گذاروں کی استدعا ہے کہ ہندوستانی کپڑا روکا جائے۔

(۴) عرضی گذار ایک بڑی جماعت ہیں اور قدیم سے ان کو قانونی طور پر خاص حقوق حاصل ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے حال میں ہندوستان سے بہت سی بانانی ٹوپیاں (ہیٹ) بنوا کر منگائی ہیں اگر اُن کی درآمد نہ روکی گئی تو یہ صنعت یہاں تباہ ہو جائے گی۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر قسم کی ارزانی ہے اور مال بہت سستا تیار ہوتا ہے۔

(۵) ہندوستانی لوگ ہماری ریشمی کپڑے کی صنعت پہلے ہی ہضم کر چکے ہیں پنکھوں کی صنعت بھی اُنہوں نے قبضہ میں کر لی ہے اور ہمارے چوبینہ کے کام کو بھی دبا لیا ہے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے وہ یہاں کی تمام صنعتوں کو برباد کر دیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دن میں ہندوستان پیرس کا جانشین بن کر ہم پر فیشن عائد کرے گا۔ ہم کو تو فرانس ہی کے وضعدار کپڑوں کا آنا سخت ناگوار تھا اب ہندوستان سے خوب وضعدار لباس تیار ہو کر بکثرت آ رہا ہے اور ہمارے درزیوں کا روزگار تباہ ہو رہا ہے۔

غرضکہ اس زمانہ کی بیشمار شکایتی درخواستیں اور محضر سرکاری محافظ خانوں اور کتبخانوں میں اب بھی موجود ہیں۔ لوگوں نے سودیشی کی تائید میں نظمیں لکھیں۔ رسالے شائع کئے چونکہ مستورات فطرتاً فیشن کی بہت زیادہ دلدادہ ہوتی ہیں وہی ہندوستانی کپڑوں کی سب سے زیادہ شائق تھیں۔ ایک دلچسپ رسالہ بھی اُن کو غیرت اور جوش دلانے کے واسطے شائع کیا گیا۔ اس میں تحریر ہے کہ یہ امر بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ بہت سے غریب صنّاع اور دستکار بے روزگار ہیں۔ معاش کو محتاج ہیں اور بھوکوں مر رہے ہیں۔ اُن کی ایک کثیر جماعت سخت افلاس اور مصیبت میں گرفتار ہے۔ خیراتی امداد دو چند بلکہ سہ چند ہو گئی ہے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی مصنوعات کی درآمد اور مقبولیت سے

انگلستان کی صنعتوں کو بہت زک پہنچی تھی۔ اور روک تھام نہ ہوتی تو وہاں کے صنّاع اور دست کار تباہ ہو جاتے۔ حامیان سودیشی کی طرف سے جو معروضات پارلیمنٹ میں پیش ہوتے ان میں سے ایک میں لکھتے ہیں۔

"ذرا انگریزی قوم کی حالت پر تو نظر ڈالئے اور خاص کر ان لوگوں کی حالت قابل ملاحظہ ہے جن کی صنعتیں ہندوستان کے مقابل ہیں۔ اتنی انگریزی صنعتیں جو سراسر تباہ ہو گئیں۔ اس نقصان پر غور فرمائیے غریب لوگ جوان مقامات میں روزگار اور روزی کے واسطے فریاد کر رہے ہیں اس پر توجہ فرمائیے۔ بالآخر یہی تحقیق ہو گا کہ ہندوستانی تجارت ان تمام مصائب کی اصلی باعث ہے۔"

انگریزی صنعتوں کی تباہی کے علاوہ ایک بڑا اعتراض اور بڑا غم یہ بھی تھا کہ ہندوستانی مال کے معاوضہ میں زیادہ تر انگلستان سے چاندی سونا ہندوستان بھیجا جاتا تھا اس بارہ میں بھی بہت سخت بحث چلتی رہی جس کا مختصر ذکر جا بجا اوپر بھی آ چکا ہے۔ چنانچہ ایک معزز مخالف لکھتے ہیں۔ کہ یہ تجارت تا حدِ امکان بدترین قسم کی تجارت ہے چاندی سونا جو ہم کو کسی طرح علیحدہ نہ کرنا چاہیئے ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور اس کے معاوضہ میں ہمارے یہاں مصنوعات اور کھیل کھلونے آ رہے ہیں۔ جن کی ہم کو کچھ بھی ضرورت نہیں ہے۔"

جب اس درجے نوبت پہنچ گئی تو لامحالہ پارلیمنٹ میں بھی یہ بحث چھڑی۔ وہاں بھی تقریروں کا وہی رنگ نظر آتا ہے۔ کرنل برچ اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان کی جس چیز نے ہم کو سب سے زیادہ تباہ کیا وہ کالیکو یعنی سوتی کپڑا ہے کہ اُس نے ہمارے اُونی کپڑے کو بالکل نکما کر دیا۔ افسوس ہے ہندو تو دولت لوٹ رہے ہیں اور عیسائی تباہ ہو رہے ہیں۔"

ایک اور صاحب فرماتے ہیں:۔

"انگلستان کے پارچہ بافوں کو ہندوستانی پارچہ بافوں سے مقابلہ کرنا محال ہے اس لئے کہ اوّل تو ہندوستان میں مال بہت ارزاں ہے۔ دوسرے وہاں کے پارچہ باف ایک آنہ روزپر گذر کر سکتے ہیں۔ اگر یہی بیل و نہار رہیں

تو یہ خیال کرتے ہوئے دل دھڑکتا ہے کہ آخر اس تجارت کا کیا انجام ہوگا یقیناً ہندوستان کے لوگ مالا مال ہو جائیں گے اور ہم افلاس میں گرفتار ہوں گے۔"

ایک اور صاحب اصرار کرتے ہیں کہ:-

"ہندوستانی تجارت کی روک تھام ضروری ہے کیونکہ نہ صرف پارچہ بافی بلکہ انگلستان کی بہت سی صنعتیں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد سے معرض خطر میں پڑ گئی ہیں۔ ہندوستانی مصنوعات نہ صرف انگلستان میں انگریزی مصنوعات کی جگہ استعمال ہوتی ہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی جہاں جہاں ہماری مصنوعات جاتی تھیں وہ ان کی جانشین بن گئی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کچھ بندوبست نہ کیا گیا تو ہماری صنعتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انگریزی مصنوعات کو نہ کوئی گھر ہاتھ لگائے گا نہ باہر۔"

علیٰ ہذا مسٹر بالکسفن نے بھی اپنی تقریر میں اس پہلو پر زور دیا اور فرمایا کہ:-

"ہندوستان سے جو کپڑا آتا ہے وہ نہ صرف ہمارے یہاں اُونی کپڑے کے بجائے استعمال ہوتا ہے بلکہ وہ دیگر ممالک میں پہنچ کر وہاں بھی ہمارے اُونی کپڑے کی مزاحمت کرتا ہے اور اُن ممالک کے کپڑے کو بھی ہمارے یہاں آنے سے روکتا ہے جو ہم پہلے اپنی مصنوعات کے معاوضہ میں منگایا کرتے تھے۔ غرضکہ ہندوستانی کپڑے نے ہمارے اُونی کپڑے کا کام تمام کر دیا۔ اور اپنے مقابل دیگر ممالک کے کپڑے کی درآمد بھی انگلستان میں روک دی۔"

مسٹر شیلڈن نے پارلیمنٹ میں اپنا یہ بیان دیا کہ:-

"پہلے انگلستان میں جو کپڑا ریشمی فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا وہ بالکل بند ہو گیا اس لئے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا اس سے نصف قیمت پر آتا ہے اور اس سے بہتر ہوتا ہے۔"

حاصل کلام یہ کہ ہندوستانی مصنوعات اور خاص کر پارچہ جات کی خوبی اور ارزانی نے اکثر ممالک یورپ اور خاص کر انگلستان کے بازار پر پورا قبضہ کر لیا اور مقابلہ کی تاب نہ لا کر مقامی صنعتیں دم توڑنے لگیں تو جان بچانے کی خاطر

سودیشی کی تحریک پھیلائی گئی۔ اور ہندوستانی مصنوعات کی درآمد روکنی پڑی چنانچہ عام حالات اور خیالات کو پیشِ نظر رکھ کر مجلس تجارت و آبادیات کے کمشنروں نے پارلیمنٹ سے یہ سفارش کی کہ ہندوستانی تجارت سے جو بے چینی پھیل رہی ہے اُس کو رفع کرنے کے لئے مناسب ہے کہ ہندوستانی کپڑے اور مصنوعات کی درآمد اور اُن کا استعمال اپنی سلطنت اور آبادیات میں روکا جائے چنانچہ اسی اصول پر قانون بننا تجویز ہوا۔

جوش کی کیفیت یہ تھی کہ قانون پیش ہونے میں کچھ تعویق نظر آئی تو پارچہ بافوں نے ایک روز ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفاتر پر حملہ بول دیا اور قریب تھا کہ غصّہ میں اُس کا سارا خزانہ لُوٹ لیں۔

اس شُبہ پر کہ شاید یہ قانون نامنظور ہو جائے پارچہ بافوں کی بیویوں نے پارلیمنٹ کی عمارت پر ہلّہ کیا تاکہ اگر کچھ لوگ قانون کی مخالفت کریں تو اُن کی وہ اچھی طرح مرمّت کریں غرضکہ ۱۷۰۰ء میں قانون پاس ہو ہی گیا جس کی رُو سے ہندوستانی کپڑے کی درآمد اور اس کا استعمال ممنوع قرار پایا اور پارچہ بافوں کی محنت ٹھکانے لگی۔ اس کے بعد ہندوستان کی دیگر مصنوعات پر بھی محصول کروڑ گیری اس درجہ بڑھا دیا گیا کہ اُن کی درآمد بہت دشوار ہو گئی۔"

ظاہر ہے کہ ایسے قوانین سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سخت خطرہ اپنی اس تجارت اور نفع اندوزی میں پیش آیا جس کی وجہ سے دولت کے دریا اُس کے ممبروں کے گھروں میں بہتے تھے۔ اس لئے اُس نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا کہ کوئی ایسا قانون نہ بننے پائے۔ اس کے ممبروں اور طرفداروں نے آزاد تجارت کے متعلق نہایت زور دار تقریریں کیں اور فلسفی طریقہ پر آزاد تجارت کے وہ اصول اور فوائد دکھلائے جن پر انسانی زندگی کی ترقی کا مدار ہے جو بین الاقوامی انصاف اور عدالت کے لئے مرکز بننے کے مستحق ہو سکتے تھے مگر ایک بھی نہ چلے۔ مخالف فریق نے بالمقابل مامون تجارت کی شدید ضرورت پر دھواں دھار تقریریں کیں۔ تصانیف اور مضامین کے دروازے کھل گئے۔ مامون تجارت کی بھلائی میں بیانات اور پمفلٹ شائع کئے گئے اور پریس میں

زوردار پروپیگنڈوں کے ذریعہ سے عوام کو ہم خیال بنایا۔ ہوٹلوں، تفریح گاہوں، جلسوں وغیرہ میں یہی چرچا پھیلایا گیا۔ کوئی آزاد تجارت پر تقریر کرتا تھا تو کوئی ماموں تجارت پر زوردار لکچر دیتا تھا۔ مگر آزاد تجارت کے حامی اگر دو چار ہوتے تھے تو ماموں تجارت کے سینکڑوں شیدائی اس کے مقابلہ میں آجاتے تھے۔ کوئی انگلستانی صنّاعوں کی بربادی کا فوٹو کھینچتا تھا کوئی ہندوستانی کاریگروں کی لوٹ کا داستان گو بن جاتا تھا کوئی انگریزی خزانوں کے باہر نکل جانے کا رونا روتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ماموں تجارت کا تفوق اور آزاد تجارت کا ملک کے لئے سمِّ قاتل اور زہرِ ہلاہل ہونا بہت بڑے پیمانہ پر پھیلایا گیا اور چونکہ قوت اور اقتدار ماموں تجارت والوں کے ہاتھ میں تھا اس لئے آزاد تجارت کے قائلین کو شکست کھانی پڑی۔

صاحب معاشیاتِ ہند لکھتا ہے۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے طرف داروں نے بہت کچھ آزاد تجارت کے فوائد سمجھائے لیکن ان کی کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ البتہ آزاد تجارت اور تابین تجارت کے آئندہ علمی مباحث کے واسطے اچھا خاکہ تیار ہو گیا۔ یہ بھی اچھا لطیفہ رہا کہ اوّل تو خود کمپنی نے بامید اعانت سرکار کو اپنے معاملات میں ہاتھ بٹانے کی دعوت دی لیکن بعد کو وہ خود ہی سرکاری مداخلت سے تنگ آنے لگی۔ سرکار کو اوّل مروّتاً اور پھر ضرورتاً کاروباری معاملات میں دخل دینا پڑا ان ہی حالات کی بدولت تجارت کے اصول بنے اور تجارت کا مسلک رائج ہوا۔ صنعت اور تجارت کے علمی مباحث کی بنیاد پڑی۔"[۱۹۵]

الحاصل مدعیانِ خدمت انسانی اور دعویداران تمدّن و تہذیب نے ماموں تجارت کی آڑ میں ایسے ایسے جابرانہ اور ظالمانہ قوانین ہندوستانی تجارت اور مصنوعات کو روکنے کے لئے بنائے کہ دنیاء تجارت نے نہ کبھی دیکھے نہ سُنے تھے۔ ہندوستانی مصنوعات پر حکومت کی طرف سے نہایت ہی بوجھل محصول لگائے گئے۔ حالانکہ ہندوستان برطانوی مقبوضات اور نوآبادیات برطانیہ میں سے قرار پاچکا تھا۔ ایسے ٹیکس کی بناء پر ضروری اور لازم تھا کہ ہندوستانی مال انگلستان سے یک قلم بند ہو جاتا اور ہندوستانی کاریگروں کی زندگی موت کے گھاٹ اُتر جاتی چنانچہ مسٹر مانٹ گومری مارٹن مؤلف تاریخ نوآبادی

ہائے برطانیہ لکھتا ہے۔

"ہم نے ربع صدی کے دوران میں ہندوستانی علاقوں کے علاقوں کو اپنی مصنوعات کے خریدنے پر مجبور کیا اس طریقہ پر کہ ہمارے اُونی مال پر ہندوستان میں کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ سوتی مال پر ۳½ فیصدی محصول تھا۔ اور اسی نسبت سے دیگر اشیاء پر محصول لگایا گیا تھا۔ درانحالیکہ اسی زمانہ میں ہندوستان کے بنے ہوئے مال پر ہم انگلستان میں ایسے سخت محصول لگاتے رہے کہ ہندوستانی مال کی درآمد بند ہو جائے۔

بالفاظ دیگر اس محصول کی مختلف شرح ۱۰۔۔۲۰۔۔۳۰۔۔۵۰۔۔۱۰۰۔۔۵۰۰ اور ۱۰۰۰ فی صدی تک ان اشیاء پر لگائی گئی تھیں جو ہمارے ہندوستانی مقبوضات کی بنی ہوئی ہوں اس لئے ہندوستان کے ساتھ آزاد تجارت کی جو چیخ پکار ہو رہی تھی وہ دراصل انگلستان کے مال کی آزاد تجارت تھی۔ نہ کہ ہندوستان کے اُس مال کی جو انگلستان بھیجا جائے۔ سورت۔ ڈھاکہ۔ مرشدآباد و دیگر مقامات کی جہاں دیسی صنعتیں عروج پر تھیں بربادی کی داستان کا بیان کرنا حد درجہ دل خراش ہے۔ میری رائے میں یہ بربادی ایمانداری کے ساتھ تجارت کو ترقی دینے کی وجہ پر مبنی نہ تھی بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایک زبردست طاقت تھی جس کے ذریعہ سے کمزور کو دبایا جا رہا تھا۔"

(حکومت خود اختیاری صد ۲۳ از دت جلد دوم صد ۱۱۲)

ہنری سنٹ جارج ٹکر (جنہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ہندوستان میں بسر کیا تھا اور جو بعد واپسی انگلستان میں کمپنی کے ڈائرکٹروں میں داخل کر لئے گئے تھے ۱۸۲۳ء میں مختصراً یوں بیان فرماتے ہیں:۔

"ہم نے ہندوستان کے ساتھ کیسے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اُس کے ریشمی کپڑے اور نیز وہ کپڑے جو سوت اور ریشم سے مل کر بنے جاتے ہیں کچھ روز سے ہمارے بازاروں سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔ اور حال میں کچھ تو [illegible] فیصدی محصول درآمد کی بدولت [illegible] کلوں کی ایجاد کی بدولت سوتی کپڑے جو کہ ہندوستان میں بکثرت تیار ہوتے تھے نہ صرف اس ملک

میں آنے بند ہو گئے بلکہ ہم اُلٹے انگلستان سے سُوتی کپڑے اپنے ایشیائی مقبوضات میں بھیجنے لگے ہیں۔ اور اس طرح پر ہندوستان تجارتی ملک سے تنزل کر کے اب محض زراعتی ملک رہ گیا۔" (علم المعیشت صفحہ ۵۹۰)

نقشہ ذیل ملاحظہ ہو جو کہ ہندوستانی مال پر محصولات کی بھاری مقدار اور اس کی بندش پر روشنی ڈالتا ہے:۔

ہندوستانی مصنوعات	فیصدی محصول		
	سنہ ۱۸۱۲ء	سنہ ۱۸۲۴ء	سنہ ۱۸۳۲ء
ریشمی کپڑے	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	۲۰ فیصدی
زربفت	"	"	۳۰ "
شالی چادر	۷۱ فی صدی	۶۷½ فیصدی	۳۰ "
چھینٹ	۷۱⅔ "	۶۷½ "	۱۰ "
قالین	۶۸¼ "	۵۰ "	۲۰ "
بنت کا آرائشی سامان	۷۱ "	۵۰ "	۳۰ "
سوتی کپڑا	۲۷½ "	۵۰ "	۲۸ "

(علم المعیشت صفحہ ۵۹۲)

(نوٹ) سنہ ۱۸۳۲ء میں جو محصولوں کی تخفیف نظر آ رہی ہے وہ کسی انسانی ہمدردی یا انصاف و عدل گستری کی بناء پر نہیں ہے بلکہ اس بناء پر ہے کہ پہلے سالوں کے ظالمانہ اور وحشیانہ ٹیکسوں اور قطعی ممانعت وغیرہ کی کارروائیوں سے ہندوستانی مال انگلستان سے بالکل خارج ہو چکا تھا اور اس کا وہاں آنا بھی بند ہو چکا تھا نیز اُس کے کاریگر اور اُن کی صنعتیں تقریباً دم توڑ رہی تھیں۔ اس لئے اُس وقت اتنے بڑے محصولوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ اِدھر انگلستان کی صنعت اور تجارت اتنی قوت پکڑ چکی تھی کہ وہ ہندوستانی صنعت کا مقابلہ بخوبی کر سکتی تھی۔ اس وقت میں بڑی بڑی کلیں اور دخانی کارخانے بھی قائم ہو چکے تھے اس لئے اب وہ خطرہ اپنے ملک کی بیکاری وغیرہ کا اُٹھ گیا تھا۔ کیونکہ اُن کلوں کا مال اب بہ نسبت سابق ارزاں ہونے لگا تھا

تاہم یہ محصول بھی اُن محصولوں سے جو کہ انگلستانی مال پر ہندوستان میں لگایا گیا تھا اور جابرانہ طریقہ پر اخیر تک باقی رکھا گیا۔ نہایت ہی زیادہ ہے۔ انگریزی مال پر محصول ۳½ فیصدی اور ۲½ فی صدی تک ہی رکھا گیا تھا اور جب کبھی اس سے زائد کی تجویز ہوئی تو انگلستان میں ہائی ویلا مچ گئی۔ کاغذات انڈیا آفس میں ہے۔

"۱۷۸۵ء میں ناٹنگھم کارخانہ ولایت میں کھولا گیا ڈھاکہ کی ململ کی نقل پر پانچ لاکھ تھان موٹے اور کھردرے دو سال بعد تیار کئے گئے۔ ولایت میں شور مچایا گیا کہ ڈھاکہ کے کاریگروں سے ولایتی کاریگروں کی حفاظت چاہیئے۔ چنانچہ گورنمنٹ انگلستان نے ہندوستان سے آنے والے سوتی مال پر کچھ فی صدی محصول لگا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۸۷ء میں ڈھاکہ سے انگلستان میں تیس لاکھ روپے کی ململ گئی تھی۔ محصول لگا دینے کے بعد ۱۸۰۷ء میں ۸½ لاکھ روپیہ کی گئی اور ۱۸۱۳ء میں ۳½ لاکھ روپیہ کی اور ۱۸۱۷ء میں اُس کا جانا بالکل بند ہو گیا۔"

(اخبار پرتاپ لاہور مورخہ ۱۴/اگست ۱۹۲۱ء)

سر جان اسٹوارٹ مل اپنی کتاب سلطنت برطانیہ کی تاریخ میں لکھتا ہے۔

"۱۸۱۳ء تک ہندوستان کا سوتی اور ریشمی مال انگلینڈ میں وہاں کے مال کی بہ نسبت ۵۰-۶۰ فی صدی کم قیمت پر بکتا تھا اس لئے انگلینڈ کے مال کی حفاظت کے لئے ولایت میں آنے والے مال پر قیمت کے حساب سے ۷۰-۸۰ فیصدی محصول لگایا گیا اور اُس کا آنا بالکل بند کر دیا گیا۔ البتہ نہ کیا جاتا تو پیزلی اور مانچسٹر کے لئے شروع کئے گئے کپڑے کے کارخانے ہندوستانی مال کے مقابلہ بھاپ کے زور سے بھی نہیں چلائے جا سکتے تھے۔"

مگر افسوس کہ اس پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا کہ بھاری بھاری محصولات لگائے جائیں بلکہ قانونی طریقہ پر ہندوستانی مال کی قطعی ممانعت بھی قانوناً پاس کی گئی اور اس کا لانا اور اس کا فروخت کرنا اُس کا خریدنا بھی جرم قرار دیا گیا اور خلاف کرنے والوں پر مالی اور بدنی سزائیں جاری کی گئیں۔ چنانچہ لیوزپل آرٹ مینوفیکچر آف گریٹ برٹن (کتاب) میں ہے۔

"صوبہ ملابار کی چھینٹ کو ولایت میں روکنے کے لئے انگریز جولاہوں کی

استدعاء پر پارلیمنٹ نے اُس چھینٹ پر ڈیڑھ آنہ فی گز ٹیکس لگایا۔ دو سال بعد وہ ٹیکس ۳/ فی گز کر دیا گیا اور سنہ ۱۸۲۰ء میں قانون بنا دیا کہ جو لوگ ولایت میں ہندوستانی چھینٹ فروخت کریں گے اُن پر دو سو روپیہ جُرمانہ اور جو خریدیں گے اُن پر پچاس روپیہ جُرمانہ ہوگا۔ ہندوستان کے ریشمی کپڑے اور چھینٹوں کو روکنے کے لئے سنہ ۱۸۰۰ء میں قانون پاس کیا گیا کہ بنگال چین، فارس، یا ایسٹ انڈیا میں بنا ہوا ریشم اور وہاں پر رنگی ہوئی اور چھپی ہوئی چھینٹ وغیرہ سنہ ۱۸۰۱ء کے بعد ولایت میں نہ منگائی جائے اور نہ پہنی جائے۔ اس تاریخ کے بعد جو مال منگایا جائے گا وہ گوداموں میں بند کر دیا جائے گا۔ اور پھر غیر ممالک میں بھیج دیا جائے گا۔"

سنہ ۱۸۲۱ء میں محصولات کو بڑھاتے بڑھاتے مندرجہ ذیل مقدار پر کر دیا گیا۔ کپاس کا کپڑا فی صدی ۸۱ روپیہ کپاس فی من ۱۵ روپیہ چھینٹ فی صدی ۸۱ روپیہ تنزیب فی صدی ۳۲ روپیہ چٹائی فی صدی ۸۴ بجرے کے اُون کی اشیاء ۱۲ صاحبِ علم المعیشت سنہ ۱۸۳۰-۳۲ء کی منتخبہ کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ کمپنی کی تدابیر کارگر ہو چکی تھیں۔ پارچہ بافی کی صنعت کو گھن لگنا شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے سوتی کپڑے کی درآمد انگلستان میں بہت گھٹ گئی۔ ریشمی کپڑا ہندوستان میں بننا کم ہو گیا۔ حتیٰ کہ اُلٹی انگلستان سے اس کی درآمد جاری ہو گئی۔ چنانچہ مذکورہ بالا تحقیقات سے واقعات ذیل کا پتہ چلتا ہے۔

کلکتہ میں انگریزی مصنوعات کی درآمد پر ۲½ فی صدی محصول لیا جاتا تھا۔ بمقابلہ اس کے ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر لندن میں محصول بشرح ذیل وصول کیا جاتا تھا۔

ہندوستانی مصنوعات	قیمت فی صدی		
	۱۸۱۲ء	۱۸۲۴ء	۱۸۳۲ء
ریشمی کپڑے	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	۲۰ فیصدی
زربفت	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	۳۰ 〃
شالی چادر	۷۱ فی صدی	۶۷½ فیصدی	۳۰ 〃
چھینٹ	۷۱ ۲/۳ فیصدی	۶۷½ فیصدی	۱۰ 〃
قالین	۶۸½ فیصدی	۵۰ فی صدی	۲۰ 〃
بینت کا آرائشی سامان	۷۱ فی صدی	۵۰ فی صدی	۳۰ 〃
سوتی کپڑا	۲۷½ فیصدی	۵۰ فی صدی	۲۰ 〃

مگر ریشم خام کی حالت بالکل برعکس تھی ۱۸۱۲ء میں اُس کی درآمد پر محصول ۴ فی صدی قیمت و ۳ روپیہ فی پونڈ کی مجموعی شرح سے وصول کیا جاتا تھا ۱۸۲۱ء میں وہ صرف ۲ روپیہ فی پونڈ ہوگیا اور انگریزی مصنوعات کو مزید ترقی دینے کی خاطر ۱۸۳۲ء میں محصول درآمد برائے نام ایک آنہ فی پونڈ رہ گیا۔" (علم المعیشت ص ۵۹۳)

مصنّف کتاب حکومت خود اختیاری صفحہ ۸۶ پر لکھتا ہے۔

"ان واقعات سے عیاں ہے کہ انگلستان میں پہلے نہ صنعت تھی اور نہ مشینیں تھیں اور نہ کاریگر ہوشیار تھے۔ جب ہندوستان سے مال غنیمت افراط سے گیا تب مشینیں تیار کی گئیں اور کارخانے کھڑے کئے گئے مگر لطف یہ ہے کہ بے شمار سرمایہ اور عظیم الشان کارخانوں کے باوجود بھی ہندوستان کا مال انگلستان جا کر سستا بکتا رہا اور انگلستان کے تیار کردہ مال کو شکست دیتا رہا۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ برطانیہ مجبور ہوئی کہ ہندوستان کے مال کو روکنے کے لئے انگلستان میں سخت سے سخت محصول لگائے جیسا کہ حسب ذیل تحریر سے ظاہر ہوگا۔ ایچ۔ ایچ ولسن لکھتا ہے کہ "ایک شہادت کے دوران میں ۱۸۱۳ء میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ "ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے اُس وقت تک برطانیہ کے بازاروں میں

ولایتی کپڑے سے ارزاں بکتے تھے ہندوستانی مال کی قیمت ولایتی مال سے پچاس سے لے کر ساٹھ فی صدی تک کم ہوتی تھی مگر اس پر بھی ہندوستانی کپڑے کی تجارت میں فائدہ رہتا تھا۔ چنانچہ ضرورت ہوئی کہ انگریزی صنعت کو برباد ہونے سے بچایا جائے اور ہندوستانی کپڑے کی قیمت پر جبکہ وہ انگلستان میں داخل ہو ستّر اور اسّی فی صدی محصول لگا دیا جائے یا اُس کی درآمد قطعی بند کر دی جائے۔ یہ ہمت شکن محصول نہ لگتے اور سخت قانون نہ بنتے تو پیزلی اور مانچسٹر کے پتلی گھر شروع ہی میں بند ہو جاتے اور پھر دخانی انجنوں کی قوت سے بھی نہ چل سکتے۔ مگر ہندوستانی صنعت کو بھینٹ چڑھا کر انہیں زندہ رکھا گیا اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو اس کا جواب دیتا اور برطانوی مال پر ایسے محصول لگاتا کہ پھر وہ مال نہ آ سکتا اور اس طرح اُس کی صنعت تباہی سے بچ جاتی۔ لیکن اس کو اپنے تحفّظ کی اجازت نہ دی گئی ۔ وہ اغیار کے سامنے بے بس تھا۔ بغیر کسی محصول کے برطانوی مال اس کی بندرگاہوں پر زبردستی اُتار دیا گیا۔ اور آخر کار جس حریف سے برابر کا مقابلہ کرنے کی مجال نہ تھی اُس کو برطانوی کارخانہ داروں نے ایک نامنصف حکومت کے ہاتھ سے حلال کرا دیا۔"

(دت صفحہ ۲۶۲-۲۶۳)

صاحب معیشت الہند صٹ میں لکھتا ہے :-

"اس سے قبل جا بجا ذکر آ چکا ہے کہ ہندوستان کا سوتی کپڑا قدیم زمانہ سے بہت مشہور اور بہت مقبول تھا اور دُور دراز ممالک تک اس کی برآمد جاری تھی۔ قدیم تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عیسٰے علیہ السّلام سے دو تین ہزار سال قبل بھی یہی کیفیت تھی کہ ہندوستان کا کپڑا بابل و مصر اور بعد کو یونان و روم تک جاتا تھا۔ چنانچہ سرکار ہند اپنے گز۔ بیٹر جلد سوم میں رقمطراز ہے کہ ڈھاکہ کی ململ یونان میں مشہور تھی اور آج سے دو ہزار سال قبل بھی سوتی پارچہ بافی کی صنعت ہندوستان میں خوب درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ قرون وسطیٰ میں اس صنعت کو اور بھی ترقی ہوئی اور اس کی تجارت

انگلستان بلکہ تمام یورپ پر جس طرح چھا گئی اس کی مختصر کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ جب انگلستان کا اُونی اور ریشمی کپڑا بھی ہندوستانی سوتی کپڑے کے سامنے گرد ہو گیا اور انگلستان کے پارچہ باف ہندوستانی پارچہ بافوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور عاجز ہو گئے تو سترہویں صدی کے ختم پر قانون کے زور سے ہندوستانی سُوتی کپڑا انگلستان میں روک گیا۔ حتیٰ کہ اس کی خرید و فروخت اور اس کا استعمال جُرم قرار دیا گیا۔ یہ کیفیت اُوپر درج ہو چکی ہے۔ چنانچہ پروفیسر لیکی اپنی مشہور تاریخ انگلستان میں لکھتے ہیں کہ سترہویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے سستے اور خوش وضع سوتی کپڑے جو کالیکو کہلاتے تھے خاص کر ململیں اور چھینٹیں بمقدار کثیر انگلستان میں درآمد ہوتی تھیں اور ان کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اُونی اور ریشمی پارچہ بافی کی صنعتیں بیکار ہو گئیں۔ بنا برآں پارلیمنٹ نے ۱۷۰۰ء اور ۱۷۲۱ء میں ایسے قانون نافذ کر دیئے جن کی رُو سے ہندوستان کے رنگین اور پھولدار اور سُوتی کپڑے یا اسی قسم کے دوسرے کپڑے جن میں اُن کا کوئی جزو شامل ہو انگلستان میں ان کا استعمال خواہ لباس خواہ آرائشی سامان میں قطعاً ممنوع قرار دیا گیا۔ علیٰ ہذا مستند تواریخ سے واضح ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں سوتی کپڑے کی صنعت شروع کی گئی چنانچہ سرکار ہند نے بھی اپنے گزیٹیر جلد سوم میں تسلیم کیا ہے کہ سُوتی پارچہ بافی کی صنعت انگلستان میں صرف سترہویں صدی سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد اٹھارہویں صدی میں کلیں ایجاد ہوئیں۔ دخانی انجن تیار ہوئے۔ کارخانے قائم ہوئے۔ صنعتی ترقی کا دور شروع ہوُا اور ساتھ ہی ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں ایسا بندوبست کر دیا کہ یہاں سے صرف سامان خام انگلستان کو برآمد ہوا جو وہاں کی صنعتوں میں کام آئے اور وہاں کے مصنوعات یہاں درآمد ہو کر خوب کثرت سے فروخت ہوں۔ چنانچہ صنعت پارچہ بافی کا بھی یہی حشر ہوا کہ ہندوستان میں اس کا خاتمہ ہو گیا صرف روئی برآمد ہونے لگی حتیٰ کہ مدّت سے تمام ملک ولایتی کپڑے میں لپٹا نظر آتا ہے۔" ص ۲۰۰

یہی نہیں ہوا کہ ہندوستان کی مصنوعات انگلستان بکثرت جاتی تھیں اوران کو بھاری بھاری ٹیکسز اور قانونی ممانعتوں کے ذریعہ سے روکا گیا۔ بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے بازاروں میں بھی یہ مصنوعات بڑی بڑی مقدار میں چھاپہ مارتی تھیں وہاں بھی انگریزوں کی دیکھا دیکھی اسی طرز عمل کو اختیار کیا گیا اور ماموں تجارت کے حیلہ سے رکاوٹیں پیدا کرکے ہندوستانی مصنوعات کا داخلہ آہستہ آہستہ بند کر دیا گیا باوجودیکہ ۱۷۶۹ء سے ہندوستانی دستکاروں پر تشددات جاری کر دیئے گئے تھے اور جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں اُن کو دستکاری چھوڑ دینے اور صرف خام مال تیار کرنے پر مجبور کیا جانے لگا تھا۔ مگر تاہم ۱۸۳۰ء تک ہندوستانی مصنوعات دوسرے ممالک میں بھی بڑی بڑی مقدار میں تجارت کے لئے جاری رہتی تھیں جن کو اسی طرح کم کیا گیا۔

انگلستان میں ۱۸۰۳ء میں ۱۴۸۱۷ ہزار گٹھے کپڑوں کے گئے مگر۔۔۔۔۔ کم ہوتے ہوتے ۱۸۲۹ء میں کل ۴۳۳ گٹھے گئے۔

امریکہ میں ۱۸۰۱ء میں ۱۳۶۳۳ ہزار گٹھے گئے اور پھر کم ہوتے ہوتے ۱۸۲۹ء میں ۲۵۸ گئے۔

ڈنمارک میں ۱۸۰۰ء میں ۱۵۷ ہم گٹھے گئے مگر کم ہوتے ہوتے ۱۸۲۰ء میں ۱۵۰ ہو گئے۔

پرتگال میں ۱۷۹۹ء میں ۹۷۱۴ ہزار گٹھے گئے مگر ۱۸۲۵ء میں ۱۰۰۰ گئے

عرب و فارس ۱۸۱۰ء میں ۶۰۰۰ ہزار گٹھے گئے مگر ۱۸۲۵ء میں ۲۰۰۰ گئے۔

(دیکھو علم المعیشت ص۵۹۳)

ان دوسرے ممالک میں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد کی کمی بڑھنے کے اسباب میں جس طرح ماموں تجارت کا ڈھونگ تھا اسی طرح ہندوستان میں مصنوعات کی کمی کی اور انگلستان کی مصنوعات کا کثرت سے داخلہ بھی تھا۔ ہندوستان کے مصنوعات کی کمی کی دل ہلا دینے والی داستان ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ جس سے دستکاروں کو کاروبار سے معطل بلکہ مفلوج بنا دیا اور اُن کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ دستکاری بالکل چھوڑ بیٹھیں یا ملک عدم کو سدھاریں۔

(صاحب علم المعیشت لکھتا ہے۔ ص۵۹۳

"دوسرے ملک بھی ہندوستانی مصنوعات خصوصاً کپڑا بکثرت خریدتے تھے لیکن

انگلستان کی طرح اُنہوں نے بھی اپنی اپنی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی خاطر بھاری بھاری محصول قائم کر کے درآمد روک دی یا اگر کچھ عرصہ کہیں درآمد جاری بھی رہی تو انگریزی تجارت نے اپنی مصنوعات کو وہاں بھرنا شروع کر دیا۔

ہندوستان کی دستکاری اور تجارت کے

برباد کرنے کا تیسرا طریقہ فری ٹریڈ (آزاد تجارت)

ہندوستان میں انگلستان کی مصنوعات کو جو کہ مشینوں اور کلوں کے ذریعہ سے تیار کی گئی تھیں نہایت کثرت سے ٹھونسا گیا اور ان کی درآمد پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا اور اگر لگایا بھی گیا تو اس قدر کم لگایا گیا کہ اُس سے دستکاروں کے ہاتھ سے بنائی ہوئی مصنوعات ارزاں نہیں ہو سکتی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں دستکار بھوک اور مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے ملک عدم کو چل بسے اور لاکھوں بلکہ کروڑوں دستکار صناعی چھوڑ کر زراعت یا دوسرے پیشوں پر مجبور ہو گئے اور ملک بجبر یہ صنعتی اور زراعتی ملک محض زراعتی بنا دیا گیا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ابتداء میں جبکہ ہندوستانی مصنوعات ہندوستان سے بکثرت انگلستان میں جانے لگیں تو وہ اپنی نفاست اور خوش نمائی اور مضبوطی اور ارزانی (سستے پن) کی وجہ سے عام پبلک میں اس قدر مقبول ہوئیں کہ لوگوں نے عموماً وہاں کی بھدی اور مہنگی مصنوعات کو خریدنا چھوڑ دیا اور ہندوستانی مصنوعات نے انگلستان کی تمام منڈیوں پر قبضہ کر لیا خصوصاً سوتی اور ریشمی کپڑوں نے تو اس قدر قبولیت حاصل کی کہ وہاں کے اُونی کپڑوں کو (جو کہ وہاں بکثرت بنائے اور استعمال کئے جاتے تھے۔) کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے دستکار بھوکے مرنے لگے۔ دیسی دستکاری دم توڑنے لگی۔ اُنہوں نے انگلستان میں چاروں طرف شور و غوغا مچایا حکومت کے مراکز برادر کمپنی کے مخزنوں اور دفتروں پر بڑے بڑے ہجوم کئے گئے پروٹسٹ کرنے والوں نے دھاوے کئے۔ مظاہرے عمل میں لائے گئے۔ سترہویں صدی کے آخری زمانہ میں صنعت و حرفت کی مختلف جماعتوں کی طرف سے پارلیمنٹ میں بے شمار محضر اور درخواستیں پیش ہوئیں

سودیشی تحریک بڑے زور سے چلائی گئی چونکہ قومی حکومت تھی آزاد ملک تھا بہت قوی اثر ہوا اور چاروں طرف یہی چرچے ہونے لگے کہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی دستکاری اور تجارت کی حفاظت اور اُن کی معاشی ترقی کی کوشش اور تدبیر ازبس ضروری ہے۔ اگر ہندوستان کی مصنوعات کو بند نہ کیا گیا تو ہماری قوم بھوکی مر جائے گی اور ملک برباد ہو جائے گا۔ اور چونکہ ہندوستانی مصنوعات کے بدلہ میں انگلستان سے صرف سونا اور چاندی جاتا ہے اس لئے دستکاری کی بربادی کے ساتھ ساتھ ملک کی دولت اور سرمایہ بھی نکل کر ملک کو انتہائی غربت اور افلاس میں مبتلا کر دے گا۔ اس لئے مامون تجارت کا فلسفہ گھڑا گیا (یعنی دوسرے ملکوں کی ارزاں پیداوار کی درآمد ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ سے روک کر اپنے یہاں کی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی کوشش کرنا اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں ارزاں پیدا نہ ہو سکے تو حکومت کی امداد سے اس کو ترقی دینا اور اُس کی برآمد کا راستہ نکالنا تاکہ کچھ عرصہ میں اپنے ملک کی پیداوار بھی اُسی قدر ارزاں ہو جائے اور خارجی پیداوار کے درآمد کی ضرورت نہ رہے) یہی امر عین انصاف اور انسانیت کی خدمت ہے اور یہی ہر ملک اور قوم کا فریضہ ہے اس پر بڑے بڑے لیکچر دیئے گئے۔ مضامین لکھے گئے۔ پمفلٹ شائع کئے گئے۔ اخباروں میں آرٹیکل لکھے گئے۔ اگرچہ بعضے منصف مزاج اسکے مخالف بھی تھے اور تمام قوموں اور ملکوں کے ساتھ مساویانہ معاملہ کرنا اور بین الاقوام تجارتی آزادی کا حامی ہونا عین انصاف قرار دیتے تھے۔ فری ٹریڈ اُن کا اُصول تھا مگر وہ بہت ہی تھوڑے تھے مگر مامون تجارت کے پروپیگنڈا کرنے والے بہت زیادہ تھے۔ بالآخر حکومت کے تمام ایوانوں میں یہی اثر غالب آیا اور قانوناً ایسی تمام کوششیں جاری ہوئیں۔ جن سے ہندوستان میں مصنوعات کم بنائیں دستکار اپنی دستکاری چھوڑ دیں ہندوستان کا بنا ہوا مال انگلستان آنا بند ہو جائے۔ انگلستان والے ہندوستان کے بنے ہوئے مال کو خریدنا اور استعمال کرنا چھوڑ دیں وغیرہ وغیرہ چنانچہ یہ سب امور عمل میں لائے گئے۔ جیسا کہ ہم نے اس کی معتبر متعدد شہادتیں پیش کر دی ہیں۔ جب یہ امور قوت کے ساتھ انگلستان والوں نے اختیار کر کے اپنی مصنوعات بڑھالیں تو رفتہ رفتہ دوسرے ممالک نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور تمام ترقی یافتہ ممالک میں مامون تجارت کا عمل جاری ہو گیا اور سبھوں نے نہ صرف ہندوستان ہی کی بلکہ تمام خارجیہ ممالک کی مصنوعات کو اپنے اپنے

یہاں قانونی رکاوٹیں پیدا کر کے روک دیا۔ انگریز تاجروں کی تجارت پر بہت بڑا اثر پڑا ادھر چونکہ ہندوستان کی لوٹ سے سرمایہ یعنی سونا اور چاندی، اشرفیاں اور روپے لاتعداد مقدار میں انگلستان پہنچ چکا تھا اس لئے بہت سرعت کے ساتھ دخانی اور مشینی کارخانے جابجا انگلستان میں بنائے گئے۔ مصنوعات نہایت افراط کے ساتھ تیار ہونے لگیں کارخانوں اور مخزنوں میں مصنوعات کے ایسے انبار لگ گئے جن کی کھپت انگلستان میں ممکن نہ تھی۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ مصنوعات کے لئے منڈیاں حاصل کی جائیں۔ یہ امر مامون تجارت کے فلسفہ کی موجودگی میں نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اب وہ فلسفہ بدلا گیا اور جگہ جگہ فری ٹریڈ (آزاد تجارت) کا گیت گایا جانے لگا۔ آرٹیکل آزاد تجارت کے بکثرت لکھے گئے بڑی بڑی اور ضخیم کتابیں اور چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اس کی خوبیوں اور محاسن کے تمام دنیا میں شائع ہونے لگے۔ جگہ جگہ فری ٹریڈ (آزاد تجارت) ہی کا لکچر دیا جانے لگا اور یہ کہا گیا کہ ہر ملک اور ہر قوم پہ لازم ہے کہ اپنی اور غیر ممالک کی پیداوار میں کوئی فرق اور امتیاز نہ کرے۔ اگر کوئی چیز دوسرے ملک سے ارزاں دستیاب ہو سکے تو بلا تکلف اس کو منگائے ٹیکس قائم کر کے اُس کی درآمد کو نہ روکے اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں ارزاں پیدا نہ ہو سکے تو سرکاری امداد سے اس کو ترقی دینے اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنے کی کوشش نہ کرے۔ حاصل یہ کہ کسی خاص اہتمام سے خارجی پیداوار کی درآمد بند نہ کرے اور نہ ملکی پیداوار کی برآمد بڑھائے۔ مگر ترقی یافتہ اور آزاد ممالک انگلستان کے فریب میں نہیں آئے اور مامون تجارت ہی کے فلسفہ کو ترجمان بنائے رہے۔ مگر انگریزی ماتحت ممالک خصوصاً ہندوستان بے دست و پا تھے۔ ان کو ہاتھ پیر ہلانا اپنے آقاؤں کے خلاف ممکن ہی نہ تھا۔ ان پر خوب مشق کی گئی۔ ہر ہر منڈی میں انگریزی مال ٹھونسا گیا اور مصنوعات انگلشیہ کے انبار لگا دیئے گئے۔ ریلوے کے جاری کرنے اور ہر ہر منڈی تک پہنچانے کی انتہائی کوششیں کی گئیں اور ایسے ٹیکسز جن سے ہندوستان کی صنعت اور تجارت کا تحفظ اور زیادتی ہو سکے، یک قلم روک دیئے گئے۔

صاحب علم المعیشت صفحہ ۴۵۸ میں لکھتا ہے:۔

۱۸۱۳ء میں پارلیمنٹ نے پھر ہندوستان کے حالات کے متعلق تحقیقات جاری کی اور جو انگریز ہندوستان رہ چکے تھے اُن سے سوالات کر کے

مفید معلومات حاصل کیں۔ یہ وہ نازک وقت تھا جبکہ نپولین نے انگلستان کی مصنوعات کی درآمد تمام یورپ کے ممالک میں بند کر رکھی تھی۔ اور سامان فروخت نہ ہوسکنے کی حالت میں انگلستان کے صناع اور کارخانہ داروں کے برباد ہو جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ انگریزی مصنوعات کی فروخت کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالنی اشد ضروری تھی چنانچہ یہ خدمت ہندوستان کے سپرد ہوئی کہ وہ انگریزی سامان بکثرت خریدے۔ چونکہ یورپ کے ممالک میں جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں انگریزی مصنوعات کی درآمد بند تھی۔ انگریزی کارخانہ دار مال نہ بکنے سے بدحواس ہو رہے تھے۔ بالآخر اُن کی نظر بھی ہندوستان ہی پر پڑی اور انھوں نے بہت شور و اویلا مچا کر کمپنی کا ہندوستان سے تجارت کرنے کا جو اجارہ تھا اُس کو تڑوا دیا اور اب ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت عام ہوگئی۔"

صفحہ (۵۸۵) میں لکھتا ہے :۔

"نمائشیں قائم کرکے اور ہندوستانی میلوں ٹھیلوں میں جا جا کر بڑے بڑے انگریز ولائتی چیزیں دکھاتے پھرتے تھے کہ لوگ اُن کی خریداری پر مائل ہوں۔"

مسٹر ولسن ہندوستان کی تاریخ میں انگلستان اور ہندوستان کے تجارتی تعلقات پر لکھتا ہے :۔

"موجودہ طریق تجارت اُس بے التفاتی کی افسوسناک مثال ہے جو ہندوستان کے ساتھ وہ ملک برت رہا ہے جس کی اطاعت ہندوستان نے قبول کرلی ہے ۱۸۱۳ء کی تحقیقات میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے انگریزی کپڑوں سے پچاس ساٹھ کمتر نرخ پر ولایت کے بازاروں میں نفع کے ساتھ فروخت ہوسکتے تھے۔ چنانچہ مجبور ہو کر ہندوستانی کپڑوں کی درآمد پر ستّر اسّی فیصدی محصول قائم کر دیا۔ نیز بعض کی قطعاً ممانعت کر دی۔ اگر یہ طریق اختیار نہ کیا جاتا تو انگلستان میں کپڑے کے کارخانے بند ہو جاتے بلکہ کلوں کے زور سے ان کا بعد کو چلنا دشوار ہو جاتا۔ لیکن ہندوستان کو دبا دیا گیا کہ ولایت کے کارخانوں کو ترقی دی گئی کاش اگر ہندوستان کا بس چلتا تو وہ بھی بدلہ لیتا۔ انگریزی مصنوعات

کی درآمد پر بھاری بھاری محصول لگا کر اُن کو ملک میں آنے سے روکتا اور اپنی صنعت و حرفت کے میدان کو بچاتا۔ لیکن اُس کو اپنی حفاظت کرنے کا اختیار نہ تھا وہ غیروں کی اجازت کا محتاج تھا۔ انگریزی مال تو کوئی محصول درآمد لئے بغیر ہندوستان میں ٹھونسا گیا اور ہندوستانی مال کی درآمد ولایت میں روک دی گئی۔ اور پھر بھی چونکہ ہندوستان سے مقابلہ دشوار نظر آتا تھا رقابت کے جوش میں حکومت کے اختیارات سے اپنے مفید مطلب اور ہندوستان کے خلاف کام لیا جاتا رہا۔ (علم المعیشت ص ۵۸۶)

مونٹگمری مارٹن جس نے ہندوستان کے متعلق ۱۸۳۸ء میں رپورٹ شائع کی تھی لکھتا ہے۔

"اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اضلاع زیر بحث میں کس قدر لوگ پارچہ بافی پر اپنی گذران کرتے تھے اور اس میں کیسے ماہر اور کامل تھے۔ لیکن تجارت آزاد کے بہانہ سے انگلستان ہندوستانیوں کو لنکا شائر یارک شائر اور گلاسکو کی کلوں کے بنے ہوئے کپڑے خریدنے پر مجبور کر رہا ہے اور بنگال و بہار کے دستی بنے ہوئے کپڑے کیسے مضبوط اور کیسے خوشنما بھاری بھاری محصول درآمد قائم کر کے اپنے یہاں آنے سے روکتا ہے۔ یہاں ایک نکتہ یہ بھی بتانے کے قابل ہے کہ اوّل اوّل جبکہ انگلستان کی صنعت و حرفت بمقابلہ ہندوستان کے پس ماندہ حالت میں تھی تو ہندوستانی مصنوعات کو بھاری محصول درآمد کے ذریعہ سے صرف انگلستان میں جانے سے روکا جاتا۔ یہی انگریزی تاجر ہندوستانی مصنوعات دیگر ممالک میں لے جا کر فروخت کرتے تھے اور تجارت سے نفع اُٹھاتے تھے مگر اپنے ملک میں صنعت و حرفت کی ترقی کو تجارت کے نفع پر ترجیح دیتے اور ہندوستانی ارزاں مال کی بجائے ملک کا گراں مال خریدنا بہتر سمجھتے تھے جب اوّل اوّل اس تباہین کی آڑ میں بعد کہ کلوں کی ایجادات سائنس کی تحقیقات اور تعلیم عامہ کی بدولت اپنے یہاں کی صنعت خوب ترقی کر چکی تو دیگر ممالک میں بھی انگریزی مصنوعات پھیلانے شروع کئے۔ علاوہ ازیں یورپ کے دیگر ممالک اور امریکہ نے بھی اپنی اپنی صنعت و حرفت پھیلانے کی خاطر انگلستان

کی دیکھا دیکھی ہندوستانی مصنوعات کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ شروع کیا۔ یعنی بھاری محصول قائم کر کے اُن کی درآمد روک دی۔ انگلستان کی طرح اُنہوں نے اپنی کلوں کی ایجادات اور سائنس کی تحقیقات میں پوری کوشش کی۔ عوام میں تعلیم پھیلائی اور بہت جلد اُن کی معاشی حالت بھی روبہ ترقی ہوتی گئی لیکن ہندوستان نہ صرف ایجادات اور سائنس کی تحقیقات اور تعلیم عامہ کی برکت سے محروم رہا بلکہ اس کے ان پڑھ مگر اپنے فن کے بڑے بڑے کامل صناع کو اپنے کاروبار میں تباہ کن مزاحمتیں پیش آئیں نہ صرف دیگر ممالک نے ہندوستانی مصنوعات کی درآمد روک دی بلکہ اس کے برعکس بلا تحاشا اپنی مصنوعات لا لا کر ہندوستان میں انبار لگانے شروع کئے۔ اور اس طرح پر کچھ عرصہ میں ہندوستانی مصنوعات نہ صرف دیگر ممالک سے خارج ہو گئے بلکہ خود اپنے ملک میں بھی ان کو پناہ نہ مل سکی اور عارضی بندشوں میں نامساعد حالات میں گھر کر بے کس اور کار رفتہ ہو گئے۔ صرف زراعت اور پیداوار خام کی بہم رسانی اس کے ذمہ ڈال دی گئی۔ صنعت و حرفت کی خاص برکات میں اُس کا کوئی حصہ نہیں رہا

(علم المعیشت صـ ۵۹۱)

خلاصہ یہ کہ اس آزاد تجارت کے ڈھونگ اور حکومت کے زور سے ہندوستان کے ہر ہر شہر اور قصبہ اور گاؤں میں انگریزی مصنوعات کے انبار لگا دیئے گئے اور بیرون ہند کے اموال میں ڈیوٹی بندروں کے کسٹموں پر کم سے کم کر دی گئی۔ اور اگر کہیں محصول درآمد کچھ زائد حکومت نے مقامی ضرورتوں کی بناء پر بڑھایا تو شور مچا کر مقامی حکام کو اس قدر ڈرایا گیا کہ وہ مجبور ہو کر ڈیوٹی کے کم کرنے پر مضطرب ہو گئے جس کی تفصیل ہم عنقریب پیش کریں گے۔ دوسرا یہ ڈھونگ عمل میں لایا گیا کہ ہندوستان کی مصنوعات پر بھی اتنا محصول ضرور لگانا چاہیئے جتنا کہ انگلستان کے مصنوعات پر لگایا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کی مصنوعات انگلستان کی مصنوعات سے سستی نہ ہوں۔ ورنہ تجارت آزاد نہ رہے گی بلکہ تجارت مامونہ ہو جائے گی۔ صاحب علم المعیشت صـ ۵۹۶ میں لکھتا ہے۔

"باوجود ہزار پس ماندگی کے جب سُوتی کپڑا بننے والے کارخانے کلکتہ بمبئی جیسے مقامات میں اُبھرنے لگے اور بتدریج کپڑے کی ملیں جاری ہو چلیں

تو انگلستان کے کارخانہ داروں کو فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں یہ پُرانا رقیب پھر سر نہ اٹھائے اور بنا بنایا کام بگاڑ دے ۳½ فیصدی محصول درآمد جو انگریزی کپڑے پر ہندوستان میں ادا کیا جاتا ہے اور جس کی مجموعی تعداد اب سرکار ہند کی کل آمدنی کا (۱۵) فی صدی حصّہ ہے اس سے بچنا تو آسان نہ تھا پس انگریزی کارخانہ داروں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ محصول درآمد یعنی ۳½ فی صدی محصول مال نہیں بلکہ محصول تائین ہے۔ یعنی اس سے ہندوستانی کارخانہ داروں کو امان ملتی ہے اور اس میں نہ صرف انگریزی کارخانوں کا نقصان ہے بلکہ ایسا محصول انگلستان کے قومی طریق تجارت آزاد کے منافی ہے پس اگر محصول درآمد مالی نقصان کے خوف سے ترک نہیں کیا جا سکتا تو ہندوستانی کارخانوں پر بھی بقدر ۳½ فی صدی محصول پیداوار قائم کر دینا چاہیئے تاکہ ان کو انگریزی کارخانوں پر موجودہ فوقیت حاصل نہ رہے۔ سب جانتے ہیں کہ انگلستان میں لنکا شائر اور منچسٹر کے کارخانہ داروں کا حکومت میں رسوخ بہت قوی ہے۔ ان کے اثر میں اس قدر ووٹ ہیں کہ زبردست سے زبردست وزارت بھی اُن سے بے اعتنائی کرنے کی جرأت کم کر سکتی ہے۔"

اس خود غرضی اور ناانصافی کی اگرچہ بعض انصاف پسند انگریزوں نے مخالفت بھی کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا اور اگرچہ کچھ عرصہ تک محصول درآمد ۳½ فی صدی انگلستانی مال سے اُٹھا بھی دیا گیا مگر مقامی مصارف کی وجہ سے بالآخر ۱۸۹۶ء میں لارڈ ایلجن کے زمانہ میں ایک ایکٹ پاس ہُوا۔ جس کی دفعہ ۸ کی رُو سے ایسے کل سوتی کپڑے پر جو ہندوستانی کارخانوں میں تیار ہو ۳½ فی صدی محصول پیداوار اُسی طرح قائم کر دیا گیا جس طرح سے انگلستان کے کارخانہ دار ہندوستان میں ۳½ فی صدی دیتے تھے۔ یہ ایکٹ اخیر تک جاری رہا۔ یہ محصول ملکی صنعتوں پر انتہائی بے انصافی پر مبنی تھا۔ مگر قوت کے سامنے کمزور کی کیا چل سکتی ہے۔ ہندوستانیوں کا شور مچانا بالکل بے کار گیا۔ محصول درآمد بعد میں بیرونی ممالک سے آنے والے اموال پر ضروریات جنگ وغیرہ کی وجہ سے اگرچہ بڑھایا گیا اور ۵ فی صدی سے ۷½ فیصدی تک کر دیا گیا مگر سوتی مصنوعات پر کارخانہ داران لنکاشائر و منچسٹر وغیرہ کے خوف

سے زمانۂ جنگ میں بھی زیادہ نہیں کیا گیا بلکہ ۳½ فیصدی ہی رکھا گیا جس کا اقرار خود سر ولیم میر ممبر مال ۱۹۱۶ء میں اپنی تقریر میں کرتے ہیں۔ (دیکھو علم المعیشت ص ۵۹۸)

خلاصہ یہ کہ تامین تجارت کی غرض سے انگلستان نے پہلے ہندوستانی مصنوعات پر ۸۰ فی صدی اور اس سے بھی زیادہ محصول لگا کر پھر قطعی ممانعت کر کے مہذب ڈاکہ ڈالا تھا اور پھر جب ملوں اور کارخانوں کی پیداوار بہت زیادہ ہو گئی اور دوسرے ممالک میں اُن کی کھپت نہیں ہو سکی تو آزاد تجارت کے ڈھونگ سے ہندوستان میں اپنی مصنوعات ٹھونسنے کی غرض سے محصول درآمد کم کر کے ہندوستان کو مجبور کر دیا جس سے وہ خام مال تیار کرنے پر بے دست و پا ہو گیا اور دستکاری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

مسٹر مانٹ گومری مارٹن تاریخ نوآبادیات برطانیہ میں لکھتا ہے۔

"ہم نے ربع صدی کے دوران میں ہندوستانی علاقوں کو اپنے مصنوعات کے خریدنے پر مجبور کیا۔ اس طریقہ پر کہ ہمارے اونی مال پر ہندوستان میں کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ سوتی مال پر ۲½ فی صدی محصول تھا اور اسی نسبت سے دیگر اشیاء پر محصول لگایا گیا تھا درانحالیکہ اُسی زمانہ میں ہندوستان کے بنے ہوئے مال پر ہم انگلستان میں ایسے سخت محصول لگاتے رہے کہ ہندوستانی مال کی درآمد بند ہو جائے۔ بالفاظ دیگر اس محصول کی مختلف شرح ۱۰-۲۰-۲۰-۵۰-۱۰۰-۵۰۰ اور ۱۰۰۰ فیصدی تک اُن اشیاء پر لگائی گئی تھیں جو ہمارے ہندوستانی مقبوضات کی بنی ہوئی ہوں۔ اس لئے ہندوستان کے ساتھ آزاد تجارت کی چیخ و پکار جو ہو رہی تھی وہ دراصل انگلستان کے مال کی آزاد تجارت تھی نہ کہ ہندوستان کے اُس مال کی جو انگلستان بھیجا جاتے۔ سورت، ڈھاکہ مرشد آباد، و دیگر مقامات کی (جہاں دیسی صنعتیں عروج پر تھیں) بربادی کی داستان کا بیان کرنا حد درجہ دلخراش ہے۔ میری رائے میں یہ بربادی ایمانداری کے ساتھ تجارت کو ترقی دینے کی وجہ پر مبنی نہ تھی بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایک زبردست طاقت تھی جس کے ذریعہ سے کمزور کو دبایا جا رہا تھا"

(حکومت خود اختیاری ص ۲۳ از دت جلد ۲ ص ۱۱۲)

۱۹۲۵ء کی تفصیل لکھتا ہوا صاحب معیشت الہند ص ۲۵۷ پر (برآمد اور درآمد اموال کی تفصیل کے بعد) لکھتا ہے۔

"مندرجہ بالا اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ ہندوستان کا جس قدر مال و سامان برآمد ہوا اُس میں تقریباً اسّی فی صدی سامان خام تھا جس میں تقریباً تیس فیصدی سامان خوراک شامل تھا یہ بیشتر زرعی پیداوار پر مشتمل تھا۔ مثلاً روئی ۱۷ فی صدی۔ جوٹ ۱۲½ فیصدی، چاول ۱۱ فی صدی روغن دار تخم۔ ۱۰ فیصدی چاء ۶، فیصدی، گیہوں ۶½ فی صدی، خام چمڑا کچھ کم ۵ فیصدی رہے ہیں ہندوستان کے مصنوعات سوا ان کی برآمد کا اوسط۔ ۲ فی صدی سے بھی کم نظر آتا ہے اور اُن میں صرف دو قابل لحاظ ہیں اوّل جوٹ کا ٹاٹ اور بورے جن کا اوسط ۵ فی صدی ہے"

پھر لکھتا ہے:۔

"حاصل کلام یہ کہ ہندوستان میں اسّی فی صدی مصنوعات درآمد ہوئے اور یہاں سے اسّی فیصدی سامان خام برآمد ہوا جس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان سراسر زراعتی ملک بن گیا ہے اور اب بھی یہاں سرکار کی تمام تر کوشش یہی نظر آتی ہے کہ زراعت کو ترقی دی جائے۔ صنعت و حرفت یوں ہی پس ماندہ رہے۔ دوسرے اس کی طرف سرکار کا التفات بھی مقابلتاً بہت کم ہے۔ البتہ لوگ اپنی ہمت سے تھوڑا بہت کام چلا رہے ہیں"

غرض کہ ہندوستان جو کہ بقول ڈاکٹر فرانسس بکانن ودیگر مورخین ایک صنعتی اور تجارتی ملک تھا جس میں کروڑوں انسان ان دونوں پیشوں سے زندگی بسر کرتے اور بیرونی ممالک سے کروڑوں اشرفیاں حاصل کرتے تھے۔ انگریزوں کی ڈپلومیسی اور خود غرضی سے محض زراعتی ملک بنا دیا گیا۔

مسٹر ہنری سینٹ جارج ٹکر (ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر) ۱۸۲۱ء میں لکھتا ہے:۔

"ہندوستان پہلے صنعت و حرفت کا ملک تھا اب زراعت پیشہ بنا دیا گیا ہے"

یہی جارج ٹکر صاحب دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہم نے ہندوستان کے ساتھ کیسے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اس کے ریشمی کپڑے اور نیز وہ کپڑے جو سوت اور ریشم سے مل کر بنے جاتے ہیں کچھ روز سے ہمارے بازاروں سے خارج کر دیئے گئے ہیں اور حال میں کچھ تو (۶۷) فیصدی محصول درآمد کی بدولت اور کچھ کلوں کی بدولت سوتی کپڑے جو کہ ہندوستان میں بکثرت تیار ہوتے تھے نہ صرف اس ملک میں آنے بند ہو گئے۔ بلکہ ہم اپنے انگلستان سے سوتی کپڑے اپنے ایشیائی مقبوضات میں بھیجنے لگے ہیں اور اس طرح ہندوستان تجارتی ملک سے تنزل کر کے اب محض زراعتی ملک رہ گیا۔" (حکومت خود اختیاری ص۶۷)

مسٹر انڈر یو سیم ۱۸۴۰ء میں سیمو کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"چونکہ ہندوستانیوں پر اور آمدنیوں کے دروازے بند کر دیئے گئے اس واسطے وہ زراعت کی طرف متوجہ ہو گئے۔" (حکومت خود اختیاری ص۶۷)

ہم پہلے سر جان شور کا قول ذکر کر چکے ہیں وہ ۱۸۳۳ء میں کہتا ہے۔

"برطانیہ نے جو طرزِ حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت ملک اور باشندگانِ ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان پر انکے تاجروں پر جلد تباہی آگئی۔"

وہ ہندوستان جس کی تجارت کے متعلق کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان کی تجارت کا مقابلہ یورپ کے بڑے بڑے ممالک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی تجارت و مال کی درآمد و برآمد کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف شہر سورت میں چنگی کی آمدنی تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتی تھی اور احمد آباد میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ سالانہ چنگی کی آمدنی تھی۔" (سفرنامہ ہملٹن جلد اوّل ص۱۴۸) از رسالہ ہندوستان عہد اورنگ زیب میں مصنفہ مرزا سمیع اللہ بیگ چیف جج حیدرآباد۔

"بنگال میں صرف دریائے ہگلی سے ۵۰ یا ۶۰ جہاز مال سے بھرے ہوئے سالانہ تجارت کے لئے بیرونِ ہند بھیجے جاتے تھے۔" (سفرنامہ ہملٹن جلد ۲ ص۲۱)

"تمام ساحلِ ہند پر ہندوستانیوں کے بڑے بڑے جہاز تجارتی مال سے لدے ہوئے چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں۔" (سفرنامہ ہملٹن جلد اوّل ص۴۵)

"احمد آباد دولت و ثروت اور عظمت میں یورپ کے بڑے بڑے شہروں سے کچھ ہی کم ہوگا۔ صرف شہر سورت کی آمدنی ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو پونڈ ہے اور احمد آباد کی آمدنی اس سے دس گنی ہے۔"

(سفرنامہ ہملٹن اندر رسالہ ہندوستان عہد اورنگ زیب میں)

دستکاری اور تجارت کی بربادی کے نتائج

ہندوستانی دستکاری اور تجارت کے برباد ہونے کی وجہ سے دست کار اور تاجر لوگوں کے اندر انتہائی افلاس جاگزیں ہوگیا۔ کروڑوں آدمی بھوک سے مر گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک ایک صدی کے اندر ہندوستان میں ۳۱ قحط واقع ہوئے اور چار کروڑ سے زیادہ نفوس موت کی نذر ہو گئے (جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں) لاکھوں نفوس اخلاقی جرائم ڈاکہ اور چوری وغیرہ میں مبتلا ہو گئے اور کروڑوں نفوس زراعت پر گذران کرنے لگے۔ دستکاری روز بروز کم ہوتی گئی اور زراعت پیشہ بڑھنے لگے۔ ڈاکٹر فرانسس بکانن کے زمانہ تحقیقات میں دستکاری کرنے والوں کی تعداد تقریباً پچاس فیصدی تھی صناعت پیشہ کاشتکاروں سے کم نہ تھے۔ مگر ۱۹۲۸ء میں گھٹتے گھٹتے (۷ء۱۰) فیصدی رہ گئے بالعکس کاشتکاری کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی ۱۹۱۶ء میں ان کی تعداد (۶۱) فیصدی بڑھ گئی حالانکہ ڈاکٹر فرانسس بکانن کے زمانہ میں (۵۰) فیصدی سے بھی کم تھی ۱۹۰۱ء میں (۶۶) فیصدی ۱۹۱۱ء میں (۷۱) فیصدی ہوگئی اور ۱۹۲۱ء میں (۷۲) فیصدی تک پہنچ گئی۔ نقشہ ذیل ملاحظہ ہو۔

۱۹۰۱ء میں صنعت پر گذارہ کرنے والوں کی تعداد کا اوسط (۶ء۴) ہے یعنی ہندوستان کی کل آبادی میں ۵ء۱۵ کروڑ

۱۹۱۱ء میں " " (۵ء۳) یعنی " " " " ۱ء۱۱ کروڑ

۱۹۲۱ء میں " " (۳۱ء۳) " " " " ۳ء۱۰ "

۱۹۳۱ء میں " " " " ۳۹ء۳ " " " ۷ء۹ "

(روزنامہ احسان لاہور ج ۶ ع ۲۸ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۳۹ء)

جس کی بنا پر قابلِ زراعت زمینیں کمیاب ہوگئیں کیونکہ زراعت کی طرف چاروں طرف

سے لوگوں نے ہجوم کر دیا۔ مویشی کے لئے چارہ دستیاب ہونا بند ہو گیا جنگل کاٹ ڈالے گئے ایندھن کی قلت اور سخت گرانی ہو گئی۔ زمینیں کمزور ہو گئیں۔ کیونکہ زمین قوت اگانے کی متواتر زراعت کی وجہ سے کھو بیٹھی۔ جس طرح مزدور متواتر محنت کی وجہ سے کمزور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زمین بھی متواتر کاشت کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے۔ پہلے زمانہ میں ہر گاؤں میں کچھ حصّہ کاشت سے علیحدہ رکھا جاتا تھا جس میں مویشی چرا کرتے تھے اور زمین میں طاقت کاشت کا پیدا ہو جاتی تھی دوسرے سال میں گاؤں کی دوسری زمین خالی رکھی جاتی تھی۔ متواتر کاشت کا اثر یہ ہوا کہ پیداوار روز بروز گھٹنے لگی۔ آئین اکبری کو دیکھئے اس زمانہ میں جو پیداوار فی ایکڑ تھی آج اُس کا آدھا تہائی بھی پیدا نہیں ہوتا۔ روز بروز گرانی غلّہ کی بڑھتی جاتی کیونکہ پیداوار بہت کم ہے۔ بڑے بڑے شہر اُجڑ گئے۔ دیہاتی آبادی بڑھ گئی۔ کیونکہ زراعت کے لئے مزارع کے قریب رہنا ضروری ہے۔ دیہاتی زندگی کی وجہ سے جہالت بڑھ گئی کیونکہ دیہات میں تعلیمی انتظام نہیں ہو سکتا۔

(۸) محاصل اور زرعی ٹیکسوں کی بھرمار

زراعت کو بھی انگریزوں نے نہایت پامال کر دیا

زراعت کے متعلق بھی انگریزوں کی پالیسی نہایت اندوہناک اور دلخراش ہے۔ انگریزوں سے پہلے کاشتکاروں سے مالگذاری چوتھ کی صورت میں وصول کی جاتی تھی۔ کھیت میں غلّہ تیار ہونے پر حکومت کے افسر کن کرتے تھے اور پیداوار کے تخمینہ پر چوتھائی حکومت کے لئے درج رجسٹر کیا جاتا تھا۔ غلّہ حاصل ہونے پر حسب رجسٹر کاشتکار چوتھائی غلّہ یا اُس کی قیمت حکومت کو دیتا تھا۔ اس طرح اگر پیداوار اچھی ہوتی تھی تو حکومت اور کاشتکار اور زمیندار سب کو نفع ہوتا تھا اور اگر نہیں ہوتی تھی یا کم ہوتی تھی تو سب کو نقصان رہتا تھا اور حکومت کاشتکا کے نفع اور نقصان میں یکساں طریقہ پر شریک رہتی تھی۔ مگر انگریزوں نے قبضہ پاتے ہی پختہ لگان کر دیا۔ اور زمینوں پر نقد معین کر دیا۔ خواہ زمین میں پیداوار ہو یا نہ ہو۔ غلّہ خواہ عمدہ قسم کا ہو یا خراب قسم کا ہر حالت میں حکومت اپنی مقرر کردہ مقدار وصول کرنے لگی خواہ کاشتکا

کے یہاں کچھ بھی پیدا نہ ہوا ہو۔ عدم وصولیابی پر کاشتکار کی قرقی کر لی جاتی تھی اُس کے گھر کا سامان عورتوں کے زیورات، اُس کی زراعت کے وسائل بیل، ہل وغیرہ نیلام کر دیئے جاتے تھے جس کی بنا پر عام زراعت پیشہ انتہائی فلاکت میں مبتلا ہو گئے۔ لگان پر زیادتی برابر جاری رہی۔ مسٹر جی کرہارڈی موسس لیبر پارٹی اپنی کتاب انڈیا میں جو کہ ۱۹۰۹ء میں ہندوستان میں شائع ہوئی لکھتا ہے :-

وہ عام طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت کے ماتحت ہندوستان کے کسانوں کو اس سے بہت کم لگان ادا کرنا پڑتا ہے جو سلطنت مغلیہ اور دوسرے بادشاہوں کے زمانہ میں ادا کرنا پڑتا تھا اس دعویٰ کی تردید و تغلیط کئی طرح کی جا سکتی ہے لیکن اس مقام پر صرف چند اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں تاکہ دروغگوئی اور غلط بیانی کا اندازہ ہو جائے۔ ۱۸۱۷ء میں بمبئی برطانیہ کے زیر حکومت آیا۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ اُس کے حکمرانوں کی طرف سے صوبہ کے تمام کاشتکاروں سے لگان میں صرف اَسّی لاکھ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اُسی زمانہ میں لگان وصول کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ کسان سے اُس کی پیداوار کا خواہ پیداوار اچھی ہو یا بُری ¼ یعنی چہارم لیا جاتا تھا۔ اس طرح اگر فصل اچھی ہوتی تھی تو حکومت کو کاشتکاروں کے ساتھ فائدہ ہوتا تھا اور خشک سالی کے زمانہ میں جتنا کاشتکاروں کو نقصان ہوتا تھا اُسی تناسب سے حکومت کو بھی نقصان اٹھانا پڑتا تھا لیکن اب صورت برعکس ہے۔ اور کاشتکار سے سالانہ ایک مقررہ رقم وصول کر لی جاتی ہے اور اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ فصل خراب ہوئی ہے یا اچھی اور خرابی پیداوار کے باعث کاشتکار اس قابل بھی ہے کہ وہ لگان ادا کر سکے یا نہیں۔ ۱۸۱۷ء کے بعد سے جبری لگان کا طریقہ اختیار کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا ۱۸۲۳ء میں لگان کی تعداد بڑھ کر ایک کروڑ پچاس لاکھ ہو گئی۔ حتیٰ کہ ۱۸۷۵ء میں لگان کی مجموعی رقم چار کروڑ اَسّی لاکھ ہو گئی۔ ہندوستان میں ٹیکسوں کا ۸۰ فیصدی زمینوں کے لگان سے وصول کیا جاتا ہے۔ گورنمنٹ متواتر زمیندار طبقے کو نظر انداز کر رہی ہے۔ جو گورنمنٹ اور کاشتکار کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کاشتکار سے اس کی پیداوار کا ۵۰ فیصدی سے لے کر ۶۵ فیصدی تک حکومت وصول کر لیتی ہے

اس کے علاوہ اُسے دوسرے ٹیکس بھی ادا کرنے پڑتے ہیں اس طرح تمام ٹیکسوں میں اُسے اپنی پیداوار کا تقریباً ۷۵ فیصدی دینا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں کاشتکاروں پر اس قدر بار پڑا ہوا ہے جس کا اندازہ دوسرے لوگ مشکل سے کر سکتے ہیں اگر گھر کی آمدنی پر ۵ فیصدی ٹیکس لگا دیا جاتا ہے تو ٹیکس دہندہ چیخ اُٹھتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی حالت کس قدر ردّی اور ناگفتہ بہ ہوگی جہاں پیداوار پر ۵ فیصدی نہیں بلکہ ۷۵ فیصدی ٹیکس لیا جاتا ہے۔ حکومت آئے دن شرح لگان پر نظرثانی کرتی رہتی ہے تاکہ اُن کسانوں سے جو پہلے ہی بھاری بھاری ٹیکسوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں اگر ممکن ہو سکے تو اُن کے جیب کی آخری پائی بھی حاصل کر لی جائے۔ بیس فیصدی لگان تو عموماً بڑھا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے پیشِ نظر ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں ۵۰ فیصدی ۷۰ فیصدی اور ۱۰۰ فیصدی لگان میں اضافہ کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ہمیشہ افلاس و نکبت کی ہولناک مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔

(مدینہ بجنور جلد ۱۹ صفحہ ۸۵ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۰ء)

صوبہ بنگال کا لگان نواب بنگال کے آخری عہد یعنی ۱۷۶۴ء میں اکیاسی لاکھ پچھتر ہزار پانچ سو بیس روپیہ تھا مگر اضافہ کرتے کرتے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۹۳ء میں دو کروڑ اڑسٹھ لاکھ وصول کیا۔ (رسالہ مظلوم کسان صفحہ ۲۹ از آر۔ سی۔ دت)

اسی طرح ہر صوبہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ حسبِ ذیل تفصیل قابل ملاحظہ ہے۔ یہ تفصیل پورے ہندوستان کی ہے۔

۱۸۵۶ء	سترہ کروڑ تیس لاکھ روپیہ
۱۸۷۰ء	اُنیس کروڑ چھیانوے لاکھ روپیہ
۱۸۸۰ء	اکیس کروڑ اکیانوے لاکھ روپیہ
۱۸۹۰ء	چوبیس کروڑ پانچ لاکھ روپیہ
۱۹۰۰ء	چھبیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ
۱۹۱۴ء	اکتیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ

یہ اضافہ میعادی بندوبست کے حلقوں میں ہوتا رہا۔ دوامی بندوبست کے حلقے حسب معاہدہ لارڈ کارنوالس اضافہ سے محفوظ رہے۔ (معاشیات ہند ص ۲۵۹)

انگریزوں نے دیوانی کے اختیارات شہنشاہ دہلی سے حاصل کرتے ہی نہایت ظالمانہ حیثیت سے گرانبار اضافہ لگان میں جاری کر دیا تھا اور باوجودیکہ مختلف وجوہ سے لوگ قحط اور افلاس میں مبتلا ہو کر مر رہے تھے مگر سنگدل انگریزوں کو رحم نہیں آتا تھا اور دولت و مال کی ہوس میں لگان کا اضافہ غریب کسانوں پر لگاتار جاری کر رہے تھے۔ مسٹر آر سی دت لکھتا ہے

"ہندوؤں اور مغلوں کی حکومت میں جس حساب سے لگان لیا جاتا تھا اس سے بہت زیادہ باوجود افلاس بڑھ جانے کے اب وصول کیا جاتا ہے ۱۷۹۳ء سے ۱۸۸۲ء تک سرکار نے بنگال کے زمینداروں سے نوے ۹۰ فیصدی اور شمالی ہند میں اسّی ۸۰ فیصدی لگان وصول کیا۔ بنگال کے آخری نواب نے اپنی حکومت کے آخری سال ۱۷۶۴ء میں (۸۱۷۵۵۲۰) لاکھ روپیہ وصول کئے تھے لیکن بنگال، بہار، اڑلیسہ کی سلطنت حاصل کرتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۹۳ء میں لگان کی رقم (۲،۶۸،۰۰،۰۰۰) روپیہ کر دی ۱۸۰۲ء میں ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے بعض اضلاع انگریزی عملداری میں شامل ہوئے جن کا مالیہ نوابوں کے عہد میں (۱،۳۵،۱۲،۴۷۰) کروڑ روپیہ مقرر تھا۔ مگر اُس میں سے کس قدر معاف کر دیا جاتا تھا اور کس قدر رقم وصول کی جاتی تھی اس کا ٹھیک پتہ نہیں چل سکتا۔ اب انگریزی عملداری ہونے میں تین ہی سال میں ان اضلاع کی (۱،۶۸،۲۳،۰۹۰) کروڑ روپیہ سالانہ آمدنی بنائی گئی۔ پہلے پہل جب بہار اتر کا تاج انگریزوں کے ہاتھ آیا اُس وقت وہاں کا مالیہ اسّی لاکھ مقرر تھا مگر تھوڑے ہی سالوں میں انگریز اُس علاقہ سے ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ وصول کرنے لگے۔ اس وقت سے لے کر برابر زمین کا مالیہ بڑھ رہا ہے۔"

(رسالہ مظلوم کسان ص ۲۹)

ڈائرکٹرز ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۲ فروری ۱۷۷۱ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں۔

باوجودیکہ سابقہ قحط بہت ہولناک تھا اور اس سے بے شمار موتیں ہوئیں مگر پھر بھی اس سال کے واسطے نئے بندوبست میں بنگال اور بہار کا لگان بڑھا دیا گیا۔

پھر ۱۰ جنوری ۱۷۷۲ء میں انہوں نے لکھا:۔

ریونیو (مال) کے ہر ایک محکمہ میں وصولی اس طرح کامیابی کے ساتھ کی جا رہی ہے جیسی کہ ہماری خواہش تھی۔

وارن ہسٹنگز لکھتا ہے۔

اس صوبہ میں ایک تہائی آبادی کے بھوک سے مرجانے اور کھیتی میں بہت کمی واقع ہوجانے کے باوجود بھی ۱۷۷۱ء میں لگان کی رقم ۱۷۶۸ء کے لگان کی رقم سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

(رسالہ مظلوم کسان صفحہ ۲۸-۲۹- از آر-سی دت)

مسٹر ولیم وڈربرن نے ۱۸۹۶ء میں ہاؤس آف کامنس (دارالعلوم) میں تقریر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ کہے

"ہندوستانی رعایا کی تباہ حالی اور مفلسی کے تین خاص وجوہ ہیں۔ اوّل مالگذاری کی زیادتی۔ اگرچہ گورنمنٹ برطانیہ کے احکام یہ تھے کہ مالگذاری ایسی نہ ہونی چاہیے کہ اس میں زمین کا کل منافع آجائے بلکہ اس طرح مقرر کی جانی چاہیئے کہ کاشتکار کو اس کی محنت کا معاوضہ اور جو سرمایہ اس نے کاشت میں لگا رکھا ہے اس کا سود اور منافع خالص کا نصف حصّہ اس کے پاس بچ سکے۔ لیکن یہ بات خود ہندوستان کے حکام تسلیم کر چکے ہیں کہ ان ہدایات پر ہندوستان میں کبھی عملدرآمد نہیں ہوا یہاں مال گذاری اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ کے سود اور کاشتکار کی مزدوری کے حصّہ کو ہضم کر لیتی ہے اور اور باوجود یہ امر تسلیم کر لینے کے مال گذاری اس طرح بڑھائی جاتی ہے کہ بعض مواضعات میں تو سو فی صدی اور بعض خصوصی آراضیات پر ہزار فی صدی تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسرا خاص سبب رعایا کی تباہی کا یہ ہے کہ وصولی لگان و مال گذاری کا طریقہ نہایت سخت ہے جس کی رُو سے ایک مقررہ سالانہ رقم وقت معینہ پر وصول کی جاتی ہے اور خراب فصلوں میں جو نقصان ہوتا ہے اس کا بوجھ کاشتکار پر ڈالا جاتا ہے

یہ بوجھ ایسا ہے کہ کاشتکار اس کو برداشت نہیں کر سکتا اور اس کو سودی قرضہ لینا پڑتا ہے اور تیسرا اسبب یہ ہے کہ یورپ کے نمونہ پر قرضہ وصول کرنے کے لئے عدالتیں قائم کر دی گئی ہیں جن کی وجہ سے قرض خواہ کی پشت پناہی پر تمام سلطنت کی قوت ہوتی ہے اور اُس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ رعایا کو غلامی کے ادنیٰ درجہ تک پہنچا دے[1]

یہ چند شہادتیں بطور اختصار ہم نے پیش کی ہیں جن سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سنگدل اور خود غرض برطانویوں نے کس طرح ہندوستان کے غریب کاشتکاروں کو بے رحمی سے برباد کیا ہے اور کاشتکاری کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ لگان کے ثقیل بوجھ اور وصولی کے انتہائی جابرانہ طریقہ کی وجہ سے کسان ہر سال زمین جوتنے پر مجبور تھا زمین کو لگاتار بوتا تھا اور اپنی گلو خلاصی کی فکر کرتا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کی زمین انتہائی درجہ میں کمزور ہو گئی اور پیداوار میں نہایت زیادہ کمی ہو گئی۔ پیداوار کا اوسط فی ایکڑ زمین باعتبار دیگر ممالک حسب ذیل ہے۔

چاول کی پیداوار فی ایکڑ زمین		رقبہ کاشت
ہسپانیہ	۹ ر ۶۲	۶۹۶۳ ہزار ایکڑ
اطالیہ	۰ ر ۴۳	۰۰ ۵ ر ۲۷ لاکھ ایکڑ
ہندوستان	۹ ر ۱۴	۹۱ ۰ ر ۷ ر ۲۶۰ ر ۳ کروڑ ایکڑ

گیہوں کی پیداوار فی ایکڑ زمین

بلجیم	فی ایکڑ	۲۶ من
برطانیہ	"	۲۲ من
ہندوستان	"	۸ من

ناظرین خیال فرمائیں، وہ ہندوستان جو کہ بقول تھارنٹن، مرید نہ ٹاڈ نشنڈ لارڈ کلایو وغیرہ اپنی پیداوار اور زراعت میں تمام دنیا میں نہایت مشہور تھا جس کی شہادت

---

[1] تقاریر و تحریرات سر ولیم وڈر برن مطبوعہ نیٹسن پریس ص ۱۲۰ از رسالہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج ص ۱۴

آئینِ اکبری کے صفحات بھی دیتے ہیں انگریزی عہد میں تمام دنیا سے کس قدر گر گیا :-۔۔۔

مذکورہ بالا اعداد و شمار سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دولت اور تمام ذرائع دولت، دستکاری، تجارت، زراعت سبھوں پر ایسا چھاپہ مارا کہ جس کی نظیر نہ سابقہ زمانوں میں کہیں ملتی ہے اور نہ موجودہ زمانہ میں کسی دوسری قوم اور ملک میں کہیں دکھائی دیتی ہے بلکہ تعجب ہے کہ ان اُمور کے ہوتے ہوئے ہندوستان زندہ کیسے رہا۔ پچھلے زمانہ میں ظالم حکومتیں چھاپہ مارتیں اور لوٹتی تھیں مگر سرمایہ داروں پر ہی اُن کا دستِ ظلم دراز ہوتا تھا۔ بخلاف انگریزوں کے کہ انہوں نے نہ کسی امیر کو چھوڑا نہ کسی غریب کو بلکہ اُن کی ملعونہ پالیسیوں سے غریب طبقہ نہایت زیادہ برباد ہوا۔ گذشتہ شہادتیں ہندوستانیوں کے افلاس اور بھوک سے مرنے کی ان امور کے ملاحظہ سے آفتاب کی طرح روشن ہو جاتی ہیں اور یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ مبالغہ سے بالکل خالی ہیں اور بالکل واقعی ہیں۔ انگریزوں کا اُن پر پردہ ڈالنا بالکل غلط ہے۔ والی اللہ المشتکی۔

(۹) رواداری۔ اتحاد اور ہمدردی کے بجائے

نفاق نفرت بغض و عداوت تعصب اور فرقہ واریت

ہندوستان کے باشندوں میں نفرت اور دشمنی پھیلانا

تمام سمجھدار لوگ بلکہ بے سمجھ لوگوں کا بھی تسلیم کیا ہوا اصول ہے کہ اتفاق و اتحاد، رواداری اور میل ملاپ ہی انسانی فلاح و بہبود اور دنیوی اور دینی ترقی اور راحت و آرام کا ذریعہ ہے انسان تو صاحب عقل و شرافت ہے وہ اگر احساس کرے تو ایسے تعجب کی بات نہیں مگر یہ چیز تو جنگلی حیوانوں اور درندوں تک میں پائی جاتی ہے وہ اتحاد و اتفاق سے بسر کرتے ہیں اور اس کے پابند رہتے ہیں۔ اسی طرح سب مانتے ہیں کہ جھگڑا لڑائی تنفر اور عداوت، بدامنی اور فساد ہر طرح سے بربادی کے قوی اسباب ہیں۔ جن کی اجازت

کسی طرح نہیں دی جا سکتی مگر بُرا ہو خود غرضی اور نفسانی خباثتوں کا کہ وہ انسانوں اور اقوام کو ایسی ایسی ملعون پالیسیوں پر مجبور کرتی ہیں جن کی وجہ سے قوموں کی قومیں بربادی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ یورپین اقوام اور بالخصوص برطانوی قوم نے یہی پالیسی تمام ایشیائی اور افریقی اقوام کے ساتھ (اپنے اقتدار اور لوٹ کھسوٹ کے لئے) ضروری سمجھی جس ملعون طریقہ سے بھی ممکن ہو، ہندوستان کو حاصل کرنا۔ پھر پورے ملک کو زیر و برباد اور اپنے پنجۂ آہنی کے اندر دبا کر چوستے رہنا انگلینڈ کی حکمتِ عملی رہی ہے جب مقاصد ایسے ہلاکت انگیز ہوں تو ملکوں کی بربادی میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے مگر درندوں کو اس کی کیا پرواہ، اُن کو خون چوسنے سے مطلب تھا شکار مرے یا جئے۔ برطانیہ کی دو سو سالہ شرمناک پالیسی نے ہندوستان کو سخت فلاکت اور بربادی کے گڑھے میں ڈال دیا اور ایسے گندہ اخلاق اور اعمال میں مبتلا کر دیا کہ صدیوں کے بعد اس کو سنبھلنے کی نوبت آسکے گی۔ ہم مختصر طور سے اس شر انگیز پالیسی کا فوٹو کھینچتے ہیں جس سے ہمدردی، انسانیت اور خدمتِ خلق کے برطانوی دعووں کا پول کھل جائے گا اور حقیقت حال بے نقاب ہو جائے گی۔

فرقہ واریت اور منافرت کی چنگاریاں سلگانا اور اُن کو ہوا دینا

(۱) (سر جان میلکم)

"اس قدر وسیع ملک میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں جب تک یہ لوگ اِس طریقہ سے جُدا رہیں گے اُس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی۔"

اسی مقصد کے لئے ایسی تاریخیں لکھی گئیں جن میں ہندوؤں پر مسلمان بادشاہوں کے فرضی اور غیر واقعی مظالم بھیانک صورتوں میں دکھلائے گئے۔ جن میں سے مشہور تاریخ سر ہنری ایلیٹ کی ہے جنھیں یہ بات سخت ناگوار تھی کہ لکھے پڑھے ہندو مسلمانوں کی گذشتہ عہدِ حکومت کی تعریف کیوں کیا کرتے ہیں اور عہدِ جدید کی

عیب جوئی کرتے ہیں۔ چونکہ اُس زمانہ میں جس قدر کتابیں اور تاریخیں خود ہندو مصنفین کی لکھی ہوئی تھیں اُن سب سے مسلمانوں کی عظمت و وقعت کا اظہار ہوتا تھا اور اُس کو بعض انگریز برداشت نہ کر سکتے تھے اس لئے سب سے اوّل سر ہنری ایلیٹ نے جو کہ ہندوستان میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے اور آخر میں گورنمنٹ ہند کے صیغہ خارجہ کے سکریٹری ہو گئے تھے ہندوستان کی ایک تاریخ لکھ کر اس کی پہلی جلد ۱۸۴۹ء میں شائع کی۔ یہی وہ سب سے پہلی تاریخ ہے جس نے زمانۂ قدیم اور بالخصوص مسلمانوں کے عہد کے خلاف خوب زہر اگلا ہے تاریخی میدان میں یہی وہ پہلی کتاب آئی جس کے ترجمے دیسی زبان میں کرا کے اُن کے ذریعے اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے غبار اور دشمنی کا بیج بو یا گیا۔ اگر کسی شخص کو اس تاریخ کے لکھے جانے کا مقصد معلوم کرنا ہو تو اس کے لئے صرف اُس کا دیباچہ پڑھ لینا بالکل کافی ہوگا جس میں مورخ نے اپنے منشا کو واضح اور صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے مثلاً صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

"بڑا افسوس ہندو مصنفین پر آتا ہے جن سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے محسوسات توقعات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے مگر وہ تو احکام اور ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں۔ ماہ محرم کو محرم شریف اور قرآن کو کلام پاک کہتے ہیں۔ اپنی تحریرات کو بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں۔"

ایلیٹ صاحب کو ہندو مصنفین کی اس بات پر سخت غصہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے مراسم اور مذہب کی اس قدر عظمت کیوں کرتے ہیں ایک معمر ہندو مصنف نے کہیں کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ارتھی کے قریب اور اپنی قبر کے کنارے کھڑا ہے تو ایلیٹ صاحب ناراض ہو کر فرماتے ہیں کہ اُسے علم ہوگا کہ میری لاش جلا کر اُس کی راکھ گنگا میں بہا دی جائے گی پھر اُس نے قبر کے کنارے کھڑا ہوتا کیوں لکھا۔ حالانکہ مصنف مذکور نے جو کچھ لکھا تھا وہ محض اس لئے لکھا تھا کہ ایک بات کو مختلف پیرایوں میں ادا کرنا لٹریچر کی ایک خوبی سمجھا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ ایلیٹ صاحب کو اس بات پر غصہ تھا کہ:۔

"اب جب کہ ہندو اپنے ظالم (یعنی مسلمان) آقاؤں کے چنگل سے نکل کر آزاد ہو گئے اور بغیر روک ٹوک کے اپنے دل کی باتیں ظاہر کر سکتے ہیں تب بھی ان غلامانہ ذہنیت کے لوگوں میں سے ایک بھی

اپنے ملک کے محسوسات کے مطابق نہیں لکھتا۔ یا طویل زمانہ کی مظلومیت کے خیالات اور جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔"

مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کو اگر مسلمانوں کے زمانہ میں تکلیف پہنچی ہوتی تو وہ آزادی کے زمانہ میں ضرور اُس کا اظہار کرتے۔ البتہ ایلیٹ صاحب کو اس سے سخت تکلیف پہنچی تھی کہ ہندو مسلمانوں کے عہدِ حکومت کی کیوں تعریفیں کرتے تھے اور انگریزوں کے عہد کی کیوں عیب جوئی کرتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے کوشش کی کہ تاریخوں کے پرانے زمانوں میں سے ایسے واقعات نکالیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ مسلمانوں کا عہد ظالمانہ اور انگریزوں کا عہد خدا کی رحمت تھا۔ چنانچہ اس مقصد کو انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ پرانی تاریخوں کی قدر و قیمت کم ہے تاہم بغور مطالعہ کرنے سے ان میں بہت سا مواد مل سکتا ہے اُن کے ذریعہ سے جہالت کا دھندلا پن دور کیا جا سکتا ہے جس نے ہندوستان کی معلومات کو تاریک کر رکھا ہے اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ ابھی لکھنے کو باقی ہے۔ اُن سے رعایا کو بے شمار فوائد کا احساس کرایا جائے گا جو ہماری نرم اور منصفانہ حکومت سے حاصل ہوئے ہیں۔"

ایلیٹ صاحب کو ہندوؤں کے وہ تعریفی کلمات جو کہ اسلامی عہد حکومت کے متعلق کہتے یا لکھتے تھے نہایت ناگوار ہوتے تھے حالانکہ وہ واقعیت پر مبنی تھے اور اسی طرح جو کلمات انگریزی حکومت کے متعلق تنقید اور احتجاج کے کہتے تھے وہ بھی حقیقت رکھنے والے تھے۔ چنانچہ

(الف) لارڈ ولیم بنٹنگ جو ابتداء میں مدراس کے گورنر اور اس کے بعد ہندوستان کے مشہور وائسرائے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں اُن کے بیان سے زیادہ کوئی سند یا وقعت اور وزنی نہیں ہو سکتی۔ آپ نے ۱۸۹۲ء میں کمپنی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا تھا۔

"بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں۔ مسلمان اس ملک میں آباد ہو گئے جسے انھوں نے فتح کیا تھا وہ ہندستانی

باشندوں سے گھل مل گئے۔ اُن میں شادی بیاہ کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیئے فاتح اور مفتوح کے مذاق دلچسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی۔ کوئی فرق نہ تھا۔ برخلاف اس کے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری خود غرضی بے پروائی ہے جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمراں ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے اور ہندوستانیوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ [1]

(ب) سر پی سی رائے (بنگال کے مشہور عالم) ۱۹۳۶ء میں بنگال کے مسلم فیڈریشن کے جلسہ میں بحیثیت صدر جلسہ تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اورنگ زیب کے عہد میں بنگالی ہندوؤں کو منصبداری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں۔ اور بڑے بڑے زمیندار بنا دیئے گئے اور نگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا وائسرائے بنایا یہاں تک کہ اُس نے خالص مسلم صوبہ، افغانستان پر بھی جو نائب دارالسلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت ہی تھا۔ (ماخوذ از تقریر پی سی رائے۔ روشن مستقبل ص۲۴)

(ج) پنڈت سندرلال صاحب الہ آبادی (بھارت میں انگریزی راج میں) فرماتے ہیں۔

"اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اُن کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئیں تھیں۔ آج تک ہند میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کے تذکرے ہیں۔ اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک اریل میں

---

[1] (الانصار دیوبند ۲۲ ص۲ ۱۶ جون ۱۹۲۸ء از فارورڈ کلکتہ (ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت از میجر باسو جلد ۴ صفحہ ۶۴ ۲۲ روشن مستقبل صفحہ ۲۵، ۲۶)

سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے۔"

"اسی طرح شہنشاہ اورنگ زیب نے گردھر پسر جگ جیون ساکن موضع بسی ضلع بنارس اور جیدو مصر ساکن مہیش پور پرگنہ حویلی کو اور پنڈت بلبھدر مصر کو جاگیریں عطا کیں۔" (روشن مستقبل صـ۲۱)

شہنشاہ جہانگیر مرحوم لکھتا ہے:۔ "اور راجہ بکر ماجیت کو کہ ہندوستان کے معتبر راجوں سے ہے اور رصد نجوم کی ہند میں اس نے بنائی ہے خطاب دے کر میر آتش اپنا بنایا یعنی افسری توپ خانہ کی عنایت کی اور حکم کیا کہ ہمیشہ توپخانہ میں پچاس ہزار توپچی اور تین ہزار توپ عمدہ آراستہ تیار رہیں یہ بکر ماجیت کھتری ہے میرے باپ کے فیل خانہ کے داروغہ مشرقی سے خدمت دیوانی اور مرتبہ امرائی کو پہنچا تھا فن سپہگری اور تدبیر جنگ کو خوب جانتا ہے۔"

(ترجمہ تزک جہانگیری)

عالمگیر اورنگ زیب مرحوم کے عہد حکومت میں ہندو امراء کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ہفت ہزاری	شش ہزاری	پنج ہزاری	چار ہزاری	ساڑھے تین ہزاری	تین ہزاری
۲ نفر	۲ نفر	۵ نفر	۵ نفر	۴ نفر	۱۳ نفر

ڈھائی ہزاری	دو ہزاری	ڈیڑھ ہزاری	ایک ہزاری
۵ نفر	۱۶ نفر	۲۷ نفر	۱۵ نفر

مسٹر ظہیر الدین فاروقی بیرسٹر ایٹ لاء تاریخ کیول رام مصنف تذکرۃ الامراء سے مندرجہ بالا فہرست نقل کر کے فرماتے ہیں:۔

"ان مختلف فہرستوں اور پھر دوسرے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگزیب مرحوم ہندوؤں کو اُن کی لیاقت اور قابلیت کے لحاظ سے ہمیشہ بڑھاتا رہا۔ ہندوؤں کو اپنی سرکار میں ملازم رکھنے کے سلسلہ میں اس کا خیال تھا کہ مذہب کو دنیاوی امور کے بیچ میں لانا بے معنی ہے اور اس قسم کے معاملات میں مذہبی عصبیت کو راہ نہ دینا چاہیئے۔"

(کتاب اورنگ زیب اور اس کا عہد مؤلفہ ظہیر الدین فاروقی بی اے علیگ بیرسٹر ایٹ لاء بھڑا ایچ صـ۲۰۲)

(و) دوسری فہرست اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ کے ہندو امرا کی حسب ذیل ہے۔

ہفت ہزاری	شش ہزاری	پنج ہزاری	چار ہزاری
۳ نفر	۳ نفر	۹ نفر	۵ نفر
تین ہزاری	ڈھائی ہزاری	دو ہزاری	ڈیڑھ ہزاری
۱۳ نفر	۹ نفر	۵ نفر	۴۰ نفر
ایک ہزاری	۷ صدی	پانصدی	ایک صدی یعنی یوزباشی
۸ نفر	۱ نفر	۱ نفر	۱ نفر

ان منصب داروں کے علاوہ اکتالیس اور مختلف عہدوں پر ہندو امرا تھے ہفت ہزاری منصب سب سے اونچا ہوتا تھا۔ جس کے لئے حسب ذیل اشیا مقرر تھیں۔

گھوڑے	ہاتھی	شتر	خچر	چھکڑا	تنخواہ ماہوار
۴۹۰	۱۴۱	۱۱۰	۲۷	۲۲۰	۴۵ ہزار روپیہ

نمبر اوّل پنج ہزاری منصب والوں کے لئے حسب ذیل اشیا تھیں۔

گھوڑے	ہاتھی	شتر	خچر	چھکڑا	تنخواہ ماہوار
۳۴۰	۱۱۵	۱۰۰	۲۰	۱۶۰	تیس ہزار روپیہ

نمبر دوم پنج ہزاری کی تنخواہ اُنتیس ہزار روپیہ تھی اور نمبر سوم کی تنخواہ اٹھائیس ہزار ماہوار تھی :-:-:-

اسی طرح ہر امیر کی حسب درجہ بڑی تنخواہیں اور وظائف تھے۔ جو کہ آج وہم وخیال میں بھی نہیں آ سکتے۔ ہفت ہزاری ہندو اُمراء میں سے ساہو پسر مہاراجہ سیتا بھی تھا اور پنج ہزاری امراء میں سے سیواجی کا داماد راجندرجی اور مالوی بھونسلہ بھی تھا۔ اورنگ زیب کے سپہ سالاروں میں راجہ جے سنگھ (جس کے نام پر شہر جے پور ہے) پنج ہزاری منصبداروں میں سے تھا۔ راجہ جسونت سنگھ کابل کا گورنر تھا۔

(ماخوذ از علماء ہند کا شاندار ماضی جلد اوّل)

چونکہ اورنگ زیب مرحوم کا زمانہ سلطنت دراز اور طویل ہوا ہے، اس لئے اُمراُ کی فہرستوں میں کمی زیادتی اور اختلاف ہونا لازمی امر ہے۔ ہر مؤرخ نے اپنے زمانہ کے اعداد و شمار کا ذکر کیا ہے۔

(وصیت بابر) شہنشاہ محمد ظہیر الدین بابر مرحوم اپنے بیٹے محمد ہمایوں نصیر الدین کو خفیہ وصیت (سنا) میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھتا ہے :-

"اے پسر سلطنتِ ہندوستان مختلف مذاہب سے پُر ہے۔ الحمد للہ کہ اُس نے اس کی بادشاہت تمہیں عطا فرمائی۔ تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصباتِ مذہبیہ کو لوحِ دل سے دھوڈالو۔ اور عدل وانصاف کرنے میں ہر مذہب و ملت کے طریق کا لحاظ رکھو۔ جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اس ملک کی رعایا مراحم خسروانہ اور الطاف شاہانہ ہی سے مرہون ہوتی ہے۔ جو قوم یا ملت حکومت کی مطیع اور فرماں بردار رہے۔ اس کے مندر اور مزار برباد نہ کئے جائیں عدل وانصاف ایسا کرو کہ رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔ ظلم وستم کی نسبت احسان اور لطف کی تلوار سے اسلام زیادہ ترقی پاتا ہے۔ شیعہ وسنّی کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہو جائے گا جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جل کر اتحاد واتفاق سے کام کر رہے ہیں اسی طرح مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھو اور اُن میں اتحاد عمل پیدا کرو تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے۔ سرگذشت تیمور کو جو اتفاق واتحاد کا مالک تھا اپنی نظر کے سامنے رکھو تاکہ نظم ونسق کے معاملات میں پورا تجربہ ہو" (روزنامہ خلافت جلد ۵ نمبر ۱۶۰ مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۲۶ء از ڈاکٹر بال کرشن پرنسپل راجہ رام کالج کولہاپور۔ مترجم از فارسی)

فرمان اورنگ زیب۔ شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم اپنے ایک فرمان مورخہ ۵ جمادی الاوّل سنہ ۱۰۶۵ھ (ح) میں (اب سے تین سو ایک برس پہلے) لکھتے ہیں :"ہماری پاک شریعت اور سچے مذہب کی رو سے یہ ناجائز ہے کہ غیر مذہب کے قدیمی مندروں کو گرایا جائے۔ ہماری اطلاع میں یہ بات لائی گئی ہے کہ بعض حاکم بنارس اور اس کے گرد ونواح کے ہندوؤں پر ظلم وستم کرتے ہیں اور اُنکے مذہبی معاملات میں دخل دیتے ہیں اور ان برہمنوں کو جن کا تعلق پرانے مندروں سے ہے اُنکو اُنکے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے لہذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آئندہ کوئی شخص ہندوؤں اور برہمنوں کو کسی وجہ سے بھی تنگ نہ کرے اور نہ اُن پر کسی قسم کا ظلم کرے[۱]" یہ فرمان ابو الحسن حاکم بنارس کے پاس سلطان محمد بہادر کی معرفت بھیجا گیا تھا۔

[۱] راجہ نرین سین نے ایشیاٹک سوسائٹی کے جلسہ میں پیش کیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ روزنامہ خلافت ۱۸ اگست ۱۹۲۶ء

الگزنڈر۔ کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ ہندوستان میں لکھتا ہے (جلد اوّل سفرنامہ صؒ ۱۲۷ و صؒ ۱۲۸)

(ط) دربارہ ٹھٹھہ سندھ در عہد اورنگ زیب۔

"ریاست کا مسلّمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانہ میں کرتے تھے جبکہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی وہ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں لیکن ان کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہروں کے مُردوں کے ساتھ ستی ہوں۔

(ی) اسی سفرنامہ جلد اوّل صؒ ۱۶۳ میں دربارہ شہر سورت مذکور ہے۔

"اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی سخت جھگڑے اُن کے اعتقادات و طریقۂ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقہ سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلاف مذاہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے۔ پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ وہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں" (از ترجمہ سفرنامہ موسومہ ہندوستان عہد اورنگ زیب میں۔ از نواب سمیع اللہ بیگ صاحب چغتائیؒ چیف جج ہائی کورٹ حیدرآباد۔ دکن)

(نوٹ) یہ شخص (کپتان الگزنڈر ہملٹن) زمانہ شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم میں ہندوستان آیا تھا اور ۲۵ برس ہندوستان میں رہا تھا۔ مگر کمپنی کا ملازم نہ تھا۔

اورنگ زیب۔ ٹی ڈبلیو آرنلڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اپنی تصنیف پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں (ترجمہ صؒ ۲۷۵)

(ک)

اورنگ زیب کے فرامین اور مراسلات کے ایک قلمی مجموعہ میں جو ابھی تک طبع نہیں ہُوا ہے مذہبی آزادی کا وہ جامع اور مانع اصول درج ہے جو ہر ایک بادشاہ کو غیر مذہب کی رعایا کے ساتھ برتنا ضروری ہے۔ جس واقعہ کے متعلق یہ اصول بیان ہُوا ہے وہ یہ ہے کہ:۔

"عالمگیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ وہ پارسی ملازموں کو جو کہ تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے اس علت میں برخاست کر دیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور اُن کی جگہ کسی تجربہ کار معتبر مسلمان کو مقرر کیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں آیا ہے۔
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ (الآیۃ)

عالمگیر مرحوم نے عرضی پر مندرجہ ذیل حکم لکھا:۔

"مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے اور اس قول کی تائید میں یہ آیت نقل کی ہے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ط بادشاہ نے لکھا جو آیت عرضی نویس نے نقل کی ہے اگر یہی سلطنت کا دستور العمل ہوتا تو ہم کو چاہیئے تھا کہ اس ملک کے سب راجاؤں اور اُن کی رعیت کو غارت کر دیتے مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ بادشاہی نوکریاں لوگوں کو اُن کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملیں گی اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتیں۔

(دعوت اسلام ترجمہ پریچنگ آف اسلام صٓ ۲۷۸)

(ل) شہنشاہ جہانگیر مرحوم اپنی کتاب تزک جہانگیری صفحہ ۸۲ میں فرمانات شاہی کی تفصیل دیتا ہوا اپنے امراء کو مندرجہ ذیل الفاظ بھی لکھتا ہے۔
"اور بزور کسی کو مسلمان نہ کریں"

مندرجہ بالا شہادتیں صاف صاف روشنی ڈالتی ہیں کہ مسلمانوں کا عہد حکومت تعصب مذہبی اور فرقہ واریت سے پاک تھا۔ اس میں مساویانہ اور برابری کا سلوک تھا۔ ہر ہندوستانی کو خواہ کسی مذہب اور کسی برادری اور نسل سے تعلق رکھتا ہو حسب قابلیت حصہ ملتا تھا۔ کسی عہدہ انتظامی، فوجی، ملکی کا دروازہ کسی کے لئے بند نہ تھا۔ سب سے لطف واحسان اور رحم وکرم اور ہمدردی کا معاملہ کیا جاتا تھا۔ تمام مذاہب کے ساتھ دریا دلی اور رواداری کا معاملہ ہوتا تھا۔ بادشاہوں کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ مختلف

مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھا جائے اور اُن میں اتحاد عمل پیدا کیا جائے۔ سب کی ترقی اور خوشحالی و فارغ البالی کا انتظام اور خیال رکھا جاتا تھا۔ ہر مذہب اور ملّت کے ساتھ عدل و انصاف مراحم خسروانہ اور الطاف شاہانہ برتا جاتا تھا۔ ظلم و ستم، ستانا اور تنگ کرنا بغیر کسی جُرم قانونی کے روا نہ رکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان بادشاہوں نے رعیت کے دلوں میں جگہ کر لی تھی۔ بادشاہ لوہے کی سنگینوں اور تلواروں اور آگ و بارود کی بندوقوں اور توپوں سے حکومت نہیں کرتا تھا۔ تمام امور حکومت میں رعایا کو دخل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ میں ہندوستان دن دُگنی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اور ضرب المثل امن عام ملک میں پھیلا ہوا تھا۔

(س) میجر باسو کہتا ہے:۔ رعایا کی خوشحالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دَور حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے دولت مندی اور آرام وچین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلاشبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔ حالانکہ اُس زمانہ میں رسل و رسائل کے طریقے اس زمانہ جیسے ملک میں نہ تھے۔ ریلیں اور تار، موٹریں اور ہوائی جہاز، دخانی جہاز، ٹیلیفون وغیرہ معدوم تھے۔ مگر انگریزی حکومت بالکل اس کے برعکس تھی اور ہے جیسا کہ ہم اوپر لارڈ ولیم بینٹنگ وائسرائے ہند کا قول نقل کر آئے ہیں وہ لکھتا ہے برخلاف اس کے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری، خود غرضی، بے پروائی ہے۔ جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمراں ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔"

(ع) سرجان سلیوان (مدراس گورنمنٹ کا ممبر) کہتا ہے: "وہ لوگ (باشندگان ہند) ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائیگی کے لئے وہ مجبور کئے جاتے ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ قوانین کو جن کی تعمیل اُن پر فرض ہوتی ہے مرتب کرنے میں اُن کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اپنے ملک کے انتظام میں اُن کا کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا اور ان حقوق کے دیئے جانے سے اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ ان میں اس قسم کے فرائض کے انجام دینے

کے لئے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی کمی ہے۔"

(رپورٹ سلیکٹ کمیٹی صا۴۰۲ دت جلد ۲ حکومت خود اختیاری صنا۳)

خلاصہ یہ ہے کہ ہندو مصنفین انہیں وجوہ سے جو کہ واقعی اور صحیح تھیں اور جن کا مشاہدہ اور معاملہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور اپنے باپ دادوں سے سن کر یقینی طور پر جانتے تھے مسلمانوں کے عہد حکومت کی تعریفیں کرتے تھے اور انگریزوں کے عہد کی عیب جوئی کرتے تھے۔ ایلیٹ صاحب آنکھوں میں دھول جھونک کر اور واقعات کو چھپا کر اور مسخ کر کے بلکہ فرضی اشیاء درمیان میں لا کر چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد حکومت کو ظالمانہ اور انگریزوں کے عہد حکومت کو نرم اور منصفانہ ثابت کریں۔ حالانکہ انگریزوں نے بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدوں پر آخر تک کسی ہندوستانی کو فائز نہیں ہونے دیا۔ اور وہ وہ انسانیت سوز اور برباد کن کارروائیاں کرتے رہے کہ جن کی مثال متمدن دنیا میں نہیں ملتی ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایلیٹ صاحب کو پرانے زمانے کے ہندو مسلمان مورخوں پر ہی غصّہ نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ ہندوستانیوں پر بھی غصّہ ہے جن کے لئے تحقیر کے طور پر وہ بابو کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اب ہم اُن شاندار بابوؤں کی کچھ نہ سُنیں گے جنہیں ہماری گورنمنٹ کے عہد میں حد درجہ آزادی اور بہت سے سیاسی حقوق حاصل ہیں جو کبھی کسی مفتوح قوم کو نہیں دیئے گئے۔ جو ملکی ہمدردی کا دم بھرتے اور اپنی موجودہ ذلّت کا رونا روتے ہیں۔ اگر وہ تاریخ میں غوطہ لگائیں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جس زمانے کے واپس آنے کی وہ تمنّا کرتے ہیں اُس میں اگر وہ محض زبان سے ان لغویات کو ظاہر کرتے تو اُنہیں سیسہ پلا دیا جاتا یا دیوار میں چُن دیا جاتا۔ اب ہم بلا لگان آراضی کے متعلق شور و غوغا سُننے پر مجبور نہ ہوں گے درانحالیکہ تاریخ کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے کہ پہلے زمانہ میں کوئی ملکیت ایسی نہ تھی جو قانوناً ضبط نہ ہو سکتی اور نہ ہوتی ہو۔"

مورّخ کی بڑی تعریف یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ نفسانیت، ذاتیات اور خود غرضانہ جذبات سے بالاتر ہو کر لکھے۔ برخلاف اس کے جو کتاب محض دو قوموں میں منافرت پھیلانے کی غرض سے لکھی جائے اور لکھتے وقت صاف الفاظ میں کہا جائے کہ قدیم تاریخوں میں کچھ نہیں

ملنا بلکہ واقعات سے اپنے حسب منشاء نتائج نکالے جاتے ہیں۔ جو مورّخ اپنوں اور غیروں سب پر اس بات سے ناراض ہو کہ فلاں زمانے یا فلاں قوم کی کیوں تعریف کی جاتی ہے، ہندوؤں پر اس لئے ناراض ہو کہ مسلمانوں کی سلطنت جانے پر مسلمان بادشاہوں کی برائی نہیں کرتے اور ہمارے زمانہ کی خوبیوں کی تعریف کرنے کی جگہ اُس کی عیب جوئی کرتے ہیں اور اپنے مقصد کو صریح الفاظ میں لکھ دے کہ اس کی غرض بابوؤں کی تردید اور انگریزوں کی سلطنت کے فوائد ذہن نشین کرنا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے شخص کی تصنیف کا شمار تواریخ میں کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہندوستانیوں کی قسمت اُسی روز پھوٹ گئی جبکہ اس قسم کی کتابوں کی بناء پر دیسی زبانوں میں تاریخیں لکھی گئیں۔ اسکولوں میں جاری کی گئیں اور رفتہ رفتہ وہی جھوٹ اور افتراء پردازیاں موجودہ تاریخ کا جزء بنا دی گئیں چنانچہ یہی وہ تعلیم ہے جس کا پھل چکھنے سے ہندوستان میں مذہبی افتراق پیدا ہو اس کی تصدیق سرجان بینارڈ ممبر اگزیکٹو کونسل پنجاب کے سینئر ممبر کے حسب ذیل قول سے ہوتی ہے جس کو اس نے لندن کے ایک جریدہ موسومہ معاملات خارجیہ میں شائع کیا تھا۔

"ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے۔ جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت قائم نہ ہو سکتی نہ برقرار رہ سکتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں میں عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ظالم بادشاہ گذرے ہیں جن میں سے کسی نے غیر مسلموں پر جزیہ لگایا اور کسی نے ذبیحہ گاؤ پر مجنونانہ جوش میں آکر سزائیں دیں لیکن یہ واقعات گاہے گاہے پیش آتے تھے۔ شجر علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا خواہ ہندو یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف بہ پرستش ہوتے تھے۔" (ان ہیپی انڈیا مصنفہ لالہ لاجپت رائے ص۴۰۸۔ روشن مستقبل ص۲۳۶)

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا پھل تھا جس کے چکھنے سے مذہبی افتراق پیدا ہوا اس کا جواب صاف یہ ہے کہ نہ علوم قدیمہ میں کوئی ایسی بات تھی جس سے مختلف قوموں میں افتراق ہوتا نہ علوم جدیدہ میں کوئی ایسا مضمون تھا جس سے ہندو مسلم فسادات ہوتے

اور نہ عام تاریخوں میں ایسی سمیّت تھی بلکہ سمیّت جو کچھ تھی وہ اس قسم کی تاریخوں میں تھی جس کی ابتداء ایلیٹ صاحب نے کی تھی۔ اُن کے بعد مسٹر کیمسن ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے اسی نوعیت کی ایک تاریخ لکھی جس کی شکایت سر سیّد احمد خاں نے کی ہے۔ اسی قسم کی کتابیں اسکولوں کے درس میں داخل کی گئیں۔ اُن کے ترجمے اُردو میں کرا کے تمام ملک میں پھیلائے گئے جنہوں نے ملک کے امن کو باہمی خلفشار اور کشاکش میں بدل دیا اسی قسم کی فضا میں ملک میں فرقہ وارانہ اور نام نہاد سیاسی جماعتیں پیدا ہوئیں جو ملک کی سیاسی ترقی میں مزاحم ہو کر غیر ملکی حکومت کی بالواسطہ امداد کرتی رہتی تھیں۔ (روشن مستقبل ص ۲۴)

ان تاریخی کتابوں اور اس قسم کے پروفیسروں اور مدرسوں نے گزشتہ بادشاہوں اور راجاؤں کو متعصب، کٹر مذہبی، مذہبی دیوانے وغیرہ الفاظ سے ملقب کر کے تحریروں اور تقریروں میں زہر پھیلا کر ملک کی فضا کو نہایت زیادہ گندا کیا۔ نوعمر، جوشیلے، ناتجربہ کار ناواقف طلبہ کے سادہ اور صاف قلوب ان زہریلے مواد سے ایسے زہر زدہ ہو گئے کہ اُن کی اصلاح باوجود کھلی بربادی اور نہایت مضرت رساں نتائج دیکھنے اور اقرار کرنے کے نہیں ہوتی اور نہ دلوں کی صفائی ہوتی ہے۔ اسی کی شکایت ڈبلیو ایم ٹارانس اپنی کتاب "ایشیا میں شہنشاہیت" میں کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"سیواجی کو متعصب اور سلطان ٹیپو کو کٹر مذہبی کہا جاتا ہے۔ لیکن جس وقت ہم نے جنوبی ہند کی ریاستوں میں دخیل ہونا شروع کیا اس وقت اُن کے یہاں اس قسم کے مذہبی تنفر کا کہیں نام تک نہ تھا جس طرح انگلستان اور یورپ کے تقریباً سب حصّوں میں مخلوق کو تباہ کرنا روا رکھا جاتا تھا۔ جب آئرلینڈ میں کوئی رومن کیتھولک نہ اپنے بزرگوں کی جاگیر کا حق دار سمجھا جاتا تھا نہ فوج کا افسر ہو سکتا تھا۔ جب سویڈن میں سوائے لوتھر کے معتقدین کے اور کسی عقیدہ کا کوئی ملازم نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹھیک اس وقت ہندوستان کے اندر ہر شہر اور شاہی دربار میں ہندو مسلمان عزت اور سرمایہ کمانے میں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں آزاد تھے۔"

گزشتہ شہادتیں جو کہ نہایت صحیح ہیں بتلاتی ہیں کہ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اورنگ زیب اور دیگر سلاطین مغلیہ اور اسی طرح سیواجی اور سلطان ٹیپو اور دوسرے

نواب اور راجہ فرقہ وارانہ تعصبات نہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے نہ اپنے احکام شاہی اور اپنے درباروں میں استعمال کرتے تھے۔ ہاں حکومت اور ملک کے لئے بے شک لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ مگر ہندو راجاؤں کے ساتھ مسلمان اور مسلمان بادشاہوں اور نوابوں کے ساتھ ہندو فوجی افسری اور ملکی نظام میں شریک رہتے تھے اور ہر ایک کو دوسرے پر اعتماد ہوتا تھا۔ جہانگیر اپنے تمام توپ خانہ کو راجہ بکرما جیت کی کمان میں رکھتا ہے۔ مرہٹے اپنی تمام توپ خانہ کی قوت کو ابراہیم کردی کے زیر کمان رکھتے تھے۔

"توپ خانہ ایسی اہم چیز ہے کہ اُس پر لڑائی کا تمام تر دار و مدار ہوتا ہے چنانچہ آج تک انگریزوں نے اپنے توپ خانہ کو ہندوستانیوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ بہرحال اُس لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ میں جبکہ مرہٹے ہار گئے اُس وقت احمد شاہ ابدالی نے مسلمان توپچیوں کو اُن کی مردانگی اور نمک حلالی پر بڑی داد دی اور اُن سے خواہش کی کہ وہ احمد شاہ کی فوج میں آجائیں اس پر مسلمانوں نے جواب دیا کہ اُن کے آقا ہاریں یا جیتیں وہ اُن کا ساتھ چھوڑ کر دوسری جگہ نہیں جا سکتے"۔ (حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۲)

اورنگ زیب مرحوم جس کو انگریزوں نے بعد میں متعصب مشہور کیا اور پھر سرکار جادو نے بھی انگریزوں کی ہمنوائی کی ہم اُس کے متعلق مسٹر آرنلڈ کی تاریخی شہادت اور دوسرے مورخین کی شہادتیں پیش کر چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت فراخ حوصلہ اور دریا دل غیر متعصب بادشاہ تھا۔ ہفت ہزاری منصب پر اکبر کے یہاں صرف ایک ہندو فائز ہوتا ہے مگر عالمگیر کے یہاں اس منصب پر ایک فہرست میں دو اور دوسری میں تین ہندو امراء نظر آتے ہیں اُس کے سپہ سالاروں میں جے سنگھ، جسونت سنگھ ساہو پسر مہاراجہ سبنتا راجندجی داماد سیواجی مالوی بھونسلہ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ سیواجی کے مقابلہ کے لئے جے سنگھ سپہ سالاری کرتا ہوا پہنچتا ہے اور اس کو قید کرتا ہے۔ سیواجی معافی طلب کرتا ہے تو عالمگیر اس کو معاف کر دیتا ہے۔ انگریزی قانون اور عملدرآمد میں تو صرف سازش (کانس پریسی) پر سڈیشن ایکٹ کے تحت موت یا کالے پانی کی سزا دینی ضروری ہو جاتی ہے۔ بغاوت کے تحقق پر تو ٹھکانا ہی نہیں۔ مگر سیوا کھلی بغاوت کرتا ہے اور بادشاہی قلمرو کو لوٹتا اور فوجوں سے مقابلہ کرتا ہوا ہزاروں کا خون بہاتا ہوا پکڑا جاتا ہے مگر معافی مانگنے پر دوم مرتبہ چھوڑ دیا جاتا ہے اور خلعت پاتا ہے۔ تیسری مرتبہ پھر بغاوت

کرتا ہے اور گرفتار ہو کر بادشاہ کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ اورنگ زیب اس کو قتل نہیں کرتا بلکہ قلعہ میں قید کر دیتا ہے جہاں سے کچھ عرصہ کے بعد وہ فرار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تمام نوابوں اور بادشاہوں کا حال تاریخ میں موجود ہے۔ سلطان ٹیپو کا دیوان معتمد سرداار پورنیا ایک برہمن تھا۔ سراج الدولہ (نواب بنگال) کا صدر دیوان (وزیر اعظم) موہن لال تھا پٹنہ کا گورنر رام نرائن تھا۔ آصف الدولہ (نواب اودھ) کا وزیر اعظم جھاؤ لال تھا۔ روہیلہ نواب حافظ رحمت خاں کا وزیر اعظم راجہ مان رائے تھا۔ اور اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا راؤ پہاڑ سنگھ ہوا۔ نواب کو اس قدر اعتماد تھا کہ نوابوں اور گورنر جنرل کے پاس ایلچی بنا کر اُن کو بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ تاریخ روہیلکھنڈ معروف بہ حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۲۸۸ کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

(ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ) طرز حکمرانی اور ذاتی حالات کے ضمن میں ہم نے عام رعایا کے ساتھ حافظ الملک کے حسن سلوک اور اُن کی عطا کردہ مراعات کا تذکرہ کیا ہے وہ محض مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص نہ تھیں بلکہ ہندو بھی اُن سے مستفید ہوتے تھے۔ شریعت اسلامیہ کے سچے اور پکے پیرو ہونے کے باعث اور اسلام کے پاک اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی وجہ سے حافظ الملک اپنی اُس رعایا کو جو امن پسند تھی اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی میں خلل اندازی نہ کرتی تھی ہر طرح کا آرام پہنچانا اور اُس کے لئے ترقی کی راہیں کھولنا اپنا فرض ایمانی سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو اپنے فرائض مذہبی کی ادائیگی میں پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ آئے دن بڑے بڑے مندروں اور دوسری عبادت گاہوں کی تعمیر ہوتی تھی اور حکومت کسی قسم کی مزاحمت نہ کرتی تھی۔ مذہبی تہوار بدستور قدیم بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے منائے جاتے تھے اور مسلمانوں کی جانب سے کسی طرح کی روک ٹوک نہ ہوتی تھی۔ گائے باجا اور محرم و رام لیلا کے قضیوں کا وجود نہ تھا۔ اور روہیلوں کے ابتدائے زمانہ حکومت سے انتہا تک کسی ہندو مسلم فساد کا پتہ نہیں ملتا۔ پہلا ہندو مسلم فساد دارالحکومت بریلی ۱۸۳۷ء میں ہوا جبکہ روہیلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

مخالف و موافق مورخین کی تمام مستند تاریخوں کی ورق گردانی کر لی جائے لیکن کوئی ایک واقعہ نظر سے نہ گذرے گا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہندوؤں نے اس سرزمین

میں اپنی غالب اکثریت کے باوجود من حیث القوم مسلمان حکمرانوں کے خلاف کوئی مذہبی بغاوت کی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ طاقتور حکومت کا خوف اس امر میں مانع ہوا ہو لیکن ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں تو روہیلہ حکومت کو زوال ہوئے عرصہ گزر چکا تھا پھر جب حافظ الملک کے پوتے خان بہادر خاں نے ازسرِنو روہیلہ حکومت قائم کرنا چاہی تو اُن کی تقریباً ساٹھ ہزار فوج میں بہ تعداد کثیر ہندو شامل تھے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ روہیلوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں کس قسم کا سلوک کیا ہو گا۔ جس کی خوشگوار یاد نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔

علماء صوفیہ اور مشائخ بطور خود مذہبی تبلیغ کرتے تھے لیکن تبلیغ حکومت کے فرائض میں شامل نہ تھی۔ نہ حکومت کی طرف سے اس کام کے لئے روپیہ دیا جاتا مسلمانوں کی اعلیٰ معاشرت کو پسند کرکے یا اُن کے عمدہ مذہبی اصولوں کو بہتر سمجھ کر اگر کوئی ہندو اسلام قبول کرتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ خود ہندوؤں میں زمانہ حال کی طرح اُس زمانہ میں تبلیغ مذہب کا طریقہ رائج نہ تھا ورنہ اس کی یقیناً ممانعت نہ ہوتی۔ اور جس طرح عہد قدیم میں اسلامی حکومت سے پہلے ہندو راجاؤں نے اپنی اپنی مملکتوں میں عرب کے مبلغ مذہب تاجروں کو مسجدیں بنانے اور تبلیغ اسلام کی اجازت دینے میں پس و پیش نہ کیا اسی طرح مسلمان حکمراں ہندوؤں کو اپنا مذہب پھیلانے کی اجازت دے دیتے میں مطلق تکلّف نہ کرتے۔

اگر روہیلے زبردستی ہندوؤں کو مسلمان بنانے تو آج روہیلکھنڈ میں ہندوؤں کی نہیں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ روہیل کھنڈ کے صدر مقام یعنی خاص ضلع بریلی اور دارالاقامت پیلی بھیت تک میں ہندوؤں کی آج تک زبردست اکثریت ہے اور تمام ضعیف العمر ہندو اپنے تجربہ سے اور اپنے اسلاف کے اقوال سے یہی بیان کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے طرزِ عمل میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں اور انہوں نے کبھی ہندوؤں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا۔ مذہبی آزادی کے علاوہ ہندوؤں کو زراعت و تجارت میں بھی گرانقدر مراعات و حقوق حاصل تھے بلکہ مسلمان تو بالعموم فوجی ملازمت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ زراعت و تجارت تمام و کمال ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوؤں کی بعض قومیں مثلاً کھتری، ٹھاکر اور راجپوت فوج میں نوکری

کرتے تھے، وثیش خزانچی کے عہدوں کے لئے موزوں سمجھے جاتے تھے اور کایستھ اہل قلم ہونے کے باعث حکومت کے تمام دفاتر میں ملازم تھے۔ سفارت کے اہم اور نازک فرائض بھی بالعموم ہندو معتمدین کے سپرد کئے جاتے تھے۔ چنانچہ حافظ الملک نے منشی ٹیک چند اور منشی چتر بھوج کو بارہا بڑی بڑی اہم سفارتوں پر بادشاہ دہلی، مرہٹوں جاٹوں، شجاع الدولہ اور انگریزوں کے پاس روانہ کیا۔ دیوان کا عہدہ جو مدارالمہام یا وزیر اعظم کے برابر سمجھا جاتا تھا خصوصیت کے ساتھ ہمیشہ ہندوؤں کے ہاتھ میں رہا پہلے راجہ مان رائے حافظ الملک کے دیوان رہے اور اُن کے بعد راؤ پہاڑ سنگھ اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے جن کی جاگیر میں کم و بیش (۴۰۰) گاؤں تھے ان لوگوں کے حافظ الملک سے نہ صرف برادرانہ اور عزیزدارانہ تعلقات تھے بلکہ یہ لوگ اُن کے جملہ مالی اور ملکی معاملات میں سیاہ و سپید کے مالک اور غیر معمولی اختیارات کے حامل تھے حافظ الملک کی مجلس مشاورت جس میں اہم معاملات طے پاتے تھے اُس میں ہندو اعیان دولت بھی شریک ہوتے تھے جن کی موجودگی کے بغیر کوئی مجلس انعقاد پذیر نہ ہوتی تھی اور اُن کی رائے کو بڑی وقعت دی جاتی تھی۔

حافظ الملک کی نظر میں اللہ کی تمام مخلوق یکساں طور پر عزیز تھی۔ جب وہ بذل و احسان کرتے تو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کون ہندو اور کون مسلمان ہے۔ شہر پناہ، پیلی بھیت کی تعمیر کا واقعہ لکھا جا چکا ہے، میواتیوں اور مارواڑیوں کے واسطے جن میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو تھے محض وجہ معاش مہیا کرنے کے لئے اُنہوں نے کس طرح ایثار و قربانی سے کام لیا۔ اسی طرح ۱۱۶۵ھ میں آتشزدگی اور زلزلہ سے شہر بریلی پر تباہی آئی تو اُنہوں نے جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا وہی ہندوؤں کے ساتھ کیا۔ ایک اور واقعہ ہے کہ حافظ الملک جب صاحبزادہ ارادت خاں کی شادی کر کے شاہجہانپور سے لوٹ رہے تھے تو پہلی منزل پر کسی رسالدار کا ایک ہندو ملازم کارپردازان رسد کے پاس آیا اور اُس نے بیس سیر آٹا اور بیس سیر گھی طلب کیا۔ کارپردازوں نے اُس سے دریافت کیا کہ تم تنہا ہو یا تمہارے ہمراہ اور لوگ بھی ہیں۔ تم کس امیر کے ملازم ہو اور کیا کام کرتے ہو۔ اُس ہندو نے اپنے رسالدار کا نام بتایا اور کہا کہ میرے ساتھ دس اور آدمی ہیں اور یہ گھی رسالدار صاحب کے گھوڑوں کے واسطے لئے جاتا ہوں۔ میں

خود رسالدار کے کہاروں میں ملازم ہوں۔ اتفاقاً جس رسالدار کا نام لیا گیا اُس کے ملازم اُسی وقت تمام اشیاء مطلوبہ لیجا چکے تھے۔ لہٰذا کارپردازوں کے دل میں شک پیدا ہوا اور انہوں نے تحقیق حال کے لئے ایک شخص کو اس رسالدار کے پاس بھیجا۔ تحقیق کے بعد اُس ہندو ملازم کا جھوٹ اور فریب کھل گیا۔ چنانچہ اس کو فوراً پکڑ کر حافظ الملک کے حضور میں لے گئے اور تمام واقعہ عرض کیا۔ حافظ الملک نے حکم دیا کہ اس شخص کو پچیس سیر آٹا اور پچیس سیر گھی دیا جائے اور فرمایا کہ اس قسم کی تحقیقات سے جو غریب لوگوں کے واسطے موجب خجالت ہوتی ہے آئندہ پرہیز کیا جائے۔ حافظ الملک کی اسی رحم دلی، بیدار مغزی، روشن خیالی، بے تعصبی اور انصاف پسندی کا نتیجہ تھا کہ اُن کی ہندو رعایا نے بھی اپنے قابل احترام آقا کے لئے وفاداری کی مثال قائم کر دی۔ جس وقت تمام مسلمان عزیز و اقارب اور سرداروں نے حافظ الملک کی جان بچانے کے لئے روپیہ فراہم کرنے سے انکار کر دیا اُس وقت دیوان پہاڑ سنگھ کا چالیس لاکھ روپیہ کا پیش کش کرنا اور جب نہایت بے سروسامانی میں حافظ الملک نے وطن عزیز کی خاطر جنگ آزادی کے لئے علم جہاد بلند کیا اُس وقت جوق در جوق راجپوتوں کا آکر شریک حال ہونا ایسے واقعات نہیں ہیں جن کو دنیا جلد فراموش کر سکے گی۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن کو تاریخ عالم میں ہمیشہ آب زر سے لکھا جائے گا۔

نیز رنجیت سنگھ کے وزیر اور معتمد خاص پیرزادہ عزیز الدین تھے۔ اور اس کے توپخانہ کے افسر اعلیٰ الٰہی بخش تھے اسی نام سے توپ خانہ موسوم تھا۔ یہی نہیں کہ ان دنیادار بادشاہوں اور نوابوں اور راجاؤں کے یہاں آپس میں ایک دوسرے پر اسقدر اعتماد تھا بلکہ مذہبی لوگوں میں بھی یہی اعتماد اور وثوق تھا۔ سکھوں سے لڑائی میں حضرت سیّد احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے توپ خانہ کا چارج راجہ رام راجپوت ہندو کو دے رکھا تھا جس نے اتمان زئی کی جنگ میں سکھوں پر بہت سخت گولہ باری کر کے سکھوں کو شکست دی۔" (دیکھو شاندار ماضی ۱۹ صفحہ ۸ از سوانح احمدی ص۱۱۰)

غرض کہ زمانہ ماضی ہر دو فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت زیادہ اعتماد اور وثوق اور میل جول اور رواداری کا تھا۔ ہندوستان میں مختلف مذہبوں اور عقیدوں کے لوگ ملی جلی آبادیوں میں مثل عزیزوں اور رشتہ داروں کے امن کے ساتھ

پکارتے تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء تک مذہبی اور ملی اختلاف کا عوام میں وجود نہ تھا۔ جب فوجوں میں بغاوت اور انقلابی تحریک شروع ہوئی تو ہر مقام کے سپاہی اپنی اپنی چھاؤنیوں میں آگ لگا کر اور برباد کر کے دہلی کے معزول اور معطل بادشاہ بہادر شاہ مرحوم کی طرف دوڑ پڑے۔ سپاہی بہار تک سے آئے۔ ان میں ہر ملّت اور مذہب کے ہندوستانی تھے۔ ہندو سپاہی بھی بہادر شاہ کی جے پکارتے تھے۔ اگر موجودہ زمانہ کے سے تعصبات اُس وقت ہوتے تو مسلمان سپاہی مسلمان بادشاہ یا نواب کے پاس ہی جاتے اور ہندو سپاہی کسی راجہ کے پاس جاتے مگر سب کے سب بلا تفریق مذہب و ملّت معزول اور بے جان مسلمان بادشاہ کے گرد جمع ہو گئے (۱) مہاراجہ بٹھور عرف نانا صاحب مرہٹہ کانپوری نے کانپور پر قبضہ کیا تو بہادر شاہ کا سبز جھنڈا لہرا کر اُن کے نام پر ایک ایک سو توپوں کی سلامی دی (۲) عظیم اللہ خاں پیشکار نانا صاحب کی نسبت مشہور ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کی اسکیم انہیں کے دماغ کا نتیجہ تھیں۔ بڑا قابل اور انگریزی داں شخص تھا۔ نانا صاحب کی طرف سے اُن کے مقدمہ کی پیروی کے لئے انگلستان گیا تھا اور وہاں سے رُوس بھی گیا تھا (۳) تانتیا ٹوپی مرہٹہ نے کالپی میں جنگ آزادی میں حصّہ لیا اور کانپور میں نانا صاحب کی سپہ سالاری کی خدمات انجام دیں (۴) رانی جھانسی نے کمپنی کی فوج پر قبضہ کر کے شاہ دہلی کا پرچم لگایا اور خود گھوڑے پر چڑھ کر انگریزوں کے خلاف بہادری سے جنگ کی (۵) راجہ کنور سنگھ رئیس جگدیش پور صوبہ بہار اسی سال کی عمر میں انگریزوں سے لڑے اور انگریزی فوج کو مسلسل شکستیں دیں جس سے لارڈ کیننگ وائسرائے گھبرا گئے۔ جب بنارس میں لارڈ مارک کی فوج سے مقابلہ ہوا تو راجہ صاحب بجلی کی طرح اِدھر سے اُدھر کوندتے پھرتے تھے۔ بلیا کے قریب گنگا پار کرتے ہوئے اُن کے داہنے ہاتھ میں گولی لگی تو بائیں ہاتھ سے اُسے تلوار سے کاٹ کر پٹی باندھ دی تاکہ زہر نہ پھیلے اور آٹھ ماہ کی جنگ کے بعد اس ضعیف العمر سپاہی نے اپنی راجدھانی پر قبضہ حاصل کر لیا مگر زخم کی تکلیف سے انتقال کر گیا (۶) خان بہادر خان نواب روہیلکھنڈ کے آخری وارث تھے اُنہوں نے اپنے اعلان میں اس بات پر زور دیا کہ انگریز ہمیشہ وعدہ خلافی اور جائدادوں کی ضبطی کرتے رہتے ہیں۔ اور ہندو مسلمانوں کو لڑاتے رہتے ہیں اب دونوں کو مل کر اُن کے خلاف لڑنا چاہیئے۔ وہ روہیلکھنڈ پر قابض ہو کر خوب لڑے۔ اسی طرح بیگم

حضرت محل زوجہ واجد علی شاہ بخت خاں سپہ سالار نواب نجیب خاں اور مولانا احمد اللہ شاہ وغیرہ نے جنگ آزادی میں بہت کچھ کارنمایاں کیئے۔

ان واقعات سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ جو ظلم و ستم اور جبر و تعدی پچھلی سلطنتوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ نہ صرف غلط ہیں بلکہ حالت اس کے برعکس ہے (جیسا کہ ہم پہلے دکھلا چکے ہیں) ورنہ بادشاہ سے رعایا کی اس قدر گرویدگی کی جبکہ اس کی سلطنت جاتی رہی تھی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس طرح نیتاجی پنڈت سبھاش چندر بوس جیسے تعلیم یافتہ غیر مسلم کا بہادر شاہ کی قبر پر جاکر آنسو بہاتا اور اظہارِ عقیدت کرنا ان ان افسانوں کے غلط ہونے کی دلیل ہے۔

(دیکھو روشن مستقبل صفحہ ۷۷، ۷۸ و ۷۹، ۸۰ و ۸۱)

باوجودیکہ انگریزوں کا نفاق ڈالنے کا اصول پہلے سے چلا آتا تھا مگر ۱۸۵۷ء میں ہندو مسلمان عوام الناس جنگ آزادی میں یکساں شریک ہوئے۔ یہ بات انگریزوں کو بہت زیادہ کھٹکی اس لئے اُس وقت سے وہ اور زیادہ اس فکر میں رہے کہ دونوں قوموں کے درمیان کوئی مستقل خلیج پیدا کردیں جس سے یہ لوگ آپس میں کبھی نہ مل سکیں اس لئے مذکورۂ تاریخیں بطور پروپگنڈہ ایلیٹ اور کیمسن صاحبوں کی لکھی گئیں اور ان میں ہندوؤں پر مسلمان بادشاہوں کے مظالم دکھائے گئے پھر وہ اور اُن کے ترجمے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل کرکے نواجوان طلبہ کو پڑھائے گئے علاوہ ازیں جُداگانہ انتخاب اور مسلم لیگ اور مہاسبھا کی بنیاد، نیز قربانی گاؤ اور مساجد کے سامنے باجے کی ممانعت وغیرہ بھی اُسی کے ذرائع اور وسائل قویہ ہیں۔ نیز آفسوں میں ملازمتوں کا اُتار چڑھاؤ ہمیشہ سے اُس کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کی تاریخیں انگریزی درسگاہوں میں پڑھانے اور دوسری تدبیروں کے عمل میں لانے سے ہندو مسلمانوں میں جُدائی کی کوششیں قوی کردی گئیں۔

(۲) لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی ۱۴ مئی ۱۸۵۹ء میں ایک یادداشت میں لکھتا ہے "نفاق ڈال کر حکومت کرنا رومیوں کا اصول تھا اور یہی اصول ہمارا بھی ہونا چاہیئے۔

(حکومت خود اختیاری ص۵۵ از ان ہیپی انڈیا)

(۳) اس سے پہلے کارنے ٹیکس نے رسالہ ایشیاٹک جرنل میں ۱۸۲۱ء میں لکھا تھا۔

"لارڈ اور حکومت کرزن کا مقولہ ہماری ہندوستانی حکومت کا اصل اصول ہونا چاہیئے عام اس سے کہ وہ سیاست یا تمدن یا فوج کشی کے متعلق ہو۔" (حکومت خود اختیاری ص۵۲)

(۴) مسٹر ایڈورڈ ٹامسن اپنی کتاب "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" میں لکھتا ہے۔

"برٹش سیاست کو مدِنظر رکھتے ہوئے تو ہم نے مسٹر گلیڈسٹون اور لارڈ سالبری جیسے مشہور زمانہ مدبرین کے خیالات کو چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ وقت کی ضرورت اُن کے برخلاف حکم دیتی تھی لیکن ہندوستان کے متعلق ہم ابھی تک اُسی فرسودہ پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستانیوں میں نااتفاقی اور باہمی اختلاف کو زندہ رکھنا قدیم سے ہمارے سیاست دانوں کا نہایت مرغوب مشغلہ بنا ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان اتفاق اور اتحاد کی ضرورت کا بیش از بیش احساس نہایت تیزی سے کر رہا ہے۔"

(انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ مترجم ص۱۰۸)

(۵) مندرجہ ذیل سوال و جواب میں میجر جنرل اسمتھ کے ۔سی بی کی عجیب و غریب شہادت ملاحظہ فرمائیے۔

سر ولیم ڈگبی از ترجمہ پراسپرس برٹش انڈیا ص۱۰۹۔

سوال ۵۶۴۳ کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کر سکتے ہیں کہ دیسیوں کو اپنی طاقت کا علم نہ ہو۔

(ج) میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چند کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں جیسے آج کل برائے کی بادشاہت کہتے ہیں اس لئے جوں ہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے اُن کے قومی اور مذہبی تفرقے دُور ہو جائیں گے جس کے ذریعے سے ہم نے اب تک اس ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا علیٰ ہذا القیاس تعلیم کا اثر یہ ہوگا کہ اُن کے دل بڑھ جائیں گے اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی۔

(۶) مسٹر چرچل مورخہ ۲۷ جون ۱۹۳۲ء کو تقریر کرتے ہیں۔

"وزیر اعظم (مسٹر میگڈانلڈ) نے طے کر لیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ دیں گے میرے نزدیک اس میں سخت خطرہ ہے۔ اگر انہوں نے جملہ جماعتوں کے خوش کرنے کی کوشش کی تو وہ کسی کو خوش نہ کر سکیں گے اہل روم کا اصول تھا کہ نفاق ڈال کر حکومت کرو۔ لیکن ہم نے بالاتفاق طے کر لیا ہے کہ یہ اصول نامناسب ہے مگر اسی کے ساتھ اس اصول کو بھی اختیار نہ کرنا چاہیے جو اس کے برعکس ہو اور وہ یہ ہے کہ رعایا کو متحد کر دیا جائے جس کا نتیجہ سلطنت سے دست کشی ہوگا۔ دراصل یہ ایک بڑا خطرہ ہے اور اندیشہ ہے کہ ہم اس بڑے خطرہ میں نہ پڑ جائیں۔" (لیڈر اخبار مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۳۲ء)

(۷) سر جان بینارڈ "یہ ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔" (ان ہیپی انڈیا صد ۳۰۸ روشن مستقبل صد ۲۳۱)

(۸) آنریبل امبکا چرن مزمدار کہتا ہے "اوّل اوّل اپنی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا اور اس کے بعد ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت کا موجب ہوا۔" (ہندوستان کا قومی ارتقاء صد ۲۴۷ روشن مستقبل صد ۱۵۵)

اس طریقہ پر افسوں اور عہدہ ہائے حکومت میں سخت نفاق پھیلایا گیا۔

خلاصہ یہ کہ ہندوستان میں قدیم سے ہندو مسلمان سکھ پارسی اور دیگر اقوام ہمیشہ سے ملے جلے عزیزوں اور رشتہ داروں کی طرح رہتے اور آپس میں رواداری بلکہ اتحاد و اتفاق سے چلے آتے تھے مگر انگریزوں نے اپنے مفاد اور خود غرضی کے لئے اس کو خطرہ جان کر مختلف تدبیروں سے نفاق ڈلوایا اور آپس میں ایک دوسرے کو لڑانا اختیار کیا کبھی ایک جماعت پر دست شفقت پھیرا اور کبھی دوسری پر اور اس ذریعہ سے مختلف ملتوں میں رقابت پیدا کر کے حسد، عناد، مذہبی کشت و خون کی صورتیں پیدا کیں۔ اگرچہ مسٹر چرچل کہتے ہیں کہ ہم نے بالاتفاق اس طریق کو نامناسب جان کر ترک کر دیا ہے۔ مگر ایڈورڈ ٹامسن اپنی کتاب میں اقرار کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں میں نااتفاقی اور اختلاف کو زندہ رکھنا قدیم سے ہمارے سیاست دانوں کا نہایت ہی مرغوب مشغلہ بنا ہوا ہے واقعی یہی صحیح ہے اور خود مسٹر چرچل بھی ہندوستانیوں کے

اتحاد کو نہایت ہی مبغوض سمجھتے اور برطانوی اقتدار کے لئے موت شمار کرتے ہیں روزمرّہ کے مشاہدات بتلا رہے ہیں کہ آج بھی ہندوستان میں یہی کھیل برٹش حکام کھیل رہے ہیں اور اگرچہ پہلے کے بوئے ہوئے زہریلے بیج سالہا سال کے لئے بلکہ ایک صدی یا اس سے زائد کے لئے کافی تھے مگر اب بھی برطانوی حکام اس میں پوری جدوجہد عمل میں لا رہے ہیں۔ لارڈ ویول کے متعلق خود انگلینڈ میں اُس کے انکشافات اخبارون میں آرہے ہیں۔ اور مسٹر آر۔ ایس رونیکار آف سی پی اپنے مشاہدات اور تاثرات ۱۹/نومبر ۱۹۴۶ء کو الفاظ ذیل میں انگلستان سے واپسی پر ذکر کرتے ہیں۔

"سوئزرلینڈ، آئرلینڈ اور برطانیہ کے دوران میں مجھے سرکردہ لیڈروں، قانون دانوں، جرنلسٹوں اور تاجروں سے ملنے کا موقعہ ملا۔۔۔ جب میں لندن میں تھا تو میں نے یہ افواہیں سُنیں کہ کچھ کنسرویٹو ہندوستان کے فسادات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ وہ ہندوستان میں فسادات کرنے کے لئے رجعت پسند عناصر کو مالی امداد بھی دے رہے ہیں۔ ان دنوں وہاں یہ افواہ بھی گشت لگا رہی تھی کہ کنسرویٹو پارٹی کا ایک ایلچی فسادات کرانے کے لئے ہندوستان روانہ ہو چکا ہے۔" (پرتاپ لاہور مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۴۶ء جلد ۲۷ عــ ۱۲۱)

مسٹر لوئی فنشر (مشہور امریکن مصنّف) لندن سے بذریعہ تار ایک آرٹیکل ہندوستان بھیجتا ہے جو کہ ۲/ستمبر ۱۹۴۶ء کو اسٹنڈرڈ کلکتہ میں شائع ہوتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ چرچل اور جناح میں گذشتہ مہینوں ہندوستان کی قسمت کے بارے میں نامہ و پیام ہوا کیا ہے ان دونوں نے نہایت ہی رازدارانہ طور پر آپس میں خط و کتابت اور راز و نیاز کی باتیں کی ہیں۔ یہ واقعہ چرچل کے ایک ایسے ہی نہایت خفیہ خط پانے کے بعد ظہور میں آیا کہ مسلم لیگ نے وزارتی وفد کی تجاویز پر دوبارہ غور کیا اور دستور ساز اسمبلی کے مقاطعہ کا فیصلہ کر دیا جو آزاد ہندوستان کا دستور بنانے والی ہے۔ برطانی مشن نے ان تھک کوشش کی کہ سیاسی طاقت برطانیہ کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کو منتقل کرنے کا راستہ صاف کردے مگر چرچل اور جناح دونوں ان کوششوں کو ناکام بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ مسٹر جناح

کے نئے طرز پالیسی کا پھل کلکتہ میں لوٹ، موتیں اور قتل وغارت گری کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ الخ"

(۱۱) عہد شکنی۔ غدّاری اور خود اپنے اعلانات کی خلاف ورزی

انگریزوں کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے کہ ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لو اور ضرورت پوری ہو جانے پر باپ کو گدھا بنا دو۔ نہایت نرم اور خوش آیند الفاظ بول کر دھوکہ دینا اور سیدھے سادھے لوگوں پر قبضہ کرنا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا ہے۔ ایشیائی اور افریقی اقوام اُن کے اس دام فریب میں گرفتار ہو کر ہمیشہ نقصان اُٹھاتی رہی ہیں اس مکاری اور دغابازی میں برطانوی قوم اتنی ماہر ہے کہ یورپ کی دوسری قومیں بھی اُن کو نہیں پہنچ سکیں۔ یہی حال ہندوستان کی غلامی اور بربادی کا باعث ہوا چنانچہ۔

(۱) خان بہادر خاں جو کہ نواب روہیلکھنڈ کے آخری وارث تھے اُنہوں نے اپنے اعلان جنگ ۱۸۵۷ء میں اسی بات پر زور دیا تھا کہ انگریز ہمیشہ وعدہ خلافی اور جائدادوں کی ضبطی کرتے رہے ہیں اور ہندو مسلمانوں کو لڑاتے رہتے ہیں۔ اب دونوں کو مل کر اُن کے خلاف لڑنا چاہئیے وہ روہیلکھنڈ پر قابض ہو کر خوب لڑے (یہ اُس آزادی کی لڑائی کا اعلان تھا جو کہ ۱۸۵۷ء میں عمل میں لائی گئی اور جس کو انگریزوں نے غدر کے نام سے مشہور کیا) (ہندوستان کی سیاسی ترقی صفحہ ۵)
(روشن مستقبل ص ۷۹)

(۲) نواب اودھ واجد علی شاہ کو جبکہ ۴ فروری ۱۸۵۶ء میں صوبہ اودھ کے الحاق کا حکم سُنایا گیا جس میں اُن کی وفاداری تسلیم کی گئی اور صرف بدنظمی کے الزام میں انہیں معزول کیا گیا (درآنحالیکہ بدنظمی خود کمپنی کے طرز عمل کا نتیجہ تھا) تو اُنہوں نے سر تسلیم خم کرکے وضعداری کی تکمیل کر دی۔ اور فرمایا کہ میں تو خادم ہوں کوئی سرکشی نہ کروں گا۔ البتہ حکومت انگلستان سے چارہ جوئی کروں گا۔ اُس کے بعد اُنہوں نے افسروں اور فوج کو اپنی ملازمت سے علیحدہ کر کے اُنہیں ہدایت کی کہ وہ حکومت برطانیہ کی اطاعت اور عزت کریں۔ مگر اطاعت کا نتیجہ ہوتا ہے انصاف

ذرائع توسیع مملکت اور تحصیل دولت اور زرکشی کے قائم کئے۔ معاہدوں کو توڑنا حلیف اور تابعدار ریاستوں پر نئے نئے بہانوں اور تشددات سے قبضہ کرنا، جابرانہ قوانین خود بنا کر ملک میں نافذ کرنا، کسی شرمناک اور انسانیت سوز حرکت کو برا نہ سمجھنا وغیرہ وغیرہ روزمرّہ کا مشغلہ تھا۔ سندھ بغیر کسی وجہ کے قلمروِ انگریزی میں ملا لیا گیا۔

افغانستان میں فوجیں رکھنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ برہما کا بچا کھچا حصّہ پنجاب، اودھ اور دوسری چھوٹی ریاستیں براہِ راست کمپنی کی حکومت میں لے لی گئیں۔ متبنیٰ کے قانون کو غیر قابلِ اعتبار قرار دے کر اُن جملہ ریاستوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا گیا۔ جن پر والیِ سابق کا متبنیٰ حسبِ دستورِ ہندوستان قابض تھا۔ ایسے امور کی بناء پر عام ناراضی پھیل گئی تھی جو کہ ۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک کی باعث یا ممد و معاون بنی۔ اسی بناء پر کوئن وکٹوریہ کے اعلان میں دفعہ ۳ مندرجہ ذیل الفاظ میں رکھی گئی۔

"جو ملک ہمارے قبضہ میں ہے اسے زیادہ کرنا نہیں چاہتے اور جب ہم کو یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی شخص ہماری مملکت یا حقوق میں دست اندازی کرے تو ہم بھی پیش قدمی کی اپنی طرف سے بہ نسبت ملکیت یا حقوق اوروں کے اجازت نہ دیں گے اور والیانِ ہند کے حقوق و منزلت اور عزّت مثل اپنے حقوق و منزلت اور عزّت کے عزیز سمجھیں گے۔"

مگر اس شہنشاہی اعلان کو بھی ذمّہ داران برطانیہ نے توڑ تاڑ کر رکھ دیا اور خلاف ورزی کرنے میں انتہائی جسارت کو عمل میں لاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب تک اپنی کمزوری کا کچھ احساس یا مخالف طاقتوں کا خوف رہا جب تک تو اس پر قائم رہے۔ مگر جوں ہی یہ یقین ہو گیا کہ اب ہم کو کسی مخالف طاقت کا خوف نہیں ہے اور نہ ہم میں کوئی کمزوری باقی ہے تو توسیع ملک اور قبضہ ممالک کا سودا سوار ہو گیا۔ خود انگلستان میں توسیع مملکت کی تحریک شروع ہوئی اور وائسرائے ہند کو حکم دیا گیا کہ وہ مغربی شمالی سرحد پر پیش قدمی کرے۔ اس وقت وائسرائے ہند

ایسی بلند جو انسانی عظمت کا مطمح نظر ہو سکتی ہے عام روایات کے مطابق اپنے عمدہ طرزِ عمل۔ پاک باطنی اور ماہر علوم مشرقیہ ہونے کے باعث بہت ہر دلعزیز و محترم تھی۔ اُس کی یہ خوبیاں اور نیز یہ امر کہ اُسی کے سندات کے طفیل میں ہم نے تمام ہندوستانی مقبوضات حاصل کیا۔ اُس کو سر بازار فروخت کرنے سے نہ روک سکے۔ اُسی کے نام کا سکّہ چلتا ہے۔ اُسی کے نام سے عدل و انصاف کیا جاتا ہے ملک کے طول و عرض میں اُسی کے نام کا تمام عبادت گاہوں میں خطبہ پڑھا جاتا ہے لیکن پھر بھی اُسے بیچ ڈالا گیا۔ ایک سلطنت عطا کر دینے والے معطی اور بکثرت قوموں کے جائز حکمران کیواسطے اُس کے شاندار عطیات میں سے صرف دو ضلعے کوڑہ اور الہ آباد بطور شاہی ملک محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ لیکن ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ (خراج بنگال و بہار) کا زرِ خراج بند کر دینے کے بعد یہ اضلاع بھی اُس کے وزیر شجاع الدولہ کے ہاتھ فروخت کر دیئے گئے۔ اس معاملہ کا سب سے مذموم پہلو جو کچھ لوگوں کو نظر آئے گا وہ یہ ہے کہ ان دو ضلعوں کا سودا بھی بشکل محض دو سال کے لئے کیا گیا۔ افسوس کہ اب یہ تیموری شہزادہ اپنی معمولی ضروریات زندگی پوری کرنے سے بھی عاجز ہے اور اس کی موجودہ لاچاری میں ہم بخشش کے طور پر بھی اُسے کچھ نہیں دے سکتے۔"

(ہندوستان اور عہد کمپنی کی صحیح تاریخ رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا مؤلفہ میجر بی۔ ڈی باسو جلد اوّل۔ از حیات حافظ رحمت خاں مرحوم صفحہ ۱۹۹)

(۵) عہد نامہ ہسٹنگز و شجاع الدولہ دربارہ الہ آباد و کوڑہ "قرار پایا کہ چونکہ بموجب عہد نامہ الہ آباد۔ مورخہ ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء اضلاع کوڑہ اور الہ آباد بادشاہ کو اُن کے اخراجات کے لئے دے دیئے گئے تھے اور ان اضلاع پر بادشاہ نے اپنا قبضہ چھوڑ کر انگریز کمپنی اور وزیر کے مفاد کے خلاف اُن کی سند مرہٹوں کو دیدی اور چونکہ یہ فعل مذکورہ عہد نامہ کی منشاء کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ مقامات کمپنی ہی کو جس سے بادشاہ نے انہیں حاصل کیا تھا واپس ہو گئے اور اب وزیر اور کمپنی کے درمیان یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اضلاع مذکور کو ان شرائط کے ساتھ وزیر کے قبضہ میں دے دیا جائے گا کہ وہ سکہ رائج الوقت اودھ کے

پچاس لاکھ روپیہ کمپنی کو دیں گے جس کی ادائیگی کا یہ طریقہ ہوگا کہ بیس لاکھ روپیہ فوراً نقد اور دو سال بعد پندرہ پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ دو قسطوں میں ادا ہوگا"
(ہسٹنگز اینڈ دی روہیلہ وار از حیات حافظ رحمت خاں مرحوم ص ۱۱۸)

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اس معاہدہ میں کس قدر جھوٹ اور فریب اور دیدہ دلیری سے کام لیا گیا ہے۔ جس پر برک کی سابق تقریر روشنی ڈالتی ہے۔

(۶) ۱۸۳۳ء میں تاج برطانیہ نے ایک طرف تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت سے روک کر بیس سال کے لئے صرف ملک گیری اور حکومت کا فرمان اور پٹہ دیا اور دوسری طرف مندرجہ ذیل اعلان کیا۔

اور قانون بنایا جاتا ہے کہ ممالک مذکورہ کے کسی باشندے کے لئے یا ملک معظم کی کسی رعیت کے لئے جو ممالک مذکورہ میں سکونت پذیر ہوں کمپنی کا کوئی عہدہ، کوئی خدمت اور کوئی ملازمت مذہب، جائے ولادت نسل یا رنگ کی بناء پر ممنوع نہ ہوگی"

مگر اس عہد و پیمان شاہی اور اعلان تاج برطانی کی ہمیشہ خلاف ورزی کی گئی اور کبھی بھی اس کو شرمندۂ عمل نہیں کیا گیا۔ وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"۱۸۳۳ء کا مسودہ قانون جو پارلیمنٹ نے منظور کیا ہے اتنا مبہم ہے اور دیسی باشندوں کے متعلق حکومت ہند کی ذمہ داریاں محتاج تشریح رکھتا ایسی بیّن غلطی ہے کہ قانون منظور ہوتے ہی اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے اور حکومت ہند اس کی پابندی سے گریز کرنے کی تدابیر کرنے لگی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے روز افزوں طبقے نے (جس کی ترقی میں حکومت ساعی رہتی ہے مگر اُس کی خواہشات پوری نہیں کر سکتی) اس قانون کی دفعات کا مطالعہ کیا ہے اور دل پر نقش کر لیا ہے اب اس قانون کی رُو سے اگر کسی ہندوستانی کو ایک بار ایسا عہدہ مل جائے جو پہلے سول سروس والوں کے لئے مخصوص تھا تو اُس کو یہ توقع اور دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ ترقیات کا زینہ بالتدریج طے کرنے کے بعد بڑے سے بڑے عہدہ پر اُس کا تقرر ہو سکتا ہے۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ یہ حقوق اور توقعات نہ کبھی

پوری کی جائے گی نہ کی جا سکتی ہیں۔ گویا ہمارے سامنے اس وقت دو راہیں تھیں یعنی ممنوع کر دینا یا فریب دینا اور ہم نے وہ وہ راہ اختیار کی جس میں راست روی سب سے کم تھی۔ مقابلے کے امتحان جیسے کہ انگلستان میں رائج ہیں ہندوستانیوں کے لئے مقرر کرنا یا شرکت امتحان کے وقت اُمیدواروں کی قید عمر میں تخفیف کر دینا وہ عریاں حیلے ہیں جو بالقصد اس کے لئے اختیار کئے گئے ہیں کہ اس قانون کو مفلوج اور معطل کر دیا جائے۔ چونکہ یہ تحریر خفیہ ہے اس لئے بلا تامل میں کہنے کو تیار ہوں کہ میرے نزدیک ہندی اور برطانوی دونوں حکومتیں ابھی تک اس الزام کا معقول جواب نہیں دے سکتی ہیں کہ انہوں نے ہندوستانیوں کے کان تک تو ایک وعدہ جانفزا پہنچا دیا لیکن اُن کے قلوب کو ایفاء کی مسرّت سے محروم رکھنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ (حکومت خود اختیاری صفحہ ۴۴ و ۴۵)

(۷) ڈیوک آف آرگل کہتا ہے:۔

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہم ادائے فرض سے قاصر رہے اور ہم نے جو وعدے اور پیمان کئے تھے پورے نہیں کئے۔" (حکومت اختیاری صفحہ ۴۵)

(۸) اسی سلسلہ میں لارڈ سالبری کہتا ہے:۔

"دوستو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس گندم نمائی اور جو فروشی سے فائدہ کیا ہے۔"

(۹) مذکورہ بالا اعلان ۱۸۳۳ء جبکہ بتایا گیا اور پاس ہو کر مشتہر ہوا تو ممبران پارلیمنٹ (ہاؤس آف کامنس) نے نہایت زوردار الفاظ میں اس کی معقولیت اور ضرورت کو تسلیم کیا تھا بلکہ لارڈ میکالے نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی زوردار تائید کی تھی۔

"ممکن ہے کہ ہمارے نظام حکومت کے سایہ میں ہندوستان کی سیاسی ذہنیت اس قدر نشوونما پا جائے کہ خود اس نظام کے اندر نہ سما سکے۔ ممکن ہے کہ بہتر حکومت کے ذریعہ سے ہم اپنی رعایا میں بہتر حکومت کی صلاحیت پیدا کر دیں اور مغربی علوم سے آشنا ہونے کے بعد آئندہ کسی عہد میں

وہ مغربی اداروں کا مطالبہ کرنے لگیں۔ وہ دن کبھی آئے گا یا نہ آئے گا مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اس کو روکنے یا ٹالنے کی ہرگز کوشش نہ کروں گا اور جب کبھی یہ دن آئے گا تو برطانیہ کی زندگی میں وہ دن سب سے زیادہ فخر و مباہات کا دن ہوگا۔"

مگر حسب پیشگوئی لارڈ میکالے جبکہ ہندوستانیوں نے تعلیم میں اس قدر کامیابی حاصل کرلی کہ امتحان مقابلہ میں وہ انگریزوں کو شکست دینے لگے تو زوردار کوشش ہونے لگی کہ انگریزوں کے لئے سول سروس کے عہدے مخصوص کردیئے جائیں۔ ذمہ داران حکومت نے ضروری سمجھا کہ اس اعلان کو عمل میں لانے سے گریز کیا جائے اور حیلوں اور بہانوں سے اس کو مفلوج کردیا جائے۔ چنانچہ عرصہ دراز تک جس کی مقدار تقریباً بیس سال ہوتی ہے ہندوستانی عہدہ ہائے عالیہ سے اس کے بعد بھی بالکل محروم رہے۔ آخرکار احتجاجی آوازیں اُٹھیں، شکایات کے بازار گرم ہوئے، پروٹسٹو کی بھرمار ہوئی، حق طلب اور حق کوش زبانوں اور قلموں نے فضا کو اپنی گونج سے مکدر کردیا تو آسمان انگلینڈ سے کڑکتی ہوئی آواز آئی کہ ہندوستانی نالائق ہیں عہدہ ہائے عالیہ کی قابلیت نہیں رکھتے۔ مگر وہ ہندوستانی دماغ اور قلم، اور وہ مشرقی قلب اور گردہ جس کے دماغی اور عملی بہترین کارناموں سے تاریخ قدیم بھری پڑی ہے اور جس کی تصدیق خود یورپین مورخین کرچکے ہیں کب دب سکتا تھا اور کب ایسی لچر اور لوچ بات پر سکوت کرسکتا تھا چنانچہ باربار جوابات اور سوالات کی بھرمار ہوتی رہی تو حسب عادت کمیشن بٹھایا گیا۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ عدم قابلیت کا عذر بالکل غلط اور محض بہانہ ہی بہانہ اور حیلہ سازی ہے اُن کا عہدوں سے محروم ہونا صرف ہندوستانیت اور کالے رنگ ہونے کی بناء پر اور نسلی امتیاز کی وجہ سے ہے۔ سرارسکن پیری (جس نے اس تحقیقات قابلیت میں شہادت دی تھی) کہتا ہے کہ "ہندوستانی مجوزین کی قوتِ فیصلہ کمپنی کے ان ججوں سے جو اپیل سنتے تھے بدرجہا بہتر تھی۔"

سرجان سلیور (مدراس گورنمنٹ کا ممبر کہتا ہے :-

"وہ لوگ (باشندگان ہند) ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائیگی کے لئے وہ مجبور کئے جاتے ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ قوانین کو جن کی تعمیل اُن

پر فرض ہوتی ہے مرتب کرنے میں اُن کی کوئی آواز نہیں ہوتی اپنے ملک کے انتظام میں اُن کا کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا اور اُن کے حقوق دیئے جانے سے اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ اُن میں اس قسم کے فرائض انجام دینے کے لئے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی کمی ہے۔"

(دت ص۴۰۲ جلد ۲)

لارڈ ڈلہوسی ۱۸۶۷ء میں کہتا ہے:۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس فرض کو ادا کریں جو ہندوستان کی طرف سے ہم پر عائد ہے تو ہم اسی طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ ملک میں جتنے اشراف و اکابر ہیں اُن کی امداد اور مشورہ سے فائدہ اُٹھائیں۔ یہ جواب کہ ہندوستانی دماغ میں تدبر اور قابلیت کا سرمایہ ناکافی ہے ایک بے معنی لغویت ہے"

(۱۰) بہر حال مذکورہ بالا اعلان ۱۸۳۳ء کے ایفاء کی مدبرین برطانیہ کی طرف سے برابر عملی مخالفت ہوتی رہی اور طرح طرح کے جھوٹے حیلوں سے اُس کو ٹالا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں انقلابی تحریکات کی آگ کے نشوونما پانے کے وجوہ میں سے یہ وجہ بھی تھی۔ اس لئے ۱۸۵۸ء کے اعلان وکٹوریہ میں اس امر کو اور بھی زیادہ قوت کے ساتھ سراہا گیا۔ یہ اعلان نہ صرف ملکہ وکٹوریہ (تاج برطانیہ) کی طرف سے تھا بلکہ دار العوام (ہاؤس آف کامنس) اور دار الامراء (ہاؤس آف لارڈس) اور مذہبی طبقہ (کلیسا) کی طرف سے متفقہ تھا اس کی دفعہ ۶ میں مندرجہ ذیل الفاظ تھے:۔

" اور یہ بھی ہمارا حکم ہے کہ جہاں تک ممکن ہے ہماری سب رعیت کو گو کسی قوم اور مذہب کی ہو بلا تعرض و طرف داری کے ہماری ملازمت میں اُن عہدوں پر جن کو وہ اپنی علمیت اور قابلیت اور دیانت سے انجام دے سکتے ہوں مقرر کرتے رہیں۔"

۱۸۵۸ء کا یہ شہنشاہی اعلان بہ نسبت ۱۸۳۳ء کے پارلیمنٹری اعلان کے نہایت زوردار اور تاکیدی الفاظ کے ساتھ وسیع اور واضح پیمانہ پر واقع ہوا تھا مگر کیا اسکو عملی جامہ پہنایا گیا اور اُس کے ایفاء کا خیال کیا گیا۔

مسٹر ہیرلڈ کاکس کا آرٹیکل مندرجہ سنڈے ٹائمز لندن اس کو بتلائے گا۔ اس کے

اقتباس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :۔

"مسٹر گاندھی کے طرزِ عمل میں برطانی حکومت کی طرف سے ایک بیّن انقلاب رُونما ہو گیا ہے اُس کی وجہ موجودہ برطانی تدبّر کی ناکامی ہے کہ وہ اس مساویانہ عدل وانصاف کی عزت نہیں کرتے جس کا ملکہ معظمہ کے عہد حکومت میں اعلان کیا گیا تھا۔ آج اس اعلان کا حوالہ دینا ضروری ہے کہ اس کی مسلسل خلاف ورزی نے ہی یہ دن دکھایا کہ سلطنت کو نازک ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے"۔ اعلان کے الفاظ یہ تھے۔

"باعتبار رنگ، نسل، مذہب یا زبان قانون کسی میں فرق وامتیاز نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کے تحفّظ کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا کہ ہر ایک سے غیر جانبدارانہ سلوک ہو" (اخبار فتح مورخہ ۱۵/ اپریل ۱۹۲۱ء)

لالہ لاجپت رائے آنجہانی ۱۹۱۶ء میں تحریر کرتے ہیں کہ "اس قسم کے اعلان کو پچانوے سال گذر چکے ہیں مگر آج تک بھی اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا (توتنو) روپیہ سے (ہزار) روپیہ تک عہدوں پر کل چار فی صدی ہندوستانی مقرر ہیں باقی ماندہ چھیانوے فی صدی عہدوں پر انگریز اور اینگلو انڈین فائز ہیں۔ حالانکہ وہی ہندوستانی جو انگریزی عمل داری میں نالائق قرار دیئے گئے ہیں، ہندوستانی ریاستوں میں وزارت اور مدار المہامی کے کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں الخ (حکومت خود اختیاری صلا)

ایک ہزار یا اس سے زائد تنخواہ والے عہدوں تو ہندوستانیوں کا پہنچنا تقریباً محال ہی رہا۔ ہر قسم کے احتجاجات ہوتے رہے۔ مگر فوجی اعلیٰ عہدے اور سول سروس وغیرہ کے بڑے بڑے عہدے انگریزوں کے لئے ہی مخصوص رکھے گئے۔ یہ صرف عملی کوتاہی نہیں تھی بلکہ ہمیشہ ذمہ داران برطانیہ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ ایسے ایسے قوی اعلانات شاہی اور پارلیمنٹ پاس شدہ تجاویز کو پائے استحقار سے ٹھکراتے ہی رہے۔

اسی بناء پر پھر اہل ہندوستان کو مطمئن کرنے کے لئے ۱۸/ اگست ۱۹۱۷ء کو ملک معظم کا مشہور اعلان حکومت خود اختیاری کی بابت شائع کیا گیا۔ جس میں ہندوستانیوں کو ذمہ دار حکومت دینے کا وعدہ تھا۔ اور اس سے اگلے دن اعلان کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کو فوجی کمیشن کے اعلیٰ عہدے دیئے جایا کریں گے۔ مگر یہ اعلانات بھی پا در ہوا ثابت ہوئے

اور چار مہینہ ہی کے بعد رولٹ کمیٹی مقرر کی گئی جو کہ صلح اور آشتی کے بالکل منافی تھی جس کے نتیجہ میں سیتہ گرہ، قتل غارت گری ظہور پذیر ہوئے۔ بے گناہوں پر ہوائی جہازوں سے بم گرائے گئے۔ مگر جبکہ ترک موالات (نان کوآپریشن) کے موثر حربہ نے گورنمنٹ کے دانت کھٹے کر دیئے تو ڈیوک آف کیناٹ کو بھیج کر ہندوستانیوں کو دلاسا دیا گیا۔ ڈیوک موصوف نے اپنی تقریر میں جو کہ ۹/ فروری ۱۹۲۱ء کو جدید اسمبلی کے افتتاح کے وقت ملک معظم کی طرف سے کی گئی تھی فرمایا۔

"سالہا سال سے بلکہ چند نسلوں سے ہمدردانِ ملک اور وفادار ہندوستانی اپنی بھارت ماتا کے لئے سوراج کا خواب دیکھ رہے تھے۔ آج میری سلطنت میں آپ کے لئے سوراج کی ابتداء ہو رہی ہے اور آپ کو ترقی کے وسیع ترین اور اعلیٰ درجہ کے موافق مل رہے ہیں جن سے میری نوآبادیات کے مانند آزادی حاصل ہو۔"

نیز دوسری تقریروں میں ڈیوک موصوف اور وائسرائے نے صاف الفاظ میں فرمایا کہ:۔

"اب مطلق العنان حکومت کا اصول قطعی طور پر ترک کر دیا گیا۔ پس اس وقت سے ہندوستان معتد بہ درجہ میں اپنا بوجھ خود اٹھائے گا۔"

(روشن مستقبل ص ۲۶۹)

(۱۱) مگر افسوس کہ ان جملہ اعلانات بعیدہ اور قریبہ موکدہ اور غیر موکدہ کو جس طرح پہلے سے توڑنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اب بھی جاری رہا۔ اگر کبھی کچھ مشکلات پیش آئیں تو زوردار الفاظ میں مواعید اور عہود کو دہرایا گیا اور جب اطمینان کی سانس آنے لگی تو سب کو توڑ تاڑ کے رکھ دیا گیا۔ چنانچہ مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ ہاؤس آف کامنس (دارالعوام) میں ۲/ اگست کو تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اگر پہلے سے یہ بات صاف نہیں ہے تو میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری غرض اصلاحات دینے سے یہ نہیں ہے کہ انجام کار ہم اپنی امانت سے بالکل دست بردار ہو جائیں جو بات خاص طور پر میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندوستانی بحیثیت جماعت مقننہ کے یا بہ حیثیت مدبرانِ ملک کے

خواہ کیسے ہی کامیاب کیوں نہ ہوں مگر میرے نزدیک کوئی زمانہ ایسا نہ ہوگا کہ اُن کا کام انگریزی عہدہ داروں کی ایک تھوڑی سی تعداد کے بغیر چل سکے گا جو ساڑھے اکتیس کروڑ کی آبادی میں کل بارہ سو ہیں "

نیز وزیر اعظم موصوف نے اسی تقریر میں یہ بھی فرمایا:-

"انگریز افسران ملازمت کی تمام عمارت کے لئے بمنزلہ فولادی قالب کے ہیں اگر اُس قالب کو ہٹا لیا جائے تو تمام عمارت منہدم ہو جائے گی"

مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ اور ممبران پارلیمنٹ کی بدعہدی اور دیدہ دلیری کو ملاحظہ فرمائیے کہ مندرجہ بالا تقریر کس قدر غداریوں اور عہد شکنیوں سے بھری ہوئی علانیہ عمل میں لائی گئی ہے جس نے گزشتہ تمام شاہی اور پالیمنٹری اعلانات جو کہ دربارہ حقوق اہل ہند متعلقہ ملازمتوں اور آزادی ہند وغیرہ تھے سب کو یک قلم پاش پاش کر دیا۔ اور پھر کوئی مخالف آواز ہاؤس سے نہیں نکلی۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم اس زمانہ میں وزیر ہند کی کونسل کے ممبر لندن میں موجود تھے اس عہد شکن تقریر سے نہایت زیادہ متاثر ہوئے اور ۳ اگست ۱۹۲۳ء کو اور پھر ۴ اگست کو دو زبردست چٹھیاں وزیر ہند کو بطور احتجاج لکھیں اور درخواست کی کہ وزیر اعظم کے پاس بھیجدی جائیں۔ ان میں نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا کہ وزیر اعظم کی یہ تقریر شاہی اعلان ۱۹۱۷ء اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء اور شاہی اعلان ۱۹۲۱ء کے کس قدر منافی تھی۔ حکومت کو کون سی ضرورت پیش آئی کہ ۱۹۲۱ء کے اعلان کے صرف ڈیڑھ سال بعد اس تقریر کے ذریعہ انہیں کالعدم کر دیا گیا۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنی چٹھی میں یہ بھی دکھایا تھا کہ "قانون گورنمنٹ ہند ۱۹۱۹ء کے الفاظ یہ تھے۔

"پارلیمنٹ کی پالیسی جس کا اعلان کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کی تعداد مسلسل بڑھائی جائے تاکہ اس سے برٹش انڈیا میں بحیثیت سلطنت برطانیہ کے ایک اہم جز کے ذمہ دار حکومت کا مسلسل احساس پیدا ہو"

جب مندرجہ بالا الفاظ میں کوئی قید کسی قسم کی نہ تھی تو اب بارہ سو انگریز عہدہ داروں کی کیوں قید لگائی جاتی ہے اور جبکہ وہ ہمیشہ مسلط رہیں گے تو ہندوستانیوں میں

خود اپنا انتظام کرنے کی قابلیت کیسے پیدا ہو گی"
(روشن مستقبل باب نہم صفحہ ۳۷۳ تا ۳۷۵)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم نے بہت کچھ زور لگایا مگر لاٹھی کی طاقت کے سامنے حجت اور دلیل کہاں چل سکتی ہے۔ اور سرکاری برطانوی افراد کے ذاتی منافع کے سامنے ہندوستانیوں کے مفاد اور حقیقی فرائض سلطنت اور عہود کے ایفاء کی کیا پرواہ کی جاسکتی ہے۔ یہاں تو خود غرضیوں اور اپنے حلوے مانڈے کی فکر ہے۔ اور بے ایمانی اور عہدہ شکنی ذخیرہ ہے جس کے ذریعہ سے ہمیشہ انسانی شرافت کا خون بہایا گیا ہے۔

(۲۱) توسیع مملکت کے متعلق ۱۸۵۷ء کا شاہی اعلان اور اس کی خلاف ورزی | یوں تو لوٹ کھسوٹ اور زرکشی کی انتہائی اور روزافزوں حرص انگریزوں میں اُسی وقت سے تھی جب سے کہ وہ ہندوستان میں وارد ہوئے تھے بلکہ یہی چیز اُن کے انگلستان چھوڑ کر سفر کرنے کی باعث ہوئی تھی۔ مگر جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء سے اس میں چار چاند لگ گئے تھے اُنہوں نے ایک طرف تو تجارت کے بڑھتے ہوئے وسائل سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا اور دوسری طرف ملک گیری اور اقتدار و غلبہ سے غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار خوب گرم کیا۔ رؤسا اور عام پبلک کو اس دَور میں جن جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اُن کو بجز علام الغیوب کوئی نہیں جانتا۔ ان دونوں حیثیتوں کے جمع ہو جانے سے کمپنی کو بے شمار فوائد اور ہندوستانیوں کو بے شمار اسباب ہلاکت و بربادی کا سامنا کرنا پڑا بالآخر ہندوستان اور یورپ میں آوازیں اُٹھیں اور بالخصوص اُن انگریز تاجروں کی طرف سے جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں حصہ دار نہیں تھے اور ان کو کمپنی کے اقتدار کی بناء پر من مانی کارروائی کا موقعہ نہیں ملتا تھا بالآخر ۱۸۳۲ء میں تاج برطانیہ کی طرف سے کمپنی کو حقوق تجارت سے روک دیا گیا اور صرف ملک گیری اور حکمرانی کا چارٹر دیا گیا کہ جس کی وجہ سے تجارتی ذرائع سے جو سونے اور چاندی کے دریا کمپنی کے گھروں میں بہتے تھے اُن کے دہانے خشک ہو گئے۔ منہ کو انسانی خون لگ جانے کے بعد درندے کی حرص و آز انتہائی زور پر ہو جاتی ہے اس لئے یہ سپید بھیڑئیے کہاں صبر کر سکتے تھے اُنہوں نے طرح طرح کے نئے نئے اطوار و

اور مراعات اور وعدوں کے ایفاء کا جن کی حکام گورنمنٹ اپنی مسلسل کامیابیوں کے زعم میں ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ وہ وعدے یہ تھے کہ نواب صاحب کی معزولی کے وقت تعلقداران اودھ شاہی خاندان اور وابستگانِ دربارِ دولت کو یہ اُمید دلائی گئی تھی کہ اُن کے حقوق محفوظ رکھے جائیں گے مگر ہوا یہ کہ برخلاف سرکاری اعلانات کے مال گزاری میں اضافہ شروع کیا گیا۔ اور بجائے تعلقداروں کے براہِ راست آراضی کے قابضوں سے بندوبست کی کارروائی کی جانے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے تعلقداروں کی آمدنیاں آدھی کے قریب رہ گئیں۔ شاہی خاندان کے لوگوں کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کیا گیا تھا اُس کا پتہ لارڈ اسٹینلی کے مراسلہ مورخہ ۱۲، اکتوبر ۱۸۵۸ء سے چلتا ہے جس میں تحریر تھا۔

"شاہی خاندان کے لوگوں اور وظیفہ خواروں کے ساتھ بے تمیزی کا برتاؤ کیا گیا اور وظائف روک دیئے جانے سے اُن کا حال پتلا ہو گیا۔ سابق ملازموں اور با اثر لوگوں کو خاص طور پر ملازمتوں اور عہدوں سے محروم کیا گیا جن کے وہ متوقع تھے (فوجی بغاوت از لفٹیننٹ جنرل میک لوڈ امینس صفحہ ۳۷) (روشن مستقبل صفحہ ۲۰۷)

(۳) مسٹر پیٹر فریمین ممبر پارلیمنٹ و صدر کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ کہتے ہیں (از انڈین نیوز لندن) برطانیہ عہد و پیمان کے ذریعہ ہندوستان پر ہندوستان کے بھلے کے لئے حکومت کرنے کا پابند ہے۔ لیکن کیا ہم نے اس عہد کی پابندی کی ہے۔ میں نے اُوپر جو واقعات و حقائق بیان کئے ہیں وہ اس سوال کا جواب دیں گے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کو ہوم رول مل گیا تو عوام جمہور پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ ایک سو برس کے برطانی راج سے جو مصیبت ہندوستان پر نازل ہوئی ہے اس سے زیادہ مصیبت ناممکن ہے۔ جو قانون ساز مجلسیں ہم نے قائم کی ہیں اُن میں عوام کی نمائندگی نہیں ہوتی اور ہم نے محصول کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں ہی کے دوش بے کسی پر رکھا ہے۔ (مدینہ بجنور جلد ۱۹ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۵، مارچ ۱۹۳۰ء)

(۴) تقریر مسٹر برک در بارہ فروختگی اضلاع کوڑہ والہ آباد "پہلا بادشاہ جسے کمپنی نے روپیہ لے کر فروخت کیا آلِ تیمور کا مغل اعظم تھا۔ یعنی شاہ عالم بادشاہ۔ یہ بلند شخصیت

لارڈ نارتھ بروک تھے اُنہوں نے اعلان وکٹوریہ کی پابندی اور اُس پالیسی کے خطرات سے بچنے پر زور دیا ایک عرصہ تک تحریرات وغیرہ کا سلسلہ جاری رہا مگر سر بارتھ فیرجو کہ اس عہد شکنی اور فارورڈ پالیسی کا سرگرم ممبر تھا اور عرصہ سے اس جدوجہد میں کامیاب ہو کر انگلستان کے باثر اشخاص کو اپنا ہم خیال بنا چکا تھا، ایوان حکومت میں بھی کامیاب ہوگیا۔ چنانچہ لارڈ نارتھ بروک کو ۱۸۷۶ء میں استعفا دے کر قبل از وقت ہندوستان چھوڑنا پڑا اور لارڈ لٹن کو اس کی جگہ وائسرائے بنایا گیا اُس نے ہندوستان پہنچ کر کابل کو مشن بھیجا اور پھر افغانستان اور سرحدی مقامات پر حملوں اور درازدستیوں کے دروازے کھل گئے۔ افغانستان پر بار بار چار مرتبہ حملے ہوئے جن میں لاکھوں جانوں اور کروڑوں روپیوں کا نقصان ہوا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک کم و بیش چالیس لڑائیاں ہو چکی ہیں جن میں سے صوات، سہانہ، بنیر، چترال کھجوری کابل وغیرہ کی لڑائیاں مشہور ہیں۔ آفریدیوں، مسعودیوں، وزیریوں، مہندیوں وغیرہ قبائل کو تاخت و تاراج کیا گیا۔ اُن کی زمینیں چھینی گئیں۔ ان لڑائیوں پر ہندوستان کے خزانہ سے روپیہ اور جانیں پانی کی طرح بہائی گئیں۔ مسٹر آصف علی کی تحقیقات کے مطابق سات ارب سے زیادہ اس عہد شکن پالیسی کی بناء پر خرچ ہوا ہے جس میں سے صرف پچاس لاکھ پونڈ انگلستان سے وصول ہوا حالانکہ صرف کابل کی لڑائیوں پر دو کروڑ پونڈ سے زیادہ خرچ ہوئے تھے۔ قومی جماعتیں (بالخصوص کانگریس) اس پالیسی کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتی رہی ہیں چنانچہ کانگریس نے ۱۸۹۶ء میں مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

"سرحد کی پیش قدمی کی پالیسی سلطنت برطانیہ کے لئے اور بالخصوص ہندوستان کے مفاد کے لئے مضرت رساں ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی حدود کے باہر فوجی مہمات بھیجنی پڑتی ہیں جس سے قیمتی جانیں تلف ہوتی ہیں اور رعایا کا روپیہ ضائع ہوتا ہے اس لئے کانگریس مستدعی ہے کہ اس جارحانہ کارروائی کو بند کیا جائے اور یہ امر قرار دیا جائے .... کہ درانحالیکہ یہ مہمات شاہی اغراض کے لئے ضروری سمجھی جائیں تو اُن کے صرف کا بڑا حصہ سلطنت برطانیہ کے خزانہ سے

ادا کیا جائے۔"

مگر قوت کے غرور نے عہود شکنی کی مسنیوں میں اضافہ ہی کیا۔ اور ہوس ملک گیری روز افزوں ہوتی رہی۔

(۱۳) یہی لارڈ لٹن جو کہ لارڈ نارتھ بروک کی جگہ توسیع ملک کے اعلانِ شاہی کو توڑنے اور فارورڈ (پیش قدمی کی) پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ ۳۰ / مئی ۱۸۷۸ء کو اپنی وائسرائی کے زمانہ میں وزیرِ ہند کو مندرجہ ذیل الفاظ لکھتے ہیں:۔

"مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کی حکومتوں کے پاس اس وقت تک اس الزام کا کوئی جواب نہیں ہے کہ اُنہوں نے جو وعدے کئے اُن کی خلاف ورزی کرنے کے کسی ذریعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔"

(مدینہ بجنور مورخہ ۲۸ / اکتوبر ۱۹۴۱ء جلد ۳۰ ع۲۷)

(۱۴) "مارک سولہویں" جنگ اور بے چینیوں کے اسباب کی تشخیص کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"اس کی تمام ذمہ داری انہیں وعدہ خلافیوں پر عائد ہوتی ہے۔ مسٹر چرچل کو اس پر غور کرنا چاہیئے۔" (مدینہ بجنور جلد ۳۰ مورخہ ۲۸ / اکتوبر ع۲۷)

(۱۵) خاندانی جائدادوں۔ جاگیروں اور محاصل کے متعلق اعلان اور اس کی خلاف ورزی

۱۸۵۸ء کے اعلان شاہی کی دفعہ ۷ میں ہے "اس کا ہم کو بخوبی علم ہے کہ اہل ہند اُس آراضی کو جو اُن کے بزرگوں سے اُنہیں وراثۃً پہنچی ہے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم کو بھی اُس کا بڑا لحاظ ہے بلکہ چاہتے ہیں کہ یہ حقوق اُن کے جو آراضی سے متعلق ہیں بشرط ادا کرنے مطالبہ سرکاری کے محفوظ رہیں اور ہمارا حکم ہے کہ بوقت تجویز و نفاذ قانون کے عموماً حقوق قدیمی اور ملک کے رسم و رواج پر لحاظ کامل ہوتا ہے۔"

نیز دفعہ ۹ میں ہے "...... اور ملک کا انتظام ایسا کیا جائے کہ جس سے ہماری ساری رعایا باشندہ ملک کو فائدہ ہو کیونکہ اُن کی فارغ البالی ہمارے لئے موجب اقتدار اور اُن کی فراغت ہمارے لئے باعث بے خطری اور اُن کی شکر گزاری ہمارے لئے پورا صلہ ہے۔"

مگر کیا ذمہ دارانِ برطانیہ نے اس شاہی اعلان کو عملی جامہ پہنایا اور اس عہد کو

ایفاء کے درجہ پر پہنچایا سر ولیم ویڈربرن (جو کہ ہندوستان میں بڑے ممتاز عہدوں پر فائز رہ چکے تھے اور بعد میں پارلیمنٹ کے ممبر ہو گئے تھے) کے وہ الفاظ جو انہوں نے ۱۸۹۷ء میں دارالعوام (ہاؤس آف کامنس) میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے اس کا جواب دیں گے:

ہندوستانی رعایا کی تباہ حالی اور مفلسی کے تین خاص وجوہ یہ ہیں:۔

(اوّل) مالگزاری کی زیادتی۔ اگرچہ گورنمنٹ برطانیہ کے احکام یہ تھے کہ مالگزاری ایسی نہ ہونی چاہیئے کہ اُس میں زمین کا کل منافع آجائے بلکہ اس طرح پر مقرر کی جانی چاہیئے کہ کاشتکار کو اس کی محنت کا معاوضہ اور جو سرمایہ اُس نے کاشت میں لگا رکھا ہے اُس کا سود اور منافع خالص کا نصف حصہ اُس کے پاس بچ سکے۔ لیکن یہ بات خود ہندوستان کے حکام تسلیم کر چکے ہیں کہ ان ہدایات پر ہندوستان میں کبھی عمل درآمد نہیں ہوا۔ یہاں مالگزاری اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ کے سود اور کاشتکار کی مزدوری کے حصہ کو بھی ہضم کر لیتی ہے اور باوجود یہ امر تسلیم کر لینے کے مالگزاری ہمیشہ اس طرح بڑھائی جاتی ہے کہ بعض مواضعات میں تو سو فیصدی اور بعض خصوصی آراضیات پر ہزار فی صدی تک پہنچ جاتی ہے۔

(دوم) دوسرا خاص سبب رعایا کی تباہی کا یہ ہے کہ وصول لگان و مالگزاری کا طریقہ نہایت سخت ہے جس کی رُو سے ایک مقررہ سالانہ رقم وقت معینہ پر وصول کی جاتی ہے اور خراب فصلوں میں جو نقصان ہوتا ہے اُس کا بوجھ کاشتکار پر ڈالا جاتا ہے یہ بوجھ ایسا ہے کہ کاشتکار اُس کو برداشت نہیں کر سکتا اور اُس کو سودی قرضہ لینا پڑتا ہے۔

(سوم) اور تیسرا سبب یہ ہے کہ یورپ کے نمونہ پر قرضہ وصول کرنے کے لئے عدالتیں قائم کر دی گئیں ہیں۔ جن کی وجہ سے قرض خواہ کی پشت پناہی پر تمام سلطنت کی قوت ہوتی ہے اور اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ رعایا کو غلامی کے ادنیٰ درجہ تک پہنچا دے۔" (تقاریر و تحریرات سر ولیم وڈربرن مطبوعہ نیٹسن پریس صفحہ ۱۲۰)

(از مسلمانوں کے افلاس کا علاج صفحہ ۱۴)

مذکورہ بالا شہادت معمولی شہادت نہیں ہے جس سے جملہ حکام برطانیہ کی بدعہدی اور عہد شکنی آفتاب کی طرح روشن ہے اور جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ عہد شکنی ایک دو دن یا ایک دو مہینہ یا سال دو سال عمل میں نہیں لائی گئی بلکہ ہمیشہ اس پر عمل درآمد ہوتا رہا جس کی وجہ سے عام طبقہ بالخصوص کاشتکار انتہائی بربادی کو پہنچ گئے۔ پھر اس پر مزید طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ مال گزاری کا اس قدر بھاری اور ثقیل بوجھ اگر ایک ہی مرتبہ بطور دوامی بندوبست کے جیسا کہ لارڈ کارنوالس نے کیا تھا تو ممکن تھا کہ اگر گرانی اجناس کے وقت، کاشتکار کو اپنی اور اپنے بچوں کی سسکتی ہوئی جان بچا لینے کا موقعہ ہاتھ آجاتا جیسا کہ لارڈ کارنوالس کے بندوبست دوامی کئے ہوئے علاقوں میں رعایا کو بعد میں حاصل ہوا جس میں سابقہ مال گزاری پر نوے فیصدی یا اُس سے زیادہ اضافہ کیا گیا تھا اور کاشتکار کے پاس صرف دس فیصدی چھوڑا گیا تھا۔ مسٹر آر۔سی دت لکھتا ہے۔ کہ ۱۷۹۳ء سے ۱۸۲۲ء تک صوبہ بنگال میں زمینداروں سے ۹۰ فیصدی وصول کیا گیا) مگر کارپردازان برطانیہ کی حرص وطمع اور ہندوستانیوں کے لوٹ کھسوٹ کے عزائم نے اس کا موقع نہیں دیا۔ ۱۸۵۸ء کے اعلان کے بعد کچھ عرصہ تک جنگ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کی بھیانک صورت کے دماغوں اور آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی اور مثل فارورڈ پالیسی کے زیادتی لگان و مالگزاری سے بھی گریزاں رہے مگر جبکہ اپنی قوت کا نشہ اور ہندوستانیوں کے ضعف کا یقین پورا ہو گیا تو سب کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور وکٹوریہ کے اعلان کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔ تفصیل اُس کی مجملاً حسب ذیل ہے۔

۱۸۶۱ء میں کرنل بیرڈ نے قانون اراضی کی بخوبی جانچ کی اور اس کی اصلاح پر زور دیتے ہوئے سفارش کی کہ اگر باقی ماندہ علاقہ میں بھی (جو کہ لارڈ کارنوالس کے بندوبست سے بچ گئے تھے اور وہاں میعادی بندوبست جاری تھا جن میں ہر دس پندرہ برس کے بعد اضافہ ہوتا رہتا تھا) دوامی بندوبست جاری کر دیا جائے تو قحط کا زور بے حد کم ہو سکتا ہے۔ اس کو قبول کرتے ہوئے سیکرٹری آف اسٹیٹ ہند نے ۹ جولائی ۱۸۶۲ء میں اس سفارش کی تائید کی۔ چنانچہ سلطنت برطانیہ کی

گورنمنٹ نے اس کو منظور کر لیا۔ اور ۲۳؍مارچ ۱۸۶۷ء کو وزیرِ ہند سر اسٹیفورڈ نورتھ کورٹ نے گورنمنٹ کے اس فیصلہ کی کہ بندوبست استمراری جاری کر دیا جائے۔ دوبارہ تصدیق کی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ہز میجسٹی کی گورنمنٹ تیار ہے کہ مال گذاری میں اضافہ ہونے کی اُمید کو قربان کر دے اس لئے کہ مالکان آراضی کی اغراض کو حکومت برطانیہ کی بقا سے وابستہ کر دینا زیادہ اہمیت رکھتا ہے"

(دت جلد ۲ صـ۲۸۸)

مگر وہ انگریزی دل و دماغ جس کی گھٹی میں عہد شکنی اور بدعہدی پڑی ہوئی ہے اور جس کے ہر ہر جوڑ و بند میں طمع اور لالچ اور زرکشی کا طوفان ہمیشہ جوش کھاتا رہا ہے وہ کہاں ایسے اعلان اور قانون پر قائم رہ سکتا تھا جس میں اس کی حرص و آز کو نقصان اور ہندوستانیوں کو کسی قسم کے فائدہ کی صورت ہو چنانچہ یہی دوامی بندوبست کی مذکورہ بالا تجویز جس کو ۱۸۶۳ء میں ملکہ معظمہ نے منظور کر لیا تھا اور ۱۸۶۷ء میں وہ مستحکم بھی ہو گئی تھی جس سے رعایا کے دلوں میں خوشی اور اُمید کے جذبات پیدا ہو چکے تھے اور صوبہ آگرہ (یو۔پی) کے بعض مشرقی اضلاع میں اُس کا نفاذ بھی ہو چکا تھا۔ ۲۸؍مارچ ۱۸۸۳ء کو اکیس سال بعد سیکریٹری آف اسٹیٹ کے مندرجہ ذیل الفاظ نے اُس کو ختم کر دیا۔

"جس پالیسی کی داغ بیل ۱۸۶۲ء میں رکھی گئی تھی اب وقت آگیا ہے کہ اس کو باضابطہ ترک کر دیا جائے" (دت صـ۲۹۹)

اصل واقعہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کو رعایا کی مسلسل وفاداری اور اُن کے ضعف کی بناء پر کامل اطمینان ہو گیا تھا اس لئے خلاف اعلان شاہی میعادی بندوبست کو ہی جاری رکھا گیا جس میں ہندوستانیوں کا خون زیادہ سے زیادہ چوسا جا سکتا تھا۔ اس زیادتی لگان و مال گزاری کی وجہ سے ہزاروں زمیندار اور تعلقدار برباد ہو گئے اور اُن کی جائدادیں نیلام کر دی گئیں۔

مسٹر رابرٹ فائٹ کہتا ہے:۔

"تعلقداران سے ہمارے مطالبہ جات اُس رقم سے جو وہ پہلے ادا

کرتے تھے تین گنے بلکہ اس سے بھی زائد ہیں اور اس زیادتی کے
معاوضہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے جو اُن کو حاصل ہوا ہو۔ ساہوکاروں
نے جن سے تعلقداروں کو تباہ کن شرح سود پر قرضے لینے پڑے ہیں
اپنے مطالبہ میں اُن کی املاک اور دیہات کو قرق کرا لیا ہے"۔

دوامی بندوبست ۱۷۹۳ء سے جاری ہوا تمام مزروعہ زمین فیصدی ۵ام دوامی دوامی بندوبست کے ماتحت ہے جس میں مال گزاری کا اضافہ نہیں ہوتا مگر باقیماندہ زمین میعادی ہے جس میں ہر بندوبست میں (جو کہ ہر پندرہ سال سے تیس سال کے اندر ہوتا رہتا ہے) اضافہ کیا جاتا ہے۔ مزروعہ زمین کا ۵۵ فی صدی میعادی رکھا گیا ہے اور اسی کے متعلق مذکورہ بالا ۱۸۶۲ء کی تجویز تھی اور اسی کے متعلق کوئن وکٹوریہ کے اعلان میں اطمینان دلایا گیا تھا اسی میں اضافہ اور زیادتی کے لئے انگریزی قلوب ہمیشہ بے چین رہے جس کی بناء پر کاشتکار آبادی انتہائی بربادی میں مبتلا ہو گئی۔

حالانکہ انگریزی حکومت اور کمپنی کے اقتدار سے پہلے زمینوں کی مال گزاری بہت کم تھی بطور چوتھ یعنی ۲۵ فی صدی وصول کیا جاتا تھا اور حالانکہ ۱۷۶۵ء میں بادشاہان دہلی سے دیوانی کا فرمان (ریونیو افیسری) حاصل کرنے کے بعد کمپنی نے ستر اور اسی فیصدی کا اضافہ کر دیا تھا اور یہ اضافہ بھی روز افزوں ہی ہوتا رہا یعنی ۱۷۶۴ء میں جو کہ نواب بنگال کا آخری زمانہ ہے تمام صوبہ بنگال کی مالگذاری اکیاسی لاکھ پچھتر ہزار پانچسو بیس روپیہ تھی مگر ۱۷۶۵ء سے کمپنی نے اس پر اضافہ کی دھواں دھار اس قدر زیادتی کی کہ تیس برس کے بعد ۱۷۹۴ء میں صوبہ بنگال کی مال گزاری دو کروڑ اڑسٹھ لاکھ ہو گئی۔ یہ اضافہ ۱۷۶۵ء میں قبضہ پاتے ہی شروع ہوا اور اس میں اس قدر مظالم اور تشددات کئے گئے کہ اُن کو ذکر کرتے ہوئے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اُن کی کچھ تفصیل ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے رسالہ ہمارے ہندوستانی مسلمان میں اور دوسرے مورخین نے ذکر کی ہے۔ اسی طرح اضافہ تمام صوبہ جات میں ہوتا رہا۔ خلاصہ یہ کہ ۱۸۵۶ء میں تمام مقبوضہ علاقہ ہائے برطانیہ سے ۱۰۰۰۰۰۰۰۰۳۰ کروڑ روپیہ وصول کیا گیا ۱۸۵۷ء کے جنگ انقلاب کے اسباب میں یہ

گرانبار اضافہ لگان اور مالگزاری بھی دکھلایا گیا تھا جس کی بناء پر کوئن وکٹوریہ کے اعلان میں یہ دفعات داخل کی گئیں تھیں جن سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو مطمئن کرنا مقصود تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جو اضافہ مال گزاری و لگان کمپنی کے قبضہ میں آنے پر ہُوا تھا وہ دُور کر دیا جاتا اور اسی درجہ پر زمین کی آمدنی کر دی جاتی جس پر شاہی نظام کے زمانہ میں تھی یا اگر یہ نہ کیا جاتا تو کم از کم اُس اضافہ میں سے کچھ گھٹا دیا جاتا جو کہ اس مدّت میں کمپنی نے روز افزوں زیادتی کے ساتھ کیا تھا جس کی بناء پر صوبہ بنگال کا خراج (۸۱۷۵۵۲۰ لاکھ روپیہ) سے بڑھ کر تیس برس کے عرصہ میں (۰۰۰،۰۰۰،۸۸،۱ کروڑ) کو پہنچ گیا تھا اور صوبہ بمبئی کا خراج (۰۰۰،۰۰۰،۸۰ لاکھ روپیہ) جو کہ ۱۸۱۷ء کا خراج ہے جبکہ وہ دیسی اور شاہی نظام پر وصول کیا جاتا تھا مگر کمپنی نے قبضہ پاتے ہی اس میں اضافہ شروع کیا۔ یہاں تک کہ چھ برس کے بعد ۱۸۲۳ء میں (۰۰۰،۰۰۰،۵۰،۱ کروڑ) ایک کروڑ پچاس لاکھ ہوگیا اور پھر اضافہ ہوتے ہوتے ۱۸۷۵ء میں چار کروڑ اسی لاکھ (۰۰۰،۰۰۰،۸۰،۴ کروڑ) ہوگیا اور یہی حال تمام صوبہ جات میں زیادتی مالگزاری اور لگان کا جاری رہا جس سے رعایا سخت پریشان ہوگئی۔ کمپنی کے کارکن اور حکام لگان کی وصولی میں انتہائی سختی برتتے تھے جس کا عشر عشیر بھی شاہی زمانہ میں نہ تھا۔ الحاصل رعایا تنگ ہو کر جنگ کے لئے کھڑی ہوگئی۔ شہنشاہی اعلان وکٹوریہ میں اشک شوئی اور تھپکنے کے لئے یہ الفاظ مذکورہ بالا تو ذکر کر دیئے گئے مگر کوئی عملی کارروائی تخفیف خراج کی نہیں کی گئی ہاں ۱۸۶۲ء کی تجویز کا اعلان کیا گیا اور رعایا کو اس کے ذریعہ سے دوامی بندوبست کا لالچ دے کر مزید اضافہ لگان کی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ یہ محض باتوں باتوں کی تھپک اور بناوٹی دھوکہ دہی کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ پھر ۱۸۸۳ء میں اس کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اور اضافہ کی چھری تمام میعادی زمینوں پر چلتی رہی۔ جس کا نقشہ ہم (۸) میں زیرِ عنوان ٹیکسوں کی بھرمار پیش کر چکے ہیں۔

یہ تمام اضافہ میعادی زمین پہ ہوتا رہا اور کوئن وکٹوریہ کے اعلان کے بعد ہوتا رہا۔ اور اس زمانہ میں ہوتا رہا جبکہ ہندوستان میں قحط انتہائی شباب پر پہنچا ہُوا تھا۔ رعایا بھوک کی بناء پر مکھیوں کی موت مر رہی تھی اس تمام مال گزاری کا تقریباً ۸۴ فیصدی

میعادی بندوبست کے حلقوں سے وصول ہوتا رہا اور تقریباً ۱۰ فی صدی دوامی بندوبست کے حلقوں سے وصول ہُوا۔

اسی زمانہ کے متعلق سر چارلس ایلیٹ چیف کمشنر آسام ۱۸۸۸ء میں لکھتا ہے "مَیں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ کاشتکاروں کی نصف تعداد ایسی ہے جو سال بھر تک یہ نہیں جانتی کہ ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا کسے کہتے ہیں"۔

اگرچہ انگریزی اقتدار کے بڑھنے کے ساتھ ہندوستان کا قحط بھی بڑھتا رہا تھا حسب تصریحات سر ولیم ڈگبی انگریزی اقتدار سے پہلے چھ سو برس میں یعنی ۱۱۰۰ء سے ۱۷۰۰ء کے ابتداء تک کل ۱۸ قحط واقع ہوئے تھے اور وہ بھی تمام ملک میں نہیں ہوئے تھے بلکہ کسی صوبہ میں واقع ہوئے اور دوسرے صوبے محفوظ رہے۔ پھر جہاں یہ قحط واقع بھی ہوئے وہاں موتیں زیادہ نہیں ہوئیں۔ اس لئے کہ لوگوں کے پاس روپیے زیادہ تھے غلّہ کتنا بھی گراں ہوجاتا خریدنے کی طاقت موجود رہتی تھی۔ موت تک کی نوبت نہیں آتی تھی۔ دیسی بادشاہوں اور نوابوں اور راجاؤں کو رعایا سے خصوصی ہمدردی ہوتی تھی اس لئے وہ اپنی طاقت کے موافق قحط کے ازالہ کا انتظام کرتے کرتے تھے۔ بخلاف ان قحطوں کے جو کہ ابتداء ۱۸۰۰ء سے واقع ہوئے وہ نہایت ہولناک اور بہت زیادہ تھے۔ ۱۹۰۰ء کے ابتداء تک یعنی صرف ایک سو برس کے عرصہ میں اکتیس قحط واقع ہوئے اور پھر جوں جوں اقتدار برطانوی بڑھتا گیا قحطوں کی مقدار اور ہولناکی بھی بڑھتی گئی۔ جس کی تفصیل چوتھائی صدی کے طرز پر حسب تصریح سر ولیم ڈگبی مندرجہ ذیل ہے۔

۱۸۰۰ء	سے	۱۸۲۵ء تک	۵ قحط	۱۰ لاکھ آدمی صرف قحط سے مرے	
۱۸۲۶ء	سے	۱۸۵۰ء تک	۲ قحط	۴ لاکھ	" " " "
۱۸۵۱ء	سے	۱۸۷۵ء تک	۶ قحط	۵۰ لاکھ	" " " "
۱۸۷۵ء	سے	۱۹۰۰ء تک	۱۸ قحط	۲ کروڑ ۶۰ لاکھ	" " " "

ناظرین خیال فرمائیں کہ اس صدی کی آخری چوتھائی یعنی ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۰ء تک کا زمانہ وہ زمانہ ہے جس کو انگریزی اقتدار کی حیثیت سے زریں اور سنہرا زمانہ کہا جاتا ہے کیونکہ انقلاب ۱۸۵۷ء اور اُس کے ہولناک مظالم اور بیدردی سے

قتل وغارت وغیرہ کے بعد ہندوستانی اس قدر کمزور اور ذلیل ہو گئے تھے کہ اُن میں کوئی سکت حکام برطانیہ کے مقابلہ اور مخالفت کی باقی ہی نہیں رہی تھی۔ انگریزی حکام جو چاہتے تھے کرتے تھے کسی میں دم مارنے کی طاقت نہیں تھی۔ خلاصہ یہ کہ اس صدی کی آخری چوتھائی جو کہ انگریزی اقتدار کی سب سے بلند چوٹی ہے اس میں اٹھارہ قحط واقع ہوئے اور ڈھائی کروڑ سے زیادہ آدمی صرف قحط کی وجہ سے موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ ان قحطوں کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں مگر جب اس طرح بربادی پھیلی ہوئی ہو اور لوگ بھوک اور غذا نہ پانے کی وجہ سے اس کثرت سے مر رہے ہوں اس وقت تو ضروری تھا کہ مالگذاری اور لگان بالکل چھوڑ دیا جاتا یا کم از کم تخفیف عمل میں لائی جاتی۔ مگر انگریزوں کی سنگ دلی اور درندگیت ملاحظہ فرمائیے کہ چھوڑنا اور تخفیف کرنا تو درکنار ہمیشہ خراج میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور وہ بھی معمولی اضافہ نہیں تھا بلکہ تقریباً سو فیصدی اضافہ اس پچاس برس کے عرصہ میں کر دیا گیا۔ اور نہایت سختی سے وصول کیا گیا۔ نہ انسانیت کا پاس کیا گیا۔ نہ شہنشاہی اور نہ پارلیمنٹ عہود و مواثیق اور اعلانات کا کوئی لحاظ کیا گیا۔ نہ غریبوں اور مفلسوں کی بربادی اور ہولناک موت کا کچھ خیال رکھا گیا۔ دنیائے تاریخ میں ایسی سنگدلی اور وحشت کی مثال نہایت کم پائی جائے گی۔ مسٹر جے کیر ہارڈی (موسس لیبر پارٹی) اپنی کتاب انڈیا میں لکھتا ہے ”کہ چالیس برس کے عرصہ میں ۱۸۶۰ء سے ۱۹۰۰ء تک ۲ کروڑ آدمی صرف فاقہ کشی کی وجہ سے ہندوستان میں مر گئے“۔ اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتا ہے ”۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۰ء تک نو برس کے عرصہ میں ہندوستان میں ایک کروڑ نوے لاکھ آدمی قحط سے مرے ہیں“۔ اس قدر موتیں ڈیڑھ سو برس میں (یعنی ۱۷۵۰ء سے ۱۹۰۰ء تک میں تمام دنیا میں جتنی لڑائیاں واقع ہوئیں) نہیں ہوئی تھیں۔ جتنی برطانوی حکومت کے زیر اقتدار کے تحت امن و امان کی حالت میں ہندوستان میں واقع ہوئیں“۔

ذرا اس بربریت کو ملاحظہ فرمائیے کہ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۰ء تک میں اتنا عظیم الشان قحط ہندوستان میں پڑا ہوا ہے کہ تقریباً دو کروڑ آدمی مر گئے ہیں مگر اسی مدت میں زمین کے خراج پر دو کروڑ بیس لاکھ روپیہ اضافہ کیا گیا۔ یعنی ۱۸۹۰ء میں خراج

چوبیس کروڑ پانچ لاکھ تھا اور ۱۹۰۰ء میں چھبیس کروڑ پچاس لاکھ کردیا گیا۔ کیا اسی کو انسانیت کی خدمت اور رعایا پروری کہا جاتا ہے۔ اسی لئے ڈبلوجی پیڈر ۱۸۷۳ء میں لکھتا ہے کہ "ایک ایسی رائے جس پر تقریباً ہر شخص متفق ہے اگر قابل اعتماد ہو سکتی ہے تو یہ صحیح ہے کہ اہل ہند ہماری زیر حکومت بد سے بدتر حالت کو پہنچتے جاتے ہیں" (حکومت خود اختیاری ص ۴۸)

مسٹر گرانٹ ڈف (مئی ۱۸۷۰ء میں مسٹر لین سے غریب ہندوستانیوں کے متعلق دارالعوام میں) کہتا ہے "آپکا کیا ارادہ ہے کہ ایک مفلس قوم کو بالکل ہی پیس ڈالا جائے؟" (حکومت خود اختیاری ص ۳۷ از دادا بھائی ص ۵۱)

حالانکہ اس زمانہ سے پہلے ہی کمپنی نے ہندوستانیوں کو بربادی کی نہایت بھیانک صورت میں مبتلا کردیا تھا جس کو سرجان شور ۱۸۳۳ء میں مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔

"انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کردیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر صورت سے تمام ہندوستانی قوم کو اپنی اغراض کا غلام بنا لیا جائے۔ اُن پر محصولات اتنے لگا دیئے ہیں کہ اضافہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے یکے بعد دیگرے جو صوبہ ہمارے تصرف میں آیا ہے اُس کو مزید وصولیابی کا میدان بنالیا گیا ہے اور ہم نے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ دیسی والیانِ ملک جتنا وصول کرتے تھے اس سے ہماری آمدنی کس قدر زیادہ ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں جتنی انتہائی سخت اور جابر حکومتیں گذری ہیں ان میں ایک برطانوی حکومت بھی ہے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ کوئن وکٹوریہ کے اعلان ۱۸۵۸ء سے پہلے بھی اور اُس کے بعد بھی آج تک زمینوں پر خراج کا بوجھ برابر بڑھتا رہا اور جو قدیمی نظام زمینوں کا تھا اُس میں برابر تبدیلی اور وصولی میں زیادتی ہوتی رہی جس کا زہریلا اثر یہ ہوا کہ کاشتکار اور زمیندار انتہائی درجہ میں مفلس اور قلاش ہوگئے اور لاکھوں مالکان آراضی کو

زمینوں کے بیج ڈالنے، گروکر دینے، زمین سے دست بردار ہونے اور انتہائی افلاس میں گذر بسر کرنے یا فنا ہو جانے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ ہیں وہ اعلانات و عہود برطانیہ اور ان پر عمل درآمد۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(۱۶) انگریز ہندوستان کے فاتح نہیں تھے بلکہ ہندوستان کو انتظام کی درستی کے لئے مغل بادشاہانِ دہلی سے بطور سند و عہد و پیمان فرمانات شاہی انہوں نے ۱۷۶۵ء و ۱۸۰۶ء وغیرہ میں حاصل کیا تھا اسی لئے اُس کے امانت ہونے کا اور اس کے غیر فاتح ہونے کا بڑے بڑے ذمہ داران برطانیہ کو ہمیشہ اقرار رہا ہے۔

(الف) ڈبلو ڈبلو ہنٹر اپنی کتاب (ترجمہ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۲۲۵ میں لکھتا ہے:۔

"بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا تھا تو تاہم صرف شہنشاہ دہلی کے دیوان تھے یعنی چیف ریوینیو افیسر۔ اسی بنا پر مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہم کو اُسی اسلامی طریقہ پر کاربند رہنا چاہیئے جس کے انتظام کا ہم نے اُس وقت ذمہ لیا تھا جہاں تک میرا خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقع یہی تھا۔"

(نوٹ) چونکہ آخری زمانہ سلطنت مغلیہ میں کمزوری سلطنت کی وجہ سے صوبے باغی ہو گئے تھے اس لئے جب کسی بڑے عہدہ پر بادشاہ کی طرف سے تقرر ہوتا تھا تو اُس کو فرمان بادشاہ کی طرف سے مل جاتا تھا مگر بسا اوقات اس کو اس فرمان کے منوانے میں قوت کا استعمال کرنا لازمی ہوتا تھا۔ یہی مقصد مذکورہ بالا عبارت میں مندرجہ ذیل عبارت کا ہے "پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا"

(ب) کتاب مذکور "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے اسی صفحہ ۲۲۵ کے حاشیہ پر ہے "سو ہابی مقدمات کا انچارج افسر لکھتا ہے، "ہم نے دیوانی اس وعدے کے ساتھ لی تھی کہ ہم اسلامی حکومت کو جیسی کہ اس وقت قائم ہے، برقرار رکھیں گے۔ ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔"

(ج) ہم اس سے پہلے مسٹر پیٹر فریبین کا مقالہ جو کہ انڈین نیوز لندن میں ۱۹۳۰ء میں شائع ہُوا تھا نقل کر چکے ہیں جس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہمارے اس دعوے کے مسلّم ہونے کے شاہد ہیں: "برطانیہ عہد و پیمان کے ذریعہ ہندوستان پر ہندوستان کے بھلے کے لئے حکومت کرنے کا پابند ہے"۔

(د) مسٹر برک کی تقریر بھی ہم مفصلاً ع؟ میں نقل کر آئے ہیں۔ اس کے مندرجہ ذیل الفاظ بھی قابل ملاحظہ ہیں۔

"پہلا بادشاہ جسے کمپنی نے روپیہ لے کر فروخت کیا آلِ تیمور کا مغل اعظم تھا۔ یہ بلند شخصیت ایسی بلند جو انسانی عظمت کا مطمح نظر ہو سکتی ہے۔ عام روایات کے مطابق اپنے عمدہ طرز عمل پاک باطنی اور ماہر علوم مشرقیہ ہونے کے باعث بہت ہر دلعزیز و محترم تھی۔ اس کی یہ خوبیاں اور نیز یہ امر کہ اُسی کی سندات کے طفیل میں ہم نے تمام ہندوستانی مقبوضات حاصل کئے اُس کو برسر بازار فروخت کرنے سے نہ روک سکے اُسی کے نام کا سکّہ چلتا ہے۔ اُسی کے نام سے عدل و انصاف کیا جاتا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں اسی کے نام کا تمام عبادت گاہوں میں خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اُسے بیچ ڈالا گیا۔ ایک سلطنت عطا کر دینے والے معلی اور بکثرت قوموں کے جائز حکمران کے واسطے اُس کے شاندار عطیات میں صرف دو ضلع الخ

(از حیات حافظ رحمت خاں مرحوم ص ۱۹۹ ماخوذ از ہندوستان اور عہد کمپنی کی صحیح تاریخ رائز آف دی کرسچین پاوران انڈیا۔ مؤلفہ میجر بی۔ ڈی باسو)

مذکورہ بالا الفاظ مسٹر برک کے صاف روشنی ڈالتے ہیں کہ انگریز ہندوستان کے ہرگز فاتح نہیں ہیں بادشاہی سندات اور فرامین کے ذریعہ اور اس کے طفیل میں ہندوستان پر اُنہوں نے قبضہ کیا تھا اور قبضہ و اقتدار کے زمانہ میں بھی مثل ملازموں اور خدام سلطنت کے امور انتظامیہ مالیات وغیرہ انجام دیتے تھے خطبہ اُسی کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔

(۵) مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ۔ ۲/ اگست ۱۹۲۲ء میں تقریر کرتے ہوئے ہاؤس آف کامنس میں کہتے ہیں۔

"اگر یہ بات پہلے سے صاف نہیں ہے تو اب میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری غرض اصلاحات دینے سے یہ نہیں ہے کہ انجام کار ہم اپنی امانت سے بالکل دست بردار ہو جائیں"

مسٹر لائیڈ جارج کو اقرار ہے کہ ہندوستان انگریزوں کے پاس امانت ہے مفتوحہ چیز امانت نہیں ہوتی۔

(۶) پروفیسر سیلے کہتا ہے "اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح بھی نہ ہو بلکہ صرف اسقدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحاد عمل ہندوستانیوں کے لئے شرمناک ہے تو اسی وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور اس پر فاتحانہ حکمرانی نہیں کر سکتے اگر ہم اس طرح حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً برباد ہو جائیں گے۔

انگریزوں کا اُن معاہدوں کو توڑنا جن کے ذریعہ ہندوستان پر دیوانی کے اختیارات حاصل کئے گئے

غرضکہ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ فاتحانہ نہیں تھا بلکہ متعدد عہود اور مواثیق اور شروط کے ساتھ بادشاہی فرمانات حاصل کئے گئے تھے جن کے سایہ میں آہستہ آہستہ تمام ہندوستان پر قبضہ ہو سکا اور جن میں برابر دھوکا دہی، غداری، مکاری عمل میں لائی گئی ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق ملازمین اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور جب انہوں نے پہلے پہل صوبجات پر قبضہ کیا تو اسلامی نظام کو برقرار رکھا انہوں نے شرع اسلامی کو ملک کا قانون بنایا اور اس کے نفاذ کے لئے

مسلمان قاضی مقرر کئے۔ اُس وقت جو بھی کیا جاتا دہلی کے مسلمان شہنشاہ کے نام پر کیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بادشاہت کا طغرائے امتیاز حاصل کرنے سے اس قدر ڈرتی تھی کہ ایک طویل مدت تک بھی جب مسلمان ملازمین کی وساطت سے حکومت کرنے کی کوشش اسلامی نظام کے ناقابلِ ذکر بدعنوانیوں کے باعث قطعاً ناکامیاب ہو چکی تھی اُس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ بادشاہ کی نائب ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس ظاہر داری نے آخر ایک قابلِ نفرت تماشے کی صورت اختیار کر لی تھی ہم اُس زمانے میں جب ہمارا ریزیڈنٹ شاہ دہلی کو ایک غریب قیدی کیطرح کھانے پینے کے لئے کچھ ماہوار رقم بطور وظیفہ دیا کرتا تھا جو حکم جاری کرتے اُسی کے نام پر کرتے۔ چونکہ اب تک جو لوگ ہندوستان کی تاریخ پر قلم اٹھاتے رہے وہ کبھی ہندوستان نہیں آئے اس لئے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انگلستان میں بیٹھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس عجیب و غریب طرز عمل کو سمجھ سکیں گے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے باقاعدہ بادشاہت قبول کرنے میں دس سال بھی جلدی کی ہوتی تو ہم مسلمانوں کی ایسی بغاوت میں گھر جاتے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہوتی مسلمان محسوس کرتے کہ ان کی حیثیت یک قلم بدل گئی ہے ہماری اپنی حالت بھی ایسی کافر طاقت کی ہو جاتی جس نے دارالاسلام پر قبضہ کر لیا ہو۔ اندریں حالات مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت جمع ہو جاتی کہ بغاوت کو فرض عین قرار دے۔ میں اس سے پہلے بیان کر آیا ہوں کہ شریعت اسلامی کی رُو سے ہر مرد عورت اور بچے کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ کافر حکمرانوں کی بیخ کنی کرے اور اُنہیں ملک سے باہر نکال دے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی قابلِ تعریف اعتدال پسندی اور اس عزم بالجزم نے کہ اسلامی سلطنت کی تدریجی اور طبعی موت میں ایک لحہ بھر کی عجلت بھی نہیں کی جائے اس مصیبت کو ہمارے سر سے ٹال دیا۔ ہندوستان تدریج اور غیر محسوس طور پر دارالاسلام سے دارالحرب میں تبدیل ہوتا

گیا۔ شاہی ضلع وار دستاویزات کی گئی سال تک تحقیق کرنے کے بعد میرے لئے یہ بتلانا ناممکن ہے کہ یہ تبدیلی کس سال یا کس مدّت میں واقع ہوئی۔ مسلمان شہنشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس برائے نام عظمت کے محض تماشہ بن جانے کے بعد بہت کافی عرصہ حتیٰ کہ ۱۸۳۵ء تک ہمارے سکے اسی کے نام سے جاری ہوتے تھے (۱۸۳۵ء میں کمپنی کے روپئے پر جس کا وزن ۱۸۰ گرین تھا انگریزی بادشاہ کی شکل بنائی گئی تھی اور ایسٹ انڈیا کا نام لکھا گیا تھا) پھر جب ہمیں یہ جرأت ہوئی کہ سکّوں پر انگریز بادشاہ کی شکل دی جائے تب بھی ہم نے اسلامی دستور العمل اور عدالتوں میں اسلامی زبان کو برقرار رکھا گو یہ باتیں بھی بتدریج مٹ گئیں۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۴ء میں ہم نے ایک دلیرانہ قدم اُٹھایا۔ میرے خیال میں یہ اقدام بڑا ہی غیر دانشمندانہ تھا یعنی مجلس قانون ساز کے ایک ایکٹ کے ذریعہ ہم نے تمام مسلمان قاضیوں کو برطرف کر دیا۔ اس قانون نے نئی ہندوستانی سلطنت کی اس عمارت کو مکمل طور پر دارالحرب میں بدل دیا۔ جس کی تعمیر پوری ایک صدی (۱۷۶۵ء تا ۱۸۶۴ء) سے ہو رہی تھی اسلامی حکومت کے اس طرح بتدریج مٹنے سے ہماری مسلمان رعایا پر نئے نئے فرائض عائد ہوتے گئے۔"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجم ڈاکٹر صادق صفحہ ۱۹۲ و ۱۹۴ ر ۱۹۵)

ڈاکٹر ہنٹر کی تصریحات پوری طرح پر روشنی ڈالتی ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان کو شاہان مغلیہ سے بذریعہ فرمانات اور عہد و پیمان دھوکا دے کر اور اطمینان دلا کر حاصل کیا تھا مگر نیتیں صاف نہ تھیں اپنی ملعون اور نجس اغراض زیر نظر تھیں۔ وعدہ کیا گیا کہ ہر زمانہ میں اسلامی اور شہنشاہی نظام کو محفوظ رکھ کر آمدنی کو ترقی اور نظام کو برتری دی جائے گی مگر دل کے چور نے ابتدا ہی سے نظام اسلامی کو برباد کرنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کو آہستہ آہستہ نکال کر اور اپنا زہریلا مادہ داخل کر کے بادشاہی طاقت اور مسلمانوں کی برتری کو فنا کر دیا۔ اور تمام عہود و پیمانوں کو رفتہ رفتہ اس طرح توڑ ڈالا کہ ان عہود کا کوئی تاریخی باقی نہ رہ گیا۔

(ب) پھر ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے "انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمان عہدے داروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اٹھائے کہ اس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ باایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق کار پر لگائی وہ اس قدر پُر فریب تھی کہ اُس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو۔ میرا مطلب ہے اُن تبدیلیوں سے جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں اور جن سے ۱۷۹۳ء کا دوامی بندوبست مترتب ہُوا۔ اس بندوبست سے ان مسلمان افسروں کا کاروبار زبردستی ہمارے ہاتھ میں آگیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنیوالوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے اور جن کے سپاہیوں کو مال گزاری جمع کرنے کا جائز حق پہنچتا تھا" صہ ۲۲۶

(ج) پھر صفحہ ۲۲۷ پر لکھتا ہے "ایک افسر جس نے مسلمانوں کی موجودہ بے چینی اور دوامی بندوبست سے اس کے تعلق کا مطالعہ بڑی دقیق نظر سے کیا ہے لکھتا ہے " اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے۔ اُن کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا" سو یہ سب سے بڑی ناانصافی ہے جس کا مسلمان امراء انگریزی حکومت کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے۔ لیکن جوں ہی ہم نے اپنے آپ کو طاقتور پایا اُس وعدے کو فراموش کر دیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظام دیوانی کا مطالعہ کیا تو اس کو اس قدر یکطرفہ اور ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اس کو برقرار رکھتے تو تہذیب کے لئے باعث ننگ ہوتے اور ہم اضلاع کے اندراج سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مقصد محض روپیہ جمع کرنا تھا۔ مالگزاری جمع کرنے والوں کے ذمے نظام حکومت کے تمام فرائض کر دیئے گئے تھے

ان کو اس بات کی اجازت تھی کہ جو جی میں آئے کریں بشرطیکہ مالگزاری کا روپیہ باقاعدہ جمع کرتے رہیں۔ عوام کو اس لئے ستایا جاتا تھا کہ زمینداروں کو لگان وصول ہوتا رہے اُن کو اسلئے لوٹا جاتا تھا کہ زمینداروں کے ملازمین دولت مند، ہو جائیں۔ اس ظلم و ستم کے خلاف شکایت بے سود تھی کیونکہ یہ زمیندار اور اُس کے افسر کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اُن کی شکایات کو سُنتے یا نہ سُنتے۔ اُن کی شکایات کے ازالہ کا امکان بہت کم تھا کیونکہ ظالم بالعموم زمینداری کا ملازم ہوتا تھا پھر اگر ڈاکوؤں کو کوشش کر کے گرفتار بھی کر لیا جاتا تو اُن کے لئے مشکل نہ تھا کہ قید کرنے والوں سے یارانہ گانٹھ لیں۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے ماتحت حکومت کی حیثیت ایسی مشین کی تھی جس سے تھوڑے آدمی دولتمند ہو جائیں یہ نہیں کہ بہتوں کی حفاظت ہو سکے معلوم ہوتا ہے اس پر نہ کبھی حاکموں کے دل میں رحم پیدا ہوا نہ اُن کے ضمیر میں" الخ ص ۲۲۹

ڈاکٹر ہنٹر اقرار کرتا ہے کہ انگریزوں نے یقیناً اسی شرط پر ہندوستان کے صوبہ بنگال کی دیوانی لی تھی کہ وہ نظام اسلامی کو برقرار رکھیں گے اور اس کا بھی اقرار کرتا ہے کہ ہم نے (انگریزوں نے) اس کو توڑا اور عہد شکنی کی۔ مگر چونکہ وہ اپنے قومی جذبات میں اس قدر غرق ہے کہ اپنی قوم اور اپنی حکومت کے اعمال اور اخلاق کو اوّلاً صحیح نظر یہ پر پرکھ ہی نہیں سکتا یا اگر پرکھ سکتا ہے تو اس کی تاویل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اُس کو قومی محبت نے حقائق سے اندھا کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ وہی نظام ہے جو کہ شہنشاہ بابر کے زمانہ سے شہنشاہ عالمگیر کے اخیر زمانہ تک تقریباً دو سو برس سے زیادہ قائم رہا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ زمانہ ابتدائے سلطنت اسلام سے عہدہ عالمگیری کے خاتمہ تک ایک ہزار برس سے زائد قائم رہا جس میں تمام ممالک اسلامیہ بالخصوص ہندوستان رشک جناں بن گیا تھا تو صحیح ہو گا اگر وہ نظام اسلامی ناکارہ اور یک طرفہ اور اصول انسانیت کے خلاف ہوتا تو ملک کیوں اس قدر پھولتا اور پھلتا۔

میجر باسو کہتا ہے "رعایا کی خوشحالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی

مسلمانوں کا دورِ حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دولتمندی اور آرام و چین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھتے ہیں آتا تھا بلا شبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔" (روشن مستقبل ص۱۶)

لارڈ میکالے کہتا ہے "باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لیڈروں کے مشرقی ممالک میں بنگال باغ ارم یا نہایت دولت مند سمجھا جاتا تھا۔ اسکی آبادی حد درد غایت بڑھتی تھی۔ غلّہ کی افراط سے دُور دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے اور لندن اور پیرس کے اعلےٰ خاندانوں کی بیبیاں یہاں کے کرگھوں کے نازک ترین کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھیں۔" (ماخوذ از سوانح لارڈ کلایو حکومت خود اختیاری ص۸)

لارڈ کلایو لکھتا ہے "یہ (ہندوستان) لا متناہی دولت والا ملک ہے۔"

سرجان شور انگریزوں سے پہلے کے زمانہ کو عہد زریں قرار دیتا ہے۔

غرضکہ یہ بالکل غلط اور جھوٹی بات ہے کہ نظامِ حکومت اسلامیہ یک طرفہ اور ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف تھا۔ اس قسم کی بیشمار شہادتیں خود انگریزوں کی موجود ہیں کہ اُس نظام کے ماتحت ہندوستان ہر طرح ترقی پذیر رہا۔ البتّہ اُس نظام سے جس کو کمپنی اور لارڈ کارنوالس وغیرہ نے بنایا تھا ملک انتہائی بربادی کو پہنچ گیا۔ سرجان شور (جو کہ صوبہ بنگال کی سول سروس سے تعلق رکھنے والا تھا) ۱۸۳۷ء میں لکھتا ہے:۔

"برطانیہ نے جو طرزِ حکومت قائم کیا ہے اُسکے تحت ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ اُن پر جلد تباہی آگئی انگریزی حکومت کی بیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اُس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر صورت سے تمام ہندوستانی قوم کو اپنی اغراض کا غلام بنا لیا جائے۔ اُن پر محصولات اتنے لگا دیئے ہیں کہ اضافہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے بجے بعد دیگرے جو صوبہ ہمارے تصرف میں آیا ہے اس کو مزید وصولیابی کا میدان بنا لیا گیا ہے اور ہم نے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ دیسی والیان ملک جتنا وصول کرتے تھے اُس سے ہماری آمدنی کس قدر زیادہ ہے۔ ہر وہ عہدہ عزت، اور منصب جس کو قبول کرنے کے لئے ادنیٰ سے ادنےٰ انگریز کو

آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں جتنی انتہائی سخت اور جابر حکومتیں گذری ہیں اُن میں ایک برطانوی حکومت ہے جس کے دور میں حکومت اور ذی ثروت افراد (بشرطیکہ وہ بے اندازہ دولت رکھتے ہوں) دونوں انصاف کا خون کر سکتے ہیں اور کر چکے ہیں۔ جس کے عہد میں ظلم کی دادرسی تقریباً ایک ناممکن چیز ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رعایا باہم سے نفرت کرتی ہے اور ہر طاقت کا خیر مقدم کرنے اور اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو جانے کے لئے تیار ہے۔ بشرطیکہ اُس میں اتنی قدرت ہو کہ ہمیں تباہ کر سکے۔" اس عبارت سے پہلے وہ لکھتا ہے "لیکن ہندوستان کا عہد زرّیں گذر چکا ہے جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اُس کا جزو اعظم ملک کے باہر کھینچ کر بھیجدیا گیا ہے اور اُس کے قدرتی عمل اُس بدعملی کے ناپاک نظام نے معطل کر دیئے ہیں جس نے لاکھوں نفوس کی منفعت کو چند افراد کے فائدے کی خاطر قربان کر دیا ہے۔"

(حکومت خود اختیاری ص ۲۶، ۲۷)

مسٹر سول ہیرٹ ممبر کونسل ۱۸۳۶ء میں لکھتا ہے:۔

"برطانیہ کا دورِ حکومت مہربان اور مقبول بنایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہنچ گیا ہے اُس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اُس وقت لوگ خوشحال تھے۔ یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا ہے۔ میں ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں جو نہایت اہم نتائج سے لبریز ہے اور وہ یہ ہے کہ چند سال سے سرکاری مالگزاری کا بڑا حصہ ملک کا سرمایہ بیکار ادا ہو رہا ہے۔ اگرچہ وہ سرمایہ خود ہی نہایت مختصر ہے۔ سرمایہ سے میری مراد کسانوں کی منقولہ جائداد ہے۔ جو قیمتی دھات یا پتھر کے استعمالی زیورات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان زیورات کو حسب ضرورت نفع آور کاموں میں لگایا جاتا ہے اور کاشتکاری کے لوازمات کے بہم پہنچانے کا بھی اس سے کام لیا جاتا ہے اور بالعموم اس مقصد کے حاصل کرنے کو اُس وقت تک کے لئے جب تک کام پورا ہو گرو کرنے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جس چیز پر نظر ڈالئے

اس سے یہ عقیدہ کہ روز افزوں تنگ حالی ہم کو ہلاکت مطلق کی طرف لے جا رہی ہے پختہ ہو جاتا ہے۔"

یہی مسٹر میریٹ ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں:۔

"ہندوستان میں ہماری حکومت سے جو مصائب ظہور میں آئے ہیں وہ یا تو اُس گرانقدر خراج سے براہِ راست پیدا ہوئے ہیں جو یہ ملک انگلستان کو ادا کرتا ہے یا بالواسطہ اُسی کا نتیجہ ہیں .... یہ سچ ہے کہ کھلی ہوئی دست دراز کے استیصال سے جو برکات حاصل ہوتی ہیں اُن کے ہندوستانی اب تک ممنون اور معترف ہیں مگر اسی کے ساتھ وہ کہتے ہیں کہ یہ بڑھی ہوئی ناداری ایک ایسے ناسور کا پتہ دیتی ہے جو درپردہ ہلاکت کے سامان کر رہا ہے اور اس کا کوئی جواب موجود نہیں ہے۔"

مندرجہ بالا نوٹوں سے جو کہ برطانیہ کے مشہور و معروف ذمّہ داران ارباب حکومت کے اقوال ہیں اور جنہوں نے ہندوستان میں رہ کر حالات کا بخوبی معائنہ کیا ہے، صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو الزامات اس اسلامی نظام پر (جس کا وعدہ اور عہد برطانیہ نے شاہانِ مغلیہ سے کیا تھا) رکھے ہیں وہ بالکل غلط اور محض اپنی قوم کی شرمناک جانبداری اور ناجائز پروپیگنڈہ پر مبنی ہیں اور جو بھلائیاں اپنے نظام میں دکھلائی ہیں وہ بالکل خلاف واقعہ ہیں بلکہ یہ نظام محض لوٹ کھسوٹ اور انتہائی بربادی اور خود غرضیوں پر مشتمل ہے۔ جس نے ہندوستان کو بالکل مفلس اور قلاش اور ناکارہ بنا کر ہلاکت کے گڑھوں میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستانی نظام قدیم کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کا انتقاد اور اعتراض (جو مذکورہ بالا نوٹوں سے معلوم ہوتا ہے) بالکل برعکس ہے۔ برطانیہ اور انگریزوں کے بنائے ہوئے نظام میں وہ سب خرابیاں بلکہ اُس سے بدرجہا زائد موجود ہیں جن کو ڈاکٹر صاحب موصوف اسلامی نظام میں دکھلا رہے ہیں۔ ع

برعکس نہند نام زنگی کافور

لارڈ ڈاڈسلے نے ۱۸۶۷ء میں بیان کیا تھا کہ:۔

"ہمیں دیسی حکومت کے طریقہ کو جہاں تک ممکن ہو ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ تاکہ دیسیوں کی قدرتی استعداد اور تدبر کی نشو و نما ہو سکے اور ان میں جتنی خوبیاں اور جو ہر کبھی تھے حکومت کی امداد میں کام آسکیں۔ مغلیہ سلطنت کی عظمت کا راز وہ سیر چشم حکمتِ عملی تھی جو اکبر اور اُس کے جانشینوں کا شعار رہی جنہوں نے ہندوؤں کی اعانت اور قابلیت سے فائدہ اٹھایا اور حتی المقدور خود کو اہل ملک کے ساتھ یک ذات کر لیا۔ ہمیں ان واقعات سے سبق لینا چاہیئے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اُس فرض کو ادا کریں جو ہندوستان کی طرف سے ہم پر عائد ہے تو ہم اُسی طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ ملک میں جتنے اشراف اور اکابر ہیں اُن کی امداد اور مشورہ سے فائدہ اُٹھائیں۔ یہ جواب کہ ہندوستانی دماغ میں تدبر اور قابلیت کا سرمایہ ناکافی ہے ایک بے معنی لغویت ہے۔" (حکومت خود اختیاری صـ۳۶)

لارڈ سیلسبری نے بھی لارڈ اڈسلے کی تائید کرتے ہوئے فرمایا۔ "جو لوگ ہندوستان سے سب سے زیادہ واقف ہیں اُن کی متفقہ رائے یہ ہے کہ چند چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستیں جن کا نظم و نسق عمدہ ہو۔ ہندوستانیوں کے سیاسی اور اخلاقی ارتقاء کے لئے حد درجہ مفید ہیں۔"

اسی قدیم نظام اسلامی اور جدید نظام انگریزی کے متعلق ہنیبرڈ لکھتا ہے:۔

"باوجودیکہ انگریزوں کی عام رائے اس زمانہ میں اسی طرف تھی کہ ہندوستان کا نظام اسی پرانے طریقہ پر رکھا جائے جیسا کہ قدیم سے چلا آتا تھا تاہم ہندوستان میں وہی نظام قائم رکھا گیا جو کمپنی کے زمانہ میں قائم ہو چکا تھا اور جس کی نسبت لارڈ سیلسبری نے ۱۸۶۷ء میں فرمایا تھا کہ ضابطے اور دستور کی طرف برطانوی حکومت کا رجحان اس کی شست گوش اور ابلہانہ لاپرواہی جو اکثر اس کی مکمل اور پیچیدہ تنظیم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ذمہ داری کا خوف اور اختیاراتِ نظم و نسق کا ایک جگہ مرکوز ہونا یہ سب باتیں ایسے اسباب کا نتیجہ ہیں جن کی ذمہ داری کسی شخص پر نہیں ہے۔ لیکن ان کی بدولت حکومت ناکارہ ہوگئی ہے اور اس نااہلیت میں قدرتی حالات اور اسباب سے مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک خوفناک تباہی نمودار ہوگئی ہے" (ہنیبرڈ جلد ۱۸۷ صـ۱۰۷۳ حکومت خود اختیاری صـ۳۶)

چنانچہ اس نظام کی وجہ سے جو مصیبت اس ملک میں ہوئی اُس کا اندازہ مسٹر رابرٹ نائٹ کی مندرجہ ذیل رائے سے بخوبی ہو سکتا ہے جو کہ انہوں نے زوالِ گجرات کی نسبت ظاہر کی ہے۔

"۱۸۰۷ء میں جبکہ گجرات میں ہم نے پہلا قدم رکھا تھا بہت سے دولت والے اور فارغ البال خاندان موجود تھے مگر اُن کے بدن پر آج کپڑا بھی نہیں ہے۔ تعلقداران سے ہمارے مطالبہ جات اس رقم سے جو وہ پہلے ادا کرتے تھے۔ تین گنے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں اور اس زیادتی کے معاوضے میں کوئی فائدہ نہیں ہے جو ان کو حاصل ہوا۔ ساہوکاروں نے جن سے تعلقداران کو تباہ کن شرح سود پر قرضے لینا پڑے ہیں اپنے مطالبے میں ان کی املاک اور دیہات کو قرق کرا لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قرضہ سر سے اونچا ہوتا جاتا ہے اور گلو خلاصی کی صورت نہیں۔ خیال تو کیجئے اُن کے گھرانوں کا آئندہ کیا حال ہو گا۔"

(دادا بھائی ص۲۳ حکومت خود اختیاری ص۳۷)

الغرض نظام اسلامی قدیم کی برکتیں تو ظاہر و باہر ہیں جن کا اقرار تمام مورخین کرتے ہیں اور جنہوں نے اعلانیہ طور پر ہندوستان کو رشکِ جناں بنا دیا تھا اسی بناء پر شاہانِ مغلیہ نے اپنے فرمانوں میں اُن کے باقی رکھنے اور انہیں کے ترقی دینے کا عہد لیا تھا۔ مگر انگریزوں نے چونکہ اپنی حرص و آز اور جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دولت مند ہو جانے کی خواہش کو اُس میں نہ پایا اور اس میں ہندوستانی پبلک کی پرورش اور ترقی تو دیکھی مگر انگریز قوم کی حریفانہ مسابقت کے آثار نہ دیکھے اس لئے اس کو چھوڑنا ضروری سمجھا اور حسبِ عادتِ قدیم اُس میں عیوب کا پروپیگنڈہ اور اپنی ابلیسانہ خواہشوں کو پورا کرنے والے نظام کو اُچھالنا شروع کر کے آہستہ آہستہ جاری کیا (کیونکہ دفعتہً جاری کرنا خطرناک تھا) جس کے نتیجہ میں ہندوستان انتہائی فلاکت اور بربادی میں مبتلا ہو گیا۔ حالانکہ انصاف پسند اور سمجھ دار انگریز اس کے مخالف رہے ۱۸۵۸ء کے بعد بھی اس کو جاری رکھا گیا اور وکٹوریہ کے اعلانات کو پسِ پشت ڈال دیا۔ مسٹر فلپ فرانسس جو کہ بنگال کونسل کا ممبر تھا۔ لکھتا ہے:۔

"ایک انگریز کو یہ معلوم ہو کر تکلیف ہونی چاہیئے کہ جب سے کمپنی کو دیوانی ملی ہے اہل ملک کی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی ہے اور یہ کمپنی کی تجارت وغیرہ کا نتیجہ ہے۔ میرے خیال میں یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے

یہ ملک ایک شخصی اور مطلق العنان حکومت کے زیرِ سایہ تو سرسبز ہوتا رہا مگر جب انگریزوں کے تصرف میں آیا تو تباہی کے کنارے پہنچ گیا۔

(ان ہیپی انڈیا ص ۳۳۴ حکومت خود اختیاری ص ۷۹)

خود لارڈ کلایو ۱۷۶۵ء میں کہتا ہے: "جو بدنظمی نظر آرہی ہے وہ کس چیز کا نتیجہ ہے وہ نتیجہ ہے چند لوگوں کی لوٹ مار عیش پسندی حرص اور تھوڑے عرصہ میں اس قدر دولت مند بن جانے کی ہوس کا جو صرف چند لوگ ہی بن سکتے ہیں"

بہرحال جو اعتراضات اور ننگِ انسانیت الزامات نظامِ انگریزی میں ابتدا سے پائے جاتے تھے اور آج تک ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں اُن کو نظامِ اسلامی پر تھوپنا جسارت اور شرمناک کارروائی ہے جو کہ ہمیشہ سے انگریزی ڈپلومیسیوں کے بائیں ہاتھ کا کرشمہ رہا ہے۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ لیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

(د) پھر مسٹر ہنٹر موصوف ص ۲۲۹ پر لکھتا ہے۔

"جب ہم نے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جس کو برقرار رکھنے کا ہم نے وعدہ کیا تھا تو ان بیچاروں کی جان میں جان آگئی"

یہ اقرار بھی واضح طور پر بتلا رہا ہے کہ انگریزوں نے بادشاہانِ اسلام سے عہود اور پیمانات کئے تھے اور وہ جملہ نظامِ اسلامی اور شہنشاہی قوانین اور طرزِ حکومت کا برقرار رکھنا تھا مگر انہوں نے ان سب کو توڑ ڈالا باقی رہا یہ اَمر کہ آیا نظامِ سابق کے توڑنے اور انگریزی نظام کے جاری کرنے سے ہندوستانی عوام اور کاشتکاروں کی جان میں جان آئی یا تلف ہوگئی۔ اوپر کے وہ تھوڑے سے نوٹ جو ہم نے معتبر حوالوں سے ذکر کئے ہیں اس پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی شہادتیں طول کے خوف سے ہم نے بہت کم ذکر کی ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ انتہائی برباد شدہ حالت کھلے بندوں اس کی کیفیت بتلا رہی ہے۔

(ہ) پھر ڈبلو ڈبلو ہنٹر صفحہ ۲۳۰ پر لکھتا ہے:۔

"مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں اُن پرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جو برطانوی حکومت کی بے راہ روی کی وجہ سے

بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ فوج سے بے دخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی قومی ناانصافی ہے اور اُن کے پرانے نظامِ مالیات سے ہمارا انحراف صریحاً وعدہ خلافی ہے۔"

ان جملوں میں ڈاکٹر ہنٹر وعدہ خلافی اور ناانصافی کو مسلمانوں کا عندیہ قرار دیتا ہے۔ حالانکہ خود تسلیم کر چکا ہے کہ واقع میں جو ہمارے وعدے اور عہود تھے ہم اُن پر قائم نہیں رہے اور ۱۷۶۵ء سے اس کے درپے رہے کہ اُن کا تار تار بکھیر دیا جائے چنانچہ سو برس کے عرصہ میں یعنی ۱۸۶۷ء تک ہم نے اس کو رفتہ رفتہ بالکل نیست و نابود کر دیا اور دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر پردہ ڈال کر اس عہد توڑنے اور نیا نظام قائم کرنے ہی کو بہتر اور ملک کے لئے مفید بتلاتا ہے اور نہایت شرمناک انداز سے اس حقیقت کو چھپانا چاہتا ہے جس کا ہم پول کھول چکے ہیں۔

مذکورہ بالا چند واقعات بطورِ نمونہ پیش کئے گئے ہیں جن سے ملکی اعلانات اور معاہدوں میں کھلی ہوئی غداری کا پتہ چلتا ہے۔ اب میں چند جدید واقعات پیش کرتا ہوں جن کا تعلق مسلمانوں اور اُن کے مذہبی مراکز "مقدس مقامات" سے ہے۔

مقاماتِ مقدسہ کے متعلق اعلانات اور غداری

۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو وائسرائے ہند نے امکنہ مقدسہ کے متعلق مسلمانانِ ہند کے لئے اعلان کیا تھا۔

"برطانیہ عظمیٰ اور ٹرکی میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے جو دولتِ عثمانیہ نے قصداً بغیر کسی قسم کی دھمکی دیئے جانے کے غلط مشوروں سے شروع کی ہے۔ ملک معظم کی گورنمنٹ ہزایکسی لنسی ہند کو اختیار دیتی ہے کہ وہ عرب کے مقدس مقامات اور عراق کی مقدس زیارت گاہوں اور جدہ کے ساحل کے متعلق ایک عام اعلان کر دیں۔ تاکہ ملک معظم کی بہت ہی وفادار ہندوستانی مسلم رعایا کو اس جنگ کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو۔ مذہبی سوال سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اعلان یہ ہے کہ یہ مقدس مقامات اور جدہ برطانیہ کے بحری اور بری فوج کے حملے اور دست برد سے بالکل محفوظ رہے گا تاوقتیکہ ہندوستانی حاجی اور زوار کی آمد و رفت میں کوئی دست اندازی نہ کی گئی۔ ملک معظم کی گورنمنٹ کے کہنے سے فرانس اور روس کی حکومتوں نے اسی قسم کا اطمینان دلایا ہے۔"

اس اعلان کو چند ہی دنوں میں توڑ ڈالا گیا اور ۱۹۱۶ء میں جدہ کے ساحل پر آٹھ دن گولہ باری کی گئی اور اس کے بعد فوجیں اتاری گئیں اور پھر انہی فوجوں سے جدہ سے مکہ معظمہ پر چڑھائی کی گئی۔ ترکی حکام اور افسروں اور سپاہیوں کو پہلے جدہ میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر اکے اسیر کیا گیا اور مصر بھیج دیا گیا۔ پھر مکہ معظمہ میں قشلہ اور قلعہ پر گولہ باری کرائی گئی اور جب تنگ آکر ترکی فوجوں اور افسروں نے ہتھیار ڈال دیئے تو اُن کو بھی اسیر کر کے مصر بھیجد یا گیا۔ پھر طائف پر چڑھائی کی گئی اور تقریباً ڈھائی مہینہ کی گولہ باری کے بعد جب ترکی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو ان کو بھی اسیر کر کے مصر وغیرہ بھیج دیا گیا۔ چونکہ میں (کاتب الحروف) اس زمانہ میں حجاز (طائف) میں بمعیت حضرت شیخ الہند مرحوم موجود تھا۔ ان سب واقعات پر براہِ راست مطلع ہوتا رہا۔ صورت یہ کی گئی کہ پہلے پہل جبکہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عمومی میں چناق قلعہ کی چھ سات مہینوں تک بحری قوت نے جس پر انگریزوں کو بہت زیادہ اعتماد اور غرور تھا کوئی کامیابی حاصل نہیں کی اور منہ کی کھانی پڑی اور بیک بینی و دوگوش اپنے ہزاروں سپاہیوں کو فنا کر کے لوٹنا پڑا۔ ترکوں کی شجاعت اور بہادری سے انتہائی شرمندگی اٹھانی پڑی تو اپنی بہادرانہ لڑائی سے مایوس ہو کر پرانی چال عیاری اور ڈپلومیسی کو عمل میں لانا ضروری سمجھا گیا اور شریف مکہ (شریف حسین) سے نامہ و پیام اور ساز باز کیا گیا۔ مصر میں جرنیل میکموہن اور حجاز و عرب میں کرنیل لارنس اس کے مرکز تھے۔ شریف حسین کو جمہوریہ عربیہ اور اس کی صدارت کا سبز باغ دکھایا گیا اور بے شمار اشرفیوں سے امداد کی گئی اور اپنے ولی نعمت ٹرکی کی غداری پر آمادہ کیا گیا۔ اوّلاً حجاز کا اقتصادی محاصرہ کر کے وہاں کے باشندوں کی آرام و زندگی کا میدان تنگ کر دیا گیا اور پھر شریف مذکور سے جو کہ بالکل ہمدم و ہمراز ہو گیا تھا بغاوت کا اعلان ۵ رجون ۱۹۱۶ء میں کرادیا گیا۔ شریف کی بدوی فوجوں سے مدینہ منورہ اور جدہ طائف، مکہ معظمہ پر حملہ کرایا گیا۔ مگر یہ بدوی فوجیں ترکوں کی باقاعدہ مسلح فوجوں پر نہ غالب آسکیں اور نہ ان کو ہتھیار رکھنے اور شہروں کے تخلیہ کرنے پر مجبور کر سکیں تو شریف حسین کی اس فرمائش پر کہ گولہ باری کی جائے (جو بین الاقوامی معاہدوں کے خلاف تھی اور یہ کہ باقاعدہ فوج سے جدہ اور مکہ معظمہ پر حملہ کیا جائے) یہ حکم کیا گیا کہ اہل مکہ و جدہ سے ایک محضر دستخط کرا کر انگریزی بحری ذمہ دار کے پاس بھیجے کہ ہم کو ترکوں سے آزاد کراؤ۔ ہم سخت مجبور ہیں چنانچہ

یہ عمل کیا گیا اور اُس پر جبریہ طور سے سربرآوردہ اہالی شہر کے دستخط کرائے گئے اور کماندار بحری قوت کے پاس محضر بھیجا گیا اُس کے پہنچنے کے بعد گولہ باری شروع کر دی گئی۔ چنانچہ کرنل لکھتا ہے۔

"۱۹۱۶ء میں شاہ حجاز کو ہم نے اتحادیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا"۔

(ڈیلی اکسپریس لندن مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۲۰ء)

لندن ٹائمز لکھتا ہے:۔

دو جدّہ کے ساحل پر انگریزی جہازوں نے گولہ باری کی۔ نیز ٹائمز کا نامہ نگار لکھتا ہے۔ اس کارروائی نے مرتدین کی مدد کی۔ اگرچہ برطانوی فوج ۲ ہزار فٹ یا زیادہ سے زیادہ تین ہزار گز کے فاصلے سے آگے نہیں بڑھ سکی اور بہت سی رکاوٹوں سے جن کا کوئی علاج نہ تھا گولہ باری کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا"

مگر اس تمام کارروائی کو ہندوستان سے بالکل چھپایا گیا۔ جب ہندوستان میں ایک عرصہ کے بعد خبریں پہنچیں تو چاروں طرف آگ بھڑک اٹھی۔ جو کہ سب کو معلوم ہے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ افسوس کہ ان کھلی کھلی عہد شکنیوں اور غداریوں کے ہوتے ہوئے بھی تحریکاتِ آزادی کی مخالفتیں عمل میں لائی گئیں۔ فالی اللہ المشتکی۔

(۱۲) انگریزوں کا خاص طور پر مسلمانوں کو طرح طرح سے برباد کرنا

مسلم عوام کی صلاحیت | یورپین عموماً اور انگریز خصوصاً تمام ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کے دشمن رہے ہیں اور اُن کو نیم وحشی غیر متمدن خارج از انسانیت وغیرہ کہتے ہوئے انکی عزت، مال اور ذرائع دولت وغیرہ پر نہایت بربریت سے چھاپہ مارتے رہے ہیں مگر بالخصوص مسلمانوں پر انکو سیاسی منافات کا بھی ہمیشہ سے خیال قائم رہا اور ان کو سخت ترین دشمنی کی آگ میں ڈالا گیا جس کی بنا پر مسلمانوں کے برباد کرنے اور فنا کے گھاٹ اتار دینے کا سب سے زیادہ عملدرآمد جاری کیا گیا۔ بالخصوص اس وقت سے جبکہ اُن کو بادشاہ دہلی سے دیوانی کا صیغہ دربارہ بنگال و آسام بہار و اڑیسہ دے دیا گیا تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ اپنے ولی نعمت کو پہچانتے اور اس کے ساتھ وفاداری اور نمک

حلالی کو عمل میں لاتے مگر رذیلوں کے ساتھ احسان کرنا ہی غلطی تھا ؎

نکوئی با بداں کردن چنان است — کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

شہنشاہ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں، عالمگیر اور ان کے وارثوں نے انتہائی غلطی کی تھی کہ ان غیر اقوام اور رذیل کو اپنے ملک میں اقامت اور حقوق شہریت کی معہ تجارت اجازت دے دی اور بار بار اُن کی نالائقی کو دیکھتے اور تجربہ کرتے ہوئے بھی بڑھاتے رہے۔ چنانچہ کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنوں کی بغاوت اور شاہی فوج کا اُن پر مسلط ہونا اور بارگاہ سلطانی میں ڈیپوٹیشن کا جس کا ایک ممبر وہ بھی تھا دہلی آنا اور شہنشاہ سے معافی مانگ کر انگریز مجرمین کا رہائی دلانا وضاحت سے ذکر کرتا ہے۔ اس کے باوجود شاہانِ مغلیہ ان یورپین لوگوں پر اعتماد کر کے بڑے عہدے بھی عطا کرتے رہے۔ بہر حال جو کچھ نہ ہونا تھا وہ پیش آیا۔

الغرض انگریزوں نے دیوانی پر اقتدار پاتے ہی مسلمانوں کے ساتھ سوت کا معاملہ برتنا شروع کیا اور ہر صیغہ سے مسلمانوں کو چھانٹنا اور راہبوں سے یا مسلمانوں کے دشمنوں سے بھرنے کا معاملہ تدریجی طور پر جاری کیا۔ اس زمانہ میں تمام ملکی اور فوجی صیغوں پر مسلمان ہی چھائے ہوئے تھے اور انہیں میں اعلےٰ قابلیت سیاسی اور فوجی تھی۔

چنانچہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر ص۲۳۷ پر لکھتا ہے:۔

”حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکمتِ عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی اُنہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں“

صفحہ ۲۳۶ پر لکھتا ہے:۔

”ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ ہندو محض شکریہ کے ساتھ ان چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے تھے جو اُن کو سابق فاتح اپنے دسترخوان سے ان کی طرف پھینک دیتے تھے اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں اور کلرکوں کی تھی“

صفحہ ۲۲۲ پر لکھتا ہے :-

"مختصراً یہ کہ مسلمان نواب فاتح تھے اور اس حیثیت سے حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ہندو ماہر اقتصادیات یا کوئی ہندو جرنیل بھی نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔ ان مثالوں کی موجودگی ہی اس امر کا بہترین ثبوت ہے کہ ایسا شاذونادر ہوتا تھا۔"

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۲۳۱ پر لکھتا ہے۔

"لیکن پھر بھی سوچنا چاہیئے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے یا ہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔"

صفحہ ۲۳۲ پر لکھتا ہے :-

"کارنوالس کے مجموعہ قوانین نے اس اجارہ داری کو محکمہ قانون میں اُس قوت کے ساتھ نہیں توڑا جس قوت کے ساتھ اس نے دیوانی محکمہ میں توڑا تھا لیکن پھر بھی کمپنی کے پہلے پچاس سالہ دورِ حکومت میں حکومت کی ملازمتوں میں سب سے بڑا حصّہ مسلمانوں ہی کا تھا لیکن دوسری نصف صدی میں ہوا کا رُخ بدل گیا۔"

صفحہ ۲۴۶ پر لکھتا ہے۔

"انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے وہ (مسلمان) ملک کی سیاسی ہی نہیں بلکہ دماغی قوت بھی تسلیم کئے جاتے تھے۔"

اور صفحہ ۲۶۵ پر دربارہ اسلامی تعطیلات لکھتا ہے :-

"گویا وہ قوم جو کبھی ہندوستان کے تمام عدالتی عہدوں پر فائز تھی اب اس حد تک ذلیل ہو چکی ہے۔ بہرحال یہ جاننا تسلّی بخش ہے کہ اور نہیں تو اس بے انصافی پر عملدرآمد ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حکومتِ اعلےٰ نے مداخلت کی اور حاکمانہ طور پر اسلامی تعطیلات کے چند دن مقرر کر دیئے یقیناً وہ اتنے نہ تھے جتنے مسلمان چاہتے تھے۔"

مسٹر ہنری ہیرنگٹن طامس (بنگال سول سروس کا پنشنر) اپنے رسالہ "بغاوتِ ہند اور ہماری آئندہ پالیسی" کے صفحہ ۱۳ تا ۱۷ ایں ۱۸۵۸ء میں لکھتا ہے:۔

"عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندو اُن کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں کارگذاری کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے سرکاری ملازمتیں زیادہ تر انہیں کو ملتی ہیں۔ اس طرح ان کو سرکاری کاموں اور ملکی مصالح سے واقفیت کا موقعہ ملا اور ان کی رائے کو وقعت حاصل ہو گئی۔"

اگرچہ مسلمانوں کا گرانا انگریزوں نے ۱۷۶۵ء سے شروع کیا تھا اور اس طرح گرتے گرتے سو سال کا عرصہ گزر گیا تھا مگر پھر بھی ۱۸۵۸ء میں ان کی دماغی اور عملی قابلیت کی دوسروں پر فوقیت اس درجہ باقی تھی جس کو ہیرنگٹن طامس بتاتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی قابلیت سیاسیات اور حکومت وغیرہ میں پہلے کس درجہ پر فائق ہو گی جس کی صریح دلیل ہندوستان کا انگریزوں سے پہلے زندگی کے ہر شعبہ میں بالاتر ہونا اور روزافزوں ترقی کرنا ہے جس کو ہم واضح کر آئے ہیں۔ مگر انگریزوں نے اپنی خود غرضیوں اور سیاسی رقابت اور آئندہ کے تحفظات کی بنا پر کیا کیا اس کی شہادت مندرجہ ذیل اقتباسات دیں گے:۔

مسلمانوں کو برباد کرنے کے طریقے

(الف) مسلمان حاکموں کی برطرفی ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۱۹۵ پر لکھتا ہے:۔

"مسلمان شہنشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا"

صاحب حکومت خود اختیاری صفحہ ۱۴۰ پر لکھتا ہے:۔

"ہندوستان میں انگریزی عملداری کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہندوستانی ابتداء سے بڑے عہدوں سے (جن پر عموماً مسلمان فائز تھے) قطعاً خارج کر دیئے گئے۔ قوانین بنانے میں اور ملک کے

لوگوں کے درمیان انصاف کرنے میں اُن کا کوئی اختیار باقی نہیں رہے۔ عملداری کی اس خصوصیت کے مضر اثرات کا اندازہ منجملہ دیگر انگریزوں کے سرطامس منرو کو بخوبی ہوا جس کا اظہار انہوں نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے ''وضع قوانین میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہے اور قوانین کے عملدرآمد میں اُن کو بہت کم دخل ہے۔ باستثنار چند نہایت چھوٹے عہدوں کے وہ کسی بڑے عہدہ تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول نہیں پہنچتے۔ وہ ایک ادنیٰ قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں۔ تمام فوجی اور دیوانی عہدے جو کچھ بھی اہمیت رکھ سکتے ہیں اب یورپینوں کے قبضہ میں ہیں جس کا پس انداز روپیہ خود ان کے ملک کو چلا جاتا ہے''

ان بڑے عہدوں اور ملازمتوں سے ان کا خارج کرنا ناقابلیت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ صرف ان کے ہندوستانی رقیب اور مسلمان ہونے کی وجہ سے تھا۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ خود ذمہ دار انگریزوں کا اقرار ہے کہ ہندوستانی مسلمان قوت فیصلہ اور دماغی قوتوں میں انگریزوں سے فائق تر تھے۔

سرارسکن پیری کہتا ہے:۔

''ہندوستانی جوزین کی قوتِ فیصلہ کمپنی کے اُن ججوں سے جو اپیل سنتے تھے بدرجہا بہتر تھی'' (حکومت خود اختیاری صفحہ ۳۰)

جان سلیور (مدراس گورنمنٹ کا ممبر) کہتا ہے:۔

''وہ لوگ (باشندگانِ ہند) ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائیگی کے لئے وہ مجبور کئے جاتے ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے قوانین کو جن کی تعمیل اُن پر فرض ہوتی ہے۔ مرتب کرنے میں ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی اپنے ملک کے انتظام میں اُن کا کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا اور ان کے حقوق دیئے جانے سے اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ اُن میں اس قسم کے فرائض انجام دینے کیلئے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی کمی ہے'' (رپورٹ سلیکٹ کمیٹی صفحہ ۴۰۲ دت جلد ۲)

اور پھر اُس پر مزید یہ طرّہ تھا کہ ہندوستانی ججوں کو باوجود اس اعلیٰ صلاحیت کے یورپین ججوں کی تنخواہ کا صرف پچیسواں حصّہ ملتا تھا۔ سرارسکن پیری لکھتا ہے۔

"یورپین جج کو تقریباً تین ہزار پونڈ سالانہ تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن ہندوستانی منصف صرف ایک سو بیس پونڈ سالانہ پاتا ہے"

(ب) دلسوز بے انصافیاں۔ توہین و تذلیل اوقاف کی بربادی۔ جائدادوں کی ضبطی | "لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے افسروں سے لیکر چھوٹے افسروں تک (موجودہ وائسرائے سے زیادہ کسی نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں پر زیادہ غور نہیں کیا) ہر شخص کو یقین ہو گیا ہے کہ ہم نے ملکہ کی مسلمان رعایا کے حقوق پورے نہیں کئے اور ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جس کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہے اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد ہوتا دیکھ رہا ہے۔ اسکو شکایت ہے کہ جو لوگ کل تک اس ملک کے فاتح اور حکمران تھے آج نان جویں کے روکھے سوکھے ٹکڑوں کو بھی ترس رہے ہیں اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اُن کے اپنے انحطاط کا عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہو گا کیونکہ اُن کا انحطاط بھی تو ہماری ہی سیاسی غفلت اور لاپرواہی سے مرتب ہوا۔ جب تک اس ملک کی عنان حکومت ہمارے ہاتھ میں نہیں آئی تھی تب بھی مسلمانوں کا یہی مذہب تھا وہ ایسا ہی کھانا کھاتے اور جملہ ضروریاتِ زندگی میں ویسا ہی طرز بود و ماند رکھتے تھے جیسا کہ اس زمانہ میں وہ اب بھی وقتاً فوقتاً اپنے احساس قومیت اور جنگی اولوالعزمیوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد کیا گیا ہے"

(صفحہ ۲۱۲ و ۲۱۳ ہمارے ہندوستانی مسلمان)

مگر یہ جب ہی ممکن ہے کہ ہم ان متواتر اور مسلسل ناانصافیوں کے احساس کو دور کر دیں جو انگریزی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔

"اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے کہ مسلمان ہم پر کیسے کیسے شدید الزامات عائد کرتے ہیں۔ ایسے الزام جو شاید ہی کسی حکومت پر عائد کئے گئے ہوں۔ (۱) وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے اُن پر ہر قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ہے (۲) وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسا طریقہ تعلیم رائج کر دیا

ہے جس سے ان کی قوم بہرہ ور نہیں ہو سکتی اور جو اُن کی ذلّت و خواری کا سبب بن گیا ہے (۳) وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزارہا خاندانوں کو مبتلائے آفات کر دیا ہے۔ یہ قاضی نکاح کے لئے مذہبی اجازت دیتے تھے اور اُن کا کام قدیم زمانہ ہی سے اسلام کے متبرک قوانین کی نگہداشت اور نفاذ و عمل میں لانا تھا (۴) اُن کو شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لئے اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیا۔ (۵) ہمارا بڑا جرم اُنکے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بددیانتی سے کام لیتے ہوئے اُن کے سب سے بڑے تعلیمی سرمائے کا غلط استعمال کیا۔ ان مخصوص الزامات کے علاوہ جن کے متعلق اُن کو یقین ہے کہ بآسانی ثابت کئے جا سکتے ہیں اور بھی بہت سی شکایات ہیں جو محض جذبات پر مبنی ہیں۔ اور شاید انگریزوں کے تصوّر سے قاصر دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں۔ مگر آئرلینڈ کی طرح ہندوستان میں بھی یہ شکایتیں مسلمانوں کو حاکموں سے بدظن رکھتی ہیں۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا تو مسلمانوں کے ملازمین کی حیثیت سے لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت اُن کی مطلق پرواہ نہیں کی اور نو دولت طبقہ کی گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ مختصر یہ کہ ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت کو غفلت اور بے اعتنائی کا مجرم، جذبات شجاعت سے معرا، اور سرمایہ میں کمپنیوں کی طرح بددیانتی سے کام لینے والے اور دیگر بڑی بڑی ناانصافیوں کا جن کا سلسلہ سو سال تک پھیلا ہوا ہے مرتکب ٹھیراتے ہیں۔"

(صفحہ ۲۰۷ تا ۲۰۹ ہمارے ہندوستانی مسلمان)

"یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اُس طریقۂ تعلیم سے پرہیز کرتے ہیں جو فی نفسہٖ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ لیکن اُن کے ملی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔ حقیقت میں اس طرح اُن کی ضروری سے ضروری احتیاجات بھی پوری نہیں ہوتیں۔ یہ طرز تعلیم اُن کے مفاد کے خلاف اور اُن کی مدنی روایات کے منافی ہے۔"

(ڈبلیو ہنٹر از مسٹر بے لے۔ سکریٹری محکمہ داخلیہ حکومتِ ہند)

"تعلیم یافتہ مسلمان جن کو پرانے طریقہ پر ناز ہے حکومت کے اُن عہدوں اور ملازمتوں میں جگہ نہیں پاتے جن پر اس سے پیشتر ان کی اجارہ داری قائم تھی۔ وہ حیران ہیں کہ یہ سب کچھ اور دیگر ذرائع زندگی قابل نفرت ہندوؤں کے ہاتھ میں چلے گئے یا جا رہے ہیں۔ جن مسلمانوں کی تعلیم ذرا بہتر ہوتی ہے۔ وہ بھی نالاں ہیں۔ گو اُن کا یہ احساس مذہبی ایذارسانی کی حد تک نہیں پہنچا۔ اگرچہ اُن کے مذہبی خیالات کے مطابق لاپروائی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اُن کے تعصب کو جس کا جواز قرآن مجید سے ہر وقت ثابت کیا جا سکتا ہے، یہاں تک برانگیختہ کر دیا گیا ہے کہ ڈر ہے کہ کہیں ساری مسلمان قوم بے وفا، جاہل اور متعصب گروہ کی شکل اختیار نہ کر لے" (صہ ۲۱۱ و صہ ۲۱۲)

"انہیں یہ رنج نہیں کہ حکومت کی نوازشوں سے حسبِ دستورِ سابق انہیں کوئی حصہ نہیں ملتا انہیں یہ رنج ہے کہ وہ اس سے بتدریج خارج کیے جا رہے ہیں۔ وہ اس بات کا گلہ نہیں کرتے کہ اب زندگی کی دوڑ میں انہیں ہندوؤں کا مقابلہ در پیش ہے۔ انہیں گلہ ہے تو یہ کہ اور کہیں نہیں تو کم از کم بنگال میں اُن کے لئے عرصۂ حیات تنگ ہو چکا ہے" (صفحہ ۲۱۴)

"مختصراً یوں کہئے کہ یہ وہ قوم ہے جس کی روایات بہت شاندار ہیں مگر جس کا اس کے باوجود کوئی مستقبل نہیں۔ اگر اس قوم کی تعداد تین کروڑ ہے تو یہ محض اُس قوم کے لئے ہی نہیں بلکہ اس قوم کے حاکموں کے لئے بھی ایک بہت ہی اہم سوال ہے۔ مشرقی بنگال میں کاشتکاروں کی بہت زیادہ تعداد مسلمان ہے" صہ ۲۱۴

"درحقیقت میں سارا صوبہ مسلمان امراء سے جو کبھی طاقتور اور برسرِ اقتدار تھے بھرا پڑا ہے۔ وہ گذشتہ عظمت کی نشانیاں ہیں اس وقت بھی مرشد آباد میں ایک اسلامی عدالت ایک نقلی سلطنت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ ہر ضلع میں کسی نہ کسی شہزادہ کی اولاد بے بام محلات اور پُر از خار تالابوں کے درمیان نہایت تکبر اور ترش روئی سے خون جگر پیتی نظر آتی ہے۔ اس قسم کے بہت سے خاندانوں کو میں بذاتِ خود جانتا ہوں۔ اُنکے گھروں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی کمی نہیں اُنکے پوتے پوتیاں بھی ہیں اور اُن کے نواسے نواسیاں بھی۔ لیکن اس فاقہ مست گروہ میں ایک بھی ایسا نہیں ہے

جیسے اپنے ہی لئے زندگی میں کام کرنے کا کوئی موقع حاصل ہو۔ وہ غلیظ پرآمدوں اور ساتھ کے ٹپکتے ہوئے مکانوں میں اداس زندگیاں بسر کر رہے ہیں ۔ اور دن بدن قرض کے تباہ کُن گڑھوں میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ تاآنکہ پاس ہی کا ہندو مہاجن ایک دن اُن سے جھگڑا مول لے لے گا اور چند لمحوں میں قرضخواہوں کا ایک جمِ غفیر عدالت کے حکم سے بیع قطعی کا حق حاصل کر کے قدیم مسلمانوں کے اس خاندان کو دیکھتے دیکھتے ہڑپ کر لے گا۔ یہاں تک کہ صفحۂ ہستی سے اس کا نشان تک مٹ جائیگا۔ ص ۲۱

"اگر کسی خاص مثال کی ضرورت ہو تو میں ناگرہ کے راجاؤں کی مثال پیش کر سکتا ہوں پہلے پہل جب انگریزوں کو اُن سے واسطہ پڑا تو اُن کی سالانہ آمدنی دو صدیوں کی غلطیوں اور فضول خرچیوں کے باوجود پچاس ہزار پونڈ تھی۔ یہ راجہ اپنے لئے ستونی شامیانے میں بیٹھ کر اپنی اس ریاست کا نظارہ کیا کرتے تھے جو آج کل دو انگریزی اضلاع پر منقسم ہے۔ اُن کی مسجدیں اور لاتعداد بارہ دریاں ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چاروں طرف چلی گئی تھیں اور صاف و شفاف پانی میں جس کے اندر ایک بھی خودرو پودا نظر نہیں آتا تھا منعکس ہوتی تھیں۔ راجہ کی خانگی سیڑھیوں سے ہر روز ایک سنہری بجرا مستانہ وار اُس جزیرہ کا رُخ کرتا ہے جو اس جھیل کے عین وسط میں واقع ہے اور رنگا رنگ پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔ محل کے دروازہ پر سپاہی پہرا بدلتے رہتے ہیں اور جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو شہزادیوں کے باغات سے بچوں کے کھیل کھلانے اور خواتین کی شیریں آوازیں سننے میں آتی ہیں "

مگر اب سوائے فلک نما ڈیوڑھی کے اس محل کا کوئی نشان باقی نہیں۔ مسجد کی بے بام و در دیواروں سے استر کاری کی تمام زیبائشیں مٹ چکی ہیں۔ وسیع و عریض باغ اور اُن کی صاف ستھری نہریں ویرانہ ہیں ۔ اب اُن میں چاولوں کی کاشت ہوتی ہے اور اُن کے رنگا رنگ مچھلیوں والے تالاب گندے اور سڑے ہوئے گڑھوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ بارہ دریوں کی جگہ اب صرف اینٹوں کا ملبہ ہے۔ کہیں کہیں اگر کسی دیوار کا کوئی حصہ نظر آجاتا ہے تو عربی وضع کی کسی محراب دار کھڑکی

سے اس نظارہ پر اور بھی حسرت برسنے لگ جاتی ہے۔

"مگر ان میں سب سے زیادہ حسرتناک منظر شاہی جھیل کا ہے جس کے کنارے محل اب بھی استادہ ہے جو پرانے نہ ماننے کا خوبصورت اور ستونوں والا محل نہیں بلکہ ایک ویران کھنڈر ہے اس کی خراب وخستہ دیواروں کو سطح آب پر جمی ہوئی کائی سے بڑی ہی مناسبت معلوم ہوتی ہے (نوٹ از مصنف! میں عمارت اور تالاب کا وہ نقشہ بیان کر رہا ہوں جو میں نے ۱۸۶۴ء میں دیکھا تھا میں نے سنا ہے کہ تالاب کو صاف کیا گیا ہے اور محل بھی خستہ ہو گیا ہے) وہ بدنصیب خواتین جو کبھی رانی کہلاتی تھیں اب کبھی شام کی سیر کو پردہ دار بجروں میں نہیں نکلتیں ان کے زنانخانوں پر چھت تک باقی نہیں۔ ان کے مکین اب معمولی مکانوں میں چلے گئے ہیں جو تباہ شدہ اصطبل کے پاس واقع ہیں۔ ناگر خاندان کی گذشتہ عظمتوں کی یاد صرف ایک نہر سے باقی ہے جو اب بھی دلدلوں کے بیچ میں اُسی راستہ سے بہتی ہے جس سے کبھی محلوں کے درمیان سے گزرتی تھی اور جسے دیکھ کر قدیم الایام روما کی خاموش یادگاروں کی ایک ہلکی سی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ دریائے ٹائبر کے سوائے روما کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ دنیا کی بے ثباتی بھی کیا چیز ہے کہ جو شئے مضبوطی سے قائم کی جائے وہی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور جو نقل مکانی کرتی رہے اُس کو ثبات و دوام حاصل ہو جاتا ہے"۔

اس خاندان کے نمائندے خستہ محل کے ایک کونے میں دبکے ہوئے اپنی عسرت زدہ زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ وہ نشہ آمیز مٹھائیوں کو چوستے اور خودرو پودوں سے اٹی ہوئی جھیل پر حسرت بھری نگاہوں سے تکتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی سیاست دان ایوان عام میں سنسنی پیدا کرنا چاہتا ہو تو اُس کے لئے یہ کافی ہے کہ بنگال کے کسی ایسے مسلمان گھرانے کی سچی داستان بیان کر دے۔

وہ اپنی کہانی کو اس طرح شروع کرے گا۔ ایک قابل شہزادہ بہت بڑے علاقہ پر حکمرانی کر رہا ہے۔ وہ اپنی فوج کا سپہ سالار ہے اُس کے بے شمار خدمت گار ہیں وہ مشرقی شاہانہ دربار کی تمام روایات کو برقرار رکھتا ہے

اور بسترِ مرگ پر مسجدوں کی تعمیر اور مذہبی اوقاف کا حکم دے کر اپنی روح کو تسکین دیتا ہے اس کے بعد وہ اس کے موجودہ بے عقل جانشین کی تصویر کھینچے گا۔ وہ اُن جنگلوں میں جب انگریز شکاریوں کی آمد کی خبر سنتا ہے تو اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے اور اگر اُس کے خادم مجبور بھی کریں کہ اجنبیوں کی عزت افزائی کرنی ضروری ہے تو وہ اُن سے ملاقات پر ہمیشہ ایک ہی بات دہراتا ہے اور وہ یہ کہ فلاں تاجر نے ابھی ابھی اُس کے محل کو چند سو روپیوں کے بدلے قرق کر لیا ہے۔

میں نے بنگال کے مسلمان نوابوں اور کاشتکاروں کے حالات ذرا وضاحت سے بیان کئے ہیں تاکہ انگریزوں کے سامنے اُن لوگوں کا نقشہ کھینچ دوں جن کی شکایات کا بیان اس باب میں کیا جائے گا میں یہ بھی بتلا دوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اٹھایا ہے۔ پھر اگر میں دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہو کہ یہ بیانات تمام مسلمانانِ ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف فرمایا جائے ــــ میری رائے میں اگر کسی قوم کی حالت کو درست کرنے کی ضرورت کبھی محسوس ہوگی تو وہ جنوبی بنگال کے مسلمان نواب ہیں اُنکے دولت و ثروت کے پرانے ذرائع ختم ہو چکے ہیں الخ،، (صفحہ ۱۷۱ تا ۱۷۲ ہمارے ہندوستانی مسلمان)

مسلمانوں کی آمدنی کے ذرائع

(۱) بنگال میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ دیوانی کا محکمہ ہے۔ جس پر مسلمانوں کی اجارہ داری قائم تھی۔

(۲) محکمہ پولیس بھی آمدنی کا اچھا خاصا بڑا ذریعہ ہے اور اس کے تمام افسر بھی مسلمان تھے۔

(۳) آمدنی کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی عدالتیں ہیں اور یہاں بھی مسلمان چھائے ہوئے تھے۔

(۴) اور ان سب سے بڑھ کر فوج۔ اس کے عہدہ داروں میں وہ لوگ نہیں آسکتے تھے جو اپنے فرائض کو معمولی منافع پر بجالاتے بلکہ فاتحوں کی ایک جماعت ہوتی تھی جو اپنے کاشت کاروں کے تمام فوج میں درج کراتے اور اُن کی تنخواہیں شاہی خزانے سے خود اپنے لئے وصول کرتے۔ گویا آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے خاندانی مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آجکل ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں مختصراً یہ کہ مسلمان نواب فاتح تھے اور اسی حیثیت سے حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔" صـ۲۲۲

"ایک نواب کے خزانے میں ہر سال تین ذرائع سے دولت جمع ہُوا کرتی تھی۔ فوج کی افسری، مالگذاری جمع کرنے کی خدمت، اور سیاسی وقانونی خدمات کی سرانجام دہی۔ یہ اس کی عظمت کے جائز ذرائع تھے لیکن اسکے علاوہ عدالتی خدمات اور سینکڑوں اور ذرائع بھی تھے جو فراہمی دولت میں کام آتے۔" صـ۲۲۲

مسلمانوں کی ذرائع آمدنی میں سے برطانوی حکومت کے ماتحت کیا باقی رہ گیا

(۱) سب سے پہلے جنگی خدمات کو لیجئے جن کا دروازہ اُن پر تمام وکمال بند ہے۔ اچھے گھرانے کا کوئی مسلمان فرد ہماری فوج میں داخل نہیں ہوسکتا اور اگر ہو بھی جائے تو وہ اُس کے لئے دولت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔" صـ۲۲۳

(نوٹ) بہت ہی کم مسلمانوں کے پاس گورنر جنرل کی کمیشن ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے ملکہ کی کمیشن کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہندوستانی صرف سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہوسکتے ہیں اور شاذونادر اگر کوئی افسری تک پہنچ بھی گیا ہے تو اُس نے بھی درجہ بدرجہ ہی ترقی کی ہے اور اس قاعدہ سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں صرف ایک مسلمان آنریری کپتان کے درجہ تک پہنچا ہے اور وہ کپتان حیات علی ہے جس کی سفارش کرنل روٹری نے غدر کے زمانہ میں کی تھی۔ یہ مسلمان ملکہ کے کمیشن لینے کا ہر طرح حق دار ہے۔ کیوں کہ

میں ذاتی طور پر اُس سے اور اُس کے کارناموں سے واقف ہوں "

حاشیہ صفحہ ۲۴۳

مسلمانوں کی سفارش برائے فوجی خدمات

"ذاتی طور پر میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستانی امراء کو جلد یا بدیر بعض شرائط کے ماتحت انگریزی فوج میں کمیشن افیسر کی حیثیت سے داخل کر لینا چاہیئے۔ آج کل کوئی کمیشن افسر ملکہ کی فوج میں ملازمت سے مال و دولت حاصل نہیں کر سکتا اور اس بات کو مسلمان بھی اچھی طرح جانتے ہیں مگر وہ ابھی تک فوجی زندگی کے اعزازات اور معقول تنخواہ کے خواہش مند ہیں اور اس بات کو سختی سے محسوس کر رہے ہیں کہ اُن کا آبائی پیشہ ہمیشہ کے لئے اُن سے چھن گیا" صفحہ ۲۲۳

مسلمانوں کا دوسرا ذریعہ آمدنی

مسلمان امراء کا دوسرا ذریعہ آمدنی تھا مالگزاری جمع کرنا۔ اس اجارہ داری کی بنیاد اسلامی قوانین پر قائم کی گئی تھی۔ ٹیکس کی ادائیگی مغلوبیت کی نشانی ہے۔ فاتح صرف ٹیکس ہی نہیں لیتا تھا بلکہ ٹیکس وصول کرنے کا پُر نفع کام بھی انہیں کے سپرد ہوتا تھا۔ اس بات کو بار بار دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہندوستان میں فاتح اور مفتوح کے تعلقات اسلامی قوانین کے اس قدر ماتحت نہ تھے۔ جتنے سیاسی اغراض کے۔ اسلئے پُر جوش اور غیر ملکی فاتحوں کو دیوانی کی تفصیلات میں الجھنا ناپسند تھا۔ وہ کاشتکاروں سے براہ راست معاملہ کرنے کی ذمّہ داری اپنے ہندو پیادوں پر چھوڑ دیتے۔ یہ طریقہ اس قدر عام تھا کہ اکبر نے جب ایک ہندو کو وزیر مالیات کے عہدہ پر فائز کیا اور اسی عذر کے ماتحت ٹوڈرمل نے مالیات کا قلمدان ہاتھ میں سنبھالا تو مسلمان شہزادوں نے احتجاج کے طور پر ایک وفد دربار شاہی میں بھیجا لیکن شہنشاہ نے جواب دیا "تمہاری جائدادوں اور معافی کی زمینوں کا انتظام کن کے ذمّہ ہے "؟ انہوں نے جواب دیا ہمارے ہندو دلالوں کے" "بہت اچھا تو مجھے بھی اپنی ریاست کے انتظام پر ایک ہندو کو مقرر کرنے کی اجازت دیجئے "

مالیات کے بڑے بڑے عہدے تو مسلمانوں ہی کے پاس رہے لیکن کاشتکاروں کے ساتھ براہ راست معاملہ کرنے کا دستور ہندو پیادوں کے ہاتھ میں رہا۔ حقیقت میں یہ ہندو ملازمین محکمہ مالیات کے ماتحت تھے جو مالگذاری کو مسلمان افسروں تک پہنچاتے مگر اس سے پہلے منافع کی رقم سے خود اپنا حصہ وضع کر لیتے۔ محکمۂ مالیات شہنشاہ اکبر کے سامنے جو ابدؔ تھا اور اسلامی نظام مالیات کی ایک بہت ہی اہم کڑی "مالگذاری کے قوانین" وہ نافذ کرتا لیکن یہ نفاذ عدالتوں کے ذریعہ نہیں بلکہ تلوار کے زور سے ہوتا۔ اگر مالیہ وصول نہ ہوتا تو سپاہیوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنی غارت گری سے دیہاتیوں کی زندگی کو اُس وقت تک اجیرن بنائے رکھیں جب تک کہ اُن سے آخری پائی تک وصول نہ ہو جائے۔ کاشتکار اور ہندو پیادے دونوں کا وتیرہ ہمیشہ یہ ہی رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مقررہ رقم پر چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اس کے برعکس اعلیٰ مسلمان عہدہ داروں کی کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو مقررہ رقم سے زیادہ وصول ہو۔

بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا۔ قانوناً ہم صرف شہنشاہ دہلی کے دیوان تھے۔ یعنی چیف ریونیو افسر[۱]۔ اسی بناء پر مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہم کو اُسی اسلامی طریقہ پر کاربند رہنا چاہیئے جس کے انتظام کا ہم نے اس وقت ذمہ لیا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقعہ یہی تھا۔[۲]

انگریزوں کا طاقتور ہوتے ہی مسلمانوں کو برباد کرنا اور معاہدوں کو توڑ ڈالنا

انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمان عہدہ داروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا

(نوٹ) [۱] مسٹر ایچی سن کی دستاویزات میں ۱۲۔ اگست ۱۷۶۵ء کا فرمان یا ایسٹ انڈیا کمپنی کی سہ ماہی رپورٹ ۱۸۱۲ء کو دیکھئے ع۱۴ سے لے ع۲۰ تک۔

[۲] وہابی مقدمات کا انچارج افسر لکھتا ہے "ہم نے دیوانی اس وعدے کے ساتھ لی تھی کہ ہم اسلامی حکومت کو جیسی کہ اس وقت قائم ہے برقرار رکھیں گے۔ ہم نے ایسا ہی کیا تھا"

وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اٹھائے کہ اس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یا اپنی سب سے کاری ضرب جو ہم نے پُرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پُر فریب تھی کہ اُس کی پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو۔ میرا مطلب ہے اُن تبدیلیوں سے جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں اور جن سے ۱۷۹۳ء کا دوامی بندوبست مرتب ہُوا اس بندوبست سے ان مسلمان افسروں کا کاروبار ہمارے ہاتھ میں آگیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنے والوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے اور جن کے سپاہیوں کو مالگزاری جمع کرنے کا جائز حق پہنچتا تھا۔ مسلمان تعلقداروں اور اُن کے سپاہیوں اور شمشیر زنوں کے بجائے اب ہم نے ہر ایک ضلع میں ایک انگریز کلکٹر مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ غیر مسلح خاصہ دار بھی جیسا کہ اس سے پہلے عام طور پر عدالتوں کے پیادے کام کرتے تھے مسلمان امراء کا یا تو مالگزاری سے کوئی تعلق نہیں رہا یا وہ محض زمیندار ہیں جن کو زمین کی آمدنی سے ایک مقررہ حصّہ مل جاتا ہے۔ بہرحال ان تبدیلیوں کو دوامی بندوبست نے رائج نہیں کیا اُس نے صرف اُن کی تکمیل کی تھی البتہ اُس نے مسلمان گھرانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ مگر ایک دوسرے رنگ میں۔ اس بندوبست کا عام رجحان اس طرف تھا کہ اُن ماتحت ہندو افسروں ہی کو زمین کا مالک قرار دے دیا جائے جو براہ راست کاشتکاروں سے مالگزاری وصول کرتے تھے۔

زمینداری کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تباہی کی دوسری وجہ

میں نے ۱۷۸۸-۹۰ء کے بندوبست کے مسودات کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کیا ہے اور میں بخوبی سمجھتا ہوں کہ ان دفعات کے باوجود جو ۱۷۹۳ء کے قانون میں دلالوں کے بارے میں درج ہیں اُس وقت کے افسران مال کی نظروں میں پچھلے نظام مالگزاری کی صرف تین ہی کڑیاں تھیں یعنی حکومت[1]، مقامی ایجنٹ[2] یا زمیندار جو کاشت کاروں سے براہِ راست مالگزاری جمع کرتے تھے۔ اور کاشتکار[3] جو زمین میں ہل چلاتے تھے۔ اور انہیں تین کڑیوں کو ہم نے نظام میں داخل کیا۔ مسلمانوں کے نظام دیوانی کی دوسری کڑیوں کو ہم نے بالکل نظر انداز کر دیا یا وہ خود بخود مفقود ہو گئیں۔ مثلاً خود مختار تعلقداروں کی علیٰحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔ یہ خاندان

اپنی ریاست کے کچھ حصہ کی کاشت کا دوامی پٹہ دوسروں کے نام لکھ دینے کے باوجود اپنے ماتحت زمینداروں پر ایک قسم کا قانونی حق رکھتے تھے اور پھر جب موقعہ ہوتا اُن سے نذرانہ کے طور پر نقدی یا جنس ہتھیا لیتے۔ ایک افسر جس نے مسلمانوں کی موجودہ بے چینی اور دوامی بندوبست سے اس کے تعلق کا مطالعہ بڑی دقیق نظر سے کیا ہے لکھتا ہے "اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اُس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنادیا ہے۔ اُن کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہوگیا ہے اور اب وہ اُس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا۔" ۲۲۷

مسلمانوں اور مسلمان بادشاہوں سے غدّاری

سو یہ سب سے بڑی ناانصافی ہے جس کا مسلمان امراء انگریزی حکومت کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے۔ لیکن جونہی ہم نے اپنے آپ کو طاقتور پایا اس وعدے کو فراموش کردیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظام دیوانی کا مطالعہ کیا تو اس کو اس قدر یک طرفہ اس قدر ناکارہ اور اصولِ انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اس کو برقرار رکھتے تو تہذیب کے لئے باعث ننگ ہوتے[1] اس کے بعد وہ لکھتا ہے۔

"ہم اضلاع کے اندراج سے یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مقصد محض روپیہ[2] جمع کرنا تھا۔"

---

[1] اس نظام کے ماتحت تو ہندوستان دن دونے رات چوگنے ترقیات کے مدارج طے کرکے دولت کا مرکز بن گیا۔ جیسا کہ لارڈ کلائیو صوبہ بنگال کے متعلق باغ ارم اور لازوال دولت کا مرکز لکھتا ہے۔ اور برطانی نظام حکومت کے متعلق سرجان شور کہتا ہے، برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اُس کے تحت ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان پُرانے تاجروں پر جلدی تباہی آگئی۔

[2] مگر انگریزوں کا مقصد روپیہ لندن بھیجنا تھا جس سے ملک بالکل تباہ کردیا گیا۔

یہ تو بقول ہنٹر مسلمانوں کی حکومت کا منشا رہا اب خود برطانوی سامراج کا منشاء کیا تھا یہ بھی خود ان کے دوستوں کی زبان سے سُن لیجئے۔ مسٹر ہیبری در لسٹ (گورنر بنگال) لکھتا ہے:۔

"کاشت کار اور کاریگر اگرچہ گراں شرح کا سودا کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ وہ سرمایہ جہاں سے کہ وہ قرض لیتے تھے بڑھتا جاتا تھا مگر انگریزی عملداری میں معاملہ برعکس ہوگیا ہے: تاتاریوں کا حملہ ضرور شر انگیز عداوت تھی مگر اس کے مقابلہ میں ہماری حفاظت کو دیکھا جائے کہ اس سے ہندوستان تباہ ہو رہا ہے وہ ان کی عداوت تھی اور یہ ہماری دوستی۔ ہر ہر روپیہ جو ایک انگریز ہندوستان سے کماتا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے جُدا ہوتا ہے۔" (حکومت خود اختیاری صفحہ ۱۲)

البسٹ انڈیا کمپنی کا منصفانہ طرز عمل ملاحظہ فرمایئے "مالگذاری جمع کرنے والوں کے ذمہ حکومت کے تمام فرائض کر دیئے گئے تھے اُن کو اس بات کی اجازت تھی کہ جو جی میں آئے کریں بشرطیکہ مالگذاری کا روپیہ باقاعدہ جمع کرتے رہیں عوام کو اس لئے ستایا جاتا تھا کہ زمینداروں کو لگان وصول ہوتا رہے اُن کو اس لئے لوٹا جاتا تھا کہ زمینداروں کے ملازمین دولت مند ہو جائیں اس ظلم و ستم کے خلاف شکایت بے سود تھی کیونکہ یہ زمیندار اور اس کے افسر کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اُن کی شکایات کو سُنے یا نہ سُنے ان کی شکایات کے ازالہ کا امکان بہت کم تھا کیونکہ ظالم بالعموم زمیندار ہی کا ملازم ہوتا تھا۔ پھر اگر ڈاکوؤں کو کوشش کرکے گرفتار بھی کر لیا جاتا تھا تو اُن کے لئے مشکل نہ تھا کہ قید کرنے والوں سے یارانہ گانٹھ لیں۔" صفحہ ۲۲۸۔

اس نظام قدیم کے توڑنے میں صریح وعدہ خلافی کا اقرار

"جب ہم نے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جس کو برقرار رکھنے کا ہم نے وعدہ کیا تھا تو ان بے چاروں کی جان میں جان آگئی۔ سب سے بڑی ناانصافی جو ہم نے مسلمان امراء سے کی وہ یہ تھی کہ ہم نے اُن کے حقوق معین کر دیئے۔ اس سے پہلے نہ اُن کے حقوق کوئی مستقل حیثیت رکھتے تھے اور نہ متعین تھے۔ حکومت وقت کے بہت سے تسلیم

شدہ حقوق کی بیش بہا قربانی کے بعد ہم نے ملکیت زمین کو موروثی کردیا اب مستقلاً اس کے مالک تھے۔ مگر جو قوم صدیوں سے قابل نفرت لوٹ مار کی عادی ہو محض گورنر جنرل کے لکھ دینے سے اپنی جاگیروں کے انتظام کا پُرامن مشغلہ اختیار نہیں کرسکتی۔ دیہاتوں پر مسلمانوں کے ظلم ختم ہوگئے اور تیس سال بعد والگذاری کے قانون نے ان کی قسمتوں پر آخری مہر لگادی۔ گذشتہ پچہتر سال سے بنگال کے مسلمانوں کے گھرانے یا تو صفحہ ہستی سے بالکل نابود ہوگئے ہیں یا اُن لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے سربلند کیا ہے لیکن پھر بھی اُن کی سرکشی گستاخی اور کاہلی میں کوئی فرق نہیں اور ایسا کیوں نہ ہو۔ آخر وہ نوابوں اور فاتحوں کی اولاد ہیں۔

مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمہ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرزعمل اختیار کیا ہے اُس کے جواز میں بہت سے دلائل موجود ہیں گو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرزعمل سے بنگال کے مسلمان گھرانے بالکل تباہ و برباد ہوگئے۔ ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہم کو یقین تھا کہ ہماری عافیت اُن کو بے دخل کردینے ہی میں ہے۔ ہم نے اُن کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لئے خارج کردیا کہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے از حد ضروری تھا[1]۔ مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں اُن پُرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کرسکتے جو برطانوی حکومت کے بے راہ روی کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھارہے ہیں۔ فوج سے بے دخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی قومی ناانصافی ہے اور اُن کے پُرانے نظام مالیات سے ہمارا انحراف صریحاً وعدہ خلافی"۔ صفحہ ۲۳۱۔

---

[1] یہ مقالہ برعکس نہند نام زنگی کافور ہے۔ سیول میرٹ ممبر کونسل ۱۸۳۶ء میں لکھتا ہے۔ برطانیہ کا دورِ حکومت مہربان اور مقبول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہنچ گیا ہے اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت لوگ خوشحال تھے..... یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا ہے"۔

قانونی اداروں سے مسلمانوں کا اخراج

"اُن کی عظمت کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی اور سیاسی یعنی دیوانی ملازمتوں کی اجارہ داری تھی۔ حالات اور واقعات پر زیادہ زور دینا تا واجب ہے لیکن پھر بھی سوچنا چاہیئے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے یا ہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سر انجام پاتے تھے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں مسلمان کلکٹر ہی مالگذاری جمع کرتے تھے۔ مسلمان فوجدار اور کوتوال ہی پولیس کے افسر تھے۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا محکمہ جس کا صدر مقام نظام کے محل واقع مُرشدآباد میں تھا اور صوبے کے تمام اضلاع میں اس کے افسروں کا جال بچھا ہوا تھا، فوجداری قوانین نافذ کرتا تھا۔ مسلمان جیلر بنگال کے تمام قیدیوں سے رشوت لیتے تھے یا اپنی مرضی سے بھوکوں مرنے تھے قاضی یعنی اسلامی قوانین کے ماہر دیوانی اور خانگی عدالتیں قائم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہم نے تربیت یافتہ انگریز افسروں کے ذریعہ انصاف کرانا چاہا تو یہی قاضی قانونی نکات پر مشورہ دینے کے لئے اُن کے ساتھ بیٹھتے اسلامی شریعت ہی ملک کا قانون تھا اور حکومت کے تمام کارپرداز اور ماتحت افسر بدستور مسلمان ہی تھے۔ وہی سرکاری زبان بول سکتے تھے وہی سرکاری دستاویزات پڑھ سکتے تھے جو فارسی کے شکستہ خط میں لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ کارنوالس کے مجموعہ قوانین نے اس اجارہ داری کو محکمہ قانون میں اس قوت کے ساتھ نہیں توڑا جس قوت کے ساتھ اُس نے دیوانی محکمہ میں توڑا تھا۔ لیکن پھر بھی کمپنی کے پہلے پچاس سالہ دورِ حکومت میں حکومت کی ملازمتوں میں سب سے بڑا حصّہ مسلمانوں ہی کا تھا لیکن دوسری نصف صدی میں ہوا کا رُخ بدل گیا۔ پہلے تو اس کی رفتار کمزور رہی لیکن جوں جوں کاروبارِ سلطنت کو دیسی زبان میں نہ کہ "وہ نہ جو من" میں جو مسلمان فاتحوں کی غیر ملکی زبان تھی چلانے کی ضرورت کا احساس بڑھتا گیا یہ رفتار بھی بتدریج تیز ہوتی گئی۔ اب ہندوؤں نے ملازمتوں میں داخل ہونا شروع کیا اور رفتہ رفتہ سرکاری زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئے یہاں تک کہ ڈسٹرکٹ کلکٹری میں جہاں اب بھی پرانے طریقے کے مطابق دوستی کی بناء پر ملازمت ملنے کا امکان ہے بہت کم مسلمان افسر ہیں۔ جو مسلمان ابھی اس محکمہ میں

باقی ہیں وہ بہت بوڑھے ہیں ۔ اُن کا کوئی جانشین نہیں ہے ۔ ابھی دس سال ہوئے ناظر یا مالگذاری کے افسر کی آسامیاں مسلمانوں کے بعد مسلمانوں ہی کو ملا کرتی تھیں مگر اب جیل کی ایک دو غیر مشہور آسامیوں کے سوائے ہندوستان کے یہ سابق فاتح اور کسی ملازمت کی امید نہیں رکھ سکتے مختلف دفاتر میں کلرکوں کا عملہ عدالت کی ذمہ دار آسامیاں اور تو اور پولیس کی اعلیٰ ملازمتیں سرکاری اسکولوں کے چالاک ہندو لڑکوں سے پُر کی جاتی ہیں [1]

اگر غیر مشہور تان گزیٹیڈ افسروں کے جمِ غفیر سے لے کر اعلیٰ عہدوں تک کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سوال شخصی آراء سے نکل کر یقینی طور پر اعداد و شمار میں پہنچ جاتا ہے ۔ دو سال کا عرصہ ہوا میں نے ایک سلسلہ مضامین میں ثابت کیا تھا کہ بنگال کے قانونی اور مالگذاری کے محکمے جن کی ملازمت کی بڑی خواہش کی جاتی ہے اور جن میں تناسب کا بہت خیال رکھا جاتا ہے مسلمانوں سے بالکل خالی ہو رہے ہیں ۔ ان مضامین کا ترجمہ بہت جلد فارسی میں ہو گیا اور بہت سے دیسی اور اینگلو انڈین اخبارات نے ان کو نقل کیا تھا اُن پر بحث کی تھی [2]

حکومتِ بنگال نے مسلمانانِ کلکتہ کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا تھا اس کے باوجود حکومت کی ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب بدستور کم ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ اس بیان کے ساتھ ذیل کے اعداد و شمار زیرِ نظر رکھئے سب سے اعلےٰ عہدوں کی جو آسامیاں پچھلی نسل سے پُر کی گئی تھیں اُن میں مسلمانوں کو زیادہ شکایت کی گنجائش نہیں کیونکہ اپریل ۱۸۶۹ء میں ہر دو ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان تھا اور اب ہر تین ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان ہے ۔ دوسرے درجہ میں اُس وقت تناسب دو مسلمان اور نو ہندوؤں کا تھا اور اب ایک مسلمان اور دس ہندوؤں کا ہے تیسرے درجہ میں اُس وقت چار مسلمان اور باقی ستائیس ہندو اور انگریز تھے اور اب تین مسلمان اور باقی چوبیس ہندو اور انگریز ہیں ۔ جب ہم چھوٹے درجوں میں جاتے ہیں تو ۱۸۶۹ء میں تمام اقوام کے لوگوں کی کل تعداد تینتیس تھی جن میں چار مسلمان تھے اور اب اُنتالیس کی کل تعداد میں صرف چار ہیں ۔ اُمیدواروں میں جن سے آسامیاں پُر کی جاتی ہیں

---

[1] یہ تمام بیانات سارے صوبہ پر عموماً..... لیکن بھاگل پور اور پٹنہ کے ڈویژن کو چھوڑ کر باقی تمام اضلاع پر خصوصاً راست آتے ہیں ۔ [2] شمال مغربی صوبے کے بہترین اخبار پانیر میں اسباب میں سے ان مضامین سے مدد لی ہے ۔

کل دو مسلمان تھے اور اُن کی کل تعداد اٹھائیس تھی لیکن اب ان میں ایک بھی مسلمان نہیں۔

بہر حال غیر مشہور محکموں میں جہاں بنگال کی سیاسی جماعتیں تناسب کا بہت زیادہ خیال نہیں کرتیں مسلمانوں کی حالت اور بھی بدتر ہے۔ ۱۸۶۹ء میں ان محکموں کا تناسب یہ تھا۔

اسسٹنٹ گورنمنٹ انجینیرز کے تین درجوں میں۔ ہندو (۱۴ نفر) مسلمان (۰)

اکاونٹنٹ آفس میں۔ ہندو (۵۰) مسلمان صرف ۳

محکمہ پبلک ورکس کے سب انجینیر۔ ہندو (۲۴) مسلمان (۱) اوورسیر ہندو (۶۳) اوورسیر مسلمان (۲)

نو آموز طبقہ۔ ہندو (۴ نفر) انگریز (۲ نفر) مسلمان (۰)

بر سپارڈینیٹ محکمہ۔ ہندو (۲۲) مسلمان (۰) صفحہ ۲۳۴

ان گزٹیڈ ملازمتوں کی فہرست جن پر ہندو، مسلمان، انگریز سب فائز ہو سکتے ہیں۔

بنگال میں سرکاری ملازمتوں کی تقسیم اپریل ۱۸۷۱ء میں

نام عہدہ	یورپین	ہندو	مسلم	کل تعداد
اکونٹنٹ سول سروس جن کا تقرر انگلستان میں بادشاہ کی طرف سے ہوتا ہے۔	۲۶۰	×	×	۲۶۰
عدالتہائے دیوانی کے افسر (غیر منظور شدہ) اضلاع میں	۴۷	×	×	۴۷
اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	۲۶	۷	×	۳۳
ڈپٹی مجسٹریٹ و ڈپٹی کلکٹر	۵۳	۱۱۳	۳۰	۱۹۶
انکم ٹیکس اسیسر	۱۱	۴۳	۶	۶۰
رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ	۳۳	۲۵	۲	۶۰
عدالت خفیفہ کے جج اور سب جج	۱۴	۲۵	۸	۴۷
منصف	۱	۱۷۸	۳۷	۲۱۶
محکمہ پولیس تمام گزٹیڈ افسر	۱۰۶	۳	×	۱۰۹
پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ انجینیر	۱۵۴	۱۹	×	۱۷۳
پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کا ماتحتی عملہ	۷۲	۱۲۵	۴	۲۰۱
پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ اکونٹنٹ	۲۲	۵۴	×	۷۶

میڈیکل ڈیپارٹمنٹ، میڈیکل کالج، جیل خیراتی ڈسپنسری، حفظانِ صحت	۸۹	۶۵	۴	۱۵۸
چیچک کا ٹیکہ اور اضلاع کے میڈیکل آفیسر	۳۸	۱۴	۱	۵۳
محکمہ تعلیم و دیگر محکمہ جات مثلاً چنگی، بحری افسر، سروے، افیون	۴۱۲	۱۰	×	۴۲۲
کل تعداد	۱۳۳۸	۶۸۱	۹۲	۲۱۱۱

صفحہ ۲۲۵

غور فرمایئے کہ گزیٹیڈ ملازمتوں میں جن کی کل تعداد دو ہزار ایک سو گیارہ ہے اُس میں یورپین ملازم ایک ہزار تین سو اڑتیس ہیں اور ہندوستانی صرف سات سو تہتر ہیں بھی مسلمان کل بانوے ہیں یعنی کل ملازموں کے بیسویں حصّہ سے بھی کم۔ حالانکہ ایک صدی پہلے تمام عہدے انہیں کے پاس تھے اس اسلام دشمنی اور انگریز نوازی کو انگریز ہی کی زبانی معلوم فرمایئے۔ اور مسلمانوں کے برباد کرنے کا فوٹو ذہن میں کھینچئے۔

ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمّہ دار عہدوں پہ مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ ہندو محض شکریہ کے ساتھ ان چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے تھے جو اُن کے سابق فاتح اپنے دسترخوان سے اُن کی طرف پھینک دیتے تھے اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں اور کلرکوں کی تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ اب ایک اور سات کا ہے۔ ہندوؤں اور یورپینوں کا تناسب ایک اور دو کا۔ مسلمانوں اور یورپینوں کا تناسب ایک اور چودہ کا تمام نظامِ حکومت میں اُس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی پہلے ساری حکومت کی اجارہ دار تھی کم ہوتے ہوتے ایک اور تئیس رہ گیا ہے اور وہ بھی اُن گزیٹیڈ ملازمتوں میں ہے جہاں تناسب کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ پریزیڈنسی شہر کے دفتر کی معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصّہ تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ایک بہت بڑے محکمہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مسلمانوں کی زبان پڑھ سکے دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا، قلموں کو ٹھیک کرنے والے کے سوائے کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں۔

مسلمانوں کو فنا کرنیکے بعد اُبھارنا اور ہندوؤں کیخلاف اُنکو بھڑکانا

کیا ہندو ہمیشہ مسلمانوں سے بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ کیا اُن کو صرف ایک ایسے غیر جانبدارانہ ماحول کی تلاش تھی جس میں رہ کر مسلمانوں کو اس دوڑ میں پیچھے چھوڑ جائیں۔ کیا مسلمانوں کے پاس سرکاری ملازمتوں کے علاوہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے دوسرے ذرائع بکثرت موجود ہیں اس لئے وہ سرکاری ملازمتوں سے بے اعتنائی برتتے اور ہندوؤں کے لئے اس میدان کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

مسلمانوں کی برتری کا اقرار اور ان کو عہدوں سے نکالنے کی مذمت

بیشک ہندو مسلمانوں سے زیادہ ذہین ہیں مگر ابھی تک انہوں نے اُس عام اور نمایاں فوقیت کا کوئی ثبوت نہیں دیا جو گورنمنٹ کی ملازمتوں میں اجارہ داری کے لئے ضروری ہے اور ایسا کرنا اُن کی گذشتہ تاریخ کے بالکل خلاف بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاست اور حکومت عملی کے علم میں سب سے افضل تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی انہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔

قانون اور وکالت سے مسلمانوں کا اخراج

اعلیٰ خاندان کے مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی پیشہ باقی رہ گیا ہے اور وہ پیشہ وکالت کا ہے۔ طبابت کا پیشہ جیسا کہ میں ابھی بیان کروں گا بالکل الگ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ سرکاری ملازمتوں سے کہیں زیادہ سختی کے ساتھ مسلمانوں پر قانون کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ بنگال میں ہر مجسٹی کے ہائی کورٹ آف جوڈیکیچر میں دو ہندو جج ہیں اور مسلمان ایک بھی نہیں ہے۔ اس زمانہ میں اینگلو انڈین اور ہندو اس بات کا گمان بھی نہیں کر سکتے کہ ہائی کورٹ کے جج کبھی اُس قوم میں سے مقرر کئے جائیں گے جو تمام عدالتی محکموں پر قابض تھی۔ پچھلی دفعہ جب میں نے ۱۸۶۹ء میں اعداد و شمار

جمع کئے تھے تو اُن کا تناسب حسب ذیل تھا۔

سرکاری قانونی افسر۔ انگریز (۴ نفر) ہندو (۲) مسلمان (x)

ہائیکورٹ کے وہ ملازم جن کا عہدہ اتنا بلند تھا کہ ان کا نام شائع کیا جائے۔

انگریز (۱۴) ہندو (۷) مسلمان (x)

بیرسٹر۔ انگریز (معلوم نہیں) ہندو (۲) مسلمان (x)

اگر ہائیکورٹ کے ان وکلاء کی فہرست دیکھی جائے جن کا درجہ بیرسٹروں سے ذرا کم ہے تو یہ داستان اور بھی زیادہ عبرتناک ہو جائے گی یہ اس پیشہ کا ایک شعبہ ہے جو تمام کا تمام مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور اُس زمانہ کے کئی ایک آدمی ابھی تک بقید حیات موجود ہیں۔ ذیل کی فہرست ۱۸۳۴ء سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۸۶۹ء کے وکلاء میں سے ایک انگریز ایک ہندو اور دو مسلمان ابھی تک زندہ ہیں۔

۱۸۳۸ء تک مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد کے برابر تھی اور تناسب حسب ذیل تھا۔

مسلمان وُکلاء (۶ نفر) ہندو (۷ نفر) انگریز (۱۔ نفر)

چنانچہ وکلاء ۱۸۴۵ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان (ان دونوں سالوں کو شامل کرتے ہوئے) داخل فہرست کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ۱۸۶۹ء کے زندہ وکلاء میں سے سب کے سب مسلمان ہیں۔ ۱۸۵۱ء تک بھی مسلمان اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے اور حقیقت میں وہ ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد کے برابر تھے لیکن ۱۸۵۱ء سے یہ صورتِ حالات بدلنا شروع ہوتی ہے اب نئے نئے آدمیوں نے میدان میں آنا شروع کیا۔ قابلیت کے مختلف معیار قائم ہوئے چنانچہ اب فہرست کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک کل دوسو چالیس ہندوستانی داخل کئے گئے جن میں دوسو انتالیس ہندو اور صرف ایک مسلمان۔

اب ہم اس قانونی پیشہ کے دوسرے شعبوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۱۸۶۸ء میں ہائیکورٹ کے اٹورنی پروکٹرا اور سالسٹرز میں سے ستائیس ہندو تھے اور مسلمان ایک بھی نہ تھا۔ آئندہ قانون داں بننے والوں میں سے چھبیس ہندو ہیں مسلمان کوئی نہیں غرضیکہ اس پیشے کے کسی شعبہ کا ذکر کیا جائے نتیجہ ہر حال میں یکساں ہو گا۔ ۱۸۶۸ء میں

رجسٹرار ہائی کورٹ کے دفتر میں (۱۷) ملازمین کی یہ حیثیت تھی کہ اگر اُن کے نام شائع کر دیئے جائیں تو اُن میں چھ انگریز اینگلو انڈین ہوں گے۔ گیارہ ہندو اور مسلمان صفر۔ ریسیور کے دفتر سے چار نام ملے ہیں جن میں دو انگریز دو ہندو اور مسلمان کوئی نہیں۔ کلرک آف دی کراؤن اور ٹیکس افسر کے دفتر میں انگریزوں کی تعداد چار تھی۔ ہندوؤں کی پانچ لیکن مسلمان مفقود۔ محکمہ قانون کے کونے کونے سے اکونٹس، شرف کورد تر اور مترجمین کے دفاتر سے بیس نام بھیجے گئے۔ اُن میں سے آٹھ انگریز گیارہ ہندو اور صرف ایک مسلمان اس فہرست میں اپنی قوم کی نمائندگی کر رہا تھا لیکن یہ بیچارہ ایک مُلّا تھا جسے ہفتہ میں صرف چھ شلنگ تنخواہ ملتی تھی (تقریباً چھ روپیہ ماہانہ) ص ۲۲۹

مسلمانوں کی طبابت

اب طبابت کی باری آتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ پیشہ جیسا کہ ہندوستانی اطباء میں رائج ہے اعلیٰ خاندان کے مسلمانوں کے نزدیک پیشہ کی حیثیت نہیں رکھتا ایک معزز مسلمان کے ہمیشہ دو طبی مشیر ہوں گے۔ ایک تو وہ جسے انگریزی میں عام طور پر معالج کہتے ہیں اور جسے اپنے آقا کی نظر میں بڑی عزت اور وقعت حاصل ہوتی ہے، دوسرا جرّاح جس کو عرف عام میں حجّام کہتے ہیں۔ ڈاڑھی مونڈنے سے لے کر عضو کاٹنے تک تمام اعمال جرّاحی یہی کرتا ہے۔ پھر طب و جراحت کے درمیان اس قدر تفاوت ہے کہ جس طبیب کی حالت ذرا بھی اچھی ہے وہ زخموں کی مرہم پٹی کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ البتہ حجّام جرّاح اس قسم کی حدود کا پابند نہیں عملی طور پر ہر قسم کی طب اس کی حدود میں داخل ہے۔ حقیقی مسلمان اطباء بہت ہی کم ہیں اور روز بروز کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں گو ابھی تک اُن کا چرچا ہے مگر بنگال کے اضلاع میں وہ بالکل معدوم ہیں۔ طبابت کا پیشہ اب ان پڑھ حجّاموں کے ہاتھ میں ہے یا ہندو ڈاکٹروں کے۔" الخ صفحہ ۲۴۱۔

مسلمانوں کی شکایات

مسلمانانِ بنگال کے پرائیویٹ خطوط اور اخباری مضامین سے زیادہ کوئی شے

قابلِ رحم میری نظر سے نہیں گزری کچھ مدّت ہوئی کلکتہ کے ایک فارسی اخبار نے لکھا تھا (اخبار دُوربین جولائی ۱۰، ۱۸۶۹ء) آہستہ آہستہ مسلمانوں سے ہر قسم کی ملازمت خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی چھینی جا رہی ہے اور دوسری قوموں کو دی جا رہی ہے۔ خصوصاً ہندوؤں کو۔ حکومت اپنی تمام رعایا کو برابر سمجھنے پر مجبور ہے۔ لیکن وقت ایسا آ گیا ہے کہ وہ اپنے گزٹ میں اس بات کا خاص طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں دی جائے گی۔ ابھی ابھی سندربن کے کمشنر کے دفتر میں چند آسامیاں خالی ہوئی تھیں اُس افسر نے سرکاری گزٹ میں اشتہار دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ یہ ملازمتیں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہیں ملیں گی۔ [1]

الغرض مسلمان اب یہاں تک قعرِ مذلّت میں گر چکے ہیں کہ وہ سرکاری ملازمتوں کے قابل ہوں تب بھی اُن کو سرکاری اعلانات کے ذریعہ ملازمت سے باز رکھا جاتا ہے اُن کی قابلِ رحم حالت پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اعلیٰ حکام تو اُن کی ہستی تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔

مسلمانانِ اڑیسہ کی شکایات

ذیل کے فقرات اُس درخواست سے لئے گئے ہیں جو کچھ عرصہ ہوا مسلمانانِ اڑیسہ نے کمشنر کے سامنے پیش کی ان پُرتکلف فقروں پر ممکن ہے بعض لوگوں کو ہنسی آ جائے مگر اس صوبہ کے سابق فاتحین کی حالت زار جس سے مجبور ہو کر اُنہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں محض روٹی کے لئے التجا کی ہے بڑی ہی افسوسناک ہے اور ہمیشہ انسان کو متاثر کرتی رہے گی۔

"ہر میجسٹی ملکہ معظمہ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے ہم یقین رکھتے ہیں کہ ملک کی سرکاری ملازمتوں میں ہمارا بھی مساویانہ حق ہے اگر سچ پوچھئے

---

[1] فارسی اخبار کے اس بیان کی تصدیق کرنے کے لئے اس وقت میرے پاس سرکاری ذرائع موجود نہیں۔ اس بیان پر اُس وقت ضروری کچھ نہ کچھ توجہ کی گئی تھی اور اب تک اُس کی تردید نہیں کی گئی۔

تو اڑیسہ کے مسلمانوں کو روز بروز تباہ کیا جا رہا ہے اور اُن کے سر بلند ہونے کی کوئی اُمید نہیں مسلمان اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب بالکل نادار ہیں اور ہمارا کوئی بھی پُرسان حال نہیں۔ اب ہماری حالت ماہی بے آب کی طرح ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو ہم جناب عالی کے حضور میں پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ جناب عالی ہی اڑیسہ کے ڈویژن میں ہر میجسٹی ملکہ معظمہ کے واحد نمائندہ ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ نسل و رنگ کے امتیازسے بالاتر ہو کر ہر قوم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا۔ اپنی سابقہ ملازمتوں کے چھن جانے سے ہم اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ صمیم قلب سے دُنیا کے دُور دراز گوشوں کا رُخ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کیلئے مستعد ہیں۔ ہم سائبیریا کے بے آب و گیاہ حصّوں میں مارے مارے پھرنے کے لئے آمادہ ہیں بشرطیکہ ہمیں یقین دلا دیا جائے کہ ایسا کرنے سے ہمیں دس شلنگ (۷½ روپیہ) ہفتہ کی ملازمت سے سرفراز کیا جائے گا۔" صفحہ ۲۴۴

(ایضاً ڈاکٹر ہنٹر) صفحہ ۲۴۴-۲۷

"آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں پہ اس طرح سرکاری ملازمتوں اور تسلیم شدہ پیشوں کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے بنگال کے مسلمانوں میں ذہانت کی کمی نہیں اور غربت کی خلش ہر وقت اُن کو اس بات پر اُکستاتی رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔"

(جواب ظاہر ہے کہ وہ ہندوستانی قوم کے فرد اور سیاسی رقیبوں میں سے دماغی قابلیت والے ہیں جن سے ہر وقت خطرہ ہے کہ اگر وہ کچھ بھی خوشحال اور قوی ہوں گے تو برطانوی غلامی کا جُوا گردن سے پھینک کر دعویدار بن جائیں گے۔) مولف غفرلہٗ۔

ایک نہایت دل سوز اور انتہائی شرمناک معاملہ صوبہ بنگال و بہار و اڑیسہ کے اوقاف کا ہے۔ ان صوبوں کے مسلمان امراء نے بڑی بڑی جائدادیں رفاہ عام تعلیم وغیرہ کے لئے وقف کر رکھی تھیں جن سے تمام مصارف اس قسم کے انجام پاتے

تھے۔ دیہات اور قصبات اور شہروں میں بے شمار مدارس اور اسکول جاری تھے۔ جن سے پبلک بغیر کسی قسم کے مصارف اور فیس ادا کرنے کے تعلیم پاتی تھی۔ بقول پروفیسر میکس مولر اسی ہزار مدرسے صوبہ بنگال میں جاری تھے۔ کوئی گاؤں یا قصبہ اُن مدارس سے خالی نہ تھا۔ جس کا بیان ہم پہلے کر چکے ہیں ان وقف شدہ زمینوں سے حکومت ایک پائی بھی وصول نہیں کرتی تھی اور تمام آمدنی تعلیم وغیرہ کی انہیں مدارس میں خرچ ہوتی تھی حکومت تعلیمی اداروں پر اپنا خزانہ خرچ کرنے سے سبکدوش تھی اور تعلیمی چرچا ملک کے کونہ کونہ میں جاری تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی للچائی ہوئی آنکھیں اور زرطلبی کی انتہائی ہوس کب اُس کو برداشت کر سکتی تھی۔ قبضہ پاتے ہی یہ حرص سوار ہوئی کہ جس طرح ممکن ہو ان زمینوں پر قبضہ کیا جائے۔ اگرچہ نتیجہ میں یہ علمی اور ضروری فریضہ انسانیہ (جس کو ہر متمدن قوم اور حکومت اپنے منصبی فرائض میں سے شمار کرتی اور کروڑوں اشرفیاں خرچ کر کے اپنی رعایا اور قوم کو علم سے آراستہ کرتی ہے) موت کے گھاٹ اُتر جائے۔ طرح طرح سے اس کی کوششیں شروع ہوئیں جس کی تفصیل مجملاً حسب ذیل ہے:۔

"مسلمانانِ بنگال کا ہر اعلیٰ خاندان ایسے اسکول کا خرچ بھی برداشت کرتا تھا۔ تھا۔ جس میں خود اس کے اور غریب ہمسایوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ جوں جوں صوبہ کے مسلمان خاندانوں پر اِدبار چھاتا گیا۔ یہ خاندانی اسکول کم ہوتے اور اُن کے اثرات بھی بتدریج مٹتے گئے۔ یہ ہمارے عہد حکومت کی دوسری نصف صدی تھی جب ہم نے انگریزی قانون کی ناقابل مدافعت قوت کو اُن کے مقابلہ پر لاکھڑا کیا۔ زمانہ قدیم سے ہندوستانی شہزادوں کا دستور چلا آتا تھا کہ وہ نوجوانوں کی تعلیم اور خدا کی رضا جوئی کے لئے زمین کے قطعات وقف کرتے تھے.... مالگزاری جمع کرنے والا زمیندار یا مقامی مالک زمین کو اجازت تھی کہ ماتحت زمینوں میں جو چاہے کرے بشرطیکہ مالگزاری کی مقررہ مقدار ادا کرتا رہے۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق مندر یا مسجد کے ساتھ کچھ علاقہ معافی کا وقف کر دیتا اور کوشش کرتا کہ ساری عمر کے ظلم و تعدی کا کفارہ بستر مرگ پر مختلف قسم کے نیک کاموں سے ہو جائے۔ جب ہم نے صوبہ بنگال پر قبضہ کیا تو اُس وقت کے قابل ترین

افسر مال (مسٹر جیمز گرانٹ) کا تخمینہ تھا کہ صوبہ کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ حکومت کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ۱۷۷۲ء میں وارن ہسٹنگز کو اس انتہائی بے ایمانی (یہ الفاظ قابل غور ہیں) کا حال معلوم ہوا تو ان علاقوں کی واپسی کے خلاف عوام کا جذبہ اس قدر سخت تھا کہ کوئی کارروائی نہ ہو سکی۔ ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو بڑی شد و مد سے اُٹھایا کہ جس معافی کے علاقہ کے متعلق حکومت وقت سے منظوری نہ لی گئی ہو اُس پر حکومت کا قبضہ ہونا چاہیئے مگر اُس وقت کی طاقت ور حکومت بھی اس اصول پر کاربند ہونے کا حوصلہ نہ کر سکی۔ پھر یہ معاملہ پچیس سال تک یونہی کھٹائی میں پڑا رہا اور ۱۸۱۹ء میں حکومت نے ایک بار پھر اپنے اس حق پر اصرار کیا۔ لیکن اس کے باوجود عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن آخر کار ۱۸۲۸ء میں مجلس قانون ساز اور محکمہ منتظمہ نے مل کر ایک بہت بڑی کوشش کا آغاز کیا جس کے ماتحت عدالتیں مقرر کی گئیں اور آئندہ اٹھارہ سال تک تمام صوبہ میں مخبر، جھوٹے گواہ اور خاموش مگر مستقل مزاج افسران واگذاری گشت کرتے رہے۔ واگذاری کے مقامات پر ۸ لاکھ پونڈ خرچ کرنے کے بعد حکومت کی مالگذاری میں تین لاکھ پونڈ سالانہ کا اضافہ مستقل ہو گیا یعنی ساٹھ لاکھ پونڈ کا سوا پانچ فیصدی سالانہ کے حساب سے۔ اس رقم کا بہت بڑا حصہ اُن زمینوں سے حاصل ہوتا ہے جو مسلمانوں یا اسلامی اوقاف کے پاس معافی کی حیثیت سے ہیں اس سے جو ابتری اور نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوئے وہ ہمیشہ کے لئے دستاویزات میں ثبت ہو چکے ہیں۔ سینکڑوں خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارو مدار انہی معافیات پر تھا بالکل تہ و بالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ جو شخص غیر جانبداری سے اس کی تحقیق کرے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جب واگذاری کے قوانین کا مقصد محض ایسے حق کے نافذ کرنے کا تھا جس کو ہم نے بار بار پُر زور طریقہ پر اپنے لئے محفوظ رکھا تھا تو پھر واگذاری کے مقدمات میں انتہائی سختی کیوں

برتی گئی وہ ایسا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کی عام رائے کے بالکل خلاف تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے صاف اور صریح قوانین کی موجودگی میں مروجہ رسم و رواج کا حق ایک غلط سی بات ہے لیکن پچھتر سال کا مسلسل قبضہ اس امر کا حق ضرور پیدا کر دیتا ہے کہ حکومت نرمی کا برتاؤ کرے ہمارے واگذاری کے افسر جنہوں نے قانون کو نافذ کیا تھا رحم کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ اُن دنوں کا خوف وہراس اب تک بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ اس سے ہمارے خلاف نفرت وحقارت کی ایک شدید درجہ پیدا ہو گئی اُس وقت سے کسی شخص کا عالم دین ہونا جو ہندوستانی نوابوں کی نظر میں بڑا قابلِ عزّت اور منفعت بخش پیشہ تھا۔ بنگال میں ہمیشہ کے لئے بند ہے۔ سب سے زیادہ نقصان اسلامی اوقاف کو پہنچا.... لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی تباہی واگذاری ہی سے شروع ہوتی ہے۔ وہابی مقدمات کے ذمّہ دار افسر کی رائے میں یہ مسلمانوں کی تباہی کا دوسرا سبب تھا۔ بہرحال ان مقدمات کو حق بجانب ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں اُن کے پاس آج بھی نہایت اعلٰے اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔"

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۲۶۲ میں لکھتا ہے:۔

"لیکن ان بے انصافیوں کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوتی جن کا مسلمان اپنے انگریز حاکموں کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔ وہ ہمیں صرف اس بات کا ملزم قرار نہیں دیتے کہ ہم نے کامیاب زندگی کی تمام راہیں ان پر مسدود کر دی ہیں بلکہ یہ بھی کہ ہم نے اُن کی عاقبت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ دنیا کے ہر اچھے مذہب نے روحانی فرائض کی انجام دہی کے خاص دن مقرر کر رکھے ہیں ہم اُس غم وغصّہ کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں جو انگریزوں کو اس وقت

ہو گا جبکہ کوئی غیر ملکی فاتح خود بخود اپنی مرضی سے اس بات کا اعلان کر دے کہ آئندہ اتوار کو چھٹی نہیں ہوا کرے گی۔ ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اپنے مذہبی تہواروں کی تنظیم کرتے ہیں اور اُن کے متعلق بڑے نازک جذبات رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے حصّوں میں ان جذبات کا احترام کیا گیا ہے لیکن معلوم نہیں جنوبی بنگال کے مسلمانوں کو کچھ عرصہ سے کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اوّل تو اُن کی مذہبی ضروریات سے تدریجاً اغماض کیا۔ پھر ان کو بالکل بھلا دیا اور آخر کار اُن سے قطعی منکر ہو گئے۔ پچھلے سال کلکتہ ہائیکورٹ کے مسلمان وکلاء نے اس بارہ میں دو عرضداشتیں بھیجی تھیں۔ انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جب عیسائیوں کو سال میں باسٹھ چھٹیاں دی جاتی ہیں اور ہندوؤں کو باون تو پھر مسلمانوں کو بارہ کیوں ملتی ہیں۔ اس سے پہلے مسلمانوں کے لئے منظور شدہ چھٹیاں اکیس تھیں اس کے باوجود عرضی گذاروں کی التجا صرف یہ تھی کہ ان تعطیلوں کی کم سے کم تعداد جو اب گیارہ تک پہنچ چکی ہے اور کم نہ کی جائے"..... مختصراً یہ کہ اس حکم سے اُن کے مذہبی تہواروں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ ممانعت اس حکومت کی بہتر سالہ روایات کے خلاف ہے اگر ہندوؤں اور عیسائیوں کو اُن کے مذہب کے مطابق چھٹیاں دی جا سکتی ہیں تو آپ کے سائل عرض پرداز ہیں کہ مسلمانوں کو بھی مذہبی فرائض کی بجا آوری اور تہواروں کو منانے کی چھٹی کیوں نہیں مل سکتی" گویا وہ قوم جو کبھی ہندوستان کے تمام عدالتی عہدوں پر فائز تھی اب اس حد تک ذلیل ہو چکی ہے..... حکومت اعلیٰ نے مداخلت کی اور حاکمانہ طور پر اسلامی تعطیلات کے چند دن مقرر کر دیئے۔ یقیناً وہ اتنے نہ تھے جتنے مسلمان چاہتے تھے"

ڈاکٹر ہنٹر مذکور صفحہ ۲۶۵ میں لکھتا ہے:-

"مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ہم نے اُن کو قانونی پیشہ ہی سے خارج نہیں کر دیا بلکہ مجلس قانون ساز کے ایک ایکٹ کی رُو سے اُن کے مذہبی اور شخصی قوانین کو پورا کرنے والے ضروری منصب داروں سے بھی محروم کر

دیا ہے۔ اسلامی حکومت میں قاضی کے فرائض منصبی میں فوجداری دیوانی اور شرعی عدالت کے فرائض داخل تھے۔ پہلے پہل جب ہم نے ملک پر قبضہ کیا تو عدالتی نظام کو جاری رکھنے کے لئے بڑی حد تک انہیں پر بھروسہ کیا تھا ہمارے سب سے پُرانے قوانین میں اُن کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے ہم نے قاضی کے عہدے کو برقرار رکھا اُس کے فرائض کے متعلق پچیس دفعات کی طویل فہرست ہندوستان کی قانونی کتابوں میں اب بھی مل سکتی ہے (بنگال کورٹ آرنمبر ۴ سنہ ۱۷۹۳ء و آر XII/۱۱ سنہ ۱۷۹۳ء وغیرہ) حقیقتہً قاضی کی حیثیت مسلمانوں کے شخصی اور مذہبی قوانین میں اس قدر ضروری ہے کہ اس بات کا فیصلہ ہو گیا تھا کہ جب تک قاضی برقرار رہیں گے ہندوستان دارالاسلام کہلاتا رہے گا۔ لیکن جب ان کو علیحدہ کر دیا گیا تو یہ ملک دارالحرب بن جائے گا۔ مسلمانوں کی بے اطمینانی سے ہم اس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ عام مسلمانوں کے جذبات کی تحقیقات کریں۔ بدقسمتی سے ان تحقیقات کی ابتداء بہت تھوڑے دنوں سے ہوئی۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں صوبجات کے گورنروں میں سے ایک نے اعتراض کیا تھا کہ قاضیوں کا تقرر گویا اس بات کا اقرار ہے کہ حکومت ان کی مقدس حیثیت کو تسلیم کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم مسلمانوں کو اس امر کا حق دیتے ہیں کہ وہ ان کا تقرر بطور خود کر سکتے ہیں چنانچہ بہت کچھ بحث و تمحیص اور حکومت بمبئی کی طرف سے پُرزور احتجاج کے بعد اس مضمون پر تمام سابقہ قوانین منسوخ کر دیئے گئے اور حکومت نے قاضیوں کا باقاعدہ تقرر بند کر دیا۔ (ایکٹ XI سنہ ۱۸۶۴ء جو بعد میں سنہ ۱۸۶۸ء کے ایکٹ VIII کے ضمیمہ کی رُو سے منسوخ کر دیا گیا تھا مگر اُس نے اُن قوانین کو زندہ نہ کیا جس کی رُو سے پہلے تقرر کیا جاتا تھا) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے سات سال سے مسلمانوں کا بہت بڑا اور ہمیشہ بڑھتا ہوا حصّہ ایک ایسے عہدہ دار سے محروم ہو گیا جس کا وجود شادی بیاہ اور دوسری خاندانی رسم و رواج کے منانے کے لئے از حد ضروری ہے۔ شروع شروع میں اس مصیبت کا احساس زیادہ نہیں ہوا تھا کیونکہ

پُرانے قاضی ابھی موجود تھے اور قانون مذکور کا اطلاق صرف اُس وقت ہوتا تھا جب کوئی قاضی مرجاتا یا پنشن پالیتا اور پھر اُس کی جگہ ازروئے قانون پُر نہیں کی جاسکتی تھی۔ اوّل اوّل موجودہ وائسرائے نے اس معاملہ پر غور و خوض کرنا شروع کیا تھا مگر کوئی قطعی فیصلہ کئے بغیر پھر ۱۸۷۰ء میں مدراس ہائیکورٹ نے اس مسئلہ پر بحث کی اور اس کا فیصلہ کردیا۔ مسٹر جسٹس کو بٹ کے فیصلہ کے بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ صرف حکومت ہی قاضیوں کو مقرر کرسکتی ہے۔ اگر قاضی کا تقرر نہ ہو تو مسلمان اس بات کے مجاز نہیں کہ ازخود کسی کو قاضی منتخب کرلیں۔

(اصل مقدمہ عـ ۵۳ ہٰ محمد ابوبکر مخالف میر غلام حسن اور انور)

گویا ۱۸۶۴ء کے ایکٹ نے اس قوم سے اُن کے قوانین کا ایک اہم عہدیدار چھین لیا جس کے فرائض تھے انتقال ناموں کی تسوید و تعریف عقد نکاح اور دوسرے مذہبی فرائض و مراسم کی بجاآوری۔ اب صورتِ حالات یہ ہے کہ جنوبی بنگال میں سب سے بڑی مصیبت جو ایک مجسٹریٹ پر آسکتی ہے اور جس سے چھٹکارا پانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے ازدواجی مقدمات ہیں۔ بعض نامعلوم وجوہ کی بناء پر مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات کچھ عرصہ سے بہت ہی نازک ہوگئے ہیں۔ زناکاری اور اغوا کے مقدمات (یہ دو تو تعزیراتِ ہند کے ماتحت آجاتے ہیں) اضلاع دہانہ کی عدالتوں میں دھڑا دھڑ آرہے ہیں۔ ان دس مقدمات میں سے نو ایسے ہوتے ہیں جن میں نکاح کو قانونی طور پر ثابت نہیں کیاجا سکتا۔ مشرقی بنگال کے دو حلقوں میں ۱۸۶۱-۶۲ء کے اندر یعنی جب سے حکومت نے قاضیوں کا تقرر بند کردیا ہے اس سے دو سال پہلے کل مقدمات کی تعداد (۱۵۶) تھی ۱۸۶۶ء میں یعنی قاضیوں کا تقرر بند ہوجانے کے دو سال بعد یہ تعداد بڑھتے بڑھتے (۱۹۸۴) تک پہنچ گئی۔ لیکن اس وقت سے فوجداری اعداد و شمار میں ان کی تعداد کم ہوتی گئی ہے۔ واقعتہً نہیں بلکہ اس لئے کہ اب یہ دستور ہے کہ ایسے مقدمات کو دیوانی عدالت

میں منتقل کر دیا جاتا ہے ..... دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ باقاعدہ قاضیوں کی غیر موجودگی میں مسلمانوں کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنی زندگی مذہبی قواعد کے مطابق بسر کر سکیں ان کی اجازت مذہبی مراسم کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ مسلمانوں کی روزمرّہ زندگی میں بھی کئی ایک چھوٹے چھوٹے شرعی مسئلے ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا صحیح حل صرف قاضی ہی کر سکتا ہے۔ اس قسم کے منصب کی غیر موجودگی میں ہر اس شخص کو جو حکومت کا وفادار نہیں مسلمانوں پر یہ واضح کرنے کا بہت کافی موقعہ مل جاتا ہے کہ موجودہ حکومت اس قابل ہی نہیں کہ ہم اس کے ماتحت اچھی زندگی بسر کر سکیں۔ برعکس اس کے حکومت کے مقرر کردہ قاضیوں کو ماننا اور اُن سے کام لینا فی الحقیقت اس حکومت کے با اختیار اور جائز ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔"

ہم نے اس جگہ زیادہ تر شہادتیں ڈبلو ڈبلو ہنٹر کے مصنفہ رسالہ (ہمارے ہندوستانی مسلمان) سے نقل کی ہیں۔ اس لئے کہ وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے واقعات پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں چونکہ وہ جنوبی بنگال میں عرصہ دراز تک ملازم رہا تھا۔ اس لیئے اُس کو اعداد و شمار پیش کرنے اور احوال کے مفصّل معلوم کرنے کے ذرائع بہت سے حاصل تھے۔ مگر یہ احوال صرف بنگال یا اُس کے جنوبی حصّہ کے نہیں تھے بلکہ تمام ہندوستان کے یہی احوال تھے۔ چنانچہ اُس کا یہ قول ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔

"میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اُٹھایا ہے۔ پھر اگر میں دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہو کہ یہ بیانات تمام مسلمانان ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف فرمایا جائے۔"

واقعہ یہی ہے کہ انگریزوں نے جو طرز عمل بنگال میں اختیار کیا تھا وہی طریقہ ہر ہر صوبہ میں جاری کیا گیا۔ لفٹننٹ جنرل میک لیوڈ اینس نے اپنی کتاب (بغاوت فوج) میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہیں:-

"ملک کے لوگوں کی کثیر تعداد ہمارے تحت میں فتوحات سے یا جبر یہ الحاق سے آئی تھی حکمراں خاندان تخت سے اتارے گئے یا کچل دیئے گئے۔ بڑے خاندان ذلیل کئے گئے۔ لوگوں کے اختیارات اور مناصب اور جائدادیں چھن جانے سے مصیبتیں نازل ہوئیں۔ ان حالات میں اس بارہ میں شک کرنا خلافِ عقل تھا کہ ہمارے دشمنوں کی ایک جماعت تیار اور مرتب ہو گئی تھی۔" لـه

بادشاہ دہلی سے ۱۸۰۶ء کے معاہدہ کے مطابق دفتروں اور عدالتوں کی زبان فارسی تھی جس میں مسلمانوں کو پوری مہارت تھی مگر ۱۸۳۷ء میں خلاف معاہدہ تمام دفاتر کی زبان انگریزی کر دی گئی۔ مس میو مدر انڈیا میں لکھتی ہیں۔

"ایک چھوٹا سا بیج بویا گیا اور اس کے پھل سے ہم اب متمتع ہو رہے ہیں یہ عدالتوں کی زبان کی تبدیلی تھی جو فارسی سے انگریزی کر دی گئی۔ ہندوستان کی تعلیم کو مغربیت کا رنگ دینے کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ یہ تبدیلی معمولی معلوم ہوتی تھی اور اس کے نتائج بھی معمولی تھے۔ اس کی مثال ایسی تھی جیسی کہ کلہاڑی سے ایک ضرب لگائی جاتی ہے...... مسلمانوں نے اس تبدیلی پر سخت احتجاجات کئے اور فی الواقع یہ اُن کے لئے سخت بربادکن تھی۔"

(مدر انڈیا صفحہ ۲۸۹ از حکومت خود اختیاری صفحہ ۷۹)

لـه یہ کہنا کہ فتوحات سے انگریزوں نے ہندوستان کو حاصل کیا ہے بالکل غلط ہے بلکہ ڈپلومیسیوں عہد شکنیوں، رشوتوں آپس میں پھوٹ ڈالنے وغیرہ چالبازیوں سے ملک حاصل کیا گیا تھا۔ پروفیسر سیلے اکسپنشن آف انگلینڈ میں لکھتا ہے:۔

"اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اُس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح نہ بھی ہو بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحاد عمل ہم ہندوستانیوں کے لئے شرمناک ہے تو اسی وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور نہ اُس پر فاتحانہ حکمرانی کر سکتے ہیں۔ اگر اس طرح ہم حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً برباد ہو جائیں گے۔

انگریزوں نے ملک مسلمانوں سے لیا تھا اس لئے اُن کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ کہیں مسلمان ہم سے اس ملک کو واپس نہ لے لیں اور ہم کو یہاں سے بے دخل نہ کر دیں۔ خصوصاً اس بناء پر کہ اُن کی دماغی قابلیت اور جسمانی طاقت، عزم و استقلال، سیاسی مہارت وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ایسے خطرات کا ہمیشہ انتظام کرنا ضروری سمجھتے رہے کہ مسلمانوں کو اس قدر کچل دیا جائے کہ اُن میں اُٹھنے کی طاقت نہ رہے اور ہندوؤں کو اتنا اُبھار دیا جائے کہ اگر کسی وقت میں مسلمان سر اُٹھائیں بھی تو یہ اُن کے دبانے کے لئے کافی ہو سکیں مگر ہندوؤں کو بھی اتنا نہ اُبھارا جائے کہ وہ ہمارے مقابلہ پر آسکیں اسی بناء پر اگرچہ ہندوؤں نے تعلیم میں بہت کچھ ترقی حاصل کر لی تھی اُن کو ذمہ دار عہدوں سے ہمیشہ محروم رکھا گیا بالخصوص فوج کے بالائی عہدوں کے پاس اخیر تک کسی ہندوستانی کو پھٹکنے نہیں دیا گیا۔ حالانکہ یہی ہندوستانی ہندو اور مسلمان شاہان مغلیہ وغیرہ کے تمام عہدوں پر سپہ سالاری (جرنیلی) سے لیکر ادنیٰ فوجی عہدہ تک اور وزارت سے لے کر ادنیٰ سویلین تک تمام ملکی اور فوجی خدمتیں باحسن الوجوہ انجام دیتے تھے۔

(دیکھو آئین اکبری، تزک جہانگیری، تذکرۃ الامراء عالمگیری وغیرہ)

بہرحال مسلمان انگریزوں کی آنکھوں میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے اور ان کو طرح طرح کی تدبیروں سے برباد کیا گیا۔ ڈاکٹر ہنٹر صـ۱۹۳ میں لکھتا ہے۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق ملازمین اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور جب اُنہوں نے پہلے پہل صوبہ جات پر قبضہ کیا تو اسلامی نظام کو برقرار رکھا اُنہوں نے شرع اسلامی کو ملک کا قانون بنایا اور اس کے نفاذ کے لئے مسلمان قاضی مقرر کئے اُس وقت جو کچھ کیا جاتا دہلی کے مسلمان شہنشاہ کے نام پر کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بادشاہت کا طغریٰ امتیاز حاصل کرنے سے اس قدر ڈرتی تھی کہ ایک طویل مدت تک بھی جب مسلمان ملازمین کی وساطت سے حکومت کرنے کی کوشش اسلامی نظام کی ناقابل ذکر بدعنوانیوں کے باعث قطعاً ناکامیاب ہو چکی تھی اُس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ بادشاہ کی نائب ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس کی ظاہرداری نے آخر ایک قابل نفرت تماشے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہم

اُس زمانے میں بھی جب ہمارا ریزیڈنٹ شاہ دہلی کو ایک غریب قیدی کی طرح کھانے پینے کے لئے کچھ ماہوار رقم بطور وظیفہ دیا کرتا تھا جو حکم جاری کرتے اُسی کے نام پر کرتے (۱۸۳۳ء تک سکوں پر یہ عبارت کندہ ہوتی تھی جو ناموں کے تغیر کے ساتھ متواتر جاری رہی۔ بادشاہ شاہ عالم پاسبان دین محمدی سایۂ رحمت الٰہی نے یہ سکہ ہفت اقلیم میں جاری کرنے کے لئے ڈھالا۔ اور دوسری طرف کندہ ہوتا تھا۔ مرشد آباد میں تخت نشینی کے اُنیسویں سال ہمایوں میں ڈھالا گیا۔)

چونکہ اب تک جو لوگ ہندوستان کی تاریخ پر قلم اٹھاتے رہے وہ کبھی ہندوستان نہیں آئے اس لئے اُن سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ انگلستان میں بیٹھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس عجیب و غریب طرز عمل کو سمجھ سکیں گے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے بادشاہت قبول کرنے میں دس سال بھی جلدی کی ہوتی تو ہم مسلمانوں کی ایسی بغاوت میں گھر جاتے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہوتی۔ مسلمان محسوس کرتے کہ ان کی حیثیت یک قلم بدل گئی ہے ہماری اپنی حالت بھی ایک ایسی کافر طاقت کی ہو جاتی جس نے دارالاسلام پر قبضہ کر لیا ہو۔ اندریں حالات مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت جمع ہو جاتی کہ بغاوت کو فرض عین قرار دے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی قابل تعریف اعتدال پسندی اور اس عزم بالجزم نے کہ "اسلامی سلطنت کی تدریجی اور طبعی موت میں ایک لمحہ بھر کی عجلت نہیں کی جائے" اس مصیبت کو ہمارے سر سے ٹال دیا ہندوستان بتدریج اور بغیر محسوس طور پر دارالاسلام سے دارالحرب میں تبدیل ہوتا گیا۔

شاہی ضلع وار دستاویزات کی کئی سال تک تحقیق کرنے کے بعد بھی میرے لئے یہ بتلانا ناممکن ہے کہ یہ تبدیلی کس سال یا کس مدت میں واقع ہوئی۔ مسلمان بادشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس برائے نام

عظمت کے محض تماشہ بن جانے کے بعد بہت کافی عرصہ حتیٰ کہ ۱۸۲۵ء تک ہمارے سکے اُسی کے نام سے جاری ہوتے تھے (۱۸۳۵ء میں کمپنی کے روپیہ پر جس کا وزن ۱۸۰ گرین تھا انگریزی بادشاہ کی شکل بنائی گئی تھی اور ایسٹ انڈیا کا نام لکھا گیا تھا) پھر جب ہمیں یہ جرأت ہوئی کہ سکوں پر انگریزی بادشاہ کی شکل دیدی جائے تب بھی ہم نے اسلامی دستور العمل اور عدالتوں میں اسلامی زبان کو برقرار رکھا گویہ باتیں بھی اپنی اپنی باری پر بتدریج مٹ گئیں۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۴ء میں ہم نے ایک دلیرانہ قدم اٹھایا میرے خیال میں یہ قدم بڑا ہی غیر دانشمندانہ تھا۔ یعنی مجلس قوانین ساز کے ایک ایکٹ کے ذریعہ ہم نے تمام مسلمان قاضیوں کو برطرف کر دیا۔ اس قانون نے نئی ہندوستانی سلطنت کی اس عمارت کو مکمل طور پر دارالحرب میں بدل دیا جس کی تعمیر پوری ایک صدی ۱۷۶۵ء سے ۱۸۶۴ء تک ہو رہی تھی۔ اسلامی حکومت کے اس طرح بتدریج مٹنے سے ہماری مسلمان رعایا پر نئے فرائض عائد ہونے گئے۔" صفحہ ۱۹۵

"مسلمانوں سے انہیں خطروں کے ماتحت ہندوستان میں سود در سود کا قانون بھی رائج کیا گیا۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ ہندوستان پر قومی قرضہ (انڈین نیشنل ڈیبٹس) اس قدر بڑھ جائے کہ وہ کبھی سبکدوش نہ ہو سکے اور روپیوں کے دریا سود کی وجہ سے انگلستان کی طرف ہمیشہ بہتے رہیں۔ ہندوستان میں قدیم زمانہ سے دام دوپٹ کا قانون جاری تھا یعنی اصل قرض کی مقدار ہی میں سود کی ڈگری دی جاتی تھی۔ پھر اس ڈگری کے بعد حکومت قرضخواہ کی پشت پناہ نہ ہوتی تھی قرض خواہ (مہاجن اور قرضدار) آپس میں کسی مقدار پر صلح کر کے سبکدوش ہو جاتے تھے۔ مگر انگریزی قانون حکومت کو مہاجن کا پشت پناہ بنانے لگا حکومت قرض دار کو صرف قید و بند ہی نہیں بلکہ قرقی وغیرہ سے بھی مجبور کر کے مہاجن کو کامیاب بنانے لگی۔ اوّل تو سود اور سود در سود ہی ایسی عظیم الشان مصیبت بن گیا کہ سو دو سو قرضہ چند ہی سالوں میں لاکھوں کی مقدار پر پہنچ جاتا تھا۔ ثانیاً حکومت

اپنی ذمّہ داری کی بناء پر جائدادیں اور گھر کے زیورات اور دیگر سامان وغیرہ قرق کرکے بیچنے لگی۔ اس قانون نے ہزاروں مسلم امراء اور نوابوں کے خاندان اور لاکھوں زمینداروں کو لنگوٹیا، نان جویں کا محتاج، فاقہ مست بنا دیا۔ ان امراء اور نوابوں اور زمینداروں کی زمانہ ہائے سابق میں بڑی بڑی آمدنیاں تھیں ان کی عادتیں تمام ضروریات زندگی اور رسومات بیاہ شادی اور رسومات موت وغمی اور امور مذہبی وغیرہ میں نہایت کشادہ بلکہ فضول خرچیوں اور اسراف تک کی پڑی ہوئی تھیں۔ وقت پر اگر سرمایہ موجود کافی نہ ہوتا تھا تو قرض لے کر پوری کرتے اور اپنی جائدادوں وغیرہ کی آمدنیوں سے قرض ادا کرتے تھے مسلم رعایا کے لوگ بھی لگان اور ٹیکس اسی طرح قرض سے ادا کیا کرتے تھے مگر اس قانون سود در سود نے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں سب کا دیوالہ نکال دیا۔ پرانے رؤساء اور امراء اگرچہ حکومت اور عہدہ ہائے بالا سے محروم کر دیئے گئے تھے مگر اُن کی عادتیں اور نام و نمود کی خواہشیں برابر باقی تھیں اس لئے ان کی کشادہ دلی اور رسوم کی ادائیگی میں فرق نہ آیا اور نہ آنا تھا۔ رسّی جل جاتی ہے مگر اُس کی اینٹھن نہیں جاتی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مہاجن جائدادوں کے مالک بن گئے اور لاکھوں مسلمان خاندان بربادی کے گھاٹ اُتر کر نیست و نابود ہو گئے علاوہ ان رسوم کے تعلیمی مصارف کی روز افزوں زیادتی اور رکورٹوں کے اندھا دھند مصارف نے رجوکہ زمانہ ہائے قدیم میں پائے نہ جاتے تھے کیونکہ انگریزی قانون نے انصاف اور تعلیمات کو انتہائی گرانبار اور گراں کر دیا ہے۔ بالخصوص عدالت دیوانی میں تو انصاف حاصل کرنا بغیر مصارف ثقیلہ کے ناممکن ہو گیا ہے) بھی ہزاروں غیر مسرف خانوادوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہ سب مٹنے والے خاندان عموماً مسلمان تھے اور مہاجن عموماً غیر مسلم تھے۔

ادھر صنعت و تجارت کے پیشے بھی عام طور پر مسلمانوں میں پائے جاتے تھے۔ خشکی اور سمندروں میں سفر کرنے کے مسلمان ہی عادی تھے۔ دور دراز ملکوں

اُن کے تعلقات تھے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح دونوں کو انگریزوں نے مٹایا ہے جس سے خصوصی طور پر لاکھوں تجارت پیشہ اور دست کار خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ بہر حال انگریزی حکومت اور اس کے ذمہ داروں نے عام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں اور بالاخص بڑے مسلمان رؤسا اور امراء کو انتہائی درجہ میں نیست و نابود کر دیا۔ مذکورہ بالا امور جن کو ہم نے کافی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہی وہ امور تھے جنہوں نے مسلمانوں میں ایک تڑپ پیدا کر دی۔ یہ تڑپ کیا تھی۔ ایک درد تھا۔ پوری ملّت کا ایک درد تھا۔ جو اس کو گلو خلاصی پر مجبور کر رہا تھا۔ یہ ایک نیم بسمل قوم کی اضطرابی حرکت تھی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ ملک اور ملّت اُن مصائب سے نجات پائے جن کے نشتر شب و روز جسدِ ملّت کے ہر رگ و پے میں پیوست ہو رہے تھے اس مذبوحانہ اضطراب نے مسلمانوں کو کس طرح آمادہ انقلاب کیا اور اُن کے رہنماؤں بالخصوص حضرات علماء نے اپنی ایمانی فراست اور دانش مندانہ بصیرت سے کس طرح انقلاب کا لائحہ عمل پیش کیا اور حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز اور آپ کے متوسلین نے کس طرح جانبازانہ اور سرفروشانہ کوششوں میں اپنی زندگی صرف کی اس کی تفصیل دوسری جلد میں پیش کی جائے گی۔ واللہ الموفق وھو المعین

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

ختم شد

چند مطبوعات دارالاشاعت

		قیمت
قصص القرآن چار جلد کامل مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی کل صفحات ۱۷۸۴ سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ صحیح ترین نسخے کا فوٹو لیکر چھاپا گیا ہے۔	قرآنی قصص اور انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور اُن کی دعوتِ حق کی مستند تاریخ و تفسیر پر نہایت محققانہ کتاب جو فاضل مصنف کے تدبر قرآن کا شاہکار ہے جس میں انبیاء علیہم السلام اور پچھلی اُمتوں کے مستند واقعات اور ان واقعات سے حاصل ہونے والی عبرتیں، الحاد، تحریف دین، اور مادہ پرستی کا احتساب جدید عصری تحقیقات تفسیر حدیث اور علم کلام کے نادر مباحث طرز استدلال سائیٹفک اور دلنشین یہ کتاب عوام وخواص میں بیحد مقبول ہے اور ہمارا شائع کردہ نسخہ اغلاط سے پاک اور صحیح ترین نسخہ ہے۔ عکسی طباعت، سفید کاغذ، جلدیں مضبوط اور ہر جلد پر حسین پلاسٹک کور۔	جلد اول صفحات ۵۷۲ جلد دوم سوم صفحات ۶۹۲ جلد چہارم صفحات ۵۲۰ کامل سیٹ
فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جدید ترتیب اور جدید اضافہ از مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتی محمد شفیع صاحب سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ کل صفحات ۱۹۰۰	دارالعلوم دیوبند کی خداداد شہرت اور اس کے فتاویٰ پر تمام ممالک اسلامیہ مسلمانوں کی پنچایتوں اور عدالتوں کا اعتماد محتاج بیان نہیں دور حاضر کے یہ وہ فتاویٰ ہیں جو اکابر علماء کے لکھے اور دیکھے ہوئے ہیں اور جنکو مسلمانوں کے ہر طبقہ میں مستند و معتبر تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ فتاویٰ متعدد بار شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں اس دفعہ ترتیب بالکل بدل کر تمام مسائل کو فقہی ابواب و فصول کے تحت کر دیا گیا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے کراچی میں لکھے ہوئے فتاویٰ جواب تک شائع نہیں ہوئے تھے ان میں سے آج کل کی ضرورت کے بیشمار فتاویٰ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کتابت و تصحیح دوبارہ کرائی گئی ہے۔ عکسی طباعت سفید کاغذ مجلد اعلیٰ۔	جلد اوّل جلد دوم کامل دو جلد

چند مطبوعات دارالاشاعت

کتاب	تفصیل	قیمت
تاریخ ارض القرآن از مولانا سید سلیمان ندویؒ کامل دو جلد سائز ۲۲×۱۸ / ۸	قرآن پاک کی تاریخی آیات کی تفسیر سرزمین قرآن کا جغرافیہ اور تاریخ قرآن میں مذکورہ اقوام کے تاریخی حالات پر ایک محققانہ اور فاضلانہ کتاب، دونوں جلدیں یکجا، عکسی طباعت مجلد	
تاریخ فقہ اسلامی شیخ محمد خضری بک مصری ترجمہ حبیب احمد ہاشمی سائز ۲۲×۱۸ / ۸	فقہ اسلامی کی تاریخ پر مشہور و مستند کتاب تاریخ التشریع الاسلامی کا مکمل اردو ترجمہ جس میں نبی کریم سے لیکر آج تک ہر دور کے فقہ اسلامی کی تاریخ اور خصوصیات درج ہیں، امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے شاگردوں کے حالات، عکسی طباعت، سفید کاغذ، مجلد مع ڈسٹ کور۔	
تذکرہ مجدد الف ثانی مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ سائز ۲۲×۱۸ / ۸	حضرت مجدد شیخ احمد سرہندیؒ کے مکمل حالات زندگی اور تجدید واحیاء دین کے کارنامے اکبر و جہانگیر کے تاریک ترین دور میں آپ نے جو ایمان کی شمع روشن کی اس کی مستند ترین داستان عکسی طباعت، سفید کاغذ مجلد مع پلاسٹک کور۔	
تاریخ دارالعلوم دیوبند از مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ سائز ۲۲×۱۸ / ۸	دارالعلوم دیوبند کی ایک سو سالہ مستند تاریخ دارالعلوم دیوبند نے جو خدمات پوری دنیا میں انجام دیں اس کی تفصیل مشاہیر دیوبند کے حالات اور مدرسے دارالعلوم کی عمارات کے عکسی فوٹو، عکسی طباعت، سفید کاغذ مجلد۔	
تاریخ مذہب شیعہ از مولانا عبدالشکور لکھنویؒ سائز ۳۰×۲۰ / ۱۶	مذہب شیعہ کی پوری تاریخ اور مشہور منافق ابن سبا یہودی کے حالات پوری تفصیل سے بیان کئے ہیں کہ اس نے کسطرح، مسلمانوں میں تفرقہ ڈالا اور ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوگیا، عکسی طباعت سفید کاغذ بکس بورڈ جلد	
تعلیم الاسلام مولانا مفتی محمد کفایت اللہ	دینی معلومات عقائد و مسائل اسلام کی عام فہم مشہور و معروف کتاب جو سوال و جواب کی صورت میں لکھی گئی ہے ہر گھر میں بچوں کو پڑھانے کیلئے مقبول ترین سلسلہ چار حصے یکجا عکسی طباعت سفید کاغذ بکس بورڈ جلد	

اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ

نقشِ حیات

خود نوشت سوانح حیات

حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی

جلد دوم

وہ قابل قدر بیش بہا مستند تاریخی مجموعہ جس میں اسلامی ریاستوں پر دول یورپ کی مسلسل یورش۔ استخلاص وطن کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ۔ حضرت سیّد احمد صاحب شہید کا جہاد حریت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علماء اور مشائخ اسلام کا حصہ۔ ریشمی خطوط کی تحریک یعنی شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی انقلابی تحریک، اس کے رفقاء کار۔ ہندوستان اور افغانستان میں اس کے اثرات و نتائج۔ اسارت مالٹا۔ مقدمہ کراچی وغیرہ وغیرہ یعنی انیسویں اور بیسویں صدی میں اسلامی سیاسیات۔ اس کے تقاضوں ردعمل اور پس منظر پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے

ناشر

مولانا حسین احمد مدنی رح

(محشر رسا دقی اعظمی نظام آبادی)

فدائے قوم و ملّت بے اسیر مالٹا تو ہے!
ہمارا رہنما تو ہے ہمارا پیشوا تو ہے
نہاں گنجینۂ علم و عمل ہے تیرے سینے میں،
دیا ہے درس قال اللہ مدّت تک مدینے میں
حسین احمد تیرا ایثار عالم آشکارا ہے
ستم کاروں کا دشمن بیکسوں کا تو سہارا ہے
ہے چرچا تیرے استقلال کا ہفت آسمانوں میں
برائے قوم تکلیفیں اٹھائیں قید خانوں میں
مقدّس تیری ہستی سب سے اعلیٰ تیری شخصیت
تعالیٰ اللہ تیرا صبر و تحمل ہمّت و جرأت
فدائے قوم شیدائے وطن ملّت کا دیوانہ
تجھے کہتی ہے دنیا شمع آزادی کا پروانہ
مبارک ہو تجھے اے قوم ایسا رہبر کامل
دکھائے گا یہی راہیں بتائے گا یہی منزل

فہرست مضامین نقشِ حیات جلد دوم،

تو تھا ملّت کا بلاشک ایک سچا رہنما

اے حسین احمد سراپا با صفا و با وفا
تو تھا ملّت کا بلاشک ایک سچا رہنما
خدمتِ دیں کے لئے تھی وقف تیری زندگی
دین و ملّت کے لئے جھیلے مصائب بارہا
کیوں نہ ملت کو تری خدمات پر ہو فخر و ناز
تو نے پھیلایا جہاں میں علم دینِ مصطفےٰ
تیرے زرّیں کارناموں کی نہیں ملتی مثال
حق کی خاطر تو رہا برسوں اسیرِ مالٹا
چار سو چرچا ترے علم و عمل کا کیوں نہ ہو
تھا تو ئی علم و عمل کا ایک موتی بے بہا
دے گیا توحید کا ملّت کو تو اب سبق
ماسوا اللہ کے کوئی نہیں مشکل کشا
تیرے حق میں التجا انورؔ کی ہے لیل و نہار
تیری تربت پر سدا ہو بارشِ نورِ خدا

(حافظ نور محمد انورؔ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

جلد دوم

نقش حیات

تحریک استخلاص وطن کی ابتدا

حصول اقتدار۔ استحصال دولت۔ اقتصادی برتری کے لئے یورپین اقوام بالخصوص انگریزوں نے جو نفرت انگیز، انسانیت سوز مظالم کئے اور جن کا طویل سلسلہ وحشت و بربریت کی پوری سرگرمیوں کے ساتھ برابر جاری تھا انہیں سفاکانہ مظالم نے عام مسلمانوں بالخصوص علمی طبقہ میں آزادی کی عام تڑپ پیدا کی۔ پہلے پہلے تو یہ خیال تھا کہ بادشاہ اور صوبہ جات کے نواب وزراء وغیرہ اس بدیسی یورپین ظالم قوم کا قلع قمع کر دیں گے۔ مگر پلاسی اور پھر بکسر پھر روہیلکھنڈ و میسور، مدراس، دکن، بمبئی وغیرہ کی لڑائیوں میں ناکامیوں نے انتہائی مایوسی پیدا کر دی اور مصائب کے روز افزوں زلزلوں نے سخت پریشان کر دیا۔ ۱۸۰۳ء میں جب کہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندہ نے بادشاہ دہلی سے ملکی انتظام کا پروانہ جابرانہ طریقہ پر لکھوا کر ملک میں اعلان کرادیا کہ:-

"خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا حکم کمپنی بہادر کا"، تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کے دارالحرب ہوجانے کا فتویٰ دیا اور مسلمانوں کو آزادی ہند کے لئے آمادہ کرنا ضروری سمجھا[1] (وہ فتویٰ مفصل فتاویٰ عزیزیہ صفحہ ۱۷ وغیرہ میں موجود ہے)

---

[1] اسی حالت کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۱۹۸ میں لکھتا ہے "ہمارے لئے اگرچہ اپنی مسلمان رعایا سے پرجوش وفاداری کی توقع رکھنا عبث ہوگا لیکن ان سے یہ امید رکھنا بھی غیر معقول نہیں کہ جب تک ہم پابندی کے ساتھ ان کے حقوق پورے کرتے رہیں گے وہ بھی ایمانداری کے ساتھ اس صورتحالات میں اپنے فرائض سرانجام دیتے رہیں گے جس میں اللہ تعالےٰ نے ان کو ہمارے زیرنگین کردیا ہے۔ علماء میں سے جو لوگ زیادہ زیرک تھے انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت میں آنے والے تغیر کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ یہ تغیر اب ایک حقیقت بن چکا ہے وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے فتووں سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مآل اندیشانہ رویہ کے باوجود حکومت کا انقلاب ایک نامعلوم طریقہ پر جاری نہ تھا۔ چنانچہ اُن میں سے ایک فتوے میں صاف صاف اعلان کیا گیا ہے کہ ہندوستان اُس وقت تک دارالاسلام رہ سکتا ہے جب تک مسلمان مفتی جن کو آگے چل کر ہم نے برطرف کردیا تھا قانونی فیصلے کرتے رہیں۔ ان میں سے دو فتوے یعنی ایک تو شمس الہند مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب اور دوسرا اُن کے بھتیجے مولوی عبدالحی صاحب کا سب سے زیادہ اہم ہیں جب ہم نے نظام حکومت کو بتدریج اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو اس وقت دیندار مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا کہ ہمارے ساتھ ان کے تعلقات کیا ہونے چاہییں۔ لہٰذا انہوں نے ہندوستان کے سب سے زیادہ مستند علماء سے رجوع کیا اور اُوپر کے دونوں مشہور علماء نے اُن کے جواب میں فتوے صادر فرمائے۔ جو حرف بحرف مندرجہ ذیل ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "جب کافر کسی اسلامی ملک پر قابض ہوجائیں اور اُس ملک اور ملحقہ اضلاع کے لئے یہ ناممکن ہو کہ وہ اُن کو اُس سے باہر نکال سکیں یا اُن کو باہر نکالنے کی کوئی اُمید باقی نہ رہے اور کافروں کی طاقت میں یہاں تک اضافہ ہوجائے کہ وہ اپنی مرضی سے اسلامی قوانین کو جائز یا ناجائز قرار دیں اور کوئی انسان اتنا طاقتور نہ ہو جو کافروں کی مرضی کے بغیر ملک کی مال گذاری پر قبضہ کر سکے اور مسلمان باشندے اُس امن وامان سے زندگی بسر نہ کرسکیں جیسا کہ وہ پہلے کرتے تھے تو یہ ملک سیاسی اعتبار سے دارالحرب ہوجائیگا۔ جوں جوں ہماری طاقت مضبوط ہوتی گئی علماء کے فتووں میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ مولوی عبدالحی صاحب جو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد ہوئے صاف طور پر حکم لگاتے ہیں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۱ پر)

واقعات نے بتلا دیا تھا کہ ہندوستان کے موجودہ حکام و امراء میں اب کسی میں طاقت اس بدیسی غیر مسلم ظالم قوم کے مقابلہ اور دفع کرنے کی ایسی نہیں رہی جس پر اطمینان کیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کو احوال پر غور کرنا اور آزادی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا از بس ضروری ہے جو کہ ہر دار الحرب کے باشندوں پر لازم ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سے جدوجہد شروع ہوئی۔ جو کہ سکھوں کے مقابلہ کے نام سے مشہور کی گئی[1] اُس زمانہ میں مغربی پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی جو کہ انگریزوں کے حلیف تھے اور آپس میں (انگریزوں اور راجہ رنجیت سنگھ میں) زوردار معاہدے کئے ہوئے تھے۔ مگر حقیقت میں[2] سکھوں سے لڑنے کا مقصد اصلی ان بدیشیوں (انگریز) اور اُن کے معاونین سے لڑکر ملک کو اس مصیبت سے بچانا تھا اور رعایا پر سے اُن کے وحشیانہ مظالم کو اٹھا دینا اور بس حضرت سید احمد صاحب بریلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ جو کہ اس تحریک کے سردار اور بانی ہیں اُن کے خط میں جو کہ وزیر گوالیار کے نام مدد طلب کرنے کے لئے لکھا گیا تھا (جس کو ہم بجنسہٖ آگے ذکر کریں گے) صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ ہمارا مقصد ہندوستان کو اس بدیسی قوم (انگریز) کے مظالم سے پاک کرنا ہے اس کے بعد ہندو اور مسلمان مل کر بادشاہت کے لئے جس کو مناسب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۹) "عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لیکر دہلی اور ہندوستانِ خاص سے ملحقہ ممالک (یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبے) تک سب کی سب دار الحرب ہے کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ دار الحرب ہے۔ یہاں اُن تمام شرائط کا بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا جن کے ماتحت جملہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ کلکتہ اور اُس کے ملحقات دار الحرب ہیں۔ ان فتووں سے عملی نتائج بھی مرتب ہوئے۔ وہابیوں نے جن کا جوش اُن کے علم کی نسبت بہت زیادہ ہے اس اصول سے کہ ہندوستان دار الحرب ہے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اُس کے حاکموں کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے"

[1] بہت سی مصلحتیں تھیں جن کی بناء پر اس نام سے شہرت دی گئی ان مصلحتوں کو ہم آئندہ ذکر کریں گے۔

[2] حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ فرقہ وارانہ نہ تھی۔ ہندوستان میں کئی سو ریاستیں غیر مسلموں کی پہلے سے چلی آتی تھیں جو کہ مسلمان بادشاہوں نے غیر مسلم فرمانرواؤں کو دے رکھی تھیں۔ راجہ رنجیت سنگھ کو بھی شہزادہ زمان خاں ابدالی نے پنجاب کا گورنر بنایا تھا۔

سمجھیں منتخب کریں[1]۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجاہدین کی جماعت جو کہ باغستان میں اب تک مقیم ہے اور جس کو انگریز باغی کیمپ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں سکھوں کی حکومت کا خاتمہ ہو جانے کے بعد بھی وہاں مقیم رہے انگریزوں نے بہت خواہش کی کہ وہ اپنے وطنوں میں لوٹ آئیں۔ مگر اُن کا بڑا حصہ وہیں رہ کر انگریزوں سے برسرِ پیکار ہوتا رہا۔ مندرجہ ذیل اقتباس جو کہ البرہان جلد ۱۲ صفحہ ۷۴ ۔ اگست ۱۹۴۸ء کا ہے اس پر پوری روشنی ڈالتا ہے۔

ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر کے بعد یہاں کی حکومت کو گھن لگنا شروع ہوا تو حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی (مرحوم) نے نہ صرف یہ کہ اس کو محسوس کیا بلکہ اس کے اسباب و علل پر بڑی دیدہ وری اور جامعیت کے ساتھ بحث کی اور ان کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے اس کی طرف حکومت کو امرا اور وزرا کو اور سوسائٹی کے دوسرے طبقات کو درجہ بدرجہ نہایت پُر زور و پُر شکوہ الفاظ میں توجہ دلائی۔ حضرت شاہ صاحب (مرحوم) کے بعد آپ کے صاحبزادہ اور صحیح جانشین حضرت شاہ عبد العزیز صاحب (مرحوم) کی حیات میں دہلی کے حالات اور زیادہ بگڑ گئے اور حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم کی مثل صادق آنے لگی۔ انگریزوں کا اقتدار اور اُن کا ظلم و ستم اور اس کے بالمقابل لال قلعہ کے بادشاہ کی قوت کا اضمحلال روز افزوں ہو گیا تو شاہ عبد العزیز صاحب نے دہلی کے دارالحرب ہونے کا فتوےٰ دیا۔ چنانچہ ایک شخص جس نے پوچھا تھا کہ دارالاسلام دارالحرب بن سکتا ہے یا نہیں۔ حضرت شاہ صاحب اُس کے جواب میں یہ بتانے کے بعد کہ کن کن چیزوں کے پیدا ہونے سے دارالاسلام دارالحرب بن جاتا ہے خاص دہلی کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔ "دریں شہر حکم امام المسلمین الخ"۔ (ترجمہ) "امام المسلمین (بادشاہِ اسلام) کا حکم اس شہر میں بالکل جاری نہیں ہے اور بڑے بڑے عیسائیوں (انگریزوں) کا حکم بے دغدغہ جاری ہے اور احکام

---

[1] ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۹۸ میں سید صاحب کی حج سے واپسی بمبئی پر لکھتا ہے "پہلے جو چیز اُن کی نظر میں محض خواب و خیال تھی وہ اُن کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی جس میں انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریز کافروں کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا"۔

کفر کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ملک داری، رعایا کا بندوبست، خراج اور باج کا وصول کرنا کسٹم ڈیوٹی لینا۔ رہزنوں کو سزا دینا، اور مقدمات کا فیصلہ کرنا، اور جرموں کی سزا دینا یہ تمام معاملات یہ لوگ خود ہی کرتے ہیں۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں۔ کہ "اگرچہ بعض احکام اسلام ایسے ہیں جن سے یہ تعرض نہیں کرتے مثلاً جمعہ، عیدین اور اذان و ذبح بقر وغیرہ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ جب ان چیزوں کی جو اصل اور جڑ و بنیاد ہے وہی ان کے نزدیک غیر وقیع ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بے تکلف مسجدوں کو گرا دیتے ہیں اور کوئی مسلمان یا ہندو ان سے امن لئے بغیر دہلی یا اُس کے اطراف و جوانب میں نہیں آسکتا اور دوسرے بڑے بڑے سردار مثلاً شجاع الملک اور ولائتی بیگم بھی ان عیسائیوں کے حکم اور اجازت کے بغیر اس علاقہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ عیسائیوں کا عمل دخل دہلی سے کلکتہ تک پھیلا ہوا ہے۔"

عام لوگ جو مسلمانوں کی گذشتہ دو سو سال کی سیاسی جد و جہد کی تاریخ سے بے خبر ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں کانگریس ہی سب سے بڑی اور سب سے پہلی وطنی جماعت ہے جو ملک کو اجنبی اقتدار سے آزاد کرنے کے لئے کھڑی ہوئی۔ اس قسم کا خیال کرنا تاریخی اعتبار سے بالکل غلط ہے کیونکہ اوّل تو کانگریس کی ابتداء ۱۸۵۷ء کے بہت بعد ۱۸۸۵ء میں ہوئی اور پھر اس کے اوّلین مقاصد میں ملک کو آزاد کرانا نہیں بلکہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں باہمی اعتماد پیدا کرنا اور اُن کے دلوں کو ایک کرنا تھا۔ چنانچہ کانگریس کا پہلا اجلاس جو ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو مسٹر بنرجی وکیل کلکتہ کی زیر صدارت بمبئی میں منعقد ہوا تھا اور جس میں بمبئی کے مشہور مسلمان تاجر مسٹر رحمت اللہ سیانی اور دوسرے مسلمان بھی شریک ہوئے تھے اس میں کانگریس کے مقاصد حسبِ ذیل بیان کئے گئے تھے۔

۱۔ ہندوستان کی آبادی جن مختلف عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔

۲۔ اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو اس کی دماغی۔ اخلاقی اور اجتماعی و سیاسی صلاحیتوں کو بیدار کرنا۔

۳۔ ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندوستان کے لئے نقصان کا باعث

اور غیر منصفانہ ہوں اور ہندوستان اور انگلستان میں اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا۔

اس واقعہ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) مسلمان اور ہندو اور دوسرے مذاہب کے ارباب نظر نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریز اپنی حکومت کو مضبوط اور دیر پا بنانے کے لئے ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی اختلاف سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے کیا۔ اس بنا پر انہوں نے کانگریس کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی قرار دیا تھا کہ ہندوستان کی سب قوموں کو ملا کر ایک ہندوستانی قوم بنایا جائے۔ (۲) کانگریس کے قیام کا مقصد انگریزوں سے ملک واپس لینا نہیں تھا بلکہ راعی اور رعایا دونوں کے باہمی تعلقات کو خوشگوار رکھنا تھا۔

بہر حال یہ ظاہر ہے کہ کانگریس کے عالم وجود میں آنے سے بہت پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب (مرحوم) اور آپ کے ہم خیال دوسرے علماء کی رہنمائی میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی تھی جو ہندوستان کو انگریزوں کے اقتدار سے نجات دلانا اپنا فرض سمجھتی تھی آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ اس جماعت میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے لیکن قیادت اور سیادت بہر حال مسلمانوں کو حاصل تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز (مرحوم) کے علاوہ آپ کے شاگرد مولانا عبدالحی صاحب بھی صراطِ مستقیم میں لکھتے ہیں۔

"سلطنت شاہجہاں آباد در دہلی امر محض بلا حقیقت است کہ اصلا معنی از سلطنت نماندہ"

جمہوریت یا فسطائیت

اس موقعہ پر آگے بڑھنے سے قبل یہ معلوم کر لینا موضوع گفتگو کی زیادہ وضاحت کا سبب ہو گا کہ علماء کا سلطنت کے معاملات میں کیا رویہ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کو جمہوری نظام پر چلانے کی کوشش کی یا وہ اُسے فسطائیت کی راہ پر چلانا چاہتے تھے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ علماء نے حکومت کو ہمیشہ جمہوریت کے اصول پہ چلنے کی تلقین کی۔ وہ حکومت کو خدا کی مخلوقات جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں ان کی خدمت کا ذریعہ سمجھتے تھے نہ کسی قسم کے تغلب اور جبر و تشدد کا۔ قرآن کی انسانیت عامہ کی تعلیم کے پیشِ نظر اُن کا اصل مقصد تھا انسانیت کو اس کی نشو و نما میں مدد دینا۔ خدا کی پاک زمین سے ظلم و فساد کی گندگی کو دور کرنا۔ عدل و انصاف کا راج قائم کرنا۔ حق اُس کے حقدار کو پہنچانا۔ خدا کے مختلف المذاہب بندوں میں خلوص و محبت اور صلح و آشتی پیدا کرنا۔ حکومت پر ان کا اثر ہوتا تھا اور وہ اس اثر کو اپنے

ان مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے جب تک ہندوستان میں مغلیہ حکومت قائم رہی اور دربار پر علماء کا اثر و اقتدار رہا سلطنت انتظامی معاملات میں اسی عدل و انصاف کے اصول پر عامل رہی اس بناء پر تخت حکومت پر اگرچہ بادشاہ مسلمان نظر آتا تھا۔ لیکن دراصل حکومت کا نظم و نسق جمہوری تھا۔ آج کل جمہوریتوں میں عوام کی رائے الکشن اور انتخابات سے معلوم ہوتی ہے اور اس زمانہ میں جبکہ یہ جدید طریقہ مروج نہیں تھا۔ درباریوں، عمال حکومت، جاسوسوں اور ملک کے عام حالات وغیرہ کے ذریعہ عوام کی رائے اور اُن کی خواہشوں کا بادشاہ کو علم حاصل ہوتا رہتا تھا اور وہ اُن کی روشنی میں اپنی پالیسی متعین کرتا اور عوام کو مطمئن کرنے کے لئے احکام جاری کرتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور مقرر ایڈمنڈ برک نے پارلیمنٹ میں ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کے نظام حکومت کے متعلق صاف اور واضح لفظوں میں کہا تھا۔

"عیسائی بادشاہوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قانون میں بدرجہا زیادہ مضبوطیاں ہیں اُن کا اپنے قانون کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس لئے بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کے سب یکسانیت کے ساتھ قانون اور مذہب کے پابند ہیں۔ قرآن کے قانون کا ہر ہر حرف ظالموں کے خلاف گرج رہا ہے۔ اس قانون کی شرح کرنے والے علماء یا قاضیوں کا طبقہ موجود ہے جو اس کا محافظ قرار دیا گیا ہے اور جو بادشاہوں کی ناراضی سے محفوظ ہے اور جسے بادشاہ بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اُن کے بادشاہوں تک کو حقیقی اعلیٰ طاقت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ وہاں کی حکومت ایک حد تک جمہوری ہے"

(تقاریر ایڈمنڈ برک (انگریزی) جلد اوّل صفحہ ۱۰۴ و ۱۰۵)

علماء کے زیر اثر ملکی معاملات میں ہندو یا مسلم کا کوئی امتیاز نہیں تھا دونوں کو یکساں حقوق حاصل تھے۔ اور اُن کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارے ملک کے مشہور مصنف پنڈت سندر لال الہ آبادی لکھتے ہیں:۔

"اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اُن کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو و مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے دونوں مذاہب کی توقیر کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور

معافیاں دی گئی تھیں" (بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ایڈیشن ۵۔ صفحہ ۲۴۰)
شواہد و نظائر بے شمار ہیں۔ کوئی کہاں تک گناسکے صرف ایک واقعہ جو حد درجہ عبرت آمیز ہے سُن لیجئے سلطان محمد تغلق کا نام کس نے نہ سنا ہوگا۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کے جاہ و جلال اور رعب و داب کا کیا عالم تھا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ اُس کے متعلق اپنا چشم دید واقعہ لکھتا ہے:۔

"ایک مرتبہ سلطان کے خلاف ایک ہندو نے عدالت میں استغاثہ کیا کہ بادشاہ نے اُس کے لڑکے کو بے وجہ مارا ہے۔ قاضی نے بادشاہ کو مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں طلب کیا اور مقدمہ کی سماعت کی۔ آخر یہ فیصلہ کیا کہ بادشاہ پر جرم ثابت ہے اور اُس سے بدلہ لیا جائے۔ سلطان محمد بن تغلق نے بے چون و چرا عدالت کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا" ابن بطوطہ لکھتا ہے:۔

"میں نے دیکھا کہ بادشاہ نے عدالت کے فیصلہ کے مطابق ہندو زادہ کو دربار میں بلایا اور اُس کے ہاتھ میں چھڑی دے کر کہا کہ لے مجھ سے بدلہ لے لے" مزید برآں لڑکے کو اپنے سر کی قسم دے کر کہا کہ جس طرح میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی مجھ کو اُسی طرح مار۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اب لڑکے نے بادشاہ کے اکیس چھڑیاں ماریں یہاں تک کہ ایک مرتبہ بادشاہ کی ٹوپی بھی سر پر سے گر پڑی"

(سفر نامہ ابن بطوطہ ج ۲ صفحہ ۱۳۰)

دنیا میں عدل و انصاف ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے باعث ایک شخص کو کسی حکومت پر مکمل اعتماد ہو سکتا ہے۔ مسلمان بادشاہ چونکہ علماء کی زیر نگرانی اس راہ پر گامزن رہتے تھے اس بناء پر بلا اختلاف مذہب و ملت رعایا کو ان پر اعتماد ہوتا تھا اور بغاوت و سرکشی کے واقعات ہوتے بھی تھے تو اُن کی بنیاد مذہب کے اختلاف پر نہیں ہوتی تھی علاوہ بریں کسی فرقہ کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس فرقہ کے لئے بھی حکومت کے عہدوں اور منصوبوں کے دروازے ایسے ہی کھلے رکھے جائیں جیسے کہ خود اپنے فرقہ کے لوگوں کے لئے اور ملکی و انتظامی معاملات میں کسی قسم کا کوئی تعصب نہ برتا جائے۔

قرآن کا حکم ہے۔ ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ (کسی قوم سے تکدر تم کو اس پر مجبور نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ نہیں تم بہر حال انصاف ہی کرو)۔

یہی پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے) مغل بادشاہوں نے اس معاملہ میں کس حد تک بے تعصبی برتی۔ تاریخ کے دفتر اس سے پر ہیں۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اُن سے قطع نظر خود اورنگ زیب عالمگیر جو اپنی خشک مذہبیت کے لئے بدنام ہے اُس کے عہدِ حکومت میں راجپوت اور ہندو سیکڑوں کی تعداد میں بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر فائز تھے اور جب کسی نے اُس پر اعتراض کیا تو اُس نے فوراً کہا۔ دنیوی کاروبار اور حکومت کے معاملات کا دارومدار قابلیت اور لیاقت پر ہوتا ہے اس میں مذہب کو دخل ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔

زوالِ حکومت کے بعد علما کا نصب العین

یہ جو کچھ آپ نے پڑھا اُس زمانہ سے متعلق ہے جب کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا اقتدار پورے طور پر قائم تھا۔ پھر جبکہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اُس میں اضمحلال آنا شروع ہوا اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے رہے تو اب علمائے اُن کی اصلاح کی کوشش کی اور اس کوشش سے اُن کا مقصد ملک کی خوشحالی، امن وامان سکون و اطمینان ظلم وجور کی بیخ کنی اور خلق خدا کی عام رفاہیت و بہبودی تھا اُن کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ حکومت مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ جس کی بھی حکومت ہو انصاف کرے اُس سے خدا کے بندوں کو کوئی دکھ نہ پہنچے پھر خدمت انسانیت کے اس جذبۂ بلند و اعلیٰ کے زیر اثر مقصد کی تکمیل کے لئے وہ سب کچھ کرتے تھے جو ایک باعمل سرفروش جماعت کو کرنا چاہیئے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے کا جو اقتباس اوپر گذر چکا ہے اس میں دو باتیں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہیں۔

(۱) حضرت شاہ صاحب نے انگریزوں کے خلاف جو ظلم وستم کی شکایت کی ہے اُس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ذکر کیا ہے دونوں شہر دہلی اور اُس کے نواح میں امن کا پروانہ لئے بغیر نہیں آسکتے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی بھی گلوخلاصی چاہتے تھے۔

(۲) شاہ صاحب کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لئے اُس میں محض مسلمانوں کی آبادی کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لئے وہ یہ بھی ضروری جانتے ہیں کہ مسلمان باعزّت طریقہ پر رہیں اور اُن کے شعار مذہبی کا احترام کیا جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی

بہرحال اُس اقتدار میں شریک ہوں اور اُن کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لئے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیراندیشی کا معاملہ کریں۔

حضرت سیّد احمد شہید اور ان کی تحریک

حضرت شاہ ولی اللہ اور پھر حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہما نے اپنے ارشاد و ہدایت سے جس انقلابی پارٹی کی داغ بیل ڈالی تھی آخر کار اُس نے انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سیّد احمد صاحب شہید اور اُن کی جماعت حقہ کے رُوپ میں جنم لیا۔ حضرت سیّد صاحب اور آپ کے رفقائے کار نے اپنی نواہائے آتشیں سے تمام ملک میں آگ لگا کر ایک ایسی بڑی جمعیت پیدا کرلی جو ملک کو ہر قسم کے شر و فساد اور ظلم و جور سے پاک و صاف کردے اور مسلمان دوسرے اربابِ مذہب کے ساتھ عزت و خودداری کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکیں۔ یہ زمانہ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کا تھا۔ سیّد صاحب کو مسلسل اطلاعات پہنچ رہی تھیں کہ مہاراجہ کی حکومت میں مسلمانوں پر ناگفتنی مظالم ہو رہے ہیں اُن کے شعائرِ مذہبی کی علانیہ توہین ہو رہی ہے اور عرصۂ حیات اُن پر تنگ کر دیا گیا ہے آپ نے اپنے خلیفہ مولانا اسمٰعیل شہید کو ان واقعات کی تحقیق کے لئے پنجاب روانہ کیا اور آخر جب اُنھوں نے چشم دید حالات دیکھنے کے بعد ان واقعات و مظالم کی تصدیق کر دی تو آپ نے پنجاب کا رُخ کر دیا۔

جہاد کا مقصد

لیکن اس جہاد سے سیّد صاحب کا مقصد ملک گیری یا اور کوئی دنیوی منفعت بالکل نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے خطوط اور خطبات و مواعظ میں آپ بار بار اسکا تذکرہ فرماتے مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری جو حضرت سیّد صاحب کے نہایت مستند سوانح نگار ہیں لکھتے ہیں۔

کہ ایک مرتبہ ایک سوال کے جواب میں سیّد صاحب نے صاف صاف فرمایا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ مذہبی فرائض ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آجائیں گے تو ہم کو اُن سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ (سوانح احمدی صفحہ ۷۰)

ہندوستان کی یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سید صاحب کو مسلمانانِ پنجاب کی حد درجہ پامالی و زبوں حالی کے باعث مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل صف آراء ہونا اور آخر معرکہ بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ ورنہ اصل یہ ہے کہ سید صاحب کا مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط و اقتدار سے نجات دلانا تھا۔ انگریز خود اسے محسوس کرتے تھے اور اس تحریک سے بڑے خوفزدہ تھے اسی بناء پر جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے مہیّا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔

سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اس بناء پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی۔ اس سے آپ کو غرض نہیں ہے جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سرحد سے ریاست گوالیار کے مدار المہام اور مہاراج دولت رائے سیندھیا کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے آپ کے اصلی عزائم اور ملکی حکومت کے متعلق آپکے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم اس خط کو اس کی اہمیت کی وجہ سے بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔

(از کتاب مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا صفحہ ۲۴۲ تا ۲۴۷ مصنفہ مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی)

"بر رائے عالی روشن و مبرہن است	جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی
کہ بیگانگاں بعید الوطن ملوک	سمندر پار کے رہنے والے
زمین و زماں گردیدہ و تاجراں	دنیا جہاں کے تاجدار اور یہ سودا
متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ	بیچنے والے تاجر سلطنت کے
امارت امرائے کبار و ریاست	مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے
رؤسائے عالی مقدار برباد نمودہ	امیروں کی امارت اور بڑے بڑے
اند و عزت و اعتبار ایشاں	اہلِ حکومت کی حکومت اور انکی عزت
بالکل ربودہ۔ چوں اہلِ ریاست	کو انہوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔ جو حکومت

وسیاست درزاویہ خمول نشستہ
اند ناچار چندے از اہل فقر و مسکنت
کمر ہمت بستہ ایں جماعت ضعفا محض
بنا بر خدمت دین رب العالمین ہرگز ہرگز
از دنیاداران جاہ طلب نیستند محض
بنا بر خدمت دین رب ذوالجلال برخاستہ
اند نہ بنا بر طمع مال و منال و قتیکہ
میدان ہندوستان از بیگانگاں دشمناں
خالی گردیدہ و تیر سعی ایشاں
بر ہدفِ مراد رسیدہ آئندہ مناصب
ریاست وسیاست بطالبین آں مسلم
باد و بیخ شوکت و سطوت ایشاں محکم
شود وایں ضعفا را از رؤساء کبار و
عظماء عالی مقدار ہمیں قدر مطلوب
است کہ خدمت اسلام بجان و دل کنند
و بر مسند مملکت متمکن شوند۔"

وسیاست کے مرد میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ
دھرے بیٹھے ہیں اس لئے مجبوراً چند غریب و
بے سروسامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور
محض اللہ کے دین کی خدمت کیلئے اپنے گھروں سے
نکل آئے یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیادار اور جاہ
طلب نہیں ہیں محض اللہ کے دین کیلئے اٹھے ہیں
مال و دولت کی ان کو ذرہ برابر طمع نہیں جس
وقت ہندوستان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی
ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے
نشانوں تک پہنچ جائے گا حکومت کے عہدے
اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو ان
کی طلب ہو گی اور ان (ملکی حکام واہل ریاست
کی شوکت و قوت کی بنیاد مستحکم ہو گی ہم کمزوروں
کو والیان ریاست اور بڑے بڑے سرداروں
سے صرف اسی بات کی خواہش ہے کہ جان و
دل سے اسلام کی خدمت کریں اور اپنی مسندِ
حکومت پر برقرار رہیں۔"

ریاست گوالیار کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خاں کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"دریں صورت مناسب وقت
چناں می نماید کہ ریاست پیرائے
سیاست آرائے عظمت نشاں
راجہ ہندو رائے را ایں معنی
بفہمانند کہ اکثر بلاد ہندوستان
بدست بیگاں افتادہ وایشاں ہر جا
بنیاد و آئینِ ظلم و جور نہادہ ریاست

ایسی صورت میں مناسب ہی معلوم
ہوتا ہے کہ آپ سردار والا قدر راجہ ہندو رائے
کے یہ مضمون ذہن نشین
کریں کہ ملک ہندوستان
کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ
میں چلا گیا اور انہوں نے ہر
جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھی

رؤساء ہندوستان بر باد رفتہ کسے تاب و مقاومت ایشاں نمی دارد بلکہ ہر کس ایشاں را آقائے خود می شمارد چوں رؤسا یکبارہ از مقابلہ ایشاں نشستند لاچار چند کس از ضعفائے بے مقدار کمر بستند۔ پس دریں صورت رؤسائے عالی مقدار را لازم چنانکہ بر مسند ریاست سالہا سال متمکن ماندہ اند بالفعل در اعانت ضعفا مذکورین مساعی بلیغہ بجا آرند و آں را باعثِ استحکام بنیان ریاست خود شمارند۔

ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہوگئی کسی کو ان کے مقابلہ کی تاب نہیں بلکہ ہر ایک اُن کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے چونکہ بڑے بڑے اہلِ حکومت ان کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں اس لئے چند کمزور بے حقیقت اشخاص نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اس صورت میں اُن بڑے سرداروں کے لئے مناسب یہی ہے جو سالہا سال سے اپنی مسند ریاست پر متمکن چلے آرہے ہیں کہ اس وقت ان کمزوروں کی ہر طرح امداد کریں اور اس بات کو اپنی حکومت کے استحکام کا باعث سمجھیں۔

(مجموعہ خطوط قلمی صفحہ ۱۴)

حضرت سید صاحب (مرحوم) کے ان خطوط کو غور سے پڑھنے کے بعد تجزیہ کیجئے تو حسبِ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) آپ انگریزوں کو "بیگانگاں بعید الوطن" اور پردیسی سمجھتے تھے اور اُن کے استیلاء و تغلب سے تنگ آکر اُن سے لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔

(۲) آپ ہندوستان کو اپنا ملک اور وطن سمجھتے تھے۔

(۳) جہاد سے آپ کا مقصد خود اپنی حکومت قائم کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ دین رب العالمین کی خدمت تھا۔

(۴) ہندوؤں سے اختلافِ مذہب کی بناء پر آپ کو پرخاش تو کیا ہوتی آپ کمپنی کے ہاتھوں مظلومیت و پامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں شریک جانتے تھے اور جہاد سے آپ کی غرض دونوں کو ہی اجنبی اقتدار کی مصیبت سے نجات دلانا تھا۔

(۵) کامیاب ہونے کے بعد ہندوستان میں ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا اسکا فیصلہ آپ طالبین مناصب

ریاست و سیاست پر چھوڑتے ہیں۔ مگر ہندوؤں کو یہ اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سید صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی بنیاد کے مستحکم ہونے کا باعث سمجھیں اور پھر سید صاحب کا ہندو ریاستوں کو مدد اور شرکتِ جنگ کی دعوت دینا اور اپنے توپ خانہ کا افسر راجہ رام راجپوت کو مقرر کرنا خود اس کی دلیل ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں بلکہ شریکِ حکومت بنانا چاہتے تھے۔

بے شک سید صاحب جگہ جگہ اعلاءِ کلمۃ اللہ اور دین رب العالمین کی خدمت کا ذکر کرتے اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے ہیں لیکن آپ یہ خوب سمجھتے تھے کہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہی نہیں ہے کہ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قائم کی جائے۔ اور خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے بلکہ اُس کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ برادرانِ وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے اسلامی فضائل اخلاق سے ان کے دلوں کو فتح کیا جائے۔ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی آپ کے ذہن میں نہیں تھی۔ کیونکہ آپ کے نزدیک یہ دونوں بے حقیقت چیزیں تھیں جو اپنے عمل میں سب سے زیادہ پُر جوش، فداکار، سرگرم اور مخلص و دیانت دار ہوگا۔ امامت اور لیڈر شپ اُسی کے ہاتھ میں رہے گی۔ خواہ اقلیت کے فرقہ سے تعلق رکھے یا اکثریت کے فرقہ سے۔ قرآن مجید کی آیت۔ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ (کتنی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں ہیں جو بڑی ٹکڑیوں پر غالب آجاتی ہیں) آپ کے لئے مشعلِ راہ تھی۔ اقلیت میں ہونے کا خوف وہراس اور وسوسہ و اندیشہ صرف اُسی شخص یا گروہ کو ہو سکتا ہے جو سست عمل، کمزور اور سُبک مایہ ہو اور جو اپنے بچاؤ کے لئے خارجی قلعہ بندیوں کا محتاج ہو۔

(البرہان ع ۲ جلد ۱۲ صفحہ ۱۰۸ تا ۱۰۹)

مذکورہ بالا اقتباس سے بہت سے امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(الف) یہ تحریک آزادی، علماء ہند کے ہاتھوں انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ سے شروع ہوئی اور اس کا سنگ بنیاد رکھنے والے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی اور اُن کے خاندان کے لوگ اور اُن کے شاگرد اور مریدین ہیں۔

(ب) اس تحریک میں فرقہ واریت اور مذہبی تنگدلی کا نام نہ تھا بلکہ تمام ہندوستان اور اُس کے باشندوں کو بدیشی مظالم سے جو کہ تمام ملک کو برباد کر رہے تھے نجات دلانا تھا۔

(ج) اس تحریک میں غیر مسلموں کو بھی شریک کیا گیا تھا۔ اور اُن کو بلایا گیا تھا۔

(د) سکھوں سے جنگ فرقہ واریت کی بناء پر نہیں تھی بلکہ اس بناء پر تھی کہ وہ انگریزوں کے حلیف اور مددگار تھے۔ انگریزوں نے اُن کو ہندوستان میں اپنی حکومت کی حفاظت کے لئے افغانستان کے راستہ میں آہنی دیوار اور سدِ سکندری بنایا تھا اس لئے اُن کا قلع قمع کرنا لازم تھا اس کے علاوہ وہ بے پناہ مظالم بھی محرک تھے جن کا وہ انتہائی بربریت کے ساتھ ارتکاب کر رہے تھے۔

(ہ) اس تحریک کا مقصد دنیاوی مفاد، ملک گیری، خود غرضی، عہدوں اور منصوبوں کا حاصل کرنا، کسی قوم کو غلام بنانا، اُن کی دولت اور ذرائع دولت کو ہتھیانا ہرگز نہ تھا بلکہ محض خدا کی ہندوستانی عام مخلوق کو یورپین سپید بھیڑیوں اور ان کے حلفاکی لوٹ مار، چیر پھاڑ، تذلیل و توہین وغیرہ بچانا تھا جو کہ اعلاء کلمۃ اللہ کا عظیم ترین مقصد ہے۔ عدل و انصاف، امن و اماں، انسانی ہمدردی، غربا پروری، کمزوروں کی امداد اسی مقصدِ اعلیٰ کے پھل پھول اور شاخیں ہیں۔

(و) یہ تحریک شخصی یا کسی فرقہ کی حکومت، فسطائیت کے لئے عمل میں نہیں لائی گئی تھی بلکہ حقیقی جمہوریت اس کا مطمح نظر تھا۔

الحاصل دارالحرب بن جانے کے فتویٰ مذکورہ کے بعد اُس کے فرائض کی انجام دہی میں غور و خوض شروع ہوا۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم اور اُن کے خاندانی حضرات اور تلامذہ اور مریدین با اخلاص میں گفت و شنید، بحث و تمحیص ہونی ضروری تھی۔ اُس کے بعد عام مسلمانوں کو ساتھ لینے اور اس فریضہ کی انجام دہی کے عمل میں لانے کی تدبیریں سوچی گئیں۔ اور ضروری سمجھا گیا کہ عام مسلمانوں کو فریضہ مذکورہ کی دعوت دی جائے مگر جب تک مدعوین کے کیرکٹر اور اخلاق و اعمال میں استقامت اور استقلال، خدا ترسی اور اخلاص وغیرہ جیسے اعلیٰ ترین اخلاق پیدا نہ ہوں تو مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اور اگر بغیر ان کے اقدام کیا گیا تو بجائے نفع ضرر کا سخت

اندیشہ [1] ہے۔ اس لئے ملک میں دورہ کرنا، ہر جگہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ و تفہیم سے لوگوں کے عقائد و اخلاق و اعمال کو درست کرنا اور ان عہد و میثاق لینا کہ وہ اللہ تعالےٰ اور رسول علیہ السلام کی سچی اور پکی تابعداری کریں گے۔ چوری، زنا، ناحق قتل کرنا، لوگوں پر بہتان باندھنا وغیرہ تمام بڑے بڑے گناہوں سے دور رہیں گے [2] ضروری سمجھا گیا۔ اور اس کام کے لئے حضرت سید احمد صاحب بریلوی مرید و خلیفہ خاص حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور اُن کے بھتیجے شاہ محمد اسماعیل صاحب اور داماد و بھتیجے مولانا عبدالحی صاحب مرحومین کو منتخب کیا گیا۔ اوّل الذکر کو سب کا سردار اور ہر دو بزرگوں کو جو کہ بحکم حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سید صاحب کے مرید بھی ہو گئے تھے ان کا دست و بازو بنا دیا گیا۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے احوال و مناقب بہت سی کتابوں میں مذکور ہیں اُن کی تفصیلات وہیں سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس تحریک کے سردار ہونے کی وجہ سے بہت سے انگریزوں کو بھی قلم اُٹھانا پڑا اور چونکہ انگریزوں کے خلاف اپنی قوم اور ملک کی بھلائی سید صاحب چاہتے تھے اس لئے انگریز حکام اور مورخین سید صاحب پر نہایت کڑی اور سخت نظر رکھتے ہیں اور حسبِ عادت نہایت قبیح الفاظ آپ کی نسبت اور آپ کی پارٹی کی نسبت استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صادق حسین صاحب ایم۔ بی بی ایس تمہید ترجمہ رسالہ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں لکھتے ہیں۔

"مغربی تاریخ نگاروں کا یہ ہمیشہ اصول رہا ہے کہ ملت کے یہ وفادار سرفروش اگر یورپ میں ہوں تو انہیں قومی اور مذہبی زندگی میں بلند ترین مقام پر جگہ دی جاتی ہے اور بدقسمتی سے اگر ان کا تعلق سرزمین ایشیا اور بالخصوص اسلام سے ہو اور وہ کسی مغربی سے برسرِ پیکار ہو تو اُس سے زیادہ

---

[1] کیونکہ تہذیب اخلاق اور مصالح جذبات کے بغیر جو جنگ و جدال ہو گا وہ جہاد نہ ہو گا بلکہ فساد اور ڈاکہ زنی ہو گی۔ خلقت کی آبادی اور امن و امان کی صورت نہ ہو گی بلکہ بربادی اور ظلم و ستم کا بازار گرم ہو گا۔

[2] یہی مفہوم مرید کرنے کا ہے انہیں باتوں کے عہد و پیمان لینے کو مرید کرنا کہا جاتا ہے۔

ذلیل، انسانیت کا خون کرنے والا اور امن پسند شہریوں کی جائداد و املاک لوٹنے والا اس دنیا میں کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ چاہیئے کہ اس کی لاش بھی قبر سے کھدوا کر جلادی جائے (جیسا کہ لارڈ کچنر نے مہدی سوڈانی مرحوم کے ساتھ کیا) مجاہدین کے لئے باغی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ دو متضاد قوانین میں سے ایک کی پُرجوش حمایت دوسرے سے بغاوت کے مترادف ہے"

بہر حال حضرت سید صاحب کی سیرتیں اور بلند احوال بہت سی کتابوں میں مندرج ہیں۔ اس لئے ہم اُن کی تفصیلی سیرت اس مقام پر پیش نہیں کر سکتے۔ فقط بقدرِ ضرورت اجمالاً کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سید صاحب کے مختصر حالات

حضرت سید صاحب مرحوم ۱۷۸۶ء میں بمقام تکیہ متصل رائے بریلی (صوبہ اودھ) سادات کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ہونہاری کے اعلیٰ آثار بچپن سے ہویدا تھے۔ ۱۸۰۶ء میں دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں تحصیل علوم اور سلوک کی غرض سے حاضر ہوئے۔ مقصد معلوم کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔

"آپ کے خاندان میں تو منصب ولایت موروثی ہے امید ہے کہ آپ بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح منزلِ مقصود پر فائز ہوں گے"

حضرت شاہ صاحب مرحوم نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم کے سپرد کر دیا انہوں نے روحانی تعلیمات اور تلقینات کے ساتھ قرآنِ پاک کا ترجمہ اور حدیث و تفسیر وغیرہ پڑھائی۔ ۱۸۰۸ء ہجری میں جب کہ آپ کی عمر بائیس سال کی تھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت ہوئے چونکہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی صحبت موثرہ اور تلقینات سے مادہ وصول الی اللہ پوری طرح تیار ہو گیا تھا چند ہی روز میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی حسن توجہ اور اپنی خداداد قابلیت کی بناء پر کمال پہنچ گئے شاہ صاحب نے خلعتِ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اُسی سال میں وطن مالوف واپس ہوئے۔ اور وطن میں شادی کر کے تقریباً دو برس قیام فرمایا۔ ۱۸۱۰ء میں ضروریاتِ معاشیہ کی بناء پر نواب امیر خاں والی ٹونک کی فوج میں ملازم ہو گئے

اس زمانہ میں فوجی کارناموں کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ شب بیداری کی حالت یہ تھی کہ نفلوں میں کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں ورم کر جاتے تھے ۱۸۱۶ء میں جبکہ نواب امیر خاں انگریزوں سے صلح کے نامہ و پیام کرنے لگے۔ تو سید صاحب فوجی نوکری چھوڑ کر پھر دہلی حضرت شاہ صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس آٹھ برس کی غیبوبت میں سید صاحب نے اس قدر روحانی ترقی کر لی تھی کہ ان کی روحانی نسبت اُن کے مرشدوں سے بھی بالاتر ہو گئی تھی مولانا محمد یعقوب صاحب (برادر شاہ محمد اسحاق صاحب نواسہ شاہ عبدالعزیز صاحب) فرمایا کرتے تھے۔

"شاہ عبدالعزیز صاحب کی توجہ کی تاثیر ہلکی بارش کی طرح ہوتی ہے اور حضرت سید صاحب کی مثال لوہے کی پھوکنی سے دینی چاہیئے جو کہ فوارہ کی طرح قلب پر پڑتی ہے"

(سوانح احمدی صفحہ ۱۲۱۔ از شاندار ماضی صفحہ ۱۷)

اسی بنا پر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے اعزا و احباب کو اپنے بجائے حضرت سید صاحب علیہ الرحمۃ کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت فرمائی چنانچہ حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید (باوجود سید صاحب سے تقریباً دس برس بڑے ہونے اور علوم ظاہرہ میں بہت زیادہ ماہر ہونے کے) نیز حضرت مولانا عبدالحی صاحب مولانا وجیہ الدین صاحب، مولانا محمد یوسف صاحب بنیرہ شاہ اہل اللہ صاحب وغیرہ حضرت سید صاحب سے بیعت[1] ہو گئے۔　　(شاندار ماضی صفحہ ۱۶)

---

[1] حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب حضرت سید صاحب اپنے دورۂ تبلیغ میں حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب شہید ولایتی (دادا پیر حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمہما اللہ تعالےٰ) سے ملاقی ہوئے تو منجملہ اور لوگوں کے حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب نے بھی بیعت حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر کی (حالانکہ وہ خود صاحب ارشاد کامل تھے۔ ہزاروں آدمی ان کے مرید تھے) اور فرمایا کہ واقعہ میں کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی مجھ کو حاجت نہیں ہے مگر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اسی میں دیکھتا ہوں (نظر کشفی سے) اس لئے بیعت ہوتا ہوں پھر دونوں حضرات حجرہ میں اکتساب فیوض روحانیہ کے لئے چلے گئے۔ جب نکلے ہیں تو حضرت سید صاحب پر نسبت چشتیہ اور گریہ و بکا کا غلبہ تھا اور حضرت حاجی صاحب پر نسبت نقشبندیہ سکینت اور ضحک کا غلبہ تھا۔

حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب دہلی میں حسنِ تقریر و تحریر، اعلےٰ علمی قابلیت اعلےٰ ذکاوت وغیرہ میں پہلے سے بہت زیادہ مشہور و معروف تھے ان حضرات کا اور شاہ صاحب کے تمام خاندان کا سید صاحب سے بیعت ہو جانا اور حلقہ ارادت میں داخل ہونا معمولی بات نہ تھی نہ باطنی حیثیت سے اور نہ ظاہری حیثیت سے اگر روحانی طاقت اور نسبت باطنیہ کی قوت معمولی ہوتی تو یہ علماء کرام جو کہ نہ صرف دہلی کے چوٹی کے علماء تھے بلکہ تمام ہندوستان کے ممتاز اور سربرآوردہ علماء تھے اور اسی طرح اصحابِ باطن میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر صاحب دونوں اُس زمانہ میں انتہائی درجہ کے اشخاص میں سے شمار کئے جاتے تھے اُن کا اپنے مریدوں اور اولاد کو سید صاحب کے سپرد کر دینا بخوبی دلالت کرتا ہے کہ سید صاحب باطنی کمالات اور روحانی نسبت میں غیر معمولی طاقت کے مالک ہیں[1] اس کا اثر یہ بہت جلد ظاہر ہوا کہ سید صاحب کے کمالات کا تمام شہر اور اطراف و جوانب میں چرچا زوروں پر ہو گیا۔ اور لوگ جوق در جوق فیض یاب ہونے کے لئے آنے لگے دعوتی خطوط کی بھرمار ہو گئی۔ مقصدِ اصلی کے لئے فضا مناسب ہو گئی۔ ہر دو ممتاز علماء مولانا اسماعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب رحمہما اللہ تعالےٰ کو لے کر حضرت سید صاحب ۱۸۲۰ء میں مشرقی اور جنوبی صوبجات کے دورہ

---

[1] سید صاحب کا انتہائی دشمن انگریز ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۶۷ میں لکھتا ہے۔ "گو سید احمد ایک لٹیرا اور جعل ساز تھا اور اُن کے حواریوں نے بھی بعد میں یہی پیشہ اختیار کیا لیکن میں اس بات کا یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سید احمد صاحب کی زندگی کا ایک درمیانی حصہ ایسا بھی تھا جس میں دل و دماغ اپنے برادرانِ وطن کی نجات کے لئے ہر وقت بے قرار رہتا تھا اور اُن کا دھیان ہر وقت خدا کی طرف لگا رہتا تھا۔ وہ بہت ہی بے قرار جوشیلے اور اعصابی مزاج کے انسان تھے۔ اگرچہ اُن کا ظاہری اطمینان ان کی قلبی کیفیت کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ جس کو ہم مغربی سائنس کی اصطلاح میں مرگی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور ایشیائی عقیدہ کے مطابق بڑی ہی متبرک حالت ہے کیونکہ اس کا مطلب براہ راست خدا تعالےٰ سے تعلق کا پیدا ہو جانا ہے ان وجدانی کیفیات میں پیغمبران سلف ان کی بصیرت پر عیاں ہو جاتے تھے اور کشفی طور پر وہ ہندوستان کے دو گذشتہ مذہبی اماموں سے متواتر راہ و رسم رکھتے تھے" صفحہ ۷۶۔

پروانہ ہو گئے۔ اس وقت سید صاحب کے ساتھ منجملہ دیگر قوتوں کے تین قوتیں اعلیٰ درجہ کی تھیں (اوّل) بے مثل روحانی قوت نسبت (دوم) بے مثل علم وذکاوت اور قوت تقریر وتحریر حضرت شاہ اسماعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب کے آتشیں اور ساحرانہ پُر درد وپُر تاثیر مواعظ وبیانات (سوم) ان تینوں حضرات اور اُن کے رفقاء کی بے مثل مخلصانہ استقامت اور اتباع سنت پھر ایسی صورت میں اگر خارج از عقل وعادت لوگوں پر اثر نہ پڑے توکیا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بکثرت ہر ہر جگہ باطل سوز انقلاب پیدا کرنے والے مواعظ اور بیانات ہوئے۔ مناظروں اور مباحثوں کی نوبتیں آئیں جن میں شاہ محمد اسماعیل صاحب کی ذکاوت، حافظہ، حسنِ بیان، حاضر جوابی سے ہر مقابل کو کھلی کھلی شکست اٹھانی پڑی۔ بہت سے مقامات پر کرامتوں کے نہایت واضح اور کھلے ہوئے واقعات رونما ہوئے نتیجہ ظاہر تھا کہ مخلوقِ خدا فوجاً فوجاً کھنچ کھنچ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی، مرید ہوتی توبہ کرتی اور آئندہ کے لئے عہد وپیمان کرتی کہ اتباع شریعت اور اتباع سنت پر ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور بدعات اور ناجائز رسوم کو ہمیشہ کے لئے چھوڑے گی چنانچہ عام اور خاص میں کھلا ہوا انقلاب عظیم نظر آتا تھا۔ گویا کہ کایا پلٹ ہوگئی۔ ہم تفصیلات اگر لکھیں تو دفتر تیار ہو جائیں اس لئے ان کو اُن سوانح نگاروں کی تصانیف پر حوالہ کرتے ہوئے ایک دشمن اسلام وایشیا یعنی ایک چالاک انگریز کے قول کو پیش کرتے ہیں جو کہ حقیقت سے مجبور ہوکر اقرار کرتا ہے۔ الفضل ما شهدت به الاعداء۔

سید صاحب اور اُن کی جماعت اور تحریک کا دشمن انگریز ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر درہمارے ہندوستانی مسلمان، صفحہ ۲۲ پر لکھتا ہے۔

"سید احمد نے نہایت دانشمندی سے اپنے آپ کو زمانہ کے مطابق بدل دیا۔ چنانچہ انہوں نے قزاقی کا پیشہ ترک کر کے ۱۸۱۶ء میں احکام شرعیہ پڑھنے کے لئے دہلی جاکر ایک جید عالم کی شاگردی قبول کی (مغربی اقوام کا یہ خاصہ ہے کہ ہر محبِ وطن اور آزادی خواہ کو پہلے لٹیرے ہی کے لقب سے یاد کرتی ہیں۔ مترجم) اور پھر تین سال کی اس طالب علمانہ حیثیت کے بعد ایک مبلغ کی زندگی اختیار کی انہوں نے پُر زور طریقہ پر اُن بدعات کے خلاف جہاد شروع کیا جو مسلمانانِ ہند کے اسلامی عقائد

میں داخل ہو چکی تھیں اور اس طرح پرجوش اور حوصلہ مند لوگوں کو اپنا مرید بنا لیا اُن کی تبلیغ کا پہلا مرکز روہیلوں کی قوم تھی جن کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کے لئے ہم نے محض دولت کی لالچ میں اپنی فوجیں عاریتاً دوسروں کو دے دی تھیں اور جس کی افسوسناک تاریخ وارن ہسٹنگز کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا بدنما داغ ہے۔ ان کی اولاد گذشتہ نصف صدی سے متواتر اس کا انتقام لیتی چلی آ رہی ہے اور اس وقت بھی سرحد کے باغی کیمپ کو اس کے بہترین شمشیر زن مہیّا کر رہی ہے۔ روہیلوں کے معاملہ میں بھی اور ہندوستان میں جہاں کہیں بھی ہم نے مظالم کئے ہیں ہم نے جیسا بویا تھا ویسا ہی کاٹا ہے۔"

۱۸۲۰ء میں اس مجاہد نے آہستہ آہستہ اپنا سفر جنوب کی طرف شروع کیا۔ اُن کے مُرید اُن کی روحانی فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے اُن کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام کو بخوبی سر انجام دیتے تھے اور صاحب جاہ اور علماء عام خدمتگاروں کی طرح اُن کی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا اپنے لئے فخر سمجھتے لگے۔ پٹنہ میں طویل قیام کے بعد اُن کے مُریدوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک باقاعدہ نظام حکومت کی ضرورت پیش آ گئی۔ انہوں نے باقاعدہ اپنے ایجنٹ مقرر کئے تاکہ ہر اُس شہر سے جو اُن کے راستے پر پڑتا ہو تجارتی منافع پر ٹیکس وصول کریں۔ اس کے بعد انہوں نے چار خلیفے مقرر کئے یعنی روحانی نائب اور ایک قاضی القضاۃ مقرر کیا اور اُس کے لئے باقاعدہ فرمان جاری کیا جیسا کہ مسلمان بادشاہ صوبجات میں اپنے گورنر مقرر کرتے وقت جاری کیا کرتے تھے اس طرح پٹنہ میں ایک مستقل مرکز قائم کرنے کے بعد اُنہوں نے دریائے گنگا کے ساتھ ساتھ کلکتہ کی طرف کوچ کیا راستہ میں لوگوں کو سلسلہ مریدی میں داخل کرتے جاتے اور بڑے بڑے شہروں میں اپنے نائب مقرر کرتے جاتے تھے۔ کلکتہ میں اُن کے اردگرد اس قدر ہجوم ہو گیا تھا کہ لوگوں کو مرید کرتے وقت اپنے ہاتھ پر بیعت کرانا اُن کے لئے مشکل تھا۔ بالآخر انہیں اپنی پگڑی کھول کر یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہر وہ شخص جو اس کے کسی حصّہ کو چھو دے گا اُن کا مُرید ہو جائے گا۔" (رسالہ ہمارے ہندوستانی مسلمان صد ۲۲)

اس سفر سے لاکھوں بندگانِ خدا کی اصلاح ہوئی اُن کے اخلاق اور اعمال اور عقائد درست ہوئے۔ جہاد کی تلقین اور دعوت کے لئے زمین تیار ہوگئی۔ پنجاب سے برابر خبریں مظالم کی آرہی تھیں۔ انگریز بھی مطمئن ہوکر اپنے مظالم کی کڑیاں اس زنجیر میں جس میں ہندوستانیوں کو باندھ رکھا تھا بڑھاتا جارہا تھا۔ مگر چونکہ ہندوستان کے اہلِ ثروت فریضۂ حج ادا کرنا چھوڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ خشکی کے راستہ سے مکہ معظمہ جانا بہت ہی طویل مدت اور بہت زیادہ مشقت اور بہت زیادہ مصارف کا متقاضی اور طالب تھا۔ مختلف ممالک، افغانستان، ایران، عراق، نجد وغیرہ درمیان میں حائل تھے بسا اوقات اُن میں خانہ جنگی کی بناء پر راستہ ملنا مشکل ہوتا تھا اور بحری راستہ سمندر کے تلاطم اور طوفان کی وجہ سے لوگوں کی ہمتوں کو پست کئے ہوئے تھا۔ سید صاحب نے ضروری سمجھا کہ فریضۂ حج کی ادائیگی میں جو خوف اور کم ہمتی لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے اس کو نکالا جائے اور اس کی ہمت پیدا کی جائے۔ چنانچہ ۱۸۲۲ء؁ میں ایک بڑے قافلہ کے ساتھ آپ نے کلکتہ کے بندرگاہ سے عرب کا سفر کیا۔

شوال ۱۲۳۶ھ؁ میں سفرِ حج کے لئے وطن مالوف سے روانگی ہوئی۔ راستہ میں مختلف مقامات پر جو گنگا کے کنارے پڑتے تھے ٹھہرتے اور تبلیغی خدمات انجام دیتے ہوئے کئی مہینے کے بعد کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ میں بھی تقریباً تین مہینہ قیام کرنا پڑا[1]۔ قافلہ حجاج کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی تھی کہ گیارہ جہاز کرایہ کیلئے گئے اور گیارہ ہزار روپے پیشگی بطور نول دیئے گئے۔ وطن سے روانہ ہوکر گیارہ مہینہ بعد ۲۸ شعبان ۱۲۳۷ھ کو یہ قافلہ بخیر و عافیت مکہ معظمہ پہنچا۔ حج کرنے کے بعد ۱۲۳۸ھ مدینہ منورہ کو روانگی ہوئی اور وہاں تین ماہ سے کچھ زائد قیام کرنے کے بعد ۲۹ ربیع الاوّل میں مکہ معظمہ کو واپس ہوکر اخیر شوال ۱۲۳۸ھ تک مکہ معظمہ میں قیام کرکے یکم ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ کو مکہ معظمہ سے واپس ہوئے۔ حجاز میں کُل قیام چودہ مہینہ رہا۔

---

[1] قیامِ کلکتہ کے زمانہ میں دُور دُور سے مشتاقانِ زیارت آکر روزانہ بیعت کرتے تھے اگرچہ رفقاءِ سفر کی تعداد زیادہ سے زیادہ آٹھ سو تھی مگر زائرین کی تعداد ہزار سے بالا ہوجاتی تھی۔ اوسطاً دو ہزار آدمی دو وقتہ آپ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

سیّد صاحب اور اُن کے رفقاء کیلئے وہابی کا لفظ انگریزی پروپیگنڈہ ہے

مندرجہ بالا واقعات سے بخوبی واضح ہوگیا کہ حضرت سیّد صاحب اور اُن کے قافلہ والے مکّہ معظمہ میں ۱۲۳۷ھ کے آخر میں پہنچے۔ یعنی ابتداء ۱۸۲۳ء میں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ وہابی حکومت اور اُن کے اجتماعات کا نام و نشان نہ حجاز میں باقی رہا تھا اور نہ نجد کے کسی شہر اور قصبہ میں۔ بلکہ اس سے پانچ برس پہلے نہ صرف مدینہ منورہ اور مکّہ معظمہ سے بلکہ تمام حجاز اور نجد کے مشہور مقامات سے ان کا قلع قمع مصری فوجوں نے زیر کمان ابراہیم پاشا بن محمّد علی پاشا خدیو مصر بحکم سلطان عبدالمجید خاں کر دیا تھا اور اُن کے باقیماندہ لوگ پہاڑوں اور جنگلوں میں دور دور بھاگ کر روپوش ہو گئے تھے۔ چنانچہ شامی حاشیہ درمختار جلد ثالث میں واضح طور سے اس کو ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۲۳۳ھ میں مصری فوجوں نے اس جماعت کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صفحہ ۸۷ میں وہابیوں کے مکّہ معظّمہ اور مدینہ منورہ اور دیگر مقامات پر قابض ہو جانے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے۔

> "آخر کار محمّد علی پاشا والی مصر مصلحین (محمّد بن عبدالوہاب اور اُس کی جماعت) کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۱۸۱۲ء میں ٹھومس کٹیھہ نے جو کہ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا پاشا کے لڑکے کے ماتحت مدینہ شریف پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا ۱۸۱۳ء میں مکّہ معظمہ پر بھی قبضہ ہوگیا اور اس کے پانچ سال بعد یہ عظیم الشان سلطنت جس معجزانہ طور پر منصۂ شہود پر آئی تھی اسی معجزانہ طور پر ریت کے صحرائی ٹیلوں کی طرح غائب ہوگئی۔"

محمّد بن عبدالوہاب کی اس جماعت نے چونکہ اہل مدینہ اور اہل مکّہ و حجاز کے عام باشندوں کو اس مدت اقامت حجاز میں بہت زیادہ ستایا تھا۔ لوگوں کو قتل کرنا، مار پیٹ، لوٹنا، ذلیل کرنا وغیرہ وغیرہ عمل میں لاتے رہتے تھے جیسا کہ وہاں پر مشہور و معروف ہے اور صاحب ردالمحتار لکھتا ہے کہ یہ لوگ صرف اپنی جماعت کو مسلمان سمجھتے تھے اور دوسری جماعتوں کو مشرک اور غیر مسلم کہتے تھے اور اُن کے اموال اور جانوں کو لوٹنا اور ضائع کرنا حلال جانتے

تھے اس لئے اہلِ حرمین کو وہابیوں سے انتہائی عداوت اور نفرت تھی۔ اسلئے اہل حجاز سے (مکہ معظمہ و مدینہ منورہ) کسی طرح اس کے روادار نہ تھے کہ کوئی نجدی جس کا تعلق اس فرقہ سے کچھ بھی ہو یہاں حجاز میں رہ جائے۔ ترکی حکومت اور اس کے عمال تو اتنی بڑی بغاوت اور اس کے فرو کرنے میں جو کچھ مالی اور جانی نقصان ہوا اُٹھانے کے بعد کب گوارا کر سکتے تھے کہ کوئی وہابی وہاں باقی رہے۔ الغرض جس وقت حضرت سیّد صاحب اور اُن کے قافلہ والے مکہ معظمہ شعبان ۱۲۳۷ھ میں پہنچے ہیں کوئی وہابی حاکم یا عالم یا مبلغ وہاں نہ تھا اور نہ اطراف و جوانب میں تھا۔ محمد بن عبدالوہاب کی وفات بہت پہلے ہو چکی تھی اس لئے اُن کو کوئی موقعہ وہابیوں کے مسلک کو اُن سے لینے کا ہاتھ ہی نہیں آسکتا تھا اور نہ کسی وہابی سے اُن کی ملاقات کسی معتبر ذریعہ سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے پھر ان حضرات کو اس جماعت کی طرف منسوب کرنا بالکل افترا اور جھوٹا پروپیگنڈا ہے۔ یہ حضرات شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور علم ظاہر و باطن میں اُن کے تابعدار اور ایسے خوشہ چیں اہل کمال تھے کہ نہ ہندوستان میں اور نہ عرب و مصر و شام وغیرہ میں اُسوقت انکا نظیر اور مثیل تبحر تفقہ، تصوف، تقریر و تحریر میں کوئی پایا جاتا تھا۔ اُن کی تصانیف اور تقریریں اور اعمال نامے اس کے گواہ ہیں۔ تو ایسے اہل کمال کسی دوسرے کے تابعدار اور مُقلد بنیں یہ کیسے عقل سلیم میں آسکتا ہے خصوصاً جبکہ وہ دُوسرا اُن سے ہر کمال میں کمتر ہو۔ وہابیوں کے عقیدہ اور عمل میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی غرض سے سفر کرنا حرام ہے۔ چنانچہ ان کے رسائل اور تحریریں موجود ہیں۔ اگر معاذ اللہ ان حضرات کا یہ عقیدہ ہوتا تو مکہ معظمہ سے تمام قافلہ سفر کرکے مدینہ منورہ کیوں پہنچتا اور اواخر ذی الحجہ سے ربیع الاوّل تک تین مہینہ وہاں کیوں قیام پذیر رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سیّد صاحب کے ان دونوں سفروں میں (یعنی پہلے تبلیغی دورہ اور دُوسرے حج کے سفر میں) لوگوں کا سیّد صاحب کی طرف جوق در جوق رجوع کرنا اور انتہائی درجہ میں گرویدہ ہو کر مُرید ہونا اس صورت حال نے انگریزوں کو گھبراہٹ میں ڈالدیا اور پھر دوسرے سفر میں تبلیغ آزادی اور تشویش جہاد کے اثر سے چاروں طرف سے پے در پے مجاہدین کے قافلوں کا سرحد پہنچنا معمولی چیز نہ تھا اس نے انگریزوں کی دماغ کو بوکھلا دیا اور اس فکر میں ڈال دیا کہ اگر مسلمانوں کی گرویدگی اس شخص اور اس کی جماعت کی طرف اسی طرح رہی تو ہمارا ہندوستان

اس فکر میں ڈال دیا کہ اگر مسلمانوں کی گرویدگی اس شخص اور اس کی جماعت کی طرف اسی طرح رہی تو ہمارا ہندوستان میں باقی رہنا مشکل ہوگا اس لئے یہ جھوٹا پروپیگنڈہ بدنام کرنے اور لوگوں کو بدظن اور بدعقیدہ بنانے کے لئے جاری کیا گیا۔ انگریزوں کا اصول ہے "کتے کو بھی مارو تو بدنام کرکے مارو" اس کے لئے کتابیں اور رسالے لکھوائے گئے اخباروں میں آرٹیکل شائع کئے گئے۔ سی۔ آئی۔ ڈی بکثرت ہر طرف مقرر کی گئی جو کہ ہر اُس مقام پر کوشش کرتے تھے جہاں سید صاحب کے مخلصین کا کوئی اثر محسوس ہوتا تھا جب تک انہوں نے جہاد نہیں کیا تھا یا جب تک وہ سکھوں سے برسرِ پیکار رہے تھے کسی اخبار یا رسالے میں یہ الفاظ اُن کی یا اُن کی جماعت کے متعلق نہیں آئے تھے ؂

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں ؎ تمہارے حسن فسوں ساز نے کیا کیا نہ کیا

اس غلط پروپیگنڈے کی قلعی مرزا حیرت نے حیوٰۃ طیبّہ میں خوب کھولی ہے جس کو مولانا محمد میاں صاحب نے شاندار ماضی کی جلد ۲ ص۱۹۸ میں صاف طور سے بیان فرمایا ہے۔

سفرِ حج سے واپسی:۔ حضرت سیّد صاحب جدّہ سے ابتداء ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ میں روانہ ہوکر مخا میں پندرہ روز ٹھہرتے ہوئے بمبئی پہنچے ڈاکٹر ہنٹر کہتا ہے "حاجی کے مقدس لباس میں اگلے سال ماہ اکتوبر میں بمبئی وارد ہوئے یہاں پر بھی آپ کی تبلیغی کوششوں کو وہی کامیابی حاصل ہوئی جو کلکتہ میں ہوئی تھی" اور پھر بمبئی میں قیام کرکے جہاز ہی کے ذریعے کلکتہ پہنچے اور وہاں دو ماہ قیام کرنے کے بعد وطن مالوف کو روانہ ہوگئے اور ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو ایک سال نو ۹ ماہ کے بعد وطن عزیز میں داخل ہوگئے۔

حضرت سیّد صاحب کے طرز میں تغیر | ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتویٰ (ہندوستان دارالحرب ہوگیا ہے) کی وجہ سے عام مسلمانوں اور بالخصوص علماء کے دماغوں میں ہلچل پیدا ہوگئی تھی اور اس کے لئے بحث و تجیص کے بعد پروگرام بنایا گیا تھا جس کی تفصیل اُن کارناموں سے ظاہر ہوتی ہے جو کہ بعد میں ظاہر ہوئے۔ ۱۸۲۰ء تک شہر دہلی میں بکثرت وعظ اور تقریریں نہایت زوردار اور موثر الفاظ میں حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب اور اُن کے رفقاء وغیرہ کی ہوتی رہیں جن میں ہر قسم کے اصلاحی اور تنظیمی

شرعی مواد پر بحث ہوتی تھی۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین کی ایک جماعت تو اس طرف دن رات مشغول رہنے لگی اور دوسری جماعت حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا صدرالدین صاحب، مولانا رشید الدین صاحب وغیرہ جن میں مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی بھی ہیں۔ یہ حضرات ان ہنگامہ خیز امور میں باوجود ہر قسم کے کمالات علمی اور عملی کے حصہ نہیں لیتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے اس جماعت کو اسی لئے ٹھوس کاموں (تعلیم و تدریس وغیرہ میں لگا دیا تھا کہ وہ مجاہدین کے لئے پشت پناہ بن کر اُن کی ضروریات اس طرح پوری کرتے رہیں گے کہ انگریزوں کی نظر میں نہ کھٹکیں۔ چنانچہ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب مرحوم اور اُن کے بھائی شاہ یعقوب صاحب دہلی ہی میں بیٹھے ہوئے تمام ضروریات کو انجام دیتے رہے سنہ ۱۸۲۰ء میں جبکہ دہلی کی زمین تیار ہو گئی تو یہی جماعت تبلیغی خدمات کے لئے کرنال سہارن پور، دیوبند، رام پور، روہیلکھنڈ لکھنؤ وغیرہ کے دورے کرنے کے لئے نکلی اور جہاں بھی پہنچی عظیم الشان کامیابی، قبولیت اور تاثیر ظاہر ہوئی۔ پھر سنہ ۱۸۲۲ء میں حج کے لئے تبلیغ کرتے ہوئے نکلی اس میں بھی مثل سابق سید صاحب کسی مقام پر جانا نہیں ہوتا تھا بلکہ درمیانی آبادیوں میں ٹھہرنا، لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا اصلاح سے متعلق ہر قسم کی کارروائی کرنا معمول تھا، انتہائی کامیابی اور جذب کے ساتھ سنہ ۱۸۲۳ء میں حجاز سے واپسی ہوئی۔ لوگوں کا ہجوم حضرت سید صاحب کی طرف بمبئی میں کلکتہ سے کم نہ تھا۔ وہی تبلیغی اور اصلاحی کوششیں جاری کی گئیں۔ روزانہ مرید ہونے والوں کی تعداد یہاں بھی ہزاروں کی تھی۔ مگر اس وقت حضرت سید صاحب کھُل کر میدان میں آ گئے تھے۔ یعنی صریح اور صاف الفاظ میں لوگوں کو جہاد کی طرف بلاتے اور فرضیت جہاد کی وجوہ و دلائل بیان فرماتے تھے اور نہ صرف سکھوں سے جہاد کرنے کی فرضیت کی تلقین ہوتی تھی بلکہ انگریزوں سے جہاد کرنا ضروری اور اصل الاصول قرار دیتے تھے اور رقت انگیز اضطراب کے ساتھ لوگوں میں اس کی تڑپ اور آگ پیدا کرتے تھے۔ سوانح نگاروں اور سیرت کے لکھنے والوں نے اس بات کو قصداً چھپایا ہے ورنہ اُن کی کتاب بھی ضبط ہو جاتی اور وہ بھی گرفتار ہو جاتے۔ ڈاکٹر ہنٹر ص ۹ میں لکھتا ہے۔

"(حج سے واپسی کا ذکر کرتے ہوئے) پہلے جو چیز اُن کی نظر میں خواب و خیال تھی

اب وہ اُن کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی۔ جس میں اُنہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑنے اور صلیب کو انگریزوں کافروں کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا۔ پہلے جو کچھ اُن کی تعلیم میں ابہام تھا اب اُس نے اس خوفناک اور باقاعدہ مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ جس سے عبدالوہاب نے عرب میں ایک، عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اور جس سے سیّد احمد صاحب کو اُمید تھی کہ وہ ہندوستان میں اس سے بھی زیادہ عظیم الشان اور پائیدار سلطنت قائم کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ امام صاحب کی اندرونی کیفیات میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن کا علم ان کو یا صرف خدا کو ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آن کی ظاہری عادات بالکل بدل گئیں۔ اب اُن کی زندگی کا مقصد صرف مُرید بنانا ہی نہ تھا بلکہ اس مقصد اصلی کو پُورا کرنے کے لئے یہ محض ایک ابتدائی ذریعہ تھا۔ بمبئی میں جہاں وہ سب سے پہلے جہاز سے اُترے اُن لوگوں کی کثرت بھی جو اُن کا وعظ سُننے آتے یا مُرید ہونا چاہتے تھے اُن کو زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے لئے مجبور نہ کر سکی۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے اس سے زیادہ کامیابی حاصل کی جتنی کہ مکہ معظمہ کے سفر سے پہلے کی تھی۔ بایں ہمہ وہ ان پُرامن اضلاع میں اپنی واعظانہ سرگرمیوں کو حقارت آمیز بے صبری سے دیکھتے۔ معلوم ہوتا ہے اب اُن کی نگاہ ہر وقت سرحد کی دُور دراز جنگجو آبادی پر لگی رہتی تھی۔ اُن کی آئندہ زندگی کو ہم اپنے پہلے باب میں اچھی طرح بیان کر چکے ہیں۔"

یہاں یہ شبہ ضرور ہوتا ہے کہ اس طرح علانیہ جہاد کی تبلیغ اور تیاری اور اس کے لئے اجتماع پر گورنمنٹ کی طرف سے رکاوٹ کیوں نہ ہوئی اس کا جواب ڈاکٹر ہنٹر کے مندرجہ ذیل الفاظ دیتے ہیں۔ وہ صفحہ ۱۷ پر لکھتا ہے:-

"سنہ ۲۲-۱۸۲۱ء تک سیّد احمد صاحب کی تبلیغ کی طرف انگریز حکام نے کوئی توجہ نہیں کی۔ اُنہوں نے اپنے جاں نثار مُریدوں کی ہمراہی میں ہمارے صوبجات کا دورہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو مُرید بنایا اور ایک باقاعدہ گدی۔ مذہبی ٹیکس اور ملکی حکومت قائم کر دی۔ اس اثناء میں ہمارے افسران اپنے اردگرد کی بہت بڑی مذہبی تحریک سے بے خبر ہو کر صرف مالیہ جمع کرنے انصاف کے لئے عدالتیں قائم کرنے اور فوجوں کو پریڈ کرانے

ہی میں مصروف رہے۔ ۱۸۳۱ء میں اپنی اس بے خبری سے بہت بُری طرح جھنجھوڑے گئے۔"

شاندار ماضی جلد ۳ ص۹۵ میں ہے۔

"براہ دُوراندیشی شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الہ آباد کی معرفت گورنر اضلاع شمالی و مغربی کو اس تیاری جہاد کی اطلاع دے دی گئی تھی جس کے جواب میں گورنر نے کہا تھا جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو، ہم ایسی تیاری سے مانع نہیں"۔ ممکن ہے کہ مذکورہ بالا امور کے علاوہ دوسری سیاسی مصلحتیں بھی ہوں مگر بہر حال انگریزوں نے اس وقت سید صاحب کے اس علانیہ جہاد اور اس کی تیاری پر کوئی رکاوٹ نہیں کی البتہ ۱۸۳۱ء کے بعد سب کچھ کیا گیا۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اواخر شعبان ۱۲۲۹ھ میں وطن مالوف پہنچ گئے تھے۔ تین مہینہ آرام فرما کر ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ میں جہاد کے لئے اپنے سفر کا اعلان فرما دیا دولت خانہ چھاؤنی بن گیا۔ چاروں طرف سے مجاہدین اور سامان جہاد وغیرہ آنے لگے۔ اور ہر قسم کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس سفر اور جہاد کے واقعات وغیرہ کی تفصیلات حضرت سید صاحب کی سوانح اور سیرتوں اور شاندار ماضی جلد ثالث میں مکمل موجود ہیں"۔

خلاصہ یہ کہ ابتدا ابتداء میں حضرت سید صاحب کو بہت عمدہ کامیابیاں حاصل ہوئیں مگر بعد میں اپنوں کی غداریوں۔ انگریزوں اور سکھوں کی مسلسل سازشوں وغیرہ سے کامیابیاں سست پڑ گئیں (اگرچہ مخلصین کا جوش و خروش بڑھتا ہی رہا) بالآخر ۱۸۳۱ء میں بمقام بالاکوٹ جنگ و جہاد کرتے ہوئے ایک سرحدی مسلمان کی سازش سے مع مولانا محمد اسماعیل صاحب و دیگر رفقاء شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب ہم مذکورہ بالا بیان اور اس کے مآخذ کا حوالہ دیتے ہوئے مختصر طور پہ چند باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

(۱) یہ تحریک محض آزادی وطن کے لئے علماء اور فقراء اور غربا مسلمانوں نے محض بے سروسامانی کے ساتھ شروع کی تھی جس سے عام لوگوں میں اس قدر جوش اور جذبۂ سرفروشی پیدا ہو

گیا تھا کہ باوجود ہر قسم کی مشکلات اور ناکامیوں کے اخیر زمانہ تک نہیں مٹا۔ فریضۂ جہاد کی انجام دہی کا یہ جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پایا جاتا تھا۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ۔ شہری ہو یا دیہاتی۔ عوام ہوں یا خواص مختصر یہ کہ ہر فرد ملّت اس نشہ میں سرشار تھا اور اپنی اپنی بساط کے مطابق سرگرم عمل، سب ایک ہی دُھن میں لگے ہوئے تھے اور حوادث روزگار اور انگریزی مظالم کے آہنی پنجہ سے بے پرواہ ہو کر جس راہ پر گامزن ہوئے اس سے سرمو انحراف نہ کیا۔

صفحہ ۹۰ پر ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے :۔

"اب ہمیں اُس مجموعہ قوانین کا حال مختصر بیان کرنا ہے جو اُن کے پیرؤوں نے اُن کی تعلیم سے اخذ کیا اور جس کی وجہ سے اُنہوں نے ہندوستان میں ایک ایسا مذہبی انقلاب برپا کر دیا جس کی مثال اس کی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہی انقلاب ہے جس نے پچاس سال سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روح کو دبنے نہیں دیا۔"

صفحہ ۱۰۱ پر ڈاکٹر مذکور لکھتا ہے :۔

"۱۸۲۱ء میں امام صاحب (حضرت سیّد صاحب مرحوم) نے اپنے خلفاء کو منتخب کرتے وقت ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا جو بے پناہ جوش و خروش کے مالک اور بہت ہی مستقل مزاج تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح متعدد بار جب یہ تحریک تباہ ہونے کے قریب تھی انہوں نے بار بار جہاد کے جھنڈے کو تباہی سے بچا کر از سر نو بلند کر دیا۔ پٹنہ کے خلفاء جو ان تھک وعظ خود اپنے آپ سے بے پرواہ بے داغ زندگی بسر کرنے والے انگریز کافروں کی حکومت تباہ کرنے میں نہایت چالاک تھے۔ وہ اپنی جماعت کے ارکین کا نمونہ اور اُن کے لئے ایک مثال تھے۔ اُن کی بہت سی تعلیم بے عیب تھی اور یہ انہیں کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو بہترین زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالےٰ کے متعلق بہترین تصوّر پیدا کرنے کی ترغیب دی۔ مگر صرف اخلاقی نظام ہی ایک بہت بڑی جماعت کو آپس میں اکٹھا نہیں رکھ سکتا۔ اس نئی زندگی کے مذہبی پہلو

نے بہت جلد اپنی طاقت کو کھونا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس تحریک کے ابتدائی لیڈروں کے ماتحت بھی اس میں کمزوری کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور خلفاء کو ہمیشہ اپنے سامعین کے دلوں میں کافروں کے خلاف نفرت کو بار بار مشتعل کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ پٹنہ کے پروپیگنڈا اسٹرنے اس کو صاف طور پر بھانپ لیا تھا اور وقت کی نئی ضروریات کے ساتھ اپنی تعلیم میں مطابقت پیدا کرتے رہے۔ انہوں نے بیدار شدہ ضمیر کی قوت کی دہشت انگریزوں پر اعتماد کرنے کے بجائے اس سخت اور دائمی نفرت وحقارت کو اُبھارے رکھا جو ہندوستانی مسلمان کو انگریزوں سے ہے اس طرح انہوں نے اپنی تعلیم کی بنیاد مسلمانوں کے قلوب کی اعلیٰ ترین قابلیتوں کے بجائے عوام کے تعصبی جوش وخروش پر رکھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کو یہ ضرورت محسوس ہوتی گئی کہ اپنی تعلیم میں باغیانہ حصّہ کو مضبوط تر کرتے رہیں۔" (ص ۳۲)

ڈاکٹر مذکور صفحہ ۴۰ پر لکھتا ہے:۔

"ہر ایک ضلع کے مبلغین متعصب لوگوں کے گروہ دارالاشاعت میں بھیجتے اُن میں سے اکثر کو جن کے جوش کو پٹنہ کے لیڈر اور بھی بھڑکا دیتے تھے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں سرحدی کیمپ کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ اُن میں سے زیادہ ہوشیار نوجوانوں کو زیادہ دیر تک زیر تربیت رکھنے کے لئے منتخب کر لیا جاتا تھا اور جب وہ باغیانہ اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے تھے تو اُن کو اُن کے صوبہ کی طرف روانہ کر دیا جاتا میں اس بات کے لئے بے قرار ہوں کہ پٹنہ کے خلیفوں کی تاریخ کا جو روشن پہلو ہے اس کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ بہترین اخلاقی نظام سے شروع کرتے ہوئے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی تعلیم کے اخلاقی پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا اور اپنی زوال پذیر تحریک کو انسانی دل کے بدترین جذبہ کو اُبھار کر مضبوط کیا" (اگر یہی معاملہ یورپین لوگوں میں آزادی وطن کے لئے ہوتا تو اس قدر مقدس ہوتا کہ تعریف کے پل باندھ

دیئے جاتے ہیں۔)

ڈاکٹر مذکور صفحہ ۱۰۵ پر لکھتا ہے:۔

"باغیانہ لٹریچر اور پٹنہ کے پروپیگنڈہ سنٹر کے علاوہ وہابیوں کا دیہاتی علاقوں میں اپنا مذہب پھیلانے کے لئے ایک باقاعدہ اور مستقل نظام تھا مگر یہ مقامی مبلغین بعض دفعہ خطرناک آتش بیان ثابت ہوتے لیکن میرے لئے ناممکن ہے کہ میں اُن کا نام ادب سے نہ لوں۔ اُن میں سے اکثر خدا ترس نوجوان کی حیثیت سے زندگی شروع کرتے ہیں۔ اکثر اپنے اس مذہبی جوش کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں۔ جس میں اُن زہریلے اصولوں کا جن کے ماتحت پٹنہ کے واعظین نے ان کو تربیت دی تھی شائبہ تک نہیں ہوتا

پٹنہ کا مجسٹریٹ سرکاری دستاویزات متعلقہ ۱۸۶۵ء میں لکھتا ہے:۔

"ان لوگوں نے ہمارے گنجان آباد ضلعوں کے ہر گاؤں میں خود حکومت کے افسروں کی زیر حفاظت اور زیر سایہ علانیہ بغاوت کی تبلیغ کی مسلمان آبادی کے دلوں کو بے قرار کیا اور فتنہ و فساد کے لئے ایسا حیرت انگیز اقتدار حاصل کیا جیسا کہ ظاہر ہے۔

اس پر ڈاکٹر ہنٹر کہتا ہے:۔

"بہر حال اس حیرت انگیز اقتدار کے سرچشمہ کی بنیاد فتنہ و فساد تھی۔ سیّد صاحب نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کی بُنیاد انہیں دو اصولوں کی نشر و اشاعت پر رکھی جن کو تمام مبلغین کام میں لاتے آئے ہیں۔ یعنی وحدانیت اور مساوات اُنہوں نے الہامی یقین کے ساتھ عوام کی مذہبی حمیت سے انصاف چاہا۔ اُن کے ملکی بھائیوں کے دلوں میں یہ مذہبی حمیت مردہ ہو چکی تھی اور صدیوں تک ہندوؤں کے میل جول سے اُن کے اسلام میں بہت سی بدعات پیدا ہو چکی تھیں۔ اُن پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ اسلام کی حقیقی تعلیم بُت پرستی کے مراسم کے نیچے دب چکی ہے" (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۳۳ از ڈاکٹر ہنٹر) صفحہ ۱۴۳ میں لکھتا ہے:۔

"اس بغاوت کے تین نمایاں پہلو ہیں جو مقدمہ کے دوران میں ظاہر ہوئے

وہ یہ ہیں۔ پہلی وہ حیرت انگیز قابلیت جس سے دُور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا گیا۔ دوسرے وہ رازداری جس کے ساتھ مختلف پیچیدہ کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ تیسرے وفاداری کا وہ رویہ جو اس کے ممبروں نے ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھا۔ اُن کی کامیابی کا راز اُن کے عمدہ فرضی ناموں کی ترکیب اور خفیہ زبان پر تھا۔"

مندرجہ بالا نوٹوں سے (جو کہ ایک اُس دشمن انگریز کے بیانات اقتباسات ہیں جس نے اس بارہ میں بہت چھان پھوڑ کی ہے اور بہت سے اُمور کا خود معائنہ کیا ہے) ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تحریک مسلمانوں کی اٹھائی ہوئی نہایت منظم اور دیرپا اور موثر تھی اور اُس نے تمام مُلک میں اندر اور باہر ایسی بڑی ہلچل پیدا کر دی کہ مدبران برطانیہ لرزہ براندام ہو گئے اس قدر جوش اور قربانی کے جذبات پیدا کر دیئے کہ جس کی نظیر اس ملک میں کبھی پائی نہیں گئی اس میں فسادات اور ظلم، غریبوں اور ناکردہ گناہ کو ستانا، امن و امان کو تباہ کرنا جیسا کہ کمیونزم میں یا تقسیم بنگال (بنگال پارٹیشن) کے زمانہ میں نمودار ہوا، قطعاً نہیں تھا۔ ہاں متحارب قوت یعنی انگریزوں اور اُن کے حلیفوں کے ساتھ جو بھی اقتضاء وقت تھا عمل میں لایا گیا۔

(۲) اس تحریک میں اگرچہ غیر مسلموں یعنی ہندوؤں کو بھی دعوت دی گئی مگر سوائے راجہ رام توپچی کے اور کسی ہندو کی شرکت کسی جنگ میں معلوم نہیں ہوتی راجہ رام راجپوت تھے اور آتمان زئی کی جنگ میں اُنہوں نے ہی توپخانہ کے فرائض انجام دیئے ہیں۔

(۳) یہ تحریک آزادیٔ ہند ۱۸۰۶ء یا ۱۸۰۳ء سے شروع ہوئی اور ۱۹۴۷ء کی آزادی ہند تک باقی رہی۔ اس کی جنگی کارروائی صوبہ سرحد میں ۱۸۲۶ء میں شروع ہوتی ہے۔ باقی بیس برس گزشتہ زمین تیار کرنے اور تمام لوازمات کے پُورے کرنے میں خرچ ہوتے ہیں۔ چھ برس متواتر جنگ رہنے اور بکثرت فتح مند ہونے اور اپنوں کی غداریوں کی بناء پر جبکہ ۱۸۳۱ء میں حضرت سیّد صاحب اور مولانا محمد اسماعیل صاحب اور بہت سے مجاہدین شہید ہو جاتے ہیں اور باقی ماندہ لوگوں میں سے بہت سے حضرات اپنے اپنے اوطان کو واپس آجاتے ہیں تب بھی ایک جماعت مسلمان مجاہدین کی وہاں باقی رہتی ہے اور اپنی تمام جدوجہد کی کارروائیوں کو سرگرمی کے ساتھ عمل میں لاتی رہتی

ہے۔ وہ مایوس نہیں ہوتی اُس پر نامردی اور نامرادی کا اندھیرا موثر نہیں ہوتا اُس کی جماعت ہزاروں سے بڑھتے بڑھتے بعض اوقات لاکھ تک پہنچ جاتی ہے عام مسلمانان ہند میں وہی جذبہ اور جوش آزادی اور جہاد کا اس قدر زوروں پر قائم اور موثر ہے کہ رنگروٹ مہیا کرتے ہیں۔ مالی امداد نہایت مخفی طریقوں پر سالہا سال سے جاری کئے ہوئے ہیں۔ گورنمنٹ برطانیہ انتہائی سختی سے اس سب کو اپنی ہمہ گیر قوت سے دبانا چاہتی ہے مگر باوجود شدید مظالم اور زمانہ کی درازی کے کامیاب نہیں ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر ۱۸۵۲ء کے متعلق کہتا ہے :۔

"روپیہ اور آدمی ہمارے علاقہ سے ستیانا کیمپ کو متواتر جا رہے تھے اس سلسلہ میں حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط و کتابت بھی پکڑ لی تھی۔ یعنی اُنہوں نے (مجاہدین نے) کمال عیاری کے ساتھ ہماری ع۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی اور متعصب نوآبادی کے بہت ہی قریب تھی اگر وہ ہمارے صوبہ پر چڑھائی کرتے تو یہی رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے اُن کے مقابلہ کے لئے بھیجی جاتی۔ اُن خطوط سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۳۷)

"۱۸۵۳ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے" (ص۳۸)

"میں اُن بے عزتیوں، حملوں اور قتل و غارت کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا ہوں جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کا باعث۔ اس دوران میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر کسائے رکھا۔ ایک ہی واقعہ تمام حالات کو واضح کر دے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ (۱۶) فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۳ء تک ان مہمات کی گنتی بیس تک ہو گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی بے قاعدہ

فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی (صف۳۹ ہندوستانی مسلمان)

ان مہمات کے علاوہ ۱۸۵۷ء، ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۸ء میں بڑی فوجوں کے ساتھ مجاہدین پر چڑھائی کی گئی اور اگرچہ حسب عادت اپنی کامیابی اور مجاہدین کی موت کے راگ گائے گئے مگر خود ڈاکٹر ہنٹر اقرار کرتا ہے :۔

"۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اُٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کرنا دنیا کے (۵۳۰۰۰) جنگجو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے" (صف۴۷)

۱۸۶۲ء میں ایک موقعہ پر ہمارے خلاف ان جنگجوؤں کی تعداد ساٹھ ہزار ہو گئی تھی۔ (حاشیہ صف۴۷)

انگریزی گورنمنٹ نے ان مجاہدین کو نیست و نابود کر دینے کی انتہائی کوشش کی اور ایڑی سے چوٹی تک زور لگایا اور بسا اوقات اپنی فتح مندی کے شادیانے بھی خوب بجائے۔ روپے پانی کی طرح بہائے ہندوستانی فوجیوں کو بھیڑ اور بکری کی طرح ذبح کرایا اور کامیابی کے ڈنکے بھی بجائے مگر حقیقت معلوم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل عبارت گورنمنٹ پنجاب کی ملاحظہ فرمائیں۔

"پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم ختم بھی ہو گئی اور ہم اس قابل نہ ہوئے کہ ہندوستانی مجاہدین کو وہاں سے نکال باہر کریں یا ان کو اس بات پر ہی آمادہ کر سکیں کہ وہ اطاعت قبول کر لیں اور ہندوستان میں اپنے گھروں کو واپس آجائیں"

(ہندوستانی مسلمان صف۶۴ پنجاب گورنمنٹ کا خط الخ)

ڈاکٹر ہنٹر اپنی کتاب کے باب اوّل کے خاتمہ کو مندرجہ ذیل عبارت سے پورا کرتا ہے۔

"اب میں نے اپنی سرحد پر اس باغی کیمپ کی تمام تاریخ ۱۸۳۱ء سے جبکہ اس کی ابتداء ہوئی ۱۸۶۸ء تک جبکہ آخری مرتبہ انہوں نے ہم کو جنگ میں دھکیلا بیان کر دی ہے۔ وہ تمام مصیبتیں جو انہوں نے سکھ حکومت کے وقت سرحد پر نازل کی تھیں وہ تمام ایک تلخ وراثت کی صورت میں ہم تک پہنچیں اس نے تمام سرحد میں تعصبی جذبات کو برقرار رکھنے کے علاوہ

تین مرتبہ قبائل کو یکجا اکٹھا کر دیا۔ جس کی وجہ سے برطانوی ہند کو ہر ایک موقعہ پر بہت ہی مہنگی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ یکے بعد دیگرے ہر گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ یہ ہمارے لئے ایک مستقل خطرہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کے تباہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اب تک بھی یہ ہماری غیر وفادار رعایا اور ہمارے سرحد پار کے دشمنوں کی اُمیدوں کا مرکز بنا ہوا ہے ہم نہیں جانتے کہ کس وقت ہم قبائل کی خانہ جنگیوں کی لپیٹ میں آ جائیں گے جو وسط ایشیاء میں ہر وقت جاری رہتی ہیں مگر اس وقت یہ عین ممکن ہے کہ اس سال کے ختم ہونے سے پہلے ایک اور افغانی جنگ لڑنی پڑے۔ یہ جنگ جب کبھی بھی ہو گی (اور جلد یا بدیر یہ ہو کر رہے گی) تو ہماری سرحد پر غدار آبادی ہمارے دشمنوں کو ہزارہا آدمی مہیا کر سکے گی۔ ہمیں ان غداروں کی اپنی ذات سے کوئی ڈر نہیں۔ اگر ہمیں ڈر ہے تو ان شورش پسند عوام سے ہے جن کو یہ مجاہدین ہمارے خلاف جہاد کرنے کے لئے بار بار اکٹھا کرتے ہیں نو صدیوں کے دوران میں ہندوستانی لوگ شمال کی طرف سے حملہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اور کوئی شخص اُس اہمیت کے متعلق پیشگوئی نہیں کر سکتا جیسے یہ باغی کیمپ مغربی مسلمان خانہ بدوش گروہوں کی مدد سے ایک ایسے لیڈر کی سرکردگی میں جو اپنے اندر ایشیا کی قوموں کو جہاد کرنے کے لئے اکٹھا کر سکتا ہو حاصل کر سکتا ہے۔"

(رسالہ ہندوستانی مسلمان از ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۶۴ و ۶۵)

مذکورہ بالا نوٹ صاف بتلاتا ہے کہ یہ تحریک اور اس کے چلانے والے اس قدر عالی ہمت، مستقل مزاج، جفاکش اور منظم تھے کہ انگریزوں کی انتہائی بربریت اور درندگی بھی ان کو فنا نہ کر سکی۔

(۴) اس تحریک کی رازداری اور اخلاص و دیانت داری اعلیٰ پیمانہ پر تھی بے شمار مقدمات چلائے گئے اور ہر قسم کی شیطانی تدبیریں کام میں لائی گئیں مگر انگریزوں کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۲۶ پر لکھتا ہے:۔

"بہت مدت تک مجاہدین سرحد کی اس حیرت انگیز قوت کا سرچشمہ ایک راز بنا رہا۔ اس ہندوستانی حکومت نے جو ہم سے پہلے پنجاب پر حکمراں تھی اُسے تین مرتبہ منتشر کیا اور تین دفعہ یہ انگریزی فوج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے لیکن باوجود اس کے یہ ابھی تک زندہ ہیں اور دیندار مسلمان ان کے معجزانہ طور پر زندہ رہنے کو ہی آخرکار غالب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت اس سرحدی نوآبادی کو ہم فوجی قوت کے بل بوتے پر تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس وقت ہماری مسلمان رعایا کے متعصب عوام ان کو لاتعداد آدمیوں اور روپیوں سے مدد دے کر گویا ان چنگاریوں کو ہوا دیتے رہتے ہیں جنہیں ہم نے خاک سمجھ کر چھوڑ دیا تھا مگر جن کی بجھی ہوئی راکھ سے ایک دفعہ پھر شعلے اُٹھنے لگتے ہیں"۔

مقدمات بہت سے چلائے گئے اور لوگوں کو سزائیں نہایت بے دردی اور بربریت سے دی گئیں۔ بالخصوص پانچ مقدمے بڑے پیمانہ پر ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۱ء تک سازشوں کے چلائے گئے جن کا تعلق اسی مجاہدین کے کیمپ اور اس کی امداد سے تھا۔[ا]

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۱۲۳ میں لکھتا ہے:۔

[ا] اس زمانہ میں مسلمانوں کی اس قدر تنظیم تھی کہ ایک صوبہ میں وہابیوں کی نگرانی کے لئے انتظامی اور عدالتی اخراجات میں پورے ایک ضلع کی آمدنی صرف ہو جاتی تھی اور تب بھی سرکاری گواہ نہ ملتے تھے اس لئے کہ وہ مجرموں کے خلاف گواہی دینے پر موت کو ترجیح دیتے تھے۔ انجام کار حکومت نے مسلمانوں کے بارہ میں اپنی پالیسی کی غلطی محسوس کی اور انگریز مدبران ملک نے تسلیم کیا کہ مسلمانوں پر زیادتیاں ہوئی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۷۰ء میں اپنی حکمت عملی بدلی اور طے کیا کہ مسلمانوں کو پڑھا کر وفادار بنایا جائے اس طرح ۱۸۷۰ء میں بارہ سال کا وہ زمانہ ختم ہوا (یعنی ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۰ء تک) جس میں خالص مسلمان حکومت (برطانیہ کے مقابلہ میں اس قدر قربانیاں کرتے رہے جن کی تفصیل کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں اور اس زمانہ میں ہندو نہ صرف آرام کرتے رہے بلکہ حکومت کی برکات سے مستفیض ہوتے رہے۔

(روحِ روشن مستقبل صفحہ ۱۹۱)

"گذشتہ سات سال کے دوران میں ان غداروں کو یکے بعد دیگرے مجرم ثابت کرکے عمر قید بعبور دریاءِ شور کی سزا دی گئی"۔

مجاہدین یا اُن سے تعلق رکھنے والوں یا مشتبہ لوگوں پر مقدمات میں جس قدر مظالم ایذا رسانی، توہین و تذلیل، مار پیٹ وغیرہ خلاف انسانیت اور خلاف تمدن کارروائیاں کی جاتی تھیں اُن کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ برطانیہ کی تاریخ ان وحشیانہ اعمال کی وجہ سے نہایت گندی اور سیاہ ہے۔ پولیٹیکل قیدیوں کے ساتھ جن امور کا تصور بھی متمدن حکومتوں میں ناجائز شمار کیا جاتا ہے اُن پر عملدرآمد کرنے میں انگریز ان شریف النفس انسانوں کے لئے جھجک بھی محسوس نہیں کرتے تھے اور ایسے ایسے ملعون اور منحوس معاملات ان شرفاء کے ساتھ عمل میں لایا کرتے تھے جو کہ بدترین اخلاقی قیدی کے ساتھ بھی گوارا نہیں کئے جا سکتے تھے کچھ تفصیلات ان امور کی مولانا محمد میاں صاحب نے شاندار ماضی کی جلد ثالث میں نقل فرمائی ہیں۔ طوالت کی وجہ سے ہم ان کو چھوڑتے ہیں۔

الحاصل یہ مجاہدین اور اُن کے مددگار مسلمان وہ شریف النفس اور شریف اخلاق والے لوگ تھے جن کو ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر بار بار مجبور ہو کر انتہائی تعریفی کلمات سے یاد کرتا ہے مگر اُن کو ہر طرح ستایا گیا۔ اُن کو سخت سے سخت سزائیں، پھانسی، عبور دریاءِ شور، عمر قید، توہین و تذلیل وغیرہ کی دی گئیں۔ تاہم نتیجہ کیا ہوا، خود ڈاکٹر ہنٹر سے پوچھئے صفحہ ۴۴ پر لکھتا ہے:۔

"لیکن ۱۸۶۴ء کا سیاسی مقدمہ غداروں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے میں ویسا ہی ناکام ثابت ہوا جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تادیبی مہم۔ اُن کے اندرونی اختلافات نے کچھ سالوں کے لئے انہیں سرحد پر خاموش رکھا مگر اس کے باوجود ہمارے علاقہ میں جہاد کی تبلیغ بدستور جوش و خروش کے ساتھ ہوتی رہی مشرقی بنگال کے ہر ضلع میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دریائے گنگا کی وادی میں پٹنہ سے لیکر سمندر تک کے مسلمان کسان مجاہدین کے کیمپ کے لئے ہفتہ واری امداد کے نذرانے مخصوص کرنے کے عادی ہو چکے تھے"۔

صفحہ ۱۵۱ پر لکھتا ہے:۔

"سرحد پر تباہ کن جنگیں اور اندرونِ ملک میں عدالتی سزائیں اس قابل نہ ہوئیں کہ مجاہدین کے اتحاد کو توڑ سکیں۔"

مندرجہ بالا تاریخی اقتباسات جو کہ عموماً صحیح ہیں مبالغہ کا ان میں شائبہ بھی نہیں ہے بلکہ واقعات سے بہت کم ہیں ناظرین غور فرمائیں اور دیکھیں کہ مسلمانوں کی جدوجہد اور تحریک آزادئ ہند میں جانبازی اور سرفروشی کس قدر عظیم الشان اور کس بلندی پر پہنچی ہوئی اور کس قدر پرانی ہے کیا کوئی دوسری جماعت اس کے مقابل تاریخی اعتبار سے اپنا یا اپنی جماعت کا نام پیش کر سکتی ہے۔

(۱) یہ جماعت ۱۸۰۳ء سے وجود میں آئی (۲) اس جماعت نے کھلے بندوں آزادی کی تحریک کی اور لوگوں کو جہاد کے لئے آمادہ کیا۔ (۳) اس جماعت کا مقصود فرقہ وارانہ آزادی نہ تھا (۴) اس جماعت کا مقصد خود حکومت کرنا نہ تھا۔ (۵) اس جماعت نے ملک کے اکثر حصہ میں دورہ کر کے آزادی کا جوش و خروش پیدا کیا (۶) اس جماعت نے باقاعدہ تنظیم کی ہر ہر ضلع، صوبہ اور قصبات وغیرہ میں مراکز بنائے اور عہدہ دار مقرر کئے۔ (۷) یہ جماعت سرحد تک کئی ہزار میل سفر کر کے جبکہ ریل، ہوائی جہاز موٹریں نہ تھیں ہر قسم کی تکالیف جھیلتی ہوئی ہزاروں جانفروشوں کو لئے ہوئے پہاڑوں، دشوار گذار دروں ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے براہ سندھ قندھار کابل درّہ خیبر صوبہ سرحد میں پہنچتی ہے (کیونکہ انگریز نے کسی دوسرے راستہ سے جانے نہیں دیا تھا) اور آزادی کی جدوجہد عملی طور پر شروع کرتی ہے۔ (۸) یہ جماعت غریبوں کی ہے اس کے پاس رسد وغیرہ کا پورا سامان نہیں ہے فاقوں پر آدھے پیٹ کھانے پر موٹے جھوٹے کھانے پر گذر کرتی ہے اور پھر دشمن پر یلغار کرتی ہے (۹) اس جماعت کی پارٹیاں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل سے مالی اور جانی امداد کرتی ہیں۔ راستہ میں انگریز پکڑتے ہیں سزائیں دیتے ہیں مگر یہ نظام جاری ہے (۱۰) یہ جماعت انگریزوں کی طرف سے ہر قسم کی ہلاکتوں اور ایذاؤں کا نشانہ بنتی ہے اور تحمل کرتی ہے مگر آزادی کی جدوجہد اور انگریز دشمنی سے باز نہیں آتی۔ انگریز لالچ دیتا ہے قبول نہیں کرتی۔ انگریز ڈراتا ہے مگر نہیں ڈرتی (۱۱) اس جماعت کو سرحدی قبائل نے انگریزی سازشوں میں آکر برباد کرنا چاہا۔ اس کے امام کو زہر دیا۔ میدانِ جنگ میں غدر کیا۔ کئی مرتبہ متفق ہو کر اس جماعت کے منتشر لوگوں

کو جہاں پایا قتل اور شہید کیا۔ دشمنوں سے مل گئے مگر یہ سخت جان جماعت آزادی کی متوالی آج تک اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح جمی ہوئی ہے۔ (۱۲) انگریزوں نے بار بار اس پر چڑھائی کی اور اس کے گھر بار کو بزعم خود جلا کر اور فنا کر کے چلے آئے پھر بھی وہ باقی ہے اور لڑائیوں میں وہ پچاس ہزار ساٹھ ہزار حتیٰ کہ ایک لاکھ تک مردان میدان انگریزوں کے مقابلہ میں کھڑے کر دیتی ہے (۱۳) کابل کی جنگ میں ایک ہزار مردان میدان کو انگریزوں کے خلاف افغانیوں کی مدد میں پیش کر دیتی ہے۔ (۱۴) اس حال پر ایک صدی سے زیادہ اس پر گذرتا ہے۔ ہندوستان کے آزاد ہوتے تک یہ اسی طرح جمی رہتی ہے (۱۵) اس جماعت کا مقصد غیر وطنیوں کو نکالنا اور ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم کرنا۔

میں اہل انصاف و عقل سے پر زور اپیل کرتا ہوں کہ وہ سوچیں اور مدعیان پیشقدمی دربارہ جدوجہد آزادی کی غلطیوں اور مسلمانوں کی انسانی، مخلصانہ اور سرفروشانہ خدمتوں کو طشت ازبام کریں۔

جہاد حریت ۱۸۵۷ء

اب ہم ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے متعلق کچھ عرض کریں گے مگر چونکہ اس بارہ میں بہت سی تحریرات مختصر اور طویل لکھی جا چکی ہیں اس لئے ہم غیر ضروری تفصیلات اور غیر مناسب واقعات کو درج کر کے ناظرین کا وقت ضائع نہ کریں گے۔ اگرچہ انگریزوں کے خوف سے اس زمانہ میں بلکہ مابعد تک پورے اور صحیح واقعات کا لکھنا اور شائع کرنا ممکن نہ تھا اس لئے عام طور پر لوگوں کے علم میں سب واقعات نہیں آئے ہاں اس زمانہ کے موجود لوگوں سے روایتیں پہنچیں جن کو کسی کتاب میں استیعاب کے ساتھ جمع ہونا میرے علم میں نہیں آیا۔ انگریزوں نے اپنی وحشیانہ زندگیوں کو چھپانے اور اہل ہند (ہندو اور مسلمانوں) کو شیطان اور وحشی وغیرہ ثابت کرنے کے لئے سو سے زیادہ تصانیف کیں مگر سب کی سب تقریباً جھوٹے اتہامات سے پُر اور حقیقت سے خالی ہیں۔ صرف ایڈورڈ ٹامسن کی تصنیف انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ کسی قدر بلکہ بڑے درجہ تک قابل اعتبار معلوم ہوتی ہے۔

جہاں تک واقعات اور احوال خبر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو انگریز اپنی کامیابیوں اور بڑھتی ہوئی قوت کے نشہ میں اس قدر چور اور زبردست ہوگئے تھے کہ نہ کسی عہدنامے کا خیال رہا تھا نہ کسی راجہ مہاراجہ نواب بادشاہ کو خیال میں لاتے تھے۔ تمام ہندوستانیوں کو خواہ ہندو ہو یا مسلمان انتہائی ذلت کی نظر سے دیکھتے تھے اور بات بات پر تحقیر و توہین سے بھرے ہوئے کلمات اور اعمال استعمال کرتے تھے جیسا کہ وارن ہسٹنگز کا مقالہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں "انگریز ہندوستان میں آکر ایک نیا انسان بن جاتا ہے جن جرائم کو وہ انگلستان میں خیال میں بھی نہ لا سکتا تھا ان کے کرنے کے لئے یہاں صرف اپنا انگریز ہونا کافی سمجھتا ہے" اسی طرح لارڈ سدہنسہم بھی اسی کے قریب قریب کہتا ہے۔

الغرض جس قدر بھی زمانہ آگے بڑھتا جاتا تھا انگریزی عہد شکنیاں اور نئے نئے مظالم طرح طرح کے روپ میں ظاہر ہوتے جاتے تھے دوسری طرف ہندوستانیوں کی ہر قسم کی زندگی روز بروز ایسی فلاکتوں اور مصیبتوں کے گڑھوں میں گرتی چلی جاتی تھی کہ جس کا پہلے لوگوں کو وہم و گمان بھی نہ ہوتا تھا ریاستیں خلاف معاہدہ ضبط ہو رہی تھیں اور ان کو اپنے خالص علاقہ میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ گدی نشین کو طرح طرح کے حیلوں سے برطرف اور محروم کر دیا جاتا تھا۔ معمولی معمولی حیلوں بلکہ غلط اور جھوٹے پروپیگنڈوں سے جن کے یورپین لوگ عموماً اور انگریز قوم خصوصاً عادی ہیں والیان ریاست پر حملہ یا ان کو معزولی عمل میں آتی رہتی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

حسب قول مشہور "تنگ آمد بجنگ آمد" مجبور ہو کر آزادی کے لئے کوشش کرنا ضروری سمجھا گیا۔ نیز وہ لوگ جو کہ سید صاحب کی تحریک میں داخل ہو کر سرحد پر پہنچے تھے اور وہاں کی لڑائیوں اور جہادی کارروائیوں میں شریک رہے تھے اور بالاکوٹ میں سید صاحب کے شہید ہو جانے کے بعد اپنے اوطان کو واپس آگئے تھے اور وہ لوگ جو کہ حضرت سید صاحب کے مرید اور ان کی تحریک میں کسی درجہ تک شریک تھے ان لوگوں کے قلوب ہمیشہ آزادی کی تڑپ سے بے چین رہتے تھے اس لئے تمام ہندوستانیوں نے عموماً اور مسلمانوں نے خصوصاً اس انقلاب ۱۸۵۷ء کو ضروری سمجھا اور مقرر کیا گیا کہ ۱۱ مئی کو تمام ہندوستان میں انقلابی کارروائی عمل میں لائی جائے اور علم جہاد بلند کیا جائے

مگر افسوس اس پر عمل نہیں ہوا۔ بلکہ ۲۲ مارچ کو مدم (صوبہ بنگال) میں منگل پانڈے کے ہاتھوں (تقریباً دو ماہ پہلے) یہ آتشیں مادہ بھڑک اٹھا۔ ابھی دوسری جگہ تیاریاں نہیں ہوئی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی میں باقاعدہ جہاد کے شروع ہونے تک بنگال کی تحریک تقریباً ختم ہو چکی تھی اور پھر پنجاب میں تحریک اس وقت شروع ہوئی جب دہلی اور کانپور کے حالات پر انگریز قابو پا چکے تھے۔ مدراس، بمبئی، حیدر آباد یعنی جنوبی ہند میں اس وقت تک کچھ کام نہ ہو سکا تھا۔ ان صوبوں میں نہایت خفیف سا اثر ہوا۔ جس پر بآسانی قابو پا کر شمالی ہند کی اصلاح کے لئے فوجیں روانہ کی گئیں۔ بہر حال وقت مقررہ پر شروع نہ ہونا ناکامی کا بڑا سبب تھا۔[۱]
(شاندار ماضی ج ۴ ص ۴۸۹)

---

[۱] دوسری وجہ سکھوں کی مخالفت تھی۔ ابھی دس سال نہیں ہوئے تھے کہ انگریز نے سکھوں کی آزادی سلب اور ان کی حکومت غصب کی تھی۔ اس تازہ مصیبت پر سکھوں کو سب سے زیادہ مشتعل ہو جانا چاہیئے تھا لیکن وہ تلخ تاریخ جس کی بناء پر ہندو اور مسلمان دونوں کو سکھوں سے سخت شکایت اور بہت زیادہ تلخی تھی۔ سکھوں کے پیش نظر تھی اور انہوں نے انگریز کی وفاداری ہی میں اپنی جماعت کا فائدہ تصور کیا۔ سکھوں کے اسی طرز عمل کا اثر تھا کہ پنجاب میں تحریک کمزور رہی۔ البتہ صوبہ سرحد نے نہایت پامردی اور مستعدی کے ساتھ حق وفا ادا کیا اور وطن دوستی کا کامل ثبوت دیا۔ (۳) نظام حیدر آباد مرہٹوں اور دوسری حریف قوموں سے مقابلہ کے لئے ابتداء ہی سے انگریزوں کا حامی تھا اس سلسلہ میں وہ سلطان ٹیپو کے برخلاف انگریزوں کا مددگار رہا تھا اس وقت مرہٹے اور دربار دہلی اور اودھ (یعنی نظام حیدر آباد کی حریف طاقتیں) انگریزوں کے خلاف تھیں اور اس بناء پر لازم تھا کہ نظام حیدر آباد انگریزوں کی مخالفت میں کوئی دل چسپی نہ لے لیکن اس کا برا نتیجہ یہ تھا کہ پورا جنوبی ہند انگریز کے لیے پناہ گاہ بن گیا (۴) کابل پر کچھ فوجیں انگریزوں کی پہنچیں ہوئی تھیں۔ اسی طرح چین پر حملے کے لئے دیگر ممالک سے برطانوی فوجیں آ رہی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس روس اور دیگر ایشیائی حکومتوں کا راستہ بھی بند ہو گیا۔ اور تازہ دم فوجیں انگریزوں کو فوراً دستیاب ہو گئیں۔ جس کا نتیجہ ہندوستان کی غلامی اور شکست تھا۔ اگرچہ خوش گوار نتیجہ یہ رہا کہ چین اور افغانستان و ایران کو برطانوی اقدام سے نجات مل گئی۔ خیر یہ بھی اچھا ہوا ہم تباہ ہو گئے مگر ہمارے پڑوسی تو نجات پا گئے۔ ایک دوسرا خوش گوار نتیجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ اس وقت جس شد ومد سے عیسائی بنانے کی

ہمارے اکابر کا ۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینا

ہمارے تمام اکابر (علماء دیوبند و سہارنپور و مظفر نگر) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور اُن کے تلامیذ کے شاگرد اور خوشہ چین رہے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب اور اُن کے خاندان کے مسلک اور حکم کے خلاف چلیں۔ چنانچہ جب سید صاحب کی تحریک جہاد شروع ہوئی تو حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب شہید ولایتی (دادا پیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکی) اور حضرت شاہ نصیر الدین صاحب دہلوی (سابق پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور بہت سے حضرات (اطراف سہارنپور مظفر نگر وغیرہ کے) شریک تحریک ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ سرحد میں جا کر شہید ہوئے۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے اعلیٰ جذبات حریت و جہاد اور ان کی تعلیمات روحانیہ سے ان حضرات کو انتہائی شغف اور حسن اعتقاد رہتا تھا۔ سرحد کی ناکامی اور آپس کی غداریوں سے ان حضرات کے قلب میں انتہائی قلق اور اضطراب ہمیشہ محسوس ہوتا رہتا تھا جب انقلاب ۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہند خصوصاً اطراف دہلی میں چلنی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوش حریت میں نئی حرکت پیدا ہوئی ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے انگریزوں کے افعال ماضیہ اور احوال حاضرہ پر بخوبی مطلع تھے اس تمام جماعت میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۹) تحریک جاری تھی وہ بند کر دی گئی۔ اگرچہ اس کے بعد لامذہب بنانے کی پالیسی پر قوت سے عمل ہوتا رہا اور ہو رہا ہے مگر پادریوں کا زور یقیناً کم ہو گیا۔ (شاندار ماضی ص ۴۹)

(۵) آپس کی مخالفت اور رقابت جو کہ انتہائی جہالت اور رذالت پر مبنی تھی۔ ہم عنقریب ذکر کریں گے کہ دہلی میں خود بادشاہ کا بیٹا مرزا مغل اور سمدھی مرزا الٰہی بخش ہر قسم کی امداد انگریزوں کو دے رہے تھے اور جنرل بخت خاں کی اور مجاہدین کی ہر قسم کی کاٹ میں مصروف تھے جس کی وجہ سے فوج میں پھوٹ پڑ گئی اور کامیابی نہ ہو سکی۔ حالانکہ انگریزوں نے مرزا مغل کو قبضہ پاتے ہی معاس کے دو بھائیوں (مرزا حضرت سلطان اور مرزا ابو بکر) کو قتل کر کے انکا سر طباق میں رکھ کر بادشاہ کو بطور تحفہ پیش کیا البتہ مرزا الٰہی بخش (سمدھی بادشاہ) کو تھوڑے سے وظیفہ کے ساتھ ذلت میں باقی رکھا۔

حضرت حافظ ضامن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز زیادہ پیش پیش تھے (حضرت حافظ صاحب قطب العالم میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اولین اور اعلیٰ ترین خلفاء میں سے تھے نسبت روحانیہ نہایت قوی اور بے مثل پائی تھی۔ میانجی صاحب مرحوم کی وفات کے وقت تک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی تکمیل سلوک تصوف پوری نہیں ہوئی تھی تو میانجی صاحب نے حضرت حاجی صاحب کو تکمیل کے لئے حافظ ضامن صاحب ہی کے سپرد کیا تھا) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریک انقلاب میں حافظ صاحب کے ہم نوا تو ضرور تھے مگر پیش پیش اور اس قدر زیادہ جوش میں نہ تھے اسی قصبہ تھانہ بھون میں میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے چوں کہ تینوں حضرات پیر بھائی اور ایک ہی مقدس ہستی میاں جی صاحب کے دریوزہ گر تھے۔ اس لئے آپس میں میل جول اتحاد و اتفاق بڑے پیمانہ پر رہتا تھا مگر مولانا شیخ محمد صاحب علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل تھے۔ علماء دہلی سے تمام نصاب علم ظاہر پڑھ چکے تھے۔ بخلاف حضرت حافظ صاحب اور حاجی صاحب کے کہ دونوں حضرات نے علوم عربیہ کی تکمیل نہیں کی تھی۔ اگرچہ نسبت باطنیہ میں بدرجہا بڑھے ہوئے تھے۔ اس بناء پر مسائل شرعیہ میں ہر دو حضرات مولانا شیخ محمد صاحب ہی کا اتباع کرتے تھے بدقسمتی سے مولانا کی رائے یہ ہی تھی کہ انگریز دل کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ اس اختلاف اور فتوی کی بناء پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کے اوطان سے دونوں حضرات نے بلوایا (یہ دونوں حضرات اس سے بہت پہلے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی اور حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی اور حضرت مولانا مملوک علی صاحب اور دیگر اساتذہ دہلی سے سند فراغ علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کر چکے تھے اور اپنی ذکاوت اور مہارت میں پوری شہرت حاصل کر کے سلوک و طریقت کی منازل بھی طے کر چکے تھے) جب ہر دو حضرات (مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما) پہنچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا (چونکہ وہ چچا پیر تھے اس لئے ہمیشہ ان کا ادب کیا جاتا تھا) کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنانِ دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے

تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سرو سامان ہیں۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوہ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا۔ اس پر حافظ ضامن صاحب نے فرمایا کہ مولانا بس سمجھ میں آگیا اور پھر جہاد کی تیاری شروع ہو گئی اور اعلان کر دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو قاضی بنایا گیا۔ اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو میمنہ میسرہ (دائیں اور بائیں) کا افسر قرار دیا گیا۔ چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقویٰ (علم تصوف اور تشرع) کا بہت زیادہ شہرہ تھا ان حضرات کے اخلاص اور للہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے۔ ہمیشہ سے ان کی دین داری اور خدا ترسی دیکھتے رہے تھے اس لئے اُن پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے علاوہ مریدین اور تلامذہ کے عام مسلمان بھی بیحد معتقد تھے اس لئے بہت تھوڑی مدت میں جوق در جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ اس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہ تھی۔ عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار رہتے تھے جس کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے تھے مگر یہ ہتھیار پرانے قسم کے تھے۔ بندوقیں توڑے دار تھیں۔ کارتوسی رائفلیں نہ تھیں۔ یہ صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے اور تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے

خبر آئی کہ توپخانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے ایک پلٹن لا رہی ہے۔ رات کو یہاں سے گذرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی۔ کیونکہ جو ہتھیار ان مجاہدین کے پاس تھے وہ تلوار، بندوق توڑے والی اور برچھے وغیرہ تھے مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی توپخانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا فکر مت کرو۔

سڑک ایک باغ کے کنارے سے گذرتی تھی۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے افسر مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے تمام ماتحتوں کو لے کر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم دیا کہ پہلے سے تیار رہو جب میں حکم کروں سب کے سب ایک دم فیر کرنا۔ چنانچہ جب پلٹن معہ

توپخانہ باغ کے سامنے سے گذری تو سب نے یکدم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپخانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے توپخانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کی مسجد کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اس سے لوگوں میں ان حضرات کی فراست، ذکاوت، فنونِ حربیہ کی مہارت، معاملہ فہمی اور ہر قسم کی قابلیت کا سکّہ بیٹھ گیا۔

شاملی اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا۔ ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی۔ کچھ فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا کہ اس پر حملہ کیا جائے چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی وہ مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی ہنگامہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت حافظ صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُن کی شہادت سے پہلے روزانہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں مقام انگریزوں سے چھین لیا گیا۔ آج فلاں مقام پر ہندوستانیوں کا قبضہ ہوا مگر حافظ صاحب مرحوم کی شہادت کے بعد پہلے پہل خبر آئی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور یہی حال ہر جگہ کی خبروں کا تھا۔ اس سے پہلے گورے فوج چھپتے پھرتے تھے ایک ایک ہندوستانی سپاہی گوروں کی جماعتوں کو بھگائے پھرتا تھا مگر بعد میں معاملہ بالکل برعکس ہو گیا۔

پہلے کسی کھیت میں گورا سپاہی چھپا ہوا تھا تو کاشتکار عورت نے اپنے کھرپے سے اُس کو قتل کر ڈالا مگر بعد میں معاملات اُلٹے ہو گئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام معاملہ جوش و خروشِ جنگ و جدال کا حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے لئے کیا گیا تھا۔ بہر حال حافظ صاحب کی شہادت اور دہلی کے سقوط کی خبر سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہو گئیں اور سب اپنے اپنے اوطان کو واپس آ گئے۔

تقدیر تدبیر پر غالب آ گئی۔ ہندوستانیوں کو اپنے اعمالِ سابقہ کی سزا ملنی تھی گذشتہ مصائب پاداش کے لئے احکم الحاکمین کے دربارِ عدالت میں کافی نہ تھے اس لئے باوجود اس قدر جاں بازیوں کے برٹش شہنشاہیت کو ہندوستانیوں پر اس طرح مسلّط کر دیا گیا جس طرح کوڑے لگانے والے بھنگی جلّاد کو مجرم پر مسلّط کر دیا جاتا ہے۔ جس میں نہ شرافت ہوتی ہے نہ رحم وانسانی ہمدردی۔ ہندوستانیوں کو سپید برطانوی بھیڑیوں

کے سامنے سرنگوں کرنا قدرت کی تجویز تھی وہ ہو کر رہی۔ تحریک انقلاب و آزادی ناکام کردی گئی۔ غلامیت کا طوق پہلے سے ہزاروں درجہ بوجھل کرکے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی گردن میں ڈلوادیا گیا۔ قصبہ تھانہ بھون اور اُس کے اطراف و جوانب کے وہ مقامات جن کی شکایت کسی دشمن نے کردی برباد کر دیئے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

دارو گیر دپکڑ دھکڑ کا بے پناہ زمانہ آیا۔ چاروں طرف سختیاں بے حد و بے نہایت وحشی درندوں کی طرح عمل میں لائی جانے لگی۔ پُرانی دشمنیوں کو نکالنے کا لوگوں کو موقعہ مل گیا جس کو جس سے کوئی بھی پرخاش یا رنجش ہوتی انگریز افسر کے یہاں شکایت کر دیتا کہ یہ شخص بغاوت میں شریک تھا۔ علیٰ ہذا القیاس اگر کسی کی زمینداری یا نقدی کی حرص ہوتی تو اس کی شکایت انگریز کے پاس کر دیتے۔ وہاں نہ تحقیق تھی نہ گواہ کی تلاش تھی۔ نہ مجسٹریٹ کے فیصلہ کا انتظار تھا۔ وہاں تو یہ مقالہ معمول یہ تھا۔

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے

یا تو ابتداء میں انگریز چھپتے اور ہندوستانیوں سے پناہ مانگتے پھرتے تھے یا دنیا یکبارگی پلٹ گئی اور ہندوستانیوں کا قتل عام ہونے لگا۔ تحریک انقلاب ۱۸۵۷ء دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس انقلاب میں حصّہ لینے والے ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے فوجیوں میں بھی اور امراء میں بھی، عوام میں بھی اور علماء غیر/علماء خواص میں بھی۔ امراء میں اگر بیگم حضرت محل اور نواب باندہ عظیم اللہ خاں نواب عبدالرحمان خاں صاحب والی جھجر، نواب مظفر الدولہ، نواب امیر خاں پنشن دار وگیر داریلول، نواب اکبر خاں بن فیض اللہ خاں بنگش نواب احمد قلی خاں وغیرہ مسلمان نظر آتے ہیں تو ہندوؤں میں جھانسی کی رانی نانا راؤ، تانتیا ٹوپی کالپی والے راجہ جگدیش پور، کنور سنگھ آف بہار۔ راجہ ناہر سنگھ رئیس بلب گڑھ۔ راجہ اجیت سنگھ عم راجہ نریندر سنگھ رئیس پٹیالہ لالہ راجی واس گڑھ والے وغیرہ نظر آتے ہیں اسی طرح ہر طبقہ میں اشتراک تھا۔ علماء میں مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ مدراسی۔ مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی جنہوں نے

۱ـ ۲ـ ہر دو حاشیے صفحہ ۵۵۴ پر ملاحظہ فرمایئے۔

دہلی میں بعد نمازِ جمعہ جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی تھی اور استفتاء پیش کیا تھا۔

حاشیہ متعلق ص۴۵۴۔ لہ مولانا نہایت پرجوش اور خوش بیان تھے سلسلہ نسبی میں سلطان ٹیپو مرحوم سے تعلق رکھتے تھے ان کی تقریروں میں جو کہ آگرہ، فیض آباد، لکھنؤ وغیرہ میں ہوتی تھیں کئی کئی ہزار ہندو اور مسلمان جمع ہو جاتے تھے۔ اخیر میں لکھنؤ آئے اور بادشاہ بیگم حضرت محل لکھنؤ پر قابض ہو گئے تھے۔ جبکہ لکھنؤ میں ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۵۷ء بروز یک شنبہ مرزا رمضان علی عرف برجیس قدر ابن واجد علی شاہ کو حضرت محل کی منظوری سے مموخاں کی سرکردگی میں فوجی سالاروں نے باقاعدہ تخت نشین کرا دیا تو احمد اللہ شاہ صاحب (مدراسی دلاور جنگ) جو کہ پہلے سے قابض ہو کر شہر کا بندوبست کر چکے تھے۔ اب تلنگے جابجا متعین ہوئے۔ شاہ جی سخت سست کہہ کر چپ ہو گئے۔ بیلی گارد پر انگریزوں سے چھ روز تک لڑائی ہوتی رہی۔ ۱۰ جولائی کی شام جمعہ کے دن پسپا ہو کر لوٹ آئے۔

(باغی ہندوستان ص۱۵۴ از قیصر التواریخ جلد ص۲۲۵ تا ۲۳۰)

سے ۲ حضرت علامہ الور سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے یہاں فوج نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا تھا بادشاہ دہلی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ علامہ بھی شریک مشورہ ہوتے رہے۔ منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں ۱۶/۱۷ اگست ۱۸۵۷ء (مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ انہوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورتِ حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔) ۲ ستمبر ۱۸۵۷ء (بادشاہ دربارِ عام میں تشریف فرما ہوئے مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق آداب بجا لائے ۱۶ ستمبر ۵۷ء (مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے۔ اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے) ۷ ستمبر ۵۷ء (بادشاہ دربار خاص میں رہے حکیم عبدالحق میر سعید علی خاں مولوی فضل حق بدرالدین خاں اور دیگر تمام امراء و رؤساء شریک دربار رہے۔

(باغی ہندوستان ص۱۵۵)

مفتی صدرالدین خاں صاحب۔ آزردہ صدر الصدور دہلی۔ مولوی عبدالقادر صاحب قاضی فیض اللہ صاحب دہلوی مولانا فیض احمد صاحب بدایوانی۔ ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی سیّد مبارک شاہ رام پوری نے اس پر دستخط کر دیئے تھے۔ اور اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی تھی۔ دہلی میں نوّے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی (الثورۃ الہندیہ صفحہ ۱۵۰ از تاریخ ذکاء اللہ) عے

الحاصل ان علماء نے آخر وقت تک اپنے فتویٰ کے مطابق عمل کیا۔ جنرل بخت خاں اور اس کی فوج اور مجاہدین نے پوری داد شجاعت دی مگر آپس کے غداروں نے (جن کے سرغنہ مرزا الٰہی بخش اور مرزا مغل شہزادہ تھے) ہر قسم کی ابتری پھیلا دی اور نتیجہ وہی ہوا

عے بادشاہ سراسیمہ تھے شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تخت کی تمناؤں نے باہمی رقابت کا میدان گرم کر رکھا تھا۔ عمائد شہر میں دو گروہ تھے ایک بادشاہ کا ہمنوا اور دوسرا کمپنی کا بہی خواہ۔ فوجوں میں طمع لالچ نے گھر کر لیا تھا۔ دو جماعتوں نے مقصد اعلیٰ سامنے رکھ رکھا تھا ایک جماعت مجاہدین کی تھی دوسری روہیلوں کی یہ جنرل بخت خاں کی سرداری میں داد شجاعت دے رہی تھی۔ جنرل بخت خاں کی اسکیموں میں مرزا مغل صاحبزادہ بادشاہ آڑے آتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش (سمدھی بادشاہ) نے بادشاہ سے سرکار میں (کمپنی میں) معافی کا خط بھی بھجوا دیا تھا۔ کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مرزا مغل کی وجہ سے فوج میں پھوٹ پڑ گئی جنرل بخت خاں سے لوگ بگڑ گئے کمپنی کی فوج نے ۱۴ ستمبر کو شہر دہلی پر حملہ کر دیا۔ اور ۱۹ ستمبر کو انگریز مکمل طور پر قابض ہو گئے بادشاہ جو اس درمیان میں قلعہ سے نکل کر مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے مع متعلقین گرفتار کر کے قلعہ میں نظر بند کر دیے گئے تھے۔ تین شہزادوں کو قلعہ میں داخل ہوتے ہی گولی کا نشانہ بنایا گیا اور اُن کے سروں کو خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ انہیں میں مرزا مغل بھی تھے۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج اور توپخانہ کو نکال لے گئے۔ بادشاہ سے کہا کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں مگر وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے۔ (الثورۃ الہندیہ ص۱۵۰)

جو ایسی باتوں کا ہوتا ہے۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پوری دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور انتہائی سفاکی سے دہلی میں قتل عام جاری کر دیا گیا۔

اسپنسر وال پول لکھتا ہے:۔

"وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہیں مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ پانچ یا چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی۔ وال پول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ جن میں سے اُنتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف تبصرۃ التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کئے گئے۔ اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔"

(شاندار ماضی ص۶۹ از افسانۂ غم ص۲۸ و ۲۹)

۱۸۵۷ء میں انگریز جیسی دعویدار تمدن و تہذیب قوم نے یہ شرمناک اور انسانیت سوز حرکات جوش میں نہیں ہوش میں کیں۔ غلامی کی لعنت سے متاثر ہوکر نہیں فاتح و قابض ہونے کے بعد کیں۔ جہالت و حماقت سے نہیں۔ بزعم خود دانش مندی و فرزانگی کے ماتحت کیں۔ غفلت و نادانستگی سے نہیں بلکہ قصداً اور دانستہ کیں۔ خصوصیت سے مسلمانوں کے ساتھ جو ذلت آمیز اور جگر خراش برتاؤ کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوانا۔ سکھ رجمنٹ سے علیٰ رؤس الاشہاد اغلام کرانا۔ فتحپوری کی مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکانا، مساجد کی بے حرمتی خصوصاً شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کا باندھنا، عبادت کی جگہ دفاتر قائم کرنا اور حوض میں وضو کے پانی کی جگہ گھوڑوں کی لید ڈالنا ناقابل معافی اور ناممکن التلافی جرم ہے۔ منصف مزاج انگریز بھی اس کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ ترجمہ شیخ حسام الدین۔ از کتاب مسٹر ایڈورڈ ٹامسن مسمّیٰ بہ "تصویر کا دوسرا رخ"۔ (الثورۃ الہندیہ ص۱۶۱ و ۱۶۲)

[1] اس رسالہ میں اگرچہ بہت کم واقعات ذکر کئے گئے ہیں جو کہ اصل واقعات کے سامنے وہ نسبت رکھتے ہیں جو کہ ذرہ کو پہاڑ سے ہوسکتی ہے مگر پھر بھی ناظرین کے دل کو ہلا دینے والے اور انگریز کی درندگی اور وحشیت و بربریت پر پوری روشنی ڈالنے والے ہیں۔

جو تفصیلات ہم نے خود انگریزوں کے حوالہ سے مندرجہ بالا صفحات میں درج کی ہیں وہ صاف طور پر بتلاتی ہیں کہ ہندوستانیوں کی یہ تحریک انقلاب بغاوت ہرگز نہ تھی بلکہ حق طلبی کی تھی۔ ہندوستانی غدّار ہرگز نہ تھے بلکہ انگریز غدّار تھے جنھوں نے معاہدات کو یکے بعد دیگرے توڑنے اور مظالم شاقہ کا شیوہ اختیار کر رکھا تھا۔ اس طرح کے انقلابات ان سے بہت معمولی وجوہات کی بناء پر خود انگلینڈ، فرانس امریکہ روس، جرمنی وغیرہ میں واقع ہوئے اور سب کے سب حق بجانب تسلیم کئے گئے مگر ہندوستان میں سخت سے سخت اور انتہائی حالات پر یہ تحریک چلائی گئی اور بقول "برعکس نہند نام زنگی کا فور" ہندوستانیوں ہی کو غدّار اور باغی کہا گیا اور اُن پر بالکل وحشیانہ درندگی سے بھرے ہوئے مظالم کے پہاڑ ڈھائے گئے اور بے شرمی سے اپنے آپ کو مہذّب اور متمدّن کہا گیا اور اسی بنا پر مسٹر لیکی کہتا ہے :-

"اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی بغاوت تھی۔" (حکومت خود اختیاری ص۳۲)

ہم نے پہلے ذکر کیا تھا کہ اس تحریک انقلاب آزادی ۱۸۵۷ء میں ہندو اور مسلمان اور علماء سب شریک تھے چنانچہ ہم ہندو امراء اور مسلمان امراء مشہورین کے نام عنقریب ذکر کر چکے ہیں جن کی ماتحتی میں ہر قسم اور ہر مذہب کے سپاہی اور تنخواہ دار ملازم کام کر رہے تھے چند مشہور علماء کرام کے نام بھی ہم پیش کر چکے ہیں۔ عام فوجیوں کے متعلق یہ ہے کہ کارتوسوں پر گائے اور سور کی چربی کا استعمال کیا جانا خود انگریزوں کے اقرار سے ثابت ہے۔ چنانچہ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن "تصویر کے دوسرے رُخ" صفحہ ۲۷ پر لکھتا ہے "دوسرا بڑا سبب جس سے بغاوت کی آگ فی الفور بھڑک اُٹھی جیسا کہ ہر ایک کو معلوم ہے چربی والے کارتوسوں کا قصّہ ہے"۔... انگریز مورخین اگر غور سے اس واقعہ پر نظر ثانی کریں تو اُن کو نہایت ندامت اور شرمندگی سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر کسی بغاوت کے لئے کوئی جائز وجہ کا امکان ہو سکتا ہے تو موجودہ حادثہ میں اس سے بدرجہا مضبوط اور قوی وجہ ہندوستانی سپاہیوں کے لئے موجود تھی۔ لارڈ ہیرانس مسٹر ایسن کی ایک چھٹی کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو اُس نے غدر کے ایام میں بہ حیثیت سپہ سالار لارڈ کیننگ وائسرائے ہند کو لکھی تھی۔

"کارتوسوں کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے سپاہیوں کے اعتراضات پر مطلقاً کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ کارتوسوں میں ایسی چکنی چیز کا استعمال کیا جائے گا جو بالکل چربی ہے۔ گولی کے دبانے کے بعد بندوق کے منہ کی جالی اسی چربی سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہے"

اس کے بعد اپنی رائے کو ذیل کے الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:۔

"میری رائے میں ان کارتوسوں کے استعمال سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابل یقین طریق سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ جب اس ناقابل استعمال چیز کے استعمال پر اصرار کیا گیا تو سپاہی آپے سے باہر ہو گئے اور سوار فوج کی پلٹن ۳ کے (۸۵) جوانوں نے اس کے استعمال سے صاف انکار کر دیا" الخ (تصویر کا دوسرا رُخ ص ۲۷ ، ۲۸)

ظاہر ہے کہ ان چربی والے کارتوسوں پر ہندوؤں کو اعتراض بہ نسبت مسلمانوں کے بہت زیادہ ہو سکتا ہے کیونکہ اُن کے مذہبی جذبات کو مسلمانوں سے زیادہ ٹھیس لگتی ہے۔ چنانچہ دم دم کلکتہ میں منگل پانڈے کے ہاتھوں سب سے پہلے ۲۲/مارچ کو یہ آتشیں مادہ بھڑک اُٹھا۔ صاحب حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۴ پر لکھتا ہے:۔

"جہاں تک ہمیں علم ہے ۱۸۵۷ء تک ملی اختلاف کا وجود نہ تھا۔ جب فوجوں میں بغاوت شروع ہوئی تو ہر مقام کے سپاہی اپنی چھاؤنی میں آگ لگا کر اور برباد کر کے دہلی کے معزول اور معطل بادشاہ کی طرف دوڑ پڑے یہ سپاہی بہار تک سے آئے تھے اُن میں ہر ایک مذہب و ملت کے ہندوستانی تھے۔ ہندو سپاہی بادشاہ کی جے پکارتے تھے اگر موجودہ زمانہ کے سے تعصبات اس وقت ہوتے تو مسلمان سپاہی مسلمان بادشاہ یا نواب کے پاس جاتے اور ہندو سپاہی کسی راجہ کے پاس جاتے مگر سب کے سب بلا تفریق مذہب و ملت۔ معزول اور بے جان مسلمان بادشاہ کے گرد جمع ہو گئے" (حکومت خود اختیاری ص ۵۴)

مگر افسوس کہ انگریزوں نے تیرہ سو برس کا تاریخی بغض "عیسائیت اور اسلام"

کا پھیلا کر مسلمانوں کو عموماً برباد کیا۔ اور اس قدر ظلم اور وحشت کا برتاؤ کیا جس کی نظیر کبھی ہندوستان بلکہ دنیا میں نہیں پائی گئی۔ ہنری ہیرنگٹن طامس جو کہ بنگال کا سویلین تھا اپنے رسالہ (ہندوستان میں گزشتہ بغاوت اور ہماری آئندہ پالیسی) میں (خلاف واقع) لکھتا ہے:۔

"میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصل محرک ہندو نہ تھے اور اب میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہندو اگر وہ اپنی مرضی اور ذرائع تک محدود ہوں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہ کر سکتے تھے نہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ (مسلمان) خلیفہ اوّل کے وقت سے موجودہ زمانہ تک یکسانیت کے ساتھ مغرور غیر روادار اور ظالم رہے ہیں ہمیشہ ان کا مقصد یہ رہا ہے کہ جس ذریعہ سے بھی ہو اسلامی حکومت قائم ہو اور عیسائیوں کے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشوونما ہو۔ مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے اس لئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں۔ غالباً اسی خیال سے انگریزوں نے غدر کے بعد مسلمانوں کو پھانسیاں دینے اُن کی جائدادیں ضبط کرنے اور ہر طرح انہیں برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔" (حکومت خود اختیاری ص ۵۵-۵۶)

بہر حال مسلمان علماء میں سے مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ مدراسی اور مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی مفتی صدر الدین صاحب آزردہ صدر الصدور۔ قاضی فیض اللہ دہلوی۔ مولانا فیض احمد صاحب بدایونی مولوی عبدالقادر صاحب مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سیّد مبارک شاہ صاحب رامپوری مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی کوئلی۔ سیّد اسمٰعیل صاحب منیر شکوہ آبادی، مفتی مظہر کریم صاحب دریابادی، مولانا لیاقت علی صاحب الٰہ آبادی۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی، حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی اور ان حضرات کے تلامیذ وغیرہ نے جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں بڑے پیمانہ پر حصّہ لیا تھا۔

باقیماندہ مسلمان علماء اور مجاہدین کا معاملہ

جنرل بخت خاں صاحب ڈاکٹر وزیر خاں صاحب مولوی فیض احمد صاحب معہ اپنے ماتحتوں اور فوجیوں کے حالت خطرناک دیکھ کر دہلی سے نکل کر لکھنؤ چلے گئے تھے اور مولوی احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور وہاں انگریزوں کی فوج سے خوب مقابلے کئے مگر اپنوں ہی کی غداریوں سے شکست کھانی پڑی اس لئے جب حالت خطرناک دیکھی تو شاہجہان پور کو روانہ ہو گئے محمدی پور میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ نانا صاحب پیشوا، مولوی عظیم اللہ صاحب کانپوری شہزادہ فیروز شاہ وغیرہم سب یہاں جمع ہو گئے۔ آخری جنگ انگریزوں سے شاہ جہاں پور میں ہوئی۔ یہاں بھی مختلف وجوہ سے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور یہ سب لوگ نیپال چلے گئے۔ مولوی احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ کو راجہ پوائین بلدیو سنگھ نے دعوت کے بہانہ سے بلا کر دھوکہ سے ۱۵/ جون ۱۸۵۸ء مطابق ۲/ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ میں شہید کر دیا۔ یہ شخص انگریزوں سے ملا ہوا تھا انہیں کے اشاروں پر اُس نے یہ شرمناک معاملہ کیا۔

مولانا فضل حق صاحب کا معاملہ

۱۹/ ستمبر کو دہلی میں انگریزوں کا تسلّط ہوا تو مولانا دہلی ہی میں تھے۔ انگریزوں کے قبضہ کے بعد پانچ دن تک بھوکے پیاسے مکان کے اندر بند رہے پانچویں روز اہل و عیال کو لے کر معمولی سامان شب میں چھپ کر نکلے۔ دریا عبور کیا۔ میدان قطع کئے اور بھیکن پور ضلع علی گڑھ تشریف لائے وہاں ۱۸ روز قیام فرمایا۔ صاحبزادہ مولانا عبدالحق صاحب بھی ساتھ تھے۔ ۱۸ یوم کے بعد نواب عبدالشکور خاں صاحب رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو کہ بھیکن پور سے ۸ میل ہے اور نواب صاحب اور ان کے عزیزوں کی عملداری میں واقع تھا اپنے انتظام سے بدایوں اور بریلی کی طرف اُتروا دیا۔ بخیر و عافیت وطن مالوف پہنچ گئے ۱۸۵۹ء میں مولانا کو انگریزوں نے باغی قرار دیا۔ ماخوذ ہو کر سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے اور باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا۔

صاحب سیر العلماء لکھتا ہے۔

"۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتا پور سے لکھنو لائے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مولانا

موصوف کے فیصلہ کے لئے جیوری بیٹھی ایک اسیسر نے واقعات سُن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لُطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کئے اور پھر خود ہی مثل تارِ عنکبوت عقلی و قانونی اَدِلّہ سے توڑ دیئے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور اُن سے ہمدردی بھی تھی جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا وہ مولانا کی عظمت و تبحر سے بھی واقف تھا وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے۔ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے سرکاری وکیل لاجواب تھے۔

دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اُوپر جس قدر الزام لئے تھے ایک ایک کرکے سب رد کر دیئے جس مخبر نے فتویٰ کی خبر کی تھی اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی فرمایا کہ،۔

"پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہُوا ہے۔ اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"

جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مخبر نے عدالت کا رُخ اور علامہ کی بارعب و پُروقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضلِ حق نہیں وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسنِ صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا۔ مگر علامہ کی شان استقلال کے قربان جائیے۔ خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے۔

"وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہُوا ہے، اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"

نالہ از بہر رہائی نکند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود!

شیر میسور سلطان ٹیپو کے رزمگاہ شہادت کا یہ فقرہ کبھی نہیں بُھلایا جا سکتا "شیر کی ایک روزہ زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے" علامہ کے اقرار و توثیق کے بعد گنجائش ہی کیا رہ گئی تھی۔ بجبر رنج کے ساتھ عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا آپ نے کمال مسرت

اور خندہ پیشانی سے سُنتا۔ علاّمہ کے اُستاد بھائی اور رفیق خاص مفتی صدرالدین صاحب آزُردہ صدرالصدور نے بھی علامہ کی خاطر سے فتویٰ پر شہادت بالجبر لکھ کر دستخط کر دیئے تھے۔ گرفتاری کے بعد مفتی صاحب نے بتایا کہ میں نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ جبراً دستخط کرنا پڑ رہے ہیں۔ بالجبر پر نقطے نہ لگائے تھے۔ علمائے وقت نے اُسے بالخیر پڑھا اور مفتی صاحب نے بالجبر بتا کر جان چھڑائی۔ البتہ جائداد و املاک کا کافی حصّہ ضبط کر لیا گیا۔ آخرش جزیرۂ انڈمان روانہ کر دیئے گئے۔

(الثورۃ الہندیہ از ص۱۶۸ تا ص۱۷۲)

صاحبزادگان مولانا عبدالحق صاحب اور مولوی شمس الحق صاحب نے اپیل لندن میں دائر کر دی تھی۔ خواجہ غلام غوث صاحب میر منشی لفٹنٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ سرگرم سعیٔ تھے۔ بالآخر ولایت سے رہائی کا حکم آگیا اُس کو لے کر مولوی شمس الحق صاحب جزیرہ انڈمان روانہ ہو گئے۔ جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو مولانا فضل حق صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازہ حاضر ہے۔ بصد حسرت و یاس شریک دفن ہوئے اور بے نیل مرام واپس ہوئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ و رضی عنہ و ارضاہ آمین۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی رحمہم اللہ تعالیٰ کے واقعات

مخبروں کی ریشہ دوانیوں سے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز اور ان کے دونوں خلفاء حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ حضرت حاجی صاحب ہندوستان سے بقصد مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں مختلف مقامات پر جہاں پہلے سے تعلقات تھے ٹھہرتے جاتے تھے مگر جاسوس پیچھے لگے ہوئے تھے راستہ میں مختلف واقعات عبرتناک پیش آئے۔ پنجلاسہ (پنجاب) میں مقیم تھے۔ کسی نے حکومت کے یہاں مخبری کر دی (اس زمانہ میں باغیوں کی تفتیش اور دار و گیر بہت سختی سے ہو رہی تھی) کہ حضرت حاجی صاحب فلاں شخص کے اصطبل میں مقیم ہیں۔ کلکٹر ضلع جو کہ انگریز تھا خود سوار ہو کر آدھی رات کے قریب اصطبل کے دروازہ پر پہنچ گیا۔ اور

کواڑ کھلوانے چاہیے۔ بڑے بھائی نے جو کہ مالک مکان تھے انگریز سے کہا کہ آپ نے اس وقت کیوں تکلیف فرمائی۔ کلکٹر نے کہا کہ گھوڑے دیکھنے کے لئے آیا ہوں کواڑ کھولو چنانچہ کواڑ کھولے گئے۔ دیکھا تو بستر لگا ہوا ہے اور سب سامان لیٹنے کا درست ہے لیکن حضرت حاجی صاحب موجود نہ تھے۔ ادھر اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہ لگا۔ مالک مکان سے پوچھا کہ یہ بستر کس کا ہے۔ اُس نے کہا کہ میرے چھوٹے بھائی کا ہے۔ مگر خوف کے مارے پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ لیکن انگریز نے اور کچھ نہ پوچھا اور گھوڑوں کو دیکھتے ہوئے واپس ہو گیا۔ (غالباً حضرت کو کشف سے یہ حال آمد انگریز کا معلوم ہو گیا ہو گا کہ پہلے سے تشریف لے گئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت بھی وہاں ہی تشریف رکھتے ہوں اور اللہ تعالےٰ نے ابصار سے پوشیدہ فرما دیا ہو کما فسر بعضہم قولہ تعالیٰ وجعلنا بینک وبین الذین لا یؤمنون بالاخرۃ حجابا مستورا (الآیۃ) امداد المشتاق ص ۱۷۳ و ص ۱۷۴

(اسی پنجلاسہ کا دوسرا واقعہ) تینوں حضرات (حضرت حاجی صاحب، مولانا گنگوہی رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکا ہے اور گرفتار کنندہ کے لئے صلہ (انعام) تجویز ہو چکا ہے۔ لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ و دو میں پھرتے ہیں اور حضرت حاجی صاحب راؤ عبد اللہ خاں رئیس پنجلاسہ کے اصطبل خانہ کی ایک اندھیری کوٹھڑی میں مقیم ہیں۔ چاشت کی نماز کا وقت ہے (یعنی ۹ یا ۱۰ بجے صبح کا) ایک روز اسی کوٹھڑی میں وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادہ سے مصلّیٰ بچھایا اور جاں نثار حضار جلسہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیں میں نفلیں پڑھ لوں راؤ عبد اللہ خاں اعلیٰ حضرت کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید ہیں۔ گھر کے خوشحال زمیندار اور سرکار کے نزدیک باوجاہت شخص سمجھے جاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ حضرت پر جو الزام لگایا گیا ہے اس کے قائم ہوتے ہوئے حضرت کے لئے اپنا مکان کھول دینا دنیاوی حیثیت سے کس درجہ خطرناک ہے۔ کیونکہ باغی کی اعانت بھی سرکاری بغاوت میں شمار ہے مگر اسکے ساتھ ہی غلبہ حب دین اور فرط عشق میں اس درجہ مغلوب تھے کہ نہ مال کی پرواہ تھی نہ جان کی۔ خدا کی شان کہ جس وقت راؤ عبد اللہ خاں حضرت کو تحریمہ باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھڑی سے باہر نکلے اور پٹ بند کر کے اصطبل کے دروازہ کے قریب پہنچے ہیں تو سامنے سے دوش کو آتے دیکھا اور ہکا بکا کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ خدا جانے مخبر کون تھا

تھا اور کس بلا کا پتلا تھا جس نے عین وقت پر روپوشی کی کوٹھری تک معین کر دی تھی۔ چنانچہ دوش اصطبل کے پاس پہنچی اور افسر نے مسکرا کر راؤ صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں گویا اپنے آنے کی وجہ کو چھپایا جہاں دیدہ و تجربہ کار راؤ صاحب دور ہی سے تاڑ گئے تھے کہ ”ایں گل دیگر شگفت“، مگر نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن، اپنی جان یا عزت کے جانے، ریاست و زمینداری کے ملیامیٹ ہونے اور ہتھکڑیاں پڑ کر جیلخانہ پہنچے یا پھانسی پر چڑھ کر عالم آخرت کا سفر کرنے کی تو مطلق پرواہ نہ تھی اگر فکر و رنج یا حزن و افسوس تھا تو یہ کہ ہائے غلام کے گھر سے اور آقا گرفتار ہو اور عبداللہ خاں کے گھر میں اس کا جان سے زیادہ عزیز شیخ پابہ زنجیر کیا جائے مگر اس کے ساتھ ہی راؤ صاحب ایک جوانمرد مستقل مزاج نہایت دلیر قوی القلب راجپوت تھے۔ تشویش کو دل میں دابا اور چہرہ یا اعضاء پر کوئی بھی اثر اضطراب کا محسوس نہ ہونے دیا۔ مسکرا کر جواب دیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ دوش کا افسر گھوڑے سے اُترا اور یہ کہہ کر ”میں نے آپ کے یہاں ایک گھوڑے کی تعریف سُنی ہے اس لئے بلا اطلاع یکایک آنے کا اتفاق ہوا“۔ اصطبل کی جانب قدم اٹھائے۔ راؤ صاحب بہت اچھا کہہ کر ساتھ ساتھ ہو لئے اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ گھوڑوں کی سیر کرانی شروع کی۔ افسر بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نگاہ جماتا اور اس درجہ مطمئن پا کر کبھی مُخبر کی دروغگوئی کا غصہ اور گاہے اپنی ناکامی و تکلیف سفر کا افسوس لاتا تھا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا حاکم اُس حجرہ کی طرف بڑھا جس میں اعلیٰ حضرت کی سکونت کا مُخبر نے پورا پتہ دیا تھا اور یہ کہہ کر ”اس کوٹھڑی میں کیا گھاس بھری جاتی ہے“، اس کے پٹ کھول دیئے۔ راؤ عبداللہ خاں کی اس وقت جو حالت ہوئی ہوگی وہ انہیں کے دِل سے پوچھنا چاہیئے۔ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے آخری فیصلہ کا وقت آگیا اور پیمانۂ حیات لبریز ہو کر اچھلا چاہتا ہے اس لئے راضی برضاء الٰہی ہو کر جی ہاں کہا اور حکم گرفتاری کے منتظر کھڑے ہو گئے۔ خداوندی حفاظت کا کرشمہ دیکھئے کہ جس وقت کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہے تخت پر مصلیٰ ضرور بچھا ہوا تھا۔ لوٹا رکھا ہوا اور نیچے وضو کا پانی البتہ بکھرا ہوا پڑا تھا۔ مگر اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کا پتہ بھی نہ تھا۔ افسر متحیر و حیران، اور راؤ عبداللہ خاں دل ہی دل میں شیخ کی عجیب کرامت پر فرحاں و شاداں، کچھ عجیب سماں تھا کہ حاکم نہ کچھ دریافت کرتا نہ استفسار، کبھی اِدھر دیکھتا ہے کبھی اُدھر آخر مُخبر کی دھوکہ دہی

سمجھ کر بات کو ٹالا اور کہا کہ خاں صاحب یہ لوٹا کیسا اور پانی کیوں پڑا ہے۔ راؤ صاحب بولے جناب اس جگہ ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور وضو میں منہ ہاتھ دھویا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی آپ کے آنے سے دس منٹ قبل اسی کی تیاری تھی۔ افسر نے ہنس کر کہا آپ لوگوں کی نماز کے لئے تو مسجد ہے یا اصطبل کی کوٹھڑی۔ راؤ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ جناب مسجد فرض نماز کے لئے ہے اور نفل نماز ایسی ہی جگہ پڑھی جاتی ہے جہاں کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ جوابِ لاجواب سن کر افسر نے پٹ بند کر دیئے اور اصطبل کے چاروں طرف غائر نظر دوڑانے کے بعد باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو یہ کلمات کہہ کر رخصت ہوا "راؤ صاحب معاف کیجئے آپ کو اس وقت ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑی اور پھر بھی ہمیں کوئی گھوڑا پسند نہ آیا"۔ راؤ عبداللہ خاں کی نظر سے دوش کے سوار جب اوجھل ہوئے تو واپس ہوئے اور کوٹھڑی کھول دی۔ دیکھا کہ اعلیٰ حضرت سلام پھیر چکے اور مصلے پر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔ (امداد المشتاق ص ۲۹-۳۰ از تذکرۃ الرشید ص ۷۶)

اس قسم کے متعدد واقعات حضرت حاجی صاحب اور مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی قدس اللہ اسرارہم کے پیش آتے رہے اور باوجود سخت احکام اور مخبروں کی دوا دوش اور خود غرضوں اور دشمنوں کی انتہائی جدوجہد کے تینوں حضرات محفوظ رہے۔ کسی کا بال بیکا نہ ہوا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ غالباً گڑھی پختہ ضلع مظفر نگر میں جو کہ اس زمانہ میں ضلع سہارنپور میں تھا ایک رئیس کے یہاں جو کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں سے تھے مقیم تھے۔ مخبر نے افسر اعلیٰ انگریز کو خبر دی۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس انگریز کو حکم لکھا کہ تم فوراً چند سواروں کو لے کر پہنچو۔ چونکہ اس علاقہ کے تھانیدار خواجہ احمد حسن صاحب مرحوم سہارنپوری والد ماجد خواجہ اطہر صاحب سہارنپوری ایڈووکیٹ کے والد ماجد تھے اور ان کو حضرت حاجی صاحب سے عقیدت تھی اس لئے یہ تاکید کر دی کہ تھانیدار کو نیچے کی سطریں جن میں موضع اور رئیس کا نام درج تھا مت دکھانا فقط اوپر کی سطریں جن میں سپرنٹنڈنٹ کو حکم تلاشی لینے کا اور تھانیدار کو حکم سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ جانے کا تھا دکھلانا (اس خوف سے کہ چونکہ تھانیدار ہندوستانی اور مسلمان ہے ممکن ہے کہ فورس کی روانگی سے قبل خفیہ طور سے کہیں اطلاع نہ کر دے) چنانچہ سپرنٹنڈنٹ تھانہ میں پہنچا اور کہا کہ میرے ساتھ فورس لے کر فوراً چلو خواجہ صاحب

نے جگہ اور مکان کو پوچھا تو اُس نے وہی اوپر کی سطریں دکھلائیں اور نیچے کی سطریں نہیں دکھلائیں اور ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ خواجہ صاحب فورس لے کر ساتھ چل دیئے جب گاؤں میں پہنچے تو سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو فلاں شخص کے مکان پر جانا ہے۔ آواز اُن کی بہت بلند تھی۔ گاؤں کے اندر داخل ہوتے سے پہلے بلند آواز سے اُس رئیس کو گالیاں دینی شروع کیں اور کہا کہ تو سرکار کا نمک حرام اور باغی ہے ہم تجھ کو پکڑیں گے وہ کریں گے تو باغیوں کو اپنے یہاں رکھتا اور پناہ دیتا ہے۔ یہ آواز اُن کے پہونچنے سے پہلے پہنچ گئی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ رات کا وقت تھا۔ مکان پر پہنچے اور دروازہ کھلوایا۔ مردانہ اور زنانہ مکان کی تلاشی لی۔ مکان کا محاصرہ کرلیا۔ مگر حضرت حاجی صاحب نہ ملے کیونکہ آواز کے پہنچتے ہی حضرت حاجی صاحب کو دوسرے مکان میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ باوجود شدت تلاشی کے ناکام واپس آئے۔ ایک دوسرے گاؤں میں اسی طرح واقعہ پیش آیا۔ بالکل بے خبری میں دوش پہنچ گئی۔ فوراً حضرت کو ایک رزائی اوڑھاکر مردانہ ہی مکان میں لٹا دیا گیا تھا۔ افسر کو زنانہ مکان کے متعلق زیادہ شبہ تھا اُس نے کہا کہ میں تمہارے مکان کی تلاشی لوں گا۔ مالک مکان نے کہا کہ حضور چلیئے یہاں کوئی مشتبہ چیز یا شخص نہیں ہے اندر لے گیا اور لے جاتے ہوئے اپنے لوگوں سے بلند آواز سے کہا کہ اس بڈھے بیمار کو چارپائی سمیت کہیں کھیت میں ڈال آؤ۔ اُس نے کھانس کھانس کر اور کھنگار نکال نکال کر تمام مکان گندہ کر دیا ہے۔ وہ مکان میں معہ افسر داخل ہوا اور گاؤں والے چارپائی مثل جنازہ اُٹھاکر گاؤں کے باہر کھیت میں ڈال آئے۔ حصار کرنے والی پولیس نے سمجھا کہ یہ تو کوئی واقع میں قریب المرگ ہے تعرض نہ کیا۔ حضرت وہاں جاکر دوسرے مکان میں چلے گئے اور افسر معہ فورس باوجود سخت تفتیش ناکام واپس ہوئے۔ بہرحال فضلِ خداوندی شامل حال تھا۔ اس قسم کے متعدد واقعات پیش آتے رہے مگر ہر جگہ حکومت کو ناکامی ہی رہی۔ اور حضرت حاجی صاحبؒ صحیح وسالم مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ صاحب امداد المشتاق صـ۲۲ پر لکھتا ہے۔

درحال۔ ایامِ غدر ہندوستان میں بوجہ بے نظمی دین وتغلب معاندان دین قیام ہند گراں خاطر ہوا اور ارادہ سابقہ ہجرت واشتیاق بالغہ زیارت روضہ حضرت رسالت پناہ صلے اللہ علیہ وسلم

جوش و خروش میں آیا اور ۱۲۷۶ھ میں براہ پنجاب روانہ ہوئے اور اثناء راہ میں پاک پٹن و حیدرآباد سندھ وغیرہ مواضع میں زیارت بزرگان مقامات مذکور سے مشرف اور فیوض و برکات سے مالا مال ہوتے ہوئے کراچی بندر پہنچے وہاں سے جہاز پر سوار ہوئے اور انوار و برکات ہجرت ابتدائی سفر سے مشاہدہ فرمانے لگے اور بعد طے منازل خیر البلاد مکہ معظمہ پہنچے اور انوار و برکات اس مقام متبرک سے فیضیاب ہوئے اور اس مقام مقدس کو مسکن و ماوی بنایا۔

الحاصل عنایات خداوندی شامل حال رہیں اور اس طویل سفر میں محفوظ و مصئون رہ کر انگریزی حدود سے نکل گئے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ وارنٹ کے بعد تین دن تک بتقاضائے احباب و اعزہ روپوش رہے اس کے بعد مکان سے باہر نکل آئے لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف تین دن تک غارِ حرا میں رُوپوش رہے ہیں وہ سُنّت پوری ہو گئی۔ اب روپوش ہونا خلافِ سُنّت ہو گا کسی کی نہ مانی اور قرب و جوار کے مواضع میں کبھی نانوتہ میں کبھی دیوبند میں کبھی انبہٹہ میں کبھی رامپور منہیاران میں کبھی آبادی میں کبھی جنگل میں پھرتے رہے ہر جگہ دشمن بھی تھے اور دوست بھی۔ ہر قسم کی کوششیں جاری تھیں مگر حفاظت الٰہی ساتھ ساتھ تھی کوئی کامیاب نہ ہوا چھتہ کی مسجد میں دیوبند میں اکثر رہا کرتے تھے ایک مرتبہ مسجد میں تھے کہ دوش آگئی۔ آپ اپنی جگہ سے کچھ ہٹ گئے۔ افسر مسجد میں داخل ہوا اور پوچھا کہ مولوی قاسم کہاں ہیں۔ آپ پہلی جگہ کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ ابھی تو یہاں تھے دیکھ لو کہیں مسجد میں ہی ہوں گے وہ ڈھونڈنے دوسری طرف گیا آپ مسجد کے دوسرے دروازہ سے نکل کر جنگل کو چلے گئے۔ اُس نے اور سپاہیوں نے مسجد میں چاروں طرف کونے کونے کو اور حجروں کو خوب دیکھا مگر نہ ملے اس طرح ہر جگہ پر مخبریاں ہوتی رہیں اور دوشیں آتی رہیں مگر مولانا ہاتھ نہ آئے البتہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کے شبہ میں گرفتار کر لئے گئے مولانا محمد یعقوب صاحب ایام انقلاب میں اجمیر شریف میں تھے پہلے ہی سے وہاں ملازم تھے جس وقت یہ جہاد اور اس کی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ وہ وہاں ہی تھے امن ہونے کے بعد اپنے وطن نانوتہ میں پہنچے چونکہ بہت بڑے عالم اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

کے قریبی رشتہ دار اور اُستاد زادہ اور ہم درس تھے اس لئے لوگ ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے مخبر نے اُن کی رپورٹ کر دی۔ دوش آئی اور مولانا محمد قاسم سمجھ کر گرفتار کر کے لے گئے۔ اس پر مولانا محمد یعقوب صاحب کو بہت غصہ تھا اور فرمانے لگے کہ جو لوگ ان تمام کارروائیوں میں شریک تھے انہوں نے جہاد کیا تھا وہ تو آزاد پھر رہے ہیں اور میں جو کہ یہاں تھا بھی نہیں نہ میں نے اس میں کوئی حصہ لیا مجھ کو گرفتار کیا گیا ہے یہ مجھ کو تنبیہ ہے کہ تو نے کیوں جہاد میں شرکت نہ کی۔ بہر حال تحقیق و تفتیش کے بعد اُن کو رہا کر دیا گیا۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنی جگہ گنگوہ شریف سے نہیں ٹلے۔ بالآخر گرفتار ہوئے اور گنگوہ سے سہارنپور اور وہاں سے مظفر نگر لائے گئے۔ آپ پر علاوہ شرکت جہادِ شاملی یہ بھی الزام تھا کہ سپاہیوں کی رائفل اُن کے پاس ہے آپ نے دونوں سے بالفاظ تو ریہ انکار کیا۔ حاکم نے پوچھا کہ تم نے خلاف گورنمنٹ ہتھیار اٹھایا آپ نے فوراً جیب سے تسبیح نکالی اور فرمایا کہ یہ میرا ہتھیار ہے اس نے کہا کہ وہ بندوق کہاں ہے آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بندوق سے کیا سروکار۔ غرضیکہ اُس کے تمام الفاظ کا جواب اسی طرح دیتے رہے۔ جب اُس کی مقصد بر آری نہیں ہوئی تو اُس نے سپاہیوں کو حکم کیا کہ ننگی تلواریں لے کر اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ۔ آپ کے ماموں مولانا محمد شفیع صاحب گنگوہی جو کہ پنجاب میں عرصۂ دراز تک ملازم گورنمنٹ رہ چکے تھے ہتھکڑیاں اور انگریز حاکم کی سختیاں اور دھمکیاں دیکھ کر پہلے ہی سے سراسیمہ ہو رہے تھے۔ اس حکم کو سن کر سخت پریشان ہو گئے۔ آپ کو علیحدہ لے جا کر کہنے لگے بیٹا بتلا دے کہ وہ بندوق کہاں ہے۔ بندوق کے مل جانے پر حاکم تجھ کو چھوڑ دے گا۔ وہ بندوق اب کیا کام آئے گی۔ دیکھ ننگی تلواروں کا تجھ پر پہرہ بٹھا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ماموں جان آپ گھبرائیے نہیں ایک تلوار نہیں سیکڑوں تلواروں کا بھی اگر پہرا قائم کر دیا جائے تو کیا خوف ہے۔ بندوق کا بتانا الزام کو سر پر لینا ہے اس کو سن کر وہ بھی چپکے ہو گئے۔ الغرض جب آپ ان تمام تخویفات اور دھمکیوں سے متاثر نہیں ہوئے اور نہایت استقلال سے جوابات دیتے رہے۔ سپاہی ننگی تلواروں سے آپ پر پہرہ دیتے رہے تو آپکو مظفر نگر جیل میں بھیجدیا گیا اور شہادتوں کے حصول کے لئے پولیس اور حکومت کوشش کرتی رہی تاکہ ثبوت بہم

پہنچا کر مقدمہ چلایا جائے۔ ماموں صاحب مرحوم جو کہ گنگوہ سے اسی اعلان اور ارادہ پر نکلے تھے اور ساتھ تھے کہ مولوی رشید احمد جب تک رہا نہ ہو جائیں گے میں گنگوہ واپس نہ ہونگا۔ انہوں نے ضمانت پر رہائی کی درخواست کی حاکم نے تین ہزار کی تین سال کیلئے ضمانت طلب کی تین شخص ضمانت مطلوبہ کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر حاکم نے قبول کرنے سے اس حیلہ سے انکار کر دیا کہ یہ سب گنگوہ کے باشندہ نہیں ہیں ان کی ضمانت قانوناً درست نہیں۔ صاحب امداد المشتاق صـ۱۵۳ پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی نقل کرتے ہیں۔

"جب میں قید خانہ میں تھا تو میری تین سال کے لئے تین ہزار کی ضمانت طلب ہوئی تھی چنانچہ تین شخص ضامن ہوئے لیکن انگریز سخت مزاج تھا اُس نے یہ کہہ کر کہ تینوں گنگوہ کے باشندے نہیں ہیں، ضمانت نامنظور کر دی۔ ماموں صاحب نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس کو نہ چھڑا لوں گا گنگوہ نہ آؤں گا۔ چنانچہ وہ ساعی تھے۔ اسی اثنا میں ہمارے حضرت گنگوہ تشریف لائے اور یہاں خبر تھی کہ میں اب رہا ہوا، اب رہا ہوا۔ حضرت (حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز) نے فرمایا چھوٹنے میں ابھی دیر ہے۔ ہم اس سے مل آئے ہیں۔ انہیں ایام میں کہ میں قید خانہ میں تھا خواب میں آپ تشریف لائے، گویا میرے پاس تشریف رکھتے ہیں اور تسلی فرماتے ہیں۔ پھر حضرت یہاں سے تشریف لے گئے اور میں ایک ماہ بعد چھوٹ آیا۔"

(امداد المشتاق صـ۱۵۳ از تذکرۃ الرشید صـ۲۶۹)

قید ہونے کے اوائل زمانہ میں ہی مشہور ہو گیا تھا کہ مولانا رشید احمد صاحب کو پھانسی دے دی جائے گی اور انگریزوں کی بوکھلاہٹ بھی اسی کی موید تھی۔ ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو پھانسی دینا، گولی سے اڑا دینا انگریزوں کے یہاں اُس زمانہ میں نہایت معمولی بات تھی اس کے لئے جرم اور اس کے ثبوت کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ اپنے رعب کے جمانے بلکہ پھانسی دیئے ہوئے ہندوستانی انسان کے تڑپنے کا تماشہ دیکھنے کے لئے بھی بیشمار پھانسیاں دی گئی تھیں جیسی کو مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے بھی انگریزوں کے ہی حوالوں سے نقل کیا ہے تو حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر بغاوت وجہاد وغیرہ کا الزام جب کہ تھا ہی تو کس کو یقین ہو سکتا تھا کہ مولانا کی براءت ہو جائے گی۔ تمام تھانہ بھون کو اُجاڑ ہی

دیا گیا تھا بار بار تلاشیاں رام پور، گنگوہ، تھانہ بھون، اور ہر مشتبہ آبادی کی ہو رہی تھیں۔

انقلاب آزادی اور فتویٰ جہاد اور شاملی پر چڑھائی میں شرکت وغیرہ امور سب کو معلوم تھے اس لئے سب کو یہی خیال تھا کہ جب کہ گرفتار ہو چکے ہیں تو انگریز بجز پھانسی دینے کے اور کوئی دوسری صورت عمل میں نہیں لائے گا جبکہ اس کا یہی عملی کارنامہ سب جگہ جاری ہے۔ اسی بناء پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی بہت تشویش تھی رسالہ امداد المشتاق صفحہ ۷۲ پر تحریر ہے۔

"حال یہ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب) سے ایک مرتبہ کسی شخص نے دریافت کیا تھا اعلیٰ حضرت (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) نے تو آپ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اطمینان رکھو میں عرب روانہ ہوتے وقت تم سے مل کر جاؤں گا مگر آپ گرفتاری و حوالات میں رہے۔ آپ کی رہائی سے قبل ہی اعلیٰ حضرت نے بیت اللہ کی جانب ہجرت فرمائی گویا سائل کا مطلب یہ تھا کہ ملاقات کے خوش کن الفاظ محض تسلی کے لئے تھے جس کا وقوع نہیں ہوا حضرت نے بہت ہی ہلکی آواز سے فرمایا "اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے" چنانچہ دوسرے طریق سے معلوم ہوا کہ باوجود سنگین پہرہ کے اعلیٰ حضرت نے جیلخانہ کے اندر قدم رکھا اور کئی گھنٹہ باتیں کر کے شب ہی میں واپس ہوئے اور عرب کو روانہ ہوئے۔ مولوی ولایت حسین صاحب کی روایت ہے کہ حکیم صاحب جو اعلیٰ حضرت کے مرید انبالہ کے رہنے والے بندہ کے ساتھ سفر حج میں شریک تھے فرمایا جس زمانہ میں مولانا گنگوہی جیلخانہ میں تھے۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ میاں کچھ سنا کیا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ خدام نے عرض کیا کہ حضرت کچھ پتہ نہیں۔ ابھی تک تو کوئی خبر آئی نہیں فرمایا ہاں حکم ہو گیا چلو۔ یہ فرما کر اٹھ کھڑے ہوئے حکیم صاحب کا بیان تھا کہ برسات کا زمانہ تھا مغرب کے بعد اعلیٰ حضرت اور میں غالباً مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی غرض تین آدمی چلے۔ شہر سے باہر نکل کر تھوڑی دور جا کر اعلیٰ حضرت گھاس کے قدرتی سبز مخملی فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر سکوت فرما کر گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا چلو مولوی رشید احمد کو کوئی پھانسی نہیں دے سکتا خدا تعالےٰ

کو ابھی ان سے بہت کام لینا ہے۔ چنانچہ چند روز بعد اس کا ظہور ہو گیا۔
والحمد للہ علی ذلک (امداد المشتاق صفحہ ۱۷۲،۱۲۰ از تذکرۃ الرشید صفحہ ۸۵)

یہ سب باطنی تصرفات تھے ورنہ ظاہری حیثیت سے کسی صاحب کی ان میں سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی مگر قدرت کو اُن سے کام لینا تھا اُن کی تعلیم و تربیت سے ایسے لوگ تیار کرانے تھے جو کہ بیدھڑک ہو کر بلا خوف و خطر میدان آزادی اور تحریک انقلاب میں جان کو ہتھیلی پر رکھ کر باوجود انگریز کے آہنی پنجہ اور انتہائی سفاکیت کے کود پڑیں۔ یعنی مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند مرحوم اور اُن کے تلامذہ اور متوسلین کو پیدا کرنا اور بنانا تھا اسلئے ان حضرات کو بچایا گیا اور ہر طرح حفاظت عمل میں لائی گئی جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے دشمن کے گھر میں پیدا کیا گیا اور اسی سے پرورش کرائی گئی اسی طرح مولانا محمود حسن صاحب کو انگریز کے زیر حکومت پرورش کرایا گیا حضرت کے والد ماجد انگریزی ملازم تھے۔ مسٹن گورنر یو، پی کہتا تھا کہ ہم اگر مولوی محمود حسن کو جلا کر خاکستر کردیں تو اس کی خاک بھی ہم سے نفرت کرے گی۔ مولانا سے مالٹا کی واپسی پر جبکہ مولانا انگریزوں کی قبائح کو ذکر کر رہے تھے بعض حاضرین مجلس نے کہا کہ حضرت انگریزوں میں کچھ اچھائیاں بھی ہوں گی تو فرمایا کہ ہاں ایک اچھائی ہے انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اُن کے کباب نہایت مزیدار ہوں گے۔

امداد المشتاق صفحہ ۱۲۵ میں ایک دوسرا واقعہ خود حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ العزیز سے نقل کیا ہے فرمایا کہ راؤ عبداللہ خاں صاحب (حضرت کے چچا پیر) مغرب کی نماز پڑھتے تھے اپنے بیٹے امیر علی خاں کو پکارنے لگے۔ امیر علی امیر علی! میرے خاوند (حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی شہید مرحوم) نے آج مجھ کو دکھایا ہے کہ جلبی میاں (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) کو مسجد میں بند کرکے قفل لگا دیا ہے اور مولوی رشید احمد کے ہاتھ میں کتاب دے کر درس کو کہہ دیا ہے۔ یہ بات حاجی میاں کو کہہ دو کہ وہ اس کا مطلب سمجھ لیں گے۔ مینوں (بزبان پنجابی مجھے) کچھ خبر نہیں ہے اس کا کشف پورا نکلا۔ مجھے تو مکہ مکرمہ میں کہ اشرف المساجد ہے مقید کردیا۔ ہند کا خواب و خیال بھی نہیں آتا اور مولوی رشید احمد صاحب کو کتاب دے کے مدرس بنادیا۔ ہمیشہ احادیث نبوی کا درس دیتے ہیں"! (امداد المشتاق صفحہ ۱۲۸)

الغرض یہ قدرت کے غیبی ہاتھ تھے جو کام کر رہے تھے۔ تاکہ دارالعلوم دیوبند وغیرہ مراکز علم وعمل قائم ہوں اور ان حضرات کی تعلیم و تربیت سے ہزاراں ہزار درجہ بدرجہ علماء وصلحاء وجود میں آئیں۔ دین اسلامی کا چاروں طرف چرچا ہو جائے۔ دشمنان اسلام کے ملعون ارادے اسلام کا چراغ بجھانے کے کامیاب نہ ہو سکیں۔ یہی قدرت کے غیبی ہاتھ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز امام مجاہدین تھانہ بھون اور حضرت مولانا نانوتوی سپہ سالار مجاہدین اور مولانا رشید احمد صاحب قاضی مجاہدین کو محفوظ رکھ رہے تھے۔ یہی حضرت حاجی صاحب مرحوم بعد میں مولانا محمود حسن صاحب کے پیر و مرشد بنے اور یہی مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی اُستاد اور مربی بنے۔ جن کی تعلیمات اور ارشاد و تربیت سے ایسا شیر دل انقلاب لانے والا مرد میدان ظاہر ہوا اور اُس نے انگریزوں کے قصر استبداد و مظالم کے آہنی قلعہ میں زلزلہ ڈال دیا۔ ایام تحریک خلافت میں ایک بزرگ نقشبندی صاحب کشف دیوبند آئے مولانا کا وصال ہو چکا تھا حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہو کر مراقب ہوئے دیر تک مراقبہ میں رہے۔ بعد کو فرمایا کہ میں نے مراقبہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت کی تحریک میں حکام کی سختیوں کا تذکرہ کیا تو حضرت نے مولانا محمود حسن صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مولوی محمود حسن عرش خداوندی کو پکڑے ہوئے اصرار کر رہے ہیں کہ انگریزوں کو جلد ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ واقعہ یہی ہے کہ مولانا مرحوم کی معنوی اور روحانی جدوجہد انگریزوں کے نکالنے اور ہند کو آزاد کرانے میں ظاہری اور مادی جدوجہد سے بدرجہا زائد اور فائق تھی۔ اس کو معنوی امور کے پرکھنے اور جاننے والے خوب سمجھتے ہیں۔ اسی معنوی جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ انگریز باوجود ہر قسم کی مادی قوتوں کے اور باوجود اس کے کہ ہندوستان کی آزادی اس کی عظیم الشان مصلحتوں کے لئے پیغام فنا تھی، ہندوستان سے چلا گیا۔ اور خود چھوڑ کر چلا گیا۔ ورنہ کسی کے قیاس اور گمان میں بھی نہ آتا تھا کہ وہ یہاں سے نکلیگا اور اگر نکلا بھی تو اسطرح بلا خون خرابہ کے بیک بینی و دوگوش یہاں سے منہ کالا کرے گا۔ قدرت کے مخفی ہاتھوں کی کارگذاریوں کو مادہ پرست ظاہر بیں اشخاص نہیں مانتے مگر واقعات عالم ان کو بعض حدود پر بیجا کر ماننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

ذٰلک تقدیر العزیز العلیم۔ قل اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علیٰ کل شیٍٔ قدیر۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

حضرات علماء دیوبند اور کانگریس کی تائید

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جو وحشیانہ مظالم اور جس درندگی کا مظاہرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سخت دل اور وحشی انگریزوں نے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ جاری کیا تھا اس سے برطانوی حکومت بھی متاثر ہونے سے باز نہ رہ سکی۔ وہاں کی ذمہ دار جماعتوں اور سمجھدار حکام کو ضروری معلوم ہوا کہ ہندوستان کی حکومت کی باگ اُن تجارت پیشہ لوگوں اور خود غرض حریصوں کے ہاتھ سے نکالنی ضروری ہے ورنہ تمام انگلش قوم اور برطانوی تاج دنیا بھر میں بدنام ہو جائیں گے اور تمدن و تہذیب کا دعویٰ نیست و نابود ہو جائے گا۔ نیز ملک ہندوستان قبضہ سے نکل جائے گا۔ کلایو اور ہسٹنگز وغیرہ کی سیاہ کاریوں کا بھانڈا کورٹوں میں پھوٹ چکا تھا جو کہ برٹش قوم کے لئے انتہائی سیاہ دھبہ تھا۔ انہیں امور کی بناء پر امریکہ قریبی زمانہ میں آزاد ہو چکا تھا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ تاج برطانیہ کمپنی سے ہندوستان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور وہاں ملکہ وکٹوریہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا جائے۔ نیز ہندوستانیوں کو اطمینان بخش امور کا یقین دلایا جائے تاکہ آئندہ اس قسم کی بغاوتوں اور بے چینیوں کا احتمال باقی نہ رہے[۱]۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں کوئن وکٹوریہ کا مشہور اعلان نافذ کیا گیا۔

---

[۱] ڈائرکٹران کمپنی نے عذر کیا کہ کمپنی کا بہت بڑا سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے تو قرار پایا کہ سرمایہ کا حساب کر کے کمپنی کو دے دیا جائے اور ہندوستان کو اس کے معاوضہ میں خرید لیا جائے حساب کیا گیا تو ثابت ہوا کہ پونے چار کروڑ پونڈ کمپنی کا سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے اُس کے دینے کا وعدہ کیا گیا۔ اور انگلستان سے قرض لے کر کمپنی کو ادا کر دیا گیا جس کو بطور قرض ہندوستان ہی کے کندھے پر رکھا گیا۔ اور سود در سود کی صورت میں وصول کیا جانے لگا۔ جبکہ تاج برطانیہ نے خریدا تھا تو ضروری تھا کہ شہنشاہی خزانہ سے سو پیہ ادا کیا جاتا

(باقی حاشیہ صفحہ پر)

مجرمین اور مشتبہین کے معاف کر دینے کا عام اعلان ہوا اور حسب قابلیت بلغیر تفرقہ مذہب و نسل و رنگت تمام عہدہ ہائے ملکیہ سب کو دینے کا اور سب کے ساتھ برابر کا برتاؤ کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ آئندہ کسی صوبہ یا ریاست پر حملہ کرنے اور اپنے مقبوضہ ملک کو بڑھانے کی مخالفت کی گئی اور اطمینان دلایا گیا کہ ہم کسی قطعۂ زمین کو اپنی ملکیت میں شامل نہ کریں گے نیز وعدہ کیا گیا کہ ہم ہندوستان کو ہمیشہ اپنا مقبوضہ ملک نہیں رکھنا چاہتے۔ جب بھی ہندوستانی باشندے حکومت کے قابل ہو جائیں گے ہم وہاں سے چلے آئیں گے وغیرہ وغیرہ۔

اعلان مذکور کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"اعلان ملکہ معظمہ بنام والیان و سرداران و جمہور انام ہند" جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ بفضل خدا خدیو مملکت گریٹ برٹن و آئرلینڈ و آبادی ہائے و مضافات واقع یورپ و ایشیا و افریقہ و امریکہ و آسٹریلیا کی طرف سے خاص و عام کی اطلاع کے لئے حسب تفصیل ذیل مشتہر کیا جاتا ہے کہ:۔

(ص۴۷۴ کا حاشیہ) جیساکہ ٹانگا نیکا وغیرہ میں عملاً کیا گیا تھا مگر ہندوستان کی بدقسمتی یہاں بھی رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔ صاحب علم المعیشۃ لکھتا ہے "ہندوستانی قرض عامہ کی بنیاد ۱۸۵۸ء سے پڑی جبکہ کمپنی سے ہندوستان خریدنے کی قیمت اور غدر فرو کرنے کے کل مصارف ہندوستان سے وصول کرنے قرار پائے اور یہ کل رقم بطور قرض عامہ انگلستان میں لے کر ہندوستان کے نام لکھ دی گئی۔ اور اُس روز سے آج کے دن تک ایک رقم کثیر بطور سود ہندوستان سے انگلستان وصول کر رہا ہے ذرا خیال تو کرو کہ گذشتہ نصف صدی میں ہندوستان کتنی رقم بطور سود انگلستان کو ادا کر چکا ہوگا" صفحہ ۱۶۷۔ دوسری جگہ لکھتا ہے "جب ۱۸۵۸ء میں اس کے (کمپنی کے) مقبوضات سرکار برطانیہ نے اپنے تخت میں لئے تو اس کو معاوضہ کیا دیا اور کیونکر دیا۔ کمپنی کا ہندوستان میں جس قدر روپیہ صرف ہوا تھا وہ سب قرض لے کر ادا کر دیا گیا اور یہ قرض ہندوستان کے نام لکھا گیا۔ جس پر اب تک ہندوستانی محاصل میں سے منجانب ہندوستان سود دیا جا رہا ہے گویا سرکار برطانیہ نے انگریزی کمپنی سے سلطنت ہند خریدی اور زر قیمت ہندوستانیوں نے ادا کیا ایسی خرید و فروخت کی مثال تاریخ عالم میں ملنا دشوار ہے ابھی حال میں یعنی ۱۹۰۰ء میں اسی طرح ایک انگریزی کمپنی سے سرکار برطانیہ نے نائیجیریا خریدا مگر قیمت خود اپنی جیب سے ادا کی۔ ہندوستان کی طرح اس کا بار نائیجیریا پر نہیں ڈالا جنوبی افریقہ میں جو برطانوی مقبوضات حاصل کئے گئے تو وہاں بھی آخر الذکر اصول برتا گیا۔ لیکن ہندوستان کی تو تمام دنیا سے بات ہی نرالی ہے۔ جو کچھ بھی ہو کم ہے" صفحہ ۵۸

(۱) واضح ہو کہ بوجہ کاملہ ہمارے اس ارادہ کا کہ ہم نے بصلاح و اتفاق رائے امرائے ملی و ملکی و مختاران عام حاضرین جلسہ پارلیمنٹ اس ارادہ کو مصمم کر لیا ہے کہ ممالک ہند کا انتظام جس کا انصرام آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو آج تک امانتاً مفوض تھا اپنے اہتمام میں لیویں پس اس قرطاس کی رو سے ہم اطلاع دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ بصلاح و اتفاق رائے مذکورہ بالا کے ہم نے انتظام ملک مذکور کا اپنے اہتمام میں لیا اور اس قرطاس کی رُو سے اپنی تمام رعایا کو جو قلمرو مذکور میں موجود ہیں تاکید فرماتے ہیں کہ ہماری اور ہمارے وارثوں اور جانشینوں کی وفاداری اور اطاعت کریں اور جس کسی کو ہم اپنے نام اور اپنی طرف سے ملک کے انتظام کے لئے وقت آئندہ مقرر کرنا مناسب سمجھیں اس کی فرمانبرداری کیا کریں اور جو فرزند ارجمند مقرر و معتمد علیہ مشیر خاص نواب چارلس جان والی اکاؤنٹ کیننگ صاحب کی وفاداری قابلیت اور فہم و فراست کی نسبت ہم کو اطمینان اور خاطر جمعی کلی حاصل ہے اس لئے ہم نے صاحب موصوف یعنی والی اکاونٹ کیننگ صاحب کو واسطے کرنے انتظام ممالک مذکورہ کے ہماری طرف اور ہمارے نام سے برعایت ہمارے احکام اور اُن آئین کے جو اس کے پاس معرفت ہمارے وزیر اعظم کے بھیجے جائیں قائم مقام اوّل اور ممالک مذکور کا گورنر جنرل مقرر کیا۔ اور جو لوگ بالفعل کسی عہدہ پر کیا ملکی اور کیا فوجی سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملمور ہیں اُن کو اس قرطاس کی رُو سے اپنے اپنے عہدہ پر بحال اور قائم فرماتے ہیں لیکن وہ ہماری ہماری مرضی آئندہ کے مطیع رہیں اور سب آئین و قوانین کی اطاعت کرتے رہیں جو آئندہ نافذ کئے جاویں گے (۲) اور والیان ہند کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جس جس عہد و پیمان کو خود آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیا یا اس کی اجازت سے منعقد ہوا اُن سب کو ہم پذیرا اور قبول کرتے ہیں اور اُن کا ایفاء بکمال احتیاط ہوتا رہے گا۔ اور یہ چشم داشت ہے کہ ان والیوں کی طرف سے بھی اسی طرح تعمیل ہوتی رہے گی۔ (۳) جو ملک بالفعل ہمارے قبضہ میں ہے اُسے زیادہ کرنا نہیں چاہتے اور جب ہم کو یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی شخص ہماری مملکت یا حقوق میں دست اندازی کرے تو ہم بھی پیشقدمی کی اپنی طرف سے بہ نسبت ملکیت یا حقوق اوروں کے اجازت نہ دیں گے اور والیان ہند کے حقوق و منزلت اور عزت مثل اپنے حقوق و منزلت اور عزت کے عزیز سمجھیں گے (۴) اور ہم کو آرزو ہے کہ والیان ہند اور ہماری رعایا کو بھی وہ سعادت اور حسن اخلاق کی ترقی حاصل ہو جو ملک میں صلح اور حسن انتظام

سے حاصل ہوتی ہے۔ جو لوازم بہ نسبت اپنی دوسری رعایا کے ہم پر واجب ہیں وہی لوازم بہ نسبت اپنی رعایائے ہند کے ہم اپنے ذمہ لازم بتائیں گے اور بفضل خدا وفاداری اور راستی کے ساتھ ہم لوازم مذکور کا لحاظ کرتے رہیں گے (۵) اگرچہ ہم کو مذہب عیسوی کے صدق کی نسبت یقین کلی حاصل ہے اور جو تسلی خاطر اس سے ہوتی ہے اس کا بکمال شکرگذاری اعتراف ہے تو بھی ہم کو نہ یہ منصب نہ یہ آرزو ہے کہ کسی نوعیت سے خواہ مخواہ اپنے عقیدہ کو تسلیم کرائیں بلکہ یہ حکم ہمارا اور شاہانہ مرضی ہے کہ نہ کسی اہل مذہب کی بوجہ ان کے مذہب کے تائید کی جائے اور نہ کسی کو بوجہ اس کے اعتقادات کے تکلیف دی جائے۔ بلکہ سب رعیت کی موجب قانون کے بغیر طرفداری حفاظت ہوتی رہے اور جو لوگ ہمارے فرمان پذیر انتظام ملک ہند کے لئے مامور ہیں ان کو بکمال تاکید ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے کسی رعیت کے اعتقاد اور عبادت مذہبی کی نسبت دست اندازی والا ہمارا نہایت موجب غضب ہوگا (۶) اور یہ بھی ہمارا حکم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہماری سب رعیت کو گو کسی قوم اور مذہب کی ہو بلا تعرض و طرفداری کے ہماری ملازمت میں اور عہدوں پر جنکو دے اپنی علمیت اور قابلیت اور دیانت سے انجام دے سکتے ہوں مقرر کرتے ہیں (۷) اس کا ہم کو بخوبی علم ہے کہ اہل ہند اس اراضی کو جو ان کے بزرگوں سے انہیں وراثتاً پہنچی ہے بہت عزیز رکھتے ہیں اس لئے ہم کو بھی اس کا بڑا لحاظ ہے بلکہ چاہتے ہیں کہ یہ حقوق ان کے جو اراضی سے متعلق ہیں بشرط ادا کرنے مطالبہ سرکاری کے محفوظ رہیں اور ہمارا حکم ہے کہ بوقت تجویز و نفاذ قانون کے عموماً حقوق قدیمی اور ملک کے رسم و رواج پر لحاظ کامل ہوتا رہے (۸) یہ اجتماع اس حال کے بعض مفسدین نے جھوٹ موٹھ افواہیں اڑا کر اپنے ہم وطنوں کو ورغلا کر ان سے بغاوت فاش کرائی اور ملک ہند پر ایک بلا نازل کرائی۔ ہم کو نہایت افسوس ہوا اور ہمارے اقتدار کی کیفیت تو لوگوں کو فرو کرنے فساد باغیوں میں بیچ میدان کارزار کے معلوم ہوگئی ہے۔ لیکن اب ہمارا یہ منشا ہے کہ ان لوگوں کو عفو جرائم کر کے جو اس طرح دھوکا کھا گئے ہیں اور پھر اطاعت میں آنا چاہتے ہیں اپنا اظہار ترحم کریں اس نیت سے کہ آئندہ خونریزی نہ ہونے پائے اور ہمارے ممالک ہند میں جلدی سے امن وامان ہو جائے۔ قائم مقام اور گورنر جنرل بہادر ایک علاقہ میں کہ جہاں لوگوں کے ایام غدر مکروہ میں جرم مخالف سرکار کئے تھے ان میں سے اکثروں کو مترصد عفو قصورات کا بشرائط مخصوص کیا ہے اور جن کی تقصیر نے ان کو احاطہ ترحم سے باہر کر دیا ہے ان کی سزاؤں کی بھی تشریح کر دی ہے چنانچہ ہم اپنے قائم مقام اور گورنر جنرل کے اس

عمل مذکور کو پذیرا اور قبول کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے حسب ذیل اعلان فرماتے ہیں یعنی سوائے اُن لوگوں کے جن کی نسبت ثابت ہؤا یا اب ثابت ہو کہ وہ رعیت سرکار انگریزی کے قتل میں بذاتِ خود شریک ہوئے اور باقی جملہ مجرموں کی نسبت اظہار ترحم کیا جائے گا۔ مگر بہ نسبت شرکاءِ قتل کے انصاف مقتضی اس بات کا ہے کہ ان پر ترحم نہ ہو جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں یا ترغیب دیتے ہوں اُن کی نسبت صرف یہی وعدہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی جان بخشی ہوگی۔ لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں اُن سب احوال پر جن کے اعتبار سے وہ اپنی اطاعت سے پھر گئے کامل غور کیا جائے گا۔ اور اُن لوگوں کی نسبت جو بے سوچے سمجھے مفسدوں کی جھوٹی باتوں میں آکر مجرم ہو گئے بڑی رعایت کی جاوے گی۔ باقی اور سب اشخاص سے جو سرکار کے بالمقابل ہتھیار بند ہیں بموجب اس قرطاس کے وعدہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے اپنے گھر چلے جاویں اور اپنے اپنے پیشہ صلح و سداد میں مصروف ہوں تو اُن کے قصورات جو ہماری نسبت اور ہماری سلطنت اور منزلت سے سرزد ہوئے بلا شرط معاف اور درگزر اور فراموش کر دیئے جائیں گے۔ ہماری یہ مرضی شاہانہ ہے کہ رحم و عفو کی شرائط مذکور اُن سب شخصوں کے متعلق ہوں جو قبل از یکم جنوری ۱۸۵۹ء کی شرائط کی تعمیل کریں (۹) ہماری بدل و جان یہ تمنا ہے کہ جب ملکِ ہند میں امن ہو جائے تو وہ فلاح و مصالح کی ترقی کریں اور فائدہ خلائق کے لئے کام مثل تیاری سڑک و نہر وغیرہ جاری کریں۔ اور ملک کا ایسا انتظام کیا جائے کہ جس سے ہماری ساری رعایا باشندہ ملک مذکور کو فائدہ ہو کیونکہ اُن کی فارغ البالی ہمارے لئے موجب اقتدار اور اُن کی فراغت ہمارے لئے باعث بے خطری اور اُن کی شکر گزاری ہمارے لئے پورا صلہ ہے اور خدائے قادر ہم کو اور ہمارے فرمانبرداران ماتحت کو ایسی توفیق دے کہ یہ ہماری مرادیں واسطے فائدہ رسانی خلائق کے اچھی طرح حسن اختتام کو پہنچیں۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے گزٹ میں یہ اعلان شائع ہؤا[1]

---

[1] مسٹر گلیڈسٹون نے ہاؤس آف کامنس میں یکم مئی ۱۸۹۳ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا یاد اور نہ صرف مصر بلکہ ہندوستان کے متعلق بھی میں یہ کہوں گا کہ کسی ملک پر دائمی قبضہ کر لینا برٹش گورنمنٹ کی قدیم روایات کیخلاف ہے۔ ہندوستانیوں کو بھی یہی امید رکھنا چاہیئے کہ ہم ہندوستان کا قبضہ اسی وقت تک اپنے ہاتھ میں رکھیں گے جب تک کہ وہاں کی ضروریات اور ملکی ترقی و خوشحالی اس درجہ پر نہ پہنچ جائے جو کہ ایک آزاد ملک کیلئے ضروری ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۹ پر دیکھیں)

اس اعلان پر ہندوستان میں امن اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اس سے پہلے بہت سے اعلانوں اور معاہدوں کو توڑ چکی تھی اور اسی بنا پر اس کے کسی اعلان اور عہد نامہ پر ہندوستانیوں کو اعتماد نہ ہوتا تھا مگر چونکہ یہ اعلان ملکہ وکٹوریہ اور ہاؤس آف کامنس (دارالعوام) اور ہاؤس آف لارڈس (دارالخواص) اور انگلستان کی مذہبی جماعتوں کی طرف سے ہوا تھا اس پر اعتماد کیا گیا اور بڑے درجہ تک بے چینی دور ہو گئی۔ چاروں طرف رعایا مطمئن ہو گئی مگر بعد کے کچھ عرصہ کے معاملات نے واضح کر دیا کہ یہ اعلان محض ہاتھی کے دانت کی طرح تھا جو محض دکھلاوے کا کام کرتا ہے۔ تمام حکام وہی رکھے گئے جن کے ہاتھ ہندوستانیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اور جن کی سرشت میں درندگی اور بربریت بھری ہوئی تھی۔ اور جو کہ ہندوستانیوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور مساوات گورے اور کالے کے انتہائی مخالف تھے۔ چنانچہ حکام کی ان چیرہ دستیوں کو دیکھ کر گورنروں اور وائسرائے کو برابر واقعات اور مظالم کی عرضداشتیں پیش کی گئیں مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ عاجز آکر ہندوستانیوں نے ان امور کی اطلاعات پارلیمنٹ ہاؤس آف کامنس اور وزراء تک پہنچائیں مگر وہاں سے بھی کوئی دستگیری اور اشک شوئی نہ ہوئی تو اضطراب اور بے چینی بڑھنے لگی۔ چنانچہ ان بے عنوانیوں کی شکایت حکام رس لوگوں نے وائسرائے وقت لارڈ ڈفرن تک زبانی پہنچائی تو جواب یہ ملا کہ اب تک تم لوگوں نے جو کارروائی کی ہے وہ انفرادی ہے تم کو اپنی جماعت بنانی چاہیئے اور اجتماعی طور سے مطالبات پیش کرنے کی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ حکومت برطانیہ کے لوگ اجتماعی مطالبات کو وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد رکھی گئی اور پہلا اجلاس اُس کا بمبئی میں کیا گیا اور اس میں بلا تفریق مذہب و نسل ہندوستانیوں

صفحہ ۴۷۸ کا حاشیہ (رسالہ سرزمین فراعنہ میں اِن دی لینڈ آف دی فیروز مصنفہ دوست محمد ایڈیٹر امریکن ٹائمز لندن)
سر ایلڈن گورسٹ نے ۲۷ مارچ ۱۹۰۹ء کو ہاؤس آف کامنس میں حسب ذیل تقریر کی در ہندوستان کی نیشنل کانگریس کے ممبروں کو کوئن وکٹوریہ کی وہ مشہور تقریر نہیں بھولنا چاہیئے جس میں صاف صاف یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ہم اس ملک پر زبردستی کا قبضہ نہیں رکھنا چاہتے ہم وہاں کی خوشحالی اُن کی آزادی اور امن وامان کے خواہاں ہیں اور اگر ہم کو یہ یقین دلایا جائے کہ تعلیم نے اس ملک میں ایسی ترقی کر لی ہے کہ وہاں والوں کو اپنے معاملات میں ہماری سرپرستی کی ضرورت نہیں ہے تو ہم آج اس کا اعلان کرنے کے لئے تیار ہیں کہ ہندوستان کو بھی مثل دیگر برطانوی مقبوضات کے خود مختار بنا دیا جائے گا۔ (رسالہ مذکورہ بالا)

کو ممبر بنانے کا اعلان کیا گیا اور شکایات و مطالبات کو رزولیوشنوں کی صورت میں تمام اہل ہند کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس اجلاس میں اُنھتر ممبر شریک ہوئے جن میں دو مسلمان اور تین بنگالی اور باقی بمبئی کے باشندے ہندو اور پارسی وغیرہ تھے۔ مسلمانوں میں مشہور تاجر بمبئی سیٹھ رحمت اللہ سیانی تھے۔ اس اجلاس کی صدارت مسٹر سریندر ناتھ بنرجی نے کی۔

چونکہ ۱۸۵۷ء کے واقعہ پر انگریزوں نے اس قدر اور ایسے ملعون اور شرمناک مظالم چاروں طرف ہندوستان میں کئے تھے جن کی نظیر وحشی قوموں اور جاہل سے جاہل ملکوں میں بھی نہیں پائی جاتی تھی توپوں کے مُنہ پر باندھ کر گولے سے اڑا دینا، ہاتھی کے پیر سے باندھ کر کچلوا دینا زندہ آدمی کو لوہے کی گرم سلاخوں سے داغ کر آگ میں جلانا وغیرہ وغیرہ معمولی باتیں تھیں اس لئے عام ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان انتہائی درجہ خوف وہراس میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے باوجود ہر قسم کی ناانصافیوں کے معائنہ کرنے کے تمام پبلک میں آزادیٔ وطن کے لئے کھڑے ہونے کی ہمت نہ تھی۔ اگرچہ ہر سمجھدار شریف النفس غیرت مند ہندوستانی کے دل میں آزادی کی چنگاری بھڑکتی رہتی تھی مگر خوف وہراس کے تسلط کی بناء پر کسی قسم کی ظاہری کارروائی کام میں لانا احاطہ قدرت سے باہر سمجھا جاتا تھا یہ ضرور تھا کہ کچھ مسلمان جن پر خصوصی طور پر محبت قوم ووطن اور دین کا غلبہ تھا ان انسانیت سوز مظالم کے باوجود خُفیہ کارروائیاں ہتھیلی پر سر رکھ کر جاری کئے ہوئے تھے جن کا تذکرہ ہم ڈبلوڈبلو ہنٹر کے اقتباسات میں کر چکے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے انگریزوں کو سرحد میں بار بار جنگی مہمیں ۱۸۶۳ء تک جاری کرنی پڑیں اور متعدد مقامات عدالتہائے ہند میں چلائے گئے۔ جن میں انبالہ کا مشہور مقدمہ بھی ہے۔ انہیں جیسے مسلمانوں کے متعلق ۱۶ فروری ۱۸۷۱ء میں سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر نے کہا تھا۔

> "لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ مسلمانوں کو بے جان اور ضعیف بیان کرتے ہیں۔ شاید ایسا ہو۔ مگر بہت سے شکاریوں کو خطرہ برداشت کرنے کے بعد یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ اگر کسی عالی نسب شیر پر زخم لگا دیا جائے گا تو گو وہ کیسا ہی ضعیف اور ناتوان بلکہ قریب المرگ ہی کیوں نہ ہو مگر پھر بھی اپنی اصلی حرارت کے ساتھ ایک مرتبہ جست کرے گا اور چاروں طرف ہلاکت اور تہلکہ مچا دے گا۔" (روح روشن مستقبل ص ۲۲)

بہرحال عام پبلک ہندو اور مسلم اور بالخصوص مسلمان انتہائی درجہ میں خائف اور ہراساں ہو گئے تھے چونکہ سب کا یہی خیال تھا کہ آزادی بجز تشدد اور قتل و قتال کے نہیں حاصل ہو سکتی اس لئے مایوسی ہر ایک پر چھائی ہوئی تھی۔ کوئی دم مارنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ کانگریس کے اجلاس اوّل کے بعد لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ آزادی حاصل کرنے کی دوسری صورت بھی ہے اس لئے لوگ جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگے کیونکہ اس میں اطمینان تھا کہ انگریزوں کو اپنی درندگی اور بربریت کا موقعہ ہاتھ نہیں آئے گا اور ہم اپنی محبوبہ آزادی سے وصال حاصل کر سکیں گے اگرچہ دیر میں اور تدریجاً ہو۔ چنانچہ ۱۸۸۶ء میں جب کانگریس کا دوسرا اجلاس کلکتہ میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں منعقد ہوا تو ممبروں کی تعداد (۷۸) سے بڑھ کر ایک ہی سال میں (۴۳۶) ہو گئی جس میں مسلمان ممبر (۳۳) تھے۔ اور پھر ۱۸۸۷ء میں جب اس کا تیسرا اجلاس مدراس میں زیر صدارت بدرالدین طیب جی منعقد ہوا تو ممبروں کی تعداد (۶۰۴) تھی جن میں مسلمان (۸۳) تھے۔ کانگریس کی اس بڑھتی ہوئی حالت اور مقبولیت کو دیکھ کر ممکن نہ تھا کہ مستبد اور سیاہ دل انگریزوں کے دماغ ماؤف نہ ہوں اور سینہ اور دل میں کپکپی پیدا نہ ہو۔ مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج اور دوسرے انگریزوں کو انتہائی بے چینی نے گھیر لیا۔ چنانچہ انہوں نے انجمن محبان وطن (رانڈبن ہیٹر یاٹک ایسوسی ایشن) کی بنیاد ڈالی کانگریس کی مخالفت میں آرٹیکل بار بار شائع کئے۔ مختلف مقامات پر سفر کئے اور لیکچر دیئے اور سر سیّد پر اس قدر اثر اور دباؤ ڈالا کہ وہ انتہائی درجہ کانگریس کے مخالف ہو گئے اور مسلمانوں پر زور ڈالنے لگے کہ وہ ہرگز ہرگز کانگریس میں شرکت نہ کریں۔ اور رانڈبن ہیٹر یاٹک ایسوسی ایشن میں شریک ہو کر انگریزوں کی وفاداری کا ثبوت دیں۔ اس میں شرکت مسلمانوں کے لئے فرض اور ضروری ہے اور کانگریس میں جانا مسلمانوں کے لئے سم قاتل اور زہر ہلاہل ہے۔ چند علماء کو اپنا ہم خیال بنا کر فتویٰ شائع کرایا جس کی رو سے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت حرام قرار دے دی گئی۔ اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی شرکت فرض بتائی گئی۔ یہ تمام معاملہ ۱۸۸۸ء سے پر زور طریقہ پر جاری ہوا۔ اس پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب اور مدرسین دارالعلوم دیوبند اور بہت سے علماء حقانی اطراف و جوانب ہند نے پر زور مخالفت کی۔ اور

کانگریس کی شرکت کی حمایت اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی شرکت کی ممانعت میں فتوے لکھے۔ اس بارہ میں پیش پیش علماء لدھیانہ مولانا محمد صاحب اور اُن کے دو بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب اور مولانا عبداللہ صاحب مرحومین تھے انہوں نے اطراف و جوانب ہندوستان سے فتوی منگائے اور ان سب کو ایک رسالہ ”نصرۃ الابرار“ میں جمع کیا۔ اور خود کھلی کھلی اور زوردار دلیلوں سے کانگریس کی شرکت کا جواز اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں شرکت کا عدم جواز ثابت کیا۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی (قدس اللہ سرہ العزیز) کا فتوی اسی رسالہ نصرۃ الابرار میں صفحہ ۱۹-۲۰ اور صفحہ ۲۶ میں اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اور دیگر علماء دارالعلوم دیوبند کا فتوی صفحہ ۲۳ و ۲۴ میں درج ہے اور مولانا محمد صاحب مرحوم لدھیانوی اور اُن کے دونوں بھائیوں مرحومین کے تفصیلی فتوے صفحہ ۲ سے لے کر ۱۹ تک میں مذکور ہیں۔ اس رسالہ میں تقریباً سو علماء ہند کے فتاوے نقل کئے گئے ہیں۔

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں مسٹر بیک اور اُن کے ہمنواؤں کی جدوجہد سے ہندو امراء اور تعلقدار بھی شریک ہوئے تھے اس کی ممبری کسی خاص فرقہ کے لئے مخصوص نہ تھی مگر ہندو رؤساء بہت جلد تاڑ گئے کہ یہ جال ہندوستانیوں کو ہمیشہ غلام رکھنے کے لئے بچھایا گیا ہے۔ اس لئے وہ رفتہ رفتہ ایسوسی ایشن سے نکل گئے مگر مسلمان سرسید اور مسٹر بیک کے جادو کی بناء پر بالکل نہ سمجھ سکے۔ مسٹر بیک نے جب دیکھا کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن سے ہندو بالکل نکل گئے ہیں تو دسمبر ۱۸۹۳ء میں مسلمانوں اور انگریزوں کی بنائی اور اس کا نام ”محمڈن اینگلو اورنٹیل ایسوسی ایشن“ رکھا۔ اور پہلی انجمن پیٹریاٹک کو دفن کر دیا۔ اس نئی ایسوسی ایشن کے مقاصد حسب ذیل تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت، مسلمانوں میں سیاسی شورش پھیلنے کو روکنا، سلطنت برطانیہ کے استحکام کی تدابیر کرنا۔ لوگوں میں سلطنت برطانیہ کی وفاداری کے جذبات پیدا کرنا۔ اس انجمن کے سیکرٹری خود مسٹر بیک بنے اور تفرقہ اندازی (ہندو مسلم پھوٹ) مسلمانوں کو بزدل بنانے اُن میں انگریزوں کی غلامی کی زوردار اسپرٹ پیدا کرنے اور کانگریس سے علیحدگی بلکہ دشمنی رکھنے کے کھیل خوب کھُل کر کھیلے جس سے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں مستقل طور پر مایوسی چھا گئی

اور بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمان جو کہ ان انجمنوں کے ممبر اور جو شبلے کا رکن تھے یہ دیکھ کر کہ کانگریس کامیاب ہوتی جا رہی ہے امتحانات مقابلہ رُک نہیں سکتے، کونسلوں کی توسیع ہوتی جاتی ہے اور دیگر امور میں بھی کانگریس کی آواز کچھ نہ کچھ اثر انداز ہو رہی ہے۔ اُن کے دماغ معطل اور اُن کے ذاوب ضعیف اور اُن کے قویٰ مضمحل ہو گئے۔ سرسیّد ۱۸۹۸ء میں اور مسٹر بیگ ۲۷ دسمبر ۱۸۹۹ء میں انتقال کر گئے۔ اس کے بعد مسٹر ماریسن علی گڑھ کالج کے پرنسپل بنا دیئے گئے۔ انہوں نے وہاں کی سیاست میں بھی قائمقامی کی۔ ۱۹۰۰ء میں لفٹننٹ گورنر یوپی میکڈانلڈ نے اُردو ہندی کا نیا جھگڑا پیدا کیا جس سے ہندو مسلمانوں کا اتحاد کافور کر دیا گیا اور افتراق کا زہر تمام ملک میں پھیلا دیا گیا۔ یہ دوسری انجمن بھی "محمڈن اینگلو اورنٹیل" مسٹر ماریسن نے دفن کر دی۔ اُردو، ہندی کے جھگڑے میں نواب مہدی علی خاں محسن الملک کو سخت زک اُٹھانا پڑی۔ ۱۹۰۱ء میں محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن بنائی گئی جس کی رُو سے نواب وقار الملک کو بہت زیادہ تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ انہیں دنوں کے بعد تقسیم بنگال کا واقعہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کو بالکل بے دم کر دیا۔

الغرض سرسیّد کی اس پالیسی اور مسٹر بیگ اور دیگر انگریزوں کی ان کارروائیوں کا اثر انگریزی تعلیم یافتوں پر اس قدر زہریلا پڑا کہ مسلمان سیاسیات میں ہندوؤں سے بہت پیچھے پڑ گئے جس کا احساس مسلمانوں کو بہت بعد میں ہوا اسی زہریلی پالیسی کے ماتحت ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ان امور کی تفصیل روشن مستقبل اور روحِ روشن مستقبل میں پوری طرح دی گئی ہے۔ ہندوستانیوں کو اس شدّت اور بیدردی سے پامال کر دینے کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی سرحدوں کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھا۔

اپنے سامراج کو لازوال بنانے کیلئے انگریز کی چالیں

دوسرے ممالک میں انگریزوں کا جارحانہ اقدام

کوئن وکٹوریہ کے اعلان ۱۸۵۸ء کی کھلی ہوئی مخالفت

باوجودیکہ ۱۸۵۸ء میں کوئن وکٹوریہ اور دارالعوام اور دارالخواص اور انگلستان کی مذہبی جماعت کے سربرآوردہ لوگوں کے اتفاق سے منجملہ دیگر وعدوں کے یہ وعدہ پختہ طور پر کیا گیا تھا کہ ہم آئندہ کسی دوسرے ملک پر قبضہ اور دست درازی نہ کریں گے۔ مترجم کے الفاظ حسب ذیل تھے "جو ملک بالفعل ہمارے قبضہ میں ہے اسے زیادہ کرنا نہیں چاہتے اور جب ہم کو یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی شخص ہماری مملکت یا حقوق میں دست اندازی کرے تو ہم بھی پیشقدمی کی اپنی طرف سے بہ نسبت ملکیت یا حقوق اوروں کے اجازت نہ دیں گے اور والیان ہند کے حقوق و منزلت اور عزت مثل اپنے حقوق و منزلت اور عزت کے عزیز سمجھیں گے۔" مگر کیا اس پر عمل کیا گیا۔ واقعات مندرجہ ذیل اس پر روشنی ڈالیں گے۔

لہ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے اسباب انقلاب و جدوجہد آزادی میں سے ایک امر یہ بھی تھا کہ کمپنی نے مختلف ریاستوں پر خلاف معاہدہ قبضہ کر لیا تھا اور ہمیشہ توسیع مملکت اور فارورڈ پالیسی اس کے زیر نظر رہتی تھی جس کے ماتحت جنگ و جدل اور الحاق ممالک ہند شرمناک طریقوں اور حیلوں سے جاری رہتا تھا باوجود بہت سے والیان ریاست کے انتہائی وفاداری امداد اور اطاعت کے پھر بھی الحاق کی پالیسی عمل میں لائی جاتی تھی جیسا کہ اودھ اور اس کے والی نواب واجد علی شاہ اور جھانسی کی رانی وغیرہ کے ساتھ کیا گیا تھا اس لئے ہندوستانیوں کی بے چینی دور کرنے اور آئندہ کے خطرات کو مٹانے کی غرض سے یہ اعلان ضروری سمجھا گیا تھا جس کی بناء پر تمام والیان ریاست ہائے ہند مطمئن ہو گئے اور بیرون حدود برطانوی ہند کے رہنے والے باشندوں کو بھی یقین ہو گیا کہ انگریز آئندہ امن و امان سے رہیں گے اور ہماری مملکتیں محفوظ رہیں گی۔ مگر چونہی ذمہ داران برطانیہ کو اس اعلان کے بعد محسوس ہونے لگا کہ اب ہندوستانیوں کی بے چینی ختم ہو گئی

باقی صفحہ ۴۸۵ پر دیکھیں

(۱) ۱۸۶۵ء میں دوار آف بھوٹان پر قبضہ کر کے برطانوی ہند سے الحاق کیا گیا۔
(۲) ۱۸۸۵ء میں برہما کا شمالی حصہ فتح کر کے سلطنت میں شامل کیا گیا۔
(۳) ۱۸۹۰ء میں منی پور انگریزی انتظام میں لیا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد پھر ہندوستانی ریاست زیرِ سایہ برطانیہ بنا دیا گیا۔
(۴) ۱۸۹۵ء میں چترال پر چڑھائی کی گئی اور تمام علاقہ سلطنت میں شامل کیا گیا۔
(۵) تیرہ کی سرحدی مہم بھی اسی سال میں واقع ہوئی۔
(۶) ۱۸۸۰ء میں کابل کی دوسری لڑائی کی گئی جس میں چالیس لاکھ پونڈ خرچ ہوا۔
(۷) ۱۸۹۷ء میں پھر جنگ سرحد کی گئی جس میں بیالیس لاکھ پونڈ خرچ ہوا۔
(۸) ۱۸۹۸ء میں تبت اور چین پر حملہ کیا گیا جس میں ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ خرچ ہوئے۔
(۹) ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۸ء کے ستھانہ اور اُن مقامات پر حملوں کا ذکر کر چکے ہیں جہاں آزادیٔ ہند کے متوالے حضرت سیّد احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے تابعداروں کا قیام رہتا تھا۔

غرضکہ ہندوستان کی بیرونی حدود پر رہنے والے قبائل اور ممالک جو کہ ۱۸۵۷ء

(بقیہ حاشیہ ۴۸۴) طرف سے دُور ہو گئی ہے اور ہماری قوت اور گرفت بھی مکمل ہو گئی ہے اسی وقت سے آنکھیں بدل لیں اور اس عہد نامہ کو ردّی کی ٹوکری میں ڈالنا اور فارورڈ پالیسی کو زندہ کرنا ضروری معلوم ہونے لگا۔ سر بارٹل فیسر اور ان کی پارٹی نے فارورڈ پالیسی کے لئے پارلیمنٹ میں آوازیں بار بار اٹھائیں اور اپنے ہم خیال بنانے شروع کئے تا اینکہ اپنی اکثریت بنا کر وائسرائے ہند پر عملدرآمد کا زور ڈلوایا اس وقت میں لارڈ نارتھ بروک وائسرائے تھے انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے خطرات اور مضرات کو ظاہر کیا۔ مگر ایک نہ سُنی گئی اور برابر زور پڑتا رہا۔ چونکہ وہ اس پالیسی کو ہندوستان اور انگلستان کے لئے بہت مضر سمجھتے تھے اسلئے ۱۸۷۶ء میں استعفا دیکر انگلستان واپس چلے گئے اور انکی جگہ پر لارڈ لٹن آئے وہ اس پالیسی کے موافق تھے چنانچہ انہوں نے آتے ہی کابل کو مشن بھیجا اور بالآخر ۱۸۸۰ء کی کابل کی چڑھائی عمل میں آئی جس میں برطانیہ اور گورنمنٹ ہندوستان کو بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا دو کروڑ پونڈ اس مہم میں خرچ ہوا جس میں سے برطانیہ نے اپنے انگلینڈ کے خزانہ سے صرف پچاس لاکھ پونڈ دیا اور باقی ڈیڑھ کروڑ پونڈ ہندوستان کے سر ڈالا گیا۔ پھر بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

تک کے مقبوضہ ممالک سے باہر تھے حملہ کرنے اور اُن کے برباد اور کمزور کرنے کے بے شمار واقعات جاری کئے گئے ، بلوچستان ، باغستان (آزاد قبائل کا ملک) افغانستان نبت، چین ، برہما وغیرہ پر برابر فوج کشی جاری رہی جس سے ہمیشہ ہندوستانی فوجیں، ہندوستانی خزانے، ہندوستانی رسد وغیرہ موت کے گھاٹ اترتے رہے اور پڑوس کے ممالک اور قوموں کی بربادی ہوتی رہی ان کو ہندوستان اور باشندگان ہند سے بغض وعداوت بڑھتی رہی۔ اور اس طرح انگریزوں کی غلامی ہندوستانیوں کے لئے مضبوط ہوتی گئی۔ مندرجہ بالا واقعات تو بڑی بڑی جنگوں کے ہیں جن میں اس قدر مصارف واقع ہوئے کہ ہندوستانی قومی قرضہ کی نوبت آئی ورنہ ایسی مہمات ں جن میں قرض لینا نہیں پڑا وہ تو بے شمار ہیں۔ آفریدیوں، مسعودیوں، مہمندیوں، وزیریو اور دیگر قبائل سے آئے دن فارورڈ پالیسی کی بناء پر چھیڑ چھاڑ عمل میں لائی جاتی اور پھر اُن پہ فوج کشی عمل میں لائی جاتی تھی جس سے ان بہادر قوموں کو ذلیل کرنا، ہندوستان پر اپنے تسلط اور اقتدار کو مضبوط بنانا۔ باہر سے آنے والے خطرات کے لئے تحفظ اور سد راہ کی صورتیں پیدا کرنا اصلی مقصد تھا۔ ورنہ یہ ممالک ایسے زرخیز نہ تھے جن کے لئے اس قدر مصارف برداشت کئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام کارروائیاں شہنشاہیت (برٹش امپائر) کے لئے عمل میں لائی جاتی رہتی تھیں اور برطانوی قوم اور ملک کا کوئی نقصان جانی یا مالی نہیں ہوتا تھا۔ آدمی ہندوستان کے مرتے تھے خزانہ ہندوستان کا کھپتا تھا۔ دوسرے نقصانات بھی ہندوستان کے ہوتے تھے اور برٹش اقتدار روزافزوں ہوتا رہتا تھا۔ ہندوستان پر آہنی پنجہ اور اُس کی گرفت روزافزوں زیادہ ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے کانگریس اور بیدار مغز ہندوستانی اس عملدرآمد کو ملک کے لئے انتہائی خطرناک سمجھتے تھے۔ فوجی مصارف کے بارگراں کی بناء پر ہندوستانیوں پر ٹیکس آئے دن بڑھائے جاتے تھے۔ اندرون ملک کی ضروریات کے لئے بجٹ میں روپیہ نہ ہونے کا بہانہ لے کر رعایا کی ضروریات داخلیہ کی انجام دہی سے معذوری ظاہر کی جاتی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں جبکہ کانگریس کا پہلا اجلاس ہوا تو ایک رزولیوشن میں فوجی مصارف کی تخفیف کا مطالبہ کیا گیا۔ اور اس کے بعد کے اجلاس میں مندرجہ ذیل تجویز پاس کی گئی۔

"سرحد کی پیش قدمی کی پالیسی سلطنت برطانیہ کے لئے اور بالخصوص ملک ہندوستان کے مفاد کے لئے مضرت رساں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی حدود کے باہر فوجی مہمات بھیجنی پڑتی ہیں جس سے قیمتی جانیں تلف ہوتی ہیں اور رعایا کا روپیہ ضائع ہوتا ہے اس لئے کانگریس مستدعی ہے کہ اس جارحانہ کارروائی کو بند کیا جائے اور یہ امر قرار قرار دیا جائے کہ درآں حالیکہ یہ مہمات شاہی اغراض کے لئے ضروری سمجھی جائیں تو ان کے صرف کا بڑا حصہ سلطنت برطانیہ کے خزانہ سے ادا کیا جائے۔"

نیز اس قرارداد کے بعد دوسری قرارداد میں کانگریس نے گورنمنٹ کی پیش قدمی کی پالیسی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ سرحدیوں کے ساتھ پرانی دوستانہ پالیسی کی طرف رجوع کیا جائے اور وادی سوات میں جو کثیر اخراجات کئے جاتے ہیں انہیں بند کیا جائے۔ چونکہ کانگریس کے سمجھ دار ممبر اور بیدار مغز لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ کارروائی ہندوستانیوں کی غلامی کو بڑھانے اور مضبوط کرنے اور ان کی آزادی کو زیادہ سے زیادہ دور بلکہ مستخیل بنانے کے لئے کی جا رہی ہے۔ اور اس سے ہندوستان روز بروز کمزور ناتوان اور غریب ہوتا جا رہا ہے لہٰذا اس کی مخالفت کرنا ضروری ہے۔ مگر سادہ لوح مسلم افراد جو کہ سرسیّد کے تابعدار اور مسٹر بیگ کے جادو میں پھنسے ہوئے تھے وہ اس قسم کی تجویزوں کے مخالف رہے۔ یہ بھی نظر اُٹھا کر نہ دیکھا کہ اس فارورڈ پالیسی کے عمل میں آنے سے کیا مسلمانوں ہی کی بربادی نہیں ہو رہی ہے؟ ہندوستان کی مغربی وشمالی سرحد پر تو صرف مسلمان ہی آباد تھے اس پیش قدمی سے ہر روز انہیں موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے انہیں کے مال اور گھروں کو نیست و نابود کیا جا رہا ہے۔ نیز زمانہ سابقہ میں آزادی کے لئے اس راستہ ہی سے ہمیشہ کامیابی ہوتی رہتی تھی۔

مگر افسوس کہ ان مسحورین برطانیہ کی آنکھیں اس وقت نہ کھلیں۔ افغانستان پر انگریزوں نے چار مرتبہ چڑھائی کی۔ اگر علاقہ پہاڑی اور وہاں کے باشندے بہادر اور جنگجو نہ ہوتے اور انگریز کو یہ خطرہ نہ ہوتا کہ روس سے بلاواسطہ و آمنے سامنے لڑائی کہیں نہ کرنا پڑ جائے تو بہت ممکن تھا کہ مثل ہندوستان افغانستان بھی غلامی کی ہولناک دلدل میں پھنس جاتا انگریز چاہتا تھا کہ میرے اور روس کے درمیان میں افغانستان لوہے کی دیوار بنا رہے۔ چنانچہ ہندوستان کے خزانہ سے عرصہ دراز تک ایک معقول رقم امیر

افغانستان کے لئے جاری رہی جس کو امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم بجز یہ سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ بہر حال انگریزوں نے اپنی اُن حدود سے جو کہ ۱۸۵۷ء میں تھیں ہر طرف آگے بڑھ کر وہاں کے باشندوں کو غلام اور اُن کے ملکوں کو اپنے اقتدار اور تسلط کی آماجگاہ بنالیا۔ صرف افغانستان میں مذکورہ بالا وجود سے پوری کامیابی نہ ہو سکی۔ تاہم اس کو ہندوستان کی تمام حدود کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔

انگریز کا انگلستان کے بحری راستہ کو اپنے لئے صاف کرنا

چونکہ انگلینڈ سے ہندوستان آنے کے لئے اس زمانہ میں بحیرہ بحری راستہ کے اور کوئی راستہ نہیں تھا اور قدیمی راستہ ساؤتھ افریقہ کا بہت دُور پڑتا تھا اس لئے انگریزوں نے جبرالٹر سے بمبئی تک کے لئے اپنے تسلط کی ہمیشہ انتہائی کوششیں جاری رکھیں۔ سلطان عبدالمجید خاں مرحوم ۱۸۳۹ء میں تخت نشین ہوئے۔ محمد علی پاشا اس سے پہلے بغاوت کر کے فلسطین اور شام کے علاقوں پر قابض ہو چکے تھے اور ترکی بیڑہ فوجی پاشا کی خیانت کی بناء پر محمد علی کے قبضہ میں آچکا تھا اس لئے سلطان کے لئے نہایت سخت دقتوں کا سامنا تھا انگریزوں اور اُن کے حلفاء کی امداد سے ترکوں کو کامیابی اور محمد علی پاشا کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور اس بناء پر سلطان عبدالمجید سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے (حالانکہ یہ انگریزوں کی امداد اپنے مقاصد ہی کے لئے تھی اور حالانکہ انگریزوں نے صرف جہازوں سے مدد کی تھی تمام جنگی کارروائیاں ترکی فوجیں ہی کر رہی تھیں۔ مگر انگریزوں نے اس دوستی سے بہت سے عظیم الشان فوائد حاصل کئے۔ منجملہ فوائد ایک فائدہ عدن پر قبضہ تھا جو کہ محض کوئلہ کے مخزن کے نام سے طلب کیا گیا تھا۔ سلطان مرحوم نے ظاہر کیا کہ ہمارے جہازوں کی آمد و رفت کے لئے عدن میں کوئلہ کا مخزن ضروری ہے وہاں سے ہندوستان کی بندرگاہیں بہت دُور پڑتی ہیں جہازوں کے آتے وقت اور اسی طرح جاتے وقت جہازوں میں کوئلہ اور پانی کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے نیز وہ ایک ایسا مرکزی مقام ہے جہاں سے ہر طرف کی آمد و رفت اور تجارتی تعلقات اور کاروبار ہو سکتے ہیں اس کے لئے عدن میں ایسے مخزن کے لئے زمین اور اجازت دیجائے چنانچہ فرمان شاہی ہو گیا مگر انگریزوں نے بجائے مخزن کے تمام شہر اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں پر رفتہ رفتہ قبضہ کر لیا

عدن ایک عظیم الشان بندرگاہ اور جنگی مرکز ہو گیا۔ اس کے بعد باب المندب پر بھی قبضہ کیا گیا جس کے لئے سومالی لینڈ اور سوڈان اور مصر تک کی کوششیں کی گئیں اور ۱۸۸۵ء میں اس لڑائی کا خاتمہ ہوا جس کی تفصیل تو بہت زیادہ طویل ہے جو کہ مختلف تاریخی کتابوں میں درج ہے۔ مگر ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ پہلے پہل انگریز "راس اُمید" کے راستے سے جو کہ جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچتا ہے آمد و رفت رکھتے تھے اس راستہ کی مسافت بہت طویل ہے اس لئے جبکہ ۱۸۶۹ء میں نہر سوئز کو اسماعیل پاشا خدیو مصر نے کھدوا کر اس کا افتتاح کیا۔ تو انگریزوں کی آنکھیں کھلیں۔ انگریز مدبرین اس کی تعمیر کو ناممکن خیال کرتے تھے اس لئے اُنہوں نے ابتدا سے اس میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں لی مگر جب یہ تیار ہو گئی تب اس کی اہمیت سمجھی گئی اور اس پر قبضہ کرنے کی کوششیں طرح طرح سے عمل میں آنی شروع ہوئیں۔ انگریزوں نے اسماعیل پاشا سے خفیہ معاہدہ کر کے اسماعیل کے تمام حصے اونتالیس لاکھ چھہتر ہزار پانچسو بیاسی (۳۹،۷۶،۵۸۲) پونڈ میں خرید لئے اور اس کے بعد مختلف طریقوں سے مصر میں مداخلت کرتے لگے[۱] جس کی تفصیل (تاریخ دولت عثمانیہ مصنفہ مسٹر محمد عزیز صاحب ایم۔ اے علیگ جلد ثانی صفحہ ۲۱۲ تا ۲۴۳ پر درج ہے۔ بالآخر انگریزوں نے ۱۱؍جولائی ۱۸۸۲ء میں اسکندریہ پر بمباری کی اور انتہائی خفیہ اور علانیہ سازشوں اور غداریوں کے ساتھ اس جنگ کو دو برس تک جاری کر کے عرابی پاشا کو قید اور توفیق پاشا کو برسرِ اقتدار اس طرح لائے کہ وہ اُن کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی تھا۔ مورخ مذکور مسٹر عزیز مندرجہ ذیل الفاظ اس جنگ کے نتیجہ کے متعلق صفحہ ۲۴۲ پر لکھتے ہیں۔

"توفیق برٹش سنگینوں کے سایہ میں اسکندریہ سے قاہرہ آیا اور برطانیہ کی سرپرستی

---

[۱] انہیں مداخلتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسماعیل پاشا خدیو مصر کو معزول کرایا۔ مورخ مذکور کہتا ہے "برطانیہ اور فرانس کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے باب عالی (سلطان عبدالحمید خاں ثانی مرحوم) پر دباؤ ڈال کر اسماعیل کو خدیو کے عہدہ سے معزول کرا دیا۔ ۲۶؍جون ۱۸۷۹ء کو باب عالی کا ایک تار اسماعیل کو ملا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ معزول کیا گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا توفیق خدیو مصر مقرر کیا گیا۔" صفحہ ۲۱۸۔

میں عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ شریف پاشا نے وزارت قائم کی۔ نئے دور کا افتتاح یوں ہوا کہ وطنی تحریک کے علم بردار باغیوں کی حیثیت سے عدالت میں لائے گئے۔ عرابی پاشا کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی لیکن مسٹر بلنٹ نے ایک کثیر رقم اپنی جیب سے خرچ کر کے اس مقدمہ کی پیروی جس انگریز بیرسٹر کے سپرد کی تھی اس نے صفائی میں ایسی شہادتیں پیش کیں کہ خدیو کو موت کی سزا منسوخ کر دینی پڑی تاہم عرابی پاشا تمام عمر کے لئے جلاوطن کر کے سیلون بھیج دیئے گئے۔ انگریز نے جس آسانی کے ساتھ مصر پر قبضہ پالیا تھا اس کے لحاظ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ملک کی حکومت توفیق کے حوالہ کر کے خود واپس لے جائیں گے۔ تل الکبیر کے بعد ہی انہوں نے مصر پر اپنا تسلّط قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ مالیاتی امور کے انتظام میں بھی فرانس کو شریک کرنے پر تیار نہ تھے۔ توفیق اُن کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہا تھا اُس نے ایک انگریز کالوین کو اپنی حکومت کا تنہا مشیر مال مقرر کیا لارڈ ڈفرن جو اس وقت قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر تھا بحیثیت ہائی کمشنر کے مصر آیا اور حکومت کے آئندہ انتظام کا خاکہ مرتب کر گیا۔ اس خاکہ کی تفصیلی خانہ پُری سر ایولین بیرنگ" کے سُپرد ہوئی جس نے جنوری ۱۸۸۴ء میں بحیثیت قونصل جنرل کے چارج لیا یہی شخص ہے جو بعد میں لارڈ کرومر کے نام سے مشہور ہوا اُس کے آنے کے بعد مصر گویا سلطنت برطانیہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ ملک کے ہر معاملہ میں برٹش جنرل قونصل کی رائے فیصلہ کن تھی۔ مصری فوجیں انگریزی افسروں کے زیرِ کمان کر دی گئیں۔ انگریزی فوجیں جن کی تعداد چھ ہزار تھی پورے ملک پر اپنا تسلّط قائم کر چکی تھیں۔ برطانیہ نے اعلان کیا کہ مصر کی مالی حالت کے درست ہو جانے کے بعد انگریزی فوجیں واپس بلائی جائیں گی۔ لیکن مالی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی اور حکومت برطانیہ کی فرض شناسی نے کسی طرح گوارا نہ کیا کہ غریب مصریوں کو اپنے سایۂ عاطفت سے محروم کر دے۔"

بہر حال اس جنگ مصر اور سوڈان میں جو کچھ خرچ ہوا چونکہ ہندوستان اور

انگلستان کے درمیانی راستہ کے تحفظ کا ذریعہ تھا اس لئے وہ سب ہندوستان کے سر منڈھا گیا اور مبلغ ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ ہندوستان کے انڈین نیشنل ڈیٹ (ہندوستانی قومی قرضہ) میں ڈالا گیا۔ جس کا سود ہمیشہ ہندوستان ادا کرتا رہا۔ اس جنگ میں ہندوستانی فوج کے بیشمار آدمی جو کہ قتل کئے گئے یا زخمی ہوئے اور جو بے شمار سامان رسد و ہتھیار وغیرہ خرچ ہوا وہ سب اس نقد کے علاوہ ہے۔

اور چونکہ جنوبی افریقہ کے ممالک ٹرانسوال وغیرہ بھی ہندوستان اور انگلستان کے راستہ میں واقع ہیں قدیمی راستہ راس اُمید کا انہیں ممالک سے گذرتا ہے۔ انگریز اسی راستہ سے ہندوستان آئے تھے اور نہر سوئز سے پہلے یعنی ۱۸۶۹ء سے قبل انہیں ملکوں پر ہوتے ہوئے آمد و رفت ہوا کرتی تھی اس لئے ان ملکوں کا تحفظ بھی ہندوستان ہی کے ذمہ قرار دیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء میں جبکہ ساؤتھ افریقہ میں بغاوت ہوئی اور بوئر کی لڑائی ظہور پذیر ہوئی تو اس کا خرچہ جو کہ دو کروڑ ساٹھ لاکھ (۲۶۰۰۰۰۰۰) پونڈ تھا وہ بھی ہندوستان ہی پر ڈالا گیا اور ہندوستان کے قومی قرضہ میں محسوب ہوا۔ جس کا سود در سود ہندوستان برابر ادا کرتا رہا۔ جانی اور مالی مصارف اس کے علاوہ تھے۔

یہ قومی قرضہ (انڈین نیشنل ڈیٹس) ۱۸۵۷ء تک ۵ کروڑ دس لاکھ پونڈ تھا۔ ۱۸۶۲ء میں ۹ کروڑ ستر لاکھ پونڈ تک اور پھر ۱۹۰۱ء میں ۲۰۱/۲ کروڑ پونڈ تک پہنچ گیا۔

(خطبہ صدارت مسٹر فضل حق از کتاب د ت)

اسی قومی قرضہ کی بنیاد جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء میں رکھی گئی تھی ہندوستان کے لئے (انگریزوں کے دعووں پر) جہاں بھی لڑائیاں ہوئیں خواہ ہندوستان کے اندر یا باہر وہ سب ہندوستان کے سر تھوپی گئیں تھیں اور ان کا صرفہ ہندوستان سے وصول کیا جاتا رہا۔ اور جو کچھ لوٹ میں وصول ہوتا تھا خواہ وہ کتنا بھی قیمتی ہوتا تھا وہ سب غنیمت شمار ہوتا رہا اس کی کوئی گنتی نہیں ہوئی چنانچہ۔

۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں	۳۰ لاکھ ۲۵ ہزار پونڈ
۱۷۸۲ء میں جنگ میر قاسم نواب بنگالہ میں	۵۲ لاکھ پونڈ
۱۸۰۷ء میں جنگ مرہٹہ میں	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ پونڈ
۱۸۲۹ء میں جنگ کامل اوّل میں	۳۸ لاکھ پونڈ

۱۸۴۲ء میں جنگ نیپال میں ۱۰ لاکھ پونڈ

۱۸۵۸ء جنگ آزادی ہند میں معہ جملہ مصارف وحصص کمپنی ۴ کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ

یہ سب اسی قرضہ میں شمار کئے گئے اور ہندوستان کے سر مڑھے گئے۔ ہندوستان ہمیشہ مقروض رہ کر سود ادا کرتا رہا۔ اس قرضہ عامہ کی مقدار ۱۹۱۲ء میں ہندوستان پر چودہ ارب چودہ کروڑ تھی۔ ہندوستان کے قرضہ عامہ کا جزو اعظم انگریزوں سے انگلینڈ میں لیکر حکومت ہند کو دیا گیا اور سالانہ سود ہندوستان سے وصول کر کے اہل انگلینڈ کو دیا جاتا رہا۔ چنانچہ ۱۰ کروڑ پندرہ لاکھ سے زائد روپیہ صرف ایک سال سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں ہندوستان نے انگلستان کو محض بطور سود قرض عامہ ادا کیا۔" (علم المعیشۃ صفحہ ۶۰۵-۶۰۶)

نیز وہ لکھتا ہے۔

"ہندوستانی قرض عامہ کی بنیاد ۱۸۵۷ء سے پڑی جبکہ کمپنی سے ہندوستان خرید نے کی قیمت اور غدر فرو کرنے کے کل مصارف (۴ کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ ہندوستان سے وصول کرنے قرار پائے (مگر دت لکھتا ہے کہ اس کی بنیاد ۱۷۵۷ء یعنی جنگ پلاسی سے پڑی) یہ کل رقم بطور قرض عامہ انگلستان میں لے کر ہندوستان کے نام لکھ دی گئی اور اس روز سے آج کے دن تک ایک رقم بطور سود ہندوستان سے انگلستان وصول کرتا رہا ہے۔ ذرا خیال تو کرو کہ گذشتہ نصف صدی (بقول دت ڈیڑھ صدی سے زائد) میں ہندوستان کتنی رقم بطور سود انگلستان کو ادا کر چکا ہوگا۔" ص ۶۰۹

ہندوستان سے وہ بے شمار دولت جو لوٹ کر انگلستان پہنچائی گئی تھی جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں اور جس کو پراسپرس برٹش انڈیا میں مسٹر ڈگبی نے اور بروکس وغیرہ نے مال خزانوں، کروڑوں آدمیوں کی صدیوں کی کمائی اور تمام دول یورپ کے مجموعی خزانوں سے زیادہ لکھا ہے وہ کسی حساب میں نہیں لائے گئے۔)

اسی حفاظت راہ ہندوستان کے سلسلہ میں بحر ابیض (بحر روم) کو زیر تسلط اور اقتدار رکھنے کی غرض سے جزیرہ سائپرس (قبرص) پر قبضہ کرنا اور اپنی بحری قوت کا مرکز بنانا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ باب عالی (سلطان عبد الحمید خاں مرحوم) سے ۱۸۷۸ء میں ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔ جو کہ معاہدہ سان اسٹیفانو کی تنسیخ اور معاہدہ برلن کے انعقاد

کے وقت بصورت امداد دولت علیہ واقع ہوا تھا۔ یہ جزیرہ معاہدہ برلن میں اس وقت تک کے لئے حوالۂ برطانیہ کیا گیا جب تک روس گذشتہ جنگ کی ایشیائی فتوحات سے اپنا قبضہ نہ اُٹھالے نیز یہ جزیرہ برطانیہ کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ وہ روس کے مقابلہ کے لئے وہاں سامان جنگ تیار رکھ سکے۔ سلطان کی فرمانروائی کا حق قائم رکھنے کے لئے سالانہ خراج کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی۔ (دولت عثمانیہ ص۱۷۵)

بالآخر یہ جزیرہ جو کہ تین سو برس سے ترکی سلطنت میں چلا آتا تھا اور زرخیز تھا اور بحیرۂ روم میں بحری قوت کی مرکزیت کی شان رکھتا تھا انگریزی ڈپلومیسی کی نذر بن گیا۔ اس کے علاوہ جبرالٹر اسپین سے اور مالٹا جمہوریہ وینس سے حاصل کیا گیا جس کی تفصیل کتب تاریخ میں موجود ہے۔ بہرحال بحیرہ روم پر برطانیہ نے مغربی کنارہ سے مشرقی کنارہ اور وسط پر پورا قبضہ کر لیا۔ واضح ہو کہ جبرالٹر اس بحیرہ کے مغربی سرے پر ہے اور سائپرس (قبرص) مشرقی سرے پر ہے اور مالٹا وسط میں واقع ہے۔ مالٹا کو شہنشاہی برطانوی بیڑہ کا مرکز بنایا گیا جس کے بڑے مصارف کا بوجھ ہندوستان پر رکھا گیا اور یہی کہا گیا کہ یہ بیڑہ ہندوستان کا ہے اور اسی کے لئے ہم نے رکھ رکھا ہے۔ ہندوستان کے لئے بحیرہ روم میں حفاظت اور راستہ کا امن و امان فوجوں اور تجارتی جہازوں کی حفاظت یہی کرتا ہے۔ کچھ بحری قوت سائپرس میں اور کچھ جبرالٹر میں بھی ہمیشہ رکھی گئی۔ مگر اس پر کفایت نہیں کی گئی بلکہ ہمیشہ اس کی کوشش جاری رہی کہ بحر ابیض کے سواحل پر ہمارا یا ہمارے یورپین حلیفوں کا قبضہ ہو جس کی کچھ تفصیل ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

انگریزوں کا ممالک خارجہ پر قبضہ کرنا اور ایشیائی و افریقی قوموں اور بادشاہوں کے برباد کرنے کی سازشوں میں حصہ لینا

انگریزوں نے قوت پاتے ہی تمام ایشیائی اور افریقی ممالک کو غلام بنانے اور اپنے جبروت و اقتدار کے ماتحت کچلنے اور ان کو لوٹ کر اپنے ملک اور قوم کو تنومند اور موٹا بنانے اور تمام باشندگان ایشیا و افریقہ کا خون ہمیشہ چوستے رہنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ بالخصوص جبکہ ۱۸۵۷ء میں اپنے جبر و استبداد کا وحشیانہ مظاہرہ کرنے کے بعد انہوں نے تمام ہندوستان کو اپنے گمان میں فنا کر دیا تھا تو دوسرے ممالک پر انتہائی چالاکی اور عیاری کے ساتھ پل پڑے

سب سے زیادہ انہوں نے حکومت عثمانیہ (ترک) کو اپنے تبر و نشتر کا نشانہ بنایا اور اسی طرح ایران، چین، ہندچینی، جاوا، برہما، سماٹرا وغیرہ اور افریقہ کے سواحل اور ممالک پر چیرہ دستی شروع کی مگر اُس کی تفصیل کے لئے ضخیم ضخیم مجلدات درکار ہیں ہماری مختصر تالیف اس کی متحمل نہیں ہے۔ تاہم ہم مختصر نوٹ دربارہ سلطنت عثمانیہ وغیرہ پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین اس سے برطانیہ کی نیت اور طرز عمل سے وہ امور اندازہ کر لیں جن کا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اندازہ کیا تھا۔

اس مقام پر ہم اقوام یورپ اور ترکی کی پرانی تاریخ کو پیش کرنے سے اعراض کرتے ہوئے صرف ۱۸۵۶ء سے واقعات کو اجمالاً شروع کرتے ہیں جبکہ برطانیہ کو کافی اقتدار اور قوت حاصل ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۶ء ۲۵ فروری کو پیرس میں ایک معاہدہ کی مجلس منعقد ہوئی جس میں دولت عثمانیہ، فرانس، انگلستان، روس، اسٹریا، ساڈینیا کے نمائندے شریک ہوئے آخر میں پرشیا کو بھی شریک کر لیا گیا تھا۔ ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد ۳۰ مارچ ۱۸۵۶ء کو صلحنامہ پیرس مرتب ہوا اور مذکورہ بالا سات حکومتوں کے نمائندوں نے اس پر دستخط کئے۔ اس کی خاص دفعات حسب ذیل تھیں۔

(۱) ان حکومتوں نے دولت عثمانیہ کو باضابطہ طور پر مجلس دول یورپ کا رکن بنا لیا اور اس کی آزادی اور اُس کے مقبوضات کی سالمیت کے لئے متحدہ طور پر ضمانت دی۔

(۲) سلطان نے بلا امتیاز نسل و مذہب تمام رعایا کی اصلاح حال کا وعدہ کیا اور یورپین حکومتوں نے صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا مجموعی یا انفرادی طور پر انہیں کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

(۳) بحر اسود تمام قوموں کے تجارتی جہازوں کے لئے کھول دیا گیا لیکن جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔ روس اور دولت علیہ کو اُس کے ساحلوں پر اسلحہ خانہ قائم کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

(۴) وہ تمام علاقے جو دوران جنگ میں فریقین نے فتح کر لئے تھے واپس کر دیئے گئے چنانچہ قارص دولت علیہ کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور کریمیا روس کے۔

(۵) ایک بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں دریائے ڈینیوب بھی تمام قوموں کے جہازوں کے لئے کھول دیا گیا۔

(۶) جنوبی بسرابیا کا علاقہ جس پر روس نے قبضہ کر لیا تھا مولڈیویا میں شامل کر دیا گیا مولڈیویا اور ولاچیا کی ریاستوں پر باب عالی کی فرمانروائی بدستور رکھی گئی۔ روس ان ریاستوں کے حق سے جس کا وہ بلا شرکت غیرے دعوے دار تھا دست بردار ہو گیا اور اُن کے حقوق کا تحفظ مذکورہ حکومتوں نے مجموعی طور پر اپنے ذمہ لے لیا۔ ان ریاستوں کو حکومت خود اختیاری کے حقوق عطاء کئے گئے۔ انہیں مذہب قانون سازی اور تجارت کی پوری آزادی اور ایک قومی مسلح فوج رکھنے کی اجازت دی گئی۔

(۷) سرویا کو بھی یہی حقوق دیئے گئے۔ البتہ قومی فوج رکھنے کی اجازت اُسے نہ ملی۔ اس کے اندرونی معاملات میں باب عالی کی فوجی مداخلت دول یورپ کی اجازت کے بغیر ممنوع قرار دی گئی۔

ضمنی معاہدے صلحنامہ پیرس کے تکملہ کے بعد اسی روز دو معاہدے اور مرتب ہوئے۔ ایک کی رُو سے ۱۸۴۱ء کے معاہدہ کی تجدید کی گئی اور دردانیال اور آبنائے باسفورس میں غیر حکومتوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ دوسرا اسرف زار اور سلطان کے درمیان ہوا جس کی بناء پر ہر فریق کو کچھ چھوٹے اسٹیمر اور چار ہلکی کشتیاں بحر اسود کی ساحلی ضروریات کے لئے رکھنے کی اجازت دی گئی۔

۱۵ اپریل کو ایک عہدنامہ اور ہوا۔ جس میں برطانیہ، آسٹریا، فرانس نے مجموعی اور انفرادی طور پر دولت عثمانیہ کی آزادی اور سالمیت کو قائم رکھنے کی ضمانت لی اور عہد کیا کہ صلحنامہ پیرس کے کسی جزو کی خلاف ورزی جنگ کا سبب قرار دی جائے گی۔ (دولت عثمانیہ جلد دوم صفحات ۱۰۱)

عہدنامہ پیرس کی خلاف ورزی

عہد شکنیاں ع۱ ۱۸۷۰ء میں رُوس نے صلحنامہ پیرس کی خلاف ورزی کی اور اعلان کرتے ہوئے بحر اسود میں جنگی جہازوں کے ذریعہ اپنا تسلط پھر قائم کر لیا۔

ع۲ اور ۱۸۷۸ء میں بسرابیا کا وہ علاقہ جو ۱۸۵۶ء میں اس سے لے کر مولڈیویا

میں شامل کر لیا گیا تھا واپس لے لیا اس وقت دول عظمیٰ میں سے کسی نے بھی صلحنامہ پیرس کی پرواہ نہ کی جس کی رُو سے متفقہ طور پر انہوں نے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کی ضمانت کی تھی۔

ع۳۔ مولڈیویا اور ولاچیا کی ریاستوں میں اتحاد و استقلال کی تحریک پیدا کی گئی اور ۱۸۵۸ء میں دول یورپ کی زیرحمایت الگزنڈر کوزا کو ان متحدہ ریاستوں کا پہلا امیر منتخب کیا گیا۔

ع۴۔ اس کے بعد کریٹ، سرویا، مونٹی نگرو، بوسینیا، ہرزی گونیا، بلغاریا میں بغاوت کی شورشیں برپا کرائی گئیں۔ معاہدہ پیرس پر دستخط کرنے والی حکومتوں میں سے کسی نہ کسی کی ہر ایک کو حمایت حاصل تھی۔ دولت علیہ کے مقبوضات کی حفاظت کا عہد ان شورشوں کے ساتھ پورا کیا گیا اور جب ان بغاوتوں کے فرو کرنے کیلئے عثمانی فوجیں روانہ کی جانے لگیں تو یورپین حکومتوں نے انہیں روکنے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ فرانس اور روس نے ۱۸۵۸ء میں اپنے جہاز مانٹی نگرو کے ساحل پر اس لئے بھیجے تاکہ عثمانی فوجوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکیں۔

ع۵۔ ۱۸۵۸ء میں کریٹ کے یونانیوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ فتنہ وقتی طور پر رفع کر دیا گیا۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں سلطان عبدالعزیز خاں کے دور حکومت میں زیادہ قوت کے ساتھ پھر ابھرا اور ایک مرتبہ حکومت خود اختیاری کے مزید حقوق دیکر باغیوں کو راضی کرنا پڑا۔

ع۶۔ جولائی ۱۸۵۸ء میں جدّہ کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا۔ چند مسلمانوں نے فرانسیسی قنصل اور اُس کے اسٹاف پر حملہ کر دیا۔ جس میں قنصل اور اسکا سکرٹیری مجروح ہوا اور قونصل کی بیوی ماری گئی۔ فوراً ہی انگریزی اور فرانسیسی بیڑے قسطنطنیہ پہنچے۔ باب عالی نے اطمینان دلایا کہ مجرموں کو کافی سزا دیجائے گی لیکن چونکہ سزا میں کچھ تاخیر ہوئی اسلئے انگریزی بیڑے نے جدّہ پہنچکر نامق پاشا والی مکّہ سے جو جدّہ آگئے تھے اور انہوں نے مجرموں کو گرفتار کر لیا تھا مطالبہ کیا کہ مجرموں کو فوراً پھانسی دیدی جائے۔ ورنہ چوبیس گھنٹوں کے بعد گولہ باری شروع کر دی جائے گی۔ نامق پاشا کو باب عالیکے حکم کا انتظار تھا۔ اسلئے انہوں نے فوراً پھانسی دینے میں تامل کیا۔ اس پر انگریزی بیڑے نے گولہ باری شروع کر دی۔ اسی اثنا میں اسماعیل پاشا عثمانی بیڑے کے ساتھ جدّہ پہنچ گئے انہوں نے گولہ باری بند کرا کے مجرموں کو پھانسی کا حکم سُنایا۔ اگر اسماعیل پاشا کا بیڑہ وقت پر نہ پہنچ گیا ہوتا تو جدّہ تباہ ہو جاتا اور برطانیہ سے باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی۔

ے۔ ۱۸۶۰ء میں شام میں دروزیوں اور مارونیوں میں جھگڑا ہؤا۔ دروزی مسلمان تھے اور مارونی کیتھولک عیسائی تھے۔ کشت وخون کی نوبت آئی۔ کسان مارونیوں نے ابتدا کی اور چونکہ یہ ہنگامہ نظام جاگیرداری کی بنا پر ہوا تھا اس لئے انہوں نے اپنے ہم مذہب جاگیرداروں پر پہلے حملہ کیا۔ دروزی شیوخ نے بھی مارونی جاگیرداروں کا ساتھ دیا۔ مگر چند دنوں کے بعد پادریوں کے بھڑکانے سے اس شورش نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ اور نہایت تیزی سے شام کے اکثر حصّوں میں پھیل گئی۔ خصوصاً لبنان میں اس کے شعلے ہر طرف پھیل گئے۔ مارونیوں نے قتل و غارت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن چونکہ دروزی نسبتاً زیادہ طاقتور تھے اس لئے بالآخر غلبہ انہیں کو حاصل ہؤا۔ اور انتقام کے جوش میں انہوں نے ہزاروں عیسائیوں کو قتل کر ڈالا دمشق میں عیسائیوں کا قتل زیادہ ہؤا۔ فرانسیسی مورّخ دلاژون کیر کہتا ہے کہ دمشق میں اگر امیر عبدالقادر الجزائری نہ ہوتا تو ایک عیسائی کی بھی صورت دکھائی نہ دیتی۔ یہ عرب بہادر جس نے سولہ سال تک فرانسیسیوں سے نہایت بیدردی سے جنگ کی تھی دمشق میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ آگ کے شعلے پہلے ہی دفعہ بھڑکے تھے اور درماندوں کی صدا پہلی ہی دفعہ بلند ہوئی تھی اُس نے بلا کسی پس و پیش کے عیسائیوں اور اُن کے قاتلوں کے درمیان اپنے آپ کو ڈال دیا۔ ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ اُس نے عیسائیوں کو عوام الناس سے چھڑایا اور اپنا محل انہیں رہنے کو دیا جو ہزاروں سے آگے پناہ لینے لگے۔ اور عیسائیوں کے سکونتی مقام پر عرب سواروں کی پہرہ بندی کر دی۔ اس شخص نے جو مسلمان اور اولادِ پیغمبر اسلام تھا اور فرانس کا قدیم دشمن تھا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ان خونخوار ٹولیوں کو پسپا کیا جو اسلام اور ٹرکی کے لئے باعث ننگ تھیں اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان بدقسمتوں پر پوشاک کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کیا جنہیں اُس نے موت کے پنجہ سے رہائی دی تھی۔ اُس نے خود اپنی نگرانی میں عیسائی محافظین کو بیروت پہنچایا جہاں اُنہیں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ اس کا یہ ایثار اس کی یہ شرافت اور اُس کی یہ شریفانہ بہادری ایک لمحہ کے لئے بھی کم نہ ہوئی۔ اس کی زندگی کا یہ صفحہ ایسا شاندار ہے جس کے آگے ایک صدی کا کارنامہ بھی مدہم پڑ جاتا ہے۔ (تاریخ دولت عثمانیہ از دلاژون کیر ترجمہ اردو جلد اوّل صفحہ ۵۰۶ دولت عثمانیہ صفحہ ۱۰۶)

یہ واقعات سن کر مسیحی یورپ کے ہر گوشہ سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ فرانس کیتھولک مارونیوں کا خاص حامی تھا اس نے ان کی مدد کے لئے ایک فوج شام میں بھیجنی چاہی مگر اس اندیشہ سے کہ مبادا فرانس شام میں اپنا تسلط قائم کرے پہلے تو برطانیہ اور دوسری حکومتوں نے یہ تجویز منظور نہ کی مگر آخر کار ۳ اگست ۱۸۶۰ء کو سارڈینیا کے علاوہ ان تمام مغربی حکومتوں نے جنہوں نے صلحنامہ پیرس پر دستخط کئے تھے پیرس ہی میں یہ طے کیا کہ بارہ ہزار یورپین فوج شام میں امن قائم کرنے کی غرض سے روانہ کی جائے۔ چنانچہ فرانس نے فوراً چھ ہزار فوج روانہ کی۔ لیکن اس فوج کے شام پہنچنے سے قبل فواد پاشا وزیر خارجہ سلطان کے حکم سے وہاں پہنچ کر اس شورش کو رفع کر چکے تھے۔ اُن کے حکم سے عثمانی فوج کے ایک سو گیارہ سپاہی گولی سے مارے گئے۔ ستاون بڑے بڑے دروزی پھانسی پر لٹکائے گئے اور خود احمد پاشا والی دمشق کو قتل کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد بیروت میں ایک بین الاقوامی کمیشن بیٹھا جس کے فیصلہ کے مطابق سیکڑوں دروزی جلاوطن کر کے طرابلس (افریقہ) بلغراد اور ودین بھیج دیئے گئے۔ خورشید پاشا حاکم بیروت کو موت کی سزا تجویز ہوئی لیکن بعد میں اُن کو معزول کر کے قسطنطنیہ بلا لیا گیا۔ عیسائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لئے سات کروڑ پچاس لاکھ قرش کی رقم باب عالی کی طرف سے منظور ہوئی جو باقساط ادا کر دی گئی۔ لبنان کی آئندہ حکومت کے متعلق کمیشن نے یہ فیصلہ کیا کہ اُسے دولت عثمانیہ کے زیر سیادت خود مختار کر دیا جائے اور اس کے والی کا تقرر سلطان کی عیسائی رعایا میں سے باب عالی کی طرف سے ہوا کرے۔ وہ فوج جو فرانس نے بھیجی تھی نو مہینہ تک شام میں مقیم رہی حالانکہ جس غرض سے یہ فوج بھیجی گئی تھی وہ فواد پاشا کے دمشق پہنچنے کے بعد ہی پوری ہو چکی تھی نو ماہ تک قیام کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن دول عظمیٰ نے دولت عثمانیہ کی حمایت کا جو پیمان صلح نامہ پیرس میں باندھا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ اُس کے ملکی انتظامات میں مداخلت کرنے کے لئے محض نیک مشوروں پر قناعت نہ کی جائے بلکہ حسبِ ضرورت فوجی مدد بھی بہم پہنچائی جائے۔ بالآخر ۵ جون ۱۸۶۱ء کو یہ فوج شام سے روانہ ہوئی۔ (دولت عثمانیہ صفحہ ۱۰۷-۱۰۸)

(۸) ۱۸۶۶ء میں ولاچیا اور مولڈیویا کی ولایتوں نے باضابطہ متحد ہو کر رومانیہ کی ریاست قائم کر لی اور ۱۸۶۸ء میں جرمن شاہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا فرماں روا منتخب کیا۔ یہ کارروائی صلح نامہ پیرس کی مخالف تھی لارڈ ابورسلے لکھتا ہے کہ

دول عظمیٰ کو اس بات کی فکر تھی کہ حتی الامکان باب عالی کو آویزش سے بچایا جائے اس لئے اُن کے سفیروں نے سلطان پر دباؤ ڈال کر شہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا موروثی فرمانروا تسلیم کرالیا (دول عظمیٰ کی یہ خیر اندیشی کوئی نئی چیز نہ تھی۔ باب عالی کو اس کا تجربہ اُس وقت سے ہوتا آیا تھا جب سے دولت علیہ کا زوال شروع ہوتا گیا) رومانیہ پر اگرچہ سلطان کی فرمانروائی نام کے لئے باقی رہی تاہم عملاً وہ گویا آزاد ہوگیا۔ (دولت عثمانیہ صفحہ ۱۱۴ ج ۲)

(۹) سلطنت عثمانیہ کے متعلق دول عظمیٰ کی یہی خیر اندیشی سرویا کے معاملہ میں بھی ظاہر ہوئی صلحنامہ پیرس کی رو سے دولت علیہ کو بلغراد اور سرویا کے تین دوسرے قلعوں میں فوجی دستے رکھنے کا حق حاصل تھا ترکوں کی گذشتہ حکومت کا اتنا ہی نشان باقی رہ گیا تھا۔ لیکن دول عظمیٰ کی سرپرستی میں اہل سرویا نے اس نشان کو بھی مٹا دینے کا فیصلہ کرلیا اور باب عالی سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فوجیں ان قلعوں سے نکال لے۔ بابِ عالی نے معاہدۂ پیرس کی بنا پر انکار کیا اور سرویا کو جنگ کی دھمکی دی۔ لیکن چونکہ اسی زمانہ میں جزیرہ کریٹ میں بغاوت برپا تھی اور باب عالی کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول تھی اسلئے دول عظمیٰ کے سفیروں کا دوستانہ مشورہ قبول ہی کرنا پڑا۔ اور مارچ ۱۸۶۷ء میں ترکی فوجیں بلغراد اور دوسرے سروی قلعوں سے واپس بُلالی گئیں۔ اب سرویا کا استقلال مکمل ہوگیا اور اُس کے امیر نے بادشاہ کا لقب اختیار کرلیا (دولت عثمانیہ ص ۱۱۵)

(۱۰) کریٹ کی بغاوت یونانیوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی۔ یونان اس جزیرہ کو اپنے میں شامل کرلینا چاہتا تھا اور اس غرض سے وہاں کے عیسائیوں کو جو کہ زیادہ تر یونانی نسل کے تھے دولت عثمانیہ کیخلاف برابر اُبھارتا رہتا تھا۔ بغاوت کی شورش زیادہ ہوئی تو اسمٰعیل پاشا خدیو مصر نے بھی اپنی فوجیں دولت علیہ کی مدد کے لئے کریٹ میں بھیجیں اور دولت علیہ نے بھی یکے بعد دیگرے افسر اور فوجیں بھیجیں۔ اخیر میں عمر پاشا بطل کریمیا کو وہاں کا حاکم اور سرعسکر بنا کر بھیجا۔ عمر پاشا کو بغاوت کے فرو کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ قریب تھا کہ وہ اس فتنہ کو پوری طرح دبا دیتے لیکن عین اُسی وقت دول عظمیٰ نے مداخلت کی اور عمر پاشا کو اپنا ہاتھ روک لینا پڑا آخر کار ۱۸۶۹ء میں دول عظمیٰ کی تجویز سے ایک کانفرنس پیرس میں منعقد کی گئی۔

جس کا نتیجہ حسبِ سابق یہ ہؤا کہ سلطان کی طرف سے ایک فرمان جاری کیا گیا جس کی رو سے کریٹ کو حکومتِ خود اختیاری کے بعض حقوق دیئے گئے اور دو سال کا اخراج جو واجب الادا تھا معاف کر دیا گیا۔ نیز اہل جزیرہ فوجی خدمت سے بری کر دیئے گئے۔ اس طرح یہ بغاوت کچھ دنوں کے لئے فرو ہو گئی۔ (دولت عثمانیہ صـ۱۱۶ مختصراً)

(۱۱) ۱۸۷۰ء میں بابِ عالی کو دول عظمیٰ کی دوستی کا ایک اور تجربہ ہؤا۔ صلحنامہ پیرس کی ایک دفعہ کی رو سے بحرِ اسود میں روس اور ترکی کے جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ان دونوں حکومتوں کو اس کے ساحلوں پر بحری اسلحہ خانہ قائم کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی لیکن جب ۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی کی جنگ شروع ہوئی تو روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ پابندی توڑ دینی چاہی اور ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو مذکورہ بالا دفعہ کی شکست کا اعلان کر دیا۔ جرمنی کے وزیر اعظم پرنس بسمارک نے اس جنگ میں روس کی غیر جانبداری اسی قیمت پر حاصل کی تھی کہ "معاہدہ پیرس کی اس خلاف ورزی میں جرمنی روس کی تائید کریگا"، فرانس خود اپنی مصیبت میں مبتلا تھا وہ روس کو برانگیختہ کرنے کیلئے کسی طرح تیار نہ تھا۔ برطانیہ کی عنان حکومت مسٹر گلیڈسٹون کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ قرار دے رکھا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں چنانچہ برطانیہ نے بھی روس کے اس فعل کے خلاف مطلق احتجاج نہیں کیا اور روس نے بحر اسود پر اپنا تسلط پھر قائم کر لیا۔ (دولت عثمانیہ صـ۱۱۶-۱۱۷)

(۱۲) ۱۸۷۵ء میں بوسنیا اور ہرزیگوینا کے باشندوں سے بغاوت کرائی گئی۔ اس میں روس، آسٹریا، جرمنی کا بہت زیادہ ہاتھ تھا۔ بابِ عالی نے بار بار مراعاتیں دیں۔ مگر چونکہ ابھارنے والوں کے مقاصد پورے نہیں ہوتے تھے اس لئے بغاوت فرو نہ ہوئی۔ بالآخر دولِ عظمیٰ نے ظاہری مداخلت کا موقعہ پایا چنانچہ روس، آسٹریا اور جرمنی کے فرمانرواؤں نے باہم مشورہ کیا اور آسٹریا کے چانسلر کاونٹ اندراسی نے بوڈاپسٹ سے وہ نوٹ جاری کیا جو اس کے نام سے مشہور ہے۔ اس نوٹ میں اوّلاً یہ درج ہے کہ دول عظمیٰ بغاوت کے فرو کرنے اور یورپ میں امن قائم کرنے کے لئے سخت بے چین ہیں اور باب عالی ان

اصلاحات کے نافذ کرنے سے جو کہ مدت سے واجب ہو چکی تھیں نہایت قاصر رہا ہے۔ پھر درج ہے کہ سلطان پر دباؤ ڈال کر مندرجہ ذیل مطالبات پورے کرائے جائیں الخ

۳۰ جنوری ۱۸۷۶ء کو دول عظمیٰ کی طرف سے یہ اندراسی نوٹ باب عالی میں پیش کیا گیا۔

۱۱ فروری ۱۸۷۶ء کو سلطان نے تمام دفعات باستثناء ایک دفعہ کے جس میں ٹیکسوں کو صرف مقامی ضروریات میں صرف کرنے پر زور دیا گیا تھا منظور کر لیں لیکن اسکے بعد بھی باغیوں نے ہتھیار نہیں رکھے اور اس بات کا مطالبہ کرتے رہے کہ پہلے اصلاحات جاری کر دی جائیں ۔ باب عالی کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ بغاوت جب تک قائم ہے اصلاحات کی اسکیم نافذ کرنا ممکن نہیں ۔ اس درمیان میں شورش برابر بڑھتی چلی گئی ۔ بوسنیا بھی ہرزیگوینا کے ساتھ شریک ہو گیا ۔ دوسری طرف سرویا، مونٹی نگرو اور بلغاریہ بھی علم بغاوت بلند کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے تھے ۔

(دولت عثمانیہ صفحہ ۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰ مختصراً)

ع ۱۳ باب عالی کی صلح جوئی اور انتہائی مراعات کے باوجود بلقان کے عیسائیوں میں سرکشی کا جذبہ یورپین حکومتوں کی حوصلہ افزائی سے روز بروز مشتعل ہوتا جا رہا تھا کہ ۵ مئی ۱۸۷۶ء کو سالونیکا میں جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس نے سارے یورپ کو ترکوں کے خلاف دفعتاً برانگیختہ کر دیا۔ سبب یہ ہوا کہ ایک بلغاری لڑکی اسلام قبول کر کے اپنے گاؤں سے سالونیکا آئی تاکہ وہاں کی مجلس عالیہ کے سامنے اس کا اعلان کر کے اپنے ایک ہم وطن نوجوان مسلمان سے شادی کی اجازت حاصل کرے۔ جب وہ سالونیکا کے اسٹیشن پر پہنچی تو یونانیوں اور بلغاریوں کا ایک کثیر مجمع پہلے سے موجود تھا ان لوگوں نے لڑکی کے نقاب اور فرغل کو نوچ کر پھینک دیا اور زبردستی ایک گاڑی میں بٹھا کر فوراً امریکن قنصل خانہ میں پہنچا دیا۔ جہاں نائب قنصل نے جو ایک بلغاری عیسائی تھا اور اُسی نے یہ تمام انتظامات کئے تھے لڑکی کو رات بھر چھپائے رکھا اور دوسرے دن اُسے اپنے ایک دوست کے گھر بھیج دیا کہ سراغ نہ مل سکے۔ علی الصبح مسلمانوں کا ایک گروہ جس میں زیادہ تر ادنیٰ طبقہ کے لوگ تھے قنصلخانہ کے پاس جمع ہوا اور لڑکی کی واپسی کا مطالبہ کیا ۔ ادھر سے جواب ملا کہ لڑکی یہاں نہیں ہے اسکے بعد یہ لوگ برہم ہو کر قریب کی ایک مسجد میں اکٹھے ہوئے

اور آئندہ تدبیروں پر غور کرنے لگے۔ بد قسمتی سے مسلمانوں کے اس جوش کی حالت میں جرمن اور فرانسیسی قنصل مسجد میں داخل ہوئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مجمع کو سمجھانے کے لئے مسجد میں گئے یا مسجد کے دروازہ کے قریب تھے اور بھیڑ کے دھکے میں بلا ارادہ اندر پہنچ گئے تھے۔ بہرحال جس صورت سے بھی وہ گئے ہوں مجمع انہیں مسجد کے اندر دیکھتے ہی بے قابو ہو گیا اور چند آدمی کھڑکیوں کی آہنی سلاخیں کھینچ کر ان پر ٹوٹ پڑے اور دونوں کو وہیں ختم کر دیا انگریزی قونصل مسٹر بلنسٹ نے شروع ہی میں مجمع کا رنگ دیکھ کر امریکن نائب قنصل لزارو کے یہاں جو اس ہنگامہ کا اصلی باعث تھا بہت اصرار کے ساتھ کہلا بھیجا کہ لڑکی فوراً واپس کر دی جائے۔ ورنہ جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کی جان خطرہ میں ہے۔ لیکن لزارو نے پہلے تو یہ عذر کیا کہ معلوم نہیں لڑکی کہاں ہے اور جب بلنٹ کے مزید اصرار پر اُس نے لڑکی واپس کی تو وقت گزر چکا تھا اور دونوں قنصل مارے جا چکے تھے اگرچہ باب عالی نے مجرموں کی سزا کے لئے فوراً احکام صادر کئے اور چھ آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی اور بہتوں کو قید کی سزائیں دی گئیں۔ تاہم یورپ کا جوش انتقام اس کے بعد بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ یورپین پریس نے اس آگ کو خوب بھڑکایا اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ سلطنت عثمانیہ کے تمام عیسائیوں کی جانیں خطرہ میں ہیں اور وہاں کی پوری مسلمان آبادی عیسائیوں کے قتل عام پر آمادہ ہو گئی ہے۔ عیسائیوں کے تحفظ کے لئے جو تجویزیں پیش کی گئیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ ترکوں کے مقابلہ میں صلیبی اتحاد قائم کیا جائے۔ (دولت عثمانیہ صفحہ ۱۳۱-۱۳۲)

۱۴۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء میں دستور اساسی کا اعلان کیا گیا۔ اس کے اعلان پر ملک کے ہر طبقہ نے مسرت کا اظہار کیا۔ علماء شیخ الاسلام خیر اللہ افندی کی قیادت میں، عیسائی پادری اپنے بطریقوں کے ساتھ، شاکر افندی جو قسطنطنیہ کے کبار علماء میں سے تھے ننھے طلبا کی جماعت لے کر اور دار السلطنت کے عام باشندے جھنڈے لئے ہوئے جن پر آزادی کا لفظ منقوش تھا مدحت پاشا کے مکان پر مبارک باد دینے کے لئے آئے۔ شام کے وقت تمام مسجدوں میں چراغاں کیا گیا۔ لوگ مشعلیں لئے ہوئے سڑکوں پر گشت کرتے تھے اور سلطان زندہ باد اور مدحت پاشا زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ سلطنت کے تمام صوبوں سے مبارک باد کے تار آئے جن میں مسرت کا اظہار

کیا گیا تھا۔ عیسائی رعایا کے لئے دستور اساسی کا اعلان خواہ کتنا ہی مسرت کا باعث ہوا ہو لیکن یورپین حکومتوں خصوصاً برطانیہ کو یہ چیز پسند نہ آئی کیونکہ اس سے دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں اُن کی مداخلت کا بہت کچھ سدباب ہو رہا تھا۔ سب سے پہلا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس دستور کا مقصد محض دول یورپ کی اس کانفرنس کو شکست دینا تھا جو عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے منعقد ہونے والی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دستور کا اعلان اُسی روز ہوا جس روز کانفرنس منعقد ہوئی۔ لیکن اس کے لئے مدحت پاشا اور اُن کے ساتھی ایک سال سے کوشش کر رہے تھے۔ جیسا کہ سرہنری ایلیٹ سفیر برطانیہ کے ایک خط سے صاف معلوم ہوتا ہے جو رسالہ نائنٹینتھ سنچری بابت فروری ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ سرہنری لکھتے ہیں۔ الخ (دیکھو دولت عثمانیہ ص۱۵۵ جلد ۲)

ع۱۵ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو جس روز قانون اساسی کا اعلان ہوا قسطنطنیہ میں دول عظمٰی کے نمائندوں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ ابتدائی کارروائی مشکل سے ختم ہوئی تھی کہ باسفورس کے دوسرے کنارہ سے توپوں کی آواز آنے لگی صفوت پاشا وزیر خارجہ دولت عثمانیہ نے کھڑے ہو کر ارکان مجلس کو مخاطب کیا اور کہا کہ ان توپوں کی آواز جو آپ سن رہے ہیں وہ سلطان المعظم کی طرف سے اعلان قانون اساسی کی دلیل ہے اور یہ قانون بلا استثناء سلطنت کی تمام رعایا کے حقوق و حریت کا کفیل ہے کانفرنس کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا اب اس کا انعقاد اور اس کی کارروائیاں فضول ہیں صفوت پاشا کی تقریر سے مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اگناتیف (سفیر روس) نے مہر خاموشی توڑ اور یہ تجویز پیش کی کہ کانفرنس کو اپنا کام شروع کرنا چاہیئے۔ دول عظمٰی کے وکلا ایک مہینہ سے قسطنطنیہ میں مقیم تھے اور باہم جلسے کر رہے تھے۔ ان جلسوں میں ترک مندوبین عمداً شریک نہیں کئے گئے تھے۔ ۲۳ دسمبر کے باضابطہ اجلاس سے پہلے وہ لائحہ عمل جو دولت علیہ کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا طے کر لیا گیا تھا اس غیر معمولی کارروائی کا مقصد باب عالی کو یہ یقین دلانا تھا کہ کانفرنس جو فیصلہ کرے گی وہ دول یورپ کا متفقہ فیصلہ ہوگا اور باب عالی کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ وہ دول عظمٰی کی رقابتوں سے کچھ فائدہ اٹھا سکے گا چونکہ تمام معاملات حقیقتاً پہلے ہی طے کر لئے گئے تھے اسلئے کانفرنس کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ اپنے فیصلوں کو باضابطہ طور پر

مرتب کردے۔ چنانچہ کانفرنس کی کارروائی روسی سفیر کی اس تجویز سے شروع ہوئی کہ صوبہ بلغاریہ کو حکومت خوداختیاری دے دی جائے۔ وہاں ایک عیسائی والی مقرر کیا جائے اور ایک قومی ردیف قائم کیجائے اور ترکی فوجیں صرف چند متعین قلعوں میں باقی رکھی جائیں ترک مندوبین کے اس جواب پر کہ یہ امور دائرہ بحث سے بالکل خارج اور قطعاً ناقابل قبول ہیں۔ یہ تجویز یوں ترمیم کردی گئی کہ بلغاریہ کو ایک خاص گورنمنٹ دے دی جائے۔ ایک بین الاقوامی کمیشن اس کے انتظامات کی نگرانی کے لئے مقرر کردیا جائے اور اسکے گورنر کا تقرر دول عظمیٰ کی منظوری سے ہوا کرے ساگنا تیف (سفیر روس) نے یہ تجویز کم سے کم مطالبہ کے طور پر پیش کی تھی۔ ترک مندوبین نے اس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ سرویا اور رومانیا کی مثالیں سامنے ہیں جن کو مخصوص رعایتی حکومتیں دی گئی تھیں اور وہی خاص انتظامات ان کے لئے بھی کئے گئے تھے جو بلغاریہ کے لئے تجویز ہو رہے ہیں۔ لیکن نتیجہ کو دیکھتے ہوئے اسی تجربہ کو بلغاریہ میں دہرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ انہوں نے بتایا کہ سرویا اور رومانیا کی مسلمان آبادی کے ساتھ رواداری اور مساوات کا وہ سلوک نہیں کیا گیا جس کا وعدہ کیا گیا تھا اور جو بطور شرط کے منظور کیا گیا تھا۔ برخلاف اس کے وہاں کے مسلمان باشندے ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ علاوہ بریں یہ ریاستیں زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کے بعد بھی جب کہ انہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع باقی نہ رہ گیا سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں سے اتحاد کرنے یا اس کے خلاف سازش کرنے سے کبھی باز نہ آئیں۔ بالآخر طویل بحث ومباحثہ کے بعد دول عظمیٰ کے نمائندوں کی طرف سے کم سے کم مطالبہ یہ پیش کیا گیا جس میں اب کسی تخفیف کی گنجائش نہ تھی کہ مقامی حکام کی مدد کے لئے ایک قنصل کمیشن مقرر کردیا جائے اور بلغاریا، ہرزیگوینیا اور بوسینیا کے صوبوں کے والی پہلے پانچ سال تک دول عظمیٰ کی منظوری سے مقرر کئے جائیں۔ ترک مندوبین اس تجویز سے بھی اتفاق نہ کرسکے انہوں نے کہا قنصلی کمیشن کا تقرر قوم کے حقوق خاص میں رخنہ اندازی کا باعث ہوگا جسے منظور کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ ایک عملی دشواری یہ بھی ہے کہ ان صوبوں کے لئے کوئی مخصوص انتظام کردینے سے سلطنت کے دوسرے صوبوں میں بے اطمینانی پیدا ہوجائے گی اور غالب ہے کہ بعض میں

شورش بھی رُونما ہو جائے ۔ انہوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ یہ موقع سلطنت کے کسی ایک حصہ کے لئے مخصوص مراعات حاصل کرنے کا نہیں ہے جبکہ سلطان کی طرف سے ایک ایسے دستور کا اعلان کر دیا گیا ہے جس میں بلا امتیاز تمام رعایا کو سلطنت کے ہر حصہ میں زیادہ سے زیادہ امکانی آزادی اور مساوی حقوق دیئے گئے ہیں اس پر جنرل اگنا نیف نے ایک نہایت سخت تقریر کی جس کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔ اور ارکان نے ترک مندوبوں کی اس احتجاجی تقریر کے سننے کا بھی انتظار نہیں کیا جو اگنا نیف کی تقریر کے جواب میں وہ کرنا چاہتے تھے ۔ بہرحال یہ آخری ترمیم شدہ تجویز دول عظمٰی کے نمائندوں نے ایک الٹی میٹم کی شکل میں باب عالی میں بھیجی اور یہ دھمکی دی کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اس کا جواب قابل اطمینان نہ آیا تو ہم قسطنطنیہ سے روانہ ہو جائیں گے ۔ مدحت پاشا نے سلطان کے حکم سے ایک مجلس عالیہ منعقد کی جس میں سلطنت کی تمام قوموں کے نمائندے شریک کئے گئے اور اُن کے سامنے کانفرنس کی یہ آخری تجویز پیش کی گئی ۔ مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں صاف صاف بتا دیا کہ اگر یہ تجویز مسترد کر دی گئی تو جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں اس کے بعد حاضرین نے پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا۔

رؤف بے بن رفعت پاشا نے کہا کہ لڑائی مثل بخار کی بیماری کے ہے جس سے بچنا ممکن ہے لیکن کانفرنس کی تجویز مثل پھیپھڑوں کی دق کے ہے جس کا لازمی نتیجہ قبر ہے ۔ صاد پاشا نے ایک طویل خطبہ میں کہا کہ ہم اپنی عزت کی اہانت پر موت کو ترجیح دیتے ہیں ۔ وکیل بطریق ارمنی نے بھی ایک لمبی تقریر کی جس میں کانفرنس کے مطالبات کے مسترد کرنے پر زور دیا ۔ غرض مجلس نے متفقہ طور پر دول عظمٰی کے مطالبات منظور کرنے سے انکار کر دیا ۔ دول عظمٰی کے الٹی میٹم کے خلاف مجلس عالیہ کا یہ فیصلہ یقیناً تعجب خیز تھا ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز وہ اتفاق و اتحاد تھا جو اس نازک موقعہ پر وطن کی محبت اور عزت کے لئے مجلس کے مسلمان عیسائی اور یہودی ممبروں میں ظاہر ہو رہا تھا یونانی اور کیتھولک، آرمینی ممبروں کا جوش خصوصیت کے ساتھ بہت نمایاں تھا ۔ باب عالی نے اس فیصلہ کی اطلاع دول عظمٰی کے نمائندوں کو دے دی ۔ چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۸۷۷ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ

ہو گئے اور کانفرنس برخاست ہو گئی۔ (دولت عثمانیہ صفحہ ۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱)

۲۴ اپریل ۱۸۷۷ء کو روس نے اعلان جنگ باضابطہ کر کے عثمانی سرحدوں کو عبور کرنے کا حکم دے دیا رومانیہ کو جو کہ دولت علیہ کا باجگذار تھا روس سے مل گیا بشرط یہ کی کہ اس کی آزادی اور خود مختاری تسلیم کر لی جائے اور روسی فوجوں کو رومانیہ کے علاقوں سے گزرنے کی اجازت دے دی اور پھر باضابطہ طور پر اعلان جنگ کر کے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مونٹی نگرو نے بھی صلح توڑ کر از سر نو جنگ شروع کر دی۔ زار روس نے رایشٹاٹ میں شہنشاہ آسٹریا سے ملاقات کر کے اُسے مطمئن کر دیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا مطلقاً ارادہ نہیں رکھتا اور یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ اگر اس جنگ میں آسٹریا غیر جانبدار رہا تو بصورت فتح بوسنیا اور ہرزیگوینا کے صوبے اس کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ ۸ جون ۱۸۷۷ء میں روس نے انگلستان کی غیر جانبداری بھی اسی قسم کے ایک معاہدہ سے حاصل کر لی اور وعدہ کیا کہ مصر اور نہر سویز سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور نہ قسطنطنیہ یا آبنائے باسفورس پر حملہ ہو گا۔ اس جنگ کے زمانہ میں سرویا نے بھی اعلانِ جنگ کر کے نیش پر قبضہ کر لیا۔ ترکی فوجوں نے نہایت بہادری کے ساتھ روسیوں کو شکست پر شکست دی۔ پہلے پہل جبکہ روسی کمانڈر جنرل گورکو کوہ بلقان طے کرتا ہوا درّہ شپکہ پر حملہ آور ہوا اور اسے ترکوں سے لے لیا تو روس کے لئے اب آکوزنہ (ایڈریانوپل) اور وہاں سے قسطنطنیہ کا راستہ کھلا ہوا تھا اس نازک موقع پر سلطان نے فرانسیسی نو مسلم محمد علی کو جو کریٹ کا گورنر جنرل تھا تمام عثمانی افواج کا سپہ سالار اعظم مقرر کر کے روسیوں کے مقابلہ میں روانہ کیا۔ محمد علی کے پہنچتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ روسی کمانڈر جنرل گورکو اپنے بلغاروی حلیفوں کی مدد کے باوجود ''اِستارازگورا'' میں شکست کھا کر کوہ بلقان کی طرف بھاگا۔ اسی اثناء میں عثمان پاشا ''ودین'' سے نکل کر ''پلونا'' میں آگئے تھے۔ جو دریائے ڈینوب کے جنوب میں بیس میل کے فاصلہ پر ہے جنرل شلڈر (روسی کمانڈر) نے حملہ کرنے میں عجلت کی مگر اس کی فوج کو نہایت بے ترتیبی کے ساتھ پسپا ہو کر ''نائیکوپولیس'' میں پناہ لینی پڑی اس کے بعد ایک دوسری روسی فوج جنرل کروڈنر کی قیادت میں آگے بڑھی لیکن اُسے

بھی اپنے آٹھ ہزار مقتول میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ پلونا کا چھوٹا سا شہر روسی فتوحات کے لئے سب سے بڑا سنگ راہ ثابت ہوا۔ مسٹر ایلین فلپس اس موقع پر لکھتا ہے۔

"اب جنگ کا سارا نقشہ یک بیک بدل گیا تھا۔ زار یگرینڈ قسطنطنیہ پر فاتحانہ شوکت وجلال کے ساتھ پیشقدمی کرنے کا وہ خواب جو باوجود گذشتہ تلخ تجربات کے روسی اب تک دیکھ رہے تھے نسیا منسیا ہو گیا۔ فی الحال تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ نہیں بلکہ روسی سلطنت موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور تمام یورپ کی نظریں انتہائی بیم ورجا کے ساتھ اس محاربہ پر جمی ہوئی تھیں جو بلغاریہ کے ایک معمولی شہر کے گرد رونما تھا اور جس کے انجام سے سارے مشرق کی قسمت وابستہ تھی روسی متنفر جنگی میں اس خطرہ کا پورا احساس تھا۔ گرینڈ ڈیوک نکوکس نے محمد علی کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کے لئے فوج کا ایک حصہ چھوڑا اور فوج کے اصلی حصہ کو جس کی تعداد ستر ہزار تھی ہمراہ لے کر بسرعت تمام پلونا پہنچا۔ یہاں پہنچ کر ۱۱ ستمبر کو اس نے ایک زبردست حملہ کیا جس کے متعلق اس کو امید واثق تھی کہ وہ پچھلی ناکامیوں کی کافی سے زیادہ تلافی کر دے گا۔ مگر اس کا انجام سنگین تر ہوا اس میں شک نہیں کہ داہنے بازو پر رومانیوں اور دائیں بازو پر سکوبلیف نے ترکی مقامات پر قبضہ کر لیا تھا لیکن مرکزی حملہ خوفناک خونریزی کے ساتھ جس میں سولہ ہزار مقتول ومجروح ہوئے پسپا کر دیا۔ ان سب سے زیادہ تہلکہ انگیز وہ خبر تھی جو ایشیا سے موصول ہوئی جہاں مختار پاشا نے روسی حملہ آوروں کو جو میلیکاف کے زیر کمان تھے سرحد پار بھگا کر غازی کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ پے درپے تین حملوں میں ہزیمت اٹھانے کے بعد روسیوں کو اندازہ ہو گیا کہ پلونا کو فتح کرنے کی اسکے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کا محاصرہ سختی سے کر لیا جائے۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی تقریباً پانچ ماہ تک حیرت انگیز استقلال اور جانبازی کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار روسیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد جب سامان رسد بالکل ختم ہو گیا اور رسد نہ پہنچنے کی وجہ سے فاقوں پر فاقے کرنے پڑے تو عثمان پاشا اپنے بتیس ہزار فاقہ کش سپاہیوں کو لیکر نکلنے اور حصار توڑنے پر مجبور ہوئے انتہائی بہادرانہ جنگ کی جس میں زخمی ہو کر بے ہوش ہو کر

گر پڑے اور افسر کو اس طرح مجبور اور زخمی دیکھ کر فوج نے بھی ہمت ہار دی۔
عثمان پاشا کو جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو زار روس کے سامنے پایا۔ فوراً ہتھیار کھول کر زار کے سامنے ۱۰ دسمبر ۱۸۷۷ء کو ڈال دیئے۔ اس کے بعد زار روس اڈریانوپل میں فتحیاب ہو کر داخل ہو گیا تو انگلستان اور آسٹریا بھی روس کے خلاف تیار ہو گئے۔ اس وجہ سے کہ روس فتح یاب ہونے کے بعد ان معاہدہ ہائے سابقہ پر قائم نہ رہے گا۔ آسٹریا نے ایک فوج کوہ کارپیتھین میں تعینات کر دی انگلستان نے بحری بیڑہ خلیج بسیکا میں جو کہ درہ دانیال کے دہانہ پر ہے روانہ کیا اور پھر درہ دانیال میں داخل ہونے کا حکم دے دیا اور اپنی پارلیمنٹ سے روس کے خلاف جنگ کے لئے ساٹھ لاکھ پونڈ کی منظوری لے لی۔ واضح ہو کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ابتدائی جنگ میں دو فریق تھے۔ ایک دولت عثمانیہ کا حامی تھا جس میں برٹش وزیر اعظم بیکنس فیلڈ کی پارٹی تھی جو کہتی تھی کہ ترکوں کی حمایت کی جائے ورنہ خطرہ ہے کہ روس قسطنطنیہ پر قابض ہو جائے جو کہ سراسر برطانیہ کے مصالح کے خلاف ہے اور دوسری پارٹی جس کی اکثریت تھی وہ اس کی مخالف تھی۔ مگر ایڈریانوپل میں زار کے داخل ہونے کے بعد دوسری جماعت نے بھی اپنی رائے بدل دی۔ اور روس کو متنبہ کیا کہ اگر روس نے قسطنطنیہ کی طرف کوئی قدم اٹھایا تو یہ اقدام برطانیہ کے ساتھ جنگ کا اعلان سمجھا جائے گا۔ چنانچہ روس نے کوئی اقدام نہیں کیا اور دولت علیہ سے صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی۔ ۳۱ جنوری ۱۸۷۸ء کو فریقین کے نمائندوں نے عارضی صلح کے ایک نوشتہ پر اورنہ میں دستخط کر دیئے۔ اس عارضی صلح کے بعد گرانڈ ڈیوک نکولس (زار روس) نے اپنا فوجی مستقر بحر مارمورا کے ساحل سان اسٹیفانو میں قائم کیا۔ جہاں سے قسطنطنیہ کے منارے نظر آتے تھے اور برطانیہ نے اپنے جنگی جہاز جزائر الملوک سے کچھ فاصلہ پر جہاں سے قسطنطنیہ نظر آتا تھا کھڑے کئے اور حکم جاری کیا کہ یہ جہاز ہر وقت مستعد رہیں۔ اندیشہ تھا کہ روس اور برطانیہ میں عنقریب جنگ چھڑ جائے گی۔ عہد نامہ تیار کیا گیا جو کہ معاہدہ سان اسٹیفانو کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ میں دولت عثمانیہ کے خلاف تو بہت سخت شرطیں تھیں ہی مگر خود روس کے حلفاء رومانیہ، سرویا، آسٹریا، ہنگری

یونان، بلغاریہ وغیرہ کے بھی بہت سی مخالف شرائط تھیں۔ جن کو روس کی رقیب حکومتیں انگلستان فرانس، جرمنی، آسٹریا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ اس وجہ سے یورپ میں چاروں طرف ایسا شور برپا ہوا کہ خود روس بھی سخت مرعوب ہو گیا۔ اس میں وہ تمام باتیں تسلیم کر لی گئیں تھیں جو کہ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء میں دول عظمیٰ کے نمائندوں نے قسطنطنیہ کانفرنس میں پیش کی تھیں۔ اور بہت سی زائد باتیں تھیں جن کی وجہ سے دولت عثمانیہ نہ صرف کمزور ہوتی تھی بلکہ اُس کے بہت سے حصے قبضہ سے نکل جاتے تھے۔ (دیکھو دولت عثمانیہ صفحہ ۱۶۷ تا ۱۷۰)

چنانچہ تجویز ہوا کہ برلین میں تمام دول کے نمائندے جمع ہوں اور ان شروط پر از سر نو گفتگو کی جائے۔ روس اس پر اس شرط سے راضی ہوا تھا کہ اس کانگریس میں صرف وہی دفعات رکھی جائیں جن کو روس پیش کرنا مناسب سمجھے۔ مگر برطانیہ کو اصرار تھا کہ تمام دفعات زیر بحث لائی جائیں۔ اس پر جانبین میں اس قدر کشیدگی ہو گئی کہ پختہ گمان ہو گیا کہ برطانیہ اور روس میں عنقریب جنگ چھڑ جائے گی۔ چنانچہ لارڈ بیکنسفیلڈ۔ (وزیراعظم برطانیہ) نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ہندوستانی فوجیں مالٹا کو روانہ کر دی گئیں۔ دوسری طرف وزیر خارجہ برطانیہ نے ایک گشتی مراسلہ دول عظمیٰ کے پاس بھیج کر ان اعتراضات کو واضح کر دیا جو حکومت برطانیہ کو معاہدہ سان اسٹیفانو پر تھے۔ زار نے دیکھا کہ آسٹریا بھی جنگ کے لئے آمادہ ہے۔ رومانیہ میں روس کی بے وفائی کے خلاف سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے۔ علاوہ بریں خود اس کی سلطنت میں بھی بے اطمینانی کے آثار نمایاں تھے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر اس کو برطانیہ کی خواہش کے مطابق کانگریس کا انعقاد کو نامنظور کرنا پڑا۔ مگر دونوں حکومتوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس میں وزارت برطانیہ نے وعدہ کیا کہ وہ کانگریس میں صلحنامہ اسٹیفانو کی تمام اہم دفعات سے متعلق روس کی حمایت کریگی۔ اس شرط کے ساتھ کہ جدید بلغاریہ کی قطع و برید میں روس برطانیہ کا ساتھ دیگا۔ یہ معاہدہ بالکل خفیہ تھا لیکن وزارت خارجہ کے ایک ملازم کی غلطی کی وجہ سے پریس کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ اسی طرح برطانیہ کا ایک خفیہ معاہدہ باب عالی سے ہوا جس کی بنا پر باب عالی کو جزیرہ سائپرس (قبرص) برطانیہ کو دینا پڑا جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

الحاصل ۱۳ رجون ۱۸۷۸ء کو دول عظمیٰ کے نمائندوں کی ایک عظیم الشان کانگریس پرنس بسمارک کے زیر صدارت برلن میں منعقد ہوئی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس کو ان تمام مسائل پر از سر نو بحث و تصفیہ کا حق حاصل ہے جو معاہدہ اسٹیفانو میں مذکور تھے لیکن بہت جلد یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ روس اور برطانیہ کے خفیہ معاہدہ کی وجہ سے کانگریس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ کانگریس کی صدارت کی کرسی پر اگرچہ بسمارک متمکن تھا لیکن کانگریس میں لارڈ بیکنسفیلڈ (وزیر اعظم برطانیہ) ہی کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد جس میں اکثر یہ اندیشہ ہوتے لگتا تھا کہ ساری گفت و شنید درہم برہم ہو جائے گی۔ ۱۳ر جولائی کو ایک معاہدہ مرتب ہوگیا اور ارکان کانگریس نے اس پر دستخط کر دیئے۔ عہد نامہ برلن کی رو سے معاہدہ اسٹیفانو کی وہ شرائط جو نہایت سخت اور دور رس تھیں بہت کچھ معتدل کر دی گئیں اور تقریباً معاہدہ سان اسٹیفانو تمام تر باطل کر دیا گیا۔

(تفصیل دولت عثمانیہ ص ۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲ جلد ۲ میں دیکھئے)

برلن کانگریس میں سلطنت عثمانیہ کی حمایت کا مظاہرہ سب سے زیادہ جس طاقت نے کیا تھا وہ برطانیہ تھی لیکن معاہدہ سائپرس کے افشا کے بعد تونس کے متعلق جو معاہدہ برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں میں ہوا اور جس کی بنا پر تونس کو جو اسوقت تک دولت علیہ کی فرمانروائی میں داخل تھا فرانسیسی عسکریت کا شکار بنا کر آگ اور خون کی راہ سے حکومت فرانس کے قبضہ و اقتدار میں لایا گیا وہ برطانیہ کی دوستی کی حقیقت واضح کرنے کے لئے بالکل کافی ہے۔ کانگریس میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ برطانیہ کے لئے نہایت تشویشناک تھا۔ روس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور جنگ کے آخری ایام میں خود قسطنطنیہ اس کی زد میں آگیا تھا ایسی صورت میں برطانیہ کی مداخلت اور کانگریس کے اجلاس میں سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کے تحفظ پر زور دینا کچھ اس سبب سے نہ تھا کہ وہ دولت علیہ سے حقیقی ہمدردی رکھتا ہے بلکہ محض اس خوف سے تھا کہ اگر روس کو آگے بڑھنے سے نہ روکا گیا تو مشرق ادنیٰ میں اس کا تسلط قائم ہو جائے گا جو برطانوی مصالح کے لئے حد درجہ خطرناک ثابت ہوگا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ برطانیہ کے اس طرز عمل کا مقصود یہ بھی تھا

کہ سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے جو فائدہ دوسری حکومتیں اُٹھانا چاہتی ہیں اُسے خود اپنے لئے محفوظ کرے۔ چنانچہ عین اُس وقت جب کہ برلن کانگریس میں برطانیہ کا وزیر اعظم لارڈ بیکنسفیلڈ عثمانی مقبوضات کے تحفظ پر نہایت پرجوش تقریریں کر رہا تھا اور اپنی ترک دوستی سے یورپین قوموں کا نشانہ ملامت بنا ہوا تھا معاہدہ سائپرس پر کامل آزادی کے ساتھ باب عالی کے نمائندوں کے دستخط لئے جا رہے تھے اور پھر جب کانگریس کے اختتام سے قبل ہی یہ راز منظر عام پر آگیا اور دوسری حکومتوں کو برطانیہ کی بددیانتی پر طیش آیا تو سلطنت عثمانیہ ہی کے ایک دوسرے صوبہ (تونس) کو فرانس کے حوالہ کر کے جس کی برہمی سے ساری کانگریس اور اس کے ساتھ مشرق ادنیٰ کے تمام برطانوی مصالح کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس دوستی کا حق ادا کیا گیا۔ ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو۔ (صفحہ ۲۱۱-۲۱۳)

۱۷ عہد نامہ برلن نے یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ عثمانی صوبوں کی بجائے یونان، رومانیا، سرویا، مانٹی نگرو، بلغاریہ کی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں جن کا تعلق باب عالی سے محض سالانہ خراج کی حد تک رہ گیا۔ جو صوبے براہ راست باب عالی کے زیر حکومت رہ گئے اُن میں بھی آزادی کی تحریک پیدا ہو گئی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ ۱۸۷۸ء کے بعد سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے آخر عہد حکومت تک کسی بیرونی سلطنت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی دولت علیہ کو مسلسل مختلف صوبوں کے اندرونی ہنگاموں اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف رہنا پڑا۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا خود مختار مملکتوں کی طرف سے بھی کوئی نہ کوئی نزاع برابر جاری رہا۔ اور دول عظمٰے کے کسی نہ کسی رُکن نے انہیں مدد پہنچا کر دولت عثمانیہ کی شکست و ریخت میں حتی الامکان کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

معاہدہ برلن کی رُو سے البانیہ کے دو شہر گوسنجہ اور ریلاوا، مانٹی نگرو کو دے دیئے گئے تھے۔ باب عالی نے حسب معاہدہ مانٹی نگرو کی آزادی تسلیم کر لی اور حسب شروط وہ تمام مقامات جو کہ مانٹی نگرو کو دیئے گئے تھے اُن کا تخلیہ کر دیا مگر اہل البانیہ نے گوسنجہ اور ریلاوا کو مانٹی نگرو میں شامل کرنے سے انکار کیا اور

اس کے لئے البانی لیگ بنائی دونوں قوموں میں جنگ شروع ہوئی۔ بالآخر دول یورپ نے فیصلہ کیا کہ گوسنجہ اور پلاوا سلطنت عثمانیہ کو واپس کئے جائیں اور اُن کے معاوضہ میں ڈلسنو کا علاقہ اور بندرگاہ مانٹی نگرو کو دیدیا جائے باب عالی نے اس فیصلہ کو منظور نہیں کیا تو برطانیہ کی تحریک پر جس کی عنان وزارت گلیڈسٹون کے ہاتھ میں آچکی تھی دول یورپ کا ایک جنگی بیڑا ستمبر ۱۸۸۰ء کو ڈلسنو کے سامنے نمودار ہوا اور باب عالی کو مجبور کر کے فیصلہ منوا لیا گیا۔

ع ۱۸ عہدنامہ برلن میں یونان کے رقبہ کی توسیع کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔ صرف سفارش کی گئی تھی کہ باب عالی اپائرس اور تھسلی کو یونان سے ملحق کر دے۔ تین سال تک دول عظمٰی ریاستہائے بلقان کی حدبندیوں میں مصروف رہیں۔ آخر میں یونان نے بھی مطالبہ کیا کہ اپائرس اور تھسلی بین الاقوامی تصدیق کیساتھ یونان کو مل جائے۔ چنانچہ برلن میں دول عظمٰی کی ایک کانفرنس نے اس مطالبہ کی سماعت کر کے باب عالی سے سفارش کی کہ یہ پورا علاقہ یونان میں شامل کر دیا جائے۔ سلطان نے اس کو نامنظور کر دیا۔ چونکہ دول عظمٰی یونان کی خاطر دولت علیہ سے جنگ چھیڑنے پر آمادہ نہ تھیں اسلئے یہ مسئلہ بدستور قائم رہا پھر بھی گفت و شنید جاری رہی۔ دو سال کی جدوجہد کے بعد ۱۸۸۱ء میں طے پایا کہ تھسلی کا تقریبًا پورا حصہ اور اپایرس کا ایک ثلث یونان میں شامل کر دیا جائے۔ یانینا اور وہ دوسرے علاقے جن میں مسلمانوں کی آبادی تھی یونانی سرحد سے باہر رکھے گئے۔

ع ۱۹ کریٹ، یورپ میں سلطنتِ عثمانیہ کا آخری مفتوحہ علاقہ تھا ۱۶۶۹ء میں دولت عثمانیہ کے قبضہ میں جمہوریہ وینس سے نکل کر آیا۔ اس کے یونانی النسل باشندے نہایت شورش پسند تھے۔ یہاں کے باشندوں نے ۱۹۱۲ء تک (جب تک کہ اس کا الحاق یونان سے ہوا) چودہ بار بغاوتیں کیں۔ واقعات کی تفصیلات کتب تاریخ میں مندرج ہیں۔ یونان ہمیشہ اس کے الحاق کا ساعی رہا۔ اور جس زمانہ میں وہ آزاد نہ تھا اپنی بغاوتوں میں اس کو ابھارتا اور ہمزبان بناتا رہا۔ دول عظمٰی اور یورپین قومیں ہمیشہ ریشہ دوانیاں کرتی رہیں۔ کیوں کہ یہاں کی آبادی میں اکثریت یونانیوں اور عیسائیوں ہی کی تھی اور اس وجہ سے کہ حکومت مسلمان اور ایشیائی تھی

جو کہ یورپ کی آنکھوں میں خار کی طرح ہمیشہ کھٹکتی رہتی ہے۔ اہل یورپ کو کبھی چین نہ پڑا۔ بہر حال تاریخ کے صفحات دل آزار انسانیت سوز واقعات سے بھرے ہوئے ہیں۔ حکومت عثمانیہ نے جس قدر بھی مرحمت کی اسی قدر اُن کی طغیانی بڑھتی گئی اور دول عظمیٰ کو مداخلت کے حیلے ملتے گئے۔ بالآخر ۱۸۹۷ء میں دول عظمیٰ نے کریٹ کی بندرگاہوں پر قبضہ کر کے پورے جزیرہ کی ناکہ بندی کر دی اور ایک اعلان اس مضمون کا شائع کیا کہ آئندہ یہ جزیرہ دول یورپ کے سایۂ عاطفت میں رہے گا جو اس کی حکومت خود اختیاری کی ضامن ہوں گی۔

۲۰ء دول یورپ کی پروردہ نیشنل سوسائٹی نے یونانیوں کو توسیع مملکت کی جو شراب پلائی تھی اس کے نشہ سے وہ بدمست ہو رہے تھے۔ اسی نشہ میں انہوں نے اپنی سرحد عبور کر کے مقدونیہ کے بعض علاقوں پر حملہ کر دیا۔ کریٹ کا دول یورپ کا وہ معاملہ جو ابھی ۱۹ء میں گذر چکا ہے اُن کے نشہ کے سکون کو کافی نہ ہوا۔ باب عالی کے لئے مدافعت ناگزیر تھی۔ چنانچہ ۱۷ اپریل ۱۸۹۷ء کو باب عالی کی طرف سے بھی اعلان جنگ ہوا۔ ترکوں کے پہلے ہی حملہ میں یونانیوں کا نشہ ہرن ہو گیا اور بدحواس ہو کر ہر مورچہ اور میدان جنگ سے بھاگتے رہے ایک ہی مہینہ میں اس جنگ کا جس کے لئے یونانی مدت سے بہت زیادہ بے قرار تھے خاتمہ ہو گیا۔ ترک اُن کا پیچھا کرتے ہوئے تھسلی میں داخل ہو گئے اور قریب تھا کہ ایتھنز (پایہ تخت یونان) تک پہنچ جائیں مگر عین اس وقت جبکہ ادہم پاشا کمانڈر انچیف افواج عثمانیہ پیش قدمی کرتا ہوا بڑھ رہا تھا اور یونانی انتہائی ذلت کے ساتھ ہر جگہ شکست کھاتے ہوئے بدحواس بھاگ رہے تھے دول عظمیٰ کی مزاحمت نے حسب دستور قدیم ترکوں کی راہ روک لی۔ چنانچہ ۲۰ مئی کو انہیں مجبوراً ایک عارضی صلح کے لئے راضی ہونا پڑا۔ مسٹر ایسکویتھ وزیر اعظم برطانیہ نے دول عظمیٰ کی نمائندگی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ خواہ فتح کسی کی ہو نقشہ جغرافیہ یورپ کا بدلا نہ جائے گا۔ چنانچہ صلح میں ترکوں کو تھسلی کے مفتوحہ علاقہ کو خالی کرنا پڑا اور صرف تاوان جنگ چالیس لاکھ پونڈ اور تھسلی کا وہ تھوڑا سا حصہ جو سلطنت عثمانیہ کی سرحد پر واقع ہے لیکر اکتفا کرنا پڑا۔

۲۱۔ ان بے انصافیوں کی وجہ سے یا ذاتی مصالح کی بنا پر جرمنی آسٹریا، ہنگری، دول عظمیٰ کی جمعیتہ سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ تاہم انگلستان، روس، فرانس نے متفقہ طور پر ۱۸۹۸ء میں باب عالی پر دباؤ ڈالا کہ وہ کریٹ سے عثمانی فوجوں اور ترکی عہدہ داروں کو بلالے اور محض خراج قبول کرنے پر اکتفا کرے۔ پھر اس کے کچھ عرصہ بعد چند ہی سالوں میں کریٹ کا باضابطہ الحاق یونان سے دول عظمیٰ کی سرپرستی میں ۱۹۰۸ء میں کر دیا گیا اور سلطنت عثمانیہ کا یہ صوبہ بھی دول عظمیٰ نے آزاد کرا کے اس کو اپنا رہین منت بنا لیا۔ جس طرح انہوں نے یونان وغیرہ کو اپنا رہین منت بنایا تھا۔

۲۲۔ سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں دخل دینے کے لئے دول عظمیٰ کو کسی خاص حیلہ کے تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ عیسائی رعایا کے حقوق کا تحفظ ہر مداخلت کے لئے کافی عذر ہو سکتا تھا۔ تمام یورپین حکومتوں نے اپنی اپنی جگہ پر یہ فرض کر رکھا تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں کے ساتھ بے انتہا مظالم ہو رہے ہیں اور اس کے لئے ہمیشہ ایسا پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا جس میں دروغ گوئی ہنر شمار کی جاتی تھی۔ (محبت اور عداوت میں جھوٹ اُن کے یہاں نہ صرف جائز بلکہ واجب بھی ہے) اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی اُن کا نظریہ تھا کہ ان مظالم کے تدارک کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ عیسائیوں کو دولت علیہ کی فرمانروائی سے آزاد کرا کر اُن کی خود مختار حکومتیں قائم کرا دی جائیں۔ یونان، سرویا، بلغاریا، رومانیا کریٹ وغیرہ یہ تمام صوبے اسی مقصد کے ماتحت دول عظمیٰ کی سرپرستی میں سلطنت عثمانیہ سے علیحدہ کر دیئے گئے تھے۔ اب صرف دو علاقے ایسے اور رہ گئے تھے جن میں عیسائی آبادی کی اکثریت تھی۔ آرمینیہ اور مقدونیہ اُن کی آزادی کے بغیر کب دول یورپ کو آرام اور چین آ سکتا تھا۔ اس باب میں برطانیہ اور بالخصوص مسٹر گلیڈسٹون بہت ہی پیش پیش رہے اور ایسے ایسے بے اصل رنجدہ اور دلخراش واقعات گھڑتے رہے جو کہ نہایت مبالغہ آمیز تھے یا جن کی کوئی واقعیت نہ تھی۔ خود عیسائیوں نے ان کی تردید کی ہے مگر یورپ اور بالخصوص برطانیہ نہایت بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ ان کی نشو ونما اور اعلان کرتا رہا۔ تاریخ

کی کتابیں ان سے بھری ہوئی ہیں۔ یورپ اور بالخصوص برطانیہ نے ارمینیوں کی مظلومیت اور دولت عثمانیہ کی ظالمیت کو جس انتہائی مبالغہ کے ساتھ سراہا ہے وہ بے مثال ہے۔ مولف دولت عثمانیہ نے بھی مثل دیگر مورخین کچھ مختصراً ذکر کیا ہے۔ (دیکھو صفحہ ۱۰۲ جلد ثانی تا صفحہ ۲۰۶ وغیرہ)

ع۲۳ ابتدا ابتدا میں تو یہ یورپین حکومتیں انہیں صوبوں کے متعلق شور و غوغا مچاتی رہتی تھیں جن کی آبادی میں عیسائی اکثریت تھی انہیں کے حقوق کا تحفظ مداخلت کا حیلہ بنایا جاتا تھا اور ان کو دولتِ عثمانیہ سے کاٹ کر آزاد کرانا فرض منصبی قرار دیا جاتا تھا۔ تمام یورپین پریس اور ارباب اقتدار اسی کام میں لگے رہتے تھے انصاف و صداقت حق گوئی اور عدالت کو سبھوں نے بالائے طاق رکھ دیا تھا اگر کوئی منصف مزاج کوئی حق بات کہہ بھی دیتا تو اس کو اس طرح دبا دیا جاتا تھا کہ کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ ترکی پریس بہت کم تھا اُس کی آواز ان کوؤں کی کائیں کائیں میں کسی کو سنائی بھی نہ دیتی تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ دولت عثمانیہ کو سخت بدنام کر کے دنیا سے نیست و نابود کر دیا جائے۔ ورنہ کم از کم یہ تو ضرور ہو جائے کہ اس بہادر اور ایشیائی قوم کو یورپ سے جلد از جلد نکال دیا جائے۔ اندرون حکومت بھی اس قدر کمزوریاں، ریشہ دوانیوں اور مختلف غداریوں سے پیدا کر دی گئی تھیں کہ باوجود ذمہ داران دولت علیہ کی انتہائی کوششوں اور بیداریو کے روز بروز انحطاط ہی ہوتا جاتا تھا۔ ایک سوراخ بند کرتے تھے تو دوسرے چار پیدا ہو جاتے تھے۔ اس انحطاط کو دیکھ کر اخیہ میں دشمنوں کے حوصلے بڑھ گئے اور یہ اندازہ ہو گیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے یا خالص مسلم آبادی ہے اُن سے بھی فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ اس کے لئے صرف موقعہ کے منتظر تھے۔

ایک طرف تو وہ باب عالی پر زور ڈال کر ہر ممکن طریقہ سے عیسائی رعایا کو آزاد کرا رہے تھے دوسری طرف سلطنت کے اسلامی صوبوں پر قبضہ کے لئے ہر قسم کے بہانے تلاش کر رہے تھے۔ چنانچہ ۱۸۲۹ء میں معاہدہ اورنہ (ایڈریا نوپل) کی رُو سے یونان کی آزادی تسلیم کرائی گئی اور برطانیہ، روس، فرانس کی

متحدہ سرپرستی میں خود مختار حکومت یونان کی قائم کر دی گئی لیکن دوسرے ہی سال ۱۸۳۰ء میں الجیریا (الجزائر) پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ جب قبائل عرب نے اپنے ملک کے تحفظ کے لئے ہتھیار اٹھائے تو حکومت فرانس کی تمام قوت مقابلہ میں آ گئی اور چالیس برس تک فرانسیسی سپاہیوں نے الجزائر میں قتل وغارت گری کا بازار گرم رکھا جو آج تک بھی جاری ہے۔ کسی کے پھوٹے منہ سے ان انسانیت سوز مظالم کے سامنے نہ حق بات نکلتی ہے اور نہ کوئی جمعیۃ ان غریب مظلوموں کی آزادی کے لئے بنائی جاتی ہے اور نہ اُن کو آزاد کیا جاتا ہے۔ کیا یونان، کریٹ، بلگیریا، سرویہ وغیرہ کے باشندے انسان تھے اور یہ الجیریا وغیرہ کے باشندے انسان نہیں ہیں۔

ع ۲۴۔ تونس دولت علیہ کا صوبہ تھا جس پر فرانس کی استعماری نظریں مدتوں سے للچا رہی تھیں۔ مگر کوئی حیلہ قبضہ کے لئے نظر نہ آتا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں جبکہ برلن میں کانفرنس معاہدہ سان اسٹیفانو کی اصلاح و ترمیم کے لئے پرنس بسمارک کی زیر صدارت منعقد کی جا رہی تھی اور نہایت اہم مسائل زیر غور تھے اس وقت دولت علیہ کی تقسیم کا مسئلہ بھی زیر تجویز تھا۔ اس لئے مغربی حکومتوں کے نمائندے ایکدوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ہر ایک کو بدگمانی تھی کہ ممکن ہے کہ دوسرے نے باب عالی سے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے کر رکھا ہو۔ اس بدگمانی کو دور کرنے کے لئے کانگریس کے افتتاح کے وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہر سفیر اس امر کا اعلان کرے کہ مسائل زیر بحث سے متعلق اس کی حکومت نے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے نہیں کر رکھا ہے۔ بیکنسفیلڈ (وزیر اعظم برطانیہ) اور سالسبری حکومت برطانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے اس تجویز سے نہایت سراسیمہ ہوئے۔ لیکن انہیں اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ دوسری حکومتوں کے نمائندوں کی طرح مذکورہ بالا اعلان کرنا پڑا۔

(نوٹ) ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ برطانیہ نے اس سے پہلے باب عالی سے بھی خفیہ معاہدہ کر لیا تھا اور روس سے بھی کر لیا تھا۔ مگر روس کا خفیہ معاہدہ اخیر تک پردۂ راز میں رہا اور باب عالی کا خفیہ معاہدہ مذکورہ ذیل طریقہ سے ظاہر ہو گیا۔

ابھی کانگریس کا اجلاس ختم نہیں ہوا تھا کہ ۱۴ر جولائی کو لندن کے اخبار گلوب میں معاہدہ سائپرس (قبرص) کا مسودہ شائع ہو گیا۔ جس کا واقعہ یہ تھا کہ مارون نامی ایک سیاح جو کہ مشرقی ممالک میں سیاحت کر چکا تھا اور مختلف مشرقی زبانوں سے واقف تھا کہ برطانیہ کی وزارت خارجہ کی طرف سے معاہدہ مذکورہ کا ترکی مسودہ ترجمہ کے لئے اس کو دیا گیا۔ حالانکہ وہ دفتر وزارت میں کسی عہدہ پر مامور نہ تھا۔ اس شخص نے ایک بڑی رقم کے عوض گلوب کے ہاتھ ترجمہ کی ایک نقل فروخت کر ڈالی بہر حال معاہدۂ سائپرس کی اشاعت سے برلن میں برطانوی سفارت پر گویا بجلی سی گر گئی۔ اور اگرچہ لندن میں فوراً مسودہ کی صحت سے انکار کیا گیا۔ تاہم برلن میں حقیقت حال زیادہ دنوں پوشیدہ نہ رہ سکی برطانوی نمائندوں کی بد دیانتی سے کانگریس میں اس قدر برہمی پھیلی کہ اس کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ پرنس گورچاکوف (نمائندہ روس) اور ویڈنگٹن (نمائندہ فرانس) نے علانیہ اپنے غصّہ کا اظہار کیا۔ معاملہ نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کی مزید بدنمائی صرف بسمارک کی کوششوں سے رفع کی جا سکی۔ بسمارک نے "ایماندار دلال" کی حیثیت سے فرانس اور برطانیہ کے درمیان مندرجہ ذیل مصالحت طے کرا دی جس کے بعد ویڈنگٹن کا سارا غصّہ جاتا رہا۔ فرانسیسی اور برطانوی نمائندوں کے درمیان طے پایا کہ:۔

(الف) انگلستان نے سائپرس کو جس طرح خفیہ طریقہ سے حاصل کر لیا ہے اس کی تلافی کے لئے فرانس کو اجازت دی جائے کہ وہ جس وقت کوئی مناسب موقعہ ہاتھ آئے تونس پر قبضہ کر لے۔ انگلستان کی طرف سے کوئی مخالفت نہ ہو گی۔

(ب) مصر میں جو مالیاتی انتظامات ہو رہے ہیں اُن میں فرانس کو بھی انگلستان کے برابر دخل دیا جائے۔

(ج) شام کے رومن کیتھولک عیسائیوں کے تحفّظ کا جو دعویٰ فرانس زمانہ قدیم سے کرتا آیا ہے برطانیہ اسے تسلیم کرے۔

اس معاہدہ کے بعد فرانس کو انگلستان کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور وہ صرف مناسب وقت کا منتظر رہا۔ لیکن جب حملہ کے لئے کوئی معقول حیلہ نظر

نہ آیا تو تونس کے فرانسیسی نمائندے "ٹھیودور روستان" نے بے بنیاد سفارتی شکایات تصنیف کر کے والیٔ تونس "محمد الصادق" کے سامنے ایسے بیہودہ مطالبات پیش کئے جن کو تسلیم کر لینا گویا اس علاقہ کو فرانس کے حوالہ کر دینا تھا۔ اس کے بعد جو ہُوا اسے "اسٹینلی لین پول" اپنی کتاب "بربری قزاق" میں یوں بیان کرتا ہے:۔

"اُن باتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک طاقت ور حکومت نے جس پر مقابل کی مضبوط حکومتوں کی طرف سے کوئی روک نہ تھی۔ ایک نہایت کمزور لیکن ایماندار مملکت کے خلاف خفیہ طور پر اپنی جارحانہ کارروائیاں شروع کر دیں اور بالآخر الجزائر کی سرحد سے متصل بعض قبائل کے ہنگاموں کو غدر قرار دے کر جو ایک مضحکہ خیز غدر تھا تونس پر حملہ کا فیصلہ کر لیا۔ بے فائدہ محمد الصادق نے روستان (سفیر فرانس) کو یقین دلایا کہ قبائل میں امن و امان قائم کر دیا گیا ہے۔ بے فائدہ اُس نے تمام حکومتوں اور خصوصاً انگلستان سے اپیل کی۔ لارڈ گرانویل (وزیر خارجہ انگلستان) نے حکومت فرانس کے بیان پر یقین کر لیا کہ الجزائر اور تونس کے درمیان سرحدی علاقہ میں جو فوجی نقل و حرکت ہونے والی ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ الجزائر کے علاقہ میں سرحدی قبائل کی جو یورشیں برابر ہُوا کرتی ہیں اُن کا خاتمہ کر دیا جائے۔ بے (محمد الصادق) کی آزادی اور اُس کے علاقہ کا استقلال کسی طرح خطرہ میں نہیں ہے۔" (بربری قزاق صفحہ ۳۰۸)

ان تصریحات کے باوجود اپریل ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی فوجوں نے تونس پر حملہ کر دیا۔ اور ۱۲/ مئی کو محمد الصادق نے بالکل مجبور ہو کر معاہدہ قصر السعید پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدہ کی رُو سے تونس پر فرانسیسی تسلّط قائم ہو گیا اگرچہ حکومت نام کے لئے محمد الصادق کی رہی۔ محمد الصادق کے انتقال کے بعد سیّدی علی بے حاکم مقرر ہُوا لیکن اس کی حیثیت بھی فرانسیسی محمیہ کے ایک عہدہ دار سے زیادہ نہ تھی۔ قبائل نے معاہدہ قصر السعید کے بعد بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ تونس کے جنوبی صوبوں نے علانیہ بغاوت کر دی اور کچھ دنوں تک ان صوبوں میں ہر طرف بدامنی پھیلی رہی۔ اس کے استیصال میں فرانسیسی فوجوں نے اپنی سابق روایات کے

مطابق پُوری سرگرمی دکھائی۔ فاس پہ بے دردی کے ساتھ گولہ باری کر کے لوٹ لیا گیا۔ مکانات معہ باشندوں کے جلا دیئے گئے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا اور جو کچھ اس سے قبل الجزائر میں ہو چکا تھا وہ سب تونس میں دہرایا جانے لگا۔ کچھ دنوں بعد بتدریج حالات رو با صلاح ہونے لگے۔ خصوصاً جب روستا وہاں سے واپس بُلا لیا گیا تو امن و امان قائم کرنے میں نسبتاً زیادہ آسانی ہو تی گئی۔ فرانس نے تونس کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کے متعلق لین پول نے ایک فرانسیسی فاضل ہنری ڈی روشفورٹ کا مندرجہ ذیل قول کر کے اصل حقیقت واضح کر دی ہے۔ روشفورٹ لکھتا ہے:۔

"ہم نے تونس کی مہم کو ایک معمولی فریب سے تشبیہہ دی تھی۔ یہ صحیح نہ تھا۔ تونس کا معاملہ مثل قزاقی کے ہے جس کی شدّت قتل کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔"

(بربری قزاق صـ۳۰۹ از دولت عثمانیہ صـ۲۰۶ تا ۲۱۱)

۲۵ع برطانیہ نے دولت علیہ سے دوستی کے جو حقوق وصول کئے وہ محض سائپرس اور تونس پر قبضہ کرنے سے ادا نہیں ہوئے بلکہ ضروری سمجھا گیا کہ اس سے اور بہت زائد وصول کیا جائے چنانچہ مصر پر نظر دوڑائی گئی جس کی کچھ تفصیل ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

۲۶ع۔ روس، برطانیہ، فرانس کے درمیان ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک متعدد عہد نامے ہوئے جن کی بناء پر ان تینوں میں ایک قوی اتحاد قائم ہوا جس کی بنیاد حقیقتہً یہ قرار پائی کہ جہاں تک ممکن ہو اسلامی حکومتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان پر قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جو معاہدہ فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوا اُس میں فرانس کو اجازت دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے مراکش پر قبضہ کرلے۔ اس کے معاوضہ میں فرانس ان تمام حقوق سے دست بردار ہو گیا جو بزعم خود اسے حکومت مصر کی نگرانی میں حاصل تھے اور مصر کی فرمانروائی تمام تر انگلستان کے سپرد کر دی۔

۲۷ع اس کے بعد فرانس کی وساطت سے انگلستان اور روس کا وہ جھگڑا جو کہ ایران

کی نسبت مدتوں سے چلا آتا تھا ۱۹۰۷ء میں یوں ختم کیا گیا کہ ایران کی سلطنت معاہدہ کی رُو سے دو حصّوں میں تقسیم کر دی گئی جن میں سے ایک پر (شمالی ایران پر) روس نے اور دوسرے (جنوبی ایران) پر انگلستان نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔

۲۸۔ مقدونیہ کی تقسیم و بدامنی اور مرزنگ پروگرام

یورپین حکومتوں کی سرگرمیاں یہاں تک ہی محدود نہ تھیں۔ انہوں نے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبوں پر قبضہ کر لیا بلکہ جو صوبے اس کی فرماں روائی میں باقی رہ گئے تھے اُن کے اندر بھی ہر امکانی ذریعہ سے بدامنی اور بغاوت پھیلانے کی کوشش کی۔ ستم یہ تھا کہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی شورشوں کو غدر قرار دے کر یہ حکومتیں عیسائی رعایا کے حقوق کے تحفظ کی خاطر دولت علیہ اندرونی اور انتظامی معاملات میں مداخلت کرتیں اور جہاں تک بس میں ہوتا سلطنت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتیں۔ بلقانی صوبوں کی بغاوت اور آزادی انہیں حکومتوں کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کی رہین منت تھی۔ اگر ایک طرف روس اور آسٹریا کی فوجیں سلطنت عثمانیہ کی سرحدوں پر حملہ آور ہوتی رہیں تو دوسری طرف اُن کے گماشتے عیسائی رعایا کو مسلسل بغاوت کیلئے آمادہ کرتے رہے۔ مسٹر تائٹ جو تیس سال تک ترکی میں رہ کر وہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کر چکے ہیں اپنی کتاب "بیداری ترک" میں لکھتے ہیں۔

"ایک مقولہ ہے کہ ہر قوم کو وہی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ یہ مقولہ صحیح ہو سکتا ہے اگر کوئی قوم اپنی حسب خواہش نظام حکومت قائم کرنے کی آزادی رکھتی ہو۔ لیکن جہاں تک ترکی کا تعلق ہے اُس کے باشندوں کو کوئی موقع اُس حکومت کے حاصل کرنے کا نہیں دیا گیا جس کے مستحق تھے کیونکہ وہ ترکی کے طاقتور دشمنوں کی غرض یہ تھی کہ استبدادی حکومت کی برائیاں قائم رکھی جائیں اور جب کبھی ترکوں نے اپنے اندرونی معاملات کو درست کرنے کی کوشش کی کوئی نہ کوئی مسیحی طاقت اس خوف سے کہ ممکن ہے ایک اصلاح شدہ ترکی ایک قوی ترکی ثابت ہو یا تو مسلح فوجوں کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑی یا مجوزہ اصلاحی

تبدیلیوں کی راہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ علاوہ بریں جو طاقتیں ترکی مقبوضات کو اپنی مملکت میں شامل کرنے کے درپے تھیں وہ اس بات کی نگرانی کرتی رہتی تھیں کہ ترکی کی حدود میں امن نہ رہنے پائے اور وہ اس غرض سے شورشیں برپا کرتی رہتی تھیں وہ عیسائی کسانوں کو بغاوت کے لئے اُبھارتیں اور ہنگامے برپا کراتیں تاکہ مداخلت کرنے اور ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا حیلہ ہاتھ آئے۔ یہ طاقتیں اپنے مقصد کے حصول کے لئے کسی طریقہ کے اختیار کرنے میں تامل نہ کرتیں مثلاً بھیترے فساد پھیلانے والوں میں سے ایک درویش بھی تھا جو روس کا تنخواہ دار مخفی ایجنٹ تھا۔ چند سال ہوئے اُس نے رُوس کی ہدایت کے مطابق ایشیائے کوچک میں کافروں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کی اور مسلمانوں کو عیسائی باشندوں پر حملہ کرنے کے لئے برانگیختہ کیا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے دشمنانِ ترکی کی دغا بازی اور ترکی کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا ہے اس کی ناانصافی ظاہر ہوتی ہے۔" (بیداریٔ ترکی از ناٹ صہ ۳۳۔ دولتِ عثمانیہ صہ ۲۵)

ان شر انگیزیوں کے لئے سب سے زیادہ مناسب سرزمین مقدونیہ کی تھی سلطنت عثمانیہ کا وہ صوبہ تھا جس میں بلغاری، سردی، یونانی اور ترک سب ہی آباد تھے۔ چونکہ بلغاریا، سرویا اور یونان کی نوآزاد شدہ ریاستیں بالکل سرحد پر واقع تھیں اس لئے ان میں سے ہر ایک مقدونیہ کے اس حصّہ کو جہاں اُس کی ہم قوم آبادی زیادہ تھی اپنے اندر شامل کر لینا چاہتی تھی۔ دول عظمیٰ کی طرح ان ریاستوں کو بھی یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ عنقریب فنا ہو جائے گی اور چونکہ اس کے ترکہ کی تقسیم کیوقت مقدونیہ کی سب سے زیادہ حقدار یہی ریاستیں تھیں اس لئے ہر ایک اپنا حصّہ پہلے ہی سے محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔ پروپیگنڈا اور ہنگامہ پروری کا نہایت کامیاب تجربہ اس سے قبل ہو چکا تھا جس کی بناء پر پورا اطمینان تھا کہ یورپ کی بڑی طاقتیں اپنے چھوٹے بچّوں کی حوصلہ افزائی میں مطلق دریغ نہ کریں گی۔ چنانچہ بلغاریا، سرویا اور یونان نے اپنی ہم قوم آبادی کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے

مقدونیہ میں پہلے خفیہ ایجنٹ بھیجنے شروع کئے۔ اور پھر یہ دیکھ کر کہ مخفی تدبیریں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتیں مسلّح جتھے روانہ کئے۔ ان جتھوں نے پورے صوبہ میں ایک قیامت برپا کر دی۔ قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ گاؤں کے گاؤں جلانے لگے ان غارت گروں نے عیسائیوں اور ترکوں کی تمیز بھی اٹھا دی تھی۔ وہ اپنے علاوہ دوسرے فرقوں کے ساتھ یکساں مظالم کرتے تھے چنانچہ اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک بلغاری جتھے نے ایک یونانی پادری کو زندہ جلا دیا۔ مسٹر نائٹ لکھتے ہیں:-

"اس واقعہ پر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اگر یہی چیز مسلمانوں نے کی ہوتی تو کیسا واویلا مچتا"

اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ بھی شدید عداوت رکھتی تھیں۔ ان کے جتھے جس قدر ترکوں کو نقصان پہنچاتے تھے اسی قدر آپس میں بھی قتل و خون کرتے رہتے تھے۔ یونانی جتھے مقدونیہ کی بلغاری اور سردی آبادی کو فنا کر ڈالنا چاہتے تھے۔ تاکہ مقدونیہ کا زیادہ سے زیادہ حصہ یونان میں شامل کیا جا سکے۔ یہی جذبہ بلغاری اور سردی جتھوں کا تھا۔ بلغاری جتھوں کی سرگرمیاں سب سے بڑھی ہوئی تھیں ان ہنگاموں سے بلغاریا کا اصل مقصد یہ تھا کہ دول عظمیٰ کو مقدونیہ کی جانب متوجہ کرے اور ان کی مداخلت سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ دول عظمیٰ کو اسی دعوت کا انتظار تھا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور تمام یورپ کی طرف سے روس اور آسٹریا کو نمائندہ مقرر کر کے مقدونیہ کے لئے ایک نظامِ اصلاح مقرر کرنے کی خدمت سپرد کی۔ اس کام کے لئے اس سے بہتر انتخاب ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں روس اور آسٹریا کی تیار کردہ اسکیم جو مرزنگ پروگرام کے نام سے مشہور ہے متفقہ طور پر منظور کی گئی اور مقدونیہ کی اصلاح کا کام شروع ہوا سلطان عبدالحمید کو بھی یورپ کی متحدہ قوت سے دب کر یہ مداخلت تسلیم کرنی پڑی۔ عثمانی فوجیں جس کشت و خون، آتش زنی اور غارت گری کے استیصال میں ناکام ثابت ہوئی تھیں اُسے ختم کرنے کا بیڑا انہی حکومتوں نے اُٹھایا جن کی شہ پا کر یہ قیامت برپا کی گئی تھی۔ مقدونیہ کا صوبہ تین ولائتوں اسکوب، سالونیکا، موناستر پر مشتمل

تھا۔ ان ولائتوں کے لئے ایک ترکی انسپکٹر جنرل حسین علمی پاشا مقرر کیا گیا اور اُس کی نگرانی کے لئے روس اور آسٹریا کے نمائندے مقرر ہوئے۔ امن وامان قائم رکھنے کی خدمت ایک بین الاقوامی پولیس کو تفویض ہوئی جس کا افسر اعلیٰ ایک یورپین تھا۔ تینوں ولائتیں روس، آسٹریا، انگلستان، فرانس اور اٹلی کے درمیان اس طرح تقسیم کر دی گئیں کہ ہر حکومت اپنے حصّہ کے امن وامان کی ذمہ دار قرار پائی۔ لیکن مشترکہ امور کی نگرانی ایک مرکزی مجلس کے سپرد ہوئی۔ اس نظام کے جاری کرنے کے کچھ دنوں بعد دولِ عظمیٰ نے مقدونیہ کی مالیات کی نگرانی کے لئے ایک بین الاقوامی کمیشن بھی مقرر کر دیا یوں فوجی اور مالی دونوں شعبے دولت علیہ کے ہاتھ سے حقیقتہً نکل گئے لیکن مقدونیہ کی حالت میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا۔ امن وامان قائم کرنے میں بین الاقوامی پولیس بھی ویسی ہی ناکام ثابت ہوئی جیسی عثمانی فوج اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ یونانی اور بلغاری جتھوں کی غارت گری برابر جاری رہی۔ شیویل لکھتا ہے کہ نسلی جماعتوں کی باہمی عداوتیں خصوصاً یونانیوں اور بلغاریوں کی اور پھر اس سے کسی قدر کم سرویوں ولاچیوں اور البانیوں کی دشمنیاں اس درجہ قابو سے باہر ہو گئی تھیں کہ عقل وخرد کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا اور پوری آبادی اپنے آپ کو ہلاک کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جو ریاستیں مقدونیہ کی سرحد پر واقع تھیں وہ ان غارت گروں کی پوری طرح مدد کر رہی تھیں جنہوں نے سلطان کے بعد مقدونیہ پر قبضہ کرنے کے لئے یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ (شیویل ص ۴۳۶۔ دولت عثمانیہ ص ۲۵۳)

مرزنگ پروگرام اور مالیاتی کمیشن کا تقرر ترکوں کی غیرت ملّی کے لئے ایک سخت تازیانہ تھا۔ ان کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ بین الاقوامی مداخلت کی باگ روس اور آسٹریا کے ہاتھوں میں دے دی گئی تھی۔ جبکہ یہ دونوں سلطنتیں دولت عثمانیہ کی شدید ترین دشمن تھیں۔ چنانچہ ترکوں کا خیال تھا اور مسٹر نائٹ جیسے غیر جانبدار اشخاص کے اقوال سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ روس اور آسٹریا نے بالقصد اس پروگرام کو ناکام بنایا اور ان کے نمائندوں نے اس کا نفاذ ایسے طریقہ پر کیا کہ اس سے عیسائیوں میں ہنگامہ وفساد کی آگ

بھڑکتی ہی گئی۔ اس سے غرض یہی تھی کہ یورپین ٹرکی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تجویز آگے بڑھائی جائے۔ (نائٹ ص۹۶۔ دولت عثمانیہ ص۲۵۳)

۱۹۰۴ء کے بعد انگلستان، روس، فرانس نے مردبیمار (ٹرکی) کے مال کے حصے بخرے کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا تھا اور ۱۹۰۵ء کے آخر میں لارڈ لینس ڈاؤن کے زیرقیادت دول عظمٰی کے متحدہ جنگی بیڑوں کا مظاہرہ ایک ایسا کھلا ہُوا اشارہ تھا جسے ہر ترک سمجھ سکتا تھا۔ مسٹر بکسٹن جو بلقان کمیٹی میں انگلستان کے نمائندہ تھے اعتراف کرتے ہیں کہ ترکی حکومت کے دشمن خواہ ذاتی اغراض کی بناء پر یا نوع انسانی کی ہمدردی کے خیال سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ یہ گفتگو بھی تھی کہ مقدونیہ کو تقسیم کردیا جائے۔

(ترکی حالت انقلاب میں از چالس بکسٹن ص۴۴) دولت عثمانیہ ص۲۵۳

جون ۱۹۰۸ء میں شاہ ایڈورڈ اور زار نکولس نے ریوال میں ملاقات کی اور مقدونیہ میں امن قائم کرنے کا ایک جدید پروگرام مرتب کیا۔ ترک ہر زنگ پروگرام کا نتیجہ دیکھ رہے تھے اُن میں اب کسی نئے تجربہ کے برداشت کی طاقت نہ تھی اس میں شبہ نہیں کہ انگلستان اور روس کی یہ متحدہ سرگرمی سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں کے لئے مہلک ثابت ہوتی اگر نوجوان ترکوں نے عجلت سے کام لے کر علم انقلاب بلند نہ کردیا ہوتا جس سے نہ صرف سلطان عبدالحمید کی استبدادی حکومت کا خاتمہ ہوگیا بلکہ دول عظمٰی کے سارے منصوبے بھی دفعتہً خاک میں مل گئے۔ (دولت عثمانیہ ص۲۵۴)

۲۹۔ اصلاحات اور ترکوں کے انقلاب پر دول یورپ کا چراغ پا ہونا۔

شخصی حکومت اور استبدادیت سے عام رعایائے سلطنت عثمانیہ تنگ تھی جس سے بیرونی طاقتوں کو آئے دن مداخلتوں اور ملک کو تقسیم کرلینے کا موقعہ ہاتھ آتا رہتا تھا اور اندرونی نظام بگڑتا جاتا تھا، جاسوسی کا اس قدر زور و شور اور اثر تھا کہ کسی ترک کو اپنی جان کے متعلق اطمینان نہ تھا اور نہ کوئی جماعت جس کا ادنیٰ تعلق بھی ملکی اور انتظامی معاملات سے ہوسکتا تھا ملک میں رہ سکتی تھی۔ رشوت ستانی اور مظالم کا چاروں طرف چرچا تھا۔

بیرونی ملکوں اور دول عظمیٰ کی سازشوں کے جال ہر طرف بچھے ہوئے تھے۔ ملک کی ہر قسم کی ترقی اور اس کی اسکیمیں دول اجنبیہ کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی تھیں اُن کے ایجنٹ کسی مفید ملک و وطن اسکیم کو پنپنے بلکہ پیدا ہونے نہ دیتے تھے اس لئے نوجوانان ترک مدتوں سے جمہوری حکومت قائم کرنا اور ملک کو ترقی دینا نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ سابقہ بادشاہتوں اور ممالک اجنبیہ میں جو سابقہ معاہدات اور امتیازات چلے آتے تھے وہ اُن کو ملک کو آگے بڑھانے میں ہر ہر قدم پر آڑے آتے تھے اس لئے ضروری تھا کہ نظام حکومت بدلا جائے اور تمام امتیازات سابقہ کو بیک قلم اُٹھا کر دستوری حکومت کا اعلان کر دیا جائے سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم کے زمانہ سے اس پر متعدد مرتبہ کارروائیاں عمل میں آچکی تھیں۔ خود سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے بھی کچھ دِنوں اس کو نافذ رکھ کر پھر منسوخ کر دیا تھا مگر اس مرتبہ اس جوش و خروش اور آہنی قوت اور انتظام سے اس کا اجرا کیا گیا کہ استبدادی طاقت کو بجز سر جھکانے کے کوئی چارہ نہ رہا۔ ۵ر جولائی ۱۹۰۸ء میں رستا کی پہاڑیوں سے اس کا اعلان ہوا اور نہایت حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس کے شعلے تمام ملک میں پھیلنے شروع ہوئے سلطان نے ہر چند انتہائی کوششیں ان شعلوں کے بجھانے میں جاری کیں مگر ایک بھی کارآمد نہ ہوئی۔ فوجیں انقلاب کے حق میں ہوتی گئیں۔ بڑے بڑے استبدادی افسر موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ بالآخر جب ہر طرف سے مایوسی ہو گئی تو ۲۴ر جولائی کو علی الصباح انجمن اتحاد و ترقی کو بذریعہ تار اطلاع دی گئی کہ سلطان نے دستوری حکومت کا قیام منظور کر لیا۔ اور ایک ہفتہ بعد یکم اگست کو دستوری حکومت کی دفعات از جانب سلطان شائع کر دی گئیں۔ اور ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۸ء کو سلطان عبدالحمید مرحوم نے پارلیمنٹ کا افتتاح کر دیا۔ اس انقلاب میں ترک نوجوانوں نے جس حسن قابلیت کا مظاہرہ کیا اس سے تمام اجنبی ممالک انگشت بدنداں ہو گئے۔

نائٹ لکھتا ہے:۔

"انجمن (اتحاد و ترقی) کے ان ناتجربہ کار نوجوانوں نے ایک جدید نظام

کو بروئے کار لانے اور اپنے ملک کی ان کثیر التعداد خطرات سے حفاظت کرنے میں جن سے نئی حاصل کی ہوئی آزادی بربادی کی زد میں تھی، ایسی دانشمندی، موقع شناسی، میانہ روی، فراست اور پیش بینی دکھلائی کہ غیر ملکی اشخاص اس کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ رہ گئے انہوں نے امن وامان کو نہایت مضبوطی سے قائم رکھا۔ اور اس چیز میں خود قوم کے شاندار ضبط نفس اور حب وطن سے انہیں بڑی مدد ملی۔ اگرچہ وہ خود اور ان کے علاوہ ہزاروں آدمی استبداد اور اس کے کاسہ لیسوں کے مظالم اور غارت گری کا شکار رہ چکے تھے پھر بھی ان کی طرف سے انتقام کا کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوا انہوں نے صرف ان لوگوں کو سزائیں دیں جن کے جرائم نہایت سخت تھے ان ہی لوگوں کو برطرف کیا جنہوں نے اپنے افعال سے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ دستور اساسی کے لئے خطرہ کا باعث ہیں۔ باقی سب کو معاف کر دیا۔ بیرونی طاقتوں سے ترکی کے تعلقات موقع شناسی اور مدبرانہ سیاست دانی کے ساتھ قائم کئے گئے۔ غلطیاں غیر معمولی طور پر کم ہوئیں۔ (بیداری ترکی صفحہ ۲۴۴-۲۴۳)

پارلیمنٹ کے افتتاح پر ممبروں نے مجلس کی کارروائیوں اور اپنی تقریروں میں جس قابلیت کا ثبوت دیا وہ انگلستان کے مدبروں کے لئے خلاف توقع ثابت ہوئی۔ سلطنت عثمانیہ کے باشندے ان کے خیال میں آئینی حکومت کے اہل نہ تھے ترکی پارلیمنٹ نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا۔ نئی وزارت نے حکومت کے مختلف شعبوں میں اصلاحات کا کام شروع کر دیا اور اب ہر طرف ایک نئی روح محسوس کی جانے لگی۔ ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں حکومت کا اعتماد رعایا کے دلوں میں قائم ہو گیا۔ انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان میں بہت کم لوگ ایسے تھے جن کو نظم ونسق، فن سفارت ڈپلومیسی یا مالیات کا تجربہ تھا اور وہ اپنی اس کمی سے واقف بھی تھے۔ اس پر نظر

رکھتے ہوئے انہوں نے حکومت کے سابق اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنی جگہ پر برقرار رکھا اور ان کی لیاقت اور تجربہ سے فائدہ اُٹھایا۔ البتہ اُن عہدہ داروں کو جو رشوت خواری میں مشہور تھے برطرف کر دیا۔ جو لوگ برقرار رکھے گئے اُن کی بھی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور اگر وہ دستور اساسی کے خلاف کچھ کرتے تو فوراً علیحدہ کر دیئے جاتے تھے۔ چونکہ یہ عہدہ دار حقیقتاً سلطنت کے خیر خواہ تھے اس لئے انجمن کو اُن سے کام لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

دستور اساسی کے اعلان اور پارلیمنٹ کے افتتاح کے درمیانی چار مہینوں میں انجمن اپنے ارکان کی ایک جماعت کو انتظامی امور کی تعلیم دیکر حکومت کے مختلف محکموں کے لئے تیار کر رہی تھی۔ اس طرح نوجوان ترکوں نے اپنی لیاقت کا سکہ بیرونی حکومتوں پر بھی بٹھا دیا۔ انہوں نے دول عظمیٰ کو لکھا کہ مقدونیہ میں ان کی نگرانی کی اب مطلق ضرورت نہیں۔ چنانچہ یورپین افسر واپس بلا لئے گئے اور بین الاقوامی کمیشن برخاست کر دیا گیا۔

انقلاب کے بعد ترکوں پر یورپ کا پہلا وار اور بوسینیا۔ ہرزیگونیا اور کریٹ پر دول یورپ کا مستقل قبضہ۔

نوجوان ترکوں کی صلح جوئی ان طاقتوں کی حرص و آز کو کم نہ کر سکی جو کہ دولت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر موقع پر تیار رہتی تھیں۔ دستور اساسی کے اعلان کے بعد سلطنت کی تمام رعایا کو دستوری آزادی حاصل ہو گئی تھی مگر اُس کے دو صوبے بوسینیا اور ہرزیگونیا جو تیس برس سے آسٹریا کی نگرانی میں تھے استبداد کی زنجیروں سے اب بھی رہا نہ ہوئے حکومت آسٹریا ان صوبوں کو دستوری آزادی دینے پر راضی نہ ہوئی چنانچہ جب ترکی پریس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ دستور کا نفاذ بوسینیا اور ہرزیگونیا میں بھی کر دیا جائے جو آسٹریا کی نگرانی کے باوجود سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی میں داخل ہیں تو آسٹریا کو سخت تشویش ہوئی اور اس نے یہ دیکھ کر کہ ترکی اس وقت مقابلہ کی قوت نہیں رکھتا اور انجمن اتحاد و ترقی ایک

طاقت ور سلطنت سے اُلجھ کر اپنے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہ کرے گی۔ ۷/ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو دفعتہً ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر نائٹ لکھتا ہے :-

"یہ وہی پُرانا قصہ تھا یعنی ایک رفعت پسند عیسائی حکومت اس خوف سے کہ ایک اصلاح شُدہ ترکی کہیں ایک طاقت ور ترکی نہ بن جائے فریب کے ذریعہ سے اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ آسٹریا کے اس فعل نے رجعت پسندوں کو قدیم نظام حکومت کے از سر نو قائم کرنے کا آخری موقعہ بہم پہنچایا اور انہوں نے اس موقعہ سے پُورا فائدہ اُٹھایا"

(بیداری ترکی ص ۲۶۱)

بوسینیا اور ہرزیگونیا کے الحاق سے دو ہی روز قبل مشرقی رومیلیا کے والی نے جو بلغاریا کا فرماں روا تھا، زار بلغاریا کا قدیم لقب اختیار کر لیا پھر ۱۲/ اکتوبر کو کریٹ نے بھی مملکت یونان سے اپنے الحاق کا اظہار کر دیا۔

۳۰۔ طرابلس اور اُس پر اطالوی حملہ

ان دست درازیوں کا سلسلہ یہاں تک بھی ختم نہیں ہوا۔ افریقہ کی ساحلی حکومتیں جو پہلے سلطنت عثمانیہ میں شامل تھیں لیکن بعد میں سلطنت کی کمزوری سے رفتہ رفتہ خود مختار ہوتی گئی تھیں نو آبادیات اور تجارتی منڈی بنانے کی غرض سے مغربی حکومتوں کے لئے مرکز توجہ بن گئی تھیں چنانچہ فرانس نے الجزائر اور تونس پر قبضہ کر لیا اور انگلستان نے مصر میں اپنا تسلّط قائم کیا۔ ۱۹۰۴ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا تھا کہ انگلستان مصر پر بلا شرکت غیرے قابض رہے گا اور اس کے معاوضہ میں فرانس، مراکش

کی مملکت پر جو اس وقت تک آزاد تھی قبضہ کرنے میں مدد دے گا۔ اب افریقہ کی ساحلی حکومتوں میں صرف طرابلس رہ گیا تھا جو کسی یورپین طاقت کے پنجہ میں نہیں آیا تھا اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ طرابلس ایک ریگستانی علاقہ تھا جس میں کہیں کہیں نخلستان نظر آجاتے تھے اس کے ساحل پر کوئی بندرگاہ نہ تھی اور اس پر حکومت کرنے میں جو مصارف برداشت کرنے پڑتے اُن کے معاوضہ کی کچھ زیادہ توقع نہ تھی۔ یہی سبب تھا کہ فرانس اور انگلستان نے کبھی اس کی جانب توجہ نہیں کی۔ لیکن اٹلی جو کہ نوآبادیات کے میدان میں ان دونوں سلطنتوں سے بہت پیچھے تھا اور ۱۸۸۱ء میں تونس پر فرانس کو قبضہ کرتے ہوئے دیکھ کر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اُس کی نظر میں طرابلس ہی غنیمت معلوم ہوا چنانچہ اطالوی وزارت خارجہ نے سلطان عبدالحمید مرحوم کے عہد ہی میں یورپین حکومتوں سے یہ تسلیم کرا لیا تھا کہ جب سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات تقسیم ہونے لگیں تو طرابلس اٹلی کو دے دیا جائے گا۔ اس باب میں اٹلی نے متعدد معاہدوں کی بناء پر اپنا حق یہاں تک تسلیم کرا لیا تھا کہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب عثمانی کے وقت تمام یورپین طاقتوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اُسے جس وقت موقع ملے گا وہ فوراً طرابلس پر قبضہ کرلے گا اور یورپ کی کوئی حکومت اعتراض نہ کرے گی۔ (شیویل ص ۴۶۸ دولت عثمانیہ ص ۲۹۹)

بیسویں صدی کے آغاز میں طرابلس سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا اور براہ راست باب عالی کے زیر حکومت تھا اس کو حکومت خود اختیاری کے حقوق کبھی حاصل نہ تھے۔ جیسا کہ افریقہ کے دوسرے صوبوں نے حاصل کر لئے تھے۔ اس کی آبادی تمام تر مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ شہر طرابلس اور دوسرے ساحلی مقامات پر ترک اور مور آباد تھے اور اندرونی علاقوں میں نیم آزاد عرب قبائل تھے۔ یہاں کے باشندوں نے کبھی حکومت کی تبدیلی کی خواہش نہیں کی۔ اور اٹلی کو ان کی طرف سے کسی شکایت کا موقعہ نہیں ملا لارڈ ایورسلے جس کے قلم سے ترکوں کی حمایت میں ایک لفظ بھی مشکل سے نکلتا ہے اعتراف کرتا ہے کہ طرابلس پر اٹلی کا حملہ تمامتر ایک جارحانہ فعل تھا جس کی تحریک اس وجہ سے ہوئی کہ فرانس نے تونس پر قبضہ کر لیا تھا جس پر جغرافیائی اور معاشیاتی دونوں حیثیتوں سے اٹلی کا حق زیادہ مضبوط تھا۔ لیکن جمہوریہ فرانس اور برطانیہ عظمٰی اٹلی کے اس فعل سے متفق ہوگئیں اور یورپ کی دونوں مرکزی سلطنتیں

بھی اس وقت تک اٹلی کی حلیف تھیں۔

(ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے صفحہ ۳۵۵) (دولت عثمانیہ صفحہ ۳)

۱۹۱۱ء کے اختتام تک حکومت اٹلی برابر یہ اعلان کرتی آئی تھی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کے کسی حصہ کی خواہشمند نہیں ہے جب یہ افواہ پھیلی کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو اُس کے وزیر خارجہ نے ۲ دسمبر ۱۹۱۰ء کو اطالوی پارلیمنٹ میں اس کی پرزور تردید کی اور کہا کہ ہم سلطنت عثمانیہ کی بقاو سلامتی کے خواہش مند ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ طرابلس ہمیشہ ترکوں کے قبضہ میں رہے۔ لیکن اس اعلان پر دس مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ حکومت اٹلی نے دفعتہً باب عالی کو الٹی میٹم دے دیا حالانکہ اس درمیان میں فریقین کے تعلقات میں مطلق کشیدگی نہیں پیدا ہوئی تھی اور جواب کا انتظار بغیر پچاس ہزار فوج طرابلس پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دی اُس کے جنگی جہازوں نے پریویسیا کے شہر پر گولہ باری شروع کر دی جو بحر ایڈریاٹک کے ساحل پر ترکوں کا مقبوضہ تھا اور بحر ایجین کے متعدد جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ ترکی جہازوں نے درہ دانیال میں پناہ لی اٹلی کے مقابلہ میں ترکی جہازوں کی حیرت انگیز شکست کا سبب یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید نے اپنے عہد حکومت میں بحریہ کی طرف مطلق توجہ نہیں کی تھی اور چونکہ ۱۸۷۶ء کے بعد سے کسی بحری طاقت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی اس لئے مدت سے ترکی جہاز شاخ زریں سے باہر بھی نہیں نکلے تھے اگر سلطان عبدالحمید نے بحریہ کی طرف کچھ بھی توجہ کی ہوتی تو اٹلی کا طرابلس پر قابض ہو جانا قطعاً ناممکن تھا کیونکہ سلطان عبدالعزیز نے عثمانی بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ وہ اس زمانہ میں یورپ میں تیسرے نمبر پر شمار ہوتا تھا۔ طرابلس کے فوجی دستہ کی تعداد صرف بیس ہزار تھی چونکہ سمندر پر اطالوی جہازوں کا قبضہ تھا اس لئے جنگ شروع ہو جانے کے بعد بحری راستہ سے فوجی کمک بھی نہیں پہنچائی جا سکتی تھی بری راستہ مصر کا تھا جو اس وقت تک سلطنت عثمانیہ کے زیر سیادت اور اس کا باجگذار تھا۔ لیکن مصر پر انگریزی تسلط قائم ہو چکا تھا اور حکومت برطانیہ نے ان سابق معاہدوں کی بنا پر جو طرابلس کی نسبت اٹلی سے ہو چکے تھے مصر کی غیر جانبداری کا اعلان کر کے اُس کی راہ سے ترکی فوجوں کو طرابلس جانے سے روک دیا۔

ان تمام مشکلات کے باوجود نوجوان ترکوں نے ایسی شجاعت سے حملہ آوروں

کا مقابلہ کیا کہ وہ سراسیمہ ہو گئے۔ عرب قبائل جس جانفروشی کے ساتھ وطن کی ایک ایک انچ کے لئے آخر تک لڑتے رہے وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ اگرچہ بیرونی امداد کی تمام راہیں مسدود تھیں تاہم اعلانِ جنگ کے چند ہی دنوں بعد انور بے پوشیدہ طور پر طرابلس پہنچ گئے تھے اور انہوں نے اپنی حیرت انگیز قابلیت سے پورے ملک کو فوجی کیمپ بنا دیا تھا۔ الہلال کلکتہ نے اُن کے عجیب و غریب کارناموں کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج ہے۔

انور بے نے طرابلس میں قدم رکھنے کے بعد اطراف و جوانب کے قبائل میں دعوتِ جہاد شروع کر دی اور چند دنوں کے بعد جنود الٰہی کی عظیم الشان صفیں اس کے یمین و یسار نیزے بلند کئے ہوئے چلی آ رہی تھیں۔ وہی تن تنہا فردِ مقدس دشمن کے بے شمار لشکر کے سامنے حریفانہ و مساویانہ آ کر کھڑا ہو گیا اور پورے نو مہینوں کے اندر ایک دن بھی شکست و ہزیمت اُس کے دامنِ عزت پر دھبّہ نہ لگا سکی۔ تمام اہل عرب جن کو عثمانی خلافت کا قدیمی مخالف سمجھا جاتا تھا اوامر سلطانی کے آگے پوری اطاعت فرمانبرداری کے ساتھ جھک گئے اور آج عثمانی فوج کے مفہوم میں بلا کسی اختلاف و شبہ کے عربی افواج داخل ہیں۔ عربی فوج کے مرتب کرنے میں جو مشکلیں اجتماع کے بعد پیش آئیں وہ ابتدائی مشکلات سے کم نہ تھیں۔ سب سے پہلی مشکل مختلف قبائل کی عربی عصبیت اور اُن کی باہمی بغض و مخالفت تھی جو نسلاً بعد نسلِ قدیم سے چلی آتی ہے انور بے نے تمام قبیلوں کو مختلف موثر اور دل میں اتر جانے والے طریقہ سے سمجھا کر (جو اس اعجاز آفریں سحر بیان شخص کا وصف مخصوص ہے) ان میں باہم رشتہ داریاں قائم کرا دیں اور اس طرح اس دعوتِ جہاد کی بدولت صدیوں کی عداوت اور دشمنیاں عہد اخوت و مودت سے بدل گئیں اور دوسری مشکل قبائل کی بے نظمی اور اصولِ جنگ سے ناواقفیت تھی۔ غازی انور بے نے بغیر اس کے کہ ایک لمحہ بھی فکر و تردد میں ضائع کرتے فوراً تمام قبائل کو چند پلٹنوں میں تقسیم کر دیا اور ہر پلٹن کی تعلیم کے لئے ایک افسر مقرر کر کے شب و روز

قواعد کرانی شروع کرادی۔ خود عربوں نے جب معلوم کرلیا کہ بغیر قواعد کے سیکھے ہم دشمنوں کے حملہ کا جواب نہ دے سکیں گے اور ان کی ابتدائی دستبرد کا کا انتقام نہیں لیا جا سکے گا۔ تو خود ان کے اندر جوش و غیرت نے ایک ایسی خارق عادت ذہانت اور قوت اخذ و تحصیل پیدا کر دی کہ مہینوں کی مشق چوبیس گھنٹہ کے اندر حاصل کرنے لگے قبائل کی باہمی رقابت سے بھی اس موقع پر بڑی مدد ملی۔ انور بے نے اعلان کر دیا کہ جو قبیلہ پہلے قواعد جنگ کے امتحان میں کامیاب ثابت ہوگا اس کو عزت و ناموری کے نشان کے طور پر ایک طلاکار اطلس کا علم دیا جائے گا۔ یہ سنتے ہی ہر قبیلہ مسابقت کی کوشش کرنے لگا اور شب و روز پورا وقت فوجی نقل و حرکت اور قواعد سیکھنے اور مشق میں صرف ہونے لگا۔ اسی اثناء میں جب اطالویوں کی جراتوں نے ایک دو قدم آگے بڑھائے اور بم کے گولے بکثرت آنے لگے تو قبیلہ حسا نے ایک دن ہجوم کر کے ہلہ بول دیا۔ اور سیکڑوں اطالویوں کو تلوار کے گھاٹ اتار کر بقیۃ السیف کو کوسوں دور بھگا دیا۔ انور بے نے اس کارنامہ کی بڑی قدر کی اور اس قبیلہ کو اپنا وضع کردہ نشان عزت (اطلسی علم) عطا فرمایا۔ دوسرے قبائل نے جب قبیلہ حسا کے خیموں پر اس طلائی علم کو لہراتے دیکھا تو انور بے کے پاس دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ ہم کو بھی موقع دیا جائے کہ اس علم کے لینے کا استحقاق ثابت کریں۔ رات کے وقت جب اٹالین کیمپ طرابلس پر قابض ہونے کی خوشی میں بکثرت شراب پی کر بدمست پڑا تھا یکایک عرب قبائل کے صحرائی نعروں کی گونج سے ایک زلزلہ عظیم محسوس ہوا۔ چند لمحوں کے اندر بے تحاشا بھاگ گئے اور پورا اٹالین کیمپ خالی ہوگیا۔ اطالویوں کے جبن و نامردی نے اہل عرب کو ان کے اولین حملہ ہی میں فتح و نصرت کی ایسی چاٹ لگا دی کہ اب میدان قتال ان کیلئے بچوں کا کھیل بن کر رہ گیا۔ بغیر کسی نقصان کے انہوں نے کھیلتے کودتے ایک پوری اٹالین پلٹن برباد کر دی اور بکثرت مال غنیمت ساتھ لئے ہوئے اور وطنی گیت گاتے ہوئے عثمانی کیمپ میں واپس آکر اپنی فتوحات ڈھیر کر دیں

اس مال غنیمت میں آٹھ سو سے زیادہ توبندوقیں تھیں اور نادر قسم کی اشیاء اس کے علاوہ۔ ان بندوقوں کی لوٹ سے انورپے بہت خوش ہوئے کیونکہ عمدہ اسلحہ کی کیمپ میں بہت کمی تھی۔ انورپے نے حکومت کے نام سے ان کا فوراً نیلام کر دیا اور وہ دو دو عثمانی گنی پر فروخت کر دی گئیں۔ اس خدمت کے صلہ میں اُن کی آرزوئے دلی کے مطابق طلا کا راطلسی علم اُن کو عطا کیا گیا اس کے بعد تو ہر قبیلہ اس علم کے لئے اُٹھنے لگا اور دشمن پر برق ہلاکت بن کر گرنے لگا ہر قبیلہ کی کوشش ہوتی کہ دوسروں سے زیادہ تعداد میں دشمنوں کو قتل کریں اور سب سے زیادہ مال غنیمت انورپے کے سامنے انبار کر سکیں تاکہ شجاعت و وطن پرستی کا اعلےٰ سے اعلےٰ نشان اور تمغہ صرف ہمیں کو حاصل ہو۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر عثمانی کیمپ میں پندرہ ہزار سے زیادہ قیمتی اور جدید ایجاد کی بندوقیں جمع ہو گئیں۔

(الہلال جلد ۲ ص ۱۲-۱۱) دولت عثمانیہ ص ۳۰۴

۳۱۔ صلحنامہ نوران

اطالوی اس صورتحال سے بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے شجاعت کا جواب درندگی سے دینا شروع کیا اور ایسے مظالم کئے کہ خود یورپین نامہ نگاروں نے جو اٹالین فوج کے ساتھ طرابلس میں تھے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو وہ زیادہ زور بحری جنگ پر دینے لگے۔ چنانچہ مئی ۱۹۱۲ء میں روڈس اور بعض دوسرے جزائر ایجین پر قبضہ کر لیا۔ انہیں توقع تھی کہ ترک اب آسانی کے ساتھ صلح کے لئے راضی ہو جائیں گے۔ لیکن ترکوں نے صلح کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ وہ اُس وقت تک جنگ کو جاری رکھنے کا عزم کر چکے تھے جب تک دشمنوں کو شکست دے کر بھگا نہ دیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس درمیان میں البانیا میں بغاوت برپا ہو گئی اور پھر بلقان کے اُفق سے ایک متحدہ اور خوفناک جنگ کے بادل اُٹھتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ان حالات کے پیشِ نظر باب عالی نے بادلِ ناخواستہ صلح کی گفتگو شروع کی اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو صلحنامہ پر محاربین کے دستخط ہو گئے۔ طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ اٹلی نے وعدہ کیا کہ بحر ایجین کے مفتوحہ جزائر دولت علیہ کو واپس

کردے گا۔ لیکن یہ وعدہ کبھی شرمندۂ ایفا نہ ہوا۔

۳۲۔ بلقانی ریاستوں کا اتحاد اور جنگِ بلقان

جس خطرہ کو محسوس کر کے ترکوں نے اٹلی سے صلح کی تھی وہ بہت جلد سامنے آگیا۔ ریاست ہائے بلقان نے تاریخ میں پہلی بار متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ جنگ بلقان بقول خالدہ ادیب خانم گویا جنگِ عظیم کی ایک مشق تھی دونوں کی تیاری اور تحریک میں روس کے وزیر خارجہ اسوویسکی کی عقل شیطانی کارفرما تھی اسوویسکی نے یہ تدبیر سوچی کہ بلقانی ریاستوں کو متحد کر کے ترکوں کو بلقان سے نکال دے اور پھر آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے چنانچہ اسی کوشش سے مارچ ۱۹۱۲ء میں سرویا اور بلغاریہ میں ترکی کے خلاف ایک معاہدہ ہوا۔ اسوویسکی نے اس معاہدہ کی اطلاع فرانسیسی وزیر خارجہ موسیو پوانکارے کو دی اور لکھا کہ ابھی یہ کسی پر ظاہر نہ کیا جائے۔ بلغاریہ کو ۸ کروڑ فرانک سامانِ جنگ فراہم کرنے کے لئے قرض دیا گیا۔ (ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص۸۲ و ص۸۳) (دولت عثمانیہ ص۳۰۷)

اس معاہدہ کی ایک خفیہ دفعہ کی رو سے یہ طے پایا کہ اگر مقدونیہ کا کوئی حصہ فتح ہو جائے تو جو علاقے ان دونوں ریاستوں سے متصل واقع ہیں وہ ان میں شامل کر دیئے جائیں اور درمیانی علاقوں کی تقسیم روس کے فیصلہ پر چھوڑ دی جائے (ابورسلے ص۳۵۷)

روس ہی کی وساطت سے مئی ۱۹۱۲ء میں یونان اور بلغاریہ کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہو گیا۔ یہ سرویا اور بلغاریہ کے معاہدہ سے ایک خاص امر میں مختلف تھا یعنی اس میں مقدونیہ کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا۔ (میریٹ ص۴۴۷) (دولت عثمانیہ ص۳۰۷)

پھر ستمبر ۱۹۱۲ء میں سرویا اور مونٹی نیگرو کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ فریقین ترکی سے علیحدہ علیحدہ جنگ کریں اور کسی ترکی شہر یا گاؤں پر سرویا اور مونٹی نگرو کی فوجیں متحدہ طور پر قابض نہ ہوں۔

البانیہ کی بغاوت اور مانٹی نگرو کا اعلان جنگ

ان معاہدوں کے بعد اتحادی (انگلستان، روس فرانس) چاہتے تھے کہ جنگ جلد از جلد شروع کر دیں۔ طرابلس کی جنگ جاری تھی اور وہ اس

موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف البانیہ کی بغاوت سے مقدونیہ کی تقسیم کا مسئلہ جو اس اتحاد کی اصلی غرض اور غایت تھی بہت مشکل ہوتا نظر آرہا تھا۔ البانیہ کا مطالبہ حکومت خوداختیاری تھا۔ وہ سقوطری، یانینا، مناسٹر اور قوصوہ کی ولایتوں کو متحد کرکے دولت علیہ عثمانیہ کے زیر سیادت ایک خود مختار مملکت قائم کرنا چاہتا تھا۔ ابتدا میں انجمن اتحاد و ترقی نے البانیہ کی بغاوت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ لیکن جب سلطنت کی فوج نے بھی جو البانیہ میں تھی باغیوں کا ساتھ دینا شروع کیا۔ اور جون ۱۹۱۲ء میں مناسٹر کے فوجی دستہ نے علانیہ بغاوت کردی اور موجودہ وزارت توڑ دینے کا مطالبہ کیا تو البانیہ کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ حکومت کے سامنے آیا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ جولائی میں محمود شوکت پاشا نے استعفا دیدیا اور اُن کی جگہ ناظم پاشا جو انجمن اتحاد و ترقی کا شدید مخالف تھا وزیر جنگ مقرر ہؤا۔ اگست میں حلمی پاشا صدر اعظم کو بھی استعفا دینا پڑا۔ باغیوں کی یہ کامیابی دیکھ کر بلقانی ریاستوں کو یہ خطرہ ہؤا کہ ممکن ہے کہ البانیہ ایک خود مختار مملکت تسلیم کرلی جائے اور سقوطری، یانینا، مناستر اور قوصوہ کی ولایتیں اس میں شامل کردی جائیں۔ اگر ایسا ہؤا تو ان ریاستوں میں سے ہر ایک کو اس علاقہ سے محروم ہونا پڑے گا۔ جس کی وہ خصوصیت کے ساتھ خواہشمند تھی چنانچہ اس خوف سے کہ کہیں یہ موقعہ ہاتھ سے نہ نکل جائے انہوں نے عجلت کی اور ۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شاہ نکولس والئ مونٹی نگرو نے باب عالی کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔

زمانہ اعلان جنگ بلقان میں ترکی کی اندرونی حالت اور بلقان کا اعلان جنگ

اس زمانہ میں ترکی کی اندرونی حالت بہت نازک تھی قدامت پسند گروہ نوجوان ترکوں کی انتہا پسندی کا مخالف تھا۔ خود حکمران جماعت میں پھوٹ پڑگئی تھی۔ فوج کے اس حصہ کو جو قدامت پسند تھا غلبہ حاصل ہوگیا تھا۔ محمود شوکت پاشا کے استعفا دینے کے بعد فوج کی تنظیم بوڑھے افسروں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی، جو قابلیت میں نوجوان ترکوں سے بہت کم تھے۔ کامل پاشا صدر اعظم تھا اور اسے انگلستان کی حمایت پر اس قدر بھروسہ تھا کہ وہ بلقان کے خطرہ کو زیادہ اہم نہیں خیال کرتا تھا اسے یقین تھا کہ انگلستان بلقان پر حملہ نہ ہونے دیگا۔ اسی یقین کی بنا پر اس نے ستمبر میں (۷۶) ہزار تربیت یافتہ فوج کو جو بلقان کی سرحد پر جمع تھی منتشر کردیا۔ لیکن جب جنگ چھڑ جانے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی تو یورپین حکومتوں

سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ ستمبر میں روس اور آسٹریا نے دول عظمیٰ کی طرف سے ایک احتجاجی نوٹ اتحادیوں کے پاس بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اسوویسکی کی سازشوں کے بعد اس احتجاج کا اثر کیا ہو سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ دولت علیہ اپنی کمزوری محسوس کر رہی ہے پہلے مونٹی نگرو اور پھر دوسری ریاستوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ ترکی کے پاس ایک لاکھ فوج تھی اور وہ بھی زیادہ تر نئے رنگروٹوں کی۔ بلغاریہ کی فوج ایک لاکھ اسی ہزار تھی۔ سرویا کی اسی ہزار، یونان کی پچاس ہزار۔ (ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش صـ۸۵) دولت عثمانیہ صـ۸۵

ان ریاستوں نے سلطنت عثمانیہ سے علیحدہ ہونے کے بعد اپنی تنظیم یورپین حکومتوں کے طرز پر کر لی تھی اور ان کی فوجیں یورپ کے فوجی نظام کے مطابق تربیت یافتہ تھیں۔ برخلاف اس کے نوجوان ترک ملک کی اصلاح کافی طور پر نہ کر سکے تھے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انہیں عنان حکومت ہاتھ میں لئے ہوئے صرف چار ہی سال گزرے تھے اور دوسری بڑی وجہ قدامت پسند گروہ کی مخالفت تھی۔ نئے قانون کے مطابق ترکی فوج میں عیسائی اور یہودی بھی بھرتی کئے گئے تھے۔ ان کو فوجی خدمت جس سے وہ اب تک بالکل بری تھے نہایت شاق تھی۔ چنانچہ جب لڑائی شروع ہوئی تو انہیں عیسائی اور یہودی سپاہیوں نے دھوکہ دیا اور سب سے پہلے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک تو عثمانی فوجوں کی تعداد اتحادیوں کے مقابلہ میں یونہی کم تھی دوسرے عیسائیوں اور یہودیوں کی غداری سے اور زیادہ نقصان پہنچا۔

جنگ بلقان

اتحادیوں نے جنگ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کی عیسائی صوبوں کی اصلاح حال ظاہر کیا تھا مگر حقیقۃً اُن کے پیش نظر ذاتی اغراض تھیں۔ یونان۔ کریٹ اور بحر ایجین کے دوسرے جزیروں پر قبضہ کرنے کے علاوہ خود یراعظم پر بھی اپنی سرحدوں کی توسیع کا خواہش مند تھا۔ بلغاریہ کو اُس بلغاریہ عظمیٰ کی آرزو تھی جس کا نقشہ صلحنامہ سان اسٹیفانو میں مرتب کیا گیا تھا۔ سرویا ان تمام علاقوں کو اپنے اندر شامل کر لینا چاہتا تھا جو کہ سٹیفن ڈوشن کے زمانہ میں اس کی قدیم سلطنت کے جزو تھے وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی مملکت کے حدود بحر ایجین اور بحر ایڈریاٹک کے ساحلوں تک پہنچ جائیں۔ مونٹی نگرو کی نظر البانیہ کے ایک حصہ پر تھی۔ (لارڈ ایورسلے صـ۳۵۹) دولت عثمانیہ صـ۳۱

۸ راکتوبر کو مونٹی نگرو نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ بقیہ ریاستوں نے ۱۸ اکتوبر کو اعلان کر کے اسی روز اپنی فوجیں عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ کیں۔ حملہ کا سب سے زیادہ زور بلغاریہ کی طرف سے تھا جس کا مقصد خود قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا تھا۔ چنانچہ ۱۸ اکتوبر کو بلغاری فوجیں تھریس میں داخل ہوئیں اور ۲۲ راکتوبر کو قرق کلیسا اور ۲۸ کو لولو برگاس کے معرکوں میں ترکوں کو شکست دی۔ عثمانی فوج نے شتلجہ کے حصار میں پناہ لی جو قسطنطنیہ سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بلغاریوں نے شتلجہ پر کئی حملے کئے مگر نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ وسط نومبر تک ادرنہ کے سوا تھریس کے اور تمام حصوں پر اُن کا قبضہ ہو گیا۔ اس درمیان میں سرویا، مونٹی نگرو اور یونان نے بھی متعدد فتوحات حاصل کر لی تھیں۔ سرویا کی فوجیں سرحد عبور کر کے قدیم سرویا میں داخل ہوئیں۔ کسانودو کے میدان میں ۲۳ راکتوبر کو ترکوں سے مقابلہ ہوا دو روز تک جنگ جاری رہی۔ آخر میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ سروی فوجوں نے اسکوب پر قبضہ کر لیا۔ جو اُن کی قرون وسطیٰ کی سلطنت کا پایہ تخت تھا اس کے بعد وہ مقدونیا میں بڑھتی ہوئی مناستر تک پہنچ گئیں۔ دوسری طرف مونٹی نگرو کی فوجوں نے سقوطری کے زبردست قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یونانیوں کی فتوحات کا بھی یہی حال تھا وہ بھی قریب قریب ہر معرکہ میں کامیاب رہے۔ ۸ رنومبر کو یونانی فوجوں نے سالونیکا پر قبضہ کر لیا مگر اُن کی بحری فتوحات زیادہ اہم تھیں۔ آخر نومبر تک بحر ایجین کے تقریباً تمام عثمانی جزائر پر یونان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ترکی بحریہ کی کمزوری بری فوجوں کی حالت سے بھی زیادہ افسوسناک ثابت ہوئی۔

عثمانی شکست کے اسباب

ترکوں کی حیرت انگیز شکستوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اپور سلے لکھتا ہے۔ عثمانی فوجوں کی بدنظمی اور ابتری کا منجملہ اور خاص اسباب کے ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ سامان رسد کا انتظام مطلق نہ تھا۔ تین تین چار چار روز تک فوجوں کا بغیر غذا کے رہ جانا کوئی استثنائی واقعہ نہ تھا بلکہ عموماً ایسا ہی ہوتا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ یورپ کی اس جنگ میں عثمانی فوجوں میں بڑی تعداد دیہاتی عیسائیوں کی تھی جو پہلی بار جبری طور پر بھرتی کئے گئے تھے۔ ان کی ہمدردی تمام تر دشمن کے ساتھ تھی اور اس میں شبہ نہیں

کہ ترکی صفوں کے ٹوٹنے کے وقت فوج کا انتشار اور فرار زیادہ تر انہیں کے بھاگنے کی وجہ سے ہوتا تھا اور جو لوگ باقی رہ جاتے تھے وہ اپنے گھروں کو بھاگ جاتے تھے۔

(ابور سلے صہ ۳۶۳) دولت عثمانیہ صہ ۳۱۲

خالدہ ادیب خانم اپنی سوانح میں لکھتی ہیں:۔ بدنظمی کے لحاظ سے جنگ بلقان سے بڑھ کر کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے۔ حفظان صحت کا کوئی انتظام نہ تھا اور خطوط مدافعت کے پیچھے انتظامات کی ابتری نہایت افسوسناک تھی۔ بھیڑیں گاڑیوں میں بھوکی مر رہی تھیں اور آٹا گوداموں میں سڑ رہا تھا لیکن نصف میل سے کم ہی فاصلہ پر لوگ فاقہ سے جان دے رہے تھے۔ جب ترک پناہ گزین قتل عام سے بھاگ کر سراسیمہ قسطنطنیہ پہنچے جب باہر سے آنے والوں اور فوج میں ہیضہ پھیلا۔ جب آبادی کی آبادی مسجدوں کے صحن میں سردی کی شدت سے دم توڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی تو قسطنطنیہ کی مصیبت کا منظر اتنا ہولناک تھا کہ خیالی معلوم ہوتا تھا۔

(سوانح خالدہ ادیب خانم صہ ۳۳۴) دولت عثمانیہ صہ ۳۱۲

یورپ کا عہد ناموں کا پابند ہونا

آغاز جنگ میں دول عظمیٰ نے اعلان کیا تھا کہ خواہ کوئی فریق بھی کامیاب ہو بلقان کی موجودہ حالت برقرار رکھی جائے گی۔ اس اعلان کا سبب یہ تھا کہ انہیں ترکی کی کامیابی کا قوی اندیشہ تھا اور جس طرح ۱۸۹۷ء میں انہوں ایک ایسے ہی اعلان سے یونان کی پشت پناہی کی تھی اور ترکوں کو یونانی فتوحات سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح ریاست ہائے بلقان کا تحفظ بھی پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا۔ لیکن جب خلاف توقع عثمانی فوجوں کو تقریباً ہر معرکہ میں شکست ہوئی اور دشمن حیرت انگیز طور پر کامیاب ہونے لگے تو انہیں زبانوں نے جو یہ اعلان کر چکی تھیں اب اس کے خلاف آواز اٹھائی اور یہ کہا جانے لگا کہ بلقانیوں کو ان کی فتوحات سے محروم کر دینا ہرگز قرین انصاف نہیں۔ مسٹر اسکویتھ وزیر اعظم برطانیہ نے دول عظمیٰ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا:۔ "مشرقی یورپ کے نقشہ کو از سر نو مرتب کرنا ضروری ہے اور فاتحین کو ان ثمرات سے محروم نہیں کرنا چاہیئے جو اتنی گراں قیمت پر انہیں حاصل ہوئے ہیں۔"

(ملر صہ ۵۰۴) دولت عثمانیہ صہ ۳۱۳

عارضی صلح

دول عظمیٰ کی تحریک پر ۳ ردسمبر کو ترکی اور بلغاریہ اور سرویا کے درمیان ایک عارضی صلح ہوگئی۔ یونان اور مونٹی نگرو سے جنگ جاری رہی۔ اب تک جنگ کا نتیجہ یہ تھا کہ ترک مقدونیا اور تقریباً تمام تھریس اور اپارس سے خارج ہو چکے تھے۔ قسطنطنیہ کے علاوہ یورپ میں صرف ادرنہ، یانینا اور سقوطری پر ان کا قبضہ باقی رہ گیا تھا لیکن یہ تینوں شہر بھی دشمن کے محاصرہ میں تھے۔

صلح کانفرنس لندن

۱۶ ردسمبر ۱۹۱۲ء کو لندن میں صلح کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا۔ ادرنہ (ایڈریانوپل) کے مسئلہ پر سب سے زیادہ مشکل پیش آئی اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا باعث ہوا۔ بلغاریہ نے مستقل صلح کے لئے ادرنہ کے حصول کو ایک لازمی شرط قرار دیا تھا۔ باب عالی اس پر راضی نہ تھا لیکن جب ۱۷ رجنوری ۱۹۱۳ء کو دول عظمیٰ کی طرف سے ایک نوٹ باب عالی میں بھیجا گیا۔ اور اس میں یہ مشورہ دیا گیا کہ ادرنہ ریاست ہائے بلقان کے حوالہ کر دیا جائے اور جزائر ایجین کا مسئلہ دول عظمیٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے تو صدر اعظم کامل پاشا نے جو کہ انگلستان کا دوست تھا ترکی کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس مشورہ کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ قریب تھا کہ مجلس وزراء کامل پاشا کی اس تحریک سے متفق ہو کر دول عظمیٰ کے نوٹ کا جواب روانہ کر دے اور ترکی کے قتل نامہ پر خود اسی کی مہر ثبت کر دی جائے کیونکہ ادرنہ سے دست برداری حقیقتاً قسطنطنیہ کی دست برداری کا مقدمہ ہوتی لیکن عین وقت پر ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا جس نے مجلس وزراء کی یادداشت کو جو دولِ عظمیٰ کے پاس جانے کیلئے مرتب ہو چکی تھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے خود موجودہ وزارت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد جو وزارت قائم ہوئی اس نے ادرنہ کو حوالہ کرنے سے قطعاً انکار کر دیا جس کے بعد ہی صلح کانفرنس بھی برخاست ہوگئی۔

(دولت عثمانیہ صـ ۳۱۴)

انقلاب وزارت

یہ انقلاب وزارت اسی بطلِ حریت کا رہین منت تھا جس نے ۱۹۰۸ء میں ملک کو سلطان عبدالحمید کے استبداد سے نجات دلا کر دستوری حکومت قائم کر دی تھی۔ انور بے طرابلس کی مہم سے فارغ ہو کر قسطنطنیہ پہنچ چکے تھے۔ اسی خاموشی اور جرأت کے ساتھ جو ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں اس درجہ کامیاب ہوئی تھی وہ چند جانفروشوں کو لے کر دفعتہً ایوانِ وزارت میں داخل ہوئے۔

ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر افسران جنگ اور عام پبلک کے دستخط تھے اور اس میں تبدیل وزارت یا انکار صلح پر زور دیا گیا تھا۔ فوج کا جو حصہ وزارت کے ہاتھ میں تھا اسے پہلے ہی کسی بہانہ سے قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا گیا تھا اور جس قدر فوج شہر میں تھی وہ سب قومی جماعت کے ساتھ تھی جس کی قیادت انور بے کر رہے تھے۔ وزراء ان حالات سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھے کہ انور بے اندر داخل ہوئے۔ ناظم پاشا وزیر جنگ کے ایڈی کانگ نے اس جماعت کو روکنے کی کوشش کی اور پستول چلایا معاً دوسری طرف سے بھی گولی چلی اور ناظم پاشا وہیں گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ بہت جلد انور بے نے وزارت خانہ پر قبضہ کر لیا۔ کامل پاشا کو استعفا دینا پڑا اُس کی جگہ محمود شوکت پاشا صدر اعظم مقرر ہوئے۔ (دولت عثمانیہ صـ۳۱۵)

البانیا کی آزادی

عین اُس وقت میں جبکہ بلقانی ریاستیں لڑ رہی تھیں اہل البانیا نے ولونا میں ایک مجلس منعقد کر کے سلطنت عثمانیہ سے اپنی کامل آزادی کا اعلان کر دیا۔ ان کو خطرہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو البانیا کا بھی وہی حشر ہو گا جو بلقان کے دوسرے عثمانی مقبوضات کا ہونے والا ہے۔ اس اعلان سے دول عظمیٰ کے ہاتھ مضبوط ہو گئے اور انہوں نے لندن کانفرنس میں نہ صرف یہ کہ سرویہ کو مجبور کر کے البانی بندرگاہوں سے دست بردار کرایا بلکہ البانیا کا استقلال بھی باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا۔ البانیا ایک خود مختار ریاست قرار دی گئی جس کے فرمانروا کا انتخاب دول عظمیٰ کے فیصلہ پر رکھا گیا۔ اس فرمانروا کی مدد کے لئے ایک بین الاقوامی کمیشن کا تقرر طے ہوا۔ سرحدوں کی تعیین بھی ایک خاص کمیشن کے سپرد کیا گیا (یہ صوبہ البانیا ارنووط قوم کا وطن ہے جو کہ ترکی مملکت میں نہایت زیادہ بہادر اور سلطان عبدالحمید مرحوم کے خصوصی محافظ تھے اور یہ سب کے سب مسلمان ہیں) انہیں کی بغاوت اور البانی فوج کی ہمدردی اور مطالبہ تبدیل وزارت کی بنا پر محمود شوکت نے استعفا دیا تھا اور کامل پاشا کی وزارت قائم ہوئی تھی۔

لندن صلح کانفرنس تبدیلی وزارت کی وجہ سے ناکام ہو کر چونکہ ٹوٹ گئی تھی تو عارضی صلح بھی جاتی رہی اور پھر تمام بلقان میں جنگ جاری ہو گئی۔ وزارت جدیدہ اس قلیل مدت میں کوئی معتد بہ انتظام نہ کر سکی جس کی وجہ سے جو مقامات بلقان میں ترکوں کے پاس باقی رہ گئے تھے وہ بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ بالآخر ۱۹ اپریل ۱۹۱۳ء کو ترکوں اور بلغاریوں

میں بولیر میں عارضی طور پر صلح ہوئی اور مستقل صلح کے لئے لندن میں دوبارہ صلح کانفرنس کے انعقاد کی کوشش شروع کی گئی چنانچہ کانفرنس کا انعقاد ہوا اور بہت زیادہ بحث اور گفتگو کے بعد ۳۰ مئی کو صلح نامہ لندن پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔ جس کی بناء پر یورپین ترکی کے تمام علاقے بہ استثناء البانیا جو خط اینوس و میڈیا کے مغرب میں واقع تھے ریاستہائے بلقان کو دے دیئے گئے۔ البانیا کی سرحدوں نیز اس کے متعلق تمام دوسرے مسائل کا فیصلہ دول عظمیٰ پر چھوڑ دیا گیا۔ کریٹ کے علاوہ اور تمام "جزائر ایجین" کی قسمت کا فیصلہ بھی دول عظمیٰ ہی پر چھوڑا گیا، باب عالی نے کریٹ کا الحاق یونان سے منظور کر لیا۔ مالی معاملات کا تصفیہ پیرس کے بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کیا گیا اور حکومتی اختیارات قومیت اور تجارت کے مسائل کا مخصوص معاہدوں سے طے ہونا قرار پایا۔ (ملر صفحہ ۵۰۸-۹) دولت عثمانیہ ص ۳۱۸

جنگ تقسیم بلقان

ترکی یورپین علاقوں کی تقسیم میں جو کہ دوسری لندن کانفرنس میں ریاست بلقان کو دے دیا گیا تھا نہایت زیادہ اختلاف ہوا ہر ایک اپنے لئے زیادہ سے زیادہ چاہتا تھا اور ایسے مقامات کو انتخاب کرتا تھا جو کہ دوسرے کے نزدیک بہت اہم اور ضروری تھے۔ یہاں تک کہ نوبت جنگ کی آگئی۔ اگرچہ اپنی اپنی کامیابی پر ہر ایک سرمست اور سرشار تھا مگر ان میں بلغاریہ سب سے زیادہ مغرور اور سرمست تھا اُس نے حریفوں کی طاقت سے بے پرواہی کرتے ہوئے ۲۹ جون ۱۹۱۳ء کو آدھی رات میں بغیر کسی اطلاع یا اعلان جنگ کے یونانی اور سروی ستون پر حملہ کر دیا۔ دوسرے روز ایک لاکھ بلغاری فوج نے اُس سروی فوج پر جو کہ اُس سے قریب تھی ہلہ بول دیا۔ سروی فوج اس ناگہانی حملہ سے پہلے تو پسپا ہوئی لیکن یکم جولائی کو مونٹی نگرو کی مدد سے جم کر مقابلہ کیا۔

(بلغاریہ کے تیور دیکھ کر پہلے سے اتحادیوں (سرویا، مونٹی نگرو، یونان، رومانیہ) نے آپس میں معاہدۂ اتحاد کر لیا تھا) اور ۲ جولائی کو بلغاری فوج کو شکست دیکر اس کی بہت سی توپیں چھین لیں۔ ۴ جولائی کو پھر مقابلہ ہوا اور بلغاریا کو پھر شکست ہوئی۔ ۸ جولائی کو سروی فوج نے اسٹیپ پر قبضہ کر لیا اور اب بلغاری پسپا ہو کر اپنی سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس درمیان میں یونانی فوجوں نے بھی پیشقدمی کر کے بلغاری فوج سے بمقام کلکیش جنگ کی بلغاری بری طرح ہارے۔ اُس کے بعد متعدد لڑائیاں اور ہوئیں جن میں بلغاریوں کو لگاتار شکستیں کھانی

پڑیں اور اُن کے لئے صرف اپنی سرحد کی راہ کھلی رہ گئی ۔ بلغاریا کی اس نازک حالت کو دیکھ کر ترکوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور ۱۵ جولائی کو انور پاشا تھریس میں داخل ہوئے اور ۲۰ جولائی کو ادرنہ پر قبضہ کر لیا ۔ اُس کے بعد ڈیموٹیکا اور قرق کلیسا بھی انہوں نے دوبارہ فتح کر لئے ۔

عارضی صلح

جنگ تقسیم صرف ایک ماہ تک جاری رہی لیکن اس قلیل مدت میں بلغاریا کی حالت نہایت نازک ہوگئی ۔ اُس کی فوجوں کو ہر معرکہ میں شکست ہوئی ۔ دشمن کی فوجیں ہر طرف سے بڑھتی ہوئی آ رہی تھیں ۔ بالآخر اُسے مجبور ہو کر دول عظمیٰ سے صلح کی درخواست کرنی پڑی ۔ ۳۱ جولائی کو فریقین ایک عارضی صلح پر راضی ہوئے اور طے پایا کہ ایک صلح کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ریاست ہائے بلقان کے نمائندے شریک ہوں لیکن دول عظمیٰ کے نمائندے شرکت نہ کریں ۔

صلحنامہ بخارسٹ

بخارسٹ صلح کانفرنس کا اجلاس فوراً شروع کر دیا گیا اور اس سرعت کے ساتھ معاملات فیصل ہوئے کہ ۱۰ اگست ۱۹۱۳ء کو محاربین نے صلح نامہ پر دستخط کر دیئے سب سے زیادہ نقصان بلغاریہ کو برداشت کرنا پڑا ۔ مقدونیہ (جس کے لئے اُس نے جنگ تقسیم چھیڑی تھی) یونان اور سرویا میں تقسیم کر دیا گیا اور اس کو تقریباً کلیتہً محروم کر دیا گیا ۔

دولت عثمانیہ کے ساتھ کوئی معاہدہ ۲۹ ستمبر تک نہ ہو سکا ۔ ۲۹ ستمبر کو بالآخر باب عالی اور بلغاریا کے درمیان بھی صلح ہو گئی ۔ تھریس کا بڑا حصہ ترکوں کو واپس مل گیا ۔ اس میں ادرنہ، ڈیموٹیکا اور قرق کلیسا کے اہم شہر شامل تھے ۔ یورپ میں دولت علیہ کی کائنات صرف اسی قدر اور رہ گئی تھی ۔ باقی سارا علاقہ ریاستہائے بلقان میں تقسیم ہو گیا ۔

بلقان کی دونوں جنگوں میں ترکوں کے مقتولوں اور زخمیوں کا شمار ایک لاکھ نفوس کا کیا گیا ہے اور مصارف ۸ کروڑ پونڈ کیا گیا ہے ۔ علاقہ اور آبادی کے لحاظ سے اس کی آبادی میں سے بیالیس لاکھ اُنتالیس ہزار دو سو نفوس اس کی حکومت سے نکل گئے اور صرف دس ہزار آٹھ سو بیاسی مربع میل اس کی حکومت میں رہ گئے ۔

خالدہ ادیب خانم جنگ بلقان کے نتائج اور اثرات میں منجملہ دیگر امور مندرجہ ذیل امور بھی تحریر فرماتی ہیں :۔

(الف) شکست کی مصیبت تو تھی ہی اس پر طرہ یہ ہوا کہ بلقانیوں نے مسلمانوں کی آبادی کو جو جنگ میں شریک نہ تھی اور جس میں زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ لوگ بھاگ کر ترکی میں پناہ لینے لگے۔ اسیران جنگ کو قتل کرنا، ان کو فاقوں مارنا، ان کے ہاتھ پیر کاٹنا، عام باشندوں کو اذیت پہنچانا اور ان کا خون بہانا۔ ان سب چیزوں کی ابتداء زمانہ حال میں بلقانیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں کی۔

(ب) مغرب ان ہولناک مظالم کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ مگر جب بلقان کی ریاستوں نے ایک دوسرے کی عیسائی رعایا کے ساتھ بھی یہی حرکتیں شروع کیں تو مغرب سے مخالفت کی آواز اُٹھی۔ دوسری جنگِ بلقان کے بعد کارنیگی نے ایک بین الاقوامی کمیشن تحقیقات کے لئے بھیجا۔

(ج) جب ترکی عورتوں نے استنبول کے یونیورسٹی ہال میں جمع ہو کر یورپ کی بادشاہ بیگموں سے اپیل کی تھی کہ انسانی ہمدردی کی خاطر بلقان کی مسلم آبادی کی حمایت کریں تو جواب تک نہیں ملا تھا۔ ترکوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فریاد سے یہ بے اعتنائی اور عیسائیوں کو اسی حال میں دیکھ کر یہ جوش و خروش تو ان پر بہت بُرا اثر ہوا۔ مقدونیہ سے ہزار ہا مسلمان بھاگ کر اناطولیہ میں آ گئے تھے اور اپنی مظلومی کی داستان سناتے تھے اس کی وجہ سے اناطولیہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات جو اب تک بہت اچھے تھے بہت خراب ہو گئے۔

(ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۸۹-۸۶)

مندرجہ بالا احوال اور واقعات سے جو کہ اکثر یورپین مورخین سے نقل کئے گئے ہیں ہر سمجھ دار شخص مندرجہ ذیل نتائج نکالنے پر مجبور ہے۔

(الف) ۱ انگریز اور یورپین قومیں ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو نہ انسان سمجھتی ہیں اور نہ انسانی حقوق دیتی ہیں۔ اُن کا دعوے عام انسانوں کی ہمدردی کا بالکل جھوٹا ہے۔

(ب) ۲ انگریزوں اور یورپین اقوام کا نعرہ خدمت انسانی صرف اپنی نسل اپنی رنگت اپنی سرزمین یورپ تک محدود ہے۔ جو لوگ یورپین نسل اور سپید رنگ اور سرزمین یورپ کے باشندے نہیں ہیں وہ ہر اس فعل کے مستحق

ہیں جو مملوک حیوانات کے ساتھ کئے جا سکتے ہیں بلکہ وہ مثل حیوانات یورپ والوں کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

(ج ۳) ان کا اعتقاد اور نظریہ یہ ہے کہ نوآبادیات ایشیا اور افریقہ وغیرہ کے باشندوں کا مال، جان، عزت، زمین دست کاری، تجارت وغیرہ سب انگریزوں اور متسلط یورپینوں کا مملوک ہے جس طرح چاہیں ان کے لئے قانون بنائیں اور جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں۔ یہ رنگین قومیں اگر اف بھی کریں تو باغی ہیں۔ مجرم ہیں۔ مستحق دار و گیر ہیں۔

(د ۴) ان کے نزدیک اپنی شہنشاہیت، اپنی قوم، اپنے وطن کے لئے تمام رنگین قوموں اور ان کے ذرائع معاش اور ذرائع امن و سکون وغیرہ کو قربان کرنا ہی عدل اور رحمت اور تہذیب ہے۔

(ہ ۵) ان کا اعتقاد ہے کہ ہر قسم کا جھوٹ، عذر، فریب و مکر، ظلم و ستم، پروپیگنڈا، اور ہر ایک شرمناک معاملہ اپنے اور اپنی قوم و ملک کے مفاد کے لئے واجب اور فرض ہے اور اس میں کوئی قباحت اور عیب نہیں۔

(و ۶) ہندوستانیوں کا دنیا میں سب سے بڑا دشمن انگریز ہے اس نے جس قدر ہندوستانیوں کی دولت ذرائع دولت (تجارت، صنعت، زراعت) وغیرہ اور ان کے اخلاق، تعلیم، عزت، اتحاد، اعلیٰ قابلیت وغیرہ کو نقصان پہنچایا کسی قوم نے زمانہائے گذشتہ میں نہیں پہنچایا اور نہ کسی دوسری قوم نے اب تک کسی دوسری قوم کو پہونچایا۔

(ز ۷) انگریزوں اور یورپین قوموں کے عہود و مواثیق ایشائیوں اور افریقیوں کیلئے سراسر جھوٹ اور مکر ہیں۔ دفع الوقتی کے لئے عمل میں لائے جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں توڑ بیٹھتے ہیں۔ کوئی معاہدہ رنگین قوموں اور ایشیائیوں اور افریقی لوگوں سے کیا ہوا ضروری العمل نہیں ہے۔

(ح ۸) انگریز ہندوستانیوں کو ہمیشہ ادنیٰ حالت اور غلامی کی لعنتوں میں پھنسائے رکھنا چاہتا ہے۔ کسی امر میں اس کو ہندوستانیوں کا ابھرنا گوارا نہیں ہے۔

(ط ۹) انگریز مذہب اسلام اور مسلمانوں کے روئے زمین پر سب سے بڑے دشمن ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے ہر ظلم ہر بے حیائی ہر بدعملی کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں۔

(ی) ~~۱۰~~ ابتداء اسلام سے آج تک اسلام اور مسلمانوں کو جس قدر نقصان یورپین قوموں اور بالخصوص انگریزوں نے پہنچایا ہے کسی نے نہیں پہنچایا۔

(ک) ~~۱۱~~ انگریز دوست بن کر بھی زنگین قوموں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتا رہا ہے اور دشمن بن کر بھی۔ اُن کی دوستی اور دشمنی ایشیائیوں اور افریقیوں کے لئے بربادی ہی بربادی ہے۔

(ل) ~~۱۲~~ انگریز کا ہندوستان میں باقی رہنا ہندوستان کا برباد ہونا ہے۔ جتنی ہی اس میں دیر ہو گی ہندوستان کی ہر منٹ بربادی بڑھتی ہی جائے گی۔ جیسا کہ ہم ڈبلیو۔ ایس۔ بلنٹ وغیرہ کا قول نقل کر آئے ہیں۔

(م) ~~۱۳~~ انگریزوں نے ہندوستانیوں میں پھوٹ اور تفرقہ اس قدر پیدا کر دیا کہ جس کے ہوتے ہوئے امن وامان صدیوں تک مکمل نہیں ہو سکتا۔

(۱۴) انگریزوں نے ہندوستان کو جو کہ مذہبی اور روحانی ملک تھا بالکل ناستک اور بے دین ملک بنا دیا ہے مذہبیت اور خدا ترسی کو تقریباً مٹا دیا ہے فسق وفجور، خود غرضی مکروفریب، جھوٹ، دغا بازی مادہ پرستی اور دنیا طلبی اور خلاف انسانیت افعال کو شائع کر دیا ہے۔

ہندوستان کے حالات اور دنیا بھر کے واقعات کے مطالعہ اور گہرے غور وفکر نے انگریزوں اور یورپین اقوام کے متعلق یہ عقائد وخیالات حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ذہن میں پختہ کر دیئے تھے۔ نیز دنیا کی سابقہ تاریخیں اور آسمانی تعلیمات اُن کے پیش نظر تھیں۔ پہلو میں غیرت مند دل اور بیدار دماغ موجود تھا۔ بنابریں آنے والے ثمرات ونتائج کا ظہور لازمی تھا۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک پر روشنی ڈالنے سے پہلے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر تاریخی حالات ناظرین کی خدمت میں پیش کر دیں۔ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور کے عثمانی شیوخ میں ایک معزز اور ذی وجاہت عالم تھے۔ بصیغۂ ملازمت ڈپٹی انسپکٹری مدارس ایک عرصہ تک بریلی میں مقیم رہے (علوم عربیہ بالخصوص ادبیات عربیہ و فارسیہ و اُردو میں آپ کو خاص مہارت تھی شرح دیوان حماسہ مسمیٰ بہ تسہیل الدارسہ اور شرح دیوان متنبی اور شرح سبع معلقہ، شرح قصیدہ بردہ، تذکرۃ البلاغہ وغیرہ آپ کی تصنیف کردہ کتابیں آج بھی نہایت مفید اور عمدہ یادگار ہیں) حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم ۱۲۶۸ھ میں وہیں (بریلی میں) پیدا ہوئے۔ ایام طفولیت میں جبکہ آپ کا سن پانچ یا چھ برس کا تھا قبل از واقعہ ۱۸۵۷ء والد ماجد کا تبادلہ میرٹھ ہو گیا اس وجہ سے غدر کے زمانہ میں کبھی میرٹھ اور کبھی دیوبند رہے۔ قرآن مجید اور ابتدائی فارسی کی تعلیم ایک دیندار بزرگ میانجی منگلوری صاحب سے پائی اور کتب عربیہ اپنے با فضل و کمال چچا مولانا مہتاب علی صاحب مرحوم سے پڑھنی شروع کی تہذیب و قدوری وغیرہ پڑھتے تھے کہ دیوبند میں با اخلاص مقدس بزرگوں کے مشورہ سے ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ عربیہ جو آج ایک مرکز علوم اسلامیہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے جاری ہوا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اُس کے سرپرست قرار پائے۔ حضرت مولانا اس کے سب سے پہلے شاگردوں اور طالبعلموں میں داخل ہوئے۔ اکثر کتب درسیہ مدرسہ کے اوّلین اور مشہور اُستاد ملا محمود صاحب دیوبندی مرحوم کے پاس پڑھنے کے بعد اپنے مخصوص استاذ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دیوبند اور میرٹھ میں (جبکہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مطبع مجتبائی میں بسلسلہ تصحیح کتب مطبوعہ ملازم تھے) رہ کر صحاح ستہ اور دیگر علوم کی اعلیٰ کتابیں پڑھ کر فیوض و کمالات حاصل فرماتے۔ اور بعض کتب اپنے والد ماجد سے بھی پڑھیں۔ فراغت تحصیل سے پہلے ہی مدرسہ میں بطور معین المدرسین درس دینا شروع فرما دیا۔ ۱۲۹۰ھ میں آپ کو علماء حقانی کے ہاتھ سے دستار فضیلت اور سند تکمیل عطاء ہوئی۔ صاحب بصیرت بزرگوں کی تجویز سے ۱۲۹۲ھ میں باقاعدہ مدرس چہارم مقرر ہوئے اور ہر قسم کی متوسط اور اعلیٰ کتابیں آپ کے زیر درس رہیں۔ ۱۲۹۴ھ میں بزرگان ہندوستان کے مشہور قافلہ جس میں مولانا محمد قاسم صاحب مولانا محمد یعقوب صاحب مولانا رشید احمد صاحب اور بہت سے

مقدس مشاہیر علماء وصلحاء شریک تھے۔ حج بیت اللہ اور زیارت حرم نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے شوق میں روانہ ہوئے اور حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بارشاد مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم بیعت کا شرف حاصل کیا۔ ان مقامات مقدسہ کے برکات وفیوض سے بہرہ ور ہو کر چھ ماہ کے بعد بعافیت واپس ہوئے۔ اور بدستور تعلیم علوم میں مصروف ہو گئے اسی زمانہ میں اپنی مشہور کتاب ایضاح الادلہ کے ابتدائی اجزاء تحریر فرمائے ۱۲۹۷ھ میں جبکہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ چند ماہ بیمار رہ کر واصل بحق ہو گئے تو ان کی مفارقت کے غم والم میں تمام تعلقات اور مشاغل تدریسیہ ترک کر کے عزلت گزینی اختیار فرمائی (حضرت مولانا کو اپنے کامل اُستاذ مولانا نانوتوی مرحوم سے انتہائی عشق اور اخلاص تھا اس مفارقت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے) ایک ماہ بعد مہتمم دار العلوم مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم کے اصرار وارشاد پر پھر تدریس شروع فرمائی نیز جذبہ سلوک طریقت اسی زمانہ میں غالب آیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی جدوجہد شروع کی اوقات تعلیم میں علوم ظاہرہ کی تدریس میں مشغول رہتے تھے اور باقی اوقات میں ذکر وشغل میں مشغول ہوتے تھے۔ طبیعت نہایت موزوں تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مقامات طریقت طے کر کے مستحق خلافت ہو گئے چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حسب عادت حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کو لکھا کہ مولوی محمود حسن کو ملکہ یادداشت حاصل ہو گیا ہے آپ اُن کو اجازت دے دیں (حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی حیات میں کسی کو خود خلافت واجازت نہیں دیتے تھے۔ سالکین طریقت [illegible] و تلقین فرماتے رہتے تھے۔ جب کوئی مستحق اجازت ہو جاتا تھا تب اس کی اطلاع حضرت مُرشد قدس اللہ سرہٗ العزیز کو دے کر وہاں سے اجازت دلواتے تھے) چنانچہ وہاں سے اجازت آ گئی۔ جامع کمالات نمونہ سلف صدر مدرس جناب مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات اور مولانا سید احمد صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھوپال چلے جانے کے بعد ۱۳۰۵ھ میں باتفاق آراء

اراکین دارالعلوم صدر مدرس تجویز ہوئے اور علی الاتصال چالیس سال تک نشر و اشاعت علوم فرماتے رہے۔ تمام علوم ظاہرہ اسلامیہ اور معارف باطنہ معنویہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور سب علوم و فنون کی کتابیں بلا تکلف اعلیٰ تحقیقات کے ساتھ پڑھاتے تھے لیکن علم حدیث میں مخصوص شہرت اور بے مثال تبحر اور تحقیق رکھتے تھے جس کی وجہ سے اقطار ہندوستان اور ممالک بعیدہ سے طلباء علوم کشاں کشاں آتے تھے۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، موصل، بصرہ، بلخ، بخارا، ہرات، قندھار، کابل، ترکستان۔ ہر جگہ کے طلبہ آپ کے حلقۂ درس میں نظر آتے تھے اور تحقیقات نجیبہ کے فیوض سے دامن بھر کے لیجاتے تھے۔ متعدد منتہی طلبہ جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں سے استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اپنے اپنے شکوک و شبہات کے کامل اور تشفی بخش جواب پانے کے بعد حضرت مولانا مرحوم کی زبان سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے معانی و مضامین عالیہ کو سن کر سرنیاز خم کر کے معترف ہوتے تھے کہ یہ علم کسی کو نہیں۔ نہ ایسا محقق عالم اس وقت دنیا میں ہے۔ آواز صاف و بلند، تقریر نہایت سلیس اور رواں تھی۔ کلام میں خاص اثر تھا جو کہ مضمون کو سامع کے دل نشیں کر دیتا تھا۔ جوانی اور قوت کے زمانہ میں دن رات کے اکثر اوقات درس و تدریس کے شغل میں گذرتے تھے لیکن اخیر ایام میں صرف دو تین گھنٹہ روزانہ جامع ترمذی اور صحیح بخاری کا درس دیتے تھے۔

(مختصر سوانح عمری حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز از مولانا سید اصغر حسین صاحب مرحوم معہ افادات زائدہ ص۱۔۲)

تواریخ عالم بالخصوص تاریخ اسلام پر خصوصی نظر تھی۔ اساتذہ شعر و سخن کے (خواہ عربی ہوں یا فارسی یا اُردو) کلام بہت زیادہ محفوظ تھے جن کو سن کر ماہر ادیب دنگ رہ جاتا تھا۔ ملکہ سخن گوئی نہایت اعلیٰ اور عجیب تھا اساتذہ کلام میں مرزا غالبؔ سے بہت زیادہ مناسبت تھی۔ طبیعت نہایت سادہ اور متواضع تھی۔ فخر و تکبر کا نام تک نہ تھا۔ ظاہری چال ڈھال، وضع قطع میں ریاء و نمود، تعلی اور بڑائی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ عزم راسخ اور یقین صادق قدرت نے عطا فرمایا تھا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین

تحریک انقلاب (عرف) ریشمی خطوط کی تحریک

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہندوستان جبکہ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں آسمان سیاست پر درخشاں آفتاب بن کر چمک رہا تھا اسی زمانہ میں سامان کسوف بن کر منحوس یورپین قومیں پہلے پرتگیز پھر ان کی دیکھا دیکھی انگریز، فرنچ، ڈچ، جرمن وغیرہ ہندوستان میں آئیں۔ یہاں کے بادشاہوں اور حکام نے مہمان نوازی کے فرائض حسب عادت سلاطین ہند انجام دیئے ان کو نہ صرف داخلہ کی اجازت دی بلکہ سکونت اور تجارت اور حقوق شہریت وغیرہ بلا رکاوٹ دیئے گئے۔ انگریز بھی مثل دیگر اقوام اس خوان نعمت سے فیضیاب ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے انگریز تاجر اطراف وجوانب ہند میں پھیل گئے۔ ان کو اپنے یوروپین ہم وطن اقوام سے رقیبانہ کشمکشیں بھی پیش آئیں۔ بالآخر ۱۶۰۰ء میں ان کے تقریباً ایک سو تاجروں کی منظم جماعت بنام ایسٹ انڈیا کمپنی بن گئی جس نے تجارتی کاروبار اجتماعی قوت سے جاری کیا اور غدارانہ بلکہ ظالمانہ طریقوں سے بہت زیادہ کمایا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان کی نیتیں فاسد اور ارادے نہایت خباثت آمیز ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ آف بنگال پر حملہ کر دیا اور اس کے اراکین دولت میں سے میر جعفر اور امی چند دو وزیروں کو توڑ لینے میں کامیاب ہو کر ملک گیری اور حکومت شروع کر دی۔ یہ چسکا ان کو ایسا لگا کہ ہر وقت اور ہر آن یہی دھن لگی رہتی تھی۔ بالآخر ۱۸۰۳ء تک تقریباً اکثر حصہ ہندوستان میں ان کا مکمل اثر اور پورا اقتدار قائم ہو گیا اور اس قدر جرأت ہو گئی کہ بادشاہ دہلی سے جبراً اپنی حکومت پر دستخط کرا کر ملک میں اعلان کرا دیا کہ "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا حکومت کمپنی بہادر کی"۔ ان معاملات کو علماء اسلام دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے۔ آخر کار حکام سلطنت کی غفلت بے پروائی، بے وفائی، بزدلی ارباب اقتدار کے آپس کے نفاق کے مظاہروں وغیرہ نے مجبور کیا کہ عام مسلمانوں کو متنبہ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے آزادی کے متعلق فتویٰ دے دیا اور عام مسلمانوں کو ہندوستان کے آزاد کرانے کے طریقہ کو سمجھایا اس وقت سے

مسلمانوں اور خصوصاً اہل علم میں یہ تحریک انقلاب شروع ہوئی اور تقریباً بیس برس کے عرصہ میں تمام ہندوستان میں شعلہ جوالہ بن کر یہ تحریک پھیل گئی اور ایک مکمل نظام اور مکمل قوت تیار ہوگئی۔ ۱۸۲۴ء میں مغربی سرحد میں پہنچ کر اس کی عملی کارروائی جاری ہوگئی جس کی تفصیل ہم پہلے صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ چھ برس تک کامیابیوں کے ساتھ یہ کارروائی جاری رہی مگر انگریزی چالبازیوں اور آپس کے نفاق اور غداریوں وغیرہ کی وجہ سے ۱۸۳۰ء میں شکست ہوئی اور تحریک تقریباً فیل ہوگئی انگریزوں نے شرکاء تحریک پر عرصۂ دراز تک انتہائی آزار اور انتقامی تکلیف کے اعمال جاری رکھے اور ملک میں ہندوستانیوں کی عام لوٹ کھسوٹ اور ایذادہی میں وہ انسانیت سوز حرکتیں کیں جن کی وجہ سے انگریزوں سے عام ناراضی ملک میں پھیل گئی اور ۱۸۵۷ء کا مشترک واقعہ پیش آیا جس میں ہندو اور مسلمان آپس میں مل کر ہندوستان کی آزادی کے لئے سربکف ہو گئے تھے۔ بدقسمتی اور خائنوں کی بدعملی کی وجہ سے اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان سب ہی برباد کئے گئے مگر مسلمانوں پر بربادی کے پہاڑ بہت زیادہ ڈھائے گئے اور ہر قسم کے انتہائی دردناک مظالم اُن کو سہنے پڑے (جن کو ہم کچھ سابق صفحات میں بطور نمونہ عرض کر چکے ہیں) چنانچہ شدت مظالم اور انگریزوں کی فوجی اور اسلحہ جدیدہ کی بے پناہ طاقت کی نمائش کی بناء پر ہندوستانیوں میں جنگ کے ذریعہ انقلاب کرنے کی ہمت نہ رہی۔ خوف و ہراس کا ہر طرف دَور دورہ ہوگیا۔ اور مظالم شنیعہ کا اندھیرا بہ نسبت سابق کئی گنا زائد پھیلا دیا گیا۔ بالآخر تنگ ہو کر آئینی انقلاب کی تحریک ۱۸۸۵ء میں بصورت کانگریس جاری کی گئی اس کی رفتار نہایت دھیمی تھی اور بالمقابل انگریز ہر قسم کے توڑ کی کارروائی کر رہا تھا۔ تا اینکہ نوبت تقسیم بنگال کی آگئی۔ لارڈ کرزن نے افتراق کا سیلاب چاروں طرف بنگال میں پھیلا دیا۔ مسلمانوں اور ہندؤں کو لڑا کر حکومت برطانیہ نے اپنا مقصد خوب حاصل کیا مگر پھر مجبور ہو کر دربار کے موقعہ پر تقسیم کے منسوخ کر دینے کا اعلان کر دیا۔ یوپی میں ۱۹۰۰ء میں ناگری کا اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ اور مہاسبھا کا اور پھر کانپور کی مسجد اور کلکتہ میں توہین جناب سردار دو عالم علیہ السّلام اور پھر فائرنگ کا فتنہ برپا کر دیا۔ ادھر ٹرکی جو عرصہ دراز سے مسلمانوں کا قبلۂ توجہ اور خلیفہ دینی چلا آتا تھا اس کے ساتھ مظالم اور دردناک

ناانصافیوں خصوصاً جنگ طرابلس اور بلقان اور تقسیم ممالک اسلامیہ کے ایسے واقعات لگاتار پیش آئے جنہوں نے انتہائی بے چینی عام قلوب میں پیدا کر دی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز جن کی گہری نظر واقعات عالم اور بالخصوص ہندوستان اور ٹرکی پر زیادہ مرکوز رہتی تھی ان واقعات سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ ان کے لئے آرام و چین تقریباً حرام ہو گیا اور گویا وہ اپنے اختیار سے نکل گئے۔ تاریخ دانی اور گذشتہ واقعات ہند و ممالک اسلامیہ ایشیا و افریقہ و یورپ وغیرہ پر غائرانہ نظر نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ مذکورہ بالا چودہ نتائج کو جو کہ ص ۱۲۸ تا ۱۳۰ میں ذکر کئے گئے ہیں۔ صحیح سمجھیں۔ چنانچہ ہم ہمیشہ ان سے بار بار ان مضامین کو سنا کرتے تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر تاریخ میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ مولانا مرحوم کو تعلیم و تربیت کا شرف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور پھر حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس اللہ اسرارہما اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل تھا سالہاسال ان کی خدمت عالیہ میں انتہائی اخلاص اور شغف بلکہ عاشقانہ جذبات کے ساتھ رہنا ہوا تھا اور ان حضرات کی وہ مکمل ہستیاں تھیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں علم آزادی بلند کر کے شاملی تھانہ بھون وغیرہ پر سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی مبارک آگ سلگتی رہتی تھی اس لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر ہونا طبعی امر ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت کی فیاضیوں سے ایسا قلب عطا ہوا تھا جس میں انسانی غیرت، وطنی اور قومی حمیّت، اخلاص اور للّٰہیّت، اسلامی ہمدردی وغیرہ کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی دماغ ایسا قوی الحافظہ عطا کیا گیا تھا جس میں نہ صرف علوم نقلیہ اور عقلیہ کے بے شمار مسائل محفوظ رہتے تھے بلکہ واقعات تاریخیہ اور اشعار ادبیہ اردو، فارسی عربی کے بے شمار خزانے بھی جمع رہتے تھے۔ ذکاوت اور سمجھ ایسی اعلیٰ درجہ کی عطاء ہوئی تھی کہ مشکل سے مشکل مسائل ادنیٰ توجہ میں حل فرما دیتے تھے۔ اس لئے بیرون ہند کے مذکورہ بالا واقعات خصوصاً بلقان اور طرابلس کے دل گداز اور ہولناک مظالم اور اندرون

ہند کی انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں اور شرمناک وحشت و بربریت، لوٹ کھسوٹ کی فراوانی نے انتہائی درجہ مایوس اور مضطرب کر دیا اور آمادہ کر دیا تھا کہ عواقب اور نتائج سے بے نیاز ہو کر میدان انقلاب میں سربکف، کفن بردوش نکل پڑیں۔ زمانہ کی تاریکیاں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں، احوال کی نزاکتیں، اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں اور کچھ عرصہ اسی غور و خوض میں گذرا مگر چونکہ پانی سر سے گذر چکا تھا اس لئے خوب سوچ سمجھ کر صرف قادر مطلق پر اعتماد اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دیا۔

شروع شروع میں بہت زیادہ مشکلات قیاس سے زیادہ سامنے آئیں سخت اور تند آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بادِ سموم کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے۔ احباب و اقارب مار آستین بن گئے۔ ہر شخص ناصح اور خیرخواہ بن کر سدّ راہ بنا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ انگریز نے اس قدر پیش بندی کر رکھی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ اُٹھانا سنہ سناون کا سماں باندھتا تھا۔ آزادی اور انقلاب کا اگر کوئی خواب بھی دیکھ لیتا تھا تو پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ ہوم رول یا خود اختیاری حکومت کی خواہش بھی زبان پر لانا برق جہاں سوز سے زیادہ تباہ کُن شمار کی جاتی تھی۔ برطانی تشددات اور مظالم کے ہونے نے اس قدر قلوب اور دماغوں کو متاثر کر رکھا تھا کہ بہت سے نفوس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر نہ پایا جاتا تھا جتنا کہ انگریز کا خوف مستولی تھا۔ خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی میں ایسے ایسے لوگ کام کر رہے تھے کہ جن پر شُبہ کرنا بھی بے دینی اور کفر سمجھا جا سکتا تھا چاروں طرف سی آئی ڈی کا جال بچھا ہوا تھا پھر کس طرح اُمید کی جا سکتی تھی کہ کوئی شخص بھی ہم خیال اور ہم زبان یا ہم عمل ہو سکتا ہے خصوصاً جبکہ ہر شخص آزادی کے ذکر کرنے سے بھی کان پر ہاتھ رکھتا ہو۔ بہرحال حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تمام خطرات سے قطع نظر کرنا ضروری سمجھا اور "ہرچہ بادا باد من کشتی در آب انداختم" کہتے ہوئے اللہ تعالےٰ کا نام لے کر اس بحر زخار اور ہولناک طوفان میں کود کر آگے بڑھے۔ اور لوگوں کو ہم خیال اور رفیق سفر بنانے لگے۔ بڑے بڑے علماء اور مشائخ سے چونکہ نا اُمید اور مایوس تھے (جیسا کہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مشہور مولویوں اور پیروں سے اُمید نہ رکھنی چاہیئے اور فرماتے تھے کہ بعض اہل اللہ نے مجھ کو یہ نصیحت کی تھی) وجہ ظاہر ہے کہ ان کو اپنی

بڑائی کی وجہ سے بہت زیادہ خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھ دار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے۱؎ جن میں سے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم بھی ہیں۔ مولانا عبید اللہ صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص فدائی اور نو مسلم شاگرد تھے۔ عرصۂ دراز تک خدمت میں رہے تھے۲؎ سمجھ اور حافظہ نہایت اعلےٰ

۱؎ چونکہ مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تقریباً پچاس برس سے مسند تدریس پر متمکن رہے تھے اسلئے مخلص شاگردوں اور جانباز معتقدوں کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے عموماً انہیں لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر مشن تحریک آزادی میں شریک کیا تھا ان کی تفصیلی فہرست بہت طویل ہے۔ مگر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے مشاہیر اور بہت زیادہ سرگرم ممبروں کی مختصر فہرست پیش کر دی جائے۔ (مصنف)

۲؎ وہ اپنی ڈائری کے صفحہ ۹ میں لکھتے ہیں:۔ میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں چیانوالی میں پیدا ہوا۔ خاندان کا اصلی پیشہ زرگری (سوناری) تھا لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے رہے۔ میں عموماً سلمان فارسیؓ کے اتباع میں اپنا نام عبید اللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبید اللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی ہمشیر کا نام "جیونی" تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لئے کہا تو عبید اللہ بن راما بن رائی لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔ میں بشب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔ میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازیخاں میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوئے تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل اسکول میں شروع ہوئی ۱۸۸۵ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لئے گھر چھوڑ دیا۔ اس دوران میں دو سال کے لئے میں ضلع سیالکوٹ میں رہا اس لئے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا ورنہ اپنے اسکول میں شروع ہی سے ممتاز

(دیکھئے صفحہ ۵۵۵)

پیمانہ کا اور ہمت و استقلال بے نظر قدرت نے عطا فرمایا تھا اس زمانہ میں دہلی میں مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ میں تعلیمی کام کرتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے نوجوانان اسلام کے عقائد اور خیالات پر جو بے دینی اور الحاد کا زہریلا اثر پڑتا ہے

حاشیہ متعلق بہ صفحہ ۵۵۳ - طالب علم مانا جاتا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماج کے لڑکے کے ہاتھ سے تحفۃ الہند ملی۔ میں اس کے مطالعہ میں مصروف رہا اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب کے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلاں) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے انہیں کے توسط سے مجھے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان ملی۔ اس کے مطالعہ پر اسلامی توحید اور پورا نک شرک اچھی طرح سمجھ میں آ گیا۔ اس کے بعد مولوی محمد صاحب لکھنوی کی کتاب احوال الآخرۃ پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنّف کے نام پر عبید اللہ خود تجویز کیا احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نو مسلموں کے حالات لکھے ہیں یہی دو چیزیں جلدی اظہارِ اسلام کا باعث بنیں۔ ورنہ اصل ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی اسکول میں اگلے سال تعلیم کے لئے جاؤں گا تو اس وقت اظہار اسلام کروں گا۔ ۱۵/ اگست ۱۸۸۷ء کو توکلاً علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبد القادر تھا ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں پہنچے۔ ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ کو میری سنّت تطہیر (ختنہ) ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے میں سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہو گئی اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب (بھرچونڈی والے) کی خدمت میں پہنچ گیا۔ جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے۔ چند ماہ ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لئے اس طرح طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا (غالباً مولانا ابوالحسن تاج محمود امروٹی جن کا ذکر آگے آئے گا اس مجمع میں موجود تھے) کہ عبید اللہ نے اللہ کے

اس کو زائل کیا جائے اور قرآن کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان کے شکوک وشبہات دین اسلام سے دور ہو جائیں اور وہ سچے اور پکے مسلمان ہو جائیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لے گئے اور مولانا عبید اللہ صاحب سے ملاقات کی

بسلسلہ صفحہ ۵۵۴۔ لئے ہم کو اپنا ماں باپ بنالیا ہے۔ اس کلمہ مبارکہ کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انہیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور محض اسی لئے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے سے بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔ تین چار ماہ بعد میں طالب علمی کے لئے رخصت ہوا مجھے بتایا گیا ہے کہ حضرت نے میرے لئے خاص دعا فرمائی۔ خدا کرے کہ عبید اللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے۔ میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ پھر چونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بہاولپور کی دیہاتی مساجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل وحرکت میں دین پور پہنچا جہاں سید العارفین (حافظ محمد صدیق صاحب) کے خلیفہ مولانا ابو السراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک کتابیں میں نے یہیں مولوی عبد القادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا وہ آگئیں اور واپس لے جانے کے لئے بہت زور لگایا مگر میں بحمد اللہ ثابت قدم رہا۔ (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچی) اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔ یہیں ایک نووارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا اور میں اسٹیشن مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔ ماہ صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دار العلوم میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ مہینہ میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقہ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا حکمت ومنطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لئے چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسہ میں چلا گیا۔ اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رام پور میں رہ کر مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھ لیں۔ اس طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔ دیوبند دو تین مہینہ تک مولانا حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا اس کے بعد مولانا شیخ الہندؒ کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ

(دیکھئے صفحہ ۵۵۶)

اور تذکرہ میں فرمایا کہ جبکہ انگریزی حکومت اور اقتدار ہندوستان میں قائم ہے تو جس مدّت تک تم اپنی اس تعلیم اور اس مدرسہ سے دس بیس آدمی صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے اس مدّت میں انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنادیں گے۔" (اور واقعہ بھی یہی تھا۔ ڈبلو، ہنٹر کہتا ہی ہے۔کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں سے پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے بزرگوں کے عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو) چنانچہ مولانا عبید اللہ صاحب کی سمجھ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اسکیم آگئی اور وہ عالی ہمتی اور تن دہی کے ساتھ تمام ہولناک خطرات کو پس پشت ڈالنے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ رولٹ اپنی رپورٹ میں کہتا ہے کہ مولوی عبید اللہ نے (مولانا) محمود حسن کے خیالات پر اثر ڈالا۔

صفحہ ۵۵۵ کا بقیہ:۔ کو ہدایہ، تلویح، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سیّد احمد صاحب دہلوی مدرس اوّل نے میرے جوابات کی جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبد العزیزؒ ثانی ہوگا۔ چند دوستوں نے مبشرہ خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابو حنیفہ رحؒ کو بھی خواب میں دیکھا۔ رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا جسے شیخ الہندؒ نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کئے جس میں جمہور اہل علم کے خلاف محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی۔ مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن الحصول نہیں۔ بلکہ راسخین فی العلم۔ وہی علم سے جانتے ہیں۔ شوال ۱۳۰۷ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورہ حدیث میں شریک ہوا جامع ترمذی مولانا شیخ الہندؒ سے پڑھی اور ابو داؤدؒ کے لئے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔ بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا۔ حکیم محمود خاں کے علاج سے فائدہ ہوا حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبد الکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کرلیں مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی تھیں اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کرلی۔ مولوی صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمدؒ کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ مولانا نذیر حسین صاحب کی

(دیکھئے صفحہ ۵۵۷)

حالانکہ مولوی عبید اللہ تو تعلیمی جدّ و جہد میں منہمک اور مشغول تھے میں نے ان کو اُدھر سے کھینچ کر سیاسیات اور برطانیہ کے خلاف جنگ میں ڈالا۔

الغرض حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بالکل اپنا ہم خیال اور ہم عمل بنا لیا۔ چونکہ ان کے بہت سے احباب اور جان پہچان والے سندھ، پنجاب، سرحد وغیرہ میں تھے انہوں نے اپنے معتمد علیہ حضرات کو بار بار سفر کر کے استوار کیا اور اس تحریک کا ممبر بنایا۔ نیز دہلی میں بھی رفتہ رفتہ ہم خیال لوگ ہوتے گئے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا محمد علی مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم مولانا ابوالکلام وغیرہ حضرات کے لئے بھی مولانا عبید اللہ صاحب ذریعہ بنے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار مولانا عبید اللہ صاحب کو قرنیٹر، یاغستان سندھ وغیرہ میں بھیجا اور وہاں کے لوگوں سے تعلقات قائم کر کے اس اسکیم کو جاری کیا۔

مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کی ڈائری کا ترتیب دینے والا دیباچہ صفحہ ۳ پر لکھتا ہے:۔

"مولانا عبید اللہ سندھی کا سفر نامہ کابل ایک تاریخی دستاویز ہے اور

(صفحہ ۵۵۶ کا بقیہ) خدمت میں گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں دو سبق بھی سنے۔ ۲۰/ جمادی الثانیہ ۱۳۰۸ھ کو دہلی سے سید ھا بھرچونڈی ضلع سکھر پہنچا (اس تمام سفر میں ایاباً و ذہاباً لاہور نہیں اترا اور مسجد چینیاں نہیں گیا۔ میرے مُرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پاچکے تھے۔ رجب ۱۳۰۸ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیجدیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی۔ شوال ۱۳۰۸ھ سے سیدّ العارفین (حافظ محمد صدیق صاحب مرحوم) کے دوسرے خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا۔ انہوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا میرے لئے بمنزلہ باپ کے تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ اسکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس اخیر وقت تک مبر طرز پر رہیں میرے مطالعہ کے لئے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظل عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا (ذاتی ڈائری از صفحہ ۰ تا صفحہ ۱۶)

ان حالات پر مشتمل ہے جو مولانا کو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت کے ایک رکن کی حیثیت سے ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک کابل میں پیش آئے مولانا شیخ الہندؒ کی جماعت کو گذشتہ جنگ عظیم میں وہی حیثیت حاصل تھی جو موجودہ جنگ عظیم میں آزاد ہند فوج اور آزاد ہند حکومت کو حاصل رہی ہے۔ جس طرح موجودہ بعد از جنگ سرگرمیاں دراصل دوران جنگ کی باغیانہ جدوجہد کی ہی ترقی یافتہ صورت ہے اسی طرح خلافت ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء کی سیاسی جدوجہد مولانا شیخ الہند کی جماعت اور ان کے دوسرے شرکاء کار کی سرگرمیوں کی ترقی یافتہ صورت ہی تھی اگر آزاد ہند فوج یا آزاد ہند حکومت کے کارناموں کا سہرا سبھاش چندر بوس کے سر ہے تو گذشتہ جنگ عظیم کی سرگرمیوں کا مرکز مولانا شیخ الہندؒ تھے۔ مولانا شیخ الہندؒ کی سرگرمیاں ۱۹۰۵ء سے شروع ہوئی تھیں اور اس لیے پروگرام کا جزو تھیں جس کو مولانا عبید اللہ سندھی شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ سرگرمیاں جنگ عظیم سے پہلے دو اجزاء پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ اندرون ہند۔ اور بیرون ہند جنگ عظیم کے دوران میں انہیں سرگرمیوں کو موقع کے مناسب پھیلایا گیا۔ اور یہ ہندوستان میں داخلی بغاوت اور اس پر خارجی حملہ کے ذریعہ انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کی تدبیر سوچی گئی (جیسا کہ ارشاد قرآنی یاایہا الذین امنوا خذوا حذرکم فانفروا ثبات او انفروا جمیعا میں بتایا گیا ہے) مولانا شیخ الہندؒ نے دوران جنگ میں ان سرگرمیوں کا ایک مرکز کابل میں قائم کرنا چاہا (کیونکہ تجربے سے یاغستان[1] جو کہ ۱۹۰۵ء سے مرکز خارج تھا ناکام ثابت ہوا تھا) اور اس کے لئے مولانا عبید اللہ سندھی کی نگرانی کو مناسب سمجھ کر انہیں کابل جانے کا حکم دیا۔ مولانا عبید اللہ اس سے پہلے ہندوستانی سرگرمیوں میں مولانا شیخ الہندؒ

---

[1] شمال مغرب کا آزاد پہاڑی علاقہ جو کہ حکومت افغانستان اور حکومت برطانیہ دونوں سے آزاد تھا۔

کا ہاتھ بٹاتے رہے تھے۔ (یاغستانی مرکزیت میں بھی اُن کا بہت بڑا اور موثر ہاتھ تھا) جمعیتہ الانصار کی سرگرمیوں کا انحصار انہی پر تھا۔ غالباً ایک تجربہ کار مدبر کی طرح مولانا شیخ الہند نے اپنی بیرونِ ہند سرگرمیوں کی تفصیلات سے مولانا سندھی کو آگاہ نہیں کیا تھا (ایک ذکی الطبع، نشیب و فراز سے واقف کار سالہا سال سے کام کرنے والے تحریک کے نصب العین سے اتفاق رکھنے والے شخص کو تفصیلات بتانے کی ضرورت ہی نہیں) مولینا سندھی وہاں کے کام سے تو کیا اس کی ضرورت سے بھی قطعاً نابلد تھے۔ ان کے اس عظیم الشان اہم سفر کا حکم ان کو نہایت بے خبری میں غیر متوقع طور پر ملا۔ میرے عزیز مولوی عبدالسبوح صاحب فاضل دیو بند کی روایت ہے کہ مولانا سندھی نے خود ایک مجلس میں بتایا کہ ایک دن مجھے حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا "عبیداللہ افغانستان چلو"۔ میں نے پوچھا "حضرت کیوں" اس پر حضرت شیخ الہند خاموش ہو گئے اور زیادہ کچھ نہیں فرمایا۔ دوسرے دن حضرت نے پھر فرمایا "عبیداللہ افغانستان چلو"۔ میں نے پھر پوچھا "حضرت کیوں" اس پر خاموش تو ہوئے لیکن چہرے سے ناراضگی کے آثار نہایت ہی نمایاں تھے۔ اب میں بڑا پریشان ہوا اور دعا مانگنے لگا کہ حضرت ایک دفعہ پھر مجھے حکم دیں اور میں بلاچون و چرا تسلیم کروں خوش قسمتی سے تیسرے دن حضرت نے پھر فرمایا "عبیداللہ افغانستان چلو" اور میں بڑا مسرور ہوا۔ اور تعمیل حکم کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند سے رخصت ہو کر مولانا (عبیداللہ مرحوم) سندھ گئے اور سفر کے لئے چند رفقاء تیار کئے۔ شیخ عبدالرحیم صاحب (برادر بزرگ مسٹر کرپلانی) کی بیوی اور لڑکیوں نے اپنا تمام زیور بیچ کر اُن کے لئے زادِ راہ مہیا کیا کوئٹہ تک مولانا کو پہنچا کر نقدی اُن کے حوالے کی اور مولانا (سندھی) بلوچستان کے راستے افغانستان پہنچے۔ مولانا نے اپنے اس سفر کے حالات بعد میں مکہ معظمہ پہنچ کر قلم بند کئے۔ (ذاتی ڈائری مولانا عبیداللہ سندھی صفحہ ۳-۴-۵-۶)

مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کی سیاست میں ابتدا

مولانا عبیدا للہ صاحب مرحوم اپنی ڈائری میں صفحہ ۸ اپر لکھتے ہیں :۔

میرا سیاسی میلان :۔ دوران مطالعہ میں مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتداء سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم (شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ) سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبد الکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا۔ پہلے جو کچھ لاہور کے لئے سوچتا تھا اب دہلی کے لئے سوچنے لگا۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنا لیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا اور اس طرح اپنے خیال کے موافق آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا۔

معاودت دیوبند

۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہنچا۔ اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا ایک علم حدیث میں اور دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا (شیخ الہندؒ مرحوم) نے دونوں رسالے پسند فرمائے۔ اس درس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سنا کر دوبارہ

شفاہاً اجازت حاصل کی۔ بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا بھی ذکر آیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دیکر اسے اتحاد اسلامی کی ایک کڑی بنادیا۔ اسی کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز سے وابستہ رہے۔ (ذاتی ڈائری صـ ۱۸۔۱۹)

جمعیۃ الانصار دیوبند کا ذکر کرتے ہوئے صفحہ ۱۹ کے آخر میں فرماتے ہیں۔

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لئے حکم دیا۔ اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا اس جمعیۃ کی تحریک وتاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد احمد لاہوری اور عزیزی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی | حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے سامنے دارالعلوم کا بقاء و تحفظ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور اس کے بعد انگریز کی پالیسی اُن کے سامنے تھی۔ انہوں نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سرگرمیوں کو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کے لئے بھی خطرناک تصور کیا اور اپنے خیالات کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا سندھی کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے۔ اسی زمانہ میں اتفاق سے چند علمی مسئلوں میں مولانا سندھی اور دارالعلوم کے دوسرے علماء کے درمیان اختلاف پیدا کرا دیا گیا۔ اسی اختلاف کو وجہ قرار دے کر مولانا سندھی کو دارالعلوم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ چنانچہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اس اختلاف نے اگرچہ دارالعلوم کے اساتذہ۔ ملازمین اور عام طلبہ کو حضرت مولانا سندھی سے بہت زیادہ بعید[1] کر دیا تھا لیکن حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔

[1] حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم نے مولانا سندھی کے نام مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں پیغام بھیجا تھا کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لئے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اب میرے دل میں آپ سے کوئی رنج نہیں ہے اُمید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے۔

خفیہ آمد و رفت جاری رہی۔ رات کی اندھیریوں میں دیوبند کے باہر ملاقاتیں ہوتی تھیں اور ضروری باتیں انجام دی جاتی تھیں۔

۱۳۲۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند مرحوم کے ساتھ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور نواب وقارالملک مرحوم ایک ہی طرح شریک تھے حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی سے ملایا۔ اس طرح دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

ہجرت کابل | ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے کابل گیا[1] مجھے کوئی

---

[1] واقعہ یہ پیش آیا کہ ۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظیم چھڑ گئی تو حضرت شیخ الہند کی جماعت کے مرکز یاغستان سے جس میں مولانا سیف الرحمٰن صاحب اور حاجی ترنگ زئی صاحب وغیرہ حضرات وہاں موجود تھے اور عرصہ سے جماعت کی تنظیمی ضروریات انجام دے رہے تھے ان کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا حکم پہنچا کہ اب سکون سے کام کرنے کا وقت نہیں میدان میں آجانا اور سربکف ہو کر کام شروع کر دینا ازبس ضروری ہے۔ مرکزی حضرات نے اصرار کیا کہ آپ یہاں پہنچ جائیں تو آپ کی سرپرستی میں ہم بخوبی اپنی جدوجہد جاری کر سکیں گے۔ مگر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان سے مالی امداد کے فرائض انجام دے رہے تھے ادھر راستہ بھی جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے بہت زیادہ مخدوش ہو رہا تھا اس لئے اس کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ سرحد میں مجاہدین کے اجتماع کو دیکھ کر انگریزی فوج نے حملہ کر دیا۔ مجاہدین نے نہایت بے جگری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پلٹنوں کی پلٹنیں انگریزوں کی صاف کر دیں جن کو انگریزوں نے ظاہر نہیں کیا اور بے شمار قوت سرحد پر پہنچا دی۔ سرحدی مجاہدین نے پوری سرگرمی کے ساتھ مقابلہ کر کے انگریزی طاقت کو بے حد نقصان پہنچایا مگر تابکے جب کہ انگریز کی ٹڈی دل فوج، بے شمار سامان رسد، بے نہایت سامان جنگ، اور دوسری طرف یاغستان کے مفلس اور بے یار و مددگار عام باشندے، نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا جبکہ مجاہد کے کھانے کا سامان ختم ہو جاتا تو اس کو مورچہ چھوڑ کر رسد کے لئے اپنے دور دراز گاؤں لوٹنا پڑتا تھا۔ کارتوس ختم ہو جاتے تو اُن کے حاصل کرنے کے لئے مورچہ خالی کرنا پڑتا تھا اس لئے وہاں سے درخواست آئی کہ جب تک کسی منظم حکومت کی پشت پناہی نہ ہو ہماری شجاعت اور جانبازی بیکار ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مفصل پروگرام نہیں بنایا گیا تھا اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہنچ گیا۔ روانگی کے وقت دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے انہوں نے بھی مجھے اپنا نمائندہ بنایا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتا سکے۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ جس جماعت کے نمائندے تھے اُس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعلیم حکم کے لئے تیار ہے۔ ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی اب مجھے اس ہجرت اور حضرت شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا اس کی تعمیل میرے لئے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں اُس وقت سے میں کانگریس کا داعی بن گیا۔ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں مَیں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی۔ جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریسیڈنٹ ہوں۔

(ذاتی ڈائری صفحہ ۲۰-۲۱-۲۲)

سیاحت روس ۱۹۲۳ء میں ترکی جانا ہوا سات مہینہ ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لئے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا۔ اور مطالعہ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں (یہ غلط ہے کہ مَیں لینن سے ملا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶۲) اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ آزاد حکومتوں کی پشت پناہی ضرور حاصل کی جائے بنا بریں مولانا عبید اللہ صاحب کو کابل بھیجا گیا اور ترکی سے خود جا کر امداد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

کامریڈ لینن اُس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے اس زمانہ کے لادینی حملہ سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا میں اس کامیابی پر اوّل انڈین نیشنل کانگریس دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقاء جن میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی سوشلسٹ بھی اور نیشنلسٹ بھی۔ سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ممنون اور شکر گزار رہوں گا۔ اگر ان تین طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا۔ فللّٰہ الحمد وحدہٗ۔

جدید ترکیا ۱۹۲۳ئہ میں انقرہ (انگورا) پہنچا۔ میرے لئے سفیر ترکیا متعین ماسکو اور وزارتِ خارجیہ ماسکو نے مل کر سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا اور برطانوی کارندے اس کا پتہ نہ لگا سکے (یہ غلط ہے کہ میں استنبول اس زمانہ میں پہنچا جبکہ برطانیہ و فرانس اس پر قابض تھے) تخمیناً تین سال ترکی میں رہا وہاں مَیں نے تحریک اتحاد اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا مجھے مستقبل قریب میں اس کا کوئی مرکز نظر نہیں آیا۔ اس لئے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

ہمارا پروگرام یورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں اپنے اُستاذ الاستاذ اور اپنے امام مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہناتا ہوں اس پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرانے کے لئے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجیہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کرا کے جب تک اس کا حرف حرف نہیں پڑھ لیا اجازت نہیں دی۔ بعض ہندو دوست اُردو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کی سہولت کے لئے میں نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے۔ استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلہ افکار رہا۔ اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ ہمارے

بزرگ نہ اُسے مان سکتے تھے نہ اس کا اچھا بدل بتلا سکتے ہیں اور کوشش کر رہیں گے کہ ہمیں ہزارہ دوہزارہ برس پہلے زمانہ میں لاکھڑا کر دیں۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے وہ میرے لئے باعث سرور ہے۔

میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا لیکن اس بنا پر پولیٹیکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم یاد دلادی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے دور میں اس اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدھا فھو احق بھا۔ (ذاتی ڈائری صفحہ ۲۴)

مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے افغانستان پہونچنے اور ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کے ہندوستان سے نکالنے کے کارنامے

۱۹۱۴ء میں جبکہ پہلی عمومی جنگ کا برطانیہ اور اس کے حلفاء اعلان کر کے ہر قسم کے سامان اور تحفظات عمل میں لا رہے تھے، جب کہ ٹرکی اور جرمنی وغیرہ اتحاد اور اشتراک کی کوششوں کو عملی جامہ پہنا رہے تھے جبکہ ہندوستان میں ہر سیاسی اور نیم سیاسی اشخاص اور جماعتوں کو حکومت نہایت کڑی اور مشتبہ نظر سے دیکھ رہی تھی، جبکہ سیاسی اشخاص کی پکڑ دھکڑ قید اور نظر بندی بڑے پیمانہ پر جاری کی جا رہی تھی جبکہ مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا ابوالکلام وغیرہ حضرات کو یکے بعد دیگرے گرفتار کیا جارہا تھا جبکہ ہر سیاسی دماغ ہولناک خطرات محسوس کرتا ہوا اپنی جگہ پر تقریباً دم بخود تھا۔ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے پاس حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا حکم پہنچا ہے کہ میں حجاز جاتا ہوں تم کابل پہنچو جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ ان کو کوئی مفصل پروگرام بتایا نہیں گیا تھا مولانا عبیداللہ صاحب دہلی سے روانہ ہو کر سندھ پہنچتے ہیں اور سی آئی ڈی کو غافل کرنے کے لئے ایک غیر معروف گاؤں میں نہایت سکون کی حالت میں اقامت گزیں ہو جاتے ہیں۔ خفیہ پولیس تین چار مہینہ کی طویل مدت میں اُن سے کسی قسم کی سیاسی سرگرمی محسوس نہیں کرتی اس لئے مطمئن ہو جاتی ہے مگر مولانا عبیداللہ صاحب اور اُن کے رفقاء اپنی جدوجہد آزادانہ میں غافل نہیں ہیں۔ ایک دن معہ شیخ عبدالرحیم صاحب سندھی حیدرآبادی نکل پڑتے ہیں۔

سانڈنیوں پر بلوچستان کے ریگستان اور پہاڑی دروں میں سفر ہے۔ برطانوی خفیہ پولیس کے تعاقب کے خوف سے نہ صرف عام شاہراہوں کو چھوڑا گیا اور غیر معروف راستے اختیار کئے گئے ہیں بلکہ لگاتار سفر پر سفر اور کوچ پر کوچ ہوتا رہا ہے تانیکہ بہت طویل مسافت جلد سے جلد قطع کر لی گئی اور بہت تھوڑی مدت میں برطانوی حدود سے نکل کر حدود افغانستان میں داخل ہو گئے۔ مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم اپنی ذاتی ڈائری میں صفحہ ۶۳ پر لکھتے ہیں۔

"۱۳۳۳ھ موافق اگست ۱۹۱۵ء کو میں کابل کی طرف روانہ ہوا اس سے تخمیناً چار مہینے پہلے ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ مصمم کر چکا تھا۔ اپریل ۱۹۱۵ء کے شروع میں دلّی سے سندھ چلا آیا اور چار مہینے مختلف مقامات پر گذارے۔ دوستوں سے آخری ملاقات اور ضمناً راستے کے خطرات سے محفوظ رہنے کی تدابیر میں مصروف رہا۔ بفضلہ تعالیٰ بلوچستان سے گزر کر ۱۵ اگست کی نماز مغرب سرحد افغانستان میں پڑھی۔ اور توکلاً علی اللہ بغیر کسی پاسپورٹ حاصل کرتے کے افغانستان میں داخل ہوا جس حصۂ ملک میں ہم داخل ہوئے وہ شورابک کا علاقہ تھا وہاں کے حاکم سے ملا۔ پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں شکوک پیدا ہونے لگے مگر ہماری درخواست سُن کر کہ آپ ہمیں سرکاری حفاظت سے قندھار پہنچا دیں وہاں ہم حکومت کو مطمئن کر دیں گے۔ چند سوالات پوچھے اُن کا جواب اُن کے رفع شبہات کے لئے کافی تھا اس لئے ہمیں حکومت کا معزز مہمان قرار دیا اور ہمارے قندھار پہنچانے کا سب انتظام کر دیا۔ قندہار میں ہمارے بعض اشنا مل گئے اُن کا حکومت میں اچھا رسوخ تھا اور ہمیں اچھی طرح جانتے تھے اس لئے نائب الحکومت نے چند روز نہایت احترام سے مہمان رکھا۔ فقط کابل کے سفر کا نہیں بلکہ چند روز کابل میں رہنے کا بھی انتظام کر دیا۔ اسی طرح ہم ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے۔ اتفاقات زمانہ میں یہ بھی ایک عجیب سمجھی جائے گی کہ اسی تاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ہمیں کابل سے سفر کرنے کا پاسپورٹ مل گیا (یعنی سات برس کابل میں اقامت کرنے کے بعد) اگرچہ ہماری روانگی ۲۲۔ اکتوبر کو عمل میں آئی۔ ان سات سال اور سات دن میں جو کچھ ہم نے دیکھا اس کا اکثر حصہ اس قابل نہیں کہ عام طور پر کتابوں میں لکھا جائے۔ لیکن کسی قدر واقعات لکھنے کو ہمارا جی چاہتا ہے۔

(ذاتی ڈائری صفحہ ۶۳-۶۴)

صفحہ ۶۷ ذاتی ڈائری میں مولانا عبیداللہ صاحب موصوف مرحوم لکھتے ہیں، "ہم نے جس حالت میں ۱۳۲۷ھ (۱۹۱۰ء) سے ہند میں زندگی بسر کی اس سے حکومت اچھی طرح واقف تھی۔ ہمارا نصب العین کسی سے مخفی نہ تھا مگر ہمارا کام اتنا تیز نہیں رہا تھا جس سے حکومت ہمیں معطل کرنا ضروری سمجھتی۔ ہماری محبت میں جو لوگ سی آئی ڈی میں مقرر ہوئے تھے اُن سے ہمارا برتاؤ اچھا رہا۔ اس کا بھی ہماری آزادی میں کافی اثر ہے۔ کابل جانے کا فیصلہ ہم نے مخفی اپنے اُستاد، مربی، مرشد حضرت مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہ کو راضی رکھنے کے لئے کیا تھا۔ ہم اپنی حیثیت و طاقت سے واقف تھے۔ ہم نے بڑی بڑی امیدیں تصوّر کر کے کبھی مسرور ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ہم تصوّر نہیں کر سکتے تھے کہ کابل پہنچ کر ایک سال سے کم عرصہ میں ہم اپنا مافی الضمیر کسی ذمّہ دار افسر سے کہہ سکیں گے۔ اگر خوش ہوتے تو صرف اس پر کہ خدا نے ہمیں اپنے بزرگ کا حکم مان کر ملک چھوڑنے کی توفیق عطا فرمائی۔ حضرت مولانا کا ذکر ہم ہر ایک دوست سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے بعض دوستوں سے جو اس خیال کے مؤید تھے کبھی ہم اُن کا نام ذکر کر دیتے تھے۔ اپنا طبعی رجحان ایک مسلم حکومت میں جا بسنے کا ذرا تفصیل سے سُنا دیتے تھے۔ اسی طرح پر ہم خاص دوستوں سے رخصت ہوئے۔ ہماری طرح کے آدمیوں کو ہندوستان کے حکمران کابل میں کس قدر بدنام کرتے ہیں ہم اس سے واقف تھے۔ پہلے سے چند ہندوستانی ایک سیاسی سازش کے الزام میں محبوس ہیں اس کا جو اثر ہماری پوزیشن پر پڑتا ہے وہ ہمارے ساتھ ہے۔ ان حالات میں جس قدر احتیاط کرنی چاہیئے ہم نے اس کا کافی انتظام کر دیا تھا۔ قندھار تک تو ہم بلا پاسپورٹ حکومت کی نگرانی میں پہونچ گئے اُس وقت سردار محمد یونس خاں قندھار کے نائب الحکومت تھے جو سردار اعتماد الدولہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ قندھار میں ہمیں دو شخص ایسے ملے جو نائب الحکومت سے اچھے تعلقات رکھتے تھے اُن میں سے ایک صاحب ہمیں سندھ میں مل چکے تھے۔ اس نائب الحکومت سے ہماری اچھی ملاقاتیں ہوئیں۔ بعض علمی مسائل کا تذکرہ ہوتا رہا اگرچہ مثنوی مولانا روم سے ہمارا اشتغال بہت کم رہا ہے لیکن بفضلہ تعالیٰ اس امتحان میں کامیاب رہے نائب الحکومت نے ہمیں ایک خاص راہداری دی۔ اور اوّل درجہ کے سفر کا انتظام کر دیا۔ اپنے پرائیوٹ دوستوں کے نام تعارفی خطوط بھی دیئے۔ غزنی سے ہم نے سردار محمود طرزی کو اطلاع بھیج دی تھی اس لئے اُن کا آدمی ہمیں شیخ محمد ابراہیم کے یہاں

سب سے پہلے خوش آمدید کہنے کے لئے آیا وہ نوجوان سردار عبدالہادی خاں تھا۔

شیخ محمد ابراہیم کے مکان کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں اترے اور اُن کے توسط سے اُن سب لوگوں سے مل گئے جن کے لئے ہمارے پاس خطوط تھے۔ سردار سپہ سالار نے ہمیں ہر طرح امداد دینے کا یقین دلایا اور ہمارے قیام کابل میں جو سرکاری مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں اُن کے زائل کرنے پر اپنی تمام توجہ مبذول رکھی۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ہم بظاہر سپہ سالار سے اجنبی رہیں اور اس پر ہم نے عمل کیا سردار سپہ سالار کے خاندان کا ہمارے مشائخ سے خاص رابطہ چلا آتا ہے اس لئے اُن کا ہر قول وفعل اخلاص ومحبت پر مبنی تھا۔ ترکی کے شریک جنگ ہونے کا اثر سردار محمود خاں طرزی پر نسبتاً بہت زیادہ تھا اس لئے ہمارا رابطہ اُن سے زیادہ ہوتا گیا۔ انہوں نے ہمیں سردار معین السلطنت (سردار عنایت اللہ خاں پسر سردار حبیب اللہ خاں امیر افغانستان) سے ملایا اور ایک دن سردار کی معیت میں کھانے پر بلایا۔ اس سے ہمارا ذکر سلطنت کے تمام سرداروں تک پہنچ گیا۔ اس کھانے کے بعد ہم نے ایک دن چھری کانٹے کے استعمال کرنے کی مشق میں صرف کیا۔ اور بے تکلف دعوتوں میں شریک ہوتے رہے۔ سلطنتِ افغانیہ میں شرعی فیصلوں کا ایک محکمہ ہے جسے میزان التحقیقات الشرعیہ کہتے ہیں۔ اس محکمہ کا رئیس قاضی عبدالرزاق خاں ہمارے دارالعلوم دیوبند کا تعلیم یافتہ ہے۔ حدیث حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی (قدس اللہ سرہٗ العزیز) سے پڑھی تھی۔ وہ سردار نائب السلطنت (سردار نصر اللہ خاں) سے خاص طور پر وابستہ ہیں جیسے سردار طرزی معین السلطنت سے اور سردار سپہ سالار اعلیٰ حضرت سے، قاضی عبدالرزاق خاں صاحب سے ہم چند روز بعد ملے۔ پرانے علمی دوستوں کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ ایک عجیب بات وہاں یہ نظر آئی کہ ہمارے اس سفر کے متعلق خاص طور پر اُن کے پاس اطلاعات موجود تھیں۔ انہیں جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ میرا ہی نام عبید اللہ ہے تو بہت مسرور ہوئے۔

سردار نائب السلطنت کے حضور میں باریابی

حاجی عبدالرزاق خاں چاہتے تھے کہ ہمیں سردار نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) سے ملائیں۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کے غیر رسمی پولیٹیکل معاملات سردار نائب السلطنت

سے تعلق رکھتے تھے فقط رسمی معاملات اعلےٰ حضرت کے سامنے پیش ہوتے ہیں مگر ہم نے وہاں کے حالات کے مطابق انہیں مشورہ دیا کہ ہماری ملاقات معین السّلطنت (سردار عنایت اللہ خاں) کے توسط سے ہونی چاہیئے۔ اسے انہوں نے پسند کیا اور ہم سے ایک مختصر عریضہ لکھوالیا۔ جس میں ہم نے اپنے مقاصد کا بالاجمال ذکر کیا۔ اس کے ایک روز بعد مجھے سردار معین السلطنت اپنے ساتھ لے گئے۔ سردار نائب السلطنت ہم دونوں سے تخلیہ میں ملے اور دو گھنٹہ تک مفصّل حالات سُنے۔ سوالات کئے۔ جوابات سے مطمئن ہوئے یہ ایک طرح کا ہمارا امتحان تھا۔ جس میں ہم بفضل خداوند تعالےٰ اچھے کامیاب رہے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ سردار نائب السّلطنت ہماری گفتگو سے محظوظ ہوئے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اس مذاکرہ کا خلاصہ فارسی میں لکھ کر ہم اُن کے سامنے پیش کریں۔

میں تاریخ اسلامی کا عموماً مطالعہ کرتا رہا ہوں اور ہندوستانی تاریخ سلطان عالمگیر اور اس کے بعد کا دور میرا خاص مضمون ہے۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی علمی و سیاسی تحریکیں یہاں سے شروع ہوتی ہیں لیکن یورپین طریقہ پر سیاست کا مطالعہ مجھ کو زیادہ میسّر نہ ہوا۔ اردو، فارسی، عربی میں اس نئے طرز کو سمجھنے کے لئے بہت کم کتابیں ملتی ہیں۔ اس لئے ایک عرصہ سے سیاسیات سے واقف تعلیم یافتہ کا اشتراک اپنے لیئے ضروری سمجھتا ہوں۔ شیخ محمد ابراہیم نے تاریخ اقتصادیات میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم، اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کابل آنے سے پہلے ہم نے سیاسی اشتراک اُن سے پیدا کیا تھا اور وہ مجھ سے پہلے پہنچکر حبیبیہ اسکول میں ملازم ہو چکے تھے اس زمانہ میں فقط وہ میرے مشیر تھے۔ میں نے بہت احتیاط سے اس پندرہ دن میں سات آٹھ صفحے لکھے اور شیخ محمد ابراہیم کو سنائے انہوں نے بہت مفید اضافے کئے اور ہم نے مضمون سردار طرزی اور معین السلطنت کے معرفت سردار نائب السلطنت کے پاس بھیج دیا۔ سردار نائب السلطنت ہمارے طرزِ تحریر سے سمجھ گئے کہ جب تک ہمارے معاملہ کا فیصلہ خود اعلیٰ حضرت (امیر حبیب اللہ خاں) نہ کریں گے ہم اُسے قابلِ اطمینان نہیں سمجھتے انہوں نے شاید ایک ماہ بعد ہمیں اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کرنے کا انتظام کیا۔

اعلےٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید کے حضور میں باریابی ایک دن سردار نائب السلطنت نے مجھے اپنے قصر زین العمارۃ میں بلایا اور عصر کے بعد وہیں اعلےٰ حضرت تشریف

لائے۔ اعلیٰ حضرت اور سردار نائب السلطنت کے سوا اِس کمرے میں اور کوئی آدمی نہ تھا جس میں مجھے شرف باریابی حاصل ہوا۔ اس مجلس میں فقط دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز تھی ایک پر اعلیٰ حضرت جلوہ فرما تھے اور دوسری پر مجھے بیٹھنے کا حکم نہایت شفقت و محبت سے دیا۔ سردار نائب السلطنت نے میرا عریضہ اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کیا۔ آدھ گھنٹہ تک اعلیٰ حضرت اُسے غور سے ملاحظہ فرماتے رہے۔ آخر میں دعائیہ فقرات سے بہت متاثر ہوئے اور مختصر الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کام کرنے کے لئے زبانی ایک حکم ارشاد فرمایا۔ جس کی تعمیل میں اپنے امکان بھر آخر تک کرتا رہا مجھے یہاں صرف صراحت اعتراف کی ضرورت ہے کہ اگر شیخ مغفور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح مشورہ مجھے نہ ملتا تو میری بات اس قدر موثر نہ ہوتی۔ اور میں اپنے آپ کو بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے دربار میں پیش نہ کرتا۔ بلکہ ایک مسلم کی صورت میں متعارف ہوتا اور چند دنوں بعد مجھے مسلک ہندوستانیت بنانے کی یقیناً ضرورت پیش آتی اور میں اپنے درجہ سے بہت کچھ چھوٹا سمجھا جاتا۔ اعلیٰ حضرت نے میری عزت افزائی سے یقیناً ہندوؤں پر احسان فرمایا لیکن نہ اس لئے کہ میں نے اپنے آپ کو ہندوستان کا فرضی نمائندہ بنالیا تھا۔ بلکہ اس میں قابل عزت یہ بات سمجھی گئی کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا اُس میں مبالغہ سے قطعی پرہیز کیا گیا۔ اعلیٰ حضرت کو جس جس قدر بذاتِ خود واقفیت تھی ہمارا بیان اُس کے قریب قریب رہا۔ ایک محکوم مِلّت میں ایک متوسط طبقہ کا آدمی اور پھر وہ بھی مذہبی عالموں میں صحیح معلومات کا مالک ہے اور ایسے نازک موقع پر صداقت کا خیال رکھتا ہے اعلیٰ حضرت کے لئے اور اُن کے سردار نائب السلطنت کے لئے واقعی ایک نادر اور موثر مثال تھی۔ میں اُسے اللہ تعالیٰ عز وجل کی ایک خاص رحمت سمجھتا ہوں جس میں حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہٗ کی دعا اور اُن کی تعمیل حکم کی برکت کا بہت کچھ دخل ہے۔

ہندوستانی مشن سے ملاقات

حرب عمومی کے شروع ہونے پر جس قدر ہندوستانی "آزادی سوز یورپ" میں موجود تھے، سب برلن میں جمع ہو گئے تھے اور انہوں نے جرمن دفتر خارجیہ کے تحت ایک انڈین نیشنل پارٹی قائم کی تھی۔ ہردیال اور مولوی برکت اللہ صاحب وغیرہ اس میں شامل تھے۔ اس انڈین نیشنل پارٹی کے زیرِ اہتمام راجہ مہندر پرتاپ اور اُس کے رفقاء کو جن میں مولوی برکت اللہ صاحب

بھی شامل تھے جلد ترکی اور جرمنی افسروں کے ساتھ ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ مشن ہم سے ایک ہفتہ پہلے کابل پہنچ چکا تھا اور اُن کی مفصل ملاقاتیں ختم ہو چکی تھیں۔ جب ہم اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش ہوئے اُس کے بعد ہم کو مشن کے ہندوستانی ممبروں سے ملنے کی اجازت ہو گئی اور ہم اُن سے اچھی طرح مل سکے۔ معلوم ہوا کہ ہندوستانی معاملات میں ہمارے اور اُن کے نقطۂ نظر میں کسی قدر فرق ہے۔ اس طرح مشن کے جرمن ممبروں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں اور اپنے نقطۂ نظر کے منوانے کے لئے ہم ایک طویل زمانہ تک تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں ہمارا ترجمان ہندوستانی نوجوانان مہاجرین میں سے ایک نوجوان تھا جسے ان لوگوں نے اپنا پریسیڈنٹ منتخب کر دیا تھا۔ اس کا نام عبدالباری تھا۔ وہ لاہور گورنمنٹ کالج سے ایم، اے پڑھتا ہوا چلا آیا۔ شیخ محمد ابراہیم چونکہ حبیبیہ اسکول میں ملازم تھے اس لئے ان کو سیاسی مجلس میں عام طور پر شامل ہونے کے مواقع کم ملتے تھے۔ ہماری ملاقات سے پہلے مشن کے ہندوستانی اور جرمنی ممبروں میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ ہمارے ہندوستانی دوستوں کے نظریات یورپین سائیکولوجی کے لئے نہایت دلفریب تھے۔ ترک اور جرمن جب تک برلن اور استنبول میں رہے اپنے اُن نظریات کی بہت قدر کرتے رہے لیکن کابل میں تو عملی کارروائی کے لئے آئے تھے۔ اس مشن کے پریزیڈنٹ یا مولانا برکت اللہ کوئی زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو عمر بھر افغانستان، صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ بلوچستان کا نقشہ دیکھنے کا زیادہ موقعہ نہیں ملا تھا۔ مشن کے ممبر شروع میں ہم سے اخلاص سے نہیں ملے۔ مگر بتدریج اُن کا خیال ہمارے متعلق اچھا ہوتا گیا۔ ہماری ساری عمر شمال مغربی ہند میں گزری اور اسی ادھیڑ بن میں ہر کہ دمہ سے ملتے رہے۔ ہمارے پاس بعض ایسی معلومات بھی تھیں جو کابل میں فوجی نقطۂ نظر سے بہت قیمتی سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح ہماری رائے غالب ہونے لگی۔ اس اختلاف خیالات سے قطع نظر ہم نے ہندوستانی ممبروں کے احترام و اعزاز میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ اس لئے روز بروز ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔ (ذاتی ڈائری از صفحہ ۷۶ تا ۸۴)

مشن کے ہندو ممبروں سے تبادلہ خیالات

راجہ صاحب سے تبادلہ خیالات کرنے پر ہمیں ایک ناگوار حقیقت کا علم ہوا۔ ہم ہندوستان میں بھی اس سے کسی قدر واقف

ہو چکے تھے مگر اس کی اہمیت کا صحیح احساس نہیں ہوا تھا۔ اب ہمیں اس کے اثر اور وسعت کا حقیقی علم حاصل ہوا اِس مسئلہ میں ہمارے تبادلات سمجھنے میں ناظرین کی آسانی کے لئے ہم کسی قدر گذشتہ واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اس وقت میں، سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا۔ لیکن جب مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی۔ ہاں عملی حصہ لینے کے لئے مجھے اس زمانہ میں کوئی موقعہ نہیں ملا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلانی شروع کی اور میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی۔

اس ضروری مسئلہ کے محرکات

میں جس وقت ناظم جمعیۃ الانصار تھا میرے ایک ایک سندھی دوست پروفیسر چیوت رام کرپلانی دیوبند تشریف لائے وہ دار العلوم دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک ہفتہ تک میرے مہمان رہے۔ انہیں پوری آزادی سے دار العلوم کی سیر کرائی۔ آخر میں وہ دار العلوم کی بہت تعریف کرتے تھے کہ ہند کے مستقبل میں جو چیزیں کارآمد ہوسکتی ہیں وہ اسی قسم کے کام ہیں اور دار العلوم کی خدمات قابل تعریف اہمیت رکھتی ہیں اس پر میں نے سوال کیا کہئے پروفیسر صاحب ہماری ضرورت ہے یا نہیں اس کا جواب تھا بالکل نہیں اگر آپ ضرورت سمجھیں تو ہمارے ساتھ ہو جائیں ورنہ ہند ہمارا ہے اور ہم اپنا کام خود کر لیں گے۔" اس جواب کا اثر مجھ پر ظاہر ہے کہ اچھا نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے مجھے بیقرار کر دیا چند روز بعد ہمارے موتمر الانصار کا اجلاس مراد آباد میں قرار پایا بحیثیت ناظم موتمر الانصار مجھے شرفاء مراد آباد سے ملاقات کے مواقع ملے۔ بفضلہ تعالےٰ ہمارا جلسہ کامیاب رہا۔ علی گڑھ کے پروفیسر جلال الدین صاحب (جو ہمارے کاموں کو ابتداء سے اچھی طرح دیکھ رہے تھے) سے میں نے موتمر کی نسبت سوال کیا انہوں نے بہت تعریف کی اس پر میں نے اُن سے وہی سوال دہرایا "کیوں ہماری ضرورت ہے یا نہیں" پروفیسر نے نہایت محبت آمیز متانت سے جواب دیا "آپ کے سوا تنہا ہم کچھ نہیں ہیں" اس جواب کا مجھ پر گہرا اثر ہوا اور میں نے دل میں اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو سخت ملامت کی کہ تعلیم یافتہ جماعت سے ہم کیوں پیچھے رہے ہیں۔ ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد

کا پروگرام میرے سامنے آگیا۔ اس کی پہلی کڑی قدیم وجدید نوجوانوں کا سمجھوتہ ہونا چاہیے پھر دوسرا قدم اٹھانا اس قدر مشکل نہیں رہے گا۔

تمہیدی مقدمات کی اپیل

پرانے اور نئے خیال کے مسلمانوں میں محل نزاع کیا ہے میں اچھی طرح سے جانتا تھا۔ علماء برداشت نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں کی رہنمائی کا منصب ان کے ہاتھ سے نکلے۔ اِدھر تعلیم یافتہ طبقہ لیڈرشپ کا مدعی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ علماء کی امامت میں ہم کوئی کام نہیں کر سکیں گے میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اہل علم لیڈرشپ کے ادعاء سے دست بردار ہو جائیں اور تعلیم یافتہ لوگوں میں عام طور پر احساس پیدا کر دیا جائے کہ وہ اہل علم کی شمولیت کی صحیح قیمت کو نہ بھولیں۔ میرے استاد حضرت مولانا شیخ الہند تغمدہ اللہ بغفرانہ نے میرے خیال کی اس طرح داد دی تھی کہ وہ پہلے سے اس کے لئے تیار بیٹھے تھے مجھے یاد ہے کہ جب مولانا محمد علی مرحوم گورنر یوپی کی آمد پر دیوبند تشریف لائے تو حضرت مولانا خود ان سے ملنے کے لئے ان کے قیام گاہ پر گئے۔ اسی وقت سے ہمارے امام نے مولانا محمد علی مرحوم کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا میں اس وقت دیوبند میں نہ تھا اور نادان لوگوں نے حضرت کے اس تقدم پر نکتہ چینی بھی کی تھی۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا خدا بھلا کرے جو علماء دیوبند اور تعلیم یافتگان علی گڑھ کے ملانے میں ایک مضبوط کڑی ثابت ہوئے۔ وہ جب ہلال احمر کا وفد لے کر گئے تو اس میں علماء دیوبند بھی شریک ہوئے اور اسی کام کو مکمل کرنے والے ہمارے مسیح الملک حکیم اجمل خاں مغفور تھے میں جب دہلی آیا اور مسیح الملک کی سرپرستی میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی تو اس میں نواب وقار الملک اور حضرت شیخ الہند دونوں ایک درجہ پر شریک تھے۔

ہندو مسلم اتحاد

اس مرحلہ کے طے ہوتے پر مسیح الملک اور ڈاکٹر انصاری نے دہلی میں اس کام کو عملاً شروع کر دیا اور اس میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی ہوئی اور مولانا محمد علی قومی لیڈر بن گئے۔ میں ہندو دوستوں کے خیالات جانچتا رہا۔ ان میں بہت بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ پروفیسر کرپلانی جب دوسری مرتبہ دہلی تشریف لائے تو ان کی ذہنیت اور تھی۔ انہوں نے مجھے دعوت دی کہ اگر میں چاہوں تو تمام ہندوستان کا مطالعہ کر سکتا ہوں

اور وہ میرے لئے انتظام کردیں گے۔ ان واقعات سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اس قسم کی غلط فہمی ہندوؤں میں کافی طرح موجود ہے لیکن وہ ناقابل علاج نہیں۔ تھوڑی توجہ سے دور ہو سکتی ہے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ تمام یورپ اور امریکہ میں یہ پروپیگنڈا پھیل چکا ہے اور ہمارے ہندو بھائی جب ہندوستان کا تعارف کراتے ہیں تو یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ہندوستانی ملاقات کے وقت رام رام کیا کرتے ہیں۔

ہندوؤں کی ایک غلط فہمی

تاریخ پڑھ کر ہندو نوجوان یہ نظریہ قائم کر لیتے ہیں کہ ہندو اصلی ہندوستانی ہے اور مسلمان انگریزوں کی طرح ایک بیرونی فاتح ہے۔ اس لیے جب وہ ہند کو بیرونی لوگوں سے متعارف کرنے کا خیال کرتے ہیں تو اس میں مسلمانوں کو بیرونی فرض کر لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان شرفا کی ایک بڑی جماعت عرب و عجم کے بزرگوں کی اولاد ہے اور اُن کی زبان سے ہی بعض اوقات ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جس سے ہندوستانی نوجوانوں کو اپنے تخیل کی سند مل جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ناظرین میری شخصیت کے متعلق ناواقف نہ ہوں گے کہ میں ایک ہندو گھر میں پیدا ہوا اور ہندو نو مسلم کی کتاب تحفۃ الہند میں نے دیکھی جو ایک برہمن کے واسطے سے مجھے ملی تھی۔ اس کے مطالعہ کے بعد اسلام کی حقانیت میں یقین کر کے سولہ برس کی عمر میں مسلمان ہوا اور تیئیس سال کی عمر میں علوم دینیہ تکمیل کر کے دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کی۔ میں علمی تحقیقات سے اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی عام آبادی خصوصاً طبقہ سافلہ کاشتکار، مزدور ہند و بزرگوں کی اولاد ہے جو اسلام قبول کر چکے ہیں اور جو بزرگ فاتحانہ ہند میں داخل ہوئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے اور جو خاندان اس نئے مذہب اور تمدن کو ہند میں قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے ان کی اولاد اول درجہ کی ہندوستانی ہے۔ ہندو قوموں کا نو مسلم اور اسلامی فاتحین کی اولاد میں فرق کرنا ایک نہایت حماقت آمیز جہالت ہے۔ ہمارے بھائیوں کو بہت جلد اس غلط فہمی سے پاک ہو جانا چاہیئے۔ میرا یقین ہے کہ اسلام سے بہتر انسانیت کے لئے کوئی مذہب، کوئی فلسفہ، کوئی تمدن، کوئی قانون میسر نہیں آسکتا۔ اس لئے ہندوستانیوں کو اسے عزت سے مان لینا چاہیئے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکتا تو ہم نو مسلم کیا ایسے بھی گئے گزرے ہو گئے کہ اپنی آبادی کے متناسب اپنے مذہب

کی عزت تمام بھائیوں سے نہ منوالیں۔ ایک ہندوستانی اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے آپ کو زیادہ بہادر، زیادہ شریف تصور کرتا ہے۔

کانگریس کے ایک لیڈر کی رائے

مسلم لیگ کا ڈپوٹیشن جب شملہ گیا تو مسٹر گوکھلے نے مسلمانوں کو اپنی تعداد سے زیادہ نمایندگی مانگنے پر ایک آرٹیکل لکھا تھا میں نے اس کا ترجمہ پڑھا ہے۔ اس سے میرے دل میں یہ بات ٹھیک طور پر بیٹھ گئی کہ واقعی انصاف کے رو سے ہمیں اس قدر نمایندگی پر راضی ہونا چاہیئے جس قدر شری یت کرشن گوپال گوکھلے ہمارے لئے مانتے ہیں۔ میں نے راجہ صاحب سے اس کا ذکر کیا کہ جن صوبوں میں مسلم آبادی زیادہ ہے وہاں کوئی کاروائی مسلمانوں کے فیصلہ کے بغیر نہ ہونا چاہیئے۔ اس طرح یہ مسئلہ بیرونی لوگوں کے سامنے نہیں آیا تھا بلکہ سارے براعظم کو اکائی مان کر مجارٹی کے فیصلہ کو وہ لوگ ہندوستانی فیصلہ جانتے ہیں۔ انھوں نے ہماری مدلل بات سنی اور اعداد و شمار میں غور کیا تو اُن کی رائے ہمارے موافق ہوگئی۔ جرمن کیپٹن نے کہا کہ ہماری گورنمنٹ نے ایک دفعہ غلطی کی ہے۔ دوسری دفعہ نہیں کرے گی۔

راجہ مہندر پرتاب

ہمارے راجہ صاحب ہیومنیٹرین HUMANI-TARIAN ہیں اور اسی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ انسانیت کا معیار اُن کے ذہن میں ایک کٹر سیاسی سے اونچا نہیں ہے ان کے نزدیک ہندوستان میں (میرے ابتدائی مطالعہ کے مقابل) مسلمانوں کی کوئی ہستی نہیں تھی۔ کابل میں مہمانوں کی رواداری ایک مرض کے درجہ تک ترقی کر چکی تھی۔ وہ مہمان کی بات صریحًا غلط سمجھ رہے ہیں مگر اپنے آپ کو جاہل سمجھ کر مہمانوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری جانتے ہیں۔ عام مجلسوں میں اُن کی غلط باتوں کے لئے شاعروں کے مقولے پیش کردیں گے۔ اس سے مہمان سمجھ رہا ہے کہ میرے پروپیگنڈے کا خوب اثر ہو رہا ہے۔ ہمارے راجہ صاحب بھی اس غلط فہمی میں کافی زمانہ تک مبتلا رہے۔ یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ میرے تبادلہ خیالات نے راجہ صاحب کو مجبور کیا کہ ہندوستانی معاملات میں وہ صحیح طور پر مسلمانوں کو شریک کریں۔ اور میں ان کے لئے ایسا نرم اور میٹھا ثابت نہیں ہؤا جیسے مولوی برکت اللہ مرحوم۔ اس کے بعد ہمارے اور راجہ صاحب

کے اکثر معاملات محبت سے طے ہوتے رہے اور میں نے اُن کے معاملہ کو پروفیسر کرپلانی کی طرح معمولی تصور کیا (یعنی ایک غلط فہمی) اور ادلہ کی روشنی میں اس کی درستی کر دی گئی۔ مگر واقعہ ایسا نہیں تھا۔

راجہ صاحب کا حملہ

انہوں نے ہندو مہاسبھا کا نظریہ اُس وقت سے قبول کر لیا۔ یا صحیح طور پر کہا جائے تو انہوں نے اپنے قلبی فیصلہ کو عملی صورت دینا شروع کیا۔ یعنی آریہ سماج کو ہراول بنا کر لالہ ہردیال کے نام سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا (یعنی شدھی سنگھٹن کی تحریک) انہوں نے کافی محنت کے بعد اپنے بھائی سے سوئٹزرلینڈ میں ملاقات کی صورت نکالی اور انہیں نشیب و فراز سمجھا کر واپس کر دیا۔ راج کمار شارداکالج لاہور میں جلوس اور پنڈت مالوجی کا لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند سے جیل میں مل کر انہیں معافی کے لئے تیار کرنا معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس میں راجہ صاحب کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔

لالہ لاجپت رائے کی ملاقات استنبول میں

راجہ صاحب فرماتے ہیں کہ

حکومت موقتہ ہند (عارضی حکومت) کی کتاب سوئٹزرلینڈ کے سفر میں چُرائی گئی ہے ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی پنڈت جی (پنڈت مدن موہن مالوی تک پہنچ گئی ہے یا پہونچا دی گئی ہے۔ اس سے جس قدر معلومات حاصل ہوئیں ان کا عام پروپیگنڈا آسان نہیں۔ فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے گھرے واقعات کیسے معلوم ہوئے۔ ہمارا خیال ہے کہ راجہ صاحب کی عزت محفوظ کرنے کے لالہ لاجپت رائے ہم سے ملے۔ اس کے بعد ہر ایک بات ہمارے نام سے کہی جا سکتی ہے۔ ہماری ملاقات سے لالہ جی نے اور بھی فائدہ حاصل کرنا چاہا جس میں افسوس کہ انہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ یہاں پر یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔

جرمن ممبران کی شکایت مفصل ملاقاتوں سے ہمیں معلوم ہوا کہ مشن کے ہندوستانی ممبر اور جرمنی ممبر یک جہتی قائم نہ رکھ سکے جو ایسی سیاسی مہمات کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستانی ممبر سارا الزام جرمن ممبروں پر تھوپتے تھے لیکن جرمن ممبر شکایت کرتے تھے کہ برلن اور استنبول میں جو سبز باغ دکھائے گئے ان کا عشر عشیر بھی یہاں نظر نہیں آتا اس مشن کا جو مقصد بیان کیا جاتا ہے انصاف یہ ہے کہ مشن نے اس کے موافق کوئی تیاری نہیں کی تھی راجہ صاحب کو جب میں نے بعض کوتاہیوں سے متنبہ کیا تو فرمایا کہ جرمن چانسلر نے بھی مجھے اس طرف توجہ دلائی تھی اور میرے لئے آسانی پیدا کرنی چاہی تھی مگر میں نے خلاف شان سمجھ کر انکار کر دیا۔

ہندوستانی مشن کا مقصد جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں فقط اس قدر تھا کہ جرمنی ترکی اتحاد میں اگر افغانستان شمولیت کا قصد کرے تو مالوی جی کا ایک نمایندہ اس سے واقف ہوتا رہے اور جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کی سرحد سے اس مصیبت کو ٹالتا رہے۔ معاملات میں جو پوزیشن شاہ افغانستان کو حاصل ہو اس میں مہاراجہ نیپال کو شریک کرنے کی کوشش کرے۔ انڈین سوسائٹی برلن نے پوری دانشمندی سے اس ہندو تحریک کو ہندوستان کا رنگ دینے کے لئے مولانا برکت اللہ صاحب کو بھی برائے نام اس میں شریک کیا۔

مولانا برکت اللہ صاحب مرحوم کی شمولیت کو جس قدر ہم بے معنی دکھلا رہے ہیں اس کا مولانا کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کی اس غفلت کی سزا ہے جو اپنے آپ کو اقلیت میں فرض کر کے اکثریت کے رحم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب ایک شخص کے ذہن میں یہ ٹھونس دیا جائے کہ تم اس متعین کردہ کی اجازت نہ ہونے کی صورت میں کوئی کام نہیں کر سکتے تو اس شخص کے بیکار ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے میں اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے ایک دو مثالیں لکھتا ہوں۔ مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام جب اپنا اختیار مہاتما گاندھی کے سپرد کرتے ہیں تو کیا وہ اپنی قربانیوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یا ڈاکٹر انصاری کو اگر سوامی شردھانند کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے تو اس کی محنت کوئی نتیجہ دے سکتی ہے اسی طرح اگر مولانا برکت اللہ مرحوم راجہ صاحب سے اختلاف کر کے اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے سے سوا چارہ

ہی کیا ہے (ذاتی ڈائری از صفحہ ۸۰ تا ۹۶)

جنود اللہ کا قیام جب ہم سردار نائب السلطنت (سردار نصر اللہ خاں صاحب سے) مل چکے تو وہ ہندوستانی تعلیمیافتہ نوجوان جو لاہور سے یاغستان ہو کر کابل اس ارادہ سے پہنچے تھے کہ ترکی جاکر وہ جنگ میں شریک ہوں گے لیکن کابل میں روک دیئے گئے تھے انہیں پولیس کی حراست سے آزاد کرا دیا گیا اور ان کے رہنے کے لئے وہی گھر تجویز ہوا جس میں ہم رہتے تھے ہماری خواہش تھی کہ وہ ترکی جانے کا خیال چھوڑ دیں اور کابل میں ہمارے ساتھ رہ کر حکومت کی مصلحت جس قدر اجازت دیتی ہو اسی قدر کام میں مصروف رہیں۔ وہ جب لاہور سے نکلے تھے تو منظم شکل میں سفر کر رہے تھے مگر کابل میں لاہوری نوجوانوں کے ساتھ چند نوجوان پشاوری بھی شامل ہو گئے اور ان میں اختلاف ہو گیا۔ بے کاری میں آہستہ آہستہ لاہوری جماعت کے افراد بھی کسی قدر مختلف ہو رہے تھے ہمیں جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو میں نے پہلے اُن کے پُرانے نظام کو تازہ کرنے کی کوشش شروع کی اور ایک نوجوان عبدالباری ایم اے جماعت کا صدر منتخب ہوا ہمارا تعلق اس جماعت سے اس رئیس کے توسط سے تھا چونکہ ہندوستانیوں کی ایک جماعت سیاسی سازش کے الزام میں محبوس تھی اور وہ لوگ افغانستان کے محکمہ تعلیمات سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ہم افغانستان میں دلچسپ کام بھی جاری نہیں کر سکتے تھے لیکن جب یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہنے لگے تو ہمیں دہلی کے نظارۃ المعارف کا سا لطف آنے لگا۔ ان کے متعلق ہمیں کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اس جماعت میں کم از کم دس آدمی ایسے تھے جو تین سال سے زیادہ کالج میں پڑھ چکے تھے انہیں ہم نے علیحدہ کر لیا اور کسی قدر مذہبی اور سیاسی عام اصول پر ان سے مذاکرات ہونے لگے اس میں شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری بھی شریک تھے۔ اس عرصہ میں ہمارے بعض دوست دیوبند سے بھی پہنچ گئے جن میں سے مولانا منصور انصاری تھے جمعیۃ الانصار میں ہم دونوں ساتھ کام کر چکے تھے اور مولانا سیف الرحمٰن دہلی سے یاغستان ہوتے ہوئے کابل پہنچے مولانا سیف الرحمٰن اصل میں قندھاری افغان ہیں۔ ان کے آبا و اجداد پشاور کے پاس رہنے لگے انہوں نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے حدیث پڑھی اور زیادہ عرصہ تک ٹونک میں پڑھاتے رہے اخیر میں دہلی کے مدرسہ فتحپوری کے مدرس اول تھے۔

جب حضرت شیخ الہندؒ قدس اللہ سرہ کے مشورہ سے انہوں نے یاغستان کی طرف ہجرت کی تو حاجی ترنگ زئی صاحب کی بیعت میں کچھ عرصہ جہاد میں شریک رہے پھر کابل تشریف لائے ان کے وکیل مولانا محمد بشیر جو جماعت اہل حدیث لاہور کے معزز کارکن تھے اور ہجرت کر کے جماعت مجاہدین[1] میں رہتے تھے نوجوانوں کی ہجرت میں اس کا خاص کام تھا وہ بھی اپنی جماعت کے فرائض انجام دینے کے لئے کابل پہنچے۔ ان لوگوں کے مشورے سے ہم نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنوائی جسے جنود اللہ کہا جاتا ہے اس میں عسکریت بھی تو اسی قدر جتنی سالویشن آرمی میں موجود ہے۔ اس نظام سے ہم نوجوانوں کی باہمی رقابتوں کو دور کر سکے اور انہیں مغرور طالب علموں کے مکروہ نام سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئے سرحد میں حاجی ترنگ زئی کے آنے پر افغانی مجاہدین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی۔ حاجی ترنگ زئی چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کے خاص دوستوں میں سے تھے ان کے ساتھیوں میں سے بہت سے لوگ دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے اس لئے جب ان کے وکلاء کابل آئے تو وہ بھی جنود اللہ میں شامل ہو گئے۔

حکومت موقتہ ہند (عارضی حکومت)

ہندوستانی مشن کو اپنے مطلب میں کامیابی نہ ہوئی۔ اعلیٰ حضرت اپنے

---

[1] سرحد میں مجاہدین کی ایک جماعت تھی جس کا تعلق حضرت مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی سے تھا یہ جماعت جب بھی موقع ملتا انگریز کو نقصان پہنچانے کے لئے میدان میں نکل آتی۔ مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے حضرت سید صاحب کے ساتھ ہجرت کی۔ یہ کابل میں سفارت کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد مولانا محمد اسحاق صاحب دہلویؒ کے ماتحت ہند میں داعی بنا کر بھیجے گئے حیدر آباد اور بنگال میں کام کرتے رہے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد ۱۲۴۸ھ میں انہوں نے اپنی مستقل جماعت قائم کر لی ۱۲۷؟ھ میں حجاز، یمن، نجد کا سفر کیا ۱۲۶۲ھ میں مشرقی افغانستان میں تشریف لائے۔ مولانا ولایت علی مرحوم سید صاحب کی شہادت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کے انتظار میں بیٹھنے والی ایک خاص جماعت قائم کر لی ان کے بھائی مولوی عنایت علی مرحوم اس خیال کے مخالف تھے اسلئے جماعت میں منتظرین اور مجاہدین دونوں فریق ملتے تھے۔ ان مجاہدین کی امامت مولانا ولایت علی کے خاندان میں منحصر ہوگئی۔

ملک کو جنگ میں دھکیلنا نہیں چاہتے تھے اور انگریزوں سے انہیں بہت کچھ مراعات کی توقع تھی۔ اس کے مقابل فریق ثانی کوئی تسلی بخش پروگرام نہ بنا سکا اور ممبروں کا اختلاف سونے پر سہاگے کا کام دے گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل ہند کے متعلق ہمارے نظریات چونکہ مشن کے ممبروں سے پورے پورے نہ ملتے تھے اس لئے بھی ہمیں دربار میں جلدی بڑھنے کا موقعہ مل گیا حکومت نے مشن کے ممبروں کو آخری جواب دینے سے پہلے ہمیں ان سے ملنے کے سامان بہم پہنچا دیئے جس سے ان کے خواب کو مختلف تعبیرات سے پریشان کرنے کی کوشش کی گئی۔ مشن کی گفتگو اعلیٰ حضرت سے ہوتی وہ حرف بحرف برٹش قونصل کے ذریعہ وائسرائے کو بھیجدی جاتی اس کے معاوضہ میں کافی روپیہ انگریزوں نے اعلیٰ حضرت کے لئے بھیجا اور ان کے سالانہ گرانٹ میں مستقل اضافہ ہوگیا۔ البتہ سردار نائب السلطنت کی صدارت میں جو باتیں ہوتیں وہ محفوظ رہتیں اور ان سے افغانستان گورنمنٹ اپنی ترقی کے لئے راستے چوستی۔ اس قسم کے کاموں میں سے ایک کام حکومت موقتہ ہند کا ہے۔

روسی ہندوستانی مشن

راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ نے مل کر حکومت موقتہ ہند کی بنیاد ڈالی جس میں بعض جرمن اور ترک بھی شامل ہوئے۔ اس حکومت نے ایک وفد روسی گورنمنٹ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا سردار نائب السلطنت نے منظور کرلیا اس پروگرام پر کام کرنے کے لئے ان کے پاس ہندوستانی نہیں تھے وہ چاہتے تھے کہ یہ نوجوان ان کے ساتھ کام کریں۔ مگر یہ لوگ ہماری تنظیم میں جکڑے ہوئے تھے اس لئے ہم سے براہ راست باتیں شروع ہوئیں ہماری ابتدائی گفتگو میں ایک افغان افسر بھی موجود رہتا تھا اور ہمارے تبادلہ خیالات سے وہ بہت سی ایسی باتوں کو سمجھنے لگا جو پہلے سے اس کی توجہ جذب نہیں کرسکتی تھیں۔ ہمارے ساتھ ان نوجوانوں کے ساتھ دو سکھ بھی تھے جو غدر پارٹی کے ممبر تھے اور ہندوستان سے بھاگ کر بلا پاسپورٹ افغانستان میں داخل ہوگئے تھے۔ وہ بھی پہلے پولیس کی حفاظت میں تھے پھر آزاد ہوکر ہمارے پاس رہنے لگے تھے۔ راجہ صاحب کی تجویز یہ تھی کہ ان میں سے ڈاکٹر متھرا سنگھ کو اس روسی مشن میں بھیجا جائے۔ مولانا برکت اللہ صاحب مرحوم کی تائید کے بعد دوسرے ممبر اس داخلی مسئلہ سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے

تھے اس لئے وہ موافق ہو گئے۔ اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ ایک فیصلہ شدہ صورت میں ظاہر کیا گیا لیکن ہم ڈاکٹر متھر اسنگ کی عام سیاسی واقفیت سے آشنا ہو چکے تھے اس میں ترمیم پیش کر دی کہ اس مشن میں ڈاکٹر متھر اسنگھ کے ساتھ ایک نوجوان مسلمان بھی ہونا چاہیئے۔ راجہ صاحب نے پسند نہیں کیا اور اس پر مباحثہ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اشتراک کا یہ مطلب نہیں کہ کام سوچنے والی جماعت میں ایک مغلوب حصہ مسلمانوں کا شامل رہے اور کام کرنے والی طاقت خالص غیر مسلم رہے بلکہ عملی کاموں میں مسلمانوں کی شرکت ضروری ہے۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ سردار نائب السلطنت کے سامنے پیش ہُوا۔ ترک، جرمن، افغان بھی اس میں شریک ہوئے۔ طرفین کی باتیں سُن کر ہماری رائے کے موافق فیصلہ ہوا ہماری اور راجہ صاحب کی تلخ گفتگو کا یہ آخری حصہ ہے اس کے بعد پھر کبھی اس قسم کی ضرورت پیش نہ آئی۔

روسی ہندوستانی مشن کا مسلمان ممبر

ہم نے نوجوانوں کے رئیس سے اس کام کے لئے ایک ممبر مانگا اس نے اپنی جماعت کے پورے مشوروں کے بعد ڈاکٹر خوشی محمد کو منتخب کیا یہ نوجوان جالندھر کا رہنے والا ہے۔ میڈیکل کالج لاہور میں دو سال سے زیادہ تعلیم حاصل کر چکا ہے مذہبی جذبات جیسے نوجوان میں ہوتے ہیں اس میں کسی سے کم نہیں سمجھ دار ہے ہنس مکھ ہے۔ نوجوانوں کی ہجرت کی تحریک کا لیڈر رہے اس کا نام مرزا محمد علی تجویز کیا گیا اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ دوسرا ممبر قرار پایا یا شیخ محمد ابراہیم جب کابل چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تو اسی مرزا محمد علی کو میں نے اپنا رفیق بنایا دقرار دیا، میری جس قدر کامیابی افغانستان اور اس کے بعد روس میں مانی جا سکتی ہے اس میں مرزا محمد علی کی محنت و ہمت کا حصہ غالب ہے اس میں شک نہیں کہ اگر وہ ہمارے ساتھ نہ مل جاتا تو شاید کوئی بڑا کام نہ کر سکتا خدا نے صحیح اشتراک میں قوت رکھی ہے۔ اجزاء کے انفرادی قوت میں اضعافاً مضاعفہ قوت نازل ہوتی ہے" دو دل یک شود بشکند کوہ را۔ اگر آپس میں کارکن شریک ہو جائیں عقلی اصول صحیحہ پر شرکت ہو۔ عمل اور تقسیم فوائد میں عدل ملحوظ رہے۔ فقط اتنی طاقت دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک عالمگیر برادری جو قرآن پر ایمان کا دعویٰ رکھتی ہے کیا ان میں سے ایک مختصر جماعت سمجھ دار پیدا نہیں ہو سکتی۔

یقیناً ہو سکتی ہے مگر اُن کو قرآن پر غور کرنے کی فرصت کہاں مخالفین کے پروپگنڈے سے مرعوبیت نے انہیں کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون کابل سے سفر کرنے کے چند دن پہلے مرزا محمد علی روس کی انقلابی اشتراکی جماعت کا ممبر بن گیا اس کے بعد ہمارا اُن کا رسمی اشتراک باقی نہیں رہا فقط دوستی اور محبت ہے۔

مرزا محمد علی کے لئے سفر خرچ

راجہ صاحب نے ڈاکٹر متھرا سنگھ کا سفر خرچ دے دیا ہم سمجھتے تھے کہ راجہ صاحب پورے مشن کا خرچ دیں گے یا شاید حکومت افغانیہ انتظام کر دے گی مگر ایسا نہیں ہوا ہماری ساری زندگی اسی طرح گزری کہ روپیہ پیسہ کا کوئی خاص اہتمام نہیں جب ضرورت پیش آئی کسی نہ کسی طرح روپیہ مل گیا۔ اس طرح ہمارے دل میں اپنے پروردگار پر زیادہ اعتماد پیدا ہوتا گیا اور اسی کو ہم اپنی زندگی کا روشن پہلو شمار کرتے رہے۔ کابل کا سفر بھی اسی قاعدہ پر تھا۔ جب ہم قندہار پہنچے تو ہمارے پاس فقط ایک پونڈ تھا اور ہم چار آدمی تھے نائب الحکومت نے ہمیں سفر خرچ دے دیا مگر اُسے معلوم نہ تھا کہ یہ خالی ہاتھ ہیں۔ جب ہم کابل پہنچے تو ایک مہینہ میں ہمارا خرچ ختم ہوگیا اور ہم نے جس قدر کپڑے یا سامان راحت خریدا تھا سب بیچ ڈالا اس وقت ہندوستان سے ایک دوست نے کسی قدر روپے بھیجے اور لوگوں سے ملنے ملنے کے قابل ہم کپڑے بنا سکے۔ پھر سردار نائب السلطنت نے بطور مہمانی شاید پانچسو روپے بھیجے تو ہمارے بعض ساتھی جو ہندوستان سے واپس ہوئے ان کی ضروریات میں صرف ہوگیا میں شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ کھانے میں شروع سے شریک ہوگیا تھا۔ مگر اور قسم کی اعانت ہم اُن سے نہیں چاہتے تھے وہ سمجھتا تھا کہ میں ہند سے کام کے لئے بہت سا روپیہ لایا ہوں اور میں اُسے مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب مرزا محمد علی کا خرچ دینا ضروری تھا۔ میں نے شیخ محمد ابراہیم سے روپیہ مانگا مگر اُس مرحوم نے اُس وقت انکار کر دیا۔ اگرچہ بعد میں ان کا تمام روپیہ اور سب سامان اسی کام میں صرف ہوا۔ اپنے فیصلے سے انہوں نے یہ سب کام کیا۔ لیکن اسی خاص وقت پر ان سے غلطی ہوگئی۔ ان کے دوسرے ساتھی مولوی محمد علی قصوری تھے مولوی عبدالقادر قصوری سے ہماری سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ مولوی محمد علی کا تعارف مولانا ابوالکلام نے کرا دیا تھا مگر وہ شیخ محمد ابراہیم کی طرح ہمارے کام میں شریک نہیں تھے۔ خاص مشوروں میں فقط شیخ محمد ابراہیم پر ہمارا اعتماد تھا عام معاملات

میں مولوی محمد علی بھی شریک ہوتے تھے۔ اپنی تکلیف کا ہلکے الفاظ میں اُن سے ذکر کیا وہ بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے جلد اپنی دو ماہ کی تنخواہ پیشگی وصول کر کے ہماری ضروریات پوری کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کا خاص لطف دیکھا اور مولوی محمد علی کے از حد ممنون ہوئے جیسے آخر میں شیخ محمد ابراہیم کا تمام اندوختہ ہمارے کام میں صرف ہوا۔ اسی طرح مولوی محمد علی نے جس قدر کابل میں کمایا تھا وہ سب ہمارے ہندوستان کاموں میں صرف ہوا جزاھم اللہ خیرا، سیاسی کام فقط نظریات یا عملی تجربات کے مالک ہونے سے نہیں چلتے۔ اس کی کامیابی کے لئے ایک مستعد جماعت اور روپیہ کی بھی ویسے ہی ضرورت ہے جیسے علم و عمل کی۔ ہندوستان کے مسلمان جس قدر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں وہ تھوڑا سمجھا جائے گا کہ اُن کے نام سے کابل میں بے سر و سامانی سے کام شروع ہوتا ہے تو اُن کے نوجوان بہترین کارکن ثابت ہوتے ہیں اور روپیہ تو مولوی محمد علی اور شیخ محمد ابراہیم کا تھا جو وقت پر کام آیا۔ ہمارا خیال ہے کہ ان لوگوں کا نام قوم کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیئے اور ہمیشہ کے لئے ان کو دعا کرنی چاہیئے۔

حکومت موقتہ ہند میں ہماری شمولیت

اس مشن کے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جرمن ممبروں سے زیادہ ملنا شروع کر دیا۔ اس میں ہمارے دوست عبدالباری بی اے کی رفاقت ہمارے کام آئی۔ راجہ صاحب نہیں چاہتے تھے کہ وہ (جرمن ممبر) کسی دوسرے ہندوستانی سے ملیں ہماری ملاقاتوں کا تسلسل دیکھ کر راجہ صاحب نے ہمیں حکومت موقتہ ہند میں شمولیت کی دعوت دی انہیں خیال تھا کہ شاید اس میں شامل ہونا پسند نہ کریں گے کیونکہ اس کا جس قدر انتظام ان دونوں صاحبوں نے تجویز کیا تھا اس میں راجہ صاحب کے نام وفاداری کا حلف ضروری تھا۔ مگر میں نہایت مسرت سے اُس میں شامل ہو گیا۔ البتہ حلف نامہ تبدیل کر دیا جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ اس کے بعد ہندوستانی معاملات میں ہماری گفتگو بیرونی مداخلت سے پاک ہو گئی۔ ابتداء میں حکومت موقتہ کے تین ممبر رہے امیر امان اللہ خاں کے کے زمانہ میں جنگ افغانستان کے خاتمہ پر اور ممبر بڑھائے گئے۔ اس میں جماعت مجاہدین کے وکیل مولانا محمد بشیر صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

راجہ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں۔ مگر اپنی شخصی ڈکٹیٹر شپ کا خیال

ان کے دماغ پر غالب تھا یورپین لوگوں سے وہ اُن کی زبان میں باتیں کر لیتے اور ڈیموکریسی کے لکچر دے ڈالتے لیکن ہندوستانی معاملات میں ان کی موروثی خصلت نمایاں رہتی ہم نے بڑے داؤ پیچ سے انہیں راضی کیا کہ حکومت موقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دے دے جسے انڈین نیشنل نے اس کام کے لئے معین کیا ہو۔ وہ اس کے سوا کوئی بات نہیں جانتے تھے کہ کام پریذیڈنٹ کے اختیار میں چھوڑ دینا چاہیئے اور وہ لائف پریذیڈنٹ اپنے ہی تجویز کردہ قانون سے مقرر ہو چکے تھے۔ جب پہلی بار راجہ صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومت موقتہ کے لئے تین مرکز تجویز ہوئے۔ کابل، نیپال، بنگال شمال مشرقی۔ کابل کے مرکز میں کام ہمیں تفویض ہؤا۔ اس کے بعد ہم نے جنود اللہ اور باقی تمام کارروائیوں کو حکومت موقتہ مرکز کابل سے متعلق کر دیا۔ امیر امان اللہ خاں صاحب جب برسرِ اقتدار ہوئے تو انہوں نے ہمیں حکومت مؤقتہ ہند کا نمائندہ مان کر سرکاری معاملات صلح وحرب میں شریک کر لیا۔ جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو اس خاص مجلس میں مجھے بلا کر سرفراز فرمایا۔ دوران جنگ میں بعض اہم امور میرے حوالے کئے گئے۔ جنگ ختم ہونے پر اچھی کامیابی حاصل کرنے میں ہماری خدمات خاص طور پر تسلیم کی گئیں۔ اس تمام زمانہ میں ہمارے نوجوان رفیقوں کے کارنامے سنہری حروفوں سے لکھے جائیں گے۔ اگرچہ ایک زمانہ تک ان پر پردہ ڈالنا ضروری ہے۔ جب جنگ ختم ہونے پر راجہ صاحب دوبارہ کابل تشریف لائے تو امیر امان اللہ خاں نے ان کے اعزاز میں ایسے کام کئے جن کی راجہ صاحب کبھی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اس میں امیر صاحب نے ہمارے مشورے حرفاً بحرفاً قبول فرمائے۔

آخری سال جب ہم کابل سے رخصت ہوئے امیر صاحب نے ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومت موقتہ کا کام کرنے سے روک دیا۔ انٹرنیشنل سیاسیات کی پابندی ضروری ہے۔ ہم نے ایک شرط پر اُسے منظور کر لیا جب وہ وعدہ کرنے میں تعلل نظر آیا تو ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بذاتِ خود تھوڑے سے تغیر کے بعد آرام وعزت سے کابل میں رہ سکتا تھا مگر میرے نوجوان رفیقان (جن کی مشقتیں ہماری عزت افزائی کی سبب بنی تھیں) کا مستقبل برباد ہو جاتا اس لئے میں کابل سے نکلنا ضروری سمجھتا تھا۔ اب ہم اطمینان سے مجتمع نہیں ہیں۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ فلاں نے اپنے فائدہ کے

لئے دوسروں کا نقصان کر دیا اگر کبھی موقع میسر آیا تو تمام دوست پھر یک جا ہو جائیں گے واللہ الموافق والمعین۔ (ذاتی ڈائری صفحہ ۹۹ تا ۱۱۰)

ہندوستانی مشن کی روس کو روانگی ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا محمد علی روسی مشن پر بھیج دیئے گئے اور ممبروں کے ساتھ دو خادم بھی روانہ کئے گئے۔ محمد علی کا خادم افغان تھا اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کا خادم ایک کابلی سکھ مشن ترمذ سے تاشقند پہنچا گورنر نے زار کو مطلع کیا وہ اس وقت پریشان تھا۔ اُس نے برطانیہ سے بہت سے مطالبات شروع کر دیئے اور اس مشن کی کارروائی بہانا بنایا۔ برطانیہ مشن کو جعلی قرار دیتا ہے لیکن روس اسے تسلیم نہیں کرتا اور افغانی حملہ سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ برطانیہ ہندوستان سے ممبروں کی تشخیص کراتا ہے۔ مگر صحیح طور سے معین نہ ہو سکے۔ بالآخر زار نے ممبروں کے گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ مگر گورنر تاشقند کی مداخلت سے یہ لوگ قید سے بچ گئے۔ یہ مشن بےکار ثابت نہیں ہوا۔ روسی انگریزی اتحاد میں کسی قدر مشکلات پیدا کر سکا جس کی تلافی کے لئے لارڈ کچنر کو خود سفر کرنا پڑا۔ روسی انقلابیوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا نام ہے "سونے کی پٹری" (جو سونے کی پٹری پر کندہ کرایا گیا تھا) ایک خط گورنر تاشقند کے نام تھا اس میں اس مشن کے متعلق خط و کتابت مذکور ہے۔ جب یہ مشن واپس آیا تو ڈاکٹر متھرا سنگھ سردار نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا۔ سردار کے تمام سوالوں کے جواب میں یہی کہتا رہا کہ بخیر رفتیم و بخیر آمدیم۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت نے مرزا محمد علی کو بلایا اور سفر کی کیفیت پوچھی۔ محمد علی نے تمام واقعات کی مختصر یادداشتیں لکھ رکھی تھیں۔ جیب سے اپنی کتاب نکالی اور مفصل حالات اور گفت و شنید کا خلاصہ سب ذکر کر دیا۔ اس کے بعد سے سردار نائب السلطنت ہماری بہت زیادہ قدر کرنے لگے انہوں نے اپنے خاص لوگوں سے کہا کہ اگر ہم مولانا عبید اللہ کی بات نہ مانتے تو راجہ صاحب کا فرستادہ ہمیں ایک حرف بھی نہ بتلاتا۔

ہندوستانی حکومت کا ایک اخلاقی حملہ ہماری تربیت ہندوستانی تعلیمات میں علماءِ دیوبند کے مسلک پر ہوئی ہے۔ دیوبندی جماعت فقہ حنفیہ کی پابند ہے۔ لیکن بہت سے غلط رسوم کی تردید میں مولانا اسماعیل شہید کے طریقہ پر ہے اس میں یہاں تک مبالغہ کیا جاتا ہے کہ مولانا اسمٰعیل

کے اصلی اتباع یہ لوگ اپنے سوا کسی کو نہیں مانتے۔ سندھ میں میں نے بیس سال زندگی بسر کی ہے میرے بزرگ سب اسی دیوبندی مسلک سے ملتے جلتے ہیں اگرچہ علماء دیوبند سے ان کے افادہ اور استفادہ کا کوئی رابطہ نہیں۔ ان کے مخالف سندھ میں پیروں اور مولویوں کی تعداد کافی ہے ہندوستانی حکومت نے ان میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جن کا قندھار کے پیروں سے بہت قوی تعلق تھا۔ ان قندھاری بزرگوں میں سے ایک پیر کابل تشریف لائے اور سردار نائب السلطنت سے ملے اور انہیں یقین دلایا کہ مولانا عبیداللہ حکومتِ ہند کا فرستادہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ افغانستان کے لوگوں کا مذہب خراب کر کے افغانستانی حکومت کے اسرار سے انگریزوں کو مطلع کرے سردار نائب السلطنت کے سکریٹری نے ہم سے ذکر کیا ہم نے اُس کو تھوڑا سا سمجھا دیا کہ ہمارے متعلق وہ افغان سی آئی ڈی کے افسروں کو مقرر کر کے حکومت کی رائے معلوم کریں اس پر جس قدر سزا ہو اس سے دریغ نہ کریں اگر ذرا سا شُبہ ہو تو مجھے توپ سے اڑا دیا جائے۔ دوسری صورت میں جہاں سے میں آج کام چھوڑ رہا ہوں وہیں سے شروع کروں گا گویا یہ زمانہ بیماری کی رخصت میں حساب ہوگا غالباً یہ تجویز سردار کو پسند آئی اور اس پر عمل کیا گیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ افغان خفیہ نویسوں نے کہا کہ اس شخص (قندھاری پیر) کے نامہ اعمال میں ایک نقطہ بھی سفید نہیں رہا۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت نے ہمیں خاص طور سے باریاب فرمایا اور ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

استنبول مشن اور جاپانی مشن

پہلے مشن کی کامیابی میں راجہ صاحب نے دو مشن اور بھیجنے کا فیصلہ کیا ایک ہمارے منشا کے مطابق استنبول بھیجا گیا اس میں ہمارے رفیق عبدالباری بی اے اور ڈاکٹر شجاع اللہ مقرر ہوئے یہ ایران کے راستے استنبول جائے گا۔ دوسرا مشن مولانا برکت اللہ کی تجویز پر مقرر ہوا۔ اس میں شیخ عبدالقادر بی اے اور ڈاکٹر متھرا سنگھ روس کے راستے جاپان جائیں گے کیپٹن مینٹس (جرمن ممبر مشن) سب سے پہلے کابل سے واپس گئے۔ امیر صاحب نے رخصت کا فرمان دے دیا وہ جانے کے وقت تین سو پونڈ میرے نام چھوڑ گئے راجہ صاحب نے مجھے حکم دیا کہ وصول کر لوں اس میں سے ایک سو پونڈ تو راجہ صاحب اور مولانا برکت اللہ نے اپنے کپڑے تیار کرنے کے لئے لے لئے اور دو سو پونڈ شیخ

محمد ابراہیم کے پاس امانت رکھ لیئے۔ شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی اور میرا بھتیجا عزیز احمد جس گھر میں رہتے تھے اس پر رات کو ڈاکہ پڑا اور وہ تمام روپیہ اور دونوں صاحبوں کے کپڑے اور سامان ڈاکو لے گئے مجھے خطرہ ہوا کہ راجہ صاحب اس ڈاکہ کو ہمارے روپے ہضم کرنے کا بہانہ تصور کریں گے۔ جب استنبول مشن جانے کا وقت آیا تو اس کے لئے سو پونڈ مولانا محمد بشیر وکیل رئیس المجاہدین سے قرض لے کر ادا کر دیئے۔ مولانا محمد بشیر صاحب کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ قرض کا تو فقط نام تھا اگرچہ بعد میں مرزا محمد علی نے ادا کر دیا۔ دوسرے مشن کی روانگی سے پہلے سرکاری طور پر ڈاکہ کی تصدیق ہو چکی تھی اور چوروں کے پاس روپیہ کا ثبوت ہو چکا تھا۔ اگرچہ ہمیں اس میں سے کچھ بھی نہیں ملا۔ اب راجہ صاحب کے کہنے سے میں مولانا برکت اللہ کے ساتھ سردار نائب السلطنت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس واقعہ میں روپیہ ضائع ہونے کا ذکر کیا ایک سو پونڈ کی ضرورت ظاہر کی سردار صاحب نے بکمال مہربانی وعدہ فرمایا اور شام کو خود سو پونڈ ساتھ لائے اس طرح دوسرا مشن بھی روانہ ہو گیا۔

ممبروں کی گرفتاری

روس نے دوسرے مشن کو جب ان کی سرحد عبور کر چکا تو گرفتار کیا اور انگریزوں کے حوالہ کر دیا۔ استنبول مشن کو ایران میں خود انگریزوں نے گرفتار کیا۔ چار ممبر لاہور پہنچے ڈاکٹر متھرا سنگھ چونکہ ایک بم کیس میں مفرور تھا اُسے پھانسی پر لٹکایا گیا اور باقی تین ممبر نظر بند کر دیئے گئے ان میں سے عبدالباری جو ہر ایک موقعہ پر ہمارے ساتھ تھا اور نوجوانوں کی جماعت کا رئیس تھا سر محمد شفیع کا رشتہ دار نکلا اُسے معافی مانگنے پر راضی کیا گیا اس نے تمام واقعات حکومت موقتہ کے وجود اللہ اور جماعت مجاہدین کے مفصل لکھ دیئے اور باقی دو ممبروں نے اس پر دستخط کر دیئے۔ کچھ عرصہ نظر بند رکھ کر انہیں چھوڑ دیا گیا حکومتِ ہند روسی مشن کے نامہ سے واقعات کی تحقیق کیلئے پریشان تھی۔ اب اسے باطمینان مفصل حالات کی اطلاع مل گئی۔

نتیجہ

حکومت ہند (ان اطلاعات کے بعد ایسے عناصر کا کابل میں موجود ہونا کیسے گوارا کر سکتی تھی اس نے پُر زور پروٹسٹ کیا) اسکے پروٹسٹ کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی حبیبیہ اسکول سے معزول کر دیئے گئے اور میرا بھتیجا عزیز احمد جو حبیبیہ اسکول کا طالب علم تھا خارج کر دیا گیا۔ آج عزیز احمد کے ہم جماعت قونصل اور نائب وزیر اور جرنیل اور ممبر بن گئے اور یہ باوجودیکہ علمی اور عملی لیاقت میں ان سے کسی طرح کم نہیں اسی طرح جوتے چٹخاتا پھرتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی حکومت ضائع کر کے اپنی نسلیں برباد کر رہے ہیں۔

شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی نے فیصلہ کیا کہ وہ یاغستان میں رہیں گے۔ پہلے دونوں مجاہدین میں رہے پھر شیخ محمد ابراہیم حاجی ترنگزی کے پاس چلے گئے اور پشتو سیکھ کر لوگوں کو قرآن شریف کی تعلیم دیتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد افغانستان سے گزر کر روس پہنچنے کی کوشش کی۔ راستہ میں افغانستان کے ایک گاؤں میں فوت ہوگئے۔ شبہ کیا جاتا ہے کہ ڈاکو یاغستان سے اُن کے ساتھ تھا اس نے شیخ صاحب کو شہید کر دیا۔ آخری وقت میں شیخ محمد ابراہیم نے دوسرے ساتھی کو ایک خط لکھ دیا وہ میں نے پڑھا ہے اُس کے ایک لفظ سے شبہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب سمجھانا چاہتے ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ وہ ڈاکو نہ ہو بلکہ انگریزوں کا ایک کارندہ ہو۔ شیخ محمد ابراہیم نے یہ سفر انقلاب روس کے بعد شروع کیا تھا۔ مولوی محمد علی قصوری کچھ عرصہ تک مجاہدین میں رہے اور پھر کسی طرح سردار عبدالقیوم کی معرفت معافی لے کر (ہندوستان) پہنچ گئے۔ ان کے بیانات سے بھی ہندوستانی گورنمنٹ کے علم میں کچھ اضافہ ہوا۔

ہندوستانی مشن جب یہ دونوں حضرات یاغستان جا رہے تھے ان کے ساتھ ایک ہندوستانی مشن بھی بھیجا گیا (ہم جب کابل پہنچے تو اپنے دو ساتھی واپس بھیجے تھے ان کے پاس بعض کاغذات اور پیام تھے انہوں نے احتیاط اور آہستگی سے کام کیا۔ اب راجہ مہندر پرتاپ چاہتے تھے کہ ان کی اطلاع ان کے بھائیوں کو ملے اور وہاں سے خیریت کی خبر آئے اس کے لئے ہم نے اپنے بھتیجے محمد علی کو مامور کیا وہ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ یاغستان گیا اور وہاں سے منزل مقصود پر پہنچ کر خط پہنچا دیا۔ جواب لے کر دو مہینے میں بخیریت پہنچ گیا۔ مگر راجہ صاحب اس سے پہلے کابل چھوڑ چکے تھے۔ ان کا خط انہیں مزار شریف میں پہنچا دیا گیا اور راجہ صاحب اس سے بہت مسرور و ممنون ہوئے۔ اس کے بعد راجہ صاحب ہم سے بھائیوں کا سا سلوک کرتے رہے۔ اپنے پرائیوٹ امور میں بھی ہم سے مشورہ لیتے رہے اور بسا اوقات ہماری خاطر اپنی رائے چھوڑ دیتے) اس مشن کا ایک حصہ وہ وہ کاغذات تھے جو میں نے اور مولانا منصور نے حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی خدمت میں بطور رپورٹ لکھے تھے ہم نے انہیں نوجوانوں میں سے ایک نومسلم شیخ عبدالحق پر اعتماد کیا اس کے کپڑے پر لکھ کر مکتوبات دیئے کہ وہ شیخ عبدالرحیم حیدرآبادی کو پہنچا دے

اور شیخ صاحب حج پر جائیں اور حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کریں۔ اس اللہ کے بندے نے وہ خطوط اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر حق نواز خاں کو دیئے۔ خاں صاحب نے سرمائیکل اڈوائیر کو پہونچائے اس کے بعد کے واقعات مشہور ہیں۔ ہندستان میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ہم حیران رہ گئے۔ چند روز بعد حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے رفقاء مکہ معظمہ سے گرفتار ہوئے۔ ایک عرصہ کے بعد ہمیں حقیقت معلوم ہوئی۔ یہ واقعات ہمارے لئے موت سے زیادہ ناگوار تھے مگر ایک بات کی مسرت بھول نہیں سکتے تھے۔ اگر خدانخواستہ راجہ صاحب کا خط ہم عبدالحق کو دیتے اور ایسا معاملہ پیش آتا تو ہمارے لئے ناقابل برداشت مصیبت ہوتی اب ہم خوش ہوتے ہیں کہ راجہ صاحب کا کام تو ہوگیا گو ہمارے لوگ قید و مصیبت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے آسانی کردے گا۔

ہماری نظر بندی اور قید

اس کے بعد ہندوستانی حکومت کے اعتراض (پروٹسٹ) کا اثر یہ ہوا کہ مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمٰن کابل سے یاغستان روانہ کردیئے گئے۔ جلال آباد تک دونوں ساتھ رہے۔ مولانا سیف الرحمٰن کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں لے لیا اور ہندوستانی معاملات سے علیحدگی کا وعدہ کرالیا۔ اب وہ مستوفی الممالک کے مہمان ہوکر رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ خاں کے آخری حکومت تک وہ مستوفی کے ساتھ رہے اور مستوفی کو جو کام انگریزوں کی تائید کے لئے دیا جاتا اس میں اس کی امداد کرتے۔

انور پاشا کا خط

ہندوستانی حکومت کو اطلاع ملی کہ حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے ایک خط انور پاشا سے لے کر ہندوستان بھیجا ہے اور وہ اکابر دیوبند کے پاس کہیں محفوظ ہے اس لئے ہندوستان میں جس قدر کوشش ہوئی اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اب جب امیر حبیب اللہ خاں کی حکومت سے امداد لی گئی تو مستوفی الممالک نے دیوبند کے ایک پرانے طالب علم کو جو حضرت شیخ الہند سے خصوصیت رکھتا تھا افغانستان میں سے ڈھونڈھ نکالا۔ اسے دیوبند بھیجا گیا کہ اعلیٰ حضرت امیر صاحب وہ کاغذ مانگتے ہیں اس میں اگر مولانا سیف الدین کی واقفیت مستوفی کی امداد نہ کرتی تو یہ تجویز بر روئے کار ہی نہ آسکتی۔ اس دیوبندی بزرگ کا پتہ بھی مولانا سیف الرحمٰن سے دریافت کرلیا تھا کہتے ہیں کہ اس بزرگ کو کچھ شکوک پیدا ہوئے! اسلئے خط ہاتھ نہیں آیا! اسکے بعد احتیاط پسند لوگوں نے وہ خط جلا دیا۔

مولانا منصور انصاری افغانستان سے یاغستان چلے گئے اور ایک ماہ تک وہیں رہے۔

مولانا عبید اللہ صاحب اور ان کے رفقاء کی افغانستان میں بحکم انگریزی حکومت گرفتاری اور نظر بندی

اس کے بعد ہمیں یکم رمضان ۱۳۳۵ھ کو ایک تنگ مکان میں لاکر قید کر دیا گیا۔ ہم لوگ بیس پچیس آدمی تھے اور وہ گھر کسی حالت میں دس سے زیادہ آدمیوں کے لئے موزوں نہ تھا۔ ہماری نگرانی سردار سپہ سالار کے متعلق رکھی تھی (یعنی سردار محمد نادر خاں) انہیں ہم نے توجہ دلائی اس نے ہمارے لئے ایک سرکاری باغ میں خیمے لگوائے اور عید رمضان پر خود ہمارے خیموں میں تشریف لائے۔ ایک عرصہ کے بعد ہماری نگرانی مستوفی الممالک کے سپرد کی گئی اب ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کی امداد سے مستوفی کے گھر رہنا شروع کر دیا۔ ہمارے ساتھی اسی طرح کوتوال کی حفاظت میں رہے۔ ہمارا ایک رفیق اس مجلس سے بھاگ گیا اور انقلاب روس کے بعد بخارا پہنچا اسکا نام رحمت علی گویا ہے۔ اس نے اپنی تجویز ہمیں بتلا دی تھی اُس کو ہم منع کرنا نہیں چاہتے تھے اور ہمیں خوف تھا کہ اس کے بھاگنے کا تمام الزام ہم پر عائد کیا جائے گا۔ اسلئے ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کے توسط سے ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لی مستوفی الممالک ہمیں جلال آباد لے گئے ہم وہیں تھے کہ امیر حبیب اللہ خاں قتل کر دیا گیا اور کابل میں امیر امان اللہ خاں مستقل بادشاہ بن گیا (ذاتی ڈائری الصفحہ ۱۱۳ تا ۱۲۲)

امیر حبیب اللہ خاں کے شہید ہوتے اور امیر امان اللہ خاں کے بادشاہ ہوتے کے اسباب پر مختصر تبصرہ

امیر حبیب اللہ خاں بادشاہ ہوئے تو سردار نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) ولی عہد قرار پائے۔ دونوں بھائیوں کے اتفاق سے سلطنت کا کام چلتا رہا۔ جب امیر حبیب اللہ خاں کے بیٹے جوان ہوئے تو ان کی طبعی خواہش تھی کہ سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت ولی عہد بنا دیا جائے اس کے لئے انہوں نے نہایت دانائی سے کام لیا۔ حرب عمومی (اعلان کے) بعد جب ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں کی طرف اوّلاً اور تمام ہندوستانیوں، ترکوں اور جرمنوں طرف سے ثانیاً امیر حبیب اللہ خاں پر زور دیا گیا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں تو امیر نے تمام اینٹی برٹش (برطانیہ کے خلاف) معاملات سردار نائب السلطنت (سردار نصر اللہ خاں) کے سپرد کر دیئے اور آپ پرو برٹش معاملات کو نمٹاتا رہا۔ انگریزوں نے کافی روپیہ امیر کو دیا کہ

یاغستان میں تقسیم کرے اور اپنی سلطنت کے نام پر قبائل افغانیہ سے بیعت نامہ حاصل کرے اور پشاور میں افغانوں کو کہا جاتا کہ امیر کابل جہاد کرے تو اسوقت بیشک جہاد میں شریک ہو جاؤ لیکن لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد ناجائز ہے اسلئے عام بدنظمی سے پرہیز کرو اسی طرح حاجی ترنگ زئی اور دوسرے مجاہدین کا کام رک گیا بلکہ حاجی ترنگ زئی کے آدمی اور ہندوستانی مجاہدین کے کارندے سب اسی کام پر مامور ہو گئے کہ وہ امیر کابل کے نام بیعت نامے حاصل کریں یہ انگریزی روپیہ انہیں لوگوں کے ہاتھ یاغستان میں تقسیم ہوا۔ اس کے سرانجام دینے والے نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) تھے تمام بیعت نامے ان کے دفتر میں محفوظ رہتے تھے۔ امیر صاحب نے اس ترکی جرمن، ہندی وفد کو یہ جواب دیا کہ جب تک امدادی فوجیں افغانستان نہ پہنچ جائیں اس وقت تک روس اور انگریز دونوں کے خلاف اعلان جنگ خلاف مصلحت ہے البتہ جس وقت ترکی جرمن فوج کا پیش خیمہ افغانستان پہنچ گیا اسی دن اعلان حرب کیا جائے گا۔ دوسری طرف روسیوں نے اور انگریزوں نے تمام راستے روک لئے تھے اور انگریزی فوج کا عراق پر حملہ محض اس پیش قدمی کے روک لینے کے لئے تھا۔ اسی دوران میں یہ بھی کہا جاتا کہ اگر روس کا خطرہ دفع ہو جائے تو سرحدی قومیں ہند پر حملہ کر سکتی ہیں اس خطرہ کو معلوم کرنے کے لئے ہندوستانی روسی وفد ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا محمد علی کا وفد تجویز ہوا تھا۔ جب روس کی قوت کمزور ہو گئی اور اس مشن کی معلومات سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ روس افغانستان پر حملہ نہیں کر سکتا تو نائب السلطنت کو جو لوگ ملتے تھے تو انہوں نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا تقاضا کیا۔ سردار نائب السلطنت نے اعلیحضرت سے ذکر کیا۔ امیر صاحب نے جرگہ بلایا جس میں تمام فوجی افسر اور قومی بزرگ شریک تھے امیر صاحب نے اس مسئلہ میں رائے طلب کی تو سوائے سردار معین السلطنت (سردار عنایت اللہ خاں صاحبزادہ امیر حبیب اللہ خاں) کے سب نے متفقاً یہ قرار دیا کہ لڑنا ضروری ہے اہل شوریٰ کو اس نقطہ پر جمع کرنا سردار نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) کی قوت کا مظاہرہ تھا امیر صاحب (اعلیٰ حضرت) حیران ہو گئے اور اپنے شاہانہ فیصلہ سے اس کو رد کر دیا۔ ایک معین السلطنت (سردار عنایت اللہ خاں) کیوں کر امیر کا ہم خیال رہا۔ اس کی حقیقت یوں ظاہر ہوئی کہ انگریزوں نے اس کو اسی شرط پر ولی عہد قبول کر لیا ہے۔ یہ عجیب بات دنیا سنے گی کہ حضرت صاحب چہار باغ کو جو کہ معین السلطنت کے مرشد تھے انگریزوں نے مکہ معظمہ سے اس خدمت کے لئے بلایا اور معین السلطنت کو اپنے قومی اور مذہبی فیصلہ سے علیحدہ رکھنے

میں کامیاب ہوگئے اور یوں خواب سنائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مامور کیا ہے کہ میں اس کام کو پورا کروں۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت اور سردار نائب السلطنت کا اتحاد ٹوٹ گیا اور افغانوں میں انقلابی آثار ظاہر ہونے لگے۔ سردار نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) کو یقین ہوگیا کہ اس تمام کارروائی سے مطلب میری ولایت (ولی عہد) کے فیصلہ کو انگریزوں کی تائید سے منسوخ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا اس نے انتظامی مشن کو ذرا ڈھیلا کر دیا اور سازشیں شروع ہونے لگیں۔ امیر حبیب اللہ عام باشندوں کی طرح اخلاقی عیوب سے پاک نہیں تھے۔ اب یہ مرض بہت ترقی کر گیا تھا اور شرفاء کی بہو بیٹیوں پہ ہاتھ دراز کرنے لگے تھے اس میں بعض عفیف عورتوں نے عصمت دری کے بعد خودکشی کرلی۔ سردار معین الدولہ امیر امان اللہ خاں تمام خوبیوں سے آراستہ تھے۔ ان کی والدہ ''علیا حضرت'' سے مخاطب یعنی مشہور تھیں۔ معین السلطنت کا مخالفین سے ملنا ان کا طبعی امر تھا جشن کی سیر میں رات کو امیر صاحب پر بالا خانہ سے گولیاں برسائی گئیں مگر امیر صاحب بچ گئے ابھی حرب عمومی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مستوفی الممالک نے اس کا الزام سردار معین الدولہ اور اس کے رفیقوں پر لگایا اس سے سردار نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) اور سردار معین الدولہ (امیر امان اللہ خاں) میں اتفاق ہوگیا۔ اس کے ساتھ محمود خاں طرزی اور سردار سپہ سالار (محمد نادر خاں) بھی مل گئے۔ اب یہ جماعت بہت قوی ہوگئی۔ یہ دونوں سردار معین الدولہ کے طرف دار تھے اور نائب السلطنت کو پسند نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں جس قدر ظلم اور داخلی نظام میں خرابیاں ظاہر ہوئیں ان کا ذمہ دار براہ راست سردار نائب السلطنت تھا۔ اس طرح جس کا لوگ تجربہ کر چکے ہوں اس کو دوبارہ بادشاہ نہیں دیکھتے۔ معین السلطنت (امیر عنایت اللہ خاں) ایک سادہ مزاج تھا ایسے سیاسی انقلاب میں اس پر اعتماد نہیں ہوسکتا تھا اور اس وقت تو وہ علانیہ باپ کا طرف دار تھا سردار امان اللہ خاں کی شرکت سے انقلاب کی تکمیل میں بہت آسانی ہوگئی۔ علیا حضرت صاحبہ (والدہ امیر امان اللہ خاں) امیر صاحب کی خانگی زندگی پہ حاوی تھیں امیر صاحب کو ان کے واسطہ سے پیغام پہنچایا گیا کہ اگر وہ اپنی بداخلاقی سے باز نہ آئے تو اُن کی خیر نہیں مگر اس کا اُن کے مزاج پہ اُلٹا اثر ہوا۔ اس طرح یہ ڈراما سوچا گیا کہ امیر صاحب

کو قتل کر دیا جائے تو وہاں نائب السلطنت کو امیر مان لیں تاکہ معین السلطنت (امیر عنایت اللہ خاں) کا حق زائل ہو جائے اور پھر نائب السلطنت کے مقابلہ میں امیر امان اللہ خاں آجائے اور ان کو ختم کر دیا جائے کئی موقعوں پر ذراسی فروگذاشت کی وجہ سے تمام کام بگڑتا رہ گیا۔ لیکن خدا کو منظور تھا اس لئے یہ سارا معاملہ بخیر وخوبی اس طرح انجام پذیر ہوا جس طرح سوچا گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے پہلے دن استقلال کا دعویٰ کیا اور ہم قید وبند سے آزاد ہو گئے۔ الحمد للہ علی ذلک۔

امیر امان اللہ خاں سے ہمارا تعارف

ہم نے بعض اشد ضرورتوں کی وجہ سے ڈاکٹر میر عزت بیگ سے ایک ہزار روپیہ ایک سال کے وعدہ پر قرض لئے تھے جب یہ مدت پوری ہونے کو ہوئی تو ہم مستوفی کے پاس نظر بند تھے روپیہ کہیں سے لے کر ادا نہیں کر سکتے تھے اور اس عدم ادائگی کا اثر ہمارے مستقبل پر بہت برا ہو گا۔ اسے ہم خوب سمجھتے تھے۔ ہم نے مجبوراً سردار معین الدولہ کی خدمت میں اپنی ضروریات مفصل لکھ کر عرض کیا کہ مکمل بارہ سو روپیہ ایک سال کے لئے ضرور دلوایا جائے۔ یہ دو سو روپیہ زائد ہم نے آغا سید علی بخاری کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لکھے تھے ایک عرصہ سے وہ بھی پشاور سے ہجرت کر آئے تھے اور امیر صاحب نے انہیں ہم سے علیحدہ نظر بند کر دیا تھا۔ جس وقت سید الاحرار مولانا محمد علی مغفور ہمیں رخصت کرنے کے لئے دہلی میں ملے آغا صاحب مرحوم ان کے پاس تھے۔ الغرض سردار معین الدولہ نے روپیہ شام کو مخفی مستوفی کے گھر پہنچا دیئے۔ اس سے پہلے ایک دفعہ سردار نے ہم کو اپنے پاس بلایا تھا اور مستقبل کے متعلق اشارہ کنایہ سے باتیں ہوتی رہیں یہ ملاقات ہمارے خاص کاموں میں سے تھی۔ خدا کے فضل سے اس میں کامیاب رہے۔ ہمارے متعلق مفصل معلومات سردار معین الدولہ کو سرداران محمود طرزی اور سپہ سالار سے ملتی رہتی تھیں۔ شروع میں ہم شیخ ابراہیم سے ملے تو اُس نے ہمیں دولت افغانیہ کے تمام اراکین کے متعلق مفصل اطلاعات دیں۔ جب سردار نائب السلطنت اور سردار معین السلطنت کے معاملات بتلا چکے تو۔ آخر میں کہتے ہیں کہ پس پردہ ایک اور قوت ہے جو نہایت سنجیدگی سے باقاعدہ بڑھ رہی ہے اور وہ سردار معین الدولہ ہے اس کے بعد اول ہماری ملاقات

ان سے نہ ہو سکی۔ مگر جب کبھی ہم ان سے ملے تو اس طرح جیسے بادشاہ ہونے والے شہزادے سے ملنا چاہیئے۔ جب امیر حبیب اللہ خاں جلال آباد میں قتل ہوئے اس وقت ہم مستوفی کے گھر نظر بند تھے اور مولانا سیف الرحمٰن کی زیر نگرانی رہتے تھے مولانا سیف الرحمٰن کے کاموں سے متجاہل بن کر ان سے معاملہ کرتے رہے اس میں ہمیں بعض سخت تکلیفیں پہنچیں۔ مولانا نہیں چاہتے تھے کہ ہمیں واقعات کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوں۔ مگر خدا کی قدرت اڑتی چڑیا ہمارے کانوں میں بہت کچھ کہہ جاتی تھی۔ بعض حصّہ ہم فوراً سمجھ لیتے۔ بعض اوقات واقعہ گذرنے پر حقیقت منکشف ہو جاتی۔ جب جلال آباد پہنچے تو ایک ہفتہ تک ہم پریشان اور دیہات میں پھرتے رہے۔ جب امیر امان اللہ خاں کابل میں مستقل ہو گئے تو انہوں نے ہمیں جلال آباد سے طلب فرمایا۔ جب ہم دربار میں حاضر ہوئے تو مسکرا کر فرمایا "من ہموں ہستم" اس خاص ملاقات کی طرف اشارہ فرمایا۔

(ذاتی ڈائری از صفحہ ۲۵ تا ۱۴۰)

امیر امان اللہ کا عہد حکومت ابتدا میں

اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی سلطنت میں چند روز ہم نے اپنی حکومت کی ذرا سی جھلک دیکھ لی۔ جس قدر وہ اپنے وزراء کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے ہمارے ساتھ ان کا معاملہ اسی کے قریب قریب تھا۔ ہم ان کی پرائیویٹ مجلسوں میں شامل ہوتے تو جیسے وہ اپنے خاندان اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے تھے ہم سے ان کا برتاؤ اسی طرح کا ہوتا۔ ہم نے کوئی مشورہ عرض نہیں کیا جو قبول نہ فرمایا ہو۔ ہم نے کوئی سفارش نہیں کی جو رد کر دی گئی ہو ایسی حالت میں ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا ہم نے سلطنت افغانستان کے مستقبل و مستحکم بنانے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ یہ تمام سیاسی معاملات ابھی تک تاریخ کے درجہ تک نہیں پہنچے اس لئے ہم تفصیلات نہیں لکھ سکتے۔ حضرت مولانا شیخ الہند کی وفات پر جس شان بے نظیر سے مجلس فاتحہ خوانی منعقدہ کی وہ ایک یادگار رہے میں اس تقریر کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں "مولانا محمود الحسن یک کار را شروع کردند من او را پورا میکنم" راجہ مہندر پرتاب جب یوروپ سے واپس آئے اور اعلیٰ حضرت سے خاص ملاقاتیں کر چکے تو اعلیٰ حضرت کو آئیڈیل کنگ لکھا کرتے تھے۔ ہم نے اعلیٰ حضرت سے ہندوستانی تعلیم گاہ کھولنے کی اجازت مانگی تھی۔ لیکن برٹش وزیر نے افغان وزیر خارجہ

کو اس کے خلاف راضی کر دیا کہ ہمیں ہندوستانی یونیورسٹی کے لئے موقع نہیں دیا جائے گا۔ مگر اس کی قیمت اسے کافی مقدار میں ادا کرنی پڑی۔ اگر ہمارے رفقاء نوجوانوں کا مستقبل ہمارے سامنے نہ ہوتا اور حکومت موقتہ کی بعض کارروائیوں میں ہمیں ضروری شکست نہ ہوتی تو ہم اعلیٰ حضرت کی سلطنت سے شاید باہر جانے پر راضی نہ ہوتے جب سے کابل میں شیخ محمد ابراہیم کی جگہ مرزا محمد علی عرف احمد حسن کو اپنا شریک عمل بنایا اسی وقت احمد حسن کا مددگار ظفر حسن تجویز کر لیا تھا۔ جب احمد حسن یا محمد علی اشتراکی جماعت میں شامل ہو گیا تو ہمارا معتمد اس زمانہ میں ظفر حسن رہا۔ افغانی انگریزی محاربہ میں ظفر حسن سردار سپہ سالار کے ساتھ ٹل کے محاذ پر تھا۔ وہاں اس کے کارنامے بہت زیادہ تحسین کے قابل سمجھے گئے اور سلطنت افغانیہ اسے برائے نام خدمت کرنے پر معزز تنخواہ دیتی رہی جس سے ہمارے کئی ہندوستانی بھائی گذارہ کرتے رہے ظفر حسن کے مددگار اللہ نواز خاں مقرر ہوئے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ظفر حسن کے ہم جماعت تھے۔ افغانی انگریزی محاربہ میں وہ ہندوستان بھی آئے کابل سے رخصت ہونے پر ہم نے اپنی تمام دستاویزات ان کی تحویل میں رکھ دی تھیں۔ کہتے ہیں کہ سقاء کے فتنہ میں وہ تمام کاغذات کھوئے گئے ہمیں بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاغذات برٹش حکومت کے ہاتھ آ گئے ہیں۔

اللہ نواز نے سقاء کے مقابلہ میں خوب کام کیا اس لئے افغانستان کی موجودہ حکومت میں وہ ایک معزز کارکن مانے جاتے ہیں مہاجرین کی کثیر تعداد میں ہمارے بعض عزیز بھی ہم سے ملے مولوی احمد علی کو ہم نے ہندوستان واپس بھیجنا ہی مناسب خیال کیا۔ منت سے ہم اسے اس پر راضی کر سکے۔ ڈاکٹر نور محمد سندھی حیدر آباد سے پہنچ گئے تھے وہ ہمارے ساتھ رہے حکومت موقتہ کا کام جب اعلیٰ حضرت نے روک دیا تو ہم نے کابل کانگریس کمیٹی بنا دی۔ جس کا روح رواں ڈاکٹر نور محمد تھا اس کا الحاق گیا کانگریس میں منظور ہو گیا۔ ڈاکٹر نور محمد ہماری کانگریس کمیٹی کا افسر تھا مہاتما گاندھی اور کانگریس کے نوجوان ممبر اسے جانتے تھے۔ ہمارے مکرم ڈاکٹر انصاری کانگریس کے سکیرٹری تھے اس لئے یہ الحاق کا مسئلہ آسانی سے طے ہو گیا۔ ہماری کانگریس کمیٹی سب سے پہلے وہ کمیٹی ہے جو برٹش امپائر سے باہر قائم ہوئی تھی۔ تیسرے نوجوان جن کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں وہ شیخ محمد اقبال شیدائی ہیں مہراصولہ سیالکوٹ

اور شیدائی بھی سیالکوٹی ہیں ہم وطن کی محبت میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوئے شیدائی صاحب سے ہمارا پرانا کوئی رشتہ نہیں تھا اس لئے خیالات میں ہم زیادہ متفق نہ ہوئے ہوں مگر عملاً ایک بن گئے تھے۔ اور آگے چل کر خالی افتراق بھی کم ہوگیا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ میرا بھتیجا عزیز احمد پہلے پہنچ چکا تھا میرے ساتھ جو تین آدمی آئے تھے ان میں سے ایک میرا بھتیجا محمد علی بن حبیب اللہ تھا راجہ صاحب کے گھر پر میں نے محمد علی کو بھیجا تھا اور قندھار کے محاذ پر سردار اعتماد الدولہ کی خدمت میں اس کو معین کیا تھا۔ سردار اعتماد الدولہ نے اس کی خدمات کے اعتراف میں خاص خلعت سے سرفراز فرمایا تھا میرے یہ دونوں عزیز میری خاص خدمات کے متکفل رہے کھانا کپڑا دولے کے متعلق مجھے کسی دوسرے کی امداد کی ضرورت نہ ہوتی ہماری کابل کی زندگی کے آخری ایام میں مولانا محمد علی مولانا شوکت علی مولانا حسین احمد جیل میں تھے اور ہمارے رفیقوں کو ہم سے علیحدہ کرنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ ایسے حالات میں آرام سے بیٹھ کر شاہی مہمانی کا لطف اٹھانا ناممکن تھا۔ سوویٹ ایشیا سے تعلقات کی ابتدا اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ کی اجازت اور مصلحت سے بر روئے کار آئی جس میں راجہ مہندر پرتاپ نے کافی حصہ لیا۔ انھیں کی تجویز پر ہمارے نوجوان آنے جانے رہے جب ماسکو میں ہندوستانی اشتراکی جماعت قائم ہوئی اور اس کا مرکز تاشقند قرار دیا گیا تو اس کے لیڈر جو بندر ناتھ رائے مقرر ہوئے جو اسے کچھ سال تک چلانے رہے اس لئے ہمارے دوست بن گئے۔ اب ہم نومبر ۱۹۲۲ء میں دریائے جیحوں عبور کر کے ترمذ میں سوویٹ کارندوں کے مہمان ہوئے اور دنیا کی انٹرنیشنل سیاست کا نیا مشاہدہ شروع کر دیا۔ ہم نے اپنے حالات کسی قدر اختصار سے اپنے سیاسی پروگرام کے شروع میں لکھے ہیں اور مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے بعض واقعات زندگی عرب دوستوں کی واقفیت کے لئے عربی میں لکھے۔ مگر یہ بات ہمیشہ محسوس ہوتی رہی کہ اگر کسی قدر حالات کابل کے قیام اور وہاں سے رخصت ہونے کے متعلق مستقل تحریر نہ کریں گے تو اس اختصار کو سمجھنا بہت مشکل ہوگا۔ الحمد للہ آج اس سے بھی فارغ ہوئے وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وآلہ وصحبہ وسلم وآخر دعوانا

ان الحمد للہ رب العالمین ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۵۲ھ بلدۃ الحرام حارۃ الباب عبید اللہ سندھی سابق ناظم جمعیۃ الانصار و سابق ناظم نظارۃ المعارف دہلی۔

(ذاتی ڈائری از صفحہ ۳۲ تا آخر) از مولانا عبید اللہ مرحوم

مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم پر اجمالی نظر | مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم آزادی ہند کے نصب العین پر کابل بھیجے گئے

اور سات سال وہاں رہے پھر سات مہینہ ماسکو (روس) میں تین سال انگورہ (ٹرکی) میں پھر تقریباً بارہ سال مکہ معظمہ میں غرض کہ پچیس برس پردیس میں گذارنے کے بعد مارچ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس ہوئے۔ جس مقصد اور نصب العین کے لئے اس جلاوطنی کو ان کیواسطے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مقرر فرمایا تھا۔ وہ پھولوں کی سیج نہ تھی بلکہ نہایت کٹھن اور کانٹوں سے بھری ہوئی وادی تھی جس میں قدم قدم پر موت کا خطرہ اور مصائب کا انبار تھا مولانا موصوف نے جس جوانمردی اور مستقل مزاجی سے ہلاکت سے بھری ہوئی مصیبتوں کو جھیلا ہے اور ملک و وطن اور تمام ملت ہندوستانی اور مسلمانوں کے لئے جدوجہد کی ہے وہ صرف انکا حصہ تھا باوجودیکہ قدم قدم پر مشکلات طرح طرح کی پیش آئیں اور اپنوں اور معتمد علیہ لوگوں نے خیانتیں بھی کیں مگر انہوں نے مایوسی کو راہ نہ دی اور نہ انکا قدم ڈگمگایا ان کی جدوجہد اور کوشش جاری رہی اور پھر مختلف قسم کی کامیابیوں نے قدم بھی چومے۔ اگرچہ مولانا موصوف نے بہت سے واقعات کو اپنی اس ڈائری میں ظاہر نہیں فرمایا ہے تاہم اس مفصل بیان میں موصوف کی ذکر کردہ کارروائیوں سے اہل بصیرت عمدہ سے عمدہ نتائج نکال سکتے ہیں کہ موصوف نے کابل پہنچ کر ہندوستان کی آزادی کی راہ میں وہ کامیابیاں حاصل کیں جو کہ بغیر ان کے حاصل نہیں ہو سکتی تھیں اور جن کا حاصل ہونا از بس ضروری تھا (الف) انہوں نے جرمن ممبران مشن کو ہندوستان کی آزادی اور مستقبل کے متعلق صحیح پوزیشن اور حکمت عملی سمجھائی اور ان کو منوایا (ب) راجہ مہندر پرتاپ صاحب کو صحیح راستہ سمجھایا اور ان کو متفق کیا اور غلط راستہ سے ہٹایا (ج) انہوں نے روسی مشن، جاپانی مشن، ترکی مشن میں عمدہ سے عمدہ اور مفید کارروائیاں انجام دیں اگرچہ موانع خارجیہ کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی بلکہ

کامیابی نہیں ہوئی بلکہ ممبروں کی بعض کمزوریوں نے نقصان بھی پہنچایا (د) انھوں نے اپنا قوی اثر اراکین دولت افغانیہ میں پیدا کیا۔ اگرچہ امیر حبیب اللہ خاں صاحب کو جنگ آزادی پر عملی طور سے آمادہ نہ کر سکے اور انگریزوں کی ان کے پہنچنے سے پہلی ڈپلومیسی اس میں رکاوٹ ہوئی تاہم امیر صاحب مرحوم نے بہت زیادہ تاثر حاصل کیا اور ان کے لئے مفید مشورے دیئے جس میں سے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت بھی ہے اور ان کے لئے کامیابیوں کی راہ نکالی (ہ) انھوں نے عموماً طور سے اراکین دولت افغانیہ کو اپنا ہم خیال بنالیا جس کا کھلا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ روسی مشن کی واپسی کے بعد جب امیر صاحب شہید نے جرگہ بلا کر انگریزوں سے جنگ کی رائے لی تو تمام ممبران جرگہ انھیں کے ہم خیال اور ہم زبان تھے۔ بجز سردار عنایت اللہ خاں کوئی بھی جنگ آزادی میں امیر شہید کا ہمنوا نہ ثابت ہوا جس کو دیکھ کر امیر صاحب مرحوم حیران ہو گئے اور اپنے خصوصی اختیار ملوکانہ سے ان کے اتفاق رائے کو رد کیا جس کا نتیجہ نہایت قبیح صورت میں ظاہر ہوا (و) انہوں نے آئندہ آنے والے امیر امان اللہ خاں کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ اقتدار پا جانے کے بعد بالکل ان کے ہم خیال پائے گئے اور استقلال کابل دولت افغانیہ کا اعلان کر بیٹھے۔ (نوٹ) چونکہ انگریزوں نے امیر عبدالرحمن خاں مرحوم کو روس سے بلا کر تخت کابل پر بٹھایا تھا اس لئے وہ دولت افغانیہ کو اپنی ماتحت ریاست شمار کرتے تھے۔ فارن پالیسی میں وہ ہر طرح انگریز کی دست نگر رہتی تھی اور مثل حیدرآباد وغیرہ برطانیہ کی محتاج تھی۔ کسی خارجی ملک میں کوئی کام نہیں کر سکتی تھی۔ اور نہ براہ راست ان سے کوئی تعلق قائم کر سکتی تھی اس لئے سر ترقی میں رکاوٹ ہوتی تھی۔ اس اعلان استقلال پر انگریزی حکومت چراغ پا ہو گئی اور بالآخر افغان انگریز جنگ ظہور پذیر ہوئی (ز) اُنہوں نے تدابیر جنگ میں پورا حصہ لیا اور سرحد پر جنود اللہ جماعت کے مخلص اور جانباز نمائندے سرداروں کے ساتھ کئے جن کی مساعی کی حکومت افغانیہ نے نہایت قدر کی فقط مشرقی محاذ پر کوئی نمائندہ نہ ہونے کی وجہ سے خیانت ہوئی اور پسپائی کی نوبت آئی تاہم فتحیابی دولت افغانیہ کی رہی اور برطانیہ کو استقلال افغانستان تسلیم کرنا پڑا اسی پر سمیفرے سفیر برطانیہ کابل کہتا ہے

کہ یہ فتح دولت افغانیہ کی نہیں بلکہ عبیداللہ کی ہے اس استقلال کے بعد دولت افغانیہ مثل ممالک مستقلہ آزاد تسلیم ہونے لگی (ح) انہوں نے راجہ مہندر پرتاپ کی عزت اور منزلت ایسی دولت افغانیہ میں بڑھوادی کہ جس کا وہم وگمان بھی ان کو اور دوسروں کو نہ تھا۔ (ط) انہوں نے ممبران جنود اللہ اور دیگر ہندوستانی نوجوانوں سے ایسے ایسے کام لیے کہ دولت افغانیہ اور اس کے ارکان نہایت ممنون اور شکر گزار ہوئے (ی) انہوں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی تحریک کو اس قدر بلند اور مقبول کر دیا کہ امیر امان اللہ خاں صاحب نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر نہایت اخلاص سے بے نظیر شان کے ساتھ مجلس فاتحہ خوانی منعقد فرمائی اور اس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا مولانا محمود الحسن یک کار را شروع کردند من او را پورا میکنم ، جس سے نہ صرف حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ہم خیالی اور ہم نوائی معلوم ہوتی ہے بلکہ ظاہر ہوتا ہے کہ امیر موصوف پختہ ارادہ اور عمل آزادی ہند اور انگریزوں کے نکالنے کا کر رہے تھے یا کرنے والے تھے اسی سے انگریزی قصر شہنشاہیت میں زلزلے پیدا ہوئے اور امیر موصوف کے خلاف تدبیریں کی گئیں تا اینکہ تخت کابل سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مولانا عبیداللہ صاحب کی یہ نہایت عظیم الشان کامیابی تھی جس کے لئے کابل کو مرکز بنایا گیا تھا۔ مولانا عبیداللہ صاحب نے جو کامیابیاں صیغۂ راز میں رکھی ہیں۔ اور ان کے متعلق صفحہ ۱۴۳ پر فرماتے ہیں۔

"یہ تمام سیاسی معاملات ابھی تک تاریخ کے درجہ تک نہیں پہنچے اس لئے ہم تفصیلاً نہیں لکھ سکتے"

نہ معلوم کیا ہوں گے مگر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظیم الشان امور ہیں ، بہرحال سرسری نظر سے دیکھنے والا انسان ان مذکورہ نتائج کو ضرور سمجھ سکتا ہے نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب ہند کے لئے اُنھوں نے بار بار تحریریں ہندوستان میں بھیجی جن میں سے بعض میں کامیابی ہوئی اور بعض میں خیانتیں ہوئیں جن میں سے وہ خطوط اور تحریریں بھی تھیں جو کہ کپڑوں پر لکھی گئیں جن کو معتمد علیہ عبدالحق نومسلم نے ایک خاں بہادر حق نواز خاں تک پہنچا دیں اور اس نے انگریز حاکم سر مائیکل اڈوائر کو دیدیں دیہ نہیں معلوم کہ ان میں کیا مضمون تھا ، علاوہ ازیں بہت سی تحریریں اور کاغذات بہت مرتبہ چوری بھی ہوتے جن کی وجہ سے

انگریزوں کو بہت سے رازہائے سربستہ معلوم ہوئے اور انھیں کی بنا پر رولٹ رپورٹ مرتب کی گئی جس کا ہم عنقریب ذکر کریں گے یہ امور حقیقتاً عام ہندوستانی پبلک کے جذبات کے ترجمان ہیں۔ اسی قسم کے جذبات کے نام پر انگریز، فرانس اور روس وغیرہ ہمیشہ یورپین اقوام کے بارہ میں انقلاب کی حمایت اور تائید کرتے رہے ہیں۔ اور یونان بلگیریا مانٹی نگرو سرویا کریٹ رومانیہ، ہنگری گونیا۔ ارمینیہ وغیرہ کو اس کے عشر عشیر پر آزاد کراتے رہے ہیں۔

افسوس کہ مولانا عبیداللہ صاحب قبل از خروج انگریز ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء بمقام دین پور وفات پاگئے۔ (۱۱ اللہ ۱۲۱ ایہ راجعون)

(۲) مولانا مرحوم کے علاوہ جن مشاہیر کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریک میں ہمنوا اور ہم خیال بنایا ان میں سے نہایت سرگرم ممبر جناب حاجی ترنگ زئی صاحب بھی ہیں۔

ترنگ زئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور میں موضع اتمان زئی (جس کے رہنے والے خان برادر عبدالغفار اور ڈاکٹر خاں صاحب ہیں) کے قریب ایک گاؤں ہے حاجی صاحب موصوف اسی گاؤں کے باشندے تھے ان کا نام نامی فضل واحد تھا۔ لوگوں میں اپنے نام سے مشہور نہ تھے۔ نہایت متقی پرہیزگار اور صاحب علم وعمل اور مشہور پیران طریقت وسلوک میں سے تھے اور حضرت مولانا شاہ نجم الدین صاحب مرحوم معروف بہ ہڈے ملا کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ حضرت مولانا نجم الدین صاحب (ہڈے ملا) حضرت مولانا شاہ عبدالغفور سواتی معروف بہ حضرت سوات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور جانشین تھے حضرت سوات صاحب اور حضرت ہڈہاے ملا صاحب ان اطراف (صوبہ سرحد) میں بہت زیادہ باثر غیور مجاہد گذرے ہیں۔ ان حضرات نے اپنے اپنے زمانہ میں انگریزی اقتدار کے خلاف سالہا سال علم جہاد بلند رکھا تھا اور انگریزی اقتدار کو حد سے زیادہ نقصان پہنچاتے رہے تھے حریت اور آزادی کے جذبات ان کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھے حاجی فضل واحد صاحب (حاجی ترنگ زئی صاحب) بھی اپنے پیران طریقت کے قدم بہ قدم تھے۔ جذبات حریت و آزادی اور جہاد دینی کے حد سے زیادہ دلدادہ تھے۔ انگریزی علاقہ ضلع پشاور میں

خدمات دینیہ تبلیغ اور تسلیک میں ابتداء سے مشغول تھے۔ ضلع پشاور اور یاغستان میں ہزار ہا ہزاران کے مریدین اور مخلصین تھے اور انتہائی شہرت اور مقبولیت کے مالک تھے۔ ان اطراف میں عام مسلمانوں میں جس قدر قبولیت ان کی تھی کسی دوسرے پیر کی نہ تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے بار بار مولانا عبیداللہ صاحب اور مولانا عزیز گل صاحب کو ان کی خدمت میں بھیج کر اپنے مشن میں داخل کیا اور جہاد حریت کے لئے آمادہ کیا اور استدعا کی کہ وہ اپنے وطن سے آزاد علاقہ (یاغستان) میں ہجرت کر کے چلے جائیں اور وہاں کے مرکز کو سنبھالیں اور اپنے شاگردوں کو (جو کہ بیشمار تھے اور اپنے اپنے علاقوں میں تعلیم و تدریس وغیرہ میں مشغول تھے) لکھا کہ وہ حاجی ترنگزئی صاحب کی تابعداری کریں اور ان کی امداد و اعانت میں کسی کوتاہی کو روا نہ رکھیں چنانچہ ۱۹۱۴ء میں اعلان جنگ عمومی کے بعد حاجی ترنگ زئی صاحب وہاں پہنچے اور جہاد آزادی کے جھنڈے کو بلند کیا اور پلٹنیں کی پلٹنیں صاف کر دیں۔ کیونکہ یہ جنگ پہاڑی مقامات میں واقع ہوئی یہ جماعت مجاہدین کی پہاڑی مقامات کی جنگ سے بخوبی واقف اور ماہر تھی بخلاف انگریزی فوجوں کے کہ وہ میدان کی لڑائیوں میں تو کچھ کام توپوں، ٹینکوں، مشین گنوں وغیرہ کے سایہ میں کر لیتے تھے مگر پہاڑوں میں بالکل ناکامیاب رہتے تھے۔ ان مجاہدوں کو نشانہ لگانے میں اس قدر مشق تھی کہ ان کا کوئی نشانہ خطا نہیں جاتا تھا اور نہ کوئی کارتوس ضائع ہونے پاتا تھا۔ پہاڑوں میں پتھروں چٹانوں اور جھاڑیوں کی آڑ سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے تھے اور انگریزی فوجیوں کو جو کہ میدان اور نیچی سطحوں میں صف باندھے توپوں اور مشین گنوں اور ٹینکوں کو استعمال کرتے رہتے تھے نشانہ بنا کر برباد کر دیتے تھے۔ اس کی وجہ سے انگریزی فوجیں مالی اور جانی نقصان سے بہت زیادہ دوچار ہوئیں نیز جنگ عمومی کی وجہ سے تجربہ کار اور پرانی آزمودہ کار فوجیں بلجیم فرددن وغیرہ یورپ وغیرہ کے میدانوں میں بھیج دی گئی تھیں۔ ہندوستان میں بہت کم تعداد اور نوآزمودہ سپاہی اور پلٹنیں باقی رہ گئیں تھیں۔ غیور اور بہادر سرحدیوں اور مجاہدوں کے مقابلہ میں پرانی اور آزمودہ کار برطانوی فوجوں کے چھکے چھوٹ چکے تھے جیسا کہ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۸ء تک چار مرتبہ حملے کر کے برطانوی افسر دیکھ چکے تھے۔ اور

بالآخر ڈیوائڈ اینڈ رول (تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو) اور زرپاشی (سونا بہاؤ) کی پالیسی عمل میں لاکر جان چھڑائی تھی۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء کی لڑائی کی مہم کے متعلق ڈبلو ڈبلو ہنٹر فوجی معتمد افسروں سے نقل کرتے ہوئے صفحہ ۴۹ میں لکھتا ہے "۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کرنا دنیا کے ترپن ہزار (۵۳۰۰۰) جنگجو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے ملک کے دشوار گذار ہونے کی وجہ سے ہمارے سرحدی افسر قبائل کے مزاج اور ان کے آپس کے تعلقات کے متعلق اکثر متذبذب رہتے ہیں اور جب کبھی ان باغیوں کو شکست ہوتی ہے تو وہ صرف مہابن کے اندر دشوار گزار دروں میں چلے جاتے ہیں (ص ۴۷ ہمارے ہندوستانی مسلمان) ڈاکٹر ہنٹر، پھر وہ تفصیلی واقعات افسران فوج سے نقل کر کے برطانوی فوجوں کی ناکامی، پسپائی، مشکلات، بربادی وغیرہ کا نقشہ کھینچتا ہے حالانکہ حکومت ہند وپنجاب اور ملٹری افسروں کی ہر قسم کی امداد کے پہنچنے کو تسلیم کرتا ہے دیکھو از صفحہ ۴۸ تا صفحہ ۵۸

"طرح طرح کے نقصانات اور مصائب کو لکھنے کے بعد اخیر میں کہتا ہے۔ کہ بہر حال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں۔ پنجاب گورنمنٹ نے اس مہم کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس سے پہلے اور کسی موقعہ پر بھی کوہستان میں اس قدر شدید اور دیر پا جنگ نہیں ہوئی اور یہ کہ ان مجاہدین نے قبائل کا ایک خطرناک اتحاد پیدا کر لیا تھا اور اس اتحاد میں ان کی رائے کو بہت وقعت حاصل تھی۔ نیز مجاہدین بے ضرر اور بے طاقت مذہبی مجنون نہیں ہیں بلکہ یہ ہندوستان میں ہماری سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہیں الخ" ص ۶۰ ہمارے ہندوستانی مسلمان

دوسری جگہ لکھتا ہے مجاہدین نے سرحدی قبائل میں جو اقتدار حاصل کر لیا تھا ہم نے اس کا غلط اندازہ لگایا تھا وہ لوگ جوان کے ساتھ مذہب کی بناء پر شامل ہوئے تھے فتح یا شہادت کی امید پر بڑے پرجوش اور بے صبر ہو رہے تھے اور وہ قبائل جو ذرا کم متعصب تھے انہیں اس خدشہ کو کام میں لاکر اکسایا گیا تھا کہ ان کے

علاقہ پر انگریزی فوجیں چڑھ آئی ہیں یا ان کا علاقہ میدان جنگ بنایا گیا ہے اس طرح شوق رفاقت نے قبائلی لوگوں میں آگ لگادی تھی اور وہ تربیت یافتہ فوج کی ہر کوشش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔" (ہندوستانی مسلمان ص۵۷)

پھر آخر میں لکھتا ہے "جس کام کو ہماری فوج سرانجام نہ دے سکی اسے اندرونی اختلافات اور ڈپلومیسی اور حکمت عملی نے پورا کرنا شروع کر دیا اس سے پہلے ۲۵ نومبر کو پشاور کا کمشنر بونیر کے بعض قبائل کے اتحاد کو توڑنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس نے ایک اور گروہ کو جس کی تعداد ۲۰۰۰ تھی اپنے گھروں کو واپس جانے کے لئے بھی آمادہ کر لیا تھا اور سوات کے پیشوا کو بھی اپنے خاص مریدوں کو منتشر کرنے پر راضی کر لیا تھا بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برگشتگی کو بھانپ کر خود علیحدہ ہو گئے اور باقی ماندہ لوگوں میں بے اعتمادی کا بیج بو گئے (الخ)" ص۵۸ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔

یہ تمام وہ امور جو کہ پہلی مہمات ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۷ء وغیرہ میں واقع ہوئے تھے ان سے بدرجہا زائد اس مہم ۱۹۱۴ء میں جمع ہو گئے تھے کیونکہ علاوہ ان امور کے جو مقامی طور پر سرحد میں روزمرہ پیش آتے رہتے ہیں طرابلس، بلقان ٹرکی وغیرہ میں پیش آچکے تھے جنگ لیبیا اور طرابلس غرب اور جنگ بلقان کے خونیں واقعات مدتوں سے طشت از بام ہو رہے تھے دولت عثمانیہ (ٹرکی) کو جنگ میں کھینچا جا چکا تھا اس کے جنگی جہازوں کے چھین لینے وغیرہ کے غاصبانہ امور نے مجاہدین اور قبائل کو حد سے زیادہ مشتعل کر دیا تھا۔ اور ہر طرف یہ مشہور تھا کہ مسلمانوں کی رہی سہی حکومت اسلامی ترکی کو بھی عیسائی یورپین طاقتیں صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لئے کھڑی ہو گئی ہیں جنگ عمومی کی چنگاریاں ہر طرف سلگ گئی تھیں۔ اس لئے بعید اور بیشمار جوش پھیلا ہوا تھا جس کو تحریک آزادی کے ارکان بڑی قوت کے ساتھ تمام مجاہدین اور قبائل میں پھیلا چکے تھے اور پھیلا رہے تھے چنانچہ حاجی ترنگ زئی صاحب اور ان کے رفقاء نے بہت مستعدی اور جوانمردی کے ساتھ اس کا انتظام کیا یہ انتظامات ایسے امور نہ تھے۔ کہ راز سربستہ بن کر رہ جاتے انگریزی محکمہ خفیہ پولیس نے (جو کہ صوبہ سرحد میں بہت سرگرمی ہمیشہ سے رکھتا تھا اور اس زمانہ میں جنگ عمومی کی

وجہ سے اس کی سرگرمیاں بہت ہی زیادہ اندرون ہند اور سرحد میں بڑھ گئی تھیں اور اس کے کارکنوں کا جال چاروں طرف آزاد علاقہ کے گاؤں گاؤں اور چپہ چپہ پر پھیلا ہوا تھا۔ ذرہ ذرہ کی خبریں حکام برطانیہ کو پہنچاتیں چنانچہ پیش بندی کے طور پر انگریزی فوجیں قدیمی سرحدوں سے آگے یاغستان میں میلوں داخل ہو گئیں اور متعدد مقامات پر قبضہ کر لیا۔ مجاہدین کب صبر کر سکتے تھے انہوں نے نہایت جوش اور جوانمردی سے یکے بعد دیگرے ایسے زوردار متواتر حملے کئے کہ پلٹنوں کی پلٹنیں گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالیں اور پھر فوجیں آگے بڑھ گئی تھیں ان کی امداد اور رسد بند کر دی۔ اس طرح ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کا وارا نیارا ہو گیا اور سامان تو کروڑوں کا تلف ہو گیا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ پہاڑی جنگ میں مجاہدین ہمیشہ کامیاب ہوتے رہے ہیں اور اعلیٰ درجہ کی مہارت جنگ اور پہاڑی تحفظات کی بنا پر انگریزی باضابطہ اور میدانی فوج ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا انگریزی فوجیں توپوں اور مشین گنوں اور ٹینکوں وغیرہ سے حملے کرتی تھیں مگر یہ سب چیزیں ضائع جاتی تھیں اور مجاہدین پہاڑوں کے دروں اور چٹانوں کی آڑ اور اونچے مقامات وغیرہ سے ایسے کارتوس اور گولیاں برساتے تھے جو کہ ضائع ہونا جانتے ہی نہ تھے (حدود افغانستان میں کارتوس پیسے پیسے پر فروخت ہوتا تھا اس لئے بافراط موجود تھا۔ افغانستان اگرچہ بظاہر انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ مگر ہتھیاروں کے متعلق اس کے حدود میں کوئی بندش نہ تھی اور نہ آج تک ہے) خلاصہ یہ کہ چند مہینوں کی جنگ میں انگریزوں کو انتہائی نقصان جان و مال کا اٹھانا پڑا اور تمام بلند دعاوی اور اولوالعزمیاں خاک میں مل گئیں بالآخر وہی پرانا طریقہ جو کہ پہلی جنگوں میں اور آڑے وقتوں میں انگریز اختیار کرتے رہے یہاں بھی کرنا پڑا۔ امیر حبیب اللہ خاں کو درمیان میں ڈالا گیا اور سرداران قبائل اور مجاہدین کو توڑ کر اور زرپاشی کی سبیل اختیار کرکے بچی کھچی سپاہ کو واپس لانا پڑا جس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ اشرفیوں اور روپیوں کی بھرمار کرکے دیہات یاغستان کے سرداروں کو توڑ لیا اور یہ پروپیگنڈہ کرایا کہ جہاد بغیر بادشاہ کے شریعت اسلامی میں درست نہیں مسلمانوں کے بادشاہ

ان اطراف میں امیر کابل امیر حبیب اللہ خاں ہیں تم ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کر کے منظم ہو جاؤ۔ جب امیر صاحب اٹھیں اور علم جہاد بلند کریں سب ان کے ساتھ ہو کر جہاد کرنا سردار نائب السلطنت امیر نصر اللہ خاں اس کے ناظم بنائے گئے اور تمام بیعت نامہ کے کاغذات ان کے پاس جمع ہونے لگے۔ اس پروپیگنڈے پر پانی کی طرح روپے بہائے گئے نتیجہ یہ نکلا کہ مجاہدین کی قوت کمزور ہو گئی۔ چند لڑائیوں کے بعد جن میں مجاہدین کو کامیابی اور انگریزوں کو ناکامی ہوئی تھی پانسہ پلٹ گیا۔ ادھر تو مجاہدین رسد اور کارتوس کے خرچ ہو جانے کی وجہ سے پورے اجتماع کو سنبھال نہ سکے تھے ادھر دیہاتوں کے مکھیا اور سرداران قبائل لوٹ گئے ادھر عوام امیر کابل کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اپنے جوش و خروش کو قائم نہ رکھ سکے بالآخر حاجی صاحب اور ان کی جماعت کو چند مہینوں کے بعد شکست پر شکست اُٹھانی پڑی اور جماعت میں انتشار ہو گیا۔ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم ڈائری صفحہ ۱۲۵ پر لکھتے ہیں۔

> "انگریزوں نے کافی روپیہ امیر کو دیا کہ یاغستان میں تقسیم کرے اور اپنی سلطنت کے نام پر قبائل افغانیہ سے بیعت نامہ حاصل کرے اور پشاور میں افغانوں کو کہا جاتا کہ امیر کابل جہاد کرے تو اس وقت تم بے شک جہاد میں شریک ہو جاؤ لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد ناجائز ہے اس عام بدنظمی سے پرہیز کرو۔ اسی طرح حاجی ترنگ زئی اور دوسرے مجاہدین کا کام رک گیا۔ بلکہ حاجی ترنگ زئی کے آدمی اور ہندوستانی مجاہدین کے کارندے سب اسی کام پر مامور ہو گئے کہ وہ امیر کابل کے نام بیعت نامے حاصل کریں یہ انگریزی روپیہ انھیں لوگوں کے ہاتھ یاغستان میں تقسیم ہوا۔ اس کے سرانجام دینے والے نائب السلطنت (امیر نصر اللہ خاں) تھے تمام بیعت نامے ان کے دفتر میں محفوظ رہتے تھے۔"

پہلے سے امیر حبیب اللہ خاں صاحب سے چونکہ معاہدہ ہو چکا تھا اس لئے انگریز مطمئن تھے کہ وہ ہرگز انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے کھڑے نہ ہوں گے

اس لئے یہ کھیل کھیلا گیا معاہدہ میں امیر صاحب کو مختلف امور کے سبز باغ دکھلائے گئے تھے جن میں ان کے بیٹے سردار عنایت اللہ خاں کی ولی عہدی بھی تھی جس کا پول ذاتی ڈائری ص۱۲۷ میں کھولا گیا ہے یاغستانی مرکز سے پہلے سے تقاضا باربار یہ ہو رہا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ مرکز میں آجائیں تو اطراف و جوانب سے مجاہدین اس طرح جمع ہوجائیں گے کہ تفرق کا خطرہ نہ رہے گا اور متعدد اوقات میں ایسے لوگ دیوبند آئے جو کہ یاغستان تک اپنی حفاظت میں پہنچادینے کے ذمہ دار تھے اور ان کو ایسے مخفی راستے معلوم تھے، جن سے وہ پہنچاتے اور انگریز کو خبر بھی نہ ہوتی مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو مالی امداد کی وجہ سے اس کی مصلحت معلوم نہ ہوئی کیونکہ مرکز کو اس کی (مالی امداد) کی ضرورت زیادہ تھی اور یہاں دیوبند میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جس کی وجاہت سے مالی امداد خفیہ طور سے حاصل کی جائے اس لئے توقف فرمایا۔ اخیر میں جبکہ جہاد کی عملی کاروائی شروع ہوگئی تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بالکل جانے کے لئے تیار ہوگئے تھے مگر پھر خبر آئی کہ رسد اور کارتوسوں کے ختم ہوجانے کی بناء پر ضروری ہے کہ کوئی باقاعدہ حکومت پشت پناہ ہو جو کہ رسد اور ہتھیار پہنچاتی رہے اس لئے یاغستان جانیکا ارادہ فسخ کرنا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو کابل بھیج کر اس کو مرکز بنانا اور ترکوں کو امداد کے لئے آمادہ کرنا ضروری ہے ثانی الذکر امر کے لئے خود کو منتخب فرمایا ادھر ڈاکٹر انصاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سے فرمایا کہ مخفی طور پر مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ ہند آپ کو گرفتار کر کے نظر بند کرنا چاہتی ہے اس لئے اشد ضروری ہے کہ جلد آپ حدود حکومت برطانیہ سے باہر ہوجائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں چوٹی کے مسلم لیڈر مولانا محمد علی صاحب مولانا شوکت علی صاحب مولانا ابوالکلام صاحب وغیرہ گرفتار ہو کر نظر بند ہوچکے تھے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ حکومت ہند کے یہاں آپ کی گرفتاری طے ہوچکی ہے مگر اس پر غور ہو رہا ہے۔ کہ چونکہ آپ سے عام مسلمانوں کے تعلقات بہت گہرے ہیں۔ تو کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں عام ہیجان کی نوبت نہ آئے یہ زمانہ حج کا تھا اس لئے طے پایا کہ حج کے لئے روانہ ہوجائیں اس طرح حدود برطانیہ

سے جلد سے جلد باہر بھی ہو جائیں گے اور ترکی حکومت سے گفتگو اور استمداد کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا پھر براہ ایران واپس ہو کر یاغستانی مرکز پر پہنچ جائیں گے چنانچہ یکبارگی حج کا ارادہ کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے قریبی جانے والے جہاز میں بذریعہ تار ٹکٹوں کا انتظام کر دیا اور حضرت دیوبند سے فوراً روانہ ہو گئے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات اور وثایق اور تحریرات حاصل کرنے کے بعد حضرت نے یہ خواہش کی کہ آپ مجھ کو براہ ایران یاغستان اپنی کفالت میں پہنچا دیں۔ جمال پاشا نے جواب دیا کہ ہم اس سے اس وقت عاجز ہیں روس نے ایران کے اور انگریزوں نے عراق کے راستہ کو کاٹ دیا ہے جس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ دولت عثمانیہ اور افغانستان میں مواصلات نہ رہیں ایران میں روسی فوجیں داخل ہو کر سلطان آباد پر جنگ کر رہی ہیں اور عراق میں انگریزی فوجیں کوت العمارہ پر جنگ کر رہی ہیں اس لئے کوئی اطمینان بخش صورت ہمارے قبضہ میں نہیں ہے آپ کو ہندوستان ہی کے راستہ سے یاغستان میں جانا چاہئے حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ مجھ کو نہایت قوی خطرہ ہے کہ راستہ ہی میں مجھ کو انگریز گرفتار کر لیں گے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ پھر آپ حجاز ہی میں اپنا مرکز قائم کریں اور یہاں سے ہی کارروائیاں عمل میں لائیں۔

اگر حضرت شیخ الہندؒ یاغستانی مرکز پر پہنچ جاتے تو قوی امید تھی کہ باوجود پسپائی اور شکستوں کے مرکز یاغستان منتشر نہ ہونے پاتا اور کسی نہ کسی صورت میں کسی جگہ قائم رہتا مگر قدرت کو منظور نہ تھا بہر حال حاجی ترنگ زئی صاحب اور ان کے ساتھ کے مجاہدین نہایت استقلال اور پامردی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے اور ایک مورچہ کو چھوڑ کر دوسرا مورچہ بناتے ہوئے پسپا ہوتے رہے مگر انگریزوں کی ڈپلومیسیوں اور ان پروپیگنڈوں کی وجہ سے جن کو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے روز بروز ساتھی فرار ہوتے اور کم ہوتے رہے بالآخر کارکن حضرات مجبور ہو کر منتشر ہو گئے۔ حاجی صاحب مرحوم کو ان کے مخلصین مہمند کے علاقہ میں لے گئے وہ وہاں محفوظ ہو کر اقامت پذیر ہو گئے اور مولانا سیف الرحمٰن صاحب اور دوسرے حضرات کابل وغیرہ چلے

گئے حاجی ترنگ زئی صاحب اسی دم خم سے مہمند علاقہ میں اخیر تک رہے اور وہیں ان کی وفات ہوگئی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین۔

(۳) مولانا سیف الرحمٰن صاحب اصل میں قندہاری افغان ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد پشاور کے پاس رہنے لگے تھے۔ انھوں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے علم حدیث شریف حاصل کیا تھا۔ عرصہ دراز تک ریاست ٹونک میں تعلیم وتدریس کی خدمات انجام دیتے رہے اخیر میں مدرسہ فتحپوری دہلی میں مدرس اول ہوگئے اور اس عہدہ کے فرائض کئی سال تک انجام دیتے رہے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ہم خیال بنایا اور اپنے مشن کا ممبر بنا کر مرکز یاغستان کی طرف ہجرت کرنے کا مطالبہ کیا چنانچہ موصوف ہجرت کر کے یاغستان پہنچے اور لوگوں میں وعظ وتبلیغ عرصہ تک کرتے اور ان کو جہاد آزادی پر آمادہ کرتے رہے مقرر بہت اعلیٰ درجہ کے اور نہایت ذہین اور صاحب علم وعمل تھے ان کے وعظ وتلقین سے بہت زیادہ لوگوں میں تاثر اور جوش پیدا ہوا۔ چونکہ وہ اپنی ملازمت چھوڑ کر بامر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ معہ متعلقین یاغستان گئے تھے اس لئے جب تک حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ ہندوستان میں رہے ان کے مصارف کے لئے ماہ بماہ حسب استطاعت متکفل رہے۔ موصوف حاجی ترنگ زئی صاحب کی معیت میں جہاد میں شریک رہے شکست ہونے کے بعد کابل چلے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں صاحب کے آخری زمانہ میں انگریزی حکومت کے پروٹسٹ پر مولانا منصور رحمٰن کا ذکر آگے آئے گا) اور مولانا سیف الرحمان صاحب کابل سے یاغستان روانہ کردیئے گئے جلال آباد تک دونوں ساتھ رہے۔ مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں لے لیا اور ہندوستانی معاملات سے علیحدگی کا وعدہ لے لیا (ذاتی ڈائری صفحہ ۱۲۰) اب وہ مستوفی الممالک کے ساتھ رہنے لگے امیر حبیب اللہ خاں کی آخری حکومت تک وہ مستوفی الممالک کے ساتھ رہے اور مستوفی کو جو کام انگریزوں کی تائید کے لئے دیا جاتا اس میں اس کی امداد کرتے۔ سردار امان اللہ خاں صاحب کے عہد میں آزاد ہوکر کابل پہنچے اور بڑے عہدوں پر فائز ہوگئے۔

(۴) مولانا منصور صاحب انصاری مرحوم ان کا اصلی نام محمد میاں تھا۔ موصوف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کے نواسے اور پیر جی عبداللہ صاحب انصاری مرحوم ناظم دینیات علیگڈھ یونیورسٹی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ حضرت شمس العلما مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم ناظم اعلیٰ دارالعلوم دیوبند کے حقیقی بھانجے تھے۔ ان کا اصلی وطن انبہٹہ ضلع سہارنپور تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں تکمیل کرنے کے بعد مختلف مقامات میں خدمات تدریسیہ انجام دیتے رہے۔ دارالعلوم معینیہ اجمیر میں بعہدہ صدر مدرسی عرصہ تک کام کیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اعانت ترجمہ قرآن کی خدمات انجام دینے کے لئے مقرر کئے گئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اپنے مشن کا ممبر بنایا اور اسکیم میں شریک کر لیا۔ جمعیۃ الانصار میں بھی مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے ساتھ ان کے نائب بن کر عرصہ تک کام کرتے رہے۔ نہایت مستقل مزاج ذکی الطبع رازدار اور قابل اعتماد تھے۔ انہوں نے مشن کے کاموں کو نہایت زیادہ رازداری سے انجام دیا (اعزہ اور احباب نے) ان کو بہت کوشش کے ساتھ توڑنا چاہا مگر یہ نہ ٹوٹے اور ہمیشہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ رہے۔ ان کو ڈگمگا دینے والے خطرات سے دوچار ہونا پڑا مگر یہ ثابت قدم رہے حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ سفر حجاز میں رفاقت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ مکہ معظمہ میں گورنر حجاز غالب پاشا کی ملاقات ہوتے اور ہدایات و تعلیمات ضروریہ حاصل کرنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو ہندوستان واپس کیا اور اس پر مامور کیا کہ وہ ہندوستان جا کر حسب تعلیمات غالب پاشاؒ کارہائے متعلقہ انجام دیں اور مشن کے ممبروں کی رہنمائی فرماتے رہیں۔ حسب بیان رولٹ رپورٹ غالب نامہ اُن کے پاس تھا موصوف جب حسب ہدایات ہندوستان پہنچے تو ریشمی خط انگریزوں کو مل چکا تھا۔ جگہ جگہ تفتیش اور پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ بدخواہوں نے ان کے گرفتار کرانے کی کوشش کی۔ ان کو پتہ چل گیا اور بھیس بدل کر انہوں نے فرائض ہدایات انجام دیئے اور روپوش ہو کر یاغستان روانہ ہو گئے۔ سی۔ آئی ڈی نے بہت کوشش کی مگر یہ ہاتھ نہ آئے اور یاغستان (آزاد علاقہ) میں بال بچوں (اہلیہ محترمہ دو صاحبزادوں وغیرہ) کو وطن میں چھوڑ کر چلے گئے اور بخیر و عافیت وہاں پہنچ گئے۔ وہاں کچھ عرصہ رہ کر پھر افغانستان (کابل) چلے گئے

امیر حبیب اللہ خاں صاحب کے اخیر زمانہ میں مولانا سیف الرحمٰن صاحب کے ساتھ گورنمنٹ ہند کی پروٹسٹ کی بنا پر کابل سے یاغستان کو روانہ کر دیئے گئے۔ انہوں نے یاغستان پہنچنے کے پہلے سے جب کہ بھیس بدلا تھا اپنا نام بھی بدل کر محمد منصور انصاری رکھ لیا تھا جس سے سی۔ آئی ڈی کو گرفتاری میں بڑی ناکامی ہوئی۔ امیر امان اللہ خاں صاحب کے زمانہ میں پھر کابل واپس ہوئے اور اپنی علمی استعداد وغیرہ کی وجہ سے بڑے علمی اور سیاسی عہدوں پر فائز ہوئے۔ جو مشن افغانستان سے استنبول امیر امان اللہ صاحب کے سربراہی سلطنت ہونے کے بعد بھیجا گیا تھا اس میں موصوف بھی تھے۔ بعہدہ وزیر مختار سفیر افغانستان کے ساتھ فرائض عہدہ انجام دیتے رہے۔ پھر ماسکو میں افغانی سفارت فوق العادت میں بحیثیت مشیر شریک رہے۔ کابل میں انہوں نے مختلف سیاسی اسلامی رسائل بھی تصنیف کئے جو کہ شائع ہو چکے ہیں[1] ان کی روانگی کے بعد چونکہ ان کے متعلقین معاشی تنگیوں میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے ڈاکٹر انصاری مرحوم ۳۰ ماہوار سے تکفل فرماتے رہے انہوں نے یاغستان میں شادی بھی کر لی تھی۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا حامد انصاری صاحب ہیں جو عرصہ دراز تک مدینہ بجنور کی ایڈیٹری کی خدمات نہایت لیاقت اور دانائی کے ساتھ انجام دیتے رہے اور پھر بمبئی چلے گئے اور روزنامہ جمہوریت جاری فرمایا۔ چھوٹے صاحبزادے والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد کابل چلے گئے اور ان دنوں وہیں مقیم ہیں منصور صاحب کا انتقال کابل میں ہو گیا رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین۔

(۵) مولانا عزیر گل صاحب قصبہ زیارت کا کا ضلع پشاور کے باشندہ اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص ہیں۔ مشن کے ابتدا سے ممبر رہے اور نہایت مہتم بالشان اور خطرناک کاموں کو انجام دیتے رہے۔ صوبہ سرحد اور آزاد علاقہ (یاغستان) میں سفارت کی خدمات عظیمہ انہوں نے بہت انجام دی ہیں۔ عموماً حضرت شیخ الہندؒ ان پہاڑی علاقوں میں اپنے ہم خیال

---

[1] ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) حکومت الٰہی (۲) اساس انقلاب یا مراقبہ نمازہ (۳) مجمل بعث تابعیت (۴) دستور امامت امت (۵) انواع الدول وغیرہ۔

اور ہم تو الوگوں کے پاس انہیں کو بھیجا کرتے تھے۔ دشوار گذار اور خطرناک راستوں کو قطع کر کے نہایت رازداری اور ہمت و استقلال کے ساتھ یہ بار بار آتے جاتے رہے ہیں۔ پہاڑی علاقوں اور ہولناک جنگلوں کو رات دن پیدل قطع کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی صاحب اور علماء سرحد و یاغستان اور دیگر خوانین کو مشن کا ممبر بنایا اور ان کے پاس پیغام اور خطوط پہنچانا، ان کو ہموار کرنا، ان کا اور مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کا فریضہ تھا جس کو ان دونوں حضرات نے اوقات مختلفہ میں انجام دیا۔ باوجودیکہ سی آئی ڈی ان کے پیچھے لگی رہی مگر انہوں نے کبھی اس کو پتہ چلنے نہیں دیا بارہا ان کو بھیس بدلنا اور ان جان علاقوں میں گزرنا پڑا مگر نڈر ہو کر ان کو قطع کیا ہر قسم کے خطرات میں بلا خوف و خطر اپنے آپ کو ڈالتے رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے نہایت مخلص اور فدائی ہیں۔ کسی قسم کی طمع اور غرض نفسانی نہیں رکھی نہ حضرت سے جدا ہوئے۔ لوگوں نے بہت کوششیں کیں کہ یہ جدا ہو جائیں مگر انہوں نے گوارا نہ کیا اور ہمیشہ عاشقانہ ولولوں کے ساتھ خدمت میں حاضر رہے حتیٰ کہ مالٹا کی اسارت میں بھی انتہائی دلجمعی سے شریک اور رفیق رہے ہر قسم کی خدمت کو اپنے لئے خوش نصیبی سمجھا کئے۔ لوگوں نے ان کو سی آئی۔ ڈی مشہور کیا۔ آوازے کسے حضرت رحمۃ علیہ کو بھڑکایا؛ بدظن کرنے کی کوششیں کیں۔ مگر حضرت مردم شناس دماغ اور قلب رکھتے تھے ان کی طرف سے اخیر تک بدظن نہ ہوئے اور آخر وقت تک ان کو ساتھ رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے راز دار اور مالی سرمایہ کے خزانچی اور معتمد علیہ رہے۔ حضرتؒ کی وفات کے بعد بھی عرصہ دراز تک حضرت کے مکان ہی پر قیام پذیر رہے چونکہ ایام اسارت مالٹہ میں اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے بعض احباب کی کوششوں سے حضرت کی بھانجی کی لڑکی سے نکاح بھی ہو گیا۔ اس سے اُن کے دو لڑکے اور لڑکیاں بھی ہوئیں جو کہ ماشاء اللہ اب جوان ہو گئے ہیں۔ ایام تحریک خلافت میں دیوبند خلافت کمیٹی کی صدارت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ضروریات معاشیہ کی بنا پر سوختہ (جلونی لکڑی) کی تجارت بھی کرتے رہے پھر مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس ہو گئے وہاں ہی ایک میم سے اُس کی خواہش پر دوسری اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد نکاح کر لیا۔ پھر اپنے بچوں اور اس تیسری اہلیہ کو لے کر وطن ضلع پشاور میں چلے گئے۔ اب وہاں ہی اقامت گزیں ہیں۔

(۶) مولانا احمد اللہ صاحب پانی پتی قصبہ پانی پت ضلع کرنال کے باشندے اور حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء قدس اللہ سرہ العزیز کی اولاد میں سے تھے موصوف نے علوم دینیہ عربیہ مختلف مدارس میں حاصل کر کے دورہ حدیث اور آخری کتابیں دارالعلوم دیوبند میں پڑھیں پھر مدرس ہو کر مختلف شہروں میں خدمات تدریسیہ انجام دیتے رہے۔ پھر دیوبند میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن میں معین و مددگار بنے اور سالہا سال اس خدمت کو انجام دیتے رہے ان کی دیانت اور امانت پر حضرت رحمۃ اللہ کو بہت زیادہ اعتماد تھا۔ شروع تحریک آزادی سے یہ حضرت کے رفیق اور ہم راز اور مشن کے مخلص اور جانباز ممبر رہے بسا اوقات حضرت کی ڈاک ان کے سپرد رہتی تھی۔ مہمانوں کی کثرت اور مشاغل کی زیادتی کی بناء پر حضرت رحمۃ اللہ ڈاک کے جوابات نہ دے سکتے تھے اس لئے ان کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ جب حضرتؒ حجاز جانے لگے تو فروعی کاروبار اور نیچے کی کارروائیوں کا ناظم انہیں کو بنا گئے تھے ان کے پاس ممبران مشن کا رجسٹر چندہ دہندگان کا رجسٹر اور دیگر کاغذات متعلقہ مشن رکھ گئے تھے۔ جن کو لے کر یہ پانی پت چلے گئے تھے اور وہاں ہی سے یہ تمام کارروائیاں عمل میں لاتے تھے۔ اور اصولی اور اونچے مرتبہ کی کارروائیوں کا ناظم حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری کو بنا گئے تھے۔ مشن کے تمام امور انہیں دونوں صاحبوں کے سپرد تھے روزانہ کی جزئیات نہایت رازدارانہ طریقہ پر یہ انجام دیتے تھے اور امور عالیہ میں حسب ضرورت رائے پور جا کر مولانا رائے پوری سے مشورہ لے کر عمل میں لاتے تھے۔ جس وقت مولانا شیخ الہندؒ گرفتار ہو گئے اور کاغذات گورنمنٹ کے (حسب تحریر سابق) قبضہ میں آ گئے اور پکڑ دھکڑ تفتیش و تنقید شروع ہوئی تو ان کے مکان پر بھی پولیس کی دوڑ پہنچی مگر یہ کسی شبہ کی بناء پر چند گھنٹہ پہلے تمام رجسٹروں اور مشتبہ کاغذات کے پلندوں کو کسی دوسری جگہ منتقل کر چکے تھے اس لئے یہ رجسٹر اور کاغذات پولیس کے ہاتھ نہ آئے ان سے بہت پوچھا گیا مگر انہوں نے کسی امر کا اقرار نہ کیا ان پر ایک مسلمان سی آئی ڈی مسلط کیا گیا۔ جو نہایت اخلاص اور عقیدت کا اظہار کرتا ہوا ان سے مرید ہوا اور خدمت میں رہ پڑا۔

ذکرو اذکار عمل میں لاتا رہا اتباع شریعت میں انتہائی سرگرمی عمل میں لایا اور دن ورات خدمتیں انجام دیتا رہا ان کو اس پر اعتماد اور اعتبار ہو گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ تمام باتیں پوچھ لیں اور مشن کا ممبر بن گیا انہوں نے اس کو تمام راز کی باتیں بتا دیں۔ وہ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد غائب ہو گیا اور جا کر گورنمنٹ کو بتا دیں اس پر اُن کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر چونکہ الزامات کا ثبوت گورنمنٹ کے پاس نہ تھا اور نہ یہ اقرار کرتے تھے اس لئے ان کو پنجاب کے بعض علاقوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک عرصہ کے بعد سی آئی ڈی مولانا احمد چکوالی مرحوم کو لے کر آئی جو کہ اس سے پہلے معافی مانگ کر آزاد ہو چکے تھے۔ کیونکہ گورنمنٹ کے پاس متعدد تحریریں اور خطوط افشاء راز کے بہت سے ذرائع سے پہنچ چکے تھے مولانا احمد چکوالی مرحوم نے ان کو وہ دکھلائے اور تنہائی میں جب کہ پس پردہ افیسران سی آئی ڈی بیٹھے ہوئے تھے کہ ان تحریرات کے موجود ہونے کے بعد بجز اقرار اور استدعاء معافی کوئی چارہ نہیں رہتا اب انکار کوئی معنی نہیں رکھتا مجھ کو بھی یہی مجبوری پیش آئی۔ آپ بھی اقرار کر کے وعدہ کر لیجئے کہ میں آئندہ کوئی حصہ نہیں لوں گا۔ تحریک ختم ہی ہو چکی ہے چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا۔ یہ ایک ہمدم و ہمراز کا مشورہ تھا جو کہ قبول کرنا پڑا اس کے چند دنوں بعد اُن کو آزاد کر دیا گیا اور پانی پت میں واپس کر دیئے گئے۔ وہاں آکر تعلیمی مشاغل قدیمہ میں مشغول ہو گئے اور اخیر تک اسی میں مشغول رہے ہندوستان کی آزادی کے بعد اور تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے بمرض ہیضہ پانی پت میں انتقال ہو گیا رحمۃ اللہ تعالی۔

(۷) مولانا ظہور محمد خاں صاحب مرحوم۔ موصوف خاص شہر سہارنپور کے باشندہ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے فدائی اور نہایت مخلص شاگرد تھے۔ نہایت زیادہ ساکت صامت ٹھوس کام کرنے والے سرگرم ممبر تھے مشن میں ابتداء سے داخل ہوئے اور ہمیشہ ممبر بناتے اور چندہ فراہم کرنے کا کام کرتے رہے حضرت شیخ الہندؒ کو ان پر بہت زیادہ اعتماد تھا مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس تھے جب پکڑ دھکڑ ہوئی تو ان کو بھی گرفتار کیا گیا اور الہ آباد میں سی آئی ڈی کے دفتر میں لے جایا گیا سی آئی ڈی نے بہت زیادہ پوچھ گچھ اور سختی کی مگر انہوں نے کوئی جواب نفی یا اثبات میں نہیں دیا بالکل گونگے

بن گئے دو چار دن سختی کے بعد اُن کو چھوڑ دیا گیا بعد واپسی حضرت شیخ الہندؒ چند سال زندہ رہ کر ایام تحریک خلافت میں انتقال ہو گیا رحمہ اللہ تعالےٰ۔

(۸) شیخ عبدالرحیم صاحب مرحوم سندھی حیدر آباد سندھ کے باشندہ اور مولانا عبیداللہ صاحب کے مخلص اور وفادار دوست (نو مسلم) تھے نہایت دین دار اور مشن کے نہایت سرگرم ممبر تھے۔ مولانا عبیداللہ صاحب نے ان کو ہموار کر کے مشن میں داخل کیا تھا۔ مولانا عبیداللہ صاحب کو سرحد افغانستان تک پہنچانے میں انہوں نے بہت زیادہ مدد کی تھی۔ موصوف مسٹر اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے۔ یہ عرصہ دراز تک تعلیم یافتہ غیر مسلم سندھیوں کو مسلمان بنانے میں نہایت سرگرمی کے ساتھ کوشاں رہے اور بحمد اللہ تعالےٰ اس میں بہت زیادہ کامیاب ہوئے اور بہت سے لوگ ان کی مساعی کاملہ سے مشرف باسلام ہوئے انہیں میں سے ڈاکٹر شمس الدین صاحب بھی ہیں۔ موصوف شیخ صاحب کی جدوجہد سے مسلمان ہوئے شیخ صاحب نے اپنی صاحبزادی سے ان کا نکاح کر دیا۔ جنگ عمومی اوّل سے کچھ پہلے یہ مدینہ منوّرہ چلے گئے تھے ایام جنگ میں وہاں ہی رہے۔ بعد میں مشکلات کی وجہ سے حیدر آباد سندھ آ گئے اب وہ معہ متعلقین حیدر آباد میں ہی مقیم ہیں۔ ان کے سمجھانے کا طریقہ اس قدر عمدہ اور دلچسپ تھا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مولانا عبیداللہ صاحب تحریک آزادی ہند میں جب سے داخل ہوئے تو انہوں نے ان کو بھی اپنا ہم خیال بنایا اور اس راستہ میں نہایت عظیم الشان خدمات انہوں نے انجام دیں کابل جانے کے بعد مولانا عبیداللہ صاحب کی خط و کتابت انہیں سے ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ خطوط گورنمنٹ ہند کے ہاتھ لگ گئے اور راز فاش ہو گیا تو سی آئی ڈی ان کے پیچھے لگ گئی ان کی گرفتاری کے لئے بہت زیادہ کوشش گورنمنٹ کی طرف سے جاری ہوئی۔

مگر یہ روپوش ہو گئے اور اخیر وقت تک سی آئی ڈی کے ہاتھ نہیں آئے۔ نہایت راز دار اور سمجھ دار متقی اور پرہیز گار تھے کہا جاتا ہے کہ سرہند میں بیمار ہو کر انتقال فرما گئے رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کے روپوش ہو جانے سے مشن کی برانچ حیدر آباد سندھ کا کام تقریباً بند ہو گیا۔

(۹) مولانا ابو السراج غلام محمد صاحب دین پوری مرحوم۔ مرحوم موضع دین پور

علاقہ خان پور ریاست بہاول پور کے باشندے اور حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈی کے خلیفہ اوّل تھے ان اطراف میں ان کی بہت شہرت تھی۔ بہت زیادہ لوگ ان سے بیعت ہو کر مستفید ہوئے دین پور شریف بھی اس تحریک آزادی کا مرکز ثانوی تھا جس کے صدر خود مولانا ابو السراج صاحب موصوف تھے آپ کے صاحبزادے اور خدام مشن کے ممبر تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق مولانا عبید اللہ صاحب کے ذریعہ سے پیدا ہوا اور انہیں کے ذریعہ سے مشن کی تحریک میں شریک ہوئے۔ چونکہ مولانا عبید اللہ صاحب کے پیر بھائی اور ان کے پیر و مرشد مرحوم کے خلیفہ تھے اس لئے آپس میں بہت زیادہ تعلق اور ارتباط تھا۔ مولانا عبید اللہ صاحب کابل جاتے وقت اپنی صاحبزادی کو انہیں کی کفالت میں چھوڑ گئے تھے کچھ عرصہ کے بعد مولانا ابو السراج مرحوم نے ان سے عقد نکاح کر لیا۔ جن سے صاحبزادہ پیدا ہوا وہ اب نہایت صالح جوان ہیں ریشمین خط آپ کے پاس بھی پہنچا تھا۔ انقلاب کی تیاری کے جملہ سامان یہاں جمع کر لئے گئے تھے اور مزید کوششیں جاری تھیں کہ فوج کی بڑی مقدار اسٹیشن خان پور شام کو پہونچی۔ وہاں کے مخلصین نے فوراً یہاں مرکز میں خبر کر دی۔ راتوں رات میں تمام سامان رائفلیں کارتوس وغیرہ منتشر کر دیا گیا صبح کو جب افسر انگریز معہ فوج دین پور پہنچا اور تفتیش کی تو کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ریشمی خط کو بھی تلاش کیا وہ ایک ڈبہ میں بچوں کے کھلونوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ انگریز افسر نے اس ڈبہ کو اٹھایا مگر اوپر کے کھلونوں کو دیکھ کر رکھ دیا۔ غرضیکہ کوئی چیز جس کی مخبروں نے خبر دی تھی اور کوئی مشتبہ چیز پائی نہ گئی دوڑ آنے کی خبر اطراف و جوانب میں پھیل گئی تو ہزاروں آدمی جمع ہو گئے اس لئے دین پور میں گرفتار نہ کر سکے۔ افسر نے استدعا کی چونکہ ہمارا بڑا افسر خان پور میں رہ گیا ہے اس لئے آپ خان پور تشریف لے چلئے اور اس سے گفتگو کر لیجئے۔ وہاں جانے پر کہا کہ یہاں معلوم ہوا کہ وہ بہاول پور چلا گیا ہے۔ اس لئے بہاول پور تشریف لے چلئے پھر وہاں سے پنجاب لے گئے اور غالباً جالندھر میں نظر بند کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد کسی ثبوت نہ ہونے اور عوام کے اشتعال کی بنا پر چھوڑ دیئے گئے۔ موصوف مرحوم کے کئی صاحبزادے نیک اور جوان صالح ہیں دارالعلوم دیوبند میں علم حدیث وغیرہ پڑھا

ہے۔ بڑے صاحبزادے مولانا عبدالہادی صاحب گدی نشین ہیں۔ رحمہ اللہ تعالےٰ ورضی عنہ وارضاہ۔

(۱۰) مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب مرحوم موصوف موضع امروٹ ضلع سکھر کے باشندہ اور حضرت سیدالعارفین حافظ محمد صدیق صاحب مرحوم بھرچونڈی والے کے دوسرے خلیفہ تھے مولانا عبیداللہ صاحب ان سے بہت وابستہ تھے۔ مولانا عبیداللہ صاحب کا نکاح بھی ماسٹر محمد عظیم خاں یوسف زئی کی صاحبزادی سے انہوں نے کرادیا تھا عرصہ دراز تک مولانا عبیداللہ صاحب ان کے یہاں رہے انہوں نے مولانا کے لئے کتابوں کا بہت ذخیرہ جمع کر دیا تھا۔ موصوف خدارسیدہ متقی اور پرہیزگار نہایت جوشیلے بزرگ تھے۔ اطراف وجوانب سکھر میں ان کا بہت بڑا اثر اور رسوخ تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمان ان کے متوسل اور مریدان اطراف میں موجود ہیں۔ ان کی کرامات کا بہت بڑا چرچا وہاں پایا جاتا ہے۔ مولانا عبیداللہ صاحبؒ نے ان کا تعارف حضرت شیخ الہندؒ سے کرایا۔ متعدد دفعہ یہ دیوبند بھی آئے اور حضرت شیخ الہندؒ ان سے ملنے امروٹ بھی تشریف لے گئے اور مشن آزادی میں شریک کار کیا۔ تحریک خلافت میں بھی نہایت جوش وخروش سے آخر تک شریک رہے۔ ان کا مقام سندھ کے ان اضلاع میں حضرت شیخ الہندؒ کے مشن کا مرکز رہا۔ گورنمنٹ نے اشتباہات کی بناء پر ان کو گرفتار کیا پھر چند دنوں کے بعد رہا کر دیا۔ ایام تحریک خلافت کے آخری دنوں میں انکی وفات ہوگئی۔ رحمہ اللہ تعالےٰ ورضی عنہ وارضاہ۔

(۱۱) مولانا محمد صادق صاحب کراچوی سلمہ اللہ تعالےٰ۔ مولانائے موصوف محلہ کھڈہ کراچی کے باشندہ ہیں کتب عالیہ درسیہ خصوصاً دورہ حدیث حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھی ان میں اور مولانا عبیداللہ صاحب میں بہت گہرے تعلقات ہمیشہ رہے اور مشن آزادی میں ہمیشہ سرگرمی کے ساتھ شریک رہے ایام جنگ عمومی میں جب کہ انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو انہوں نے اور ان کے رفقاء نے بس بھیلا وغیرہ کے بلوچستانی قبائل سے بغاوت کرادی۔ کراچی سے ہر ہفتہ میں جہازمیں پوری فورس سپاہیوں اور اسلحہ اور رسد کی جایا کرتی تھی جس کی وجہ سے مسٹر ٹاونشنڈ کمانڈر انچیف محاذ عراق میں

بڑھتا ہوا ہر پڑاؤ پر پیش قدمی کر رہا تھا فوجیں بھی یکے بعد دیگرے ہر پڑاؤ کو سنبھالتی رہتی تھیں اور پیچھے سے کمک پہنچتی رہتی تھی۔ اسی طرح نظام پیش قدمی کا جاری تھا جب بلوچستان اور لس بیلا میں بغاوت ہو گئی تو وہ فورس اور فوج جو کہ بصرہ جا رہی تھی اس داخلی بغاوت کے رفع کرنے کے لئے سندھ میں اتار دی گئی۔ کئی ہفتہ تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ مسٹر ٹاونشنڈ اپنی فتحمندی کے نشے میں بڑھتا چلا گیا مگر پیچھے سے کمک پہنچ نہ سکی۔ بالآخر کوت العمارۃ میں محصور ہو گیا۔ کچھ عرصہ میں بغاوت فرو کر کے انگریزی فوجیں جب وہاں پہنچیں تو ترکی فوجوں نے حصار نہایت مضبوط کر لیا تھا نہ اندر سے کسی کو نکلنے دیتے تھے نہ باہر کی طاقتیں حصار توڑ سکتی تھیں کئی مہینہ تک محصور رہ کر بمجبوری مسٹر ٹاونشنڈ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ابتداء میں جب محصور ہوا تھا اس کی فوج تئیس ہزار تھی مگر جب حصار سے آزاد کیا گیا تو کل تیرہ ہزار فوج باقی رہ گئی تھی سترہ ہزار آدمی اس حصار میں مر گئے۔ اس کے بعد مولانا محمد صادق کو گرفتار کر لیا گیا ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کارواڑ (مہاراشٹر کا شہر) میں نظر بند کر دیئے گئے اور جنگ عمومی کے اختتام تک وہاں ہی نظر بند رہے۔ نہایت جوشیلے، راز دار، مستقل مزاج شخص ہیں تقسیم ہند تک دارالعلوم دیوبند کے ممبران شوریٰ اور جمعیت علماء ہند کے ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے ہے۔ مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی کے صدر مہتمم اور صدر مدرس بھی ہیں۔ خلافت کمیٹی سندھ اور جمعیت علماء سندھ میں ہمیشہ نہایت اولوالعزمی اور سعی بلیغ سے کام کرتے رہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء[1]

(۱۲) مولانا فضل ربی صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور ضلع پشاور کے باشندہ ہیں نہایت جوشیلے اور مستقل مزاج جانباز ہیں اپنے وطن میں علمی مشاغل میں مشغول تھے مولانا شیخ الہندؒ نے حکم فرمایا کہ آپ یاغستان (آزاد علاقہ)

---

[1] افسوس مولانا موصوف ان سطور کے لکھے جانے کے بعد ۵ شوال ۱۳۷۲ھ ۱۸ جون ۱۹۵۳ء کو وفات پا گئے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ

ہیں چلے جائیں اور وہاں لوگوں کو جہاد آزادی کے لئے آمادہ کریں اور اس کی تبلیغ میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں چونکہ ان کو تقریر کی مشق دارالعلوم میں رہتے ہوئے بہت اچھی ہو گئی تھی اس لئے ان کی جوشیلی تقریروں کا وہاں بہت اچھا اثر ہوا۔ اور بہت بڑی تعداد میں لوگ جانبازی کے لئے تیار ہو گئے جب حاجی ترنگزئی صاحب مرحوم نے علم جہاد بلند کیا تو مولانا فضل ربی صاحب شریک جہاد رہے پھر شکست کے بعد کابل چلے گئے۔ اپنی علمی استعداد اور اعلیٰ قابلیت کی بنا پر علمی ڈیپارٹمنٹ افغانستان میں ملازم ہو گئے اور آج تک اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں متعلقین ان کے ساتھ ہیں۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

(۱۳) مولانا محمد اکبر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ دارالعلوم کے فاضل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ یاغستان کے ہی باشندہ ہیں علمی قابلیت بہت اعلیٰ درجہ کی رکھتے ہیں فنون عقلیہ سے فارغ ہو کر دارالعلوم میں داخل ہوئے تھے اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس علم حدیث پڑھا پھر ساؤتھ افریقہ میں علمی خدمات اور امامت کے لئے چلے گئے وہاں سے چند برسوں کے بعد واپس ہو کر اپنے وطن میں مقیم تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو جہاد آزادی میں شامل ہونے اور لوگوں کو اس کے لئے آمادہ کرنے کا حکم کیا۔ ان کی مساعی جمیلہ سے یاغستانی خوانین کے آپس کے افتراقات اور پرانی عداوتیں جو کہ ان میں سالہاسال سے چلی آتی تھیں دور ہوئیں سب میں اتفاق اور اتحاد پیدا کیا گیا اور جہاد آزادی کی صفوف میں کھڑا کیا گیا معلوم نہیں کہ زندہ ہیں یا نہیں۔

(۱۴) مولانا فضل محمود صاحب ضلع پشاور کے باشندہ ہیں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے آزاد علاقہ میں چلے گئے اور وہاں نہایت جدوجہد کر کے لوگوں کو جہاد آزادی کے لئے تیار کیا اور بہت کارآمد اور اہم کام انجام دیئے۔ شکست کے بعد مخفی طور پر اپنے وطن واپس آ گئے اور غیر مشہور طریقہ پر زندگی بسر کرتے رہے اس مشن کے سرگرم ممبر تھے نہایت ٹھوس کام کرنے والے ہیں۔

(۱۵) خان بادشاہ عبدالغفار خاں صاحب موصوف اتمان زئی ضلع پشاور کے مشہور و معروف قومی خادم اور کارکن ہیں ابتداء میں ان کو تعلق حضرت شیخ الہندؒ سے پیدا ہوا خدمت میں حاضر ہوتے کہا جاتا ہے کہ بیعت بھی ہوتے انہوں نے اپنے سیاسی تعلقات کو بڑے مجمع میں دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے ذکر فرمایا کہ میں بارہا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا ہوں ملاقات کا وقت اور جگہ کی اطلاع کسی شخص کے ذریعہ کر دیتا تھا اور دیوبند سے پہلے کے یا بعد کے اسٹیشن پر اتر لیتا تھا اور وہاں دونوں مجتمع ہو کر باتیں کر لیتے تھے پھر اپنے اپنے مقصد کے لئے مناسب گاڑیوں پر روانہ ہو جاتے تھے سی آئی ڈی کو اطلاع نہ ہوتی تھی۔ ٹکٹ آگے کے ہوتے تھے اس طرح بارہا ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاں صاحب بہت بڑے بڑے کام انجام دیتے تھے جن کے انجام دینے کی کارروائیاں اس قدر اخفاء کی محتاج ہوتی تھیں۔ اللہ تعالےٰ ان کی مدد فرمائے۔

(۱۶) ڈاکٹر انصاری مرحوم ڈاکٹر صاحب مرحوم قصبہ یوسف پور ضلع غازی پور کے باشندہ تھے تین بھائی تھے حکیم نابینا (حکیم عبدالوہاب صاحب) مرحوم سب سے بڑے تھے حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم منجھلے تھے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم سب سے چھوٹے تھے۔ حکیم عبدالوہاب صاحب مرحوم نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی تھی۔ حدیث حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھی باوجود نابینا ہونے کے غضب کا ذہن اور حافظہ رکھتے تھے۔ تینوں بھائیوں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے نہایت گہرا تعلق تھا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے حکیم عبدالوہاب صاحب بیعت بھی تھے۔ انہوں نے وفات سے پہلے وصیت کی تھی کہ میری قبر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب بنائی جائے چنانچہ جب ان کا انتقال دہلی میں ہوا تو ان کی لاش ایک کار میں گنگوہ شریف لائی گئی اور حضرت کی قبر کے قریب بنائی گئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم اگرچہ ظاہری طور سے آمد و رفت دیوبند میں نہیں رکھتے تھے مگر قلبی تعلق حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے

اور ان کی تحریک سے بہت زیادہ ہمیشہ رکھتے رہے اور مالی امداد بہت زیادہ کرتے رہے ان کے منجھلے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم دیوبند میں بہت زیادہ آمدورفت رکھتے تھے اور جب بھی آتے تھے تو کئی کئی روز رہتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم گورنمنٹ کے اعلیٰ دفاتر کے کارکنوں کے ذریعہ بہت سے راز کے کاموں پر حضرت شیخ الہند مرحوم اور ان کی تحریک کے متعلق باخبر رہتے تھے۔ چنانچہ جنگ عمومی کے ابتداء میں جب کہ سیاسی رہنماؤں کی دار وگیر شروع ہوئی تو انہیں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق سی آئی ڈی کی رپورٹیں نہایت سخت ہیں عنقریب گرفتار ہو جائیں گے اس لئے سخت ضرورت ہے کہ جلد از جلد ہندوستان کی سرحد سے باہر ہو جائیں علاوہ ازیں بہت سے امور وائسرائے کے دفتر سے ان کے احباب کے ذریعہ سے جو کہ سیاسی اور انتظامی دفاتر سے تعلق رکھتے تھے معلوم ہوتے رہے جب حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے ہی حضرت کے اور رفقاء خاص کے ٹکٹ وغیرہ کا انتظام اپنے خرچ سے کیا اور ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب ساتھ بمبئی تک تشریف لے گئے اور جملہ امور کا روانگی تک انتظام کیا اور مصاریف حجاز کے لئے نقد عطا کیا اور اس خیال سے کہ حجاز میں گرانی شدید ہے اور وہ رقم ختم ہو گئی ہوگی۔ آئندہ سال حضرت شیخ الہند مرحوم کے بھانجے اور داماد قاضی مسعود احمد صاحب کو ایک ہزار روپیہ دے کر اپنے خرچ سے حجاز روانہ کیا اسی طرح گھر کے مصارف کا تکفل فرماتے ہوئے ماہانہ بھیجتے رہے پہلے گزر چکا ہے کہ مولانا عبیداللہ صاحب نے جب دہلی میں مدرسہ تعلیم القرآن قائم کرنا چاہا تو حضرت شیخ الہندؒ خود تشریف لے گئے اور ڈاکٹر صاحب سے ان کا تعارف کرایا اور وہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے تعارف کے لئے ذریعہ بنے مولانا عبیداللہ صاحب کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا"

ایام جنگ بلقان میں ہلال احمر کے لئے جو دو وفد استنبول بھیجے گئے تھے اس کی ایک پارٹی کے صدر ڈاکٹر صاحب موصوف تھے اسی میں حافظ محمد یوسف صاحب نواسہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز بھی ایک جانباز اور غیور ممبر تھے جنہوں نے نہایت خلوص اور محبت سے فرائض ہلال احمر انجام دیئے تھے اور ذمہ داران حکومت ترکیہ نے اس پارٹی کے شکریہ میں نہایت زوردار الفاظ فرمائے تھے الغرض یہ حضرت شیخ الہندؒ کے مشن آزادی کی چوتھی برانچ کے (جو کہ دہلی میں تھی) صدر تھے اور نہایت رازداری سے سرگرمی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ہاں مولانا عبیداللہ صاحب کے نظارۃ المعارف قائم کرنے کے بعد ان کی ظاہری جدوجہد ایک درجہ تک ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ جو کہ مولانا عبیداللہ صاحب کے سفر کابل کے بعد اور ان کی غیوبیت میں قوی ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب کو ایام دار وگیر میں بلایا گیا اور ان سے پوچھ گچھ اور سوالات کئے گئے۔ سوائے مالی امداد اور کوئی گرفت کی چیز گورنمنٹ کے پاس ان کی نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی صاحب نے اقرار کیا اور کہا کہ مولانا شیخ الہندؒ ہمارے مذہبی پیشوا اور مرشد ہیں۔ ہم پر ان کی ضروریات مہیا کرنا اور خدمات بجالانا فرض تھا اور ہے ہم اس کو بجالاتے رہے اور لاتے ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے کہا گیا کہ مولانا شیخ الہند گورنمنٹ کے باغی ہیں آپ ان کی امداد کرتے ہیں تو جواب دیا کہ مولانا گورنمنٹ کے باغی نہیں ہیں ان کو بغاوت کے ثبوت میں سی آئی ڈی کی رپورٹیں دکھلائی گئیں تو انہوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ ہے قابل یقین نہیں ہے۔ جب گورنمنٹ کی طرف سے ان رپورٹوں کی صداقت پر اصرار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے مذہبی پیشوا اور مرشد دین ہونے کی بنا پر امداد کی ہے اگر گورنمنٹ مولانا شیخ الہند کو ایسا ہی سمجھتی ہے تو میں حاضر ہوں جو سزا مجھ کو دینا چاہتے ہو دو۔ چونکہ نہایت سچائی کے ساتھ اقرار کر لیا تھا ادھر یورپ کے تعلیم یافتہ اور آئین سے بخوبی واقف تھے اس لئے حکومت نے ان پر دست درازی کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ اس کے بعد ان کو بھی اور حکیم عبدالرزاق صاحب کو بھی چھوڑ دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اخیر تک سیاسی جدوجہد میں نہایت سلامت روی کے ساتھ شریک رہے۔ خلافت تحریک اور کانگریس کے

ممبر رہے اور ہر اجلاس کانگریس میں شریک ہوتے تھے ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے صدر بھی بنائے گئے جب تک زندہ رہے عموماً قومی لوگوں کا خصوصاً گاندھی جی کا قیام ان کی ہی کوٹھی پر ہوتا تھا قومی جلسے بھی اُن کے یہاں ہی ہوتے رہے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ آخری ایام میں اُن کے یہاں ہی بسلسلۂ علاج مقیم رہے اور وہیں وفات ہوئی۔ رحمۃ اللہ تعالےٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین۔ ڈاکٹر صاحب کی سیاسی جدوجہد اور کارنامے معروف ومشہور ہیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں انہی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر کئی مرتبہ جیل گئے اور عرصہ تک دہلی جیل اور اور پھر ملتان جیل وغیرہ میں رہے۔ ۱۹۳۶ء دہرہ دون سے دہلی آتے ہوئے ریل میں انتقال ہوگیا۔ دہلی ہی مدفون ہوئے۔ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ رحمہ اللہ تعالےٰ آمین۔

(۱۷) مولانا محمد احمد صاحب چکوالی مرحوم۔ چکوال (پنجاب) کے باشندہ تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور مولانا عبیداللہ صاحب کے مخلص دوست اور مشن کے سرگرم ممبر تھے۔ مشن تحریک آزادی کی پانچویں برانچ جو کہ پنجاب میں تھی موصوف اس کے صدر تھے نہایت استقلال اور بیجگری کے ساتھ مشن کے کاروبار میں شریک رہے اور ہزاروں کو ممبر اور ہم خیال بنایا۔ دیوبند میں ان کی آمدورفت بارہا ہوئی۔ ایام دارو گیر میں ان کو بھی گرفتار کر کے نظربند کر دیا گیا ابتدا میں کوئی الزام ثابت نہیں ہوسکا اور نہ آپ نے اقرار کیا مگر جب کاغذات گورنمنٹ کے ہاتھ آگئے اور سی آئی ڈی نے ان کو دکھلائے تو ان کی باتوں میں آ کر اقرار کرنے اور آئندہ سیاسیات سے علیحدہ رہنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ان کو رہا کر دیا گیا اور یہی مولانا احمد اللہ صاحب کے اقرار کا ذریعہ بنائے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے سیاسیات میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لاہور میں ایک موٹر سے ٹکرا کر زخمی ہو گئے اور انتقال فرما گئے رحمہ اللہ تعالیٰ۔ ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالقوی صاحب اور صاحبزادی زوجہ محترمہ مولانا احمد علی صاحب لاہور میں موجود ہیں۔ سلمہما اللہ تعالےٰ۔

(۱۸) حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس اللہ سرہ العزیز۔ قصبہ

رائے پور ضلع سہارن پور کے باشندہ تھے نہایت بزرگ و متقی اور باخدا تھے۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے خلیفہ تھے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور حضرت شیخ الہندؒ کے نہایت معتمد دوست تھے ابتداء میں حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو خبر تک نہیں کی اور سالہا سال تک اپنی سرگرمی عمل میں لاتے رہے اور انتہائی اخفاء کو جیسا کہ مقتضاء وقت تھا کام میں لائے مگر اس قسم کی کارروائی کہاں تک چھپ سکتی تھی ان کو بھی اطراف و جوانب سے خبریں پہنچتی رہیں۔ چنانچہ جب ۱۳۳۱ھ میں مجھ کو حسب وعدہ چند مہینوں کے لئے ہندوستان حاضر ہونا پڑا۔ (میرے خسر حکیم غلام احمد صاحب بچھرایونی مرحوم نے بوقت نکاح وعدہ کرالیا تھا کہ مدینہ منورہ جانے کے بعد اپنے متعلقین کے ساتھ ایک مرتبہ یہاں آنا ہوگا) تو رائے پور بھی حاضر ہونے کی نوبت آئی۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ لوگوں سے بیعت جہاد لیتے ہیں یہ تو بہت خطرناک امر ہے انگریزوں کو اگر خبر ہوگئی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے اور مسلمانوں کا یہ مرکز علمی اور دینی اجاڑ دیا جائے گا چونکہ مجھ کو اس کی کوئی خبر نہ تھی میں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور یہ عرض کیا کہ میں خود حضرت شیخ الہندؒ سے پوچھوں گا۔ واقعہ یہی تھا کہ باوجودیکہ حضرتؒ مجھ پر بہت زیادہ کرم فرماتے تھے مگر اس وقت تک کسی کارروائی کی خبر نہیں کی گئی۔ مولانا عزیز گل صاحب نے حضرت شیخ الہندؒ سے عرض کیا کہ حسین احمد کو بھی اس مشن میں شامل کر لینا اور اپنی کارروائیوں کی خبر کر دینا چاہیئے تو فرمایا کہ وہ صرف چند دنوں کے لئے ہندوستان آیا ہے اس کو مشوش مت کرو۔ میں نے رائے پور سے واپسی پر مولانا عبدالرحیم صاحب کا مقالہ ذکر کیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دعا فرمائی تھی کہ پچاس برس تک یہ دارالعلوم قائم رہے سو بحمد للہ یہ پچاس برس گزر چکے ہیں اور دارالعلوم اپنی خدمات باحسن وجوہ انجام دے چکا ہے میں یہ جواب سن کر دم بخود ہو گیا اور سمجھ گیا کہ جو واقعات نقل کئے جارہے ہیں وہ صحیح ہیں حضرت کا اس امر میں پختہ خیال قائم ہو گیا ہے اب اپنے ارادہ سے ٹل نہیں سکتے اور نہ کوئی ہٹا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالرحیم صاحب کی اور حضرت شیخ الہندؒ کی آپس میں تنہائی میں کھل کر بات چیت ہوئی تو

حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو بالکل ہم خیال اور ہمنوا بنالیا اور دونوں حضرات یکجان و دو قالب ہو گئے اور اخیر تک اسی پر قائم رہے جب کہ اعلان جنگ کے بعد حضرت شیخ الہندؒ حجاز جانے لگے تو انہیں کو اپنا قائم مقام بنا گئے اور اپنے کارکنوں کو تاکید کردی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کو میرا قائم مقام سمجھنا اور مہتم بالشان امور کو ان سے مشورہ لے کر اور پوچھ کر انجام دینا اور جزوی امور کو مولانا احمداللہ صاحب انجام دیتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی طرح عمل درآمد رہا کیا حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نہایت دلسوزی اور استقلال اور عالی ہمتی سے انتہائی رازداری کے ساتھ امور مہمہ کو انجام دیتے رہے اور ان کے خاص خدام بھی دلچسپی لیتے رہے مگر افسوس کہ ہمارے مالٹہ میں اسیر ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی مولانا رائے پوری مریض ہوئے اور عرصہ تک بستر مرض پر ناچارگی اور ضعف میں مبتلا رہے ایام دارو گیر میں سی آئی ڈی کا افسران کے پاس بھی تفتیش و استنطاق کے لئے گیا مولانا مرحوم نے تمام الزامات کی تردید کردی اور بعض میں لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ جس پر وہ ناکام واپس آیا اور کہنے لگا کہ مولانا جھوٹ بولتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا حل

ممکن ہے کہ بعض ناظرین کو خلجان ہو کہ اس جگہ اقرار نہ کرنا یا لاعلمی کا اظہار کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ یہ تو کذب اور جھوٹ ہے جو کہ حرام ہے تو اس میں عرض یہ ہے کہ تعریضی جواب دینا یعنی ایسے کلمات کو جواب میں استعمال کرنا جن کے دو معنی ہوں متکلم ان کے دوسرے معنی لے اور مخاطب کچھ اور سمجھے یہ جھوٹ نہیں ہے اور ایسے موقع پر بلاشبہ جائز ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب کہ اپنی زوجہ محترمہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہجرت کرتے ہوئے فلسطین تشریف لے جارہے تھے تو ایک کافر جبار کا ملک راستہ میں پڑا جس کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی مرد کسی خوبصورت عورت کے ساتھ اس کی سرحد میں سے گزرتا تھا تو عورت کو چھین لیتا تھا اور اگر وہ مرد عورت کا شوہر ہوتا تھا تو اس کو قتل کر دیتا تھا اور اگر بھائی ہوتا تھا تو چھوڑ دیتا تھا مگر عورت ہر حال میں اپنے قبضہ میں کر لیتا تھا۔ اس کے سی آئی ڈی (جاسوسوں) نے

حضرت سارہ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی خبر بادشاہ کو پہنچائی اس نے فوراً سپاہیوں کو بھیجا تو آپ نے حضرت سارہ سے کہا کہ تم یہ نہ کہنا کہ یہ میرا شوہر ہے بلکہ کہنا کہ یہ (ابراہیم علیہ السلام) میرا بھائی ہے اس سرزمین پر کوئی ایمان والا سوائے میرے اور تمہارے نہیں ہے (یعنی میں تمہارا دینی بھائی ہوں) یہی جواب بادشاہ کے لوگوں کو دیا کہ یہ میری بہن ہے اس لئے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قتل نہیں کیا۔ تو یہ جواب جھوٹ اور کذب نہیں ہوا بلکہ معاریض میں شمار کیا گیا مخاطبین یعنی بادشاہ اور اس کے لوگ یہ سمجھے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ علیہما السلام آپس میں نسبی بھائی بہن ہیں۔ اس لئے ان کو چھوڑ دیا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دینی بھائی بہن ہونے کا ارادہ فرمایا تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "ان فی المعاریض مندوحۃ عن الکذب" یعنی معاریض میں جھوٹ بولنے سے بچاؤ ہے) اور یہ بھی فرمایا کہ سمجھ دار کو کبھی جھوٹ بولنے کی ضرورت ہوتی ہی نہیں۔ ظلم سے بچنے کے لئے معاریض (تعریضی جواب) صرف جائز نہیں بلکہ بسا اوقات ضروری ہو جاتا ہے اور قسم کھانا بھی درست ہوتا ہے البتہ کسی کے حق تلف کرنے کے لئے ایسا جواب اور قسم درست نہیں۔ یہی طریقہ اکثر سمجھ دار دیانت داروں نے پہلے بھی اختیار کیا ہے اور یہی طریقہ حضرت شیخ الہندؒ کے رفقاء حسب ضرورت اختیار کرتے رہے۔

دوسرا حل عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ ہر حالت میں بُرا اور حرام ہے حالانکہ جھوٹ بعض اوقات میں فرض اور واجب ہو جاتا ہے اور بعض اوقات میں مستحب اور بعض اوقات میں مباح اور بعض اوقات میں حرام اور مکروہ ہوتا ہے۔ اگر کسی بے گناہ غیر مستحق کو کوئی ظالم قتل کرتا ہو اور جھوٹ بول کر اس کو بچانا ممکن ہو تو اس وقت جھوٹ بولنا واجب ہوگا۔ اور اگر جھوٹ کے ذریعہ کوئی بھلائی پیدا ہوتی ہو (جیسے دو لڑنے والوں میں صلح کرا دینا) تو اس وقت جھوٹ بولنا مستحب ہو جاتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس (جو شخص جھوٹ بول کر صلح کرا دے وہ جھوٹا نہیں ہے۔) حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز (اصلاح والا جھوٹ فتنہ والی سچائی سے بہتر ہے) اسی طرح اپنی بیوی سے ایسا جھوٹ بولنا جس سے محبت میں اضافہ ہو۔ مباح یا مستحب ہے۔ اس کی تفصیل امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مستصفے الاصول میں

اور دوسرے فقہائے احناف رحمہم اللہ نے تحریر فرمادی ہے۔ اس لئے صریح جھوٹ بھی ظالم انگریزوں سے بچاؤ کے لئے کسی طرح ممنوع نہ تھا۔ مالٹہ میں مولانا عزیز گل صاحب نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا جب کہ بیان لینے والے انگریز کو ہم لوگ جواب دے کر آئے تھے اور وہ سازش اور تحریک آزادی کے متعلق سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹیں پیش کر کے ہم سے اقرار کرانا چاہتا تھا تو مولانا عزیز گل صاحب کو شبہ تھا) کہ ہم لوگوں نے ناجائز کام کیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ ہمارے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء میں سب کچھ کیا تھا مگر جب انگریز حکام نے پوچھا تو سب کا انکار کر کے چلے آئے اور کسی چیز کا اقرار نہ کیا۔ الحاصل یہ شبہ بے علمی کی وجہ سے ہے۔ یہ جھوٹ ناجائز نہیں بلکہ ضروری ہے۔

الحاصل مولانا عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سی۔ آئی۔ ڈی ایکسپرٹ کے تمام الزامات اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی جماعت کے متعلق تمام باغیانہ سرگرمیوں کا انکار کر دیا حالانکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے اخلاص اور عقیدت کے دعوے دار ان میں سے بہت سے امور کی خبر دینے والے تھے اسی لئے تصدیق حسین افسر خفیہ پولیس مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو نہایت سچا اور حضرت رائے پوری کو نہایت جھوٹا کہتا تھا کیونکہ ان کی رپورٹ سی۔ آئی۔ ڈی تصدق حسین کی دلی خواہش کے مطابق اور اس کے آقا انگریزوں کی طرف داری میں تھی بخلاف مولانا رائے پوری کے بیانات کے کہ وہ بالکل اس کی منشا کے خلاف تھے۔ افسوس کہ ہماری اسارت مالٹہ کے زمانہ ہی میں حضرت رائے پوری کا وصال ہو گیا جس کی خبر مرثیہ میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ جو کہ آپ کے قصائد میں موجود ہے اور چھپ چکا ہے رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ۔

(۱۹) مولانا محمد مبین صاحب۔ خطیب دیوبند۔ موصوف دیوبند ہی کے باشندہ اور عیدگاہ کے قدیمی امام ہیں۔ ان کے خاندان میں امامت عیدگاہ قدیم سے چلی آتی ہے مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں فارغ التحصیل ہوئے اور مدرسہ چھاؤنی انبالہ کے مدرس اور مسجد اسلامیہ کالج انبالہ کے امام سالہا سال رہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ہمیشہ وابستہ اور ان کی مشن کے ممبر رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو بار بار امداد مالی کے لئے برہما رنگون وغیرہ بھیجا جس کو نہایت رازداری کے ساتھ باحسن وجوہ انہوں نے انجام دیا۔ ان پر حکومت ہند کے افسروں نے نہایت زیادہ سختیاں بھی کیں مگر یہ نہایت استقلال سے

جواب دیتے رہے اور مرعوب نہ ہوئے آج تک حضرت شیخ الہندؒ کے معتقد اور سچے مخلص ہیں۔ تقسیم ہند کی وجہ سے ان کی معاشی زندگی پر بہت برا اثر پڑا بہت ضعیف اور آنکھوں سے بہت زیادہ معذور ہو گئے ہیں۔ معاشی حالت نہایت گر گئی ہے اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ آمین۔

(۲۰) مولانا محمد ابراہیم صاحب راندیری موصوف راندیر ضلع سورت کے مشہور و معروف عالم ہیں اگرچہ طبیعت نہایت جوشیلی رکھتے ہیں مگر ساکت وصامت رہ کر ٹھوس کام کے عادی ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ہم خیال اور رہنوا ہیں اور ان کی تحریک آزادی کے مؤید ہیں انہوں نے اپنے روستوں سے کوشش کرکے متعدد مرتبہ بڑی بڑی مالی امدادیں فرمائی ہیں۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء افسوس اپریل ۱۹۵۴ء میں ان کی وفات ہو گئی۔

اس تحریک آزادی میں غیر مسلموں کی شرکت

حضرت شیخ الہندؒ نے ایک مستقل مکان اپنے مکان کے قریب کرایہ پر لے رکھا تھا جس کو کوٹھی کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے اس میں حضرت کے غیر مسلم ہم خیال دوست اور رفقاء انقلاب ٹھہرا کرتے تھے ان کو نہایت رازداری کے ساتھ خدام خاص ٹھہرا دیتے تھے اور ان کے کھانے پینے کے انتظامات کرتے رہتے تھے اکثر تنہائی کے اوقات میں یا رات کو ان سے حضرت شیخ الہندؒ کی باتیں ہوتی ہیں یہ لوگ سکھ یا بنگالی ہندو انقلابی (بنگال پارٹیشن والے) ہوتے تھے۔ چونکہ رازداری کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا اس لئے ان کے نام اور پتے معلوم نہیں ہو سکے اور نہ حضرت سے پوچھنے کی نوبت آئی۔ علاوہ مذکورہ بالا حضرات کے غیر مشہور حضرات اس تحریک کے ہم خیال اور مشن آزادی کے ممبر بے شمار تھے جن کی تفصیل تطویل چاہتی ہے اور نہ ان کے ذکر کرنے کی ضرورت ہے[1]۔ ہم نے نہایت سرگرم لوگوں کی تفصیل پیش کر

---

[1] البتہ اس مقام پر مولانا محمد جلیل صاحب کیرانوی کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے مولانا محمد جلیل صاحب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی خدام میں سے ہیں نہایت صغر سنی میں حضرت کی خدمت میں پہنچے یہاں ہی قرآن شریف حفظ کیا اور اس کے بعد فارسی اور عربی کی کتابیں سب پڑھیں

دی ہے اور یہ پانچ برانچیں بتلا دی ہیں جو کہ علاوہ مرکز دیوبند کے ہمارے علم میں آسکیں (۱) دین پور شریف (۲) امروٹ شریف (۳) کراچی کھڈہ (۴) دہلی (۵) چکوال ہر جگہ کام کرنے والے حضرات اپنی تیز تر مساعی کی اور انتہائی اخلاص کی بنا پر صدر کہلانے کے مستحق ہوتے تھے ورنہ باقاعدہ تقرر صدر اور سکرٹری وغیرہ کا مقتضاء وقت اور احوال گردوپیش کی بناء پر نہ ممکن تھا نہ وقوع میں آیا۔ ہم نے جس جگہ پر بھی صدر یا ناظم وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں عملی استحقاق مراد ہے رسمی کارروائی مراد نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ ۶۲۷) چونکہ بہت چھوٹے تھے اس لئے گھر میں جاتے تھے۔ پردہ ان سے اس وقت تک کہ بالغ ہو گئے کسی کا نہ تھا گھر کی تمام خدمتیں اور مہمانوں کی تمام خدمات یہی انجام دیتے تھے اور ہر بات میں ہمیشہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خوشنودی کا خیال رکھتے تھے اس لئے حضرت کو ان کا بہت خیال تھا اور بمنزلہ اولاد ان کی پرورش فرماتے رہے۔ ان کی خدمات ہی کے زمانہ میں حضرت نے اس تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا اور ہر قسم کی سرگرمیاں عمل میں لائی گئیں یہ سب کو دیکھتے اور سنتے رہے۔ مگر کبھی کسی راز کی بات کا افشا نہیں کیا۔ حضرت کی اسارت مالٹہ کے زمانہ میں تمام کاروبار اندرون خانہ اور باہر کی خدمات کا یہی انجام دیتے تھے حضرت کو ان پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ صغر سنی کیوجہ سے اگرچہ یہ مشن کے ممبر نہیں بنائے گئے مگر عموماً تمام باتوں سے کم وبیش ان کو اطلاع تھی جب حضرت کے اسیر ہونے کی خبر آئی تو تلاشی کے خوف سے انہوں نے اس ڈاک کے بہت بڑے ذخیرہ کو جس کو نہایت حفاظت سے مخفی کر لیا تھا ارات کے دو بجے جلا دیا ان سے بہت لوگوں نے رازہائے سربستہ کو معلوم کرنا چاہا مگر کبھی کسی کو کسی بات کا پتہ نہیں دیا جس وقت حکومت کی طرف سے پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو اُن کو بھی زیر حراست الہ آباد لے گئے اور تصدق حسین اور مسٹر سین نے بہت زیادہ پوچھ گچھ کی۔ تصدق حسین نے بہت ڈرایا دھمکایا اور سختیاں بھی کیں مگر کوئی اپنے مقصد کی بات حاصل نہ کر سکے انہوں نے نہایت بے خوفی اور استقلال سے تمام سوالات کے جوابات دیئے جہاں بڑے بڑوں کے پیر ڈگمگا گئے تھے یہ ثابت قدم رہے حضرت کی دعاؤں کی برکت سے علمی اور معاشی ترقی کے اچھے پیمانہ پر فائز رہے حضرت کے بعد پہلے انبالہ میں پھر کراچی میں پھر دارالعلوم دیوبند میں ممتاز حیثیت سے خدمات تدریسیہ انجام دیں اب دارالعلوم ہی میں پہلے درجہ کے مدرسین میں ہیں۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی کارگذاری

اس تحریک کی ابتداء میں ضروری سمجھا گیا کہ چونکہ بغیر تشدد (وائلنس) ہندوستان سے انگریزوں کا نکالنا اور وطن عزیز کا آزاد کرانا ممکن نہیں ہے[1] اس کے لئے مرکز اور اسلحہ اور سپاہی (مجاہدین) وغیرہ ضروری ہیں۔ بنا بریں مرکز یاغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا کہ وہاں اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہیئے اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قوی ہیکل اور جانباز ہوتے ہیں اس لئے ان کو منفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصوّر کیا گیا اور انہیں سے کامیابی کی اُمید قائم کی گئی۔ اس بناء پر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں۔

(الف) ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے نزاعات قدیمہ اور شخصی اور قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے (ب) ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی جائے (ج) ان میں جوش جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے۔ (د) حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے لوگ (جماعت مجاہدین سرحد جو کہ ستیانا اور چمرقند میں مقیم ہیں اور ان میں اور قبائل میں تنفر اور شکر رنجیاں عرصہ سے چلی آتی ہیں ان کو دور کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس لئے مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو دہلی سے مولانا فضل ربی اور مولانا محمود صاحب کو پشاور سے بھیجا اور مولانا محمد اکبر صاحب وغیرہ کو آمادہ کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس علاقہ میں بہت سے شاگرد اور مخلص موجود تھے ان سبھوں نے گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ میں پھر کر زمین ہموار کی اور ایک عرصہ میں بفضلہ تعالیٰ بڑے درجہ تک کامیابی نظر آنے لگی۔ انہیں مقاصد کے لئے بار بار حاجی ترنگ زئی صاحب سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑیں اور انگریزی حدود سے باہر جا کر ان مقاصد کے لئے کوشش کریں ان کو مختلف مجبوریاں درپیش تھیں ان کے حل کرنے کے خیال سے

---

[1] اس وقت نان وائلنس کا حربہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور کانگریس کی جو کچھ کوششیں اسوقت تک یعنی ۱۹۱۲ء تک تھیں اُن سے کامیابی کی تمنّا موہوم بلکہ عبث تھی۔ کیونکہ انگریز اپنی ڈپلومیسی سے ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیتا تھا کہ برسوں کی جدّوجہد ایک لمحہ میں خاک میں مل جاتی تھی۔

وہ تاخیر فرما رہے تھے کہ جنگ عمومی چھڑ گئی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ترک بھی مجبور کر دیئے گئے کہ جنگ کا اعلان کر دیں۔ ان کے دو جنگی جہاز جو انہوں نے انگلستان میں بنوائے تھے اور ان پر کروڑوں اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں۔ انگریزوں نے ضبط کر لئے اور اسی قسم کے دوسرے غیر منصفانہ معاملات ان سے پیش آئے جو کہ ان کو جنگ میں گھسیٹنے والے تھے یہ ان معاملات کے علاوہ تھے جو کہ طرابلس غرب اور بلقان، کریٹ، یونان وغیرہ میں قریبی زمانہ میں پیش آئے تھے جن کا ہم نے کسی قدر تفصیل سے پہلے تذکرہ کیا ہے۔ بہر حال ترکی حکومت نے مجبور ہو کر اعلان جنگ کر دیا تو اس پر تقریباً آٹھ یا نو محاذوں سے۔ حملہ کیا گیا۔ انگریزوں نے عراق (بصرہ) پر عدن پر سویز پر چنانچہ قلعہ پر اسی طرح روس نے متعدد تین چار محاذوں پر اس یورش کی وجہ سے مسلمانوں میں جس قدر بھی بے چینی ہوتی کم تھی۔ چنانچہ احوال موجودہ سے حضرت شیخ الہند نے حاجی ترنگ زئی صاحب کو مطلع کیا اور ضروری قرار دیا کہ وہ یاغستان چلے جائیں اور ضروری کارروائی عمل میں لائیں اسی طرح مرکز یاغستان اور اس کے کارکنوں کو لکھا چنانچہ جب حاجی صاحب مرحوم پہنچے۔ مجاہدین کا جمگھٹا شمار سے زیادہ ہو گیا۔ مجاہدین چمرقند (حضرت سیّد احمد صاحب شہیدؒ) کی جماعت بھی مل گئی۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جنگ چھڑ گئی اور بفضلہٖ تعالیٰ مجاہدین کو غیر متوقع کامیابی ہونے لگی اور انگریزوں کو جانی اور مالی بیحد نقصان اٹھا کر اپنی سرحد پر لوٹ آنا پڑا اور اپنے استحکامات قدیمہ میں پناہ لینا ناگزیر ہو گیا۔ اس پر انگریز نے بالمقابل متعدد مذکورہ ذیل کارروائیاں شروع کر دیں۔ (الف) فوجوں کو اطراف ہندوستان سے جمع کر کے بڑی مقدار میں سرحد پر بھیجنا (ب) عوام میں پروپیگنڈا کرنا کہ یہ جہاد نہیں ہے جہاد بغیر بادشاہ کے نہیں ہوتا بغیر بادشاہ کے جہاد حرام ہے (ج) پانی کی طرح روپیہ خرچ کرنا اور اپنے لوگوں کو قبائل کے سرداروں کے پاس بھیجنا اور مال وزر بے شمار دے کر ان کو جماعت مجاہدین اور حاجی صاحب موصوف سے توڑنا (د) عوام میں تبلیغ کرنا کہ مسلمانان سرحد اور افغانوں کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ہیں مسلمانوں کو ان سے بیعت جہاد کرنا چاہیئے اور اس وقت تک انتظار کرنا ضروری ہے جبتک وہ جہاد کا علم بلند نہ کریں (ہ) اس وقت مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ کاغذوں پر بیعت جہاد

کر کے دستخط کریں اور امیر کابل کے نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں کے دفتر میں یہ کاغذات بھیجیں (و) امیر حبیب اللہ خاں کو مختلف وعدوں کے سبز باغ دکھلا کر اور بے شمار اموال اور نقد روپیہ دے کر اپنی طرف مائل کرتا اور جہاد کے لئے کھڑے ہونے سے روکتا اور یہ وعدہ کرنا کہ اس جنگ سے فارغ ہو کر تمہارے لئے فلاں فلاں وعدے پورے کر دیئے جائیں گے ان اور ان جیسی دیگر ڈپلومیسیوں کا اثر ہونا طبعی طور پر لازمی تھا چنانچہ اثر ہوا اور بہت بُرا ہوا مگر اتنا نہ ہوتا اگر مجاہدین کو رسد اور کارتوسوں کی نیز دیگر اسلحہ کی کمی کی مشکلات نہ پیش آجاتیں۔ ادھر یہ کیا گیا کہ مسلمانان ہند کے ہیجان اور اضطراب کے روکنے کے لئے ہندوستان میں اعلان کیا گیا (الف) ترکوں کو جنگ کے لئے ہم نے مجبور نہیں کیا بلکہ ترک از خود جنگ میں داخل ہوئے ہیں اور ہم تو ان کے اعلان کی وجہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ حالانکہ ترکوں کو جنگ پر انگریزوں نے مجبور کیا تھا جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں (ب) یہ جنگ سیاسی ہے مذہبی نہیں ہے حالانکہ فتح بیت المقدس پر وزیر اعظم انگلستان لائڈ جارج اپنے بیان میں اس کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا (ج) ہم مسلمانوں کے مقدس مقامات جدّہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد وغیرہ پر نہ بمباری کریں گے اور نہ کوئی اثر جنگ کا ان مقامات مقدسہ پر پڑنے دیں گے مگر بالکل اس کے خلاف عمل کیا گیا۔ جس کا تذکرہ ہم مفصل طور سے عہد شکنیوں کے باب میں کر چکے ہیں (د) ترک مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں۔ حالانکہ ۱۸۵۷ء میں سلطان عبد المجید مرحوم سے فرمان مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے نہ لڑنے اور ان کی اطاعت کرنے کا بحیثیت خلافت حاصل کیا اور ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا کہ خلیفہ کے حکم پر چلنا مسلمانوں کے لئے مذہبی حیثیت سے فرض ہے۔ چنانچہ امیر عبد الرحمٰن خاں والی کابل مرحوم اپنی تزک میں لکھتے ہیں کہ اسی فرمان خلیفہ کی بناء پر سرحدی قبائل ٹھنڈے پڑ گئے تھے بہر حال ترکوں کے خلیفہ اسلام نہ ہونے اور عدم استحقاق خلافت پر فتوے لکھوائے گئے اور بار بار حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے دستخط اور تصدیق کے لئے پیش کئے گئے مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور بھرے مجمع میں پھینک کر لکھنے والوں کو بہت بُرے الفاظ کہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفر حجاز

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس برابر کیفیات جہاد کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ابتدائی کمزوریوں میں کارکنان مرکز کا پیغام آیا کہ ہم رسد اور کارتوسوں کے ختم ہو جانے کیوجہ سے سخت مجبور ہیں جب تک ان دونوں کا انتظام نہ ہو جہاد حریت جاری نہیں رہ سکتا۔ بحمد اللہ ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں ہے مگر اسلحہ اور رسد کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں ساتھ کی لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہد کو اپنے گاؤں جانا پڑتا ہے اور مورچہ خالی ہو جاتا ہے اور کارتوس کے ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار ہو جاتا ہے اگر کارتوس اور رسد کافی مقدار میں ہو تو توپوں اور مشین گنوں ٹینکوں وغیرہ کا ہم بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لئے تیار کیجئے۔ چنانچہ اس امر کی بناء پر حضرت شیخ الہندؒ کا ارادہ بدلا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو کابل اور خود کو استنبول پہنچنا ضروری قرار دیا۔ مولانا عبید اللہ صاحب کے کابل جانے کی تفصیل ہم ان کی ذاتی ڈائری سے ناظرین کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ کے حجاز جانے کی تاریخی تفصیل ہم سفرنامہ مالٹہ میں لکھ چکے ہیں[1] ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں سیاسی کارناموں کو باقتضاء وقت ہم نے اس میں چھپایا اور ذکر نہیں کیا اور بعض امور کا جان بوجھ کر انکار کیا تھا کیونکہ ماحول اس وقت میں اسی کو چاہتا تھا۔ اب چونکہ موانع زائل ہو گئے ہیں اس لئے صرف انہیں کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چونکہ اس وقت سرحد کے واقعات ہو رہے تھے حکومت ہند بوکھلائی ہوئی تھی اور وہ معمولی شبہ پر بھی گرفتار کر کے نظر بند کر رہی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سی۔ آئی۔ ڈی کی اطلاعات خود ہندوستان میں اور سرحد یاغستان میں بہت زیادہ اور خطرناک تھیں اس لئے بڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اسی وجہ سے زور دیا تھا کہ آپ جلد از جلد انگریزی عملداری سے نکل جائیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حجاز جانے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے

---

[1] ملاحظہ ہو تتمہ۔

سے کوئی تذکرہ نہ تھا فوراً روانہ ہو گئے اب حکومت کا شبہ اور قوی ہو گیا کہ چونکہ ترکی حکومت جنگ کر رہی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ وہاں جا کر ساز باز کر لیں گے اُس لئے ان کو روکنا اور گرفتار کر لینا چاہیئے مگر وہ ملک کی اندرونی ہیجان اور گڑ بڑ سے اس زمانہ میں بہت بچتی تھی اس لئے احکام ان کی گرفتاری کے جاری کئے گئے مگر اس طرح کہ ہیجان کی نوبت نہ آئے حضرت کے سفر کی خبر معمولی نہ تھی ہر جگہ تار چلے گئے تھے ہر جنکشن پر آدمیوں کا جمگھٹا ہو جاتا تھا اس لئے راستہ میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ بمبئی پہنچے تو وہاں بھی پورا انتظام تھا لوگوں کا جمگھٹا لگا رہنا تھا گرفتاری کے لئے گورنمنٹ بمبئی کے نام گورنر یوپی کا تار پہنچا تو جہاز روانہ ہو چکا تھا۔ پھر گورنر یوپی نے بواسطہ مرکزی حکومت عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود حسن صاحب کو جہاز سے اتار لو مگر یہاں بھی لوگ ڈاکٹر انصاری صاحب کے لگے ہوئے تھے انہوں نے تار میں اس قدر تاخیر کر دی کہ جہاز عدن سے روانہ ہو گیا۔ پھر تار جدّہ میں جہاز کے کپتان کو دیا گیا کہ ان کو جہاز میں گرفتار کر لو اترنے نہ دو۔ مگر اس وقت گورنر حجاز کا انتظام یہ تھا کہ جدّہ سے پہلے حجاج کو جزیرہ سعد میں اتار کر مکہ معظمہ پہنچایا جائے اس لئے وہ تار کپتان کو اس وقت ملا جب کہ تمام حجاج جزیرہ سعد میں اتر چکے تھے۔ البتہ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ متعدد سی۔ آئی ڈی بمبئی بلکہ پہلے سے کر دیئے گئے تھے تاکہ وہ تمام حرکات وسکنات کی نگرانی رکھیں اور نوٹ کرتے رہیں۔ مگر جزیرہ سعد میں اُترتے ہی بعض لوگوں نے ترکی پولیس کو اطلاع کر دی کہ فلاں فلاں اشخاص انگریزوں کے سی۔ آئی۔ ڈی ہیں ان کو ترکی پولیس نے گرفتار کر لیا اور اپنی حفاظت میں حج کرا کر ہندوستان واپس کر دیا تاہم کچھ مخفی لوگ باقی رہ گئے۔ بہر حال گرفتاری کی کوششیں پیچھے تھیں اور حضرت شیخ الہندؒ کی حفاظت میں آگے آگے اس طرح محفوظ ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

حافظ عبدالجبار صاحب دہلوی مرحوم سے مولانا شیخ الہند کی ملاقات

مکہ معظمہ میں بہت سے ہندوستانی تاجر کاروبار کرتے ہیں مگر دہلی کے تاجر حاجی علی جان مرحوم کے خاندان کی وہاں خصوصی حیثیت ہے۔ تجارت بھی ان کی بڑے پیمانہ پر ہے اور دین داری

اور علمی حیثیت بھی ان کی اونچی ہے اہل شہر اور حکام میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس خاندان کا حضرت سید احمد اور ان کے متبعین مجاہدین ستھیانہ وغیرہ سے بھی قدیمی تعلق ہے اس لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حافظ عبد الجبار صاحب سے جو کہ اس خاندان میں معمر اور سمجھ دار اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے ملے اور ان سے

گورنر حجاز غالب پادشاہ سے ملاقات

معاملات ذکر کر کے گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کرانے کی استدعا کی انہوں نے اسی وقت ایک ہندوستانی معاملہ فہم نوجوان تاجر کو جو کہ تسبیحوں کی تجارت کرتے تھے اور ترکی اور عربی زبان سے خوب واقف اور وہاں کے ترکی اسکول کے پڑھے ہوئے تھے بلایا اور حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ کر دیا وہ گئے اور غالب پاشا سے ملاقات کرا دی اور جو باتیں حضرت شیخ الہندؒ نے کیں ان کا ترجمہ کر کے غالب پاشا کو سمجھایا۔ غالب پاشا نہایت توجہ اور غور سے تمام باتوں کو سنتے رہے معمولی ملاقات کے بعد کہا کہ آپ کل اسی وقت تشریف لائیں اس وقت میں جواب دوں گا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس روز واپس آگئے۔ غالب پاشا نے ہندوستان کے معزز تاجروں سے بالا بالا تحقیق کی کہ مولانا محمود حسن صاحب کی حیثیت ہندوستان میں کیا ہے لوگوں نے حضرت کی علمی اور عملی حیثیت شہرت اور قبولیت کی بہت اونچی شان بتلائی لہٰذا اگلے دن جب حضرت ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تو بہت زیادہ اعزاز کیا اور نہایت تپاک سے ملے اور جو کچھ حضرت نے کہا اس کو قبول کیا دیر تک تحریک اور مشن آزادی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں پھر حضرت نے فرمایا کہ میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں انہوں نے فرمایا کہ ان سے ملنے کی کوئی ضرورت آپ کو نہیں ہے میں جو کچھ کہتا ہوں وہ انور پاشا ہی کا کہنا ہے مگر حضرت نے انور پاشا سے ملنے پر اصرار کیا تو انہوں نے ایک تحریک تمام ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنی طرف سے بحیثیت گورنر حجاز لکھ کر دی اور ایک تحریر گورنر مدینہ منورہ بصری پاشا کو لکھی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کا احترام کرو اور ان کو استنبول انور پاشا کے پاس پہنچا دو اور ایک تحریر انور پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کے مطالبات پورے کیجئے پھر تحریک آزادی کے متعلق حضرت شیخ کو ہدایات کیں کہ آپ تمام ہندوستان کو آزادی کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں۔ ہم ہر

قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا ضرور کریں گے عنقریب صلح کی مجلس منعقد ہو گی تو ہم اور ہمارے خلفاء جرمنی اور آسٹریا وغیرہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے لئے پوری جدوجہد کریں گے۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستانی لیڈر سست پڑ جائیں اور انگریزوں کی باتوں میں آ کر اس کے انتداب (میڈیٹ) یا اس کی تابعداری پر راضی ہو جائیں۔ تمام ہندوستانیوں کو اخباروں، عالم مجمعوں، تقریروں تحریروں میں اندرونِ ہند اور بیرونِ ہند ایک زبان اور ایک قلم ہو کر یہی مطالبہ جاری رکھنا چاہیئے اور جب تک مقصد حاصل نہ ہو جائے ساکت نہ ہونا چاہیئے۔ اس کا پروپیگنڈا پوری طرح پر جاری کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے آپ کو واپس جانا اور آپس میں اتفاق و اتحاد کے ساتھ مطالبہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس وقت انگریز مجھ کو نہایت خطرناک نظر سے دیکھتے ہیں میں اگر ہندوستان جاؤں گا تو راستے ہی میں گرفتار کر لیا جاؤں گا مگر میں اپنے رفقاء کو اس کام کے لئے تیار کر کے ہندوستان بھیجتا ہوں۔ اگر وہاں کی جماعتیں کانگریس وغیرہ اس پر عمل کر رہی ہیں مگر اب آپ کے حکم کے موافق کوشش زیادہ ہو گی اور پہلے سے زیادہ زوردار طریقہ پر یہ مطالبہ جاری کیا جائے گا۔ میں بالفعل بالا بالا ہندوستان کی مغربی حدود میں جانا چاہتا ہوں وہاں میرے مشن کے لوگ کام کر رہے ہیں ان میں مل کر کام کروں گا اس پہلی ملاقات کے بعد جب تک وہ مکہ معظمہ میں رہے دو تین ملاقاتیں نہایت راز کے ساتھ ہوئیں کہ معظمہ کے ہندوستانی باشندوں یا انگریزی سی۔ آئی ڈی کو خبر نہیں ہو سکی۔ پھر غالب پاشا طائف کو اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ میں تھوڑے دن قیام کر کے استنبول کو روانہ ہوں گے۔ اپنے تمام ساتھیوں مولانا مرتضٰے احسن صاحب مولانا محمد میاں صاحب مولانا سہول صاحب وغیرہ کو آخری قافلہ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان کو روانہ کر دیا۔ جدہ پہنچ کر ان کو کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہ ملا اس لئے وہاں ٹھہرنا پڑ گیا۔ جدا ہوتے وقت مولانا مرتضٰی حسن صاحب کو دیوبند کے مرکز پر کام کرنے کی ہدایات فرمائیں اور بہت سے خفیہ امور پر مطلع فرمایا اور مولوی محمد میاں صاحب کو جو کہ بعد میں محمد منصور انصاری کے نام سے مشہور ہوئے خاص شعبوں کی نگرانی سپرد کی۔ غالب پاشا کی تحریر بھی انہی کو دی گئی حضرت مولانا

خلیل احمد صاحب اگرچہ پہلے سے اس تحریک آزادی میں شریک نہیں تھے۔ مگر مدینہ منورہ میں پہنچ کر بالکل متحد اور ہم نوا ہو گئے تھے۔

میرا سیاسیات میں داخل ہونا

میں اس وقت تک نہ تحریک آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جب کہ محاذ سویز کے لئے متطوعین (والنٹرز) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اس محاذ پر جہاد کے لئے مدینہ منورہ سے گئے تھے مگر اس کے علاوہ عملی جدوجہد کی نوبت نہیں آئی تھی اب حضرت شیخ الہندؒ کے واقعات اور خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتدا اور رسم اللہ کا وقت ہے اور یہی وقت مولانا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ آمین اس کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب جب تک حجاز میں رہے بالکل متفق اور ہم نوا رہے۔

تقدیری امور پیش آکر رہتے ہیں۔ کچھ لوگ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ساتھ جہاز میں لاہور کے باشندے رفیق رہے تھے ان میں سے دو نوجوان مدینہ منورہ میں رہ گئے ہندوستان واپس نہیں ہوئے۔ جب تک عام حجاج مدینہ منورہ میں مقیم رہے کوئی تفتیش ترکی پولیس نے نہیں کی مگر قافلہ روانہ ہونے کے بعد تجسس شروع ہوا اور ہر باقی رہنے والے کی دیکھ بھال جاری ہوئی وہ دونوں لاہوری نوجوان پولیس انسپکٹر کی نظر میں مشتبہ ثابت ہوئے پولیس نے ان کو گرفتار کر لیا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سیدھے سادھے بزرگ تھے ان کو ان دونوں کے متعلق حسن تھا مولانا نے ان کی گورنر مدینہ کے یہاں برأت کی اس لئے کمشنر نے مولانا خلیل احمد صاحب کو بھی مشتبہ قرار دیا اور گورنر مدینہ منورہ بصری پاشا کو نہ صرف ان دونوجوانوں کی طرف سے بلکہ مولانا خلیل احمد صاحب کی طرف سے بھی بدظن کرنا شروع کیا۔ ادھر مولانا

مرتضےٰ احسن صاحب نے جدہ سے ہر ڈاک میں طویل طویل خطوط پانچ پانچ چھ چھ ورقوں پر بھیجنے شروع کئے وہاں ان کو کوئی کام نہیں تھا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو بلا دھڑک مضامین لکھتے تھے اور چونکہ بوجہ جنگ ڈاک خانہ میں کوئی خط غیر عربی یا ترکی نہیں لیا جاتا تھا تو انہوں نے بدویوں کے ذریعہ بھیجنا شروع کیا وہی ڈاک لانے والا بدوی بھی طریقہ پر لاتا تھا پوسٹ آفس کی مہر اور ٹکٹ اُن پر نہیں تھے۔ یہ طریقہ حجاز میں جاری تھا وہ ڈاک لانے والا بدوی کچھ اجرت لے کر مکتوب الیہ کو پرائیویٹ خط پہنچا دیتا تھا۔ کسی طریقہ سے پولیس کمشنر نے وہ خطوط بدوی سے حاصل کرلئے وہ خطوط سنسر ہوئے تو پولیس کمشنر کو ان کے ترجموں سے اور بغیر پوسٹ آفس آنے سے شبہ ہوا اس نے گورنر مدینہ دربصری باشاہ کو بدظن کر دیا۔ جب کہ ہم سب مطمئن تھے پولیس کمشنر کی طرف سے گورنر مدینہ طیبہ کے پاس یہ شکایتیں پہنچیں اور وہ ان سب حضرات سے بدظن ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب حضرت شیخ الہندؒ صاحب اس سے ملنے اور استنبول جانے کے لئے تقاضا کرنے گئے تو اس کا رُخ بدلا ہوا پایا اور دیکھا کہ وہ غیر اطمینان بخش باتیں کر رہا ہے اُس پر مزید یہ کارروائی کی گئی کہ دونوں حضرات (حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ) کو آفس میں بلا کر پوچھ گچھ کی گئی اور جوابات قلم بند کر کے شام کو بھیجے گئے اس لئے سب کو فکر ہوئی کہ کہیں کوئی فتنہ سامنے نہ آجائے۔ جنگ کا زمانہ ہے ہر ایک حکومت اس وقت انتہائی احتیاط سے کام لیتی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان احوال کو دیکھ کر اسی ترجمان (ترکی تاجر) کے واسطے سے غالب پاشا کو خط لکھا کہ یہاں گورنر مدینہ منورہ رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ پولیس کمشنر نے گورنر کو مشتبہ کر دیا ہے کیوں کہ اس کو ہمارے مخالفین نے بدظن کر دیا ہے۔ اس خط کے پاتے ہی غالب پاشا نے گورنر مدینہ کو نہایت تاکیدی خط لکھا کہ مولانا محمود حسن صاحب بہت بڑے اور معتمد علیہ شخص ہیں میں نے پوری تحقیق کر لی ہے ان پر ہرگز شبہ نہ کرو اور ان کے منشا کے مطابق ان کو انور پاشا کے پاس روانہ کردو۔ اس سے گورنر مدینہ منوّرہ کا رویہ اور خیال یک بارگی بدل گیا اور اس نے حضرت رحمۃ اللہ کو بلا کر معذرت کی اور پولیس کمشنر کو بلا کر تنبیہ کی اور حضرت شیخ الہندؒ کو کہا کہ آپ تیاری کرلیں جب آپ تیار ہو جائیں گے بھجدیا جائے گا اس کے ایک دو دن بعد

ہی خبر آئی کہ انور پاشا اور جمال پاشا مدینہ منورہ آ رہے ہیں۔

انور پاشا اور جمال پاشا کی مدینہ منورہ میں آمد اور ملاقات

اس وقت تک مدینہ حجاز ریلوے جا رہی تھی۔ ٹرین آتی جاتی تھی تار بھی جاری تھا۔ یکا یک تار آیا کہ یہ دونوں وزیران جنگ دورہ کرتے ہوئے کل کو مدینہ منورہ پہنچیں گے ہم نے بھی عرشی تیاری کی حکومت مدینہ منورہ بھی استقبال کی تیاری میں مشغول ہوگئی اور اہل شہر بھی استقبال کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ چونکہ انور پاشا اس زمانہ میں حکومت ترکیہ کے وزیر جنگ تھے اور جمال پاشا چوتھے فیلق (ڈویژن) کے جو کہ محاذ جنوبی اور غربی پر یعنی میدان سویز سینا، حجاز پر متعین تھا، کماندار تھے اس لئے انور پاشا کا فریضہ تھا کہ مرکز کی خبر گیری رکھتے ہوئے ہر محاذ کی محافظت کریں اور جمال پاشا کو صرف اپنے محاذ کی خبر گیری ضروری تھی۔ اس لئے انور پاشا تمام محاذوں کا دورہ کرتے ہوئے جب محاذ جنوبی غربی پر پہنچے اور سوریہ (سیریہ شام) اور سویز وغیرہ سے فارغ ہوئے تو ضروری معلوم ہوا کہ بادشاہ دو جہاں سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کا شرف بھی حاصل کر لیں اس لئے مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ کیا گیا اور جمعہ کا مبارک دن اس کے لئے مقرر کیا گیا۔ چنانچہ جمعہ کی صبح کو تقریباً ۹ یا ۱۰ بجے وہ اسپیشل ٹرین جس میں یہ دونوں وزراء اور ان کے رفقاء تھے حسب اعلان مدینہ منورہ پہنچی۔ وقت معین سے پہلے مشتاقان ملاقات اور زائرین کی بے شمار تعداد نے تمام اسٹیشن اور اس کے جوانب کو بھر دیا تھا۔ اہل شہر اور حکومت اور فوج کی طرف سے جلوس کا انتظام کیا گیا تھا جب دونوں حضرات اترے تو اسٹیشن کے بڑے ہال میں آئے وہاں میونسپلٹی کی طرف سے ایڈریس پیش کیا گیا جائے کا پہلے سے انتظام تھا رؤساء شہر اور معززین کا تعارف کرایا گیا۔ ایڈریس کا جواب دینے کے بعد مسجد نبوی کی طرف روانگی ہوئی چونکہ جمعہ کا وقت قریب آگیا تھا اس لئے یہی قصد کیا گیا کہ زیارت حضور علیہ السلام سے فارغ ہو کر مسجد ہی میں ٹھہرے رہیں نماز جمعہ سے فراغت کے بعد قیام گاہ پر جائیں۔ جلوس کی روانگی کے وقت فٹن سواری کے لئے پیش کی گئی تو انور پاشا نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم غلامانہ طریق سے بارگاہ نبوت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ اس لئے پیدل چلیں گے۔ اہل شہر نے پہلے ہی سے جلوس کی مندرجہ ذیل ترتیب دے رکھی تھی ارباب طریقت کا مجمع معہ اپنے اپنے

مریدین کے سب سے آگے آگے زرین جھنڈے لئے ہوئے اور ذکر و تسبیح بالجہر کے ساتھ اشعار مدحیہ پڑھتے ہوئے چل رہا تھا۔ ان کی سات یا آٹھ جماعتیں تھیں اس کے بعد حرم نبوی کے خدام کی علیحدہ علیحدہ مختلف جماعتیں تھیں موذنوں کی جماعت جاروب کشوں کی جماعت اماموں کی جماعت خطیبوں کی جماعت علیحدہ علیحدہ تھیں۔ سب سے اخیر میں حجرہ شریفہ کے خصوصی خدام آغاوات (خواجہ سراؤں) کی جماعت تھی۔ سب کے سب اپنی اپنی یونیفارم (وردیاں) پہنے ہوئے حمد و صلوٰۃ دعاء و ثناء پڑھتے ہوئے خراماں خراماں چل رہے تھے ان کے بعد یہ دونوں وزیر (انور پاشا اور جمال پاشا) نہایت ادب سے ہاتھ باندھے نظریں نیچے کئے ہوئے چل رہے تھے ان کے پیچھے ان کے رفقاء اور حکام شہر تھے ان کے بعد اہل شہر تھے۔ تمام جلوس کے دائیں اور بائیں مسلح فوجیوں کی قطار تھی۔ میں (کاتب الحروف) تاک میں تھا کہ موقع ملے تو انور پاشا کے پاس پہنچوں اور عرضی پیش کردوں۔ چنانچہ قطار چیر کر انور پاشا کے پاس پہنچا اور اس عرضی کو جس میں حضرت شیخ نے تنہائی میں ملاقات کی استدعا کی تھی پیش کردی انہوں نے اپنے پرائیویٹ سکرٹیری کو دے دی۔ مفتی ماموں بری کو جو کہ مدینہ منورہ میں تمام مذہبی اور دینی طبقات کے رسمی سردار تھے اور نقیب الاشراف شامیؒ کو جو کہ رفقاء انور پاشا میں سے تھے میں نے پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ ان کی اعانت اور ہمدردی کی وجہ سے مجھ کو کسی طرف سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ میں عرضی دے کر واپس آیا تو بعد میں معلوم ہوا کہ عرضی پر غور کیا گیا اور دونوں مذکورہ بالا معززین کی سعی سے مغرب کے بعد کا وقت تنہائی میں ملاقات کا دیا گیا چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ موقعہ ملاقات پر پہنچے ایک تنہا اور بند کمرہ میں ملاقات ہوئی۔ جمال پاشا سے باتیں ہوئیں۔ غالب پاشا کا خط ان کو دکھایا گیا۔ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور تمام باتیں غور اور اطمینان سے سنیں اور فرمایا کہ تحریک مطالبہ آزادی اہل ہند کو متفقہ طور سے جاری رکھنی چاہیئے جب تک مقصود یعنی آزادی کامل حاصل نہ ہو جائے ساکت نہ ہوں۔ عنقریب صلح کی مجلس بیٹھے گی ہم اہل ہند کی آزادی کے لئے پوری جد وجہد عمل میں لائیں گے۔ تم لوگ مطمئن رہو۔ اور جس طرح ممکن ہو گا ہم ان کی (اہل ہند) کی امداد و اعانت کریں گے اس وعدہ اور عہد کے لئے انہوں نے

کہا کہ تمہاری خواہش کے موافق تحریر بھی دیں گے ہم نے عرض کیا کہ تحریر صرف ترکی زبان میں نہ ہونی چاہیئے بلکہ عربی اور فارسی میں بھی ہونی چاہیئے تاکہ اہل ہند سمجھ سکیں انہوں نے اس کو قبول کیا مگر یہ کہا کہ چونکہ یہاں کا قیام حسب پروگرام تھوڑا ہے اور مقامی مشاغل بہت زیادہ ہیں اس لئے ہم شام (دمشق) جاکر تحریریں مکمل کر کے بھیجدیں گے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مطالبہ کیا کہ مجھ کو حدود افغانستان تک یا لا یا لا پہنچا دیا جائے ہندوستان کے راستے سے مجھ کو وہاں تک (مرکز تحریک یعنی یاغستان تک) اس وقت پہنچنا غیر ممکن ہے انہوں نے اس سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ روس نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کر کے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے اور سلطان آباد تک پہنچ گیا ہے اس لئے یہ امر ہمارے قبضہ سے اس وقت باہر ہے یا تو آپ جدہ ہی کے راستہ سے اپنے وطن واپس جائیں اور اگر آپ کو اپنی گرفتاری کا خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی عملداری میں کسی دوسری جگہ قیام فرمائیں۔ اطمینان بخش باتوں کے ہو جانے کے بعد ہم واپس آ گئے۔

مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں جلسہ علماء اور حضرت شیخ الہندؒ

مفتی ماموں بری مرحوم صدر علماء مدینہ منورہ کے پاس انور پاشا کا حکم اسی شب میں پہنچا کہ میں علماء مدینہ منورہ کی تقریریں سننے کا شائق ہوں مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر ایک عالم کے حلقہ درس میں علیحدہ علیحدہ جاکر تقریریں سنوں اس لئے میری خواہش ہے کہ صبح کو بعد از اشراق مسجد نبویؐ میں علماء مدینہ جمع ہو جائیں اور اپنی اپنی تقریروں سے ہم کو مستفیض فرمائیں مفتی صاحب موصوف چونکہ ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مرحوم مجددی دہلوی کے شاگرد تھے اس لئے کاتب الحروف اور حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے ساتھ نہایت دوستانہ بلکہ مشفقانہ تعلق رکھتے تھے انہوں نے نقیب العلماء کو بھیجا کہ انور پاشا چاہتے ہیں کہ صبح کو اشراق کے بعد علماء کا اجتماع مسجد نبوی (حرم محترم میں) ہو اور علماء تقریر کر کے حاضرین مجلس کو مستفیض کریں اسلئے تم کو اس وقت حاضر ہونا چاہیئے اور میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر دو حضرات مشایخ بھی

تشریف لائیں ہمارے لئے یہ زرین موقعہ تھا ہم نے قبول کر لیا۔ چنانچہ اجتماع ہوا اور مقام صدارت انور پاشا کے لئے تسلیم کیا گیا۔ مفتی صاحب ان کے سامنے وسط میں بیٹھے اور اپنے بائیں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے بائیں مولانا خلیل احمد صاحب اور اُن کے بائیں کاتب الحروف کو بٹھایا گیا۔ مفتی صاحب نے اولاً انور پاشا اور جمال پاشا سے تمام علماء حاضرین کا تعارف اور مصافحہ کرایا بعض حضرات نے کچھ نعتیہ اشعار بلند آواز سے پڑھے اس کے بعد تقریر کا حکم ہوا حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمہم اللہ نے یہ عذر کیا کہ چونکہ ہم ہندوستانی ہیں ہم کو عربی زبان میں تقریر کی عادت اور مہارت نہیں ہے اس لئے ہم معافی چاہتے ہیں۔ پھر مجھ کو حکم کیا گیا۔ مجھ کو عربی زبان میں عادت تھی ہی میں نے حسب مناسبت وقت فلسفہ جہاد پر مبسوط اور مفصل تقریر کی جس میں عقلی اور نقلی دلائل سے روشنی ڈالی کہ نوع انسان کی فلاح اور بہبودی کے لئے جہاد عقلی طور پر ضروری ہے اسی میں انسانوں کی ترقی اور بہبودی اور کمال مضمر ہے اس کے علاوہ مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا یہ تقریر تقریباً آدھ گھنٹہ یا اس سے زیادہ جاری رہی اس کو حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا اور نہایت توجہ اور غور سے سنتے رہے بعد از تقریر سبھوں نے خوشی اور ممنونیت کا اظہار کیا اس کے بعد دوسرے علماء نے دوسرے موضوعوں پر تقریریں کیں مگر افسوس کہ حاضرین مجلس نے ان کی تقریروں کو اس قدر استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا تقریباً دو گھنٹہ کے بعد یہ جلسہ ختم ہو گیا انور پاشا نے کچھ نقد حاضر ہونے والے علماء کے لئے بذریعہ مفتی صاحب موصوف بطور نذرانہ بھیجا جو کہ پانچ اشرفی فی کس تقسیم کیا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے عذر کیا کہ ہمارے پاس خرچ کافی مقدار میں موجود ہے ہم کو حاجت نہیں ہے تو کہا گیا کہ یہ نقد صدقہ اور خیرات نہیں ہے یہ عطیہ شاہانہ ہے اس کو قبول کرنا چاہیئے تو دونوں حضرات نے قبول فرما کر مجھ کو ہی دے دیا۔

انور پاشا اور جمال پاشا کا شام کو روانہ ہوتا اور تحریرات کا وہاں سے بھیجنا

اس جلسہ کے چند گھنٹہ بعد دونوں حضرات اور ان کے رفقاء اسپیشل ٹرین میں شام کو واپس ہو گئے اور دو تین دن کے بعد تحریریں تینوں زبانوں میں مرتب شدہ دونوں وزیروں کی دستخط سے حضرت شیخ الہندؒ کے پاس بذریعہ گورنر مدینہ منورہ شام سے آ گئیں۔

مضمون سب کا ایک ہی تھا صرف زبان کا فرق تھا جس میں ہندوستانیوں کے مطالبۂ آزادی کے استحسان اور ان سے اس مطالبہ میں ہمدردی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کی اس بارہ میں امداد و اعانت کا وعدہ تھا اور ہر اس شخص کو جو کہ ترکی رعیت یا ملازم ہو حکم تھا کہ مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہندؒ) پر اعتماد کرے اور ان کی اعانت میں حصّہ لے۔

تحریرات اور وثائق کا ہندوستان پہونچانا

چونکہ حضرت شیخ الہند کو دھن لگی ہوئی تھی کہ جس طرح ممکن ہو یہ مرکز تحریک "یاغستان" جلد از جلد پہنچ جاؤں (اگرچہ اعلیٰ درجہ کے ترکی افیسر اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اصرار کرتے تھے کہ آپ ترکی قلمرو میں قیام کر کے یہاں ہی سے اپنی تحریک چلاتے رہیں) اس لئے تجویز فرمایا کہ ان تحریروں کے فوٹو متعدد لئے جائیں اور ہر مرکز اور برانچ پر وہ پہنچا دیئے جائیں مگر انگریزی عملداری میں جانے والوں کی چونکہ نہایت سخت تفتیش ہوتی تھی۔ کسی چیز کا نکال کرلے جانا نہایت مشکل ہوتا تھا اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ لکڑی کا صندوق کپڑوں کے رکھنے کا بنوایا جائے اور اس کے تختوں کو اندر سے کھود کر اس میں کاغذات رکھ دیئے جائیں اور پھر تختوں کو اس طرح ملا دیا جائے کہ جوڑ ظاہر نہ ہو اس وقت ایک نہایت ماہر اور اُستاد بڑھئی ہمارے مکان میں لکڑی کا کام کر رہا تھا اس سے کہا گیا اس نے اسی طرح جادی لکڑی کا صندوق بنا دیا اور کھدے ہوئے تختہ میں کاغذات رکھ کر اس طرح بند کر دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو شبہ بھی نہ کر سکے۔ صندوق میں کچھ زائد کپڑے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اور کچھ نئے کپڑے اور شامی تھان ریشمین اور غیر ریشمین مشجر وغیرہ کے بچوں اور عورتوں کے لئے رکھ دیئے گئے اور چونکہ ہر مہینہ میں تجارتی جہاز مغل کمپنی کا غلہ اور سامان لے کر جدہ آتا تھا اور واپسی پر بقیہ حجاج کو لے جاتا تھا تجویز ہوا کہ اس میں حضرت شیخ الہندؒ کے بقیہ رفقاء اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور ان کے رفقاء روانہ کر دیئے جائیں۔ چونکہ زمانہ جنگ کا تھا اس لئے جہازوں کی آمد و رفت عام دستور کے مطابق جاری نہ تھی اس لئے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء میں سے مولانا ہادی حسن صاحب رئیس خانجہاں پور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی (جو کہ حیدر آباد سندھ کے باشندے اور مشن آزادی کے پہلے سے ممبر تھے) باقی رہ گئے تھے اور

جانے کا قصد[1] فرمارہے تھے۔ ان کو وہ صندوق دے دیا گیا اور سمجھا دیا گیا کہ اپنے مکان پر پہنچ کر ان کا غذات کو نکال لیں اور حاجی نور الحسن صاحب رئیس موضع زنہیڑی ضلع مظفر نگر کو دے دیں۔ وہ احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی سے ان تحریروں کے فوٹو اتروا کر چند کاپیاں لے لیں گے اور فلاں فلاں جگہ پہنچا دیں گے۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز اور آپ کے رفقاء مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ کو حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء کا قافلہ ۱۲ جمادی الثانی کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر اخیر ماہ مذکور میں مکہ معظمہ پہونچا حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز نے چند روز مکہ معظمہ میں قیام فرما کر "طائف" کا قصد فرمایا اور ۲۰ رجب کو آپ طائف روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اور دیگر رفقاء مکہ معظمہ میں رہ گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ شریف حسین کی بغاوت کی وجہ سے طائف میں محصور ہو گئے جب دس شوال کو طائف سے واپس ہو کر مکہ معظمہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد صاحب اور دوسرے رفقاء جہاز آجانے کی وجہ سے جدہ روانہ ہو گئے ہیں چونکہ کوئی خبر حضرت شیخ الہندؒ کے طائف سے واپس ہونے کی نہیں تھی اس لئے یہ سب حضرات بغیر انتظار اور بلا ملاقات روانہ ہو گئے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے ضروری سمجھا کہ ان سے وداعی ملاقات کی جائے اس لئے حضرت شیخ الہندؒ بھی جدہ روانہ ہو گئے۔ جب جہاز سامان وغیرہ اتار کر اور اپنی ضروریات پوری کر کے تیار ہو گیا تو جانے والے حضرات ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے مولانا ہادی حسن صاحب خانجہان پوری اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی تھے۔ ان سبھوں کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ساحل رپورٹ تک رخصت کیا اور جہاز روانہ ہو گیا۔

تحریرات کا ہندوستان پہنچنا اور سی آئی ڈی کی تفتیش سے بچ کر نکل جانا بمبئی میں سی آئی ڈی کو اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخلصین کو خیال تھا کہ اسی جہاز میں حضرت شیخ الہندؒ تشریف

---

[1] بلکہ اسی مقصد سے دو مہینہ پہلے جدہ روانہ ہو چکے تھے مگر بندر پر جہاز نہ ملنے کی وجہ سے وہ اور شاہ بخش صاحب موصوف مکہ معظمہ جا کر بانتظار جہاز ٹھہر گئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ معہ دیگر رفقا جب مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ پہنچے تو اس وقت تک یہ وہیں تھے اور جہاز کے منتظر تھے۔

لائیں گے اس لئے انگریزی پولیس سی آئی ڈی اور اہل شہر کا بہت بڑا مجمع جہاز پر پہنچ گیا تھا۔ اسی مجمع میں سے ایک صاحب نے جو حضرت شیخ الہندؒ کے مخلصین میں سے تھے مولانا ہادی حسن صاحب سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو مجھ کو فوراً دے دیجئے میں اس کو نکال دوں گا اور جہاں پہنچانا ہو اس پتہ دے دیجئے۔ وہاں پہنچا دوں گا۔ مولانا ہادی حسن صاحب اگرچہ پہلے سے ان سے واقف نہیں تھے مگر ان کے مخصوص انداز سے ان کے اخلاص و صداقت کا یقین ہو گیا اور صندوق ان کے حوالہ کر دیا۔

یہ صاحب عام مسافروں کے سامان کے ساتھ یہ صندوق بھی قلیوں سے اٹھوا کر لے گئے اور فوراً اسٹیشن لے جا کر بذریعہ پارسل چلتا کر دیا۔ پولیس اور سی آئی ڈی کو اس کی ہوا بھی نہ لگ سکی (یہ حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت تھی) جب یہ صاحب صندوق اٹھوا کر لے جا رہے تھے اس وقت پولیس اور سی آئی ڈی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ڈھونڈنے میں مشغول تھی۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ نہیں ہیں۔ البتہ ان کے ساتھ کے کچھ لوگ ہیں تو پولیس نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا ہادی حسن صاحب کو حراست میں لے لیا اور نہایت سخت تلاشی لی۔ حتیٰ کہ ہاتھ کی چھڑی بھی توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔ مگر بحمد اللہ کوئی مشتبہ چیز نہیں نکلی[1] پھر ان سب کو پولیس کی حراست میں نینی تال پہونچا دیا گیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے وہاں پوچھ گچھ ہوئی تو فرمایا کہ میں فلاں جہاز سے فلاں تاریخ کو گیا تھا۔ مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ کا ساتھ نہ جانے میں تھانہ آنے میں۔ البتہ عام حاجیوں کی طرح حج و زیارت میں میری شرکت بھی رہی ہیں ان کی پارٹی میں نہیں ہوں ایک ہفتہ یا عشرہ حضرت مولانا موصوف کو رکھ کر چھوڑ دیا گیا البتہ مولانا ہادی حسن صاحب کو روک لیا گیا ان سے بہت زیادہ پوچھ گچھ ہوئی۔ ڈرایا دھمکایا گیا سختی بھی کی گئی اور لالچ بھی دیا گیا مگر یہ نہایت مستقل رہے کسی راز کی خبر نہیں دی جب ہر قسم کی سختی اور طمع دینے پر بھی کوئی بات معلوم نہیں

---

[1] حاجی شاہ بخش صاحب سندھی کے پاس ان انقلابی اخباروں کے پرچے تھے جن کو خیری برادرس نے برلین سے جاری کیا تھا اور جو اعلانات ترکی سے ترغیب جہاد وغیرہ میں شائع ہوتے تھے ان سب کو انہوں نے زنبیل میں حفاظت سے رکھ رکھا تھا جب جہاز پر پولیس کی یہ یورش دیکھی تو یہ اسی بھیڑ میں زنبیل ہاتھ میں لٹکائے ہوئے پھرتی سے نکل گئے چونکہ غیر معروف شخص تھے کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا مگر جب وطن پہنچے تو گرفتار کر لئے گئے اور کچھ دنوں نظر بند رہ کر رہا ہو گئے۔

ہوئی تو ایک ڈیڑھ ماہ بعد آپ کو بھی رہا کر دیا گیا۔

صندوق خان جہان پور میں

مولانا محمد نبی صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ صندوق کے تختوں میں کوئی راز کی چیز ہے لہٰذا جیسے ہی صندوق پہنچا اس کے کپڑے نکال کر لکڑی کے دوسرے صندوق میں رکھ دیئے۔ اور اس صندوق کو توڑنا شروع کر دیا۔ ان کی اطلاع صحیح ثابت ہوئی اور ایک تختہ کے اندر سے یہ تینوں کاغذات برآمد ہوئے فوراً ہی ان کو نکال کر محفوظ کر لیا۔

پولیس کی یورش۔ تلاشی اور حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کی کرامت

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ایک صاحب کے بیان سے سی۔ آئی۔ ڈی نے پتہ چلا لیا کہ وہ کاغذات لکڑی کے ایک صندوق میں مولانا ہادی حسن صاحب کے یہاں ہیں فوراً مولانا کے مکان پر پولیس کی دوڑ پہنچی اور مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ایک عجیب وغریب اتفاق تھا کہ مولانا محمد نبی صاحب اسی وقت ان تحریروں کو نکالے ہوئے نقل کر رہے تھے سپاہیوں کی دوڑ دیکھ کر جلدی میں ان کاغذات کو موڑ توڑ کر صدری کے جیب میں رکھ لیا اور صدری مردانہ مکان میں ایک کھونٹی پر لٹکا دی۔

تلاشی دس بجے سے شروع ہوئی اور نہایت سختی کے ساتھ چار بجے تک جاری رہی۔ عورتوں کو ایک کمرہ میں الگ بند کر دیا گیا تھا۔ ہر شخص کی تلاشی لے کر مردانہ مکان میں سے بھی نکال دیا۔ صرف ایک نمبردار صاحب پولیس کے ساتھ رہے تھے ہر ایک چیز کی تلاشی لی گئی۔ کھیل کھلونوں اور عورتوں بچوں کی ڈبیوں تک کو کھول کھول کر دیکھا گیا۔ کپڑوں کے صندوق کی کمبختی آئی۔ اُس کا ایک ایک تختہ توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ مگر جس چیز کی تلاش تھی وہ دستیاب نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ صندوق وہ صندوق ہی نہ تھا۔ اور عجیب اتفاق یا حضرت شیخ الہند کی کرامت یہ تھی کہ اس صدری پر کسی کی نظر نہ گئی جو مردانہ مکان میں سب کے سامنے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی تھی اور جس میں وہ خزانہ تھا جس کی جستجو میں پولیس سرگرداں تھی

چھ گھنٹہ کی سرگرم تفتیش اور تلاشی کے بعد پولیس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ موضع رہنبڑی بھی ضلع مظفر نگر میں ہے۔ یہاں جناب حاجی نورالحسن صاحب رہتے تھے جن کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ قدس اللہ سرہٗ العزیز نے پہلے فرمادیا تھا کہ وہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر اور اس کی کاپیاں کراکر فلاں فلاں مرکز میں بھیجیں گے۔ پولیس حاجی صاحب کے یہاں بھی پہنچی۔ مگر ناکام واپس ہوئی۔

حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر کے یہاں تلاشی اور ناکامی!

سراغ رساں نے پولیس کو صحیح بتایا تھا کہ حاجی احمد مرزا صاحب کے یہاں تحریروں کے فوٹو لئے جائیں گے۔ چنانچہ پولیس نے حاجی صاحب کی دوکان پر چھاپہ مارا مگر اب تک وہ تحریریں حاجی صاحب کے یہاں نہیں پہنچی تھیں حاجی نورالحسن صاحب رحمۃ اللہ اسی وقت ان کو لے جا رہے تھے جب حاجی صاحب فوٹو گرافر صاحب کی دوکان کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ پولیس دوکان کا محاصرہ کئے ہوئے ہے حاجی صاحب ان تحریروں کو جیب میں ڈالے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہو گئے۔

دوسرے وقت حاجی نورالحسن صاحب مرزا صاحب کی دوکان پر پہونچے۔ مرزا صاحب کی ثابت قدمی اور پختگی ملاحظہ کیجئے کہ پولیس ایک دفعہ چھاپہ مار چکی ہے خدشہ اور خطرہ موجود ہے مگر ہر خطرہ سے بے نیاز ہو کر حاجی صاحب نے فوٹو لئے۔ عین اس وقت کہ پلیٹیں پانی میں پڑی ہوئی تھیں اور پانی کا طشت میز کے نیچے رکھا ہوا تھا پولیس پہنچ گئی۔ ساری دوکان چھان ماری ہر ایک البم ٹٹولا مگر اس طشت پر کسی کی نظر نہیں گئی اس کو حضرت شیخؒ کی کرامت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے بہر حال پولیس یہاں سے بھی ناکام واپس ہوئی۔

حاجی صاحب کا حسب ہدایت کام کرنا

فوٹو کی کاپیاں تیار ہوگئیں حاجی نورالحسن صاحب نے ان کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور جہاں جہاں پہنچانے کا حکم تھا پہنچا دیا یہ غلط ہے کہ ان تحریرات کو جلا دیا گیا جیسا کہ مولانا عبیداللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں وہ اس زمانہ میں کابل میں تھے ان کو غلط خبر پہنچائی گئی یہ تمام فوٹو ذمہ داران مراکز کے پاس پہنچا تو دیئے گئے تھے مگر چونکہ حکومت کی طرف سے تشدد اور چھان بین بہت زیادہ ہو رہی تھی تو ممکن ہے کہ بعض

لوگوں نے ان کو جلا دیا ہو تاکہ کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔

ان تحریرات کا کارآمد نہ ہونا یہ تحریرات اور وثائق بہت زیادہ کارآمد ہوتے اور حکومت ترکیہ اور اس کے حلفا پوری طرح امداد کرتے مگر قدرت نے پانسہ ہی پلٹ دیا جرمنی اور ترکی کی فتح مندی اور کامیابی کے بعد جب امریکہ انگریزوں کا حلیف ہو گیا اور مسٹر ولسن کے پرفریب نکات سامنے آئے تو یکایک حالت بدل گئی اور کل کی فتح آج کی شکست بن گئی امریکہ کی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار جب اتحادیوں (انگریزوں اور فرانس وغیرہ) کی مدد پر آگئے اور ادھر شریف حسین نے غدر اور خیانت کر کے انگریز کی حمایت میں ترکوں اور ان کی قوت کو ہر قسم کا نقصان پہنچایا، عربوں اور ترکوں میں انتہائی نفرت پھیلا دی تاآنکہ سوریا، فلسطین، عراق وغیرہ میں عرب کے عوام ترکوں کو قتل و غارت کرنے لگے اور عرب سپاہی ترکی فوج میں سے بھاگنے لگے اور بجد و جہد سے جان چرانے لگے تو طبعی طور پر ہر جگہ ناکامی پر ناکامی ہی سامنے آگئی اور جو کچھ نہ ہونا چاہیئے تھا وہ واقع ہو گیا۔ تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کا ملک ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا طائف روانہ ہونا اور محصور ہو جانا انور پاشا اور جمال پاشا سے جب تحریری دستاویزیں حاصل کریں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا قصد تھا کہ کسی طرح ایران کے راستے بالا بالا یاغستان (یعنی اپنی تحریک کے مرکز پر) پہونچ جائیں مگر روسی اور انگریزی فوجوں نے راستہ روک لیا تھا۔ جنگی محاذ ان راستوں پر قائم ہو گئے تھے۔ اس لئے یہی قصد فرمایا کہ بحری راستہ سے سفر کیا جائے اور بمبئی نہ جایا جائے بلکہ بلوچستان کے کسی بندر (مکران وغیرہ) پر بھیس بدل کر بادبانی جہاز سے پہونچیں اور پھر یاغستان کو وہاں سے روانہ ہو جائیں مگر چونکہ مختلف مصالح سے آخری ملاقات غالب پاشا سے ضروری سمجھتے تھے چند ضروری باتیں ایسی ملاقات میں طے کرنی تھیں اس لئے پہلے مکہ معظمہ اور پھر وہاں سے طائف کے لئے روانہ ہو گئے غالب پاشا ان دنوں طائف میں تھے۔ حضرت حضرت نے عام لوگوں سے یہی ظاہر فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ان دنوں گرمی زیادہ ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی زیارت بھی کرنی ہے اس لئے میں طائف

جارہا ہوں نصف شعبان تک واپس آجاؤں گا چنانچہ ۲۰ رجب کو مکہ معظمہ سے روانہ ہو کر ۲۳ یا ۲۴ رجب کو طائف پہنچے اور دو تین دن کے بعد غالب پاشا سے ملاقات کی کچھ باتیں طے ہوئیں اور کچھ کے لئے دوسری ملاقات کا وعدہ ہوا۔ یہ وقت آنے نہ پایا تھا کہ شریف حسین نے بغاوت کر دی اور ہم سب طائف میں محصور ہو کر رہ گئے جس کی تفصیل[1] ہم نے سفر نامہ میں لکھ دی ہے ایام حصار میں حضرتؒ ایک مرتبہ غالب پاشا سے پھر ملے پاشا موصوف نے چند اصولی باتیں بتانے کے بعد مجبوریاں ظاہر کیں۔ اور کہا کہ آپ مکہ معظمہ جا کر ہندوستان کو جلد از جلد چلے جائیں اور ہندوستانی رائے عامہ کو آزادی کامل کے مطالبہ پر متفق کریں مجلس صلح میں جو کہ عنقریب منعقد ہونے والی ہے انگریز پوری کوشش کرے گا کہ ہندوستان آزاد نہ ہو یا کم از کم ہندوستانیوں کو زیر سایہ برطانیہ اندرونی آزادی یعنی آدھی آزادی ملے مگر ہندوستانی باشندوں کو چاہیئے کہ بغیر مکمل آزادی کے کسی چیز پر راضی نہ ہوں۔

تقریباً ڈیڑھ مہینہ محصور رہنے کے بعد اہل طائف کے ساتھ ہم کو باہر آجانے کی سہولت حاصل ہوئی اور ۶ شوال کو ہم وہاں سے نکل کر مکہ معظمہ پہنچے شریف عبداللہ بن شریف حسین باغی کیمپ کا کماندار تھا اس نے ایک شب ہماری مہمان داری کر کے صبح کو مکہ معظمہ تک سواری کا انتظام کر دیا۔ ہم دس شوال کو مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ چونکہ زمانہ حج کا قریب تھا اس لئے حضرت شیخ الہندؒ کا ارادہ ہوا کہ حج تک یہاں قیام کیا جائے آنے والے حجاج سے اہل وعیال کی خیر وعافیت بھی معلوم ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ کوئی متعارف یا رشتہ دار بھی آجائے تو اس سے اس کا بھی پتہ چل جائے گا کہ انگریزی پالیسی حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اور دیگر سیاسیوں کے متعلق کیا ہے اگر نرمی معلوم ہوئی تو بمبئی کے راستہ سے واپس ہوں ورنہ کوئی دوسری صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ اتفاقاً قاضی مسعود احمد صاحب آخری جہاز میں اوائل ذالحجہ میں آگئے ان سے احوال معلوم ہوئے۔

---

[1] ملاحظہ ہو تتمہ

ڈاکٹر انصاری اور حکیم عبدالرزاق صاحب رحمہا اللہ کی غیر معمولی ہمدردی اور حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے ایک عزیز

ڈاکٹر انصاری صاحب اور اُن کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب رحمہا اللہ کو خیال ہوا کہ حجاز شریف میں گرانی زیادہ ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ تنہا نہیں ہیں بلکہ آپ کے ساتھ اور رفقاء بھی ہیں و یسے بھی حضرت موصوف کا حوصلہ فراخ اور دستر خوان وسیع ہے لہٰذا حضرت کے پاس جو اثاثہ ہوگا وہ ختم ہو گیا ہوگا اب کوئی اور رقم بھیجنی چاہیئے حج کا زمانہ تھا حجاج جا رہے تھے۔ کسی معتمد حاجی کے ذریعہ رقم بھیجی جاسکتی تھی لیکن ان دونوں رہنماؤں کی غیر معمولی ہمدردی کا فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت کے کسی قریبی عزیز کو جو خانگی حالات سے پوری طرح واقف اور خانگی امور میں بے تکلف ہو۔ بھیجا جائے تاکہ رقم کے ساتھ حضرت کو اپنے متعلقین کے حالات بھی تفصیل سے معلوم ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت کے ایک خاص عزیز کو (جن کا نام لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا) اس خدمت کے لئے (جو ان کے لئے سراسر سعادت تھی کیونکہ حضرت کی زیارت کے ساتھ حج بیت اللہ کی زیارت کا شرف بھی مفت میں حاصل ہو رہا تھا) نامزد کیا گیا۔ مزید برآں تار کے ذریعہ جہاز میں سیٹ بھی متعین کرائی اور روانگی کے لئے ایسا وقت مقرر کیا کہ بمبئی پہنچ کر جہاز کا انتظار نہ کرنا پڑے بلکہ فوراً ہی جہاز پر سوار ہو جائیں گے چنانچہ یہ عزیز دفعتہً دیوبند سے روانہ ہوئے اور بمبئی پہنچتے ہی بندرگاہ پہ چلے گئے۔

اس عجلت اور رازداری کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ حکومت کو رکاوٹ پیدا کرنے کا موقع نہیں مل سکا یہاں تک کہ عزیز موصوف کی روانگی کا علم بھی حکومت کو اُس وقت ہوا جب جہاز روانہ ہو چکا لیکن اس طرح روانگی سے حکومت کو شبہ بھی ہو گیا۔ اس لئے حکومت ہند کی طرف سے عدن تار دیا گیا کہ جہاز پر تلاشی لی جائے اور مشتبہ کاغذات وغیرہ قبضہ میں کر لئے جائیں۔ چنانچہ جب جہاز عدن پہنچا تو پولیس کی جمعیت جہاز پر آئی اور عزیز موصوف کی تلاشی پوری سختی کے ساتھ لی۔ مگر کوئی چیز ایسی برآمد نہ ہو سکی جس پر شبہ کیا جاسکے۔ لہٰذا عزیز موصوف بخیریت جدہ اور پھر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ حضرت کو اہل و عیال کی خیریت معلوم ہوئی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ پھر عزیز موصوف اور ان کے رفقاء نے جن میں مولانا ولی حسن صاحب حسن پوری بھی تھے بیان کیا کہ گورنمنٹ کی پالیسی حضرت کے بارہ میں بہت سخت ہے جب

کوئی جہاز بمبئی پہنچتا ہے تو سی۔ آئی۔ ڈی اور باوردی پولیس کا بڑا دستہ جہاز پر پہنچتا ہے اور ڈھونڈتا ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب کہاں ہیں جب تک اطمینان نہیں ہو جاتا کسی مسافر کو اترنے نہیں دیا جاتا۔ اس لئے کسی طرح مناسب نہیں کہ حضرت اس زمانہ میں بمبئی پہنچیں یا ہندوستان تشریف لے جائیں۔

عزیز موصوف نے ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کا بھیجا ہوا ایک ہزار روپیہ پیش کر دیا۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب کا راندیر سے ایک ہزار روپیہ بھیجنا مذکورہ بالا رقم کے علاوہ ایک ہزار روپیہ مولانا محمد ابراہیم صاحب اور راندیر کے احباب نے تاجروں کے ذریعہ بھیجے تھے جو انہیں ایام میں پہنچے تھے ان دونوں رقموں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ عبدالجبار صاحب دہلوی کے یہاں بطور امانت جمع کرا دیا چنانچہ مالٹہ میں ضرورت پڑنے پر رقم منگوائی گئی۔ اور کام آئی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

عزیز موصوف کی واپسی اس وقت تک مدینہ منورہ پر ترکوں کا قبضہ تھا اور ہر قسم کی کوششوں کے باوجود شریف حسین کی اور انگریزوں کی فوجیں کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ جنگ جاری تھی اور حجاج کی آمد و رفت کے راستے مسدود تھے۔ لہٰذا عزیز موصوف مدینہ طیبہ نہیں جا سکے اور حج سے فراغت کے بعد پہلے ہی جہاز سے آپ کو واپس ہونا پڑا اس قدر عجلت سے واپسی ایک اور سبب تھا جس سے انگریزی حکومت کے شبہات میں اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ جب واپسی کے لئے عزیز موصوف جہاز پر سوار ہوئے تو بہاء الدین محافظ حجاج اور سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر نے بڑی سختی سے آپ کی تلاشی لی اور ہر ایک چیز چھان ماری مگر کوئی مشتبہ چیز برآمد نہیں ہوئی۔ جہاز بمبئی پہنچا تو پھر ان کی تلاشی لی گئی اور ان کو حراست میں لے کر الہ آباد پہنچا دیا گیا۔

افشاء راز یہ محترم عزیز حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز سے جو رشتہ رکھتے تھے اس کا تقاضا تھا کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ تحریک ہی کے کام سے پوری رازداری کے ساتھ ایک کارکن کی حیثیت سے اتنا طویل سفر کر کے آپ حجاز شریف پہنچے تھے اس کے علاوہ چونکہ مولانا ہادی حسن صاحب جو مذکورہ بالا دو تاریخی صندوق ،، لے کر آئے

تھے جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر کے نینی تال میں نظر بند کر دیئے تھے۔ لہٰذا تشویش اور بے چینی تھی کہ جس مقصد کے لئے اتنی کوشش کی گئی۔ اتنی مصیبتیں جھیلی گئیں اور جس راز کو اس طرح مخفی کیا گیا۔ یہ سب کچھ بے نتیجہ رہے گا بلکہ ممکن ہے اس کے اثرات تباہ کن ثابت ہوں۔ اس بنا پر حضرت شیخ الہندؒ نے عزیز موصوف کو صندوق کا راز بھی بتادیا اور یہ بھی فرما دیا کہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں صاحب کے پاس بھجوا دیئے جائیں۔

دوسری طرف عجیب و غریب قصہ یہ تھا کہ عزیز موصوف کمزور دل ناتجربہ کار اور اور نو گرفتار تھے اور سی۔ آئی۔ ڈی کے وہ افسر[1] جنہوں نے الہ آباد میں ان سے گفتگو کی وہ پولیس کے کہنہ مشق شاطر اپنے فن کے بہترین ماہر تھے۔ ان افسروں نے ڈرا دھمکا کر پولیس کی تمام جابرانہ کارروائیاں عمل میں لا کر اور متعدد اوقات میں طرح طرح جرح کر کے وہ تمام باتیں معلوم کر لیں جو عزیز موصوف کے حافظہ میں تھیں ان میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں کہ اگر ثابت ہو جاتیں تو نہ معلوم کتنوں کو جام شہادت نوش کرنا پڑتا اور کتنے عبور دریائے شور اور حبس دوام کی سزا پاتے، صندوق کا قصہ بھی انہیں کے ذریعہ معلوم ہوا گویا سی۔ آئی۔ ڈی کو دولت کا خزانہ مل گیا۔ فوراً مظفر نگر پولیس کو تار دیا گیا اور مظفر نگر سے دوش خان جہاں پور پہونچی اور مولانا ہادی حسن صاحب کے مکان کی تلاشی لی گئی۔ پھر حاجی نور الحسن صاحب اور حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر کی تلاشی بھی اسی انکشاف کا نتیجہ تھا جس کا ذکر پہلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

---

[1] یعنی (۱) مسٹر سین (۲) تصدق حسین ہاپوڑی (۳) مظہر علی تھانوی۔ یہ تینوں افسر یوپی میں کام کرتے تھے حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے مشن آزادی کے متعلق ان تینوں نے بہت سرگرمی سے کام کیا تھا مسٹر سین انگریز تھا۔ یوپی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کا افسر اعلےٰ تھا۔ مگر مہذب۔ قانون کا پابند تھا۔ اس میں کسی قدر انسانیت بھی تھی۔ لیکن تصدق حسین اور مظہر علی نہایت جابر و ظالم تھے ان میں انسانیت اور تہذیب نام کو نہ تھی۔ انہوں نے حضرتؒ کے ساتھیوں پر نہایت وحشیانہ مظالم کئے۔

سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

حج کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کا مکہ میں قیام اور گرفتاری

حضرت شیخ الہندؒ نے اس سفر میں پہلا حج ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ میں کیا تھا پھر دوسرا حج طائف سے واپسی پر ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ میں کیا قاضی مسعود احمد صاحب اور دوسرے واقف حضرات کے روانہ ہو جانے کے بعد حضرت کو فکر ہوئی کہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو کر یاغستان پہونچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہیئے حضرتؒ نے بار بار فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ہمارا قیام کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ انگریز حکومت ہم سے بدظن ہی نہیں بلکہ برہم اور مخالف ہے اور شریف حسین انگریزی حکومت کے آلہ کار ہیں لہٰذا کسی بہتری کی توقع عبث ہے اس لئے جلد از جلد کوئی صورت ہونی چاہیئے کہ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔

لیکن اگر تنہا حضرت کی ذات مبارک ہوتی تو معاملہ آسان تھا مگر یہاں تو صورت یہ تھی کہ حضرت کے ساتھ چند رفقا تھے جو اپنا سب کچھ قربان کر کے حضرت کے ساتھ ہوئے تھے وہ حضرت کو کسی حال چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے اور نہ حضرت ان کی جدائی پسند کرتے تھے چونکہ ترجمہ قرآن شریف کا سلسلہ جاری تھا۔ لہٰذا کتابوں کا بھی ایک ذخیرہ ساتھ رہتا تھا سردی اور گرمی کے کپڑوں کے علاوہ ضعیف العمری اور امراض کی بناء پر دوائیں بھی ساتھ رہتی تھیں اس قسم کی اور ضروریات بھی تھیں۔ ان سب کے حمل و نقل کے لئے چند سواریاں درکار تھیں اور خاموشی سے دفعۃً روانہ ہو جانا مشکل تھا تاہم جب حضرت کا تقاضا شدید ہوا تو ایسا انتظام کیا گیا کہ خفیہ طور سے یہاں سے روانگی ہو جائے۔ چنانچہ ہم دو چار روز بعد روانہ ہونے والے تھے تدبیر کے راستہ میں تقدیر حائل ہو گئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ

محرم ۱۳۳۵ھ کی اخیر تاریخوں میں شیخ الاسلام مکہ معظمہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علماء مکہ عصر کے بعد آیا اور کہا کہ مجھ کو شیخ الاسلام نے بھیجا ہے اور حضرت شیخ الہند سے اس محضر کی تصدیق طلب کی ہے مولانا کے اس پر دستخط کرا دو اس کو دیکھا گیا تو عنوان یہ تھا دمن علماء مکۃ المکرمۃ المدرسین بالحرم الشریف المکی'' (مکہ مکرمہ کے علماء کی جانب سے جو مکہ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں) اور اس میں تمام ترکوں کی تکفیر اس بناء پر کی گئی تھی کہ انہوں نے سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کو معزول کیا ہے شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا اور ترکوں کی خلافت کا انکار تھا وغیرہ وغیرہ حضرتؒ نے اس پر دستخط

کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ چونکہ یہ محضر ان علماء مکہ مکرمہ کی طرف سے ہے جو کہ حرم مکی میں پڑھاتے ہیں اور میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور حرم مکی میں مدرس بھی نہیں ہوں اس لئے مجھ کو کسی طرح اس پر دستخط کرنا درست نہیں ہے وہ واپس چلا گیا۔ حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطرناک ہے حضرت نے جواب دیا کہ پھر کیا کیا جائے نہ عنوان اجازت دیتا ہے نہ مُعَنوَن بمُعنوَن میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں وہ سراسر خلاف شریعت ہیں۔ اس کے بعد سنا گیا کہ شیخ الاسلام عبداللہ سراج بہت برہم ہوئے خطرہ تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا اور کچھ جواب دے گا۔ دو چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء اور سید ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف طریقوں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا مگر کچھ نفع نہیں ہوا۔ اس کی پوری تفصیل سفرنامہ میں صفحہ ۲۲ سے اخیر تک صحیح طور پر ذکر کر دی گئی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو تتمہ)

خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب گرفتار کر کے جدہ بھیجے گئے ۲۴ صفر ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح زیر حراست جدہ پہنچے اور تقریباً ایک مہینہ زیر حراست رکھے گئے پھر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیوی جہاز سے اسی طرح زیر حراست سویز بھیجے گئے ۲۲ ربیع الاول کو سویز پہونچے وہاں سے گوروں کی حراست میں (جو کہ پندرہ یا سولہ تھے اور بندوق اور سنگینوں سے مسلح تھے) ہم کو قاہرہ ریل میں بھیجا گیا اور اسی دن عصر کے بعد ہم کو جیزہ کے سیاسی جیل (معتقل) میں داخل کر دیا گیا اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور فائل تھے۔ جن میں سی آئی ڈی کے بیانات اور رپورٹیں مندرج تھیں۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری فقط شریف کے محضر پر دستخط نہ کرنے اور شریف کی شکایت کی وجہ سے ہوئی ہے مگر بعد میں بیانات لیتے اور سوالات کرتے اور بار بار اس کے ان کتابوں کے دیکھنے اور حوالہ دینے سے ظاہر ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان جملہ کارروائیوں کی بنا پر ہوئی ہے جو کہ یاغستان کابل، فرنٹیر اور دیوبند وغیرہ

ہیں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں اور جن کی مخبری اپنوں اور پرایوں دونوں نے کی ہے بہت سی ایسی باتیں بھی پوچھی گئی ہیں جن کے متعلق یقین تھا کہ کسی کو اطلاع نہیں ہے حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اس کے پاس رجسٹر بہت بڑا تھا۔ بہرحال ہر شخص نے جوابات حسب اقتضاء وقت اپنی سمجھ کے مطابق دیئے۔ اگرچہ ہم میں سے سب کے سب ایسے ہی تھے کہ جن کو ایسے امور کا سابقہ اس سے پہلے نہیں پڑا تھا اور بوجہ اس خیال کے کہ یہاں مصر میں ہندوستان کے واقعات اور وہاں کی کارروائیوں کا جاننے والا کوئی نہ ہوگا ہم نے آپس میں کوئی قرارداد بھی طے نہیں کی تھی مگر اظہار اور جوابات سب کے تقریباً ایک ہی جیسے رہے۔ اگرچہ علیحدہ علیحدہ ہوئے۔ جیزہ کے جیل (معتقل) میں تقریباً ایک مہینہ رکھنے اور بیانات لے لینے کے بعد پاسپورٹ مرتب کیا گیا اور ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۱۷ء ہم کو مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ گوروں کی گارد سنگینوں سے مسلح ہماری حراست کرتی تھی اسی روز شام کو مالٹہ جانے والے جہاز پر سوار کئے گئے اور ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ میں مالٹہ پہنچ گئے۔

۲ رجمادالثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً ۳ برس دو مہینہ مالٹہ میں رہ کر ہم مالٹہ سے روانہ ہوئے روانگی کے وقت رخصت کرنے کے لئے تمام ترکی افیسر (جو کہ اس وقت تک رہا نہیں ہوتے) صدر اعظم ٹرکی سے لے کر نیچے کے عہدوں تک سب کے سب خود جمع ہو گئے اور بہت زیادہ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے رہے۔ شیخ الاسلام خیرالدین افندی نے خاص طور سے ہاتھ اٹھا کر آواز سے دعا مانگنی شروع کی اور تمام افیسروں نے ان کی موافقت کی، آمین آمین کی آواز سے فضا گونج رہی تھی پھر سب نے نہایت تپاک سے آبدیدہ ہو کر رخصت کیا یہ مجمع اور سماں نہایت عجیب و غریب تھا بہت سے دنیاوی وجاہت اور دولت والے مالٹہ سے اس سے پہلے روانہ ہوئے مگر ایسا بڑا مجمع اور اتنے بڑے رتبہ والوں کا اجتماع اور اتنی محبت اور اخلاص کا مظاہرہ اور اس ہیئت دعائیہ اور آمین کا اظہار کسی کے لئے نہیں ہوا تھا۔ انگریزی افیسر بہت سے وہاں موجود تھے اس حالت کو دیکھ کر نہایت تعجب کرتے تھے مگر یہ عزت حقانی تھی جس میں نفسانیت کا کوئی شائبہ نہ تھا وہ شخص جس نے قول و عمل میں کبھی اپنی بڑائی کا مظاہرہ نہ کیا ہو، جس کو اہل دولت اور اصحاب مناصب کے اختلاط سے دحشت ہو، جس کو تکلف صوری اور طلب وجاہت دنیاوی سے نفرت ہو جس کی چال ڈھال

بیٹھنا اٹھنا، رفتار و گفتار وغیرہ سب سے مسکنت اور تواضع ٹپکتی ہو اس کی یہ عزت اور تمکنت، خلق خداوندی میں عام قبولیت، اس کے انتہائی تقویٰ اور للّٰہیت اور بارگاہ خداوندی میں بلند پائیگی کا اثر نہ تھا تو کس چیز کا تھا ع قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں ۹

ایں سعادت بزور بازو نیست
گر نہ بخشد خدائے بخشندہ

رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ وایدنا بامدادہ فی الدنیا والآخرہ آمین۔

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء آگبوٹ اسکندریہ پہونچا اور ۲۶ جمادی الثانی سیدی بشر میں جو کہ قرارگاہ اسراء مصر میں تھا داخل کر دیئے گئے۔ تقریباً اٹھارہ روز وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۳ رجب ۱۳۳۸ھ کو مطابق ۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویس کو روانہ کئے گئے سویس میں بھی ہم سنگینوں کے پہرہ میں اسیروں کے کیمپ میں مثل سیدی بشر داخل کئے گئے۔ یہاں پونے دو مہینہ کیمپ میں رہنا پڑا۔ ۵ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۳ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن آگبوٹ پر پہنچایا گیا ۱۲ رمضان ۱۳۳۸ھ کو جہاز عدن پہنچا۔ چونکہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھیرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور تین تار ہندوستان کو ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحب کو دیوبند میں دوسرا ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں تیسرا حکیم اجمیری کو بمبئی میں ہم نے دے دیا۔ جس سے تمام احباب کو اطلاع ہوگئی تار کے الفاظ حسب ذیل تھے ”ہم لوگ ۸ جون تک بمبئی پہنچیں گے“، مختصر یہ کہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۸ جون ۱۹۲۰ء کو ۳ برس ۷ مہینے کے بعد بمبئی پہنچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔

بمبئی پہنچنے اور خلافت کمیٹی کے استقبال کرنے کی کیفیت

بمبئی پہنچنے پر سب سے پہلے سی آئی ڈی کا افسر انگریز مع دو تین ہندوستانی افسروں کے آیا اور حضرت شیخ الہندؒ سے کہا کہ میں تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں حضرت اس کے ساتھ کمرہ میں چلے گئے اس نے کہا ”مولوی رحیم بخش صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں آپ بغیر ان کے ملے ہوئے ہرگز جہاز سے نہ اتریں“، یہ کہہ کر وہ چلا گیا ہم کو جہاز پر ہی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اب ہم بالکل آزاد ہیں ہم نے مولوی رحیم بخش صاحب کا بہت انتظار کیا جب وہ پہونچے تو میں اور مولانا عزیز گل صاحب اسباب

سے کو کنارہ پر چلے گئے۔ بعد کو مولوی رحیم بخش صاحب آئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ کے لئے اسپیشل ڈبہ ریل میں میں ریزرو کرادوں گا آپ ابھی اتریں اور ریل پر چلے چلیں حضرت نے فرمایا کہ آپ کا انتظار کر کے حسین احمد اور مولوی عزیز گل کنارے پر چلے گئے ہیں وہ آجائیں تو روانگی ہوسکے گی۔ چوں کہ ہمارے کنارہ پہنچنے پر زور کی بارش ہوگئی اور دریا میں طوفان آگیا جہاز دریا میں کنارہ سے دور لنگرانداز ہوا تھا اس لئے اس روز کوئی ہوڑی حضرت شیخ الہندؒ کو جہاز سے لانے کے لئے نہ مل سکی اگلے روز ۱۲ رمضان کو حضرت اتر سکے۔ مولوی رحیم بخش صاحب گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے آئے تھے مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ تحریک خلافت میں شریک نہ ہوں اور بالا بالا ریل پر سوار ہو کر دیوبند چلے جائیں۔ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہوجائیں اسی لئے وہ اگلے دن آتارنے کے لئے اسٹیمر پر پہنچے مگر جب لانچ کنارہ پر پہنچی تو مولانا شوکت علی مرحوم اور ہزاروں اشخاص ممبران خلافت کمیٹی نے زوردار استقبال کیا۔ نعرہ ہائے تکبیر سے فضا کو گونجا دیا اور حضرت کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کار میں سوار کر کے اپنے قیام گاہ پر جس کو پہلے سے تجویز کر چکے تھے لے گئے مولوی رحیم بخش صاحب ہجوم کی شدت کی وجہ سے حضرت کے پاس بھی نہیں پہنچ سکے۔ چونکہ خلافت کی تحریک اور اس کے جملہ کارکن حضرت کے مذاق آزادی ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے ہم نوا تھے اس لئے بالطبع ان سے رل مل گئے مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

جلسہ عام اور سپاسنامہ

مسلمانان بمبئی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیر انتظام کھتری مسجد میں جلسہ عام کیا گیا اس جلسہ میں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کی طرف سے حضرت کی خدمت میں "ایڈریس" پیش کیا گیا۔

دہلی، لکھنؤ دیوبند وغیرہ سے استقبال کے لئے آنیوالے حضرات

ان حضرات کی فہرست جنہوں نے دور دراز سے بمبئی پہونچ کر پورٹ پر حضرت کا استقبال کیا بہت طویل ہے۔ خاص خاص اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب (مرحوم) مہتمم دارالعلوم دیوبند معہ صاحبزادگان

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری (مرحوم) جناب حکیم محمد حسن صاحب (مرحوم) برادر خورد حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمد حنیف صاحب (مرحوم) خواہر زادہ و داماد حضرت شیخ الہند حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری برادر کلاں ڈاکٹر انصاری مرحوم۔ نواب محی الدین خاں صاحب مرادآبادی قاضی بھوپال (مرحوم) مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (مرحوم) مہتمم و صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی ڈاکٹر مختار احمد صاحب عرف ڈاکٹر انصاری مرحوم۔ حاجی احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی مرحوم۔

مولانا عبدالباری صاحب مرحوم فرنگی محلی اور مہاتما گاندھی

بمبئی کے دو روزہ قیام میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم بھی قیامگاہ پر تشریف لائے اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے اسی اثنا میں مہاتما گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرت سے گفتگو کی۔

دہلی کو روانگی

بمبئی میں دو روزہ قیام فرما کر ۲۳ اور ۲۴ رمضان المبارک کی درمیانی شب میں ایکسپریس سے دہلی روانہ ہوئے اور ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ (۱۳ جون ۱۹۲۰ء) کی صبح کو دہلی پہنچے ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا شب کے آخر حصہ میں دہلی سے روانہ ہو کر ۲۶ رمضان المبارک کی صبح کو ۹ بجے دیوبند پہنچ گئے۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

حضرت شیخ الہندؒ کی عام مقبولیت اور راستہ میں اسٹیشنوں پر استقبال

ایک وہ زمانہ تھا کہ نہ صرف احباب بلکہ تلامذہ۔ مریدین اور عزیز و اقارب کو یقین تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو پھانسی دی جائے گی ورنہ کم از کم حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزا پائیں گے۔ اس لئے مریدوں اور شاگردوں تک نے نہ صرف تعلق ارادت اور شاگردی سے انکار کر دیا تھا بلکہ تعارف سے بھی منکر ہو گئے تھے۔ خاص خاص لوگ نہ صرف مکان پر آتے ہوئے گھبراتے تھے بلکہ اس محلہ اور کوچہ میں بھی نہیں گذرتے تھے۔ جہاں حضرت کا دولت خانہ تھا اور حضرت کے لئے تحقیر و ملامت کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ بعض مدعیان اخلاص تو جان و عزت کے خطرہ سے انگریزوں کے سی۔ آئی۔ ڈی اور

مجبر بن گئے تھے۔ اب یہ زمانہ بھی ان کے سامنے آگیا کہ ہندوستان اور بیرون ہند جہاں بھی حضرت شیخ پہنچتے لوگ سروں پر بٹھاتے ہر ایک اسٹیشن پر عقیدت مند مخلصین کا ہجوم پروانوں کی طرح ٹوٹا پڑتا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ تک پہنچنا اور آپ سے مصافحہ کرنا جوئے شیر سے کم دشوار نہ تھا۔ دہلی۔ غازی آباد۔ میرٹھ شہر۔ میرٹھ چھاؤنی۔ مظفر نگر۔ دیوبند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر سے جانے یا عوام کو زیارت کرانے کے لئے لوگوں کو سروں پر اٹھانا پڑا۔ لوگ اس مقبولیت کو دیکھتے تھے اور انگشت بدنداں تھے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء يعز من يشاء ويذل من يشاء انه على كل شيء قدير۔

رولٹ رپورٹ کے الفاظ

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ رولٹ کمشنر کے الفاظ بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ دشمن جو اپنی سطوت وطاقت کے نشہ میں بدمست ہو کر کہتا تھا کہ میں سمندروں کا خدا ہوں۔ میری حدود مملکت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ مجھ پر اگر آسمان ٹوٹ پڑے تو میں سنگینوں پر اٹھا لوں گا۔ اس مغرور اور جابر طاقت نے اس تحریک سے کیا اثر لیا۔ اس کی نظر میں اس تحریک کی کیا حیثیت تھی اس کی بنیادیں کتنی مضبوط تھیں اور کس طرح کامیابی کے کنارہ پر پہنچ گئی تھی۔ اس کے نتائج کیا ہوئے اور اس تحریک نے دیس کی کیا کیا خدمتیں انجام دیں اور اس کے کارکنوں نے کس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کیا الفضل ما شهدت به الاعداء۔

رولٹ کمیٹی رپورٹ کے پیرا ۱۶۴ میں درج ہے۔ اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا کہ یہ ایک منصوبہ تھا جو ہندوستان میں اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدات پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں[1] کی شورش سے اسے تقویت

---

[1] اگر فقط مسلمانوں کے لئے یہ منصوبہ ہوتا تو راجہ مہندر پرتاپ کو صدارت کیوں دی جاتی اور حکومت موقتہ میں غیر مسلم کے لئے ایسی جگہ کیوں تجویز کی جاتی جیسا کہ آئندہ آئے گا (۲) اگر صرف مسلمانوں کیلئے یہ منصوبہ تھا تو ہردیال کی کوششیں اور مولانا برکت اللہ کی اعانتیں کیا گواہی دیتی ہیں دیکھو رولٹ رپورٹ بقیہ اگلے صفحہ پر ہے۔

دے کر برطانوی راج ختم کر دیا جائے۔

اس منصوبہ کو مضبوط کرنے اور عمل میں لانے کے لئے مولوی عبیداللہ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں عبداللہ، فتح محمد اور محمد علی کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو پار کیا۔ عبیداللہ پہلے سکھ تھا بعد میں مسلمان ہوا اور دیوبند ضلع سہارن پور کے مذہبی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر کے مولوی بنا۔ وہاں اس نے اپنے باغیانہ اور برطانیہ کے خلاف خیالات کا زہر چند مدرسین اور طلبہ میں بھی پھیلا دیا جن لوگوں پر اس نے اپنا اثر ڈالا ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود حسن کی تھی جو مدتوں تک درسگاہ دیوبند کے صدر مدرس رہے[1]۔ عبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور و معروف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعہ ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالمگیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵۸) فصل پنجاب (۳) جبکہ مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا جیسا کہ آگے آئے گا اور وہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا جس میں رام چندر جیسا معروف و مشہور ممبر بھی تھا تو اس میں فقط مسلمانوں کی شورش کیوں ذکر کی گئی بلکہ یہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک تھی جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے البتہ مسلم عنصر غالب تھا جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمارہ میں دکھلایا ہے اور یہی امر مولانا عبیداللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔

[1] یہ بالکل برعکس معاملہ ذکر کیا گیا ہے مولانا عبیداللہ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو متاثر نہیں کیا بلکہ مولانا شیخ الہند انگریزوں کے مظالم شنیعہ اور مسلسل بے راہیوں واقعات ماضیہ اور حالات حالیہ سے متاثر ہوئے اور انہوں نے مولانا عبیداللہ صاحب کو اس طرف کھینچا جیسا کہ ہم نے حضرت شیخ الہندؒ کے اس مقولہ کو پہلے بھی نقل کیا ہے اور مولانا عبیداللہ صاحب نے بھی اپنی ڈائری میں بار بار اس کو ذکر کیا ہے یہ بات محض اصحاب غرض نے گورنمنٹ کو سوجھائی تھی کہ مولانا عبیداللہ نے حضرت کو متاثر کیا ہے یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ تمہارے سابقہ اور لاحقہ طرابلس اور بلقان کے معاملات اور ہندوستان کے مظالم اس کے باعث ہوئے ہیں بیچارے مولوی عبیداللہ کو ہدف ملامت بناتے رہے۔

اسلامی (پان اسلامک) تحریک چلائے مگر مہتمم اور ارباب شوریٰ نے اس کو اور اس کے چند وابستگان کو نکال کر اس تجویز کو درمیان میں ہی ختم کر دیا۔ مولانا محمود حسن

لے یہ بھی بالکل غلط اور افتراء ہے ہندوؤں کو اس تحریک سے بھڑکانے کے لئے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ ہمیشہ سے انگریزوں کی عادت رہی ہے مولانا عبید اللہ صاحب اس تحریک سے بہت پہلے ہی اعتقاد جمائے ہوئے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو وہ اپنی ڈائری صلا میں لکھتے ہیں "میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اس وقت میں سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا لیکن مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی ہاں عملی حصہ لینے کے لئے مجھے اس زمانہ میں کوئی موقعہ نہیں ملا اس کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلانی شروع کی اور میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی" (ذاتی ڈائری صفحہ ۸۸) اور یہی مطمح نظر اور مشورہ حضرت شیخ الہندؒ کا مولانا عبید اللہ صاحب کے لئے نشان راہ تھا چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کے باب میں صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں " مجھے یہاں صراحت اعتراف کی ضرورت ہے کہ اگر شیخ مغفور کا صحیح مشورہ مجھے نہ ملتا تو میری بات اس قدر موثر نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے دربار میں پیش نہ کرتا بلکہ ایک مسلم کی صورت میں متعارف ہوتا اور چند دنوں بعد مجھے مسلک ہندوستانیت بتانے کی یقیناً ضرورت پیش آتی ذاتی ڈائری صلا امیر حبیب اللہ خاں نے بھی یہی مشورہ مولانا عبید اللہ صاحب کو دیا تھا۔ چنانچہ ڈائری کے صفحہ ۲۱ میں لکھتے ہیں " میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا اس کی تعمیل میرے لئے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا یہ بات عجیب معلوم ہو گی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے سشن نے منظور کر لیا۔ برٹش امپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔ (ذاتی ڈائری صلا) خیال فرمائیے کہ رولٹ کمیٹی

(بقیہ حاشیہ ص۶۶۱)

ہر حال میں دیوبند ہی رہے اور عبید اللہ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مولانا کے مکان پر خفیہ مجالس قائم ہوئیں اور کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوا کرتے۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن نے میاں محمد ایک شخص اور دوسرے دوستوں کے ساتھ مولوی عبید اللہ کی پیروی کی اور ہندوستان چھوڑ دیا مگر یہ لوگ شمال کا رخ کرنے کے بجائے عرب کے خطۂ حجاز میں پہونچ گئے۔ روانہ ہونے سے پیشتر عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور دو کتابیں شائع کی تھیں جن میں اس نے باغیانہ تعصب کی تبلیغ کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو فریضۂ جہاد سے متاثر کرنا چاہا تھا۔ اس شخص (مولانا عبید اللہ) اور اس کے دوسرے دوستوں اور مولانا شیخ الہند کا اہم مقصد یہ تھا کہ بہ یک وقت ہندوستان پر باہر سے حملہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶۰) تحریک کو پان اسلامک تحریک کہتی ہے اور تحریک چلانے والا اس کو ہندوستانی تحریک کہتا ہے اور اسی نام کو اپنی تحریک کے لئے موثر قرار دیتا ہے یہی اس کا عقیدہ اس سے پہلے کا ہے اور پان اسلامک اور اتحاد اسلامی تحریک کو امیر کابل کی ناپسندیدہ تحریک قرار دیتا ہے اور اسی کو حضرت شیخ الہندؒ کا مشورہ قرار دیتا ہے مگر رولٹ کمیٹی افتراق پھیلانے کے لئے اس کو پان اسلامک کہتی ہے۔ ہم پہلے بارہا عرض کر چکے ہیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز نے بھی زور دیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے یعنی ہندو مسلمان سکھ پارسی وغیرہ ہندوستانیوں کے اتحاد سے آزادی کی اسکیم چلائی جائے پان اسلامک میں یہ کہاں ہو سکتا ہے حضرت شیخ الہندؒ نے نہ صرف اس کو قبول فرمایا تھا بلکہ پہلے سے اس پر عامل تھے ان کے مشن میں سکھ اور انقلابی ہندو شریک تھے جن کی وجہ سے ایک مستقل مکان دیوبند میں کرایہ پر لے رکھا تھا۔ رولٹ کمیٹی کی یہ رپورٹ جھوٹ اور افترا نہیں ہے تو کیا ہے ہم پہلے لکھ گئے ہیں کہ حضرت سید احمد صاحب شہید کی تحریک ۱۸۲۴ء اور جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں بھی ہندو مسلم اتحاد کام کر رہا تھا۔ ۲؎ یہ غلط ہے کہ یہ تجویز آزادی ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی اس وجہ سے ختم ہوئی یہ تجویز اس وقت تک ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ بعض مسائل دینیہ مختلفہ فیہا کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا سندھی سے دو بلند پایہ معاصرین کو بدظن کر کے تضلیل و تکفیر پر آمادہ کیا گیا اور اسی اختلاف کی بنیاد پر مولانا سندھی رحمۃ اللہ کو دارالعلوم دیوبند سے الگ کیا گیا ان میں سے ایک بزرگ کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ آپ نے مولانا سندھی سے معافی مانگی بہر حال اصلی سبب وہ امر ہے جس کی بناء پر مسٹن گورنر یوپی دیوبند اور دارالعلوم میں گیا تھا اور مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔

بھی کرایا جائے اور ہندوستانی مسلمانوں میں بغاوت بھی پھیلائی جائے۔ ہم اس جدوجہد کی تفصیل بتلاتے ہیں جو وہ اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے عمل میں لائے۔

عبیداللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندوستانی متعصب جماعت (مجاہدین) سے ملاقات کی اور بعد میں کابل پہنچے۔ وہاں عبیداللہ کی ملاقات ترکی جرمنی مشن سے ہوئی اور ان کے ساتھ اس نے بھائی چارہ قائم کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا دیوبندی دوست محمد میاں بھی اس سے جا ملا یہ شخص مولانا محمود حسن صاحب کے ساتھ عرب گیا تھا اور وہاں سے ۱۹۱۶ء میں جہاد کا ایک اعلان حاصل کر کے واپس آیا تھا۔ جو مولانا نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا سے وصول کیا تھا یہ دستاویز غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے محمد میاں نے اس کی کاپیاں راستہ میں ہندوستان اور سرحدی قبائل دونوں جگہ تقسیم کیں۔ مولوی عبیداللہ اور اس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقتہ حکومت کے لئے ایک تجویز تیار کی تھی۔ اس تجویز کے مطابق مہندر پرتاپ نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے ۱۹۱۴ء کے اخیر میں اسے اٹلی سوئیٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں سے بدنام زمانہ ہردیال سے ملا۔ ہردیال نے اسے جرمن قونصل سے ملایا۔ وہاں سے یہ برلن آیا۔ بظاہر اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا اور اسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا عبیداللہ کو وزیر ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب و لہجہ کا ایک اخبار جاری کیا جس کا نام اسلامک فرٹیرنٹی (اسلامی برادری) تھا حکومت جاپان نے اس اخبار کو بند کر کے اسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدار برادری سے جا ملا ۱۹۱۶ء کی ابتداء میں مشن کے جرمن ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومت موقتہ (پرووبشنل گورنمنٹ) نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے جن میں اُن سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے

اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے امداد کی دعوت دی گئی تھی ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے اور یہ خطوط بعد میں برطانیہ کے ہاتھ میں آ گئے زار کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا اور اس کی ایک تصویر ہمیں (رولٹ کمیٹی کے ارکان کو) دکھلائی گئی ہے۔ حکومت موقتہ کی ایک تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مولانا عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کے نام ایک خط لکھا اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ جو ۸/رمضان (۹/جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبدالرحیم کے پاس حیدرآباد سندھ بھیجا گیا۔ شیخ عبدالرحیم تب سے غائب ہے لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں شیخ عبدالرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعہ مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں اور اگر کوئی دوسرا قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سرانجام دیں۔ مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومت برطانیہ کے ہاتھ آئے ہیں ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زرد ریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے متعلق قیام بھاگے ہوئے (مہاجر) طالب علموں کے واقعات غالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا اور حکومت موقتہ اور ایک حزب اللہ کے قیام

لـه ۱۹/فروری ۱۹۱۵ء تاریخ کے لئے جو سازش تیار ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ایک رجمنٹ کے اسلحہ خانہ اور میگزین پر حملہ کرنا تھا اس تاریخ کو ۱۴ آدمی جن میں سے کچھ مسلم تھے ریل کے ذریعہ فیروزپور پہنچے مگر فوج نے پیش بندیاں کی تھیں اور یہ سازش ناکام رہی ان میں سے پندرہ مسلمان طالب علم سرحد کے ہندوستانی متعصبین ومجاہدین سے جانے کے لئے نکل چکے تھے (رولٹ کمیٹی رپورٹ فصل پنجاب) پیرا ۱۶۴، ہم نے پنجاب سے متعلقہ فصل میں بتایا ہے کہ فروری ۱۹۱۵ء میں لاہور کے پندرہ طالبعلموں نے کالج چھوڑا اور مجاہدین کے ساتھ جا ملے اس کے بعد وہ کابل گئے وہاں ان کو پہلے تو سختی سے نظر بندی میں رکھا گیا اور بعد میں رہا ہو کر نگرانی کے ماتحت نقل وحرکت کی اجازت دی گئی وہ ہندوستان واپس آئے تین کو حکومت روس نے گرفتار کر کے برطانوی حکومت کے حوالہ کیا انہوں نے اپنے برتاؤ کے متعلق ندامت کا اظہار کیا اور انہیں مشروط معافی مل گئی۔ ان پندرہ طلباء کو ان کے مداحوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶۴)

کی تجویز درج تھی اس فوج کی بھرتی ہندوستان سے کرنی تجویز ہوئی تھی اور اس کا کام اسلامی حکومتوں کے درمیان سلسلہ اتحاد کا قائم کرنا تھا مولانا محمود حسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ تک پہنچا دیں مولانا عبید اللہ کے خط میں حزب اللہ کا مرتب و مکمل نقشہ تھا اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود مولانا محمود حسن صاحب کو اس کا سالار اعلیٰ بننا تھا۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے اور کابل کا سالار عبید اللہ کو بننا تھا۔ اس فہرست میں تین سرپرستوں بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔ لاہور کے طلبہ میں سے ایک کو میجر جنرل بننا تھا ایک کو کرنیل اور چھ کو لفٹیننٹ کرنیل ان اعلیٰ عہدوں کے لئے جن اشخاص کو تجویز کیا گیا تھا ان میں سے اکثر کے ساتھ اس تقرر کے بارے میں ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ مگر اس ساری اطلاع کی وجہ سے جو ریشمی خطوط میں دی گئی تھی چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں اور وہ عمل میں لائی گئیں ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور اس کے چار ساتھی برطانوی حکومت کے قبضہ میں آ گئے اور وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں غالب نامہ پر دستخط کرنے والا غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہے اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا اور میں نے اس پر دستخط کئے ہیں اس خط کے مشہور حصوں کا ترجمہ یہ ہے۔

"ایشیا یورپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیار سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶۳) مہاجرین کا لقب دیا تھا ان میں سے جو واپس ہوئے ان کے بیانات ہم نے پڑھے ہیں ایک طالب علم تو ایک مطبوعہ ٹریکٹ سے متاثر ہوا تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سلطان ترکی نے اعلان کیا ہے کہ چونکہ برطانوی حکومت کی طرف سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کر کے ان مقامات کی بے حرمتی کرنے کا خطرہ ہے اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کو ہجرت کر کے کسی اسلامی ملک میں جانا چاہیئے دوسرے طالب علم کو بھی اسی سلطانی اعلان سے جوش آیا تھا اور ایک انگریزی اخبار کی ایک تصویر سے بھی اسے صدمہ پہنچا تھا جو اس کے خیال میں نفرت کی لہر پیدا کرنے والی تھی۔

(حاشیہ صفحہ ۵۸-۵۹ ذاتی ڈائری)

مسلح کر کے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کے لئے کود پڑے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین اسلام دشمنوں پر غالب آگئے ہیں۔ اس لئے مسلمانو! جس عیسائی حکومت کے بند میں تم پڑے ہوئے ہو اس پر حملہ کرو دشمن کو مرنے پر مجبور کرنے کے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جدوجہد عمل میں لانے کی جلدی کرو ان پر اپنی نفرت اور دشمنی کا اظہار کرو۔ یہ بھی تمہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ مولوی محمود حسن آفندی (سابق مدرسہ دیوبند ہندوستان سے تعلق رکھنے والے) ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا۔ ہم نے اس بارے میں اس سے اتفاق کیا اور اسے ضروری ہدایات دیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئے تو تمہیں اس پر اعتماد کرنا چاہئیے اور آدمیوں اور روپیوں اور ہر اُس چیز سے اُن کی امداد کی جائے جس کی ضرورت اسے پیش آسکتی ہو۔ (ذاتی ڈائری از صفحہ ۵۴ تا ۲) رولٹ کمیٹی کی رپورٹ

رولٹ ایکٹ کمیٹی کے ارکان کو اگرچہ واقعات کا صحیح اور مکمل علم نہیں ہو سکا تاہم ان تحریروں سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت وعظمت اور ان کے بلند ارادوں اور استقلال وعالی ہمتی اور بلند پروازی کا کافی اندازہ ناظرین کو ہو گیا ہو گا۔ مولانا محمد علی (جوہر) مرحوم نے بارہا فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ تو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے کہ ہمارے اذہان اور خیالات بھی وہاں تک نہیں پہنچے تھے۔" اور جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو تعزیت کے لئے دیوبند تشریف لائے۔ اور رو کر کہنے لگے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ) کے انتقال نے ہماری کمر توڑ دی۔"

یوروپین قومیں ہر اس شخص کو جو اپنی قوم اور وطن کا فدائی اور خیر خواہ ہو نہایت عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اس کا احترام کرتی ہیں اگرچہ سیاستہً وہ دشمن ہی ہو۔ مالٹا کی اسارت گاہ میں بڑے بڑے فوجی اور ملکی افسر انگریز آتے تھے تو حضرت شیخ الہندؒ کو دُور سے دیکھ کر ہیٹ (انگریزی ٹوپی) اُتار کر سلام کرتے تھے اور با ادب کھڑے ہو کر گفتگو کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کھڑے بھی نہیں ہوتے تھے بلکہ بسا اوقات اپنے ترجمہ قرآن کے لکھنے میں مصروف رہتے مگر یہ فوجی اور ملکی بڑے بڑے افسر آکر ادب سے کھڑے ہو جاتے تھے اور آپ کی مصروفیتوں کو نہایت ادب سے دیکھتے رہتے

حالانکہ معمولی گورا بھی بڑے بڑے گورنمنٹ پرست ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں کی ادنیٰ درجہ کی تعظیم و تکریم عمل میں نہیں لاتا تھا۔ پرنس جرمنی (جرمن کا شہزادہ) جو کہ اٹلی جہاز سے گرفتار ہوا تھا اور مالٹہ میں ایک عرصہ تک رہا تھا ہمیشہ حضرت کی خدمت میں بالخصوص عید بقر عید کے موقعہ پر حاضر ہوتا تھا اور مبارک بادی پیش کرتا تھا اور یہی حال بڑے بڑے فوجی اور سول افسروں جرمنی، آسٹرین، بلگیرین اور ترکوں کا تھا مسٹر برن جو کہ گورنر یوپی کا سکریٹری انگریز تھا مولانا عزیز گل صاحب سے بعض اُستادوں کے تذکرہ پر کہنے لگا کہ گُڑ گُڑ ہی رہا اور شکر چینی بن گئی (یعنی تمہارے وہ اساتذہ کم ہمتی کی وجہ سے پیچھے ہی رہے اور تم اولوالعزمی اور بلند ہمتی کی وجہ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئے۔) یہ تو دنیاوی عزت اور وقعت کا معاملہ ہے مگر ہم کو اللہ تعالیٰ کے یہاں آخرت میں اس سے بدرجہا زائد وقعت کی امیدیں ہیں ؎

سگ اصحاب کہف روزے چند ✤ پے مردم گرفت مردم شد

پسر نوح بابدان بہ نشست ✤ خاندان نبوتش گم شد

اسی پر جب شریف حسین نے دنیاوی لالچ میں آکر انگریزوں کا ساتھ دیا اور اسلامی ترکی حکومت کو جو کہ اس کی اور اس کے آباؤاجداد اور اولاد و خاندان کی ولی نعمت بھی تھی کفرانِ نعمت کر کے برباد کرایا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ نے فرمایا تھا ؎

بابدان یار شد شریف حسین ✤ خاندان شرافتش گم شد

چنانچہ بہت ہی تھوڑے زمانہ کے بعد شرافت کا عہدہ اور امتیاز تمام مکہ معظمہ اور حجاز بلکہ عرب سے مٹا دیا گیا۔ شریف حسین کو اس کے آقاؤں نے ہی نظر بند کر کے جزیرہ سائپرس (قبرص) میں پہنچا دیا اور وہ اسی طرح وہاں بے چارگی کی حالت میں مرگیا۔ آخرت کی خبر خدا جانے اس کے لڑکوں شریف عبداللہ کو شرق اردن کی بے برگ و بے گیاہ وادی کا چھوٹا سا ٹکڑہ اور شریف فیصل کو ماسوپوٹامیا (عراق) کا برباد شدہ اور غیر آباد صوبہ دے دیا اور پھر جو اس کے قتل وغیرہ کے واقعات پیش آئے ان کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں شریف کے ساتھ غدر کرنے والے سوریہ اور فلسطین کے عرب باشندوں کا جو حشر فرانس اور اسرائیل (یہودیوں) کے ہاتھ سے کرایا گیا وہ تاریخ کے سیاہ اوراق اور عربوں کے زخمی اور گہری گھاؤ والے دلوں سے پوچھئے جن

پر یورپ کی تیر اندازی آج تک ختم ہونے میں نہیں آتی اور آئے دن قیامت پر قیامت ٹوٹتی رہتی ہے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو از مکافات عمل غافل مشو

ترک تو اپنے مقامات پر مستقل اور قابض اور حاکم رہے مگر عربوں کی پریشانیاں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ کہاں عربوں کی مستقل جمہوریت اور تمام عربی بولنے والوں کا صوبائی وفاق اور شریف حسین کی سب پر صدارت جمہوریت جس کا سبز باغ بلکہ خوش آیند خواب برطانوی ذمہ داروں نے دکھلایا تھا اور کہاں یہ تفرق، اور یہودیوں کا یہ تسلط اور ظلم و جبر اور عربوں کے لاکھوں نفوس کی جلا وطنی یہ قدرت کے عجوبات میں سے نہیں ہے تو کیا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ انسان اور مسلمان عبرت پکڑنے کے لئے آج بھی تیار نہیں ہے اور نہ خدائے قدوس مالک الملک کی طرف رجوع کرتا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس مدت مدید کی اسارت کی مشقتیں برداشت کر کے ہندوستان آئے تو ان کے جذبۂ حریت اور انگریز دشمنی میں کوئی کمزوری یا کمی نہ تھی بلکہ ہندوستانی مارشل لا رولٹ ایکٹ کے نفاذ، جلیانوالہ باغ وغیرہ کے واقعات اور ترکی مملکت کی تقسیم اور معاہدہ سیورے اور ترکوں کے ساتھ انتہائی بے انصافیوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ بمبئی میں اترتے ہی مولانا شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے ممبروں وغیرہ سے ملاقات ہوئی مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی لکھنؤ سے اور مہاتما گاندھی احمد آباد سے حضرت شیخ الہندؒ کے استقبال کے لئے تشریف لائے نیز دوسرے لیڈروں سے خلوت اور جلوت میں باتیں ہوئیں تو آپ نے بھی عدم تشدد (نان وائلنس) کا پروگرام ہندوستان کے آزاد کرانے کے لئے ضروری قرار دیا اور پھر اسی طریقہ پر خلافت کمیٹی اور کانگریس کی تجویز کردہ باتوں کی موافقت کی۔ دیوبند پہنچ کر چند دنوں قیام فرما کر ضروری سمجھا کہ کوڑا جہان آباد ضلع فتحپور ہسوہ میں تشریف لے جائیں اور حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم۔

حضرت شیخ الہندؒ کا کوڑہ جہاں آباد اور الہ آباد، غازی پور وغیرہ کو سفر کرنا!

کی والدہ محترمہ اور اہلیہ محترمہ اور ان کے بچوں کی تعزیت کریں کیونکہ حکیم صاحب مرحوم حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور مخلص خادم تھے اگرچہ وہ مشن آزادی کے ممبر تھے مگر مکہ معظمہ میں بایں ارادہ ساتھ ہو گئے تھے کہ مدینہ منورہ ساتھ جائیں گے۔ برطانیہ کی غلط کاری سے ان کو بھی رفقاء میں سے شمار کر دیا گیا اور گرفتار کر کے مالٹہ بھیج دیا گیا۔ قاہرہ مصر میں بیان لینے والے انگریز نے خود کہا کہ ان کاغذات (ڈائری اور سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹوں) میں آپ کا کہیں تذکرہ نہیں پاتا ہوں تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں ان باتوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا جن کو سی۔ آئی۔ ڈی نے ان کاغذات میں ذکر کیا ہے مجھ کو گرفتار کرنا بالکل دھاندلی ہے (صفحہ ۵۱ سفر نامہ میں ان کے جوابات کی تفصیل درج ہے) مگر اندھیر نگری چوپٹ راج میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال وہ ہمارے ہی ساتھ مالٹہ میں نہایت اطمینان اور استقلال سے رہے اور پھر بیمار ہو گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کو ان کے انتقال سے بہت صدمہ ہوا تھا ان کی ضعیف العمر والدہ اور دیگر متعلقین سے حضرت کو بہت زیادہ ہمدردی تھی اس لئے یہ سفر ضروری خیال کیا گیا۔ الہ آباد[1] والوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے وہاں اترنے کا اصرار کیا۔ وہاں اچھا خاصہ اجتماع قاری عبدالرحمان صاحب مرحوم کے مدرسہ میں ہو گیا تو حضرت نے مولانا شبیر احمد کو تقریر کے لئے فرمایا اس تقریر میں خلافت کمیٹی کی حمایت اور تائید پر زور طریقہ پر کی گئی تھی پھر غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ کو تشریف لے جانا ہوا۔ لکھنؤ میں فرنگی محل میں مولانا عبدالباری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا۔

---

[1] اور نہ ہندوستان سے ساتھ آئے تھے۔ بلکہ اگلے سال وہ اور سید ہاشم صاحب سوڈان اور مکلا ہوتے ہوئے آئے تھے۔ جب حضرت شیخ الہندؒ مدینہ منورہ سے واپس آئے تو ان سے مکہ معظمہ میں ملاقات ہوتی۔[2] مولانا فاخر صاحب الہ آبادی سے ملاقات کرنے کے لئے دائرہ شاہ اجمل صاحب میں تشریف لے گئے اور مبلغ لعہ سجادہ نشین (یعنی مولانا فاخر صاحب الہ آبادی) کو پیش کئے یہ حضرت شیخ کی کرامت تھی کہ اس روز جس نے نذر پیش کی گیارہ روپے ہی پیش کئے (بحوالہ مولانا سید محمد شاہد صاحب خلف مولانا سید محمد فاخر صاحب۔ (ناشر)

مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے حسب ارشاد حضرت شیخ الہندؒ لکھنؤ میں تقریر فرمائی اس کے بعد مراد آباد ہوتے ہوئے واپس ہو گئے۔

شیخ الہندؒ کا خطاب اور قدوم مبارک کی برکات

حضرت کی تشریف آوری، اور خلافت کمیٹی کی شرکت اور تائید اور آزادی ملک کی تڑپ اور اس راستہ میں جانبازی اور استقلال و اخلاص یہ امور ایسے نہ تھے کہ قلوب کو مسخر نہ کریں چنانچہ عام مسلمانوں کے قلوب آپ کیطرف نہایت اخلاص کے ساتھ جھک گئے اور عموماً لوگوں میں انتہائی محبت اور قبولیت جاگزین ہو گئی چنانچہ خلافت کمیٹی کے زعماء نے آپ کے لئے شیخ الہندؒ کا لقب تجویز کیا جو کہ ہر طرف اور ہر جماعت میں مقبول ہو گیا اور بمنزلہ جزء اسمی بن گیا اور باوجودیکہ حضرت رحمۃ اللہ تقریر کے عادی نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں مقبولیت نے خلقت میں ایسی قبولیت پیدا کر دی کہ لوگ عموماً آپ پر پروانہ وار فدا ہونے لگے اور یہ تحریک خلافت اور آزادی برقی طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دل اور دماغ پر چھا گئی۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس سفر حجاز سے پہلے گھٹنوں کے درد اور وجع المفاصل میں مبتلا رہتے تھے سردیوں میں یہ مرض ترقی کر جاتا تھا۔ سیڑھیوں پر چڑھنا اترنا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے بواسیر کثرت بول وغیرہ امراض کی بھی شکایات رہتی تھیں مگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اس سفر میں اس طرح شامل حال ہوا کہ تمام زمانہ اسارت میں یہ تکالیف بہت کم اور تقریباً معدوم ہو گئی تھیں۔ مالٹہ نہایت سرد جگہ ہے ہم کو ابتدا میں خیموں میں رکھا گیا تھا سردی خیموں کے باہر تو انتہائی درجہ کی پڑتی ہی تھی مگر اندر بھی اس قدر پڑتی تھی کہ باوجودیکہ لکڑی کی چارپائیوں پر نیچے گدّہ اور اوپر دو کمبل ہوتے تھے پھر بھی آدھی رات کے بعد سردی کی شدّت سے نیند نہیں آتی تھی۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ حسب عادت ڈیڑھ دو بجے اٹھتے پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے اور چونکہ پیشاب کے بار بار آنے کی بیماری تھی ایک شب میں کئی کئی مرتبہ ضرورت پڑتی تھی تاہم بلا تکلف بار بار وضو کرتے تھے۔ اگرچہ بعد میں ہم گرم پانی اور آگ کے مہیا کرنے کا انتظام بھی کر سکے تاہم اس قسم کا انتظام عرصہ تک نہیں ہو سکا تھا تب بھی بلا تکلف حضرت

رحمۃ اللہ اپنے اعمال بجالاتے رہے اور اس قدر بیماریوں کی شکایتیں تمام سفر میں نمودار نہیں ہوئیں جو پہلے تھیں البتہ ہندوستان پہنچ جانے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں شکایات لوٹ آئیں اور بڑھنے لگیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جذبہ آزادی ہند اور انگریزوں کے یہاں سے نکال لینے کا نہ صرف قائم رہا بلکہ اور قوی اور ترقی پذیر ہو گیا ان مصائب مالٹہ وغیرہ سے کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں پختہ ارادہ کئے ہوئے ہوں کہ اس بیماری سے اچھے ہوتے ہی تمام ہندوستان میں دورہ کروں گا اور ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کی مکمل جدوجہد کے لئے آمادہ کروں گا اور یقیناً اگر عمر وفا کرتی تو ضرور وہ ایسا کرتے۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا گوناگوں امراض ترقی کرتے رہے باوجودیکہ یونانی اور ڈاکٹری معالجوں کی فراوانی تھی اور ہر ایک نہایت فدائیت کا دم بھرتا تھا اور خلوص دل سے کوشاں تھا مگر تقدیر کے سامنے تدبیر کیا کر سکتی ہے۔

میرا ایام بیماری میں غیر حاضر ہونا

چونکہ ۱۳۲۶ھ و ۱۳۲۷ھ و ۱۳۲۸ھ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان بحکم والد صاحب مرحوم بوجہ وفات اہلیہ اولیٰ برائے عقد ثانی آیا تھا اور فرصت کو غنیمت جان کر دورہ حدیث شریف کی پرانی تمنا کو حاصل کر سکا تھا چونکہ اور رشتہ دار کنبہ والوں نے نکاح کرنے سے بخوف سفر حجاز انکار کر دیا تھا اس لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حافظ زاہد حسن صاحب امروہی کی توجہ اور عنایت سے عقد ثانی قصبہ چھپراؤں ضلع مراد آباد میں سید حکیم غلام احمد صاحب مرحوم کے یہاں ہو گیا تھا۔ اگرچہ حکیم صاحب نے بشرط واپسی بیک سال اہلیہ مرحوم کو مدینہ منورہ بھیجانے کی اجازت دے دی تھی مگر مختلف ایسے مواقع پیش آتے رہے کہ مجھ کو دیوبند میں تقریباً تین سال ٹھہرنا پڑ گیا پہلے سال میں میں بخاری شریف اور ترمذی شریف دوبارہ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس مرتبہ پڑھانے میں خصوصی مراعات فرماتے تھے جو کہ عام طلبہ کو حاصل نہیں ہوتی تھی وجہ یہ بھی تھی کہ اس چھ برس کے عرصہ قیام مدینہ منورہ میں یعنی ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک کتب درسیہ اور غیر درسیہ عموماً میں نے نہایت محنت سے پڑھائی تھیں تقریباً پندرہ پندرہ اسباق مختلف علوم درسیہ کے روزانہ پڑھاتا تھا۔ طلبہ کا ہجوم تھا۔ اکثر مضامین غامضہ پر حاوی ہو چکا تھا اس لئے مباحث علمیہ

کی مشکلات زیرِ نظر ہوگئی تھیں اور ان کی گتھیوں کا سلجھانا بجز حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا حضرت رحمۃ اللہ بھی استفتاء مسائل دیکھ کر نہایت کشادہ پیشانی سے بحث فرماتے تھے اور مشکلات کو بہت توجہ سے حل فرما کر بہت سے ایسے مضامین ذکر فرماتے تھے کہ عام مستفیدین کو اُن کے سُننے کی نوبت بھی نہیں آسکتی تھی۔ علاوہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تمام اساتذہ اور ارباب اہتمام انتہائی شفقت فرماتے تھے انہوں نے اگلے سال مجھ کو معقول تنخواہ پر خدمت تدریس پر مقرر کر دیا اور ارباب شوریٰ سے یہ تجویز پاس کرا دی کہ حسین احمد جب بھی ہندوستان میں آئے بلا تجدید تقرر خدمات تدریسیہ انجام دیا کرے اور کتب درسیہ میں اُونچے درجہ کی کتابیں حدیث و فقہ و تفسیر وغیرہ کی پڑھانے کے لئے دی گئیں۔ اسی عرصہ میں جلسہ دستار بندی بھی منعقد ہوا اور اس کی خدمات بھی حسب استطاعت انجام دینی پڑیں۔ چونکہ میں اپنی خواہش سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے اور پھر جدہ سے ہوا تھا تاکہ سفر میں حضرت کی خدمات انجام دوں اور حتی الوسع تکالیف سفر کو کم کروں اس لئے واپسی پر قصد مصمم تھا کہ بمبئی پہنچ کر حجاز کو واپس ہو جاؤں گا بمبئی سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خدام کا بہت بڑا گروہ مل جائے گا میرے خدمت میں حاضر رہنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے اور نہ ضرورت ہے مگر اس خیال کو جب میں نے ایک روز سویز میں ظاہر کیا تو فرمایا کہ میں تراجم الابواب بخاری شریف کی شرح لکھنا چاہتا ہوں مگر یہ کام میں تنہا نہیں کر سکتا میں سمجھ گیا کیونکہ ایام اقامت دیوبند میں بھی ۱۳۲۷ھ میں یہ کام شروع کیا گیا تھا اور حضرت نے میری اس وقت کی خدمات کو پسند فرمایا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ ایک شرط پر میں تا اختتام شرح تراجم دیوبند میں ٹھہرنے اور امور متعلقہ انجام دینے کے لئے تیار ہوں تو فرمایا کہ وہ کیا شرط ہے میں نے عرض کیا کہ جو وقت آپ اس کے لئے عطا فرمائیں اس وقت میں چاہے کیسا ہی بلند مرتبہ شخص آئے اس کے لئے صَرف نہ فرمائیں فرمایا کہ قبول ہے مگر ہماری بھی ایک شرط ہے میں نے عرض کیا کہ وہ کیا ہے تو فرمایا کہ پھر کہیں گے اس لئے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ دیوبند میں حضرت کی خدمت میں تا اختتام تراجم الابواب رہوں گا۔ مگر جب بمبئی پہنچا اور تحریک خلافت کا زور وشور دیکھا اور دیکھا کہ حضرت کا طبعی رجحان تحریک آزادی کی جدوجہد کی طرف قوی تر ہو گیا ہے اور وہی لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں تو یقین ہو گیا کہ کسی قریبی زمانہ میں تراجم

ابواب کا کام نہیں ہو سکتا اس لئے میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں مدینہ منورہ چلا جاؤں اور یہاں سے ہی انتظام سفر شروع کر دوں تو فرمایا کہ تیرا جانا تو کسی طرح اس زمانہ شریفی میں مناسب نہیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ اپنے دونوں بھائیوں مولوی سید احمد مرحوم اور محمود احمد کو بھی لکھ دے کہ وہ یہاں ہی آجائیں تو پھر میں نے عرض کیا کہ اچھا تو اتنی اجازت عطا فرمائیں کہ میں بمبئی میں تین چار دن ٹھہر کر آپ کے بعد دیوبند پہنچوں میرے چند احباب یہاں ہیں ان سے ملنے کی نوبت نہیں ہے تو اس کی بھی اجازت نہیں دی اور اسی پر اصرار فرمایا کہ ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ چنانچہ ساتھ ساتھ ہی دیوبند پہنچنا ہوا۔

حافظ زاہد حسن صاحب امروہوی میرے خصوصی محسن ہیں ان سے ہمیشہ سے بہت گہرے تعلقات چلے آتے ہیں وہ بھی بمبئی تشریف لائے تھے چونکہ وہ مدرسہ امروہہ جامع مسجد کے مہتمم تھے اور صدر مدرس مدرسہ مذکورۃ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کسی وجہ سے مدرسہ امروہہ سے برداشتہ خاطر ہو کر مبنڈھو یا چھتاری کے مدرسہ میں چلے گئے تھے اس لئے حافظ صاحب موصوف نے مجھ پر زور دیا کہ وہاں کی ملازمت قبول کر لے بمقتضائے ضروریات وقتیہ میں نے اس کو قبول کر کے عرض کیا کہ آپ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے لیں انہوں نے دیوبند پہنچ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو راضی کر لیا حضرت مولانا حافظ احمد صاحب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے دیوبند کے لئے فرمایا کہ اس کی مدرسی یہاں کی پہلے سے منظور شدہ ہے بحث و تمحیص کے بعد وہ بھی راضی ہو گئے چنانچہ میں پورب کے سفر کوڑہ جہاں آباد الہ آباد، غازی پور فیض آباد لکھنؤ مرادآباد سے واپس ہو کر امروہہ چلا گیا اور کتب تدریسیہ متعلقہ مدرس اوّل کی تدریس میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ حضرت کا حکم محرم میں ملا کہ تجھ کو یہاں دیوبند میں میرے پاس رہنا چاہیئے اس زمانہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بیماریوں کی شکایت شروع ہو گئی تھی مہمانوں کا بہت ہجوم رہتا تھا اور تحریک آزادی کے سلسلہ میں دورہ کی تیاری فرما رہے تھے میں نے عرض کیا کہ حضرت کے ارشاد اور حکم سے میں امروہہ گیا ہوں اور وہ بھی آپ ہی کا مدرسہ ہے اس کا قائم رکھنا ضروری ہے تو

فرمایا کہ مجھ کو تیری یہاں ضرورت ہے میں نے عرض کیا کہ یہاں تو خدمات انجام دینے والے بکثرت اور خصوصاً فلاں فلاں حضرات موجود رہتے ہیں فرمایا کہ یہ لوگ تو اپنی نگہداشت بھی نہیں کر سکتے میری نگہداشت کیا کریں گے۔ اس کو سن کر میں چپ ہو گیا اور عرض کیا کہ میں حسب ارشاد حافظ زاہد حسن صاحب کو لکھتا ہوں چنانچہ حافظ صاحب موصوف کو اطلاع دی وہ فوراً آئے اور عرض و معروض کے بعد اس پر راضی کر لیا کہ ایک مہینہ کے لئے حسین احمد کو امروہہ کی اجازت دے دی جائے تاکہ اس مدت میں ہم دوسرے مدرس کا انتظام کریں۔ حضرت اس پر راضی ہوئے اور میں امروہہ جا کر تدریس میں مشغول ہو گیا میرے جانے پر مرض میں زیادتی ہو گئی کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ حضرت کا تار پہنچا کہ میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جا رہا ہوں تو مجھ سے علیگڑھ میں مل۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سفر علیگڑھ اور بنیاد جامعہ ملیہ

تحریک خلافت کا زور تھا۔ انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی۔ ترک موالات کا جوش تھا اس لئے چاہتے تھے کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی برطانیہ سے ترک تعلق کرے مگر پرانے سرکار پرست ٹرسٹیاں یونیورسٹی کب اس کو گوارا کر سکتے تھے۔ انہوں نے سخت مخالفت کی۔ جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلباء یونیورسٹی کی ایک بڑی اور معتد بہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہو گئی اور آزاد درس گاہ قائم کرنے کے لئے جس میں کوئی مداخلت حکومت برطانیہ کی نہ ہو تیاری کرنے لگی یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ناگپور میں اجلاس کانگریس ہوا تھا اور اس میں نان کوآپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی اس کے خلاف مسٹر جناح اور ان کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی۔ اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آگئی تھی۔ ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے. مہاتما گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترک موالات کے متعلق طلباء یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلباء مسلم یونیورسٹی کو زوردار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔ گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں اور تمام کالج اور اسکول گورنمنٹی امداد چھوڑ دیں اور اگر کالجوں اور اسکولوں کے زعماء ایڈ نہ چھوڑیں تو طلباء ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں جن میں حکومت کی امداد خالص طور

پر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ اس ہی فتوے کی وجہ سے گورنمنٹ نے سر رحیم بخش صاحب کو مخصوصی طور پر دوسری مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سمجھانے اور فتویٰ کو واپس لینے کے لئے بھیجا تھا مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسی فتویٰ ترک موالات پر اصرار کیا اور واپس نہیں لیا۔ جیسا کہ طلباء مسلم یونیورسٹی کے پاس ترک موالات کا مفصل فتویٰ بھیجا گیا تھا۔ اسی طرح خلافت کمیٹی کے کارکنوں نے بھی فتویٰ حاصل کیا اور وہ چھپ کر شائع ہوا۔ فتویٰ مذکورہ کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ قال اللہ تعالیٰ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور آپس میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بزدل ہو جاؤ اور تمہاری ہوا بگڑ جائے تم کو نہایت صبر سے کام لینا چاہیے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (اور تم کو نیکی اور تقویٰ کی معاونت کرنی چاہیئے اور گناہوں اور زیادتیوں کی معاونت مت کرو) ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین (کفار کی موالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے "اور جس نے ان کی دوستی اور معاونت باقی رکھی وہ شخص بھی ان ہی میں سے شمار ہوگا اللہ تعالےٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا) ۵

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ ساکرم ضعیف :: آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

امابعد آج جبکہ شرق و غرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جبکہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز امڈتے ہوئے طوفان کی موجوں سے ٹکرا کر (خدا نکردہ) پاش پاش ہو جائے، جب کہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی اور خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی جرأت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے علماء ہند کی تعداد کثیر اور ہندو ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جدوجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائیں کامیابی تو ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن جو فرض شرعی قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے تو اس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور جیسا کہ میری طویل زندگی شاہد ہے میرا مطمح نظر ہمیشہ

مذہب رہا ہے اور یہی وہ مطمح نظر ہے جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور مالٹا سے پھر ہندوستان پہنچایا۔ پس میں ایک لمحہ کے لئے کسی ایسی تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کی فوز و فلاح سے ہو یا دشمنان اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔ مالٹا سے واپس آکر مجھ کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بسط و کشاد نے آخری طریق کار اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات و حقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صریح تعلیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوط تھام لیں اور نفع و ضرر قومی کا موازنہ اور عواقب ملیمہ کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف و خطر انجام تک پہنچائیں اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً و عملاً ترک کر دیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابل انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضا ہونا چاہیئے کہ وہ (۱) سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کر دے (۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کرے (۳) صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے (۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کریں بشرطیکہ (۱) اتباع شریعت کیا جائے اور عمل درآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے (۲) نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقص امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال مدنظر رہے (۳) ارشاد عثمان اذا احسن الناس فاحسن معھم واذا اساؤا فاجتنب اساءتھم (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو اور جب کہ برا کریں تو برائی سے بچتے رہو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین۔

العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی ۳ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ

اس کے بعد یہی فتوےٰ جمعیۃ علماء ہند کے متفقہ فتوے کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا۔ الغرض اسی تحریک اور اسی فتوے اور اسی تحریر کی بنا پر مسلم نیشنل یونیورسٹی

لہ حضرت مولانا حافظ احمد صاحب صاحبزادہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم اور مہتمم دارالعلوم دیوبند کو (باقی حاشیہ ص ۶۷۶ پر دیکھیں)

قائم کرنے کی بنیاد ڈالی گئی۔ جو کہ بعد میں جامعہ ملیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اگر زعماء مسلم یونیورسٹی پہلے سے آزاد اور قومی لوگوں کی بات مان لیتے تو یہ افتراق نہ ہوتا۔ بہر حال گورنمنٹ پرستوں نے انگریزوں کی چیرہ دستیاں اور غداریاں دیکھتے ہوئے غلامی اور انگریز پرستی کو ہی سراہا۔ جوشیلی روحیں کب اس کو گوارا کر سکتی تھیں انہوں نے ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کیا مگر جب اصلاح ممکن نہیں ہوئی تو مجبوراً آزاد نیشنل یونیورسٹی کے لئے جلسہ کرنا چاہا اور اہل الرائے کو دعوت دی اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو صدر بنانا چاہا۔ حضرت اس وقت سخت بیمار تھے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔

خدام نے اس سفر کو خطرناک اور نہایت تکلیف دہ ظاہر کیا۔ دوسری طرف دعوت دینے والوں کا اصرار تھا کہ ہماری جدوجہد کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ حضرت صدارت فرمائیں۔ دیر تک فریقین کی گفتگو سننے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا جواب حسب ذیل تھا۔

"اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا"

چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء اجلاس کی مقرر ہوگئی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ صدارت کا مضمون مولانا شبیر احمد کو بتلا کر تحریر کا حکم دیدیا اور جب مولانا شبیر احمد صاحب مسودہ لکھ کر لائے۔ تو اس کو سن کر حسب منشا ترمیم فرما کر چھپنے کا حکم دیا گیا۔

اس مدت میں مرض اور ترقی کرتا گیا۔ ہر قسم کا علاج جاری تھا۔ مگر بجائے فائدہ زیادتی تھی۔ بخار لازمی صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ ضعف اور نقاہت ترقی پذیر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کا تقاضا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی لے جایا جائے تاکہ میں پوری توجہ سے اپنی آنکھوں کے سامنے علاج کروں اور دوسرے اہل الرائے سے بھی مشورہ کر سکوں مگر چونکہ علیگڑھ کی تاریخیں مقرر ہو چکی تھیں اس لئے قرار پایا کہ علیگڑھ کے جلسہ سے فارغ ہو کر براہ راست دہلی روانہ ہو جائیں گے اور برائے معالجہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمائیں گے۔

میرا علیگڑھ اور پھر دہلی پہنچنا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اجلاس میں صدارت فرمانا

دیوبند سے تار آیا کہ میں علی گڑھ فلاں گاڑی سے جا رہا ہوں تو مجھ سے وہاں مل حسب الحکم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۷۵) گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب سر جیمس گورنر یو پی نے دلوایا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو واپس کر دیا اور ایسی موثر تقریر مجمع خصوصی میں فرمائی کہ نہ صرف حافظ صاحب مرحوم بلکہ تمام مجمع متاثر ہو کر یک زبان واپسی کا متقاضی ہوا۔

میں وہاں پہنچا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ جناب عبدالمجید صاحب خواجہ کی کوٹھی پر قیام تھا وہیں میں بھی قیام پذیر ہؤا۔ اگلے روز جلسہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے شرکت اور صدارت فرمائی۔ ضعف اور بیماری کی وجہ سے خود چل نہیں سکتے تھے دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک کر چلنا ہوتا تھا خطبہ جناب مولانا شبیر احمد صاحب نے پڑھا جو کہ مطبوع ہے اس کے مندرجہ ذیل فقرے قابل یادگار ہیں۔

(۱) میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو اُن کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور اُن کے سامان حرب و ضرب کا۔

پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

(۲) اے نونہالان وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علیگڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علیگڑھ کا رشتہ جوڑا۔

(۳) آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا ہاں یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے۔

(۴) ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ اُمت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسا

اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور ان میں قوم و ملت کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تعلیم اور زبان کے متعلق جو ارشاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے مصنف انگریز بھی بلکہ اس سے زیادہ تسلیم کرتے ہیں چنانچہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر صفحہ ۲۰۴ میں ۱۸۷۱ء میں لکھتا ہے "مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باغیرت اور خود دار ہوں۔ دنیادار لوگ ہمیشہ قائم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے نخ بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائداد کے مالک ہیں اپنی نمازیں ادا کرتے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے" (ص ۲۲۶ ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین ایم بی ایس)

علیگڑھ کے مذکورہ بالا جلسہ کی صدارت اور جامعہ ملیہ کے سنگ بنیاد کی فراغت کے بعد دہلی واپسی اور اجلاس جمعیۃ العلماء

اجلاس مذکور سے فارغ ہو کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت توجہ سے علاج جاری فرمایا۔ چونکہ اس سے پہلے امرتسر میں جمعیۃ العلماء کا انعقاد مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی جمیلہ اور مولانا کفایت اللہ صاحب مولانا احمد سعید صاحب اور دیگر حضرات کی جد و جہد سے ہو چکا تھا اور پہلا جلسہ بھی وہیں ہو چکا تھا اس لئے اہل الرائے حضرات نے ضروری سمجھا کہ اب اس کا دوسرا اجلاس دہلی میں بڑے پیمانہ پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں منعقد کیا جائے تاکہ احوال حاضرہ میں علماء اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتفاق ہو سکے۔ کیونکہ حضرت کو عام مقبولیت حاصل ہے۔ مسلمان سب سے زیادہ آپ کے گرویدہ اور آپ کے ساتھ حسن اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ پر پورا

اعتماد کرتے ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی استدعا کی گئی تو آپ نے قبول فرمایا اور ۷، ۸، ۹ ربیع الاول اجلاس کی تاریخ مقرر کی گئی۔ حضرت رحمۃ اللہ نے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کو تحریر خطبہ صدارت پر مامور فرمایا اور مضامین ضروریہ ذکر فرما دیئے۔ چنانچہ مفتی صاحب مرحوم نے مسودہ تحریر کر کے پیش فرمایا اور حضرت کو سنایا بعد ضروری اصلاحات اور ترمیم کے حضرت نے چھپوانے کا ارشاد صادر فرمایا۔ خود حضرت اس قدر بیمار اور ضعیف تھے کہ جلسہ میں باوجودیکہ وہ دہلی میں تھا نہیں جا سکتے تھے۔ جلسہ میں خطبہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے پڑھا مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی کتاب علماء حق صفحہ ۲۱۵ میں تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت شیخ قدس اللہ سرہ العزیز اگرچہ حیات مقدسہ کے بالکل آخری دور میں تھے مگر علماء ملت کی آرزو یہی تھی کہ جمعیۃ علماء حضرت شیخ الہند کی صدارت کا تاریخی امتیاز حاصل کرے اور آپ کے فیوض سے وطنی اور ملی سیاست کے متعلق ایسے بنیادی اصول معلوم کرے جس پر کاربند ہو کر اپنے فرائض سے سبک دوش ہونے کی کوشش کرتی رہے۔

حضرت شیخ کا خطبہ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا مگر علماء ملت اور ملی سیاست کے تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے مکمل اور کافی تھا۔

حضرت شیخ کے اس خطبہ صدارت نے علماء ملت کو مندرجہ ذیل اصولی نظریات کی ہدایت فرمائی۔

(۱) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک موالات فرض ہے۔

(۲) تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادران وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

(۳) استخلاص وطن کے لئے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

(۴) اگرچہ موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعداء کے لئے جائز ہو سکتا ہے باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں بھی تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے

لئے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق ہوائی جہاز نہیں ہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔

(صفحہ ۶ اخطبہ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند)

حضرت شیخ کی اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی اسکے چند جملے بلفظہ درج ذیل ہیں۔

کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالٰے شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کوکسی نہ کسی طریق سے آپکے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق واتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عماید نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورتحالات اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنادے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کیطرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح وآشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر واستبداد سے شکست کر سکے گی۔ ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائیدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشین کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے۔ جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح وآشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنٰے امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذارسانی اور دل آزاری متصور ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذارسانی کے درپے رہتا ہے۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعما (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت

اور ریزولیشنوں کی زبانی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔

اگر فرض کرو ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پئے۔ یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لئے مہلک نہیں۔ البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں اتفاق کے حق میں ہم قاتل ہیں مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔

(صفحہ ۱۸ خطبہ صدارت حضرت شیخ الہندؒ مطبع قاسمی) از علماء حق ص ۳۱۸

میرا کلکتہ سفر کرنا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہنے سے جدا ہونا

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے قیام دہلی کے زمانہ میں مولانا عبداللہ مصری جو کہ دراصل الہ آباد کے اصل باشندے ہیں اور مصر میں عرصہ تک ایام طالب علمی میں اقامت کرنے کی وجہ سے مصری مشہور ہو گئے ہیں جناب مولانا ابوالکلام صاحب کے بھیجے ہوئے کلکتہ سے تشریف لائے اور مولانا موصوف کا خط لائے جس میں یہ مطالبہ تھا کہ چوں کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے طلباء نے ترک موالات کی تحریک پر مدرسہ عالیہ سے علیحدگی کرلی ہے اور چاہتے ہیں کہ کلکتہ میں ایک آزاد اور نیشنل مدرسہ عالیہ قائم کر دیا جائے خلافت کمیٹی کے اراکین اس کی سرپرستی کریں اس لئے ضروری ہے کہ ایسا مدرس جو کہ علم حدیث کی کتابیں پڑھا سکے جلد بھیج دیا جائے تاکہ وہ اوپر کے طلباء کو پڑھا سکے اور مشہور معروف ہو خلافت کمیٹی اس کی کفالت کرے گی ضرورت ہے کہ مولانا انور شاہ صاحب کو یہاں بھیج دیجئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ شاہ صاحب (مرحوم) تو دارالعلوم دیوبند چھوڑ نہیں سکتے مگر ہم دوسرا شخص دیں گے جو کہ تمام کتب حدیث کی تعلیم دے سکتا ہو اور اس کو تجربہ اور شہرت حاصل ہو مگر چوں کہ جمعیت کا اجلاس عام منعقد ہونے والا ہے اس لئے اس کے منعقد ہونے تک توقف کرنا ہوگا۔ مولانا ابوالکلام صاحب کلکتہ میں خلافت کمیٹی کے صدر تھے اور ان کی تحریک اور زوردار تقریر ترک موالات پر طلباء مدرسہ عالیہ

متاثر ہو کر مدرسہ عالیہ سے جدا ہوئے تھے اس لئے اس آزاد نیشنل مدرسہ عالیہ کی تمام ذمہ داری مولانا موصوف اور اراکین خلافت کمیٹی ہی پر تھی۔ فرنگی محل اور امروہہ وغیرہ سے بھی مدرسین منگائے گئے تھے، اگر سابق مدرسین مدرسہ عالیہ ترک موالات کر دیتے تو اس کی ضرورت نہ پڑتی مگر وہ تو بڑی بڑی تنخواہوں کی لالچ اور انگریز پرستی میں مبتلا تھے۔ بہرحال ایک آزاد مدرسہ عالیہ ناخدا مسجد میں قائم ہو گیا تھا مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی اس کے ناظم بنا دیئے گئے تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چاہتے تھے کہ مولانا شبیر احمد صاحب یا مولانا مرتضےٰ حسن صاحب وہاں چلے جائیں اور اس تحریک پر جو انقلاب ہوا ہے اس کو سنبھال لیں۔ حضرت نے دونوں صاحبوں سے تذکرہ کیا دونوں نے علیحدہ علیحدہ اپنی ماؤں سے اجازت طلبی کا عذر کیا اس لئے اپنے اپنے مکانوں پر واپس ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد بذریعہ خطوط اطلاع دے دی کہ ہماری والدہ اجازت نہیں دیتیں۔ چونکہ جلسہ جمعیت کی تاریخیں بالکل سر پر آگئی تھیں حضرت نے دونوں کو بلایا اور یہ فرمایا کہ کلکتہ جانے کا مسئلہ مستقل ہے مگر یہاں تو حاضر ہو جاؤ اور آکر اجلاس کی ضروریات میں ہاتھ بٹاؤ اس وقت تک فقط مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب ہی تمام امور اجلاس انجام دے رہے تھے۔ بالآخر ہر دو حضرات تشریف لائے تا آنکہ بفضلہ تعالےٰ بخیر و خوبی علی احسن الوجوہ جلسہ ختم ہو گیا۔ چونکہ مولانا عبداللہ مصری صاحب کو اس انتظار میں بہت مدت گزر گئی تھی اور ان کے ضروری کاروبار میں تعطل زیادہ ہو گیا تھا جس کی بناء پر ان کا تقاضا سخت تھا اس لئے فراغت کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا مرتضےٰ حسن صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب اور مجھ کو تنہائی میں طلب فرمایا۔ چونکہ معالجہ میں کونین زیادہ استعمال کرائی گئی تھی اس لئے سماعت میں بہت فرق آگیا تھا حضرت نے کلکتہ کی ضرورت ظاہر فرما کر حکم کیا کہ جو رائے اور عذر ہو ہر ایک لکھ کر دے دے مولانا مرتضےٰ حسن صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب نے لکھا کہ ہماری مائیں کلکتہ جیسی دور دراز جگہ پر جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ میں نے لکھا کہ میں امروہہ میں حضرت ہی کے حکم سے گیا تھا اور

حضرت ہی کے حکم سے خدمت میں حاضر رہنے کی غرض سے ملازمت تدریس چھوڑ کر حاضر ہؤا ہوں۔ کلکتہ جانے میں یہ مقصد عظیم فوت ہوتا ہے علاوہ ازیں نہ میں تقریر کا ماہر اور عادی ہوں نہ تحریر کا نہ مجھ میں ذکاوت ہے نہ حافظہ۔ آئندہ آپ کا جو حکم ہو اس کے امتثال کے لئے حاضر ہوں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہر ایک کی تحریر پر غور کیا اور تھوڑی دیر سکوت کر کے فرمایا کہ اپنے ہی کی طرف جھکنا پڑتا ہے تم چلے جاؤ، (میری طرف خطاب کر کے) میں نے عرض کیا کہ بہت اچھا میں حاضر ہوں۔ مگر چونکہ مدینہ منورہ سے کھجوریں بھائی سید احمد صاحب کی بھیجی ہوئی آئی ہوئی ہیں مجھے اتنی اجازت دی جائے کہ میں سہارن پور اور دیوبند جا کر ان کو جہاں جہاں پہنچانی ہیں پہونچا آؤں دو تین دن میں حاضر ہو جاؤں گا اور پھر کلکتہ کو روانہ ہو جاؤں گا۔ حضرت اس پر راضی ہو گئے اور مولوی عبداللہ صاحب مصری کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ میں نے حسین احمد کو کلکتہ بھیجنے کے لئے مقرر کر دیا ہے وہ دو تین دن میں یہاں کی ضرورتیں پوری کر کے روانہ ہو جائے گا آپ خرچہ سفر فلاں کو دے دیں، اور روانہ ہو جائیں۔ میں اسی روز سہارن پور اور دیوبند روانہ ہو گیا اور تیسرے یا چوتھے دن سہارن پور و دیوبند وغیرہ سے ضروریات پوری کر کے واپس آ گیا واپسی پر معلوم ہؤا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا حمداللہ صاحب سے فرمایا کہ کہیں حسین احمد کو مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم کلکتہ جانے سے روک نہ دیں۔ میں جب خدمت میں حاضر ہؤا تو پوچھا کہ مولانا خلیل احمد صاحب نے کلکتہ جانے کے متعلق کچھ کہا تو میں نے عرض کیا کہ کچھ نہیں فرمایا (اور حقیقت یہی تھی) مگر آپ کے حکم کے بعد وہ یا اور کوئی صاحب کچھ بھی فرماتے میں کسی کی بھی ماننے والا نہیں تھا چنانچہ اسی روز میں روانگی کے لئے گاڑی کے وقت پر تیار ہو گیا۔ رخصتی کے وقت حاضر ہؤا تو میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور خوشی سے رخصت فرمایا۔ یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ رخصتی ہمیشہ کے لئے ہے مگر تقدیرات الٰہیہ کون جانتا ہے۔؟

میرا دہلی سے رخصت ہو کر بچھراؤں اور امروہہ پہونچنا چونکہ مالٹا کی اسارت ہی کے زمانہ میں پہلے والد صاحب مرحوم کا اڈریانوپل میں انتقال ہو گیا تھا (جب کہ دونوں بھائیوں مولانا سید احمد صاحب اور عزیزم محمود احمد سلمہٗ اور والد صاحب مرحوم کو ترکی حکومت نے

شریف حسین کی بغاوت پر نظر بند کر کے مثل دیگر ہندوستانیوں اور عربوں کے ترکی ممالک میں منتشر کر دیا تھا) اس کے بعد صرف بچے اور عورتیں مدینہ منورہ میں باقی رہ گئی تھیں اور ان میں مولانا عبدالحق صاحب مدنی کی ہمشیرہ بھی تھیں جو کہ بھائی سید احمد صاحب سے منسوب تھیں اس لئے سب کی خبر گیری وہ ہی حسب استطاعت کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں میرے بھتیجے اشفاق احمد اور اس کی والدہ مرحومہ کا مدینہ منورہ ہی میں انتقال ہو گیا تھا اس لئے مالٹا سے واپسی پر جناب حکیم غلام احمد صاحب مرحوم سے پہلی اہلیہ کی چھوٹی بہن کے متعلق گفتگو کی گئی اور بعد جد و جہد قبول فرما کر انہوں نے اس سے عقد کر دیا تھا۔ وہ کلکتہ جانے کے وقت بچھراؤں ہی میں تھی اس لئے دہلی سے میں براہ مراد آباد روانہ ہوا اور ایک شب کے لئے وہاں قیام کر کے کلکتہ کا ٹکٹ لے کر سوار ہو گیا راستہ میں امروہہ پڑتا تھا امروہہ کے اسٹیشن پر بہت سے احباب نے آ کر گھیر لیا اور اترنے پر مجبور کیا میں نے ہر چند اپنے اعذار پیش کئے مگر ایک نہ سنی اور کہا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں ان کا حکم ہے کہ حسین احمد کو اتار لو اور یہاں لے آؤ۔ چنانچہ اترنا پڑا اُنہوں نے ٹکٹ کو کینسل کرایا۔

امروہہ اترنے کا سبب

اترنے کا سبب بعد کو معلوم ہوا کہ شیعوں اور سنیوں میں مناظرہ کی قرار پہلے سے ہو چکی تھی اور اسی بنا پر اہل امروہہ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کو تکلیف دی تھی کیونکہ حضرت مولانا موصوف کو شیعوں کے مذہب سے بہت زیادہ واقفیت تھی اور اُن سے مناظرہ کی بھی بہت کامل مہارت تھی۔ مولانا مرحوم نے متعدد کتابیں شیعوں کے رد میں لکھی تھیں اور مختلف مقامات میں کامیاب مناظرے بھی کئے تھے۔ مگر چوں کہ خلافت کی تحریک اس وقت بہت زوروں پر تھی اور عام فضا مسلمانوں میں خصوصاً اور تمام ہندوستانیوں میں عموماً اتفاق و اتحاد قائم کرنے کی متقاضی تھی اس لئے عام اہل شہر مناظرہ کے خلاف تھے اور مناظرہ کے بانیوں وغیرہ پر سخت سے سخت اعتراض کرتے تھے اس لئے سنجیدہ حضرات چاہتے تھے کہ مناظرہ نہ ہو۔ مگر کوئی کھل کر روکنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا ورنہ اس کی

جماعت کی بدنامی ہوگی اس لئے چاہتے تھے کہ کوئی قومی اور تحریک کا حامی شخص بیچ میں پڑکر مناظرہ رکوا دے۔ میں امروہہ میں اس سے پہلے کئی مہینہ رہ چکا تھا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا مخلص خادم اور تلمیذ بھی تھا اس لئے حضرت موصوف اور دیگر احباب نے ضروری سمجھا کہ اسی کو آتار لیا جائے اور اسی کو درمیان میں ڈالا جائے تاکہ پھر کسی کو حرف گیری اور اعتراض کا موقعہ ہاتھ نہ آئے۔ بالآخر مجھ کو مجبور کیا گیا اور میں نے حاضر ہو کر وہاں تقریر بڑے مجمع میں کی جس کی وجہ سے اشتعال ٹھنڈا ہوا۔ میں نے ہر دو فریق سنیوں اور شیعوں کو سمجھایا اور وقت کی نزاکتوں کو دکھلا کر زور دار اپیل کی کہ کوئی اس قسم کی کارروائی اس زمانہ میں مناسب نہیں ہے جس سے افتراق کی خلیج میں وسعت ہو۔ ضروری ہے کہ اتفاق اور اتحاد کو مضبوط کیا جائے۔ میں نے کربلا شریف، بغداد اور عراق کے انگریزی مظالم دکھلائے نیز مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقامات مقدسہ کے قیامت خیز واقعات بھی دکھلائے۔ اور شیعوں اور سنیوں دونوں کو ملامت کی۔ بہرحال اس طویل تقریر کا فریقین اور عوام پر اچھا اثر ہوا۔ فریقین سمجھ گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا اس کے بعد میں روانگی کا انتظام کر ہی رہا تھا کہ دہلی سے ڈاکٹر انصاری مرحوم کا تار آگیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری اور وصال

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری اور وصال کی تفصیل تو جناب مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم نے اپنے رسالہ "حیات شیخ الہندؒ" میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے جس کو نقل کرنے میں بہت تطویل ہے بنابریں ہم اس کا اختصار ناظرین کے لئے پیش کرتے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء ایک بجے دن کو مالٹا سے بمبئی پورٹ پر تشریف فرما ہوئے۔ بمبئی میں دو دن قیام فرما کر ۲۳ رمضان شب جمعہ مطابق ۱۰ جون بعد از مغرب روانہ وطن ہوئے۔ ۲۴ رمضان المبارک مطابق ۱۲ جون ۱۹۲۰ء بوقت صبح دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا ایک روز قیام فرما کر ۲۵ رمضان المبارک مطابق ۱۳ جون ۱۹۲۰ء بروز یک شنبہ

بوقت صبح دہلی سے روانہ ہوئے اور اسی روز ۹ بجے دیوبند پہنچے۔ استقبال کرنے والوں کا ہرا اسٹیشن پر جس طرح نہایت زیادہ ہجوم تھا یہاں پر بھی بہت زیادہ ہجوم تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے دارالعلوم تشریف لے گئے۔ مہمانوں کی اطراف و جوانب سے نہایت زیادہ آمد تھی بنا بریں ۱۰ر شوال تک دیوبند ہی میں قیام فرمانا پڑا ورنہ پختہ ارادہ تھا کہ جلد از جلد مولانا الحکیم نصرت حسین صاحب مرحوم کے مکان پر کوڑا جہاں آباد ضلع فتح پور مرحوم کی تعزیت کے لئے پہنچیں۔ ان کی والدہ ماجدہ اور دیگر متعلقین موجود تھے وہاں سے الہ آباد، غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ مراد آباد ہوتے ہوئے ۲۵ر شوال کو دیوبند واپس ہوئے۔ چونکہ اہلیہ محترمہ سخت بیمار تھیں اس لئے دوسری مقامات پر نہ جا سکے (اگرچہ عقیدت مندوں کے بہت تقاضے تھے) ۱۷ر ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ کو اہلیہ محترمہ مرحومہ نے داغ مفارقت دیا جس کا اثر طبع مبارک پر ہونا طبعی امر تھا۔ ماہ ذی الحجہ میں دیوبند میں موسمی بخار اور تپ ولرزہ کا بہت زیادہ شیوع ہوا۔ چنانچہ عشرہ محرم کے بعد خود حضرت بھی مبتلا تپ و لرزہ ہو گئے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ وجع مفاصل اور بواسیر کی تکلیف سابق ہندوستان پہونچنے کے بعد ہی عود کر آئی تھی مگر تاہم اس کا تحمل فرماتے تھے اور نشست و برخاست آمد و رفت پر زیادہ اثر نمایاں نہیں ہونے دیتے تھے مگر اس تپ ولرزہ نے یکبارگی اتنا ضعیف کر دیا کہ نشست و برخاست اور آمد و رفت کی طاقت جاتی رہی معالجہ یونانی اور ڈاکٹری جاری تھا۔ بعد انتہائی کمزوری اور غلبہ مرض کے اواخر محرم سے افاقہ تدریجی طور پر شروع ہوا مگر افاقہ کی رفتار بہت سست تھی ۲ر صفر کو بتقریب صحت احباب اور طلبا دارالعلوم کی دعوت کی گئی جس کا اہتمام مخلصین نے از خود کیا تھا مگر افسوس کہ قدرت کو یہ خوشی باقی رکھنی منظور نہ تھی۔ ۷ر صفر کو پھر بخار آیا اور پیچش بھی ہو گئی اور ضعف اور مرض میں اضافہ ہوتا گیا تا آنکہ اطبا نے ورم جگر تجویز کیا اسی زمانے میں سفر علی گڑھ کی تحریک ہوئی جس کو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں چنانچہ ۱۶ر صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعہ علی گڑھ میں جلسہ ہوا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ پڑھ کر صدارت فرمائی۔ کمزوری اس قدر تھی کہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے مولانا شبیر احمد مرحوم نے خطبہ پڑھا۔ اگلے روز علیگڑھ سے واپس ہو گئے ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر دہلی تشریف لے گئے۔ معالجہ نہایت توجہ سے ہوا جس سے تخفیف کے آثار نمایاں تھے۔ ۳ر ربیع الاول تک

اطمینانی حالت رہی مگر ۵ ربیع یوم شنبہ کو پھر لرزہ بخار آیا اور حالت نہایت نازک ہوگئی۔ بخار بہت تیز ہوگیا۔ حالت اگرچہ تشویش ناک تھی تاہم ہوش و حواس بجا تھے آدمی کو پہچانتے تھے۔ بہت ضعیف آواز سے کچھ بات بھی فرماتے تھے۔ مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم سوانح صفحہ ۱۴۶ میں لکھتے ہیں (۱۸ کی شب کے متعلق) رات بھر یہی حالت رہی۔ سینہ پر بلغم تھا جس کو ضعف کی وجہ سے دفع نہیں کر سکتے تھے۔ صبح کو شہد کا شربت دیا گیا تو خلاف امید حلق میں اتر گیا۔ ۶ بجے کچھ اجابت ہوئی اور خود اپنے ہاتھ سے پانی سے استنجا کیا۔ ضعف لحظہ بلحظہ بڑھتا جاتا تھا اور باوجود ہوش بجا ہونے کے ایک استغراقی حالت طاری تھی مخصوص لوگ چارپائی کے گرد موجود تھے دل دھڑک رہے تھے طبیعت ہراساں تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ سات بجے کے بعد (۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ ۳۰ نومبر کو بہت تغیر ہوگیا اور حضرت دنیا سے بالکل غافل ہو گئے۔ تنفس طویل اور غیر طبعی ہوگیا اور انقطاع عن الدنیا و توجہ الی الرفیق الاعلیٰ کا گمان غالب ہونے لگا۔ چارپائی کے گرد حاضرین خاموشی اور آہستگی سے ذکر اللہ میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں حضرت نے اس غیر فانی اور واجب الوجود ہستی کو یاد کیا جس کے نام پر اپنے آپ کو محو کر دیا تھا یعنی بلند آواز سے تین مرتبہ اللہ اللہ اللہ فرمایا۔ اھ

مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم کا بیان ہے (جس کو مولانا محمد جلیل صاحب نے نقل فرمایا) کہ حضرت نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا پھر فرمایا کہ مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں تمنا تو یہ تھی کہ میں میدان جہاد میں ہوتا اور اعلاء کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کئے جاتے اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ آٹھویں مرتبہ آواز بند ہوگئی۔ دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی،، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے سورۂ یٰسین شروع کی مگر وہ جوش گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے اس لئے مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا سورۃ قریب الختم ہوئی تو حضرت نے خود بخود حرکت کر کے اپنا بدن سیدھا اور درست کر لیا ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر سیدھی کر لیں اور آٹھ بجے جبکہ مولوی صاحب بالکل اخیر سورت پر پہنچے تو حضرت نے ذرا آنکھ کھولی اور تصدیق قلبی کی تائید کیلئے زبان کو حرکت دی اور خاص الیہ ترجعون کی آواز پر قبلہ رخ ہو کر ہمیشہ کیلئے آنکھ بند کر لی لیسر اور سہولت سے سانس منقطع ہوگیا اور روح

مقدس روح دریحان وجنۃ نعیم کی بہار دیکھنے کیلئے تمام اہل اسلام کو یتیم وبیکس چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی اور رفیق اعلےٰ سے جا کر مل گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون "

"وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے" (سوانح شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ص۱۴۷)

غم زدہ اور پریشان حال حاضرین کے صدمے اور قلق وبیقراری کا اندازہ آسان نہیں ہے کچھ دیر تو وہ حالت رہی کہ ایک کو ایک کی خبر نہ تھی کسی کی آہ نکلی کوئی سر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ ایسے جانکاہ حادثات پر آہ وناللہ و چیخ وپکار ایک معمولی بات ہے مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا فیض صحبت کام آیا اور رضا بالقضاء کا مضمون غالب ہوا۔

نصف گھنٹہ کے بعد منزل اول (قبر) کا فکر ہوا ڈاکٹر صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی صاحب (حکیم محمد حسن صاحب) اور خدام سے استفسار فرمایا کہ اگر دہلی میں دفن کرنا آپ مناسب سمجھیں تو محدثین (حضرت شاہ ولی صاحب اور اُن کے احفاد کرام رحمہم اللہ تعالےٰ) کے مزارات میں سامان کیا جائے اور اگر دیوبند کا خیال ہو تو وہاں کا انتظام عمل میں آوے۔ جواباً کہا گیا کہ حضرت کی آرزو تھی کہ اپنے مخدوم استاد کے جوار باکرامت میں جگہ ملے اور یہی آرزو اور کشش دوسری دنیا (مالٹا) سے کھینچ کر یہاں لائی تھی نیز صاحبزادیاں بھی اب تک دہلی نہ پہنچی تھیں اس لئے یہی رائے ہوئی[۱] کہ دیوبند لے چلنا چاہیئے۔

(سوانح ص۱۴۸)

---

[۱] مگر مولانا محمد جلیل صاحب کا بیان یہ ہے کہ مجھ کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہی تھی کہ حضرت کو مقبرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں دفن کیا جائے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میں دو مشکلات میں مبتلا ہوں ایک یہ کہ دیوبند لے جائیں تو مذہب حنفی میں یہ غیر مستحسن ہے اور دوم یہ کہ یہاں کے مقابر میں دفن کریں تو چونکہ اس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تمام مسلمانوں کو انتہائی شغف اور محبت ہے تو خوف ہے کہ لوگ قبر کو پختہ کردیں اور ہم کتنا ہی صدائے احتجاج بلند کریں کچھ بھی نہ سنیں۔ پھر فرمایا کہ اھون البلیتین یہی ہے کہ جنازہ دیوبند ہی لے جایا جائے وہاں قبر کے پختہ کرنے کا احتمال نہیں ہے اور صاحبزادیوں کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی اس لئے اسی کو اختیار کیا گیا۔

دیوبند کو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس مضمون کا مفصل تار روانہ کیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوگئی جنازہ شام کو دیوبند پہنچے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم اطلاع دینے اور کفن و تابوت اور ریل کے انتظام میں مصروف ہوئے ادھر خدام نے غسل کا انتظام کیا۔ حکیم محمد حسن صاحب نے مخصوص شاگردوں کی امداد سے بطریق مسنون غسل دیا اور کفن پہنا کر تابوت میں رکھا جو کہ نہایت اہتمام سے بہت جلد تیار کرایا گیا تھا، اور ڈاکٹر صاحب کی وجاہت سے بارہ بجے تک ڈاکٹری سارٹیفکیٹ اور ریل کے متعلق تمام انتظامات درست ہوگئے جن کی تکمیل میں دوسروں کو بہت دقت اور ناخیر پیش آتی۔

ڈاکٹر صاحب ہی کا تار امروہہ میں میرے پاس وفات اور جنازہ کے دیوبند لے جانے کا اسی روز شام کو پہنچ گیا تھا حالانکہ میں نے امروہہ پہنچنے کی ان کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ غالباً سی آئی ڈی نے ان کو اطلاع دی ہوگی۔ دہلی میں آناً فاناً وفات کی خبر مشہور ہوگئی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی اپنی دوکانیں فوراً بند کردیں ہزاروں مسلمان ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے اور جنازہ تیار ہوتے ہی نماز جنازہ کے متقاضی ہوئے حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم لوگوں کی خواہش اور اصرار ہے تو تم نماز جنازہ پڑھ لو میں شریک نہ ہوں گا تاکہ مجھ کو نماز کے دہرانے کا اختیار رہے اور میں دیوبند میں پھر نماز اعزہ و اقارب کے ساتھ پڑھ سکوں، اس لئے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے سامنے میدان میں ایک مرتبہ بہت بڑے مجمع کے ساتھ نماز ادا کی گئی اس کے بعد جنازہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ لوگ بڑھتے جاتے تھے۔ اندازہ کیا جاتا تھا اسٹیشن کے قریب پہنچ کر بیس ہزار آدمیوں کی تعداد ہوگئی۔ وہاں پھر دوسری دفعہ نماز جمعہ پڑھی گئی۔ ڈھائی بجے کے بعد دہلی سے وہ گاڑی جس میں تابوت تھا روانہ ہوئی پھر شہر میرٹھ اور چھاؤنی میرٹھ پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے شب کو تابوت دیوبند اسٹیشن پر پہنچا ازدحام نہایت عظیم الشان تھا۔ بمشکل تمام جنازہ اسٹیشن سے نکلا اور بہت دیر میں مکان پر پہنچا چونکہ قبر پہلے سے تیار ہوچکی تھی اس لئے بہت سے لوگوں کی رائے ہوئی کہ ابھی رات ہی میں دفن کردیا جائے مگر چونکہ صاحبزادیاں اور داماد جو کہ تار ملنے کے بعد دیوبند سے دہلی کو روانہ ہوچکے تھے اور ابھی راستہ ہی میں تھے کہ جنازہ غازی آباد آگیا اس لئے وہ غازی آباد میں اتر گئیں مگر ہجوم کی زیادتی اور ٹرین کی جلدی سے روانگی اور ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ساتھ نہ ہوسکی تھیں اس لئے ترجیح اس کو دی گئی کہ صبح تک جنازہ دفن نہ کیا جائے چنانچہ وہ اگلی ٹرین سے آن میں آگئیں۔ بہت سے عقیدت مند اور مخلصین کا بے شمار اجتماع سہارنپور مظفر نگر وغیرہ اطراف و جوانب سے

ہوگیا اور اعلان کر دیا گیا کہ نماز جنازہ اور دفن صبح کی نماز کے بعد کیا جائے گا۔ صبح تک یہ اجتماع اور بھی زیادہ ہو گیا۔ جنازہ نماز صبح کے بعد دارالعلوم میں پہنچایا گیا۔ نودرہ اور باہر کا صحن آدمیوں سے بھرا ہوا تھا بمشکل تمام صف بندی ہوئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ولی اقرب اور برادر عزیز مولانا حکیم محمد حسن صاحب جنہوں نے ابتک نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی باقلب مضطر وچشم تر نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ تمام مجمع پر ایک پرکیف سکوت طاری تھا اور ایک ہیبت و نورانیت مشاہد ہو رہی تھی۔ خواہ اس کو جذبات حسرت سمجھئے یا واقعیت و حقیقت کہیئے۔ (سوانح صـ۱۵۲)

دیوبند میں اس وقت تک بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی کسی جنازہ کے ہمراہ اس قدر مجمع نہیں دیکھا تھا۔ مدرسہ کے دروازہ سے قبرستان تک آدمی ہی آدمی نظر آتا تھا جنازہ مقبرہ میں پہنچا یعنی بیالیس برس کی ظاہری جدائی کے بعد دنیا کی کشاکش سے استراحت کے لئے یہ شاگرد رشید فخر استاد اپنے مقدس مرشد و استاد کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ قبر تیار تھی جنازہ قریب لاکر رکھا گیا۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور حضرت کے داماد اور بعض مخصوص خادم قبر میں اترے چاشت کا وقت تھا نو بجے تھے کہ قدوۃ الواصلین، امام المحدثین والعارفین، قطب عالم علوم و کمالات، بطل حریت، آستاد کنندہ ہندوستان، خاتم دوران بخاری زماں کوہ وقار و حلم آفتاب معرفت و علوم، گنجینۂ حکمت الٰہیہ، حرز بیرہ احادیث، سنن نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) کو لحد میں اتار دیا گیا اور شریعت و طریقت کے آفتاب عالمتاب کو ہمیشہ کے لئے نظروں سے چھپا دیا گیا ایک غم زدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی زبان سے کہا۔

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو
گنجینۂ علوم ہے یہ گنج زر نہیں!

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ آمین۔

مسیحائے زماں پہنچا فلک پر چھوڑ کر سب کو	چھپا چاہ لحد میں وائے قسمت ماہ کنعانی
جو تھا موصل الی اللہ ہو گیا واصل بحق ہے یہ	پھریں ہیں ڈھونڈھتے سرگشتگاں تیہ حیرانی
زمانے نے دیا اسلام کو داغ اس کی فرقت کا	کہ تھا داغ غلامی جس کا تمغائے مسلمانی
نہیں ہے سینہ مجروح کم گنج شہیداں سے	تمنائیں جو تھیں دل میں ہوئی ہے سبکی قربانی
نصاً ملہائے شتی ہیں سے کوئی ایک دکھلاوے	کئے تھے حق تعالیٰ نے جو مولانا کو ارزانی
فقط ایک آپکے دم سے نظر آتے تھے سب یکجا	بخاری وغزالی بصری و شبلی و نعمانی
جنہیں چھوڑا تھا تم پر حضرت امداد و قاسم نے	کریگا کون ان سب بیکسوں کی ہائے چوپانی
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد	روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

میرا دیوبند پہنچنا

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کلکتہ بھیجنے کے تیسرے دن میں امروہہ پہنچا اور اسی روز جلسہ اور تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب کا تار پہنچا کہ حضرت کا وصال ہوگیا اور جنازہ دیوبند جارہا ہے۔ میں نے دیوبند جانے کا ارادہ کرلیا۔ لوگوں نے منع بھی کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا شام کی گاڑی نکل چکی تھی اس لئے رات کی گاڑی ہی اور میں صبح کو تقریباً ۹ بجے دیوبند پہنچا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدہ پر جب پہنچا تو دیکھا کہ لوگ دفن سے فارغ ہوکر واپس آرہے ہیں اپنی بدقسمتی اور بیچارگی پر انتہائی افسوس ہوا کہ باوجود سالہا سال حاضر باشی کے شرف کے آخری وقت میں نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور نہ دفن میں شرکت کرسکا۔ افسوس

قسمت کی بدنصیبی کو صیاد کیا کرے ؎
سر پر گرے پہاڑ تو فریاد کیا کرے

کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ دو چار روز رہ کر کلکتہ کا عزم کیا تو حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم مانع ہوئے اور دیوبند ہی کے قیام کا حکم فرمایا مگر میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت نے اپنی شدید بیماری کے دوران میں جب کہ خود حضرت میری حاضری کی ضرورت محسوس فرماتے تھے اس کے علاوہ اور بھی چند اہم ضرورتیں درپیش تھیں۔ ان سب کو نظر انداز فرماکر کلکتہ روانگی کا حکم فرمایا اور کلکتہ کے کام کو سب پر ترجیح دی۔ اب وفات کے بعد کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت کا حکم پس پشت ڈالدیا جائے اور تن آسانی اختیار کی جائے۔ خصوصاً جبکہ یہاں دارالعلوم میں بہتر سے بہتر کارکن حضرات موجود ہیں میرا یہاں قیام کس طرح درست سمجھا جاسکتا ہے؟ الغرض میں نے کلکتہ کی روانگی پر اصرار کرکے حضرت مہتمم صاحب مرحوم کو راضی کرلیا اور کلکتہ پہنچ کر اسباق حدیث شریف سنبھال لئے مگر چونکہ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی اطراف و جوانب کلکتہ میں بکثرت جلسے ہورہے تھے ان میں بار بار حاضر ہونا پڑتا تھا اس زمانہ میں اندرون بنگال بھی دور دراز شہروں میں بڑے بڑے جلسوں میں جانا پڑا جن میں سے مولوی بازار کے مشہور جلسہ کانگریس و خلافت میں بھی جانے پر مجبور کیا گیا۔ اجلاس کانگریس کے صدر مسٹر سی آر داس آنجہانی تھے اور جلسہ خلافت اور جمعیۃ کی صدارت مجھ کو انجام دینی پڑی تھی۔ اور دوسرا جلسہ ضلع رنگ پور میں بڑے پیمانہ پر ہوا تھا دونوں کے خطبات چھپ کر شائع ہوچکے ہیں۔ اسی طرح دو مرتبہ ہندوستان یوپی میں بھی آنا پڑا۔ ایک جلسہ سیوہارہ ضلع بجنور کا تھا اور اس جلسہ میں جمعیۃ کی صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نائب مہتمم دارالعلوم نے فرمائی تھی اور جلسہ خلافت کی خدمت صدارت مجھے انجام دینی پڑی تھی۔ اس موقع پر بھی کانگریس کا اجلاس مشترک طور پر ہوا تھا۔ اس کے صدر دہرہ دون

کے ایک پنڈت صاحب تھے۔ میرا خطبہ اس وقت بھی شائع ہوا تھا۔ ان جلسوں کے خطبوں کے ضروری اقتباسات حضرت مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند نے اپنے رسالہ[1] میں نقل کر دیئے ہیں اسی طرح سہارنپور کے مدرسہ مظاہر العلوم کے سالانہ جلسہ میں بھی کلکتہ سے حاضر ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد کراچی کے مشہور جلسہ میں حاضر ہونا پڑا جس پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا اور دو سال قید بامشقت کی عزت مجھے اور مولانا محمد علی مرحوم و مولانا شوکت علی وغیرہ میرے ساتھیوں کو حاصل ہوئی اور کلکتہ کی ملازمت اس کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس تحریر کو یہاں ختم کر دیں کیونکہ یہ احوال اکثر تحریروں میں آ گئے ہیں[2] خصوصاً مولانا محمد میاں صاحب نے اپنے رسالوں میں ذکر فرما دیئے ہیں اور لوگوں کو معلوم بھی ہیں۔ نیز خطبات اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس لئے مزید تحریر غیر ضروری سمجھ کر قلم فرسائی بند کرتے ہیں

کانگریس سے تعلق

میں اگرچہ پہلے سے کانگریس میں شامل نہ تھا مگر مالٹا سے واپسی پر کانگریس کا ممبر باقاعدہ بن گیا اور ہمیشہ جدوجہد آزادی میں شریک رہا اور قید و بند کی مصائب بھی اہل ملک کے ساتھ ساتھ جھیلتا رہا۔ بفضلہ تعالیٰ اس میں کامیابی ہوئی اور انگریزوں کی غلامی سے تمام ہندوستان آزاد ہو گیا۔ فالحمد للہ اولاً و آخراً۔

اس تحریک کی ابتداء نینی جیل میں ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی۔ ابھی چند صفحات لکھے تھے کہ رہائی ہو گئی پھر جب بھی تکمیل کا ارادہ کیا مشاغل اور عوائق حائل ہوتے رہے۔ مگر احباب کے تقاضوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ دن بدن شدید ہو کر بڑھتے رہے۔ خدا خدا کر کے بڑی مشکلوں سے ۱۹۵۳ء کے آغاز میں یہ ٹوٹی پھوٹی تحریر اختتام کو پہنچی۔ مشاغل و عوائق جس طرح باعث تاخیر ہوتے رہے وہ شکستگی میں بھی اضافہ کرتے رہے۔ اور اس کا موقع بھی میسر نہ آسکا کہ نظرثانی کر سکوں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے پیش خدمت ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہٗ۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیے رسالہ حیات شیخ الاسلام۔ [2] ملاحظہ فرمائیے علماء حق جلد اوّل و دوم و حیات شیخ الاسلام۔

ضمیمہ صفحہ ۲۱۲

حضرت مصنف مدظلہٗ العالی نے نقشِ حیات جلددوم میں چند واقعات کی تفصیل کے لئے سفرنامہ اسیرِ مالٹا کا حوالہ دیدیا ہے۔ چونکہ یہ تفصیل دلچسپی کے علاوہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے حالات کے بارہ میں خاص اہمیت بھی رکھتی ہے۔ اس لئے اس کو اس ضمیمہ میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ مطالعہ کرنے والے حضرات کو تشنگی باقی نہ رہے۔ البتہ یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ سفرنامہ اسیرِ مالٹا چونکہ برطانوی سامراج کے دورِ شباب میں ایسے وقت لکھا گیا تھا کہ حضرت مصنف (شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی) جیل میں بند تھے۔ اس لئے اندازِ تحریر میں یہ لحاظ رکھنا ضروری تھا کہ مسودہ جیل خانہ کی چاردیواری سے باہر نکل کر طبع ہوسکے اس لئے بعض واقعات کو آئینی الفاظ میں ظاہر کرنا پڑا ہے۔ ناظرین کرام اس پس منظر کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ عبارتیں ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا مرحوم کا حجاز کو روانہ ہونا ماہ شوال ۱۳۳۳ھ میں قصد فرمایا چونکہ مولوی عزیز گل صاحب خاص خادم کو اپنے وطن کی طرف جانا اور اپنے اکابر سے ملنا اور اجازت چاہنا ضروری تھا اس لئے اُن کی واپسی کا انتظار فرمایا۔ اس مدّت میں سامان سفر قدرے مہیّا ہوگیا۔ عالی جناب حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری برادر بزرگ جناب ڈاکٹر انصاری نے اس سفر میں نہایت زیادہ امداد دی جس کے حضرت مولانا مرحوم ہمیشہ ممنونِ منّت رہا کئے۔ حکیم صاحب موصوف مولانا سے پہلے بمبئی پہنچ گئے اور ہر قسم کا ضروری سامانِ سفر نہایت فراخ دلی کے ساتھ مہیّا کردیا۔ بلکہ جائے قیام اور ٹکٹ وغیرہ کا بھی انتظام کافی طور پر کردیا۔

مولانا کے رفقائے سفر مولانا کی روانگی ایک معمولی شخص کی روانگی نہ تھی۔ بہت سے اربابِ عقیدت استفاضہ یا خدمت کے لئے ساتھ ہولئے جن میں سے خاص خاص حضرات حسب ذیل ہیں۔

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری۔ مولانا محمد سہول صاحب بھاگل پوری۔ مولوی محمد میاں صاحب انبھٹوی۔ مولوی عزیز گل صاحب ساکن زیارت کاکا صاحب۔ حاجی خان محمد صاحب مرحوم

مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب دیوبندی۔ حاجی محبوب خاں صاحب سہارنپوری۔ حاجی عبدالکریم صاحب سرونجی۔ مولوی وحید احمد وغیرہ۔

مولانا کے سفر کی نسبت افواہ

عام لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ مولانا دیوبند سے ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔ اور اب ہمیشہ حرمین شریف میں عمر بسر فرمائیں گے۔ اور چونکہ مولانا مرحوم نے بخوف ممات اپنی جائداد شرعی طریقہ پر ورثاء میں تقسیم کر دی تھی۔ اس لئے اور بھی لوگوں کو اس خیال میں تقویت ہوئی۔ مولانا نے ایک عرصہ تک کے لئے اپنے گھر کے مصارف کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ اس خاص افواہ کی وجہ سے ہر اسٹیشن پر لوگوں کا بہت بڑا مجمع زیارت کے لئے موجود رہتا تھا۔ طلباء مدرسہ نے اپنے اپنے اعزہ کو تاریخ روانگی سے تار کے ذریعہ مطلع کر دیا تھا۔ غرض کہ ہر اسٹیشن پر ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا جس کی وجہ سے مصافحہ کرنا بھی سخت دشوار تھا۔ مشایعت کرنیوالے بھی بہت سے ساتھ ہو گئے تھے۔ دہلی میں مولانا مرحوم نے گاڑی میں قدرے تاخیر ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر جا کر چاء بھی نوش فرمائی اور بہت تھوڑی دیر قیام فرما کر گاڑی کے وقت اسٹیشن پر آ گئے تاگدہ ریلوے سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں رتلام، راندیر میں بھی قدرے قیام فرمایا۔ کیونکہ ان مقامات پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص خاص لوگ تھے جنہوں نے سخت اصرار فرمایا تھا۔

راندیر سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچے اور انجمن محافظ حجاج کے آفس میں جس کو حکیم عبدالرزاق صاحب نے پہلے سے آراستہ کر رکھا تھا قیام فرمایا۔ وہاں بھی مولانا کے زائرین کا ایک بڑا مجمع رہتا تھا۔ اگر انجمن کے کارکن انتظام کافی نہ کرتے تو غالباً مولانا کو آرام کی صورت ممکن ہی نہ ہوتی۔

بمبئی سے مولانا کی روانگی

چونا رنجیں اکبر جہاز کی روانگی کی تھیں۔ اسی کے ٹکٹ مولانا مرحوم اور ان کے ساتھیوں کے لئے لئے گئے تھے۔ مولانا اور ان کے بعض خاص خدام کے ٹکٹ سیکنڈ کلاس کمرہ کے اور باقی ماندہ کے چھتری یا تنق کے تھے چنانچہ بروز شنبہ، ۷ ذی القعدہ ۱۳۳۳ھ کو جہاز پر سوار ہو کر جدہ کو روانہ ہو گئے۔ چونکہ اکثر ہمراہیوں کی طبیعت دریائی سفر سے مانوس نہ تھی۔ اس لئے عموماً ان کو بدمزگی اور چکر وغیرہ کی شکایت پیش آئی۔ جس کی وجہ سے شکایت پیش آئی جس کی وجہ سے میوہ جات اور عمدہ غذائیں اپنے موقع پر صرف نہ ہوئیں جن کی بڑی مقدار حکیم صاحب نے مولانا اور ان کے رفقاء کے لئے مہیا کی تھی بلکہ بہت سی چیزیں ضائع ہوئیں۔ بوجہ ظہور جنگ ان دنوں قرنطینہ جزیرہ کامران سے اٹھا لیا گیا تھا۔ اور قریب جدہ کے مقام سعد میں ہوتا تھا۔ چنانچہ جہاز نے وہاں لنگر ڈالا اور بخیر و خوبی مولانا اور ان کے رفقاء اترے اور ... قرنطینہ ... عافیت سے انجام دے کر جدہ پہنچے۔

خفیہ پولیس کی افواہ

بمبئی میں سوار ہوتے وقت بعض لوگوں نے مولانا کے رفقاء سے یہ کہا کہ تقریباً آٹھ دس آدمی تمہارے ساتھ خفیہ پولیس کے ہیں اُن سے احتیاط رکھنا (ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بیان صحیح تھا یا غلط) چونکہ یہ بات اہل جہاز کو معلوم ہو چکی تھی۔ کسی شخص نے جو کہ غالباً جدّہ یا مکہ معظمہ کا رہنے والا تھا اس کو ٹرکی پولیس تک پہنچا دیا۔ اور جو لوگ مشتبہ تھے اُن کے نام ونشان بتا دیئے اور کہہ دیا کہ یہ لوگ مولانا پر مسلّط ہو کر آئے ہیں حالانکہ اس قسم کا خیال نہ مولانا کو تھا اور نہ اُن کے رفقاء کو۔ ٹرکی پولیس نے فوراً ان لوگوں کو گرفتار کر لیا اور مولانا مرحوم کی خدمت میں پولیس کا افسر تصدیق کرانے کے لئے حاضر ہوا۔ مولانا خود تو آفس میں نہ گئے مگر مولانا مرتضےٰ احسن صاحب وغیرہ کو بھیجدیا۔ چونکہ واقعی طور پر کوئی یقینی بات تھی ہی نہیں اس لئے مولوی صاحب موصوف نے یہی بیان دیا کہ ہم کو کوئی یقین ان لوگوں کے سی۔ آئی۔ ڈی ہونے یا مولانا پر مسلّط کئے جانے کا نہیں ہے۔ ہم کوئی شہادت ایسی نہیں دے سکتے جس کا ہم کو علم نہیں۔ مگر پولیس ٹرکی نے اس جواب کو اس پر محمول کیا کہ چونکہ ان لوگوں کو پھر ہندوستان جانا ہے اس لئے صریح طور پر اپنی معلومات کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ الحاصل ٹرکی پولیس نے ان لوگوں کو زیر حراست رکھا اور اسی طرح ان کو حج کرا کر یہ کہا کہ اگر تم اپنے محافظ سپاہیوں کا خرچ دو تو تم کو مدینہ منورہ کی زیارت کی اجازت مل سکتی ہے ورنہ تم کو ہندوستان واپس ہونا پڑے گا۔ چونکہ ان لوگوں کے پاس اتنا خرچ نہ تھا اس لئے وہ بمبئی واپس کر دیئے گئے۔

دوسری افواہ

بعض خفیہ پولیس کے افسروں کا بیان ہے کہ جب مولانا مرحوم بمبئی پہنچے تو وہاں کے افسر پولیس کے پاس تار آیا کہ مولانا کو بمبئی میں گرفتار کر لیا جائے اور آگے جانے نہ دیا جائے مگر چونکہ مولانا کے پاس بہت بڑا مجمع رہتا تھا اس لئے بمبئی کے مقامی حکام کو بلوہ کا خوف ہوا اور اس وجہ سے انہوں نے عملدر آمد سے پہلو تہی کی۔ پھر دوسرا حکم روانگی کے بعد جہاز کے کپتان کے پاس پہنچا کہ مولانا کو جدّہ میں اُترنے نہ دیا جائے بلکہ جہاز ہی پر گرفتار کر لیا جائے مگر یہ حکم اُس کے پاس اُس وقت پہنچا جبکہ مولانا جزیرہ سعد میں برائے قرنطینہ اُتر چکے تھے۔ اس لئے ہمیں معذوری رہی (ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں بیان کہاں تک صحیح ہیں) مگر ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے۔

مولانا مرحوم کی جدّہ سے روانگی اور مکہ معظمہ میں داخلہ

۲۶ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ اونٹوں کی سواری پر مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے اور اٹھائیسویں کو مکہ معظمہ میں شب بحرہ گذار کر شام کو

داخل ہوئے وہ زمانہ طبعی طور پر حجاج کے ہجوم کا ہوتا ہے مگر چونکہ جنگ کی وجہ سے بہت سے ملکوں سے حجاج کی آمد و رفت بند یا کم ہو گئی تھی اس وجہ سے حسب دستور ہجوم میں کمی ضرور تھی۔ تاہم مکہ معظمہ کی گلیاں اور مکانات مسافرین سے لبریز تھے۔ حرم محترم میں بھی لوگوں کی کثرت تھی۔ مولانا مرحوم طواف قدوم وسعی وغیرہ ادا کرنے کے بعد احباب سے ملنے اور اورادِ عبادت میں بہ دل وجان مشغول ہوئے۔

ضمیمہ صفحہ ۲۲۸

سفرنامہ اسیر مالٹا (جس کا حوالہ دیا گیا ہے) اس کی عبارت درج ذیل ہے۔

حضرت شیخ الہند بہ معیت سید ابن عاصم صاحب آمد و رفت کا اونٹ کرایہ کر کے ۲۰ رجب ۱۳۳۴ھ کو روانہ ہو کر ۲۳ یا ۲۴ رجب کو طائف پہنچے شہر پناہ کے باہر ایک باغ میں فروکش ہوئے جس کا انتظام سید صاحب نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ باغ کے بالائی حصہ مکان میں سید ابن عاصم صاحب مع اپنے متعلقین تھے اور نیچے کے ایک حصہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس سفر میں مولانا کے ہمراہ فقط تین آدمی تھے۔ مولوی عزیز گل صاحب۔ وحید احمد اور کاتب الحروف حسین احمد۔

طائف

طائف حقیقتاً ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مگر اس کا اطلاق بہت بڑے حصہ پر کیا جاتا ہے جس میں بہت سے قصبات اور دیہات شامل ہیں۔ یہ قطعہ زمین کا بہت اونچائی پر واقع ہے۔ اونٹوں کے راستہ سے تین دن میں یہاں پہنچتے ہیں۔ کیونکہ چکر زیادہ ہے اور چڑھائی بآسانی طے ہوتی ہے۔ اور جبل کرہ کے راستہ سے جس میں خچر گدھے گھوڑے چلتے ہیں ۲۴ گھنٹے بلکہ اس سے کم میں آدمی پہنچ جاتا ہے مگر راستہ دشوار گزار ضرور ہے۔ آدھے راستہ ہی سے ہوا بالکل متغیر ہو جاتی ہے جبکہ مکہ معظمہ میں سخت گرمی کی وجہ سے شب کو بھی آرام نہ ہوتا ہو طائف میں پتلی رضائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں کا موسم گرمیوں میں نہایت عمدہ رہتا ہے جا بجا باغات ہیں۔ ہر قسم کے میوے بکثرت اور عمدہ ہوتے ہیں۔ انگور، انجیر، برشومی (ناگ پھل) انار، آڑو، آلوچہ وغیرہ وغیرہ جملہ سرد ملکوں کے میوے بکثرت اور عمدہ ہوتے ہیں۔ زراعت اور سبزی ہر قسم کی پیدا ہوتی ہے جا بجا نہریں بھی ہیں۔ کنویں میٹھے بکثرت ہیں۔ بارش بھی خوب ہوتی ہے حجاز کے لئے طائف ہند کے لئے شملہ کی مانند ہے۔ ترکی گورنر اکثر گرمیوں کے زمانہ میں طائف میں رہا کرتا تھا اور بڑے درجہ کے حکام اور اہل عرب شریف وغیرہ بھی وہاں ہی چلے جاتے تھے۔

فتنہ حجاز جب ہم مکہ معظمہ میں پہنچے تو عجیب عجیب افواہیں مشہور تھیں عام بدوؤں اور اہل شہر کی زبانی سنا جاتا تھا کہ عنقریب بدعملی ہونے والی ہے۔ شریف حسین انگریزوں سے ملا ہوا ہے اور بغاوت کرنیوالا ہے مگر ترکی کے استقلال میں کوئی فرق نہ تھا۔ ترکی فوج تمام حجاز میں غالباً چار پانچ ہزار ہوگی۔ کیونکہ اکثر فوج دوسرے مقامات جنگ پہ چلی گئی تھی۔ شریف نے باب عالی کو اطمینان دلا رکھا تھا کہ حجاز کا ذمہ دار میں ہوں، یہاں زیادہ قوت رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جائے ضرورت جنگ پر اپنی قوت پہنچاؤ۔ یہ موجودہ فوج بھی جدہ۔ مکہ، طائف پر منقسم تھی ہم کو یہ بھی اس وقت کہا گیا کہ جلد طائف جانا اور لوٹ آنا چاہیئے۔ مبادا بدعملی ہو جائے۔ مگر ہم کو یقین کامل نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں یہ خبر بھی مشہور ہوئی تھی کہ گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے کوئی خط شریف کے نام آیا ہے کہ فلاں تاریخ تک یا تو تم ترکوں کو حجاز سے نکال دو ورنہ ہم شریف علی کو (جو پہلے شریف حجاز تھا اور شریف حسین موجودہ کا بھائی ہے اور اس وقت مصر میں مقیم تھا) اس کو حجاز کا شریف بنا کر بھیجیں گے (نہ معلوم یہ خبر کہاں تک صحیح تھی) جدہ میں ہمیشہ جنگی آگبوٹ آتے اور بندر میں تین تین چار چار اور کبھی کم زیادہ ہو جاتے تھے اور کھڑے رہ کر چلے جاتے تھے۔ نہ وہ کچھ تعرض کرتے تھے نہ ترکی حکومت۔

ہم اس رسالہ میں ان واقعات کو دکھلانا نہیں چاہتے۔ جو کہ اس فتنہ کے زمانہ میں ہوئے کیونکہ اس کے لئے ہمارا ارادہ ہے کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو مستقل رسالہ لکھیں گے اس مقام پہ تو فقط حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا سفر نامہ لکھنا ہے۔ ہم کو طائف پہنچ کر کچھ طبیعت سیر ہونے کا موقعہ ہاتھ نہ آیا تھا کہ شتربان آیا اور کہا کہ اگر چلنے ہو تو شتر حاضر ہے ورنہ میں آٹھ دن کے بعد پھر آؤں گا۔ مطوف صاحب اور ہم لوگوں کی رائے ہوئی کہ ایک ہفتہ یہاں اور قیام کر لیا جائے اس کے بعد مکہ معظمہ جانا چاہیئے۔ اتفاق وقت سے اس وقت طائف میں میوے بہت کم تھے شہتوت اور خوبانیوں وغیرہ کا ابتدائی موسم تھا البتہ شہد خوب آتا تھا۔ دو چار دن بعد مولانا مرحوم نے تقاضا فرمایا کہ مکہ معظمہ کو چلنا چاہیئے۔ مگر شتربان جا چکا تھا ایک دو دن کے بعد پھر زیادہ تقاضا فرمایا۔ ہم نے جب دوسری سواریاں تلاش کیں تو معلوم ہوا کہ راستہ بند ہو گیا ہے۔ ہم اس وقت اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ کیوں اس قدر تقاضا کیا جا رہا ہے مگر دو ہی تین دن کے بعد معلوم ہو گیا کہ آئندہ آنیوالے واقعات نے خلاف عادت مولانا کو تقاضائے سفر پر مجبور کیا ہے جن کو نظر کشفی سے مولانا نے معلوم کر لیا تھا مگر چونکہ ضبط اور اخفاء کا مادہ بہت زیادہ تھا ادھر

مقام رضا میں قدم راسخ تھا۔ اس لئے چند مرتبہ ظاہری تقاضا کرنے کے بعد چپ ہو رہے اور پھر معلوم ہوا کہ طائف نہایت سخت خطرہ میں پڑ گیا ہے اس لئے جو لوگ باہر باغوں میں مقیم ہیں اُن کو شہر پناہ میں چلے جانا ضروری ہے چنانچہ ہمارے مطوّف سیّد امین عاصم صاحب معہ اپنے اہل و عیال شہر میں سیّد علی حبشی کے مکان پر چلے گئے اور ہمارے لئے بھی وہاں ہی ایک کوٹھری لے دی۔ تمام شہر میں اس وقت عجب ہل چل تھی۔ ۹ شعبان روز شنبہ کو ہم لوگ شہر میں چلے گئے تھے ترکی افسروں کو بھی یہ بات محسوس ہو گئی انہوں نے شہر کے اردگرد حسب قواعدِ جنگ کیلئے مورچے بنائے اور جن جن باغوں اور مکانوں کو مورچہ کے لئے مناسب جانا اُن کو خالی کرالیا۔ گیارہویں شعبان ۱۳۳۴ھ کی شب کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے شریف کی فوجوں نے چڑھائی کی جو کہ زیرِ کمانداری عبداللہ بیگ کام کر رہی تھیں۔ صبح صادق کے وقت ہم سب بہ معیت حضرت مولانا مرحوم صبح کی نماز کے لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مسجد میں جا رہے تھے کہ ناگاہ ایک بندوق کی آواز سُنائی دی۔ پھر تو چاروں طرف سے بندوقیں چلنے لگیں ترکی فوج جس نے چاروں طرف حسب قواعدِ جنگ مورچے بنا رکھے تھے پورے طور سے جواب دیتی رہی اگرچہ ترکی فوج کی مقدار تقریباً ایک ہزار مسلح سپاہی کے تھی۔ باقیماندہ لوگ مسلح نہ تھے مگر چونکہ منتظم جماعت تھی اس نے بدوی فوجوں کو بہت زیادہ اور قوی نقصان پہنچایا بدوؤں کی مقدار بہت زیادہ بتائی جاتی ہے اس سے دو دن پہلے مکۂ معظمہ، جدّہ، منبع، مدینہ منوّرہ میں بھی واقعہ پیش آچکا تھا۔ کیونکہ شریف نے انتظام کیا تھا کہ ایک ہی دن میں سب جگہ یہ کام ہو۔ اس جنگ کی وجہ سے جو لوگ طائف میں غلّہ اور ترکاری میوہ وغیرہ لاتے تھے اُن کا آنا بند ہو گیا اور یہاں سے باہر کا جانا بھی بند ہو گیا۔ ادھر فوجی حکام کو رسد کی فکر ہوئی۔ حسب قواعدِ جنگ انہوں نے تاجروں سے موجودہ غلّہ کی نصف مقدار لینی شروع کی۔ جس نے خوشی سے دے دیا اس کی مقدار میں سے نصف لے لیا اور نصف چھوڑ دیا اور لئے ہوئے نصف کی قیمت اُس وقت کے حساب سے لگا کر اس کو رسید دے دی کہ حکومت ترکی بعد از جنگ یہ مقدار تجھ کو ادا کرے گی۔ البتّہ جن لوگوں نے چھپایا اُن پر شدّت کی گئی اور تمام مال تجارت ان کا خورد و نوش اور ضروریات فوجی قسم کا لے لیا گیا فقط بمقدار ان کے اہل و عیال کی ضرورت کے اُن کو دے دیا گیا۔ ادھر تو شہر میں غلّہ

کی کمی اُدھر آمد بالکل بند غرضکہ اس وجہ سے شہر میں سخت گرانی ہوگئی۔ پھر شریف کے لوگوں نے نہر کو بھی اوپر سے بند کر دیا اس وجہ سے پانی کی سخت تکلیف ہوئی۔ اگر چہ قشلہ (فوجی قیامگاہ) کا کنواں نہ ہوتا تو نہایت زیادہ مشکلات کا سامنا ہوتا۔ اگر چہ شریف کی فوج کثیر تعداد میں تھی اور اس کے پاس نئی اور عمدہ انگریزی رائفلیں بھی تھیں اور سامان جنگ نہایت کثرت سے تھا مگر باوجود سعی بسیار ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ جب انہوں نے ہجوم کیا منہ کی کھائی۔ دن رات برابر گولیاں چلتی رہتی تھیں ترکی فوج اُن کے مجمعوں پر توپوں سے گولے برساتی تھی۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی اس کے بعد وہ مصری فوجیں جو جدہ میں اس کے لے لینے کے بعد اتاری گئی تھیں اور جنہوں نے مکہ معظمہ کے قلعہ اور قشلہ کو توپوں کے ذریعہ سے فتح کیا تھا۔ طائف میں معہ توپوں کے پہنچیں اور طائف کے چاروں طرف سے توپیں سات یا آٹھ نصب کر کے قلعہ اور قشلہ پر گولہ باری کرنے لگیں۔ صبح صادق سے تقریباً بارہ بجے تک یہ عمل ہوتا رہا۔ اس کے بعد توپیں ٹھہر جاتی تھیں۔ ترک بھی اُن کا جواب دیتے تھے۔ یہی حال عید مبارک تک رہا افسوس کہ عید کے دن بھی شریف کے لوگوں نے جنگ کو موقوف نہ کیا۔

مولانا کا رمضان طائف میں

چونکہ رمضان کا مہینہ طائف میں نہایت بدامنی کی حالت میں واقع ہوا تھا اس لئے نہ تو دن کو حسب خواہش لوگوں کو خوراک کا انتظام کرنا ممکن نہ ہوتا تھا نہ مساجد میں تراویح وغیرہ کا انتظام حسب ضرورت ہو رہا تھا۔ مسجد ابن عباسؓ وہاں کی بڑی مسجد ہے اس میں بھی تراویح الم ترکیف سے ہوتی تھیں۔ اور اس میں بھی بہت کم آدمی آتے تھے باقی لوگ محلہ کی مسجدوں اور اپنے مکانوں میں پڑھتے تھے۔ کیونکہ ہر وقت گولیاں اُوپر سے گذرتی رہتی تھیں۔ مولانا نے بھی اولاً مسجد ابن عباسؓ میں حسب عادت سابقہ تراویح پڑھنی شروع کیں۔ مگر چونکہ راستہ وہاں کا ایسا تھا جہاں پر گولیاں برابر آتی رہتی تھیں۔ اس لئے اس مسجد میں جانے وقت خطرہ ضرور رہتا تھا اور پھر ایک شب میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نماز مغرب پڑھ کر فارغ ہوئے ہی تھے ابھی تک نفل وغیرہ پڑھ رہے تھے اندھیرا ہو چکا تھا کہ بدوؤں نے ہجوم کیا۔ مسجد ابن عباسؓ کی چھت اور میناروں پر بھی ایک بڑا دستہ ترکی فوجوں کا تھا اور مسجد کے قریب جو دروازہ تھا وہاں پر مورچہ بھی تھا۔ غرضکہ طرفین میں خوب گولی اور گولوں کی بارش دیر تک ہوتی رہی۔ خود مسجد میں بھی برابر گولیاں برستی

رہیں۔ جو لوگ مسجد میں باقی تھے وہ ایک کونہ میں جدھر گولیوں کے آنے کا گمان نہ تھا بیٹھ گئے۔
اس روز تراویح بھی نہیں ہوئی صرف چند آدمیوں نے بوقت نماز عشاء فرض عشاء ایک طرف پڑھ کر جب کچھ سکون ہوا چلے گئے۔ اس کے بعد احباب اور خصوصاً سید ابن عاصم صاحب نے اصرار کیا کہ آپ مسجد ابن عباسؓ میں نماز کے لئے نہ جایا کریں۔ دروازہ مکان کے قریب جو مسجد ہے اس میں ہمیشہ نماز باجماعت پڑھا کریں۔ چنانچہ تمام رمضان اوقات خمسہ کی نماز وہاں پڑھا کرتے تھے۔ اس سال تراویح فقط الم ترکیف سے پڑھی گئی۔ اس کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نوافل میں سحر کے وقت تک مسجد میں مشغول رہتے تھے اور مولوی عزیز گل صاحب اور کاتب الحروف بھی اسی مسجد میں علیحدہ علیحدہ نفلوں میں وقت گزارتے۔ چونکہ گرمیوں کی رات تھی۔ جلد تر سحور کا وقت ہو جاتا تھا۔ پھر آکر کچھ سحری پکاتے جو کہ میٹھے چاول ہوتے تھے۔ مگر اکثر چونکہ شکر وہاں ملتی نہ تھی اس لئے شہد کو بجائے شکر چاول اور چاء میں استعمال کرتے تھے اور نمکین چاول بغیر گوشت پکایا جاتا تھا۔ اس وقت طائف میں چاول وغیرہ بھی دستیاب ہونا مشکل ہوتا تھا۔ ایک آنہ والی روٹی آٹھ آنہ کو بمشکل ملتی تھی۔ مگر دہلی کے تاجروں میں سے حاجی ہارون مرحوم نے تھوڑے سے چاول مولانا مرحوم کے لئے ہدیۃً بلا طلب بھیج دیئے تھے جو کہ عمدہ قسم کے تھے۔ انہوں نے بہت کام دیا۔ اس مدت میں جو کہ تقریباً دو ماہ تھی ہم نے دس بارہ اشرفی طائف میں بوجہ سخت گرانی کھا ڈالی۔

طائف سے روانگی

عید کے بعد چونکہ تمام اہل شہر بھوک سے مرنے لگے تھے حکام کے پاس جا کر شکایت کی کہ اب ہمارے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا۔ ہمارے پاس جتنے حیوانات دودھ سواری کے تھے کھا ڈالے۔ سب غلہ ختم ہو گیا۔ اب ہمارے لئے کوئی صورت کیجئے۔ ہم سب مرے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا صبح کے آٹھ بجے سے بارہ بجے تک باب ابن عباسؓ سے روانگی کے لئے ہم تم کو اجازت دیں گے۔ ہم اپنی حد میں تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے شریف کے آدمی تم کو نقصان پہنچائیں تو اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔

الحاصل لوگوں کو اس طرح ایک فارم معہ اُن کے اہل و عیال کے نام دیا جاتا تھا اور اُن سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ کہیں آکر ترکی حکومت سے جنگ نہ کریں گے۔ پھر اُن کو معہ اُن کے ضروری اسباب کے باہر نکلنے دیا جاتا تھا۔ جب اِس طرح سے لوگ نکلنے

لگے تو پھر ہم سبھوں کو ضروری معلوم ہوا کہ نکل چلیں چنانچہ ۶ شوال ۱۳۳۴ھ کو بوقت صبح ہم بھی باب ابن عباسؓ سے نکلے اور وہاں سے چل کر پھرتے ہوئے (قیم) میں پہنچے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر شریف کا بیٹا عبد اللہ بیگ جو کہ کماندار بدوؤں کا تھا مقیم تھا اور تمام فوجی حرکات کا یہی مرکز تھا۔ یہیں مصری فوج کے خیمے بھی تھے چونکہ ہمارے پاس نہ سواری تھی اور نہ نقد وغیرہ اور راستہ دور تھا۔ ادھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نہایت ضعیف تھے تین دن تک پہاڑی راستہ کو قطع کرنا آسان نہ تھا۔ علاوہ ازیں اسباب بھی نہ تھا اس وجہ سے وہاں جانا ضرور ہوا۔ عبد اللہ بیگ سے ملاقات ہوئی۔ اعزاز و اکرام سے پیش آیا۔ ایک خیمہ کھڑا کرنے کا حکم کیا۔ ایک دنبہ ذبح کر کے دعوت پیش کی (عرب میں عادت ہے کہ معزز مہمان کی دعوت میں دنبہ ذبح کرنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ کامل اکرام مہمان کا شمار نہیں ہوتا) اور پھر انجیر وغیرہ میوہ جات بھیجے۔ اور ایک اشرفی نذر کی اور کہا کہ شب کو یہاں قیام کرو علی الصباح تم کو روانہ کر دیا جائے گا۔ مگر علی الصباح لڑائی پر چلا گیا۔ اس کے لوگوں نے خالی پشت شتر کا انتظام کر دیا۔ کرایہ بھی خود دیا اور زاد راہ بھی۔ اس طرح وہاں سے روانہ ہو کر ہم دسویں شوال کو مکہ معظمہ علی الصباح پہنچے۔

ضمیمہ صفحہ ۲۳۲

حضرت مصنف مدظلہ العالی اپنی تصنیف ''سفرنامہ اسیر مالٹا'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

ایام حج میں اورنگ آباد کے خان بہادر مبارک علی مکہ معظمہ تشریف لائے۔ سرکاری آدمی تھے۔ لن ترانیاں خوب ہانکتے تھے۔ شریف صاحب کے یہاں پہنچے۔ ترکوں کو ہر مجلس میں برا کہتے تھے۔ حکومت موجودہ کی مدح سرائی میں زبان خشک ہو جاتی تھی انہوں نے ظاہر کیا کہ میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں تاکہ حجاز کے احوال کو دریافت کر کے واقعی باتیں اہل ہند کو بتاؤں۔ کیونکہ ہند میں اس وقت بے چینی بہت پھیلی ہوئی ہے اور عموماً اہل ہند یہ طاتیبر پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے بادشاہ حجاز کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک اعلان علماء مکہ کی طرف سے مجھ کو دیا جائے جس میں ترکوں اور اُن کی حکومت اور خلافت کی برائیاں ان کے استحقاق خلافت پر تردید و مضمون سے رد کیا گیا ہو۔ ہیں موجودہ انقلاب اور حکومت حاضرہ کی بھلائیاں ذکر کی گئی ہوں۔ چنانچہ ایک ایسا محضر تیار کیا

گیا اور وہاں کے ان علماء سے جن کو دربار شرافت میں دخل تھا اور صاحب عزت و شوکت شمار کئے جاتے تھے اس پر دستخط اور مہر کرایا گیا۔ بہتوں نے خوشی سے اور بہتوں نے خوف سے دستخط اور مہر کر دیا۔ خان بہادر موصوف کے پاس جب یہ محضر نامہ پہنچا تو انہوں نے کہا کہ ان علماء کو کوئی ہند میں نہیں جانتا۔ کون تصدیق کرے گا۔ مناسب ہوگا کہ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب جو کہ علماء ہند میں ایک مشہور اور مسلم شخص ہیں اُن کے اور دیگر علماء ہند کے دستخط اور مہر ہوں۔ (نہ معلوم یہ اسی واسطے وہاں بھیجے گئے تھے کہ اس ذریعہ سے مولانا مرحوم کو وہاں سے پکڑا جائے یا یہ قضیہ اتفاقیہ تھا)

الحاصل اس مضمون کو وہاں کے شیخ الاسلام مفتی عبداللہ سراج جو کہ زمانۂ حکومت ترکیہ میں مفتی الحناف تھے اور اب انقلاب کے بعد عہدۂ شیخ الاسلامی اور وکالت شرافت پر مامور ہو گئے تھے بذریعہ نقیب العلماء مولانا کے پاس بھیجا اواخر محرم الحرام ۱۳۳۵ھ میں عصر کے بعد وہ اس محضر کو لے کر مکان پر آیا۔ اس زمانہ میں اہالی مکہ معظمہ میں سے جو لوگ مہاجرین ہند اور علم دوست تھے انہوں نے ظہر کے بعد مولانا مرحوم سے بخاری شریف کو شروع کر رکھا تھا۔ مکانِ اقامت ہی پر درس دیا کرتے تھے۔ جب وہ کاغذ آیا تو چونکہ اُس کی سُرخی تھی "من علماء مکۃ المکرمۃ المدرسین بالحرم الشریف المکی"۔ یعنی یہ تحریر مکہ مکرمہ کے اُن علماء کی طرف سے ہے جو حرم شریف مکی میں پڑھاتے ہیں۔ اِس لئے اُن سے کہا گیا کہ "اوّلاً اس سرخی کی وجہ سے کوئی استحقاق نہیں کہ حضرت مولانا اس پر کچھ لکھیں کیونکہ وہ علمائے مکّہ میں سے نہیں اور نہ حرم مکی یعنی مسجد الحرام میں مولانا نے کبھی تدریس کی ثانیاً اس میں قوم ترک کی مطلقاً تکفیر کی گئی ہے اور درباره اس کے جو کچھ احتیاط اور سخت احکام ہیں آپ کو معلوم ہے۔ ثالثاً اس میں وجہ تکفیر سلطان عبدالمجید خاں کا تخت سے اتار دینا لکھا گیا ہے۔ حالانکہ کسی فقیہ نے اس کو موجبات کفر میں سے قرار نہیں دیا۔ رابعاً اس میں خلافتِ سلاطین آل عثمان کا انکار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ اَمر مخالف نصوص شرعیہ میں ہے۔ خامساً اس میں اس انقلاب اور حرکت کو مستحسن دکھایا گیا ہے اور یہ بھی شرعاً نہایت قبیح واقع ہوا ہے"۔ چونکہ کاتب الحروف کی نقیب العلماء سے کچھ پہلے سے معرفت تھی اس لئے اُن سے تمام کیفیتیں ظاہر کر دینے کے بعد یہ کہا گیا کہ تم شیخ الاسلام سے یہ کہہ دینا کہ مولانا نے اس پر دستخط اور مہر کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ اس کا عنوان اہل مکّہ اور مدرسین حرم کے ساتھ مخصوص ہے میں آفاقی شخص ہوں۔

پردیسی ہونے کی وجہ سے مجھ کو کوئی استحقاق اس پر دستخط کرنے کا نہیں اور یہ کہا گیا کہ ابھی دوسری وجہوں کو اُن پر ظاہر نہ کرنا اگر پھر انہوں نے اصرار کیا تب ان وجہوں کو پیش کیا جائے گا۔ وہ اسی وقت واپس ہو گئے اور پھر کوئی جواب نہ لائے۔ اس محضر کا شہر میں پہلے سے چرچا تھا۔ جو لوگ مقامی تھے اُن کو خوف لگا ہوا تھا کہ اگر ہمارے پاس آیا تو ہم کیا جواب دیں گے اور کس طرح جان چھڑائیں گے۔ مولانا مرحوم کے رد کرتے ہی تمام شہر میں مشہور ہو گیا کہ مولانا نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اب تو دوسروں کو بھی ہمت ہو گئی۔

ادھر شیخ الاسلام صاحب کو متنبہ ہوا انہوں نے عبارت سابقہ بالکل بدل ڈالی اور اس طرح اس کو لکھا کہ اس میں سے مبحث تکفیر بالکل خارج ہو گیا۔ مگر دستخط کرنے کو پھر نہیں بھیجا۔ جو عبارت دوبارہ بنائی گئی تھی۔ اس پر پہلے علماء سے فقط دستخط لے کر اخبار "القبلہ" میں چھاپ دیا اور اسی کو خان بہادر مبارک علی خاں لے کر روانہ ہو گئے۔ خیر خواہوں نے مولانا مرحوم سے کہا کہ کہیں شریف آپ کو کوئی اذیت نہ پہنچائے۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ پھر کیا کیا جائے۔ مذہبی حیثیت سے اس پر مہر و دستخط کسی طرح درست نہ تھا۔ آئندہ جو کچھ تقدیر الٰہی میں ہو گا جھیلیں گے۔



کتبِ تصوّف وسُلوک

		قیمت
احیاء العلوم کا اردو ترجمہ مذاق العارفین حجۃ الاسلام امام غزالیؒ	احیاء علوم الدین امام غزالیؒ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ تصوف سلوک اور اسلامی فلسفے کی زندہ جاوید کتاب۔ ترجمہ: مولانا محمد احسن نانوتوی (چار جلد کامل) مجلد اعلیٰ	
کیمیائے سعادت کا اردو ترجمہ اکسیر ہدایت حجۃ الاسلام امام غزالیؒ	اسرار تصوف تزکیۂ نفس اور اصلاح ظاہر و باطن میں بے نظیر کتاب کا نہایت مستند اردو ترجمہ۔ کتابت، طباعت اعلیٰ، مضبوط و حسین جلد	
مجموعہ رسائل امام غزالیؒ اردو ۳ جلد	اس مجموعے میں تصوف، عقائد، کلام اور فلسفہ پر امام غزالیؒ کی ۱۶ وہ مستقل کتابیں شامل ہیں جو عرصے سے نایاب تھیں۔	
مکاشفۃ القلوب	تصوف کی مشہور کتاب	
بیاض یعقوبی مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ	مولانا کی قلمی بیاض جس میں تصوف و سلوک کے مسائل کے علاوہ عملیات، وظائف، تعویذات اور طبی نسخہ جات درج ہیں۔ مجلد	
تربیت السالک حکیم الامت مولانا اشرف علی	اصلاح ظاہر و باطن اور تزکیۂ نفس اور راہ طریقت کی مشکلات کا حل اور روحانی علاج کی قرابادین۔ تین جلد کامل	
حجۃ اللہ البالغہ (اردو) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	اسلامی شریعت کے حقائق و اسرار اور تمام علوم اسلامی پر محققانہ کتاب کا مستند اردو ترجمہ۔ مجلد اعلیٰ	
مجالسِ الابرار شیخ احمد رومی	وعظ و تقریر اور نصیحت میں بلند پایہ کتاب جس میں احادیث سے شرک و بدعت کا رد اور صوفیائے متقدمین کے حالات ہیں۔ مجلد	
مجالسِ حکیم الامت	مولانا تھانویؒ کے ملفوظات جمع کردہ مفتی محمد شفیع	
کلیاتِ امدادیہ	حضرت حاجی امداد اللہؒ کی جملہ دس تصانیف کا مجموعہ مجلد	
شریعت و طریقت کا تلازم	اس موضوع پر بہترین کتاب۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب	
نور الصدور فی شرح القبور	امام جلال الدین سیوطی کی کتاب کا ترجمہ۔ مولانا محمد عیسیٰؒ	
تعلیم الدین مدلل	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (تصوف و اخلاق)	
فیوض یزدانی	شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے مواعظ کا عام فہم ترجمہ۔ ترجمہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی	
غنیۃ الطالبین	شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی عقائد اسلام و تصوف پر بے نظیر کتاب۔ ترجمہ عبد الدائم جلالی	

فہرست کتب مفت ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں

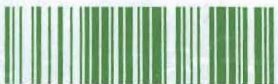
دار الاشاعت اردو بازار کراچی

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی شخصیت علم و عمل اور شریعت وطریقت کا وہ مجمع البحرین ہے جو ایک طرف اتباعِ سنت، اخلاقِ نبوت، سیرتِ صحابہ اور اسوۂ مشائخ کا سرچشمہ ہے تو دوسری جانب ایسا بحرِ بے پایاں ہے جس سے جذباتِ حریت، ترقی ملت، حب وطن، ہمدردی اور غمخواری نوع انسانیت اور ان کے لئے ایثار و بے پناہ قربانی کے چشمے ابلتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب حضرت رحمہ اللہ کی خودنوشت سوانح حیات ہے جسے آپ نے نینی جیل میں قید وبند کی زندگی کے دوران اپنے مخلص خدام اور بے تکلف احباب کے اصرارِ پیہم پر تحریر فرمایا جس میں آپ کی سوانح حیات اور انگریزوں کی ہندوستان آمد اور ان کے اقتدار کے خاتمے تک کے واقعات کا مستند و جامع تذکرہ ہے اور یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء نے راحت و آرام، درس و تدریس، تذکیۂ نفس، تالیف وتصنیف اور تفسیر و رفقاء جیسے مقدس مشاغل سے دست کش ہو کر یک بیک سیاست کی پُرشور وہنگامہ آراء زندگی کیوں اختیار کی اور حکومت متسلطہ کے بالمقابل صف آراء کیوں ہونا پڑا؟ نیز حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی تحریک کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کی گئی اور تحریک کے رجالِ کار، حکومتِ موقتہ کے قیام، افغانستان و حجاز کے انقلابات، ناکامی تحریک کی وجوہات اور اسارتِ مالٹا وغیرہ کے حالات کو قلمبند کیا گیا ہے۔

E-mail: ishaat@pk.netsolir.com
ishaat@cyber.net.pk

نقش حیات



DIU-7366